منازل العرفان

في تفسير القرآن الكريم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث

حضرت مولانا سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جلد پنجم

سورۃ الانعام تا سورۃ الانفال

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ○ کوئٹہ

نام کتاب: منازل العرفان في تفسير القرآن الكريم

تالیف: شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہ

قیمت:

سن اشاعت: ۱۴۴۴ھ 2023ء

تعداد: 1100

ملنے کے پتے.............

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

جامعہ فرقانیہ، سریاب روڈ، کوئٹہ

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

اور ملک کے تمام بڑے کتب خانے

ضروری گزارش

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ سہواً جو غلطیاں ہوگئی ہوں ان کی تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم انسان، انسان ہے، اگر اس اہتمام کے باوجود کسی قسم کی بھی غلطی پر آپ مطلع ہو جائیں، تو برائے مہربانی ہمیں مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ اور آپ ”تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى“ کے مصداق بن جائیں۔ شکریہ

واٹس ایپ نمبر: 03022999778-03128588383

ناشر

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین منازل العرفان جلد پنجم

سورۂ انعام

سورۂ اعراف

سورۂ انفال

سُورَةُ الأَنْعَامِ

مكية آياتها ١٦٥ ركوعاتها ٢٠

سورۂ انعام مکی ہے، اس میں ایک سو پینسٹھ (١٦٥) آیتیں، اور بیس (٢٠) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورة الأنعام ہے جو اس سورت کی آیت ١٣٧ میں موجود "اَلْاَنْعَام" سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے، البتہ بعض مفسرین نے تین چار آیات کو مستثنیٰ لکھا ہے، اور انہیں مدنی کہا ہے۔ یہ وہ سورت ہے جو پوری کی پوری یک بار نازل ہوئی۔ یہ سورت ترتیبِ تلاوت میں چھٹے نمبر پر ہے، اور ترتیبِ نزول میں ٥٥ نمبر پر ہے۔ اس سورت میں ١٦٥ آیات، اور بیس رکوع ہیں۔ یہ سورت تین ہزار ایک سو (٣١٠٠) کلمات اور بارہ ہزار نو سو پینتیس (١٢٩٣٥) حروف پر مشتمل ہے، اس کا نزول سورة الحجر کے بعد ہے۔

ربطِ آیات:

سورۂ مائدہ کے آخر میں توحید کا بیان ہے، جبکہ اس سورت کے شروع اور آخر میں اسی چیز کا تذکرہ ہے۔ سورۂ مائدہ کے شروع میں حلال وحرام جانوروں کا بیان ہے، اس سورت میں بھی اسی کا تذکرہ ہے۔ سورۂ مائدہ میں شرکِ اعتقادی اور شرکِ فعلی کا بیان ہے، سورۂ انعام بھی انہیں چیزوں کی تردید پر نازل ہوئی ہے۔ سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام دونوں کا مرکزی مضمون توحید اور ربوبیتِ باری تعالیٰ ہے، دونوں سورتوں میں آباء واجداد کے اتباع اور ان کی ناجائز امور میں اقتداء کی مذمت ہے۔

مختصر موضوع:

توحیدِ باری تعالیٰ، اثباتِ قیامت، اثباتِ رسالت، صداقتِ قرآن، شرکِ اعتقادی، شرکِ عملی کی مکمل تردید، تذکیر بایّامِ اللہ، تذکیر بآلاءِ اللہ، تذکیر بِمَا بَعدَ المَوْت، قرآن کریم سے مستفیدین اور غیر مستفیدین کا تذکرہ اور نتائج کا بیان، اِمہالِ المجرمین، منکرینِ توحید، منکرینِ رسالت، منکرینِ قرآن، منکرینِ قیامت کے شکوک وشبہات کے اِبطال اور جوابات، دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کی بقاء کا بیان، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت، انبیاءِ کرام علیہم السلام کا بیان، انعاماتِ خداوندی کا بیان، انبیاء علیہم السلام کے استقلال کا تذکرہ، معاندین، مشرکین اور منافقین کے انجام ونتائج کا تذکرہ، عبادات وطاعات اور اوامر ونواہی وغیرہ کا بیان ہے۔

فضیلتِ سورت:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب سورۃ الانعام نازل ہوئی تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سُبۡحَانَ اللهِ کہا، پھر فرمایا کہ اس سورت کو اتنے فرشتوں نے رخصت کیا جنھوں نے اُفق یعنی آسمان کے کناروں کو بھر دیا، اور ستر ہزار فرشتوں نے اس کو رخصت کیا، یعنی یہ سارے فرشتے اس کے ساتھ تسبیح وتہلیل اور تکبیر وتحمید کرتے ہوئے آئے۔ [روح المعاني، ابن كثير قرطبي] علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ سورت اصولِ دین کا ماخذ ہے، علماءِ کرام نے عقائد کے مسائل اکثر اسی سورت سے مرتب کئے ہیں۔ [قرطبي]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ ؕ ثُمَّ الَّذِيۡنَ
كَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ يَعۡدِلُوۡنَ ۞ ١ هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى
عِنۡدَهٗ ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ ۞ ٢ وَهُوَ اللّٰهُ فِى السَّمٰوٰتِ وَفِى الۡاَرۡضِ ؕ يَعۡلَمُ سِرَّكُمۡ وَجَهۡرَكُمۡ وَ
يَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُوۡنَ ۞ ٣ وَمَا تَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ اٰيَةٍ مِّنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ ۞ ٤
فَقَدۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ؕ فَسَوۡفَ يَاۡتِيۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۞ ٥

ترجمہ: سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو، اور زمین کو، اور بنایا تاریکیوں

کواور روشنیوں کو، پھر بھی وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اپنے ربّ کے برابر قرار دیتے ہیں① وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا کیچڑ سے، پھر اُجل مقرر فرمائی، اور اس کے پاس ایک اُجل مقرر ہے، پھر تم شک کرتے ہو② اور وہ اللہ تعالیٰ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، وہ جانتا ہے تمہارے باطنی حالت کو، اور ظاہر حالات کو، اور وہ جانتا ہے جو تم عمل کرتے ہو ③ اور جب ان کے ربّ کی نشانیوں میں سے ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو اس سے اعراض کرتے ہیں④ سو بلاشبہ انہوں نے حق کو جھٹلایا جب ان کے پاس آیا، سو عنقریب آجائیں گی ان کے پاس اس چیز کی خبریں جس کا مذاق بنایا کرتے تھے⑤

معارف ومنازل

اس سورتِ مبارکہ کا نزول ایک ایسے تاریک وقت میں ہوا جبکہ یہ مادی دنیا تمام روحانی انوار و برکات اور عام انسانی شرافتی اقدار وفضائل سے سراسر محروم تھی، گدھے، گھوڑے، انسان، جانور ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے ،صنفِ نازک عورت عاؔم جانوروں کی طرح بازاروں میں بکتی اور فروخت ہو رہی تھی، اور اس کی عصمت پر لوگ جوا اور شطرنج کھیلتے تھے، ہر طرف گمراہی کا بھیانک تباہ کن اندھیرا چھایا ہوا تھا، انسان کا رشتہ اپنے خالق و مالک جل جلالہ سے بالکل کٹ چکا تھا۔ کہیں دیکھو کوئی سورج کا پجاری، کوئی ستاروں کا پرستار، کوئی پہاڑوں کی بلند چوٹیوں، بڑے بڑے دریاؤں، اور اونچے اونچے درختوں، قبروں، مزاروں کا عبادت گزار تھا۔

ہندوستان میں تینتیس کروڑ معبودوں کا راج تھا، ایران کے صحراؤں اور لالہ زاروں میں آتش کدے روشن تھے، رستم واسفند یار اور جمشید کے تمام بہادر فرزند آگ کے شعلوں کے سامنے سجدہ ریز تھے، مسیحی دنیا میں ایک خدائے برتر ودانا قادر مطلق کی جگہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی، اور جزیرۂ نمائے عرب کی تو حالت ہی نہ پوچھیے، راہ چلتے کوئی پتھر پسند آ گیا اس کی تراش خراش کی، اور اسے اپنے محراب عبادت کی زینت بنا دیا۔

عین اس وقت ہادیٔ برحق، داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ: عالم علوی (آسمان) اور عالمِ سفلی (زمین) اسی طرح اندھیرا اور نور یہ سب مخلوق ہیں، اور اپنے وجود اور اپنی حیات، اپنی نشوونما اور اپنی بقاء میں اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے محتاج ہیں۔ اے شریف واشرف انسانو! تاجِ خلافت فی الارض کے پہننے والو! علم و دانش کے

پاسبانو! تم خود ہی بتاؤ اور خود ہی سوچو، پھر فیصلہ کرو، کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ اپنے خالق سے منہ موڑ کر گھٹیا اور ناتواں مخلوق کی بندگی اختیار کرو؟ صمد، واحد، اور غنی ذات کی جگہ محتاج، بے بس، بے جان مخلوق کی پرستش کرو، یہ ہر چیز حسین وجمیل سہی، بلند وبالا ہی سہی، پُر ہیبت وجلال ہی سہی، نفع بخش ومفید ہی سہی، لیکن یہ حسن وجمال اور یہ بلندی و کمال یہ افادیت اور نفع رسانی ان میں آئی کہاں سے؟

یہ اسی ذات برتر واعلیٰ، قادر مطلق کے فضل وکرم کی جلوہ طرازی ہے جس نے انہیں عدم سے وجود میں لایا، اور نیست سے ہست کا لباس پہنایا، اور ہر طرح کی رونقوں اور زینت کی رعنائیوں سے نوازا، تو حمد وثناء وصف وستائش ہر سمت اور ہر پہلو اور ہر محفل میں اسی کی ہونی چاہئے، اور سب مخلوقات کو زبانِ حال وقال سے یہی کہنا چاہئے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کہ سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں، ہر تعریف وتوصیف کا مستحق وہی ہے۔

یہ کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ قرآن پاک کی پانچ سورتوں کی ابتداء کی زینت ہے۔ یعنی سورۃ الفاتحۃ، سورۃ الأنعام، سورۃ الکھف، سورۃ سبأ، سورۃ فاطر۔ اس مختصر جملہ نے گویا شرک کی لاتعداد قسموں کا ابطال کر کے تمام صفاتِ کمالیہ جلالیہ اور جمالیہ کا خالقِ کائنات جل جلالہ کے لئے خوبصورت پیرایہ میں اثبات کر دیا، کہ ساری تعریفیں تمام عظمتیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔

اس دعویٰ پر آنے والے جملے اور پورے مضامین بمنزلۂ دلیل وبرہان کے ہیں۔ اس اثباتِ حمد میں جملہ اسمیہ کے دوام واستمرار پر دلالت کرنے سے ایک لطیف اشارہ بھی ہے، کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، وہ ہر قسم کی تعریفوں کا مستحق ہے، اس کو کسی حمد اور تعریف کی حاجت نہیں، کوئی حمد کرے یا نہ کرے وہ اپنی ذات و صفاتِ کاملہ کے اعتبار سے محمود ہے۔ اب اس کی دلیل کا بیان:

﴿الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ کہ اس کی وہ عظیم وبرتر ذات ہے، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا، یہ آسمان اور زمین تم سب کی نظروں کے سامنے ہیں، اور تم خود بھی معترف ہو کہ ان علوی اور سفلی مخلوقات کا پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، پس جس ذات پاک نے ان کی تخلیق فرمائی ظاہر ہے کہ حمد وثنا کی مستحق وہی ہے، اور وہی واحد لاشریک اور ہر قسم کی عبادتوں کی مستحق بھی ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اَفَلَمْ یَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَزَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّ

ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۸﴾ [ق]

منکرینِ توحید کو دعوت مشاہدہ و نظارہ دیا جارہا ہے کہ اندھے مت بنو، خوب آنکھیں کھول کر نظارہ کرو، اور آسمان کو دیکھ لو، نہ بظاہر کوئی کھمبا نظر آتا ہے، نہ کوئی ستون، اتنا بڑا عظیم الشان جسم کیسا مضبوط و مستحکم کھڑا ہے؟ اور رات کو جب ان پر ستاروں کی قندیل اور جھاڑ فانوس روشن ہوتے ہیں تو کس قدر پُر رونق اور خوبصورت نظر آتے ہیں؟ پھر لطف یہ ہے کہ ہزاروں لاکھوں برس گزر گئے نہ اس چھت میں کہیں سوراخ ہوا، نہ کوئی کنگرہ گرا، اور نہ پلاسٹر ٹوٹا، نہ رنگ خراب ہوا، آخر کونسا ہاتھ ہے جس نے یہ مضبوط و محکم مخلوق بنائی؟ اور بنا کر اس کی ایسی حفاظت کی؟

پس جس آدمی کا خدا کی طرف رجوع ہو محض ان محسوسات کے دائرہ میں الجھ کر نہ رہ جائے، اس کے لئے آسمان وزمین کی تخلیق و تنظیم میں دانائی و بینائی کے کتنے سامان ہیں؟ جن میں ادنیٰ غور کرنے سے صحیح حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ کہ اس نے تاریکیوں کو بنایا، اور نور کو بنایا۔ روشنی اور اندھیریاں بھی آسمان و زمین کی طرح نظروں کے سامنے ہیں، ان میں بھی انقلاب آتا رہتا ہے، کبھی روشنی کبھی اندھیرا، یہ انقلاب اور اُلٹ پھیر بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ خود بخود وجود میں نہیں آئیں، ان کو وجود دینے والی کوئی ذات ہے، اس بات کے ماننے کے لئے کسی خاص غور و فکر کی ضرورت نہیں، سب پر عیاں ہے۔ ؎

ہیچ چیزے خود بخود چیزے نشد ☆ ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد

[مثنوی]

ظلمات اور نور سے مادی تاریکی، اور روحانی تاریکی، اسی طرح مادی روشنی اور روحانی روشنی سب مراد ہو سکتے ہیں: ﴿السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ کے ساتھ خَلَقَ اور ظلمات و نور کے ساتھ جَعَلَ لانے کے بارے میں حضرات مفسرین نے یہ نکتہ بتایا ہے کہ آسمان وزمین اجرام و اجسام ہیں، اپنے وجود میں کسی دوسری مخلوق کے محتاج نہیں، جبکہ اندھیرا اور نور عوارض ہیں، اور قائم بالذات نہیں ہیں، ان کو محل و مکان یعنی جگہ کی ضرورت ہے، جیسے رنگ وغیرہ، جو لوگ آسمانوں کے وجود کو نہیں مانتے، یا ان کے وجود میں متردد ہیں، اس آیت کریمہ میں ان کی بھی تردید ہوگئی، اور جو لوگ دو خدا مانتے ہیں، یعنی یَزْدَانْ اور اَهْرَمَنْ، اور یَزْدَانْ کو خالقِ خیر، اور اَهْرَمَنْ کو خالقِ شر کہتے ہیں، پھر یَزْدَانْ کو نور سے، اور اَهْرَمَنْ کو ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں، آیت کریمہ میں ان کی بھی تردید ہوگئی۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظلمات سے مراد کفر ہے، اور نور سے ایمان مراد ہے۔ اس قول پر ظلمات کو بصیغہ جمع، اور نور کو مُفرَد لانے کا مقصد یہ ہے کہ کفر کے طریقے بہت ہیں، اور ایمان کا راستہ ایک ہی ہے، جیسے کہتے ہیں کہ حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے، جبکہ باطل متعدد ہوتے ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک سیدھی لکیر کھینچی، اور فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے، پھر اس لکیر کے دائیں بائیں مختلف لکیریں کھینچیں، اور فرمایا: ان راستوں میں سے ہر راستہ پر شیطان کھڑا ہے، جو لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ [رواه أحمد والنسائي والدارمي]

﴿ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾ پھر جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ لوگ (عبادت و تعظیم اور عطاء و انعام کی نسبت میں) دوسروں کو اپنے ربّ کے برابر قرار دیتے ہیں، اور خالقِ کائنات جل شانہ کے لئے شرکاء تجویز کرتے ہیں، اور ان کی عبادت کرتے ہیں، اور خیر و شر کا انہیں مالک قرار دیتے ہیں، جو بہت بڑی حماقت اور نادانی ہے۔ پھر ارشاد ہوا:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تم کو گارے سے پیدا فرمایا، چونکہ انسان کی ابتدائی تخلیق مٹی سے ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش مٹی سے ہوئی، اسی کو ابلیس نے اپنے کبر و غرور کا سبب و بہانہ بنا کر کہا تھا: ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ [الأعراف: ۱۲] (آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے، اور آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا ہے)۔

جب حضرت آدم علیہ السلام بلا واسطہ مٹی سے پیدا ہوئے، تو اسی توسط سے ان کی نسل کو مٹی سے پیدا ہونے کی نسبت ہوئی۔ پھر ساری زندگی انسانوں کی خوراک "غذاء" بقاء، رہائش، قیام اور بعد از موت تدفین سب کا تعلق مٹی کے ساتھ ہوا۔ اس پیدائشی نسبت کو قرآن حکیم نے مختلف الفاظ میں یاد فرمایا، یہاں سورۂ انعام میں ﴿مِنْ طِيْنٍ﴾ فرمایا۔ سورہ حجر میں ﴿مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ [الحجر: ۲٦] (بجتی ہوئی سڑی ہوئی مٹی سے) جو ہاتھ لگانے پر آواز پیدا کرے۔ سورۂ غافر میں فرمایا: ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ [الغافر: ٦۷] (تم کو مٹی سے پیدا فرمایا)۔ سورۂ صافات میں فرمایا: ﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ﴾ [الصافات: ۱۱] (ہم نے ان کو چپکی ہوئی لیس دار مٹی سے پیدا فرمایا)۔ سورۂ رحمٰن میں ارشاد ہے: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [الرحمن: ۱۴] (انسان کو بجتی ہوئی مٹی

سے پیدا فرمایا)۔

دراصل بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو مٹی زمین کے مختلف حصوں سے اٹھائی گئی، تو اسی کا اثر انسانوں میں ظاہر ہوا، کوئی سفید، کوئی سیاہ، کوئی سرخ، کوئی نرم، کوئی سخت، وغیرہ وغیرہ۔ اس مٹی کو جنت کے پانی سے خمیر کیا گیا۔ [مظهري]

تو یہ "طین" یعنی کیچڑ ہوگئی، پھر وہ کیچڑ پڑی رہی تو سڑ گئی اور سیاہ رنگ کی بدبودار ہوگئی، پھر اس سے فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کا پُتلا تیار کیا، اور وہ پُتلا سوکھ کر خشک ہوگیا تو بجنے والی مٹی بن گئی، اس کے بعد اس میں روح حیات پھونکی گئی۔

چونکہ یہ مختلف ادوار اس مٹی پر گزرے، اور مٹی کی کیفیتیں مختلف ہوتی گئیں، (ایک چیز مختلف صفات میں) اس لئے انسان کی تخلیق بیان کرتے ہوئے کبھی تُرَابٍ کبھی طِيْنٍ کبھی صَلْصَالٍ اور کبھی الْفَخَّار کبھی حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کبھی لَازِبٍ فرمایا۔ تخلیقِ انسان بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

﴿ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا﴾ پھر اَجل مقرر فرمادی۔ اس سے موت کا وقت مراد ہے، جو ہر فرد کے لئے مقرر ہے، جو کہ اس سے آگے پیچھے نہ ہوگا جیسے سورۂ منافقون میں ارشاد ہے: ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾ [المنافقون:۱۱] (اللہ تعالیٰ کسی جان کو ہرگز مہلت نہ دے گا جب کہ اس کی مقررہ اجل آجائے)۔ پھر ارشاد ہوا:

﴿وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ﴾ اور ایک اجل اس کے پاس مقرر ہے، یہ قیامت اور صور پھونکے جانے اور قبروں سے اٹھنے کی اجل مراد ہے۔ افراد کی اجل باری باری سے ان کی موت کے وقت پوری ہوتی جاتی ہے، اور ساری دنیا کی جو اجل مقرر ہے وہ قیامت آنے کے ساتھ پوری ہوجاتی ہے۔ پہلی اجل کا علم فرشتوں کو ہوجاتا ہے، کیونکہ انہیں روح قبض کرنا ہوتا ہے، اور دوسری اجل کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوتا، نہ فرشتوں کو، نہ انبیاء علیہم السلام کو نہ ہمارے پیغمبر سید کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ یہی کتاب وسنت کا فیصلہ ہے، پس اچانک قیامت کا ظہور ہوگا، جسے بَغْتَةً سے تعبیر فرمایا ہے، پھر فرمایا:

﴿ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ﴾ یہاں ثُمَّ تراخی کے لئے نہیں، تعجب کے لئے ہے، کہ ان تمام حقائق دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کے باوجود حیرت ہے کہ تم شک کرتے ہو، چاہئے تھا کہ تم فوراً ایمان لاتے، اور تصدیق کرتے، اور وحدانیتِ باری کا اقرار کرتے۔

گلیم بخت کسے را کہ بافتند سیاہ ☆ بآب زمزم وکوثر سفید نتوان کرد

فائدہ:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر شخص کی دو اجلیں ہیں: ایک پیدائش سے موت تک، دوسری موت سے حشر تک (یعنی برزخی زندگی)۔ اگر آدمی نیک پرہیزگار صلہ رحمی کرنے والا ہوتا ہے تو برزخی اجل کا کچھ حصہ لے کر میعادِ عمر میں بڑھا دیا جاتا ہے (اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں ارشاد ہے کہ والدین کی خدمت اور اقرباء پروری سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے)۔ اور اگر آدمی بدکار اور رشتہ منقطع کرنے والا ہوتا ہے تو مدّتِ زندگی کا کچھ حصہ لے کر برزخی اجل میں بڑھا دیا جاتا ہے۔ [مظهري] اس مسئلہ کی تحقیق سورۂ نوح کی تفسیر میں دیکھیں۔

فائدہ:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: چھ لوگ ہیں جن پر میں نے اور اللہ تعالیٰ نے اور ہر مُستجاب الدعوات پیغمبر نے لعنت کی ہے: (۱) اللہ تعالیٰ کی کتاب میں (لفظی یا معنوی) زیادتی کرنے والا۔ (۲) تقدیرِ خداوندی کی تکذیب کرنے والا۔ (۳) زبردستی اقتدار پر تسلط جمانے والا، تاکہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ذلیل قرار دیا ہے اس کو عزّت والا بنادے، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے عزّت دار بنایا ہے ان کی ذلت کرے (جیسے ہمارے زمانے کے ظالم بے دین حکمران اور افسران)۔ (۴) اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنے والا۔ (۵) حلال چیزوں کو حرام کرنے والا۔ (٦) اور میرے طریقہ کو ترک کرنے والا۔ [مظهري، بيهقي]

صاحبِ مظہری فرماتے ہیں (ہم بھی یہی جانتے ہیں) میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں زیادتی کرنے والے روافض شیعہ ہیں، جو قرآن پاک کے تیس پاروں میں دس پاروں کی زیادتی کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن پاک کے دس پارے ساقط کردیئے تھے، (اور یہ بھی کہتے ہیں کہ موجودہ قرآن پاک اصلی قرآن نہیں، یہ موجودہ قرآن شرابی خلفاء کا ترتیب دیا ہوا صحیفہ ہے، اور اصلی قرآن امام غائب کے پاس عراق کے مشہور غار "سُرَّ مَنْ رَىٰ" میں محفوظ ہے، جس کی ضخامت اونٹ کی رانوں کے برابر ہے، اور اس کی سترہ ہزار آیات ہیں وغیرہ)۔

اسی طرح رافضیوں کا یہ خیال بھی ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ کے برابر تھی (اس میں اہلِ بیت کے مناقب تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کی خلافت اور مناقب کا بیان تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم

نے مل کر انہیں ساقط کیا، اور سارے کافر تو پہلے ہی سے تھے (معاذ اللہ) انہوں نے دیدہ دانستہ کفر کیا، اس سلسلے میں وہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر کہتے ہیں، سوائے چار کے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس اُمت کے فرعون وہامان تھے، وہ مؤمن صرف چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہتے ہیں، جن کے نام یہ ہیں: حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت سلمان فارسی، حضرت عمار بن یاسر، حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم۔

روافض گرزند طعنہ بیار غار پیغمبر ☆ مکن عیبش کہ اولعنت زمیراث پدر دارد

صاحب مظہری فرماتے ہیں کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کا قتل حلال سمجھنے والے خارجی ہیں، اور تقدیرِ خداوندی کی تکذیب کرنے والے معتزلہ ہیں، آیت میں ان کی طرف بھی اشارہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھنے والے مرجئہ ہیں، جو انسان کو محض مجبور قرار دیتے ہیں، اور زبردستی اقتدار پر تسلط جمانے والے ظالم حکمران اور بادشاہ ہیں، اور سنت وطریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ترک کرنے والے تمام بدعتی اور فاسق ہیں۔ انتهى كلام المظهري۔

فائدہ:

پہلے زمانے میں تارکِ سنت صرف بدعتی کہلاتا تھا، وہ اعمال میں بدعات کو حسنِ ظن کے درجے میں داخل کر کے گزارہ کرتے تھے، یعنی وہ عملی بدعتی ہوتے تھے۔ ہمارے زمانہ کے اہل بدعت اس طرح نہیں، یہ کفر وشرک تک کا بخوشی ارتکاب کرتے رہتے ہیں، ان کی ساری پرورش نذر لغیر اللہ کی مرہونِ منت ہے۔ بعض چیزوں میں یہ لوگ مشرکینِ عرب اور عیسائیوں کے بھی ریکارڈ توڑ دیتے ہیں۔ کبھی یہ کہتے ہیں (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کے پاس وحدت کے سوا کچھ نہیں، اگر کچھ لینا ہو تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے لو، جن کے پاس سب کچھ ہے۔

دیکھئے! یہ کتنا مشرکانہ اور باطل عقیدہ ہے؟ یہ بعینہٖ عیسائیوں والا عقیدہ ہے جو کہتے تھے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [المائدة: ۷۲] (بیشک اللہ مسیح بن مریم ہی ہے)۔ ایسا عقیدہ رکھنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔

﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ﴾ اور وہی ہے معبودِ برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی۔ هُوَ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور لفظ "اللہ" جو اس جگہ مذکور ہے۔ هُوَ کی خبر ہے یا بدل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کی طرح هُوَ ضمیرِ

شان ہو۔

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ﴿فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ﴾ معنیِ وصفی (اُلوہیت) سے متعلق ہے، جو اسمِ جلالہ یعنی لفظ ''اللہ'' سے مفہوم ہورہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں صرف اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت ہے، اور ہر جگہ وہی معبودِ برحق اور لائقِ عبادت ہے۔ بعض حضرات نے جار مجرور کو اَلْمَالِکُ اور اَلْمُتَصَرِّفُ سے متعلق بتایا ہے، جو محذوف ہے، مطلب یہ ہے: ''وَهُوَ الْمَالِکُ وَالْمُتَصَرِّفُ وَالْمُدَبِّرُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ''۔ اللہ تعالیٰ شانہ کو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کا علم ہے، کیوں نہیں، ساتوں سمندروں کی تہہ میں رینگنے والی چیونٹیوں کے پاؤں کی حرکت کو سنتا بھی ہے، اور دیکھتا بھی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

''یَعْلَمُ مَثَاقِیْلَ الْجِبَالِ وَمَکَایِیْلَ الْبِحَارِ وَعَدَدَ قَطْرِ الْاَمْطَارِ وَعَدَدَ اَوْرَاقِ الْاَشْجَارِ وَعَدَدَ مَا اَظْلَمَ عَلَیْهِ اللَّیْلُ وَاَشْرَقَ عَلَیْهِ النَّهَارُ سُبْحَانَهٗ مَا اَعْظَمَ شَانَهٗ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْعَلِیْمُ الْجَبَّارُ''۔ مطلب یہ ہے کہ جو اقوال واعمال ہیں، اور جو نیتیں اور قلبی ارادے ہیں، جو کچھ تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو، اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے، تمہارے اعمال خواہ کسی قسم کے ہوں عملی یا قلبی، ﴿وَهُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [الحدید:٦] (وہ سینوں میں چھپی ہوئی باتوں خوب جانتا ہے)۔ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحدید:۴] (وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں کہیں تم ہو)۔ وہی ذات پاک ہے جو کائنات کے تمام ذرّات سے آگاہ اور باخبر ہے۔

﴿وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ﴾ جو بھی کوئی آیت اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ان کے سامنے آتی ہے تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اس سے آیاتِ قرآنیہ مراد ہوسکتی ہیں، اور آیاتِ تکوینیہ بھی (آسمانی زمینی، ہوائی، فضائی، کوہ وجبال اور ہزاروں دیگر مخلوقات)۔ یہ مشرکین سب کو جھٹلاتے اور سب سے اعراض کرتے ہیں۔

﴿فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ سو انہوں نے حق کو بھی جھوٹا قرار دیا، جب حق ان کے پاس آگیا۔ حق سے مراد قرآن کریم یا سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ فَقَدْ میں ''فاء'' تفریع کے لئے ہے، یعنی انہوں نے جب تمام معجزات کا انکار کردیا تو قرآن کریم کا بھی انکار کردیا۔ یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے، یا ''فاء'' سببیہ ہے، یعنی جب انہوں نے قرآن پاک کی تکذیب کی جو لفظاً اور معناً ہر زمانہ میں واضح ترین معجزہ ہے، جس کی نظیر پیش کرنے سے اور اس کی چھوٹی سورت جیسی کوئی سورت پیش

کرنے سے قیامت تک ساری انسانیت ناتواں اور عاجز ہے۔

اور انہوں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی، جن کا وجود مسعود بجائے خود ایک عظیم معجزہ ہے، ایک شخص جو انہی میں پیدا ہوا، اور انہوں نے نہ کسی سے کچھ پڑھنا سیکھا، نہ لکھنا، پھر ایسے شخص کی زبانِ حق بیان سے علم کے چشمے اور معرفت کے خزانے اور حکمت کے دریا پھوٹ پڑے، اور بہہ نکلے، جن کی تائید وتوثیق تمام سابق آسمانی کتابوں سے ہو رہی ہے، اور ان کی نبوت ورسالت کا اقرار بڑے بڑے یہودی اور نصرانی احبار ورُہبان اور علماء ومشائخ کر چکے ہیں، لیکن ان ناعاقبت اندیش بدبختوں نے ان کی نبوت ورسالت کا اقرار نہیں کیا، حالانکہ وہ سب کچھ جانتے تھے، مگر تعصب وعناد نے انہیں اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ ﴿فَبِأَيِّ حَدِيثٍۭ بَعْدَهُۥ يُؤْمِنُونَ﴾ [المرسلات: ۵۰] (اب اس کے بعد اور کونسی بات ہے جس پر یہ ایمان لائیں گے؟)۔

جب انہوں نے حق کو جھٹلایا، اور اس پر مذاق واستہزاء بھی کیا، تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس تکذیب و استہزاء کا عنقریب انجامِ بد ان کا استقبال کرے گا، اور وہ اپنی سرکشی کا انجام ونتیجہ دیکھ لیں گے، اور انہیں زجر وتوبیخ کے طور پر کہا جائے گا: ﴿إِنَّ هَٰذَا مَا كُنتُم بِهِۦ تَمْتَرُونَ﴾ [الدخان: ۵۰] (یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں تم لوگ شک کیا کرتے تھے)۔ ﴿اصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ [یس: ۶۴] (آج اس میں داخل جاؤ، کیونکہ تم کفر کیا کرتے تھے)۔ وَغَيرُ ذَالِكَ مِنَ الْآيَاتِ الْبَيِّنَاتِ۔ فرمایا:

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَٰرَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَٰهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِنۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا ءَاخَرِينَ ۝٦

ترجمہ: کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی امتوں کو ہلاک کر دیا، ان کو ہم نے زمین میں ایسا اقتدار دیا تھا جو تم کو نہیں دیا، اور ہم نے ان پر زوردار بارشیں برسائیں، اور ہم نے نہریں بنا دیں جو ان کے نیچے جاری تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا، اور ان کے بعد ہم نے پیدا کر دیں دوسری امتیں ۝٦

☆☆☆

معارف ومنازل

تَذْكِيرٌ بِأَيَّامِ اللهِ قرآن کریم کے علوم میں سے ایک سبق آموز عبرت ناک علم ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ لوگوں کو گزشتہ اقوام کے اعمال و نافرمانیوں سے، اور نافرمانیوں کی پاداش میں تباہی و ہلاکتوں سے، اور ان کے انجام و نتائج سے آگاہ کرنا ہے، اور انہیں خبردار کرنا ہے کہ نافرمانی کی صورت میں تمہارا انجام ان سے شاید بدتر اور ناگفتہ بہ ہو: ﴿أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ۝١٦ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ ۝١٧ كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ۝١٨ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝١٩﴾ [المرسلات] (کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے بعد والوں کو بھی چلتا کردیں گے۔ ایسا ہی سلوک ہم مجرموں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ بڑی خرابی ہوگی اس دن ایسے لوگوں کی جو حق کو جھٹلاتے ہیں)۔

نزول قرآن کے وقت قرآن حکیم کے اولین مخاطب مشرکین عرب تھے، وہ قرآن حکیم کی تکذیب کرتے تھے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی بری طرح پیش آتے تھے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے انہیں ایذائیں دیتے تھے، اور مذاق بھی اڑاتے تھے۔

شعب ابی طالب کا سہ سالہ دور نہایت پریشانیوں اور تکالیف کا دور رہا، دوبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جان و ایمان بچانے کی غرض سے دو مرحلوں میں حبشہ ہجرت کی، مشرکینِ مکہ کٹر جاہل غیر تعلیم یافتہ تھے، انہیں اقوامِ عالم کا پتہ ہی نہ تھا۔ پرانی امتوں کے واقعات سے سراسر ناواقف اور جاہل تھے۔

وہ زمانہ تالیف و تصنیف کا نہ تھا کہ کتابیں مدوّن ہوتیں، اور ماضی کے تاریخی واقعات سے کچھ سبق سیکھتے، لیکن یہ لوگ گرمیوں میں تجارت کے لئے ملک شام جایا کرتے تھے، اس سفر میں مدینہ منورہ کے یہودیوں پر گزر رہوتا تھا، اور شام میں نصاریٰ آباد تھے، وہ ان قوموں سے مل کر پرانی امتوں کے واقعات اور قصے جزوی طور پر سنتے رہتے تھے، اور اس سفر میں خاص کر قوم ثمود اور دیگر اقوام کی بربادی کے نشانات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔

قوم (ثمود) حضرت صالح علیہ السلام کے پہاڑوں سے تراشے ہوئے گھر ان کے سامنے آتے تھے، جو تبوک جاتے ہوئے راستے میں واقع ہیں۔ کہاں گئے ان گھروں کے بنانے والے؟ اور کہاں گیا ان کا کرّ وفرّ؟ سارا اقتدار، ساری تمکنت، سارا خاک میں مل گیا۔ ان کی خرمستیاں اور خوش حالیاں، ناز و نخرے، قوّت و بہادری سب ختم ہوگئیں، آج کرۂ ارض کے صفحۂ ہستی میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں۔

اصحابِ فیل کی بربادی کا واقعہ تو اہلِ مکہ کے بچہ بچہ کی زبان پر تھا، جنہیں قومِ قریش نے آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہوا تھا۔

یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انہیں یاد دلائیں، اور فرمایا کہ تم جو ہمارے رسول (ﷺ) اور ہماری کتاب کی تکذیب کرتے ہو، کیا تمہیں اس سے کچھ بھی عبرت نہیں؟ کہ جن لوگوں نے یہ حرکتیں کیں ان کو ہم نے صفحۂ ہستی سے مٹا کر ہلاک و برباد کیا، اور جو شرف و اقتدار ہم نے ان کو دیا تھا تمہیں وہ بھی تو حاصل نہیں، پھر تم کیسے عذاب سے بچ سکتے ہو؟ ان کی زبردست حکومت بھی تھی، اور مالی اعتبار سے ہم نے انہیں خوب نوازا تھا، ان پر موسلا دھار بارشیں برساتے رہے، ان کے لئے نہریں جاری کیں، جو ان کے باغوں اور کھیتوں میں جاری تھیں، یہ لوگ اوپر بیٹھ کر ان باغوں کھیتوں اور لہلہاتے پھلوں اور پھولوں کا نظارہ کرتے تھے، اور خوش ہوتے تھے، انہوں نے نعمتوں کی ناقدری کی، سرکشی اور بغاوت پر اتر آئے، شرک و کفر پر جمے رہے، برابر تکذیب کرتے رہے، گناہوں پر منہمک رہے، لہٰذا ہم نے ان کی تباہی کا فیصلہ کیا، اور انہیں ہلاک کر دیا۔

ایک قوم ہلاک ہوئی تو اس کے بعد دوسری قوم پیدا کر دی، جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان ہلاکتوں سے عبرت حاصل کریں، اور اپنی اصلاح کی فکر کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اپنے گناہوں کے سیلاب میں ان اقوام کی طرح خس و خاشاک کی طرح بہہ نہ جائیں، کیوں نہیں، ﴿إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ﴾ [الصافات:۳۴] (ہم مجرم لوگوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں)۔ خدائی قانون ہے، اور تیرا ربّ گھات میں ہے۔ فرمایا: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ [الفجر:۱۴] (تمہارا رب گھات میں ہے)

سورۂ سبأ میں فرمایا: ﴿وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ﴾ [سبأ:۴۵] (اور جھٹلایا ان لوگوں نے جو اُن سے پہلے تھے، اور یہ لوگ نہیں پہنچتے اس کے دسویں (۱۰) حصّے کو بھی وہ جو ہم نے ان کو دے رکھا تھا، سو جھٹلایا میرے پیغمبروں کو، تو کیسا ہوا میرا عذاب؟)۔

مشرکوں کو تنبیہ فرمانے اور یہ بتانے کے بعد کہ تم سے پہلے بہت سی امتیں آئیں، اور وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے برباد ہوئیں، لہٰذا تم عبرت سیکھو، اور ایمان لاؤ۔

"قَرْن": لفظِ قرن اس جماعت کو بھی کہا جاتا ہے جو ایک وقت اور ایک زمانہ میں مجتمع موجود ہو، اور زمانہ کے ایک طویل حصّہ کو بھی قرن کہتے ہیں، جس کے بارے میں دس سال سے لے کر سو سال تک کے مختلف اقوال ہیں۔

مگر بعض واقعات وروایاتِ حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ لفظِ قرن سو سال کے لئے بولا جاتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ سرور عالم ﷺ نے عبداللہ بن بشر مازنی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ تم ایک قرن زندہ رہو گے، اور وہ پورے ایک سو سال زندہ رہے۔ اسی طرح سرور عالم ﷺ نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی کہ ایک قرن زندہ رہو، وہ پورے ایک سو سال تک زندہ رہا۔ [معالم، النهايه جزري]

زنیرنگئ این دولت مشو خندہ مرنجان دل ☆ کہ این کارے جہان گاہے چنان گاہے چنین شر

اہلِ مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ تم گزشتہ اقوام کے مقابلے میں کچھ نہیں ہو، وہ لوگ بدنی، جسمانی ڈیل ڈول اور قوت میں تم سے مضبوط تھے، افرادی قوت اور سیاسی وحکومتی لحاظ سے بڑے مضبوط ومنظم تھے، مالداری وسرمایہ داری، کھیتی وزراعت اور باغات کے اعتبار سے تم پر فائق رہے، مگر گناہوں اور شرک وکفر کی وجہ سے وہ مکمل ہلاک ہوئے، اور ان کی جگہ اللہ تعالیٰ نے دوسری قومیں پیدا فرمائیں، پس کوئی بعید نہیں کہیں تمہارا حشر ان سے بھی بدتر ہو، سنت اللہ ہمیشہ یہی جاری رہی ہے، اور رہے گی: ﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ [محمد ﷺ: ۳۸] (اگر تم منہ موڑو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا)۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَٰبًا فِى قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝٧ وَقَالُوا لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِىَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ۝٨ وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَٰهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝٩ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِۦ يَسْتَهْزِءُونَ ۝١٠ قُلْ سِيرُوا فِى الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝١١

ترجمہ: اور اگر ہم اتار دیں آپ پر کاغذ میں لکھا ہوا کوئی نوشتہ، پھر وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھو لیں، تب بھی کافر لوگ یوں کہیں گے کہ یہ کچھ بھی نہیں ہے مگر صریح جادو ہے ۝٧ اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتارا گیا اس پر فرشتہ، اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتار دیتے تو فیصلہ کر لیا جاتا، پھر ان کو کوئی مہلت نہیں دی جاتی ۝٨ اور اگر ہم اس کو فرشتہ بنا دیتے تو اس کو آدمی ہی بنا دیتے، اور ہم ان پر شبہ ڈال دیتے، جس شبہ میں وہ اب پڑ رہے ہیں ۝٩ اور بلا شبہ آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ استہزاء کیا گیا، پھر جن لوگوں نے استہزاء کیا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے

تھے⑩ آپ فرما دیجئے کہ چلو زمین میں، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟⑪

معارف ومنازل

شانِ نزول:

ایک دفعہ قریش کے نضر بن الحارث، عبداللہ بن اَبِی اُمَیّہ اور نوفل بن خویلد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، اور کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم ہرگز آپ پر ایمان نہ لائیں گے، جب تک کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ایسی کتاب نہ لائیں جس کے ساتھ چار فرشتے ہوں، وہ گواہی دے رہے ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

اسی طرح عبداللہ بن ابی امیہ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک معاندانہ مطالبہ پیش کیا، اور کہا کہ میں تو آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لاسکتا جب تک کہ میں یہ واقعہ نہ دیکھ لوں کہ آپ اوپر آسمان میں چڑھ جائیں، اور وہاں سے ہمارے سامنے ایک کتاب لے کر آئیں، جس میں میرا نام لکھا ہوا ہو کہ میں آپ پر ایمان لے آؤں، اور آپ کی تصدیق کروں۔ اور یہ سب کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ یہ سب کچھ کر بھی دکھائیں پھر بھی میں آپ کی تصدیق نہیں کرسکتا۔

ہدایت اور ضلالت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، یہ معاندانہ سوال دیکھئے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی عنایت بھی دیکھئے۔ یہی عبداللہ بن ابی امیہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے، اور غازی بن کر غزوۂ طائف میں شہید ہوئے۔ رضی اللہ عنہ۔ انہی سوالات کے جواب میں آیت کریمہ:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ﴾ کا نزول ہوا، یعنی اگر ہم ان پر کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب نازل کردیں، پھر وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھولیں، تب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں۔ کتاب کو دیکھ کر ہاتھ لگا کر بھی منکر ہی رہیں گے، اور یوں کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ یہ جو کہہ رہے ہیں کہ کتاب آجائے، اور فرشتے آجائیں تو ہم ایمان لے آئیں گے، یہ ضد اور عناد ہے، ایمان لانا ان کا مقصد نہیں۔ یہ اور ان کے دیگر بہت سے مطالبات جن کا تذکرہ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں مذکور ہے کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں، جن سے ان کے ایمان کی توقع ہو۔

اسی طرح ان کا یہ مطالبہ کہ چار فرشتے اتر کر اس پر گواہی دینے والے ہوں۔ فرمایا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ﴾ اور انہوں نے کہا کہ کیوں نہ نازل ہوا فرشتہ؟ مشرکینِ مکہ یہ بھی مطالبہ کیا کرتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس فرشتہ آتا، اور ان کی تصدیق کرتا تو ہم ایمان لے آتے۔ اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ﴾ اگر ہم کوئی فرشتہ بھیج دیتے تو فیصلہ ہو جاتا۔ یہ غفلت شعار لوگ ایسے مطالبات کر کے اپنی موت اور ہلاکت کو دعوت دے رہے ہیں، کیونکہ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی پیغمبر سے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ ان کا مطلوبہ معجزہ پورا کرے، پھر اگر وہ ایمان لانے میں پس و پیش کریں تو انہیں عمومی عذاب سے ہلاک کیا جائے گا۔

یہ اہلِ مکہ معجزہ کے بعد اگر ایسا کریں تو ان کی تباہی بھی اسی قانون کے تحت یقینی ہو جائے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ [الأنفال:۳۳] (اور (اے پیغمبر!) اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان کو اس حالت میں عذاب دے جب تم ان کے درمیان موجود ہو)۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ شَقُّ الْقَمر کے بعد چاہئے تھا کہ اہلِ مکہ پر عمومی عذاب کا نزول ہوتا، مگر رحمۃ للعٰلمین (فِدَاهُ اَزْوَاجُنَا) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود باجود نزولِ عذاب میں رکاوٹ بنا۔ ﴿وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ کی یہی مراد و مطلب ہے۔

تو عمومی قانون کے پیش نظر یہی فرمایا کہ یہ قوم ماننے والی تو ہے ہی نہیں، تو معجزہ کے دیکھنے کے بعد بھی جب خلاف ورزی کرے گی تو اللہ تعالیٰ کا حکم ان کے ہلاک کرنے کے لئے جاری ہو جائے گا، اور اس کے بعد ان کو ذرا بھی مہلت نہیں دی جائے گی، اس لئے ان کو سمجھنا چاہئے کہ ان کی مانگی ہوئی کوئی نشانی اگر ظاہر نہیں کی گئی تو اس میں ان کی خیر ہے، اس بات کا دوسرا جواب:

﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ﴾ کہ یہ سوال کرنے والے نہایت بے وقوف و ناعاقبت اندیش ہیں، کہ فرشتوں کے نزول کا مطالبہ کرتے ہیں۔ فرمایا: اگر ہم اس کو فرشتہ بناتے تو اس کو آدمی ہی بناتے، اور ہم ان پر شبہ ڈال دیتے، جس شبہ میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں، کیونکہ فرشتوں کے نازل ہونے کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ فرشتہ اپنی اصلی ہیئت وصورت میں لوگوں کے سامنے آجائے، تو لوگ اس کو دیکھنے کی تاب اور طاقت نہ لاسکتے، اور کوئی اسے برداشت نہ کرسکتا، لوگ سارے صدمے میں مرجاتے۔ امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فرمایا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل وصورت میں آجائے ، جیسے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہزاروں مرتبہ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل وصورت میں تشریف لاتے رہے، تو اس صورت میں سوال کرنے والوں کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو اعتراض ہوتا کہ آپ ہماری طرح کے بشر ہیں، وہی اعتراض فرشتہ پر بھی ہوتا، کہ یہ تو ایک انسان ہی ہے، تو مسئلہ جوں کا توں باقی رہتا، اور حل نہ ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ہم فرشتہ کو نبی بنا کر بھیجتے تو آدمی ہی کی صورت میں آتا، کیونکہ انسانوں کو اتنی طاقت اور قوت برداشت نہیں ہے کہ وہ فرشتے کو اس کی صورت میں دیکھ سکیں، جب اس کی صورت انسانی صورت ہی ہوتی تو یہ لوگ پھر معاندانہ باتیں کرتے ، اور کہتے کہ ہمیں کیا معلوم کہ یہ فرشتہ ہے، جو باتیں اب کہہ رہے ہیں کہ یہ صاحب جو نبوت کا دعویٰ کررہے ہیں ہمارے ہی جیسے آدمی ہیں، ﴿مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ [الشعراء:۱۵۴] (تم تو ہماری طرح انسان ہی ہو)۔ فرشتہ کو انسانی صورت میں دیکھ کر ایسی باتیں کرتے اور یہی کہہ دیتے کہ یہ تو ہمارا جیسا ہے، اس میں کونسی خصوصیت ہے جو نبی بنا دیا گیا؟

لہٰذا فرشتہ کے رسول بن کر آنے کی صورت میں بھی لوگوں کو جو شبہ ہو رہا ہے، وہ شبہ پھر بھی باقی رہتا۔ اور حقیقت میں ان لوگوں کے یہ بہانے ہیں کہ ایسا ہوتا تو ہم مان لیتے، یہ حق کے طالب نہیں ہیں، اگر حق کے طالب ہوتے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح معجزات دیکھ کر جو بشر ہیں اور انہیں میں سے ہیں، اور سب سے بڑا معجزہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی صفات تو ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے اندر چالیس سال سے پاکیزہ سیرت، پاکیزہ اعمال کے ساتھ رہ رہے ہیں، اور بے داغ زندگی گزار رہے ہیں، جن کی دیانت، صداقت اور عصمت پر تم سب گواہی دے رہے ہو، اور انہیں "أمین" کے لقب سے یاد کررہے ہو۔

استہزاء کرنے والوں کے لئے وعید شدید:

پھر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ اور بلاشبہ آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ بھی استہزاء کیا گیا، پھر جن لوگوں نے استہزاء کیا ان کو اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس میں اول تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ تکذیب کرنے والے جو کچھ آپ کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، مخالفت کرتے ہیں، یا بلاوجہ ستاتے اور دشمنی کرتے ہیں، مختلف طور پر ایذاء

دیتے ہیں، یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ آپ سے پہلے جو رسول گزرے ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے، لہٰذا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف:۳۵] (تم اسی طرح صبر کیے جاؤ جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ہے) سورۂ یٰسٓ میں فرمایا: ﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ [یٰس:۳۰] (افسوس ہے ایسے بندوں کے حال پر۔ ان کے پاس کوئی رسول ایسا نہیں آیا جس کا وہ مذاق نہ اڑاتے رہے ہوں)۔

پھر انجام یہ ہوا کہ جن لوگوں نے استہزاء کیا تھا وہ اس کے وبال میں مبتلا ہو گئے، اور استہزاء وتمسخر کی سزا میں ان کو عذاب نے گھیر لیا، موجودہ استہزاء کرنے والوں کا بھی ایسا انجام ہونے والا ہے۔ اس کے بعد مکذّبین اور مستہزئین ومعاندین کو مزید تنبیہ فرمائی، اور ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ آپ فرمایئے کہ زمین میں چلو پھرو، اور دیکھو کہ کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا؟ دنیا میں چلیں پھریں، دنیا میں مست وناعاقبت اندیش لوگوں کے شہروں، بستیوں میں رہائشی مکانات محلات کے کھنڈروں سے اور ان کی اجتماعی ہلاکت اور بربادی کے واقعات سے عبرت حاصل کریں۔ ﴿فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً﴾ [النمل:۵۲] یہ ہیں ان کے گھر جو کھنڈرات بنے ہوئے ویران ہیں۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ
إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑫ وَلَهٗ مَا سَكَنَ
فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ⑬ قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ إِنِّيْٓ أُمِرْتُ أَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ⑭ قُلْ إِنِّيْٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑮ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ
فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ⑯ وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ ۭ وَإِنْ
يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑰ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ⑱

ترجمہ: آپ فرمادیں: کس کی ملکیت ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمینوں میں ہے؟ فرمادیجئے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اس نے اپنے اوپر رحمت کرنا لازم فرمایا ہے، وہ ضرور تم کو قیامت کے دن جمع فرمائے گا، جس میں کوئی شک نہیں۔ جن لوگوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑫ اور اسی کے لئے ہے جو ساکن ہے رات میں، اور دن میں، اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ⑬ آپ فرمادیجئے: کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مددگار بنالوں؟ جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اور وہ کھلاتا ہے اور اسے کھلایا نہیں جاتا۔ آپ فرمایئے: بلاشبہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے وہ شخص ہو جاؤں جو فرمانبردار ہو، اور آپ ہرگز مشرکین میں سے نہ ہو جایئے ⑭ آپ فرمادیجئے: کہ بیشک میں اگر اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ⑮ اس دن جس سے عذاب ہٹا دیا گیا، سو میرے ربّ نے اس پر رحم فرمایا، اور یہ کھلی ہوئی کامیابی ہے ⑯ اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی تکلیف پہنچادے تو اس تکلیف کا دور کرنے والا اس کے علاوہ کوئی نہیں، اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچادے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے ⑰ اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے، اور وہ حکمت والا ہے، باخبر ہے ⑱

معارف ومنازل

ان آیات میں اوّل تو سردار دو جہان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان مشرکین سے پوچھ لیں کہ بتاؤ جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور زمین میں ہے یہ کس کا ہے؟ یہ سب کس کی مخلوق ہے؟ اور یہ سب کس کی ملکیت ہے؟ اور ان سب میں کس کا تصرف ہے؟ پھر فرمایا کہ آپ خود ہی جواب دے دیں کہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی ہیں، سب اس کے تصرف کے ماتحت ہیں۔

کفار کے جواب کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی جواب دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ جواب مشرکینِ مکہ کے نزدیک بھی مُسَلّم ہے، وہ اگرچہ شرک و بُت پرستی میں مبتلا تھے مگر زمین وآسمان اور کُل کائنات کا مالک وخالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے، جیسے فرمایا: ﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾[لقمان:۲۵] (اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے)۔ پس یہ واضح ہے کہ مشرکین بھی یہی کہتے تھے، اور وقتاً فوقتاً وہ بھی اقرار کرتے تھے کہ تمام کائنات کا مالک وخالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو

واضح فرمایا کہ کائنات کا خالق و مالک اللہ ہی ہے، ساری کائنات مل کر اگر ایک مکھی بنانا چاہے تو یہ اس کے بس میں نہیں، تو اتنے بڑے جہاں کا خالق بغیر کسی دلیل کے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوگا، یہ سارا نظام اسی کا ہے، اور اس نے اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے کہ وہ رحمت فرمائے گا، مؤمنین پر تو اس کی رحمت دنیا اور آخرت دونوں میں ہے۔

اور کفار و مشرکین کے ساتھ بھی دنیا میں ہر طرح رحمت کا معاملہ ہے، کیونکہ دنیا دار العمل ہے، اگر کفار بغاوت اور سرکشی چھوڑ دیں، اور ایمان کی نعمت کو قبول کرلیں، اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی تکذیب سے باز آجائیں، اور تصدیق کرلیں، تو بخوشی وہ بھی آخرت کی رحمتوں کے مستحق اور حقدار ہوں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشاد ہے: ﴿قَالَ عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنۡ أَشَآءُۖ وَرَحۡمَتِي وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٖۚ فَسَأَكۡتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤۡتُونَ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلَّذِينَ هُم بِـَٔايَٰتِنَا يُؤۡمِنُونَ﴾[الأعراف:١٥٦] (اللہ نے فرمایا: اپنا عذاب تو میں اسی پر نازل کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، چنانچہ میں یہ رحمت ان لوگوں کے لئے لکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھیں)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو ایک نوشتہ لکھا جو اس کے پاس عرش پر ہے، اس میں لکھا ہے کہ: ''میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی''۔ [بخاري]

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں، دنیا میں ان میں سے ایک رحمت نازل فرمائی، جو جن اور انسان اور حیوانات اور زہریلے جانوروں میں بٹی ہوئی ہے، اسی ایک رحمت کے ذریعہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر مہربانی کرتے ہیں، اور رحم کرتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ وحشی جانور تک اپنی اولاد پر مہربانی کرتے ہیں، اور ننانوے (٩٩) رحمتیں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے لئے مختص فرمائی ہیں، جن کے ذریعہ قیامت کے دن وہ اپنے فرمانبردار بندوں پر رحم فرمائے گا۔ [بخاري] پھر فرمایا:

﴿لَيَجۡمَعَنَّكُمۡ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلۡقِيَٰمَةِ لَا رَيۡبَ فِيهِۚ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓاْ أَنفُسَهُمۡ فَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ تم سب کو قیامت کے دن ضرور جمع فرمائے گا، جس میں کوئی شک نہیں، جن لوگوں نے اپنے نفسوں کو خسارہ میں ڈالا وہ ایمان نہ لائیں گے۔ دیکھیں! اللہ تعالیٰ نے سب کو اپنی مہربانی سے پیدا فرمایا، وہ سب کی پرورش فرماتا ہے، وہاں کے حساب و کتاب سے اسی دنیا میں باخبر فرمایا، ابھی سے امتحان کے پرچے ان کے ہاتھ میں دے دیئے، اور

سوالات بھی سمجھائے، جوابات بھی سمجھائے، اس کے باوجود سرکش انسانوں نے اپنے اپنے نفسوں کو خسارہ میں ڈال دیا۔ فطرتِ سلیمہ کے خلاف بغاوت پر اتر آئے، عقلِ سلیم کو ناکارہ بنادیا، اور تمام ایمانی اور اصلاحی قوتوں کو ضائع کر دیا۔

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ جو تاجر اصل سرمایہ کو گم کرے گا اسے خاک نفع ملے گا، وہ در بدر اور ہلاک ہو کر جہنم کا ایندھن ہی بنے گا۔ ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾[الزمر:١٥] (یہی ہے واضح نقصان)۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ رات دن میں جتنے ساکن اور آباد ہیں وہ سب اسی کے ہیں، کائنات کا جو حصّہ متحرک ہے وہ اسی کے حکم سے ہے، کس کی مجال ہے کہ وہ چاند و سورج اور ستاروں کی گردش کا انتظام کرے؟ اسی طرح دریاؤں کا جو نظام جاری ہے رات دن وہ بہتے رہتے متحرک ہیں، یہ کونسا ہاتھ ہے کہ ان محیر العقول اجرام کو حرکت دیتا ہے اور چلاتا ہے؟ اسی طرح آسمان جو کہ ساکن غیر متحرک ہے، یہ فلک بوس پہاڑ جو زمین پر گاڑے ہوئے ہیں، یہ جنگلات، درخت، جڑی بوٹیاں جو ساکن ہیں، کون ہے ان کا محافظ؟ اسی طرح متحرک مخلوقات جو زمین پر سکونت پذیر ہیں کون ہے ان کا خالق و منتظم سوائے اللہ تعالیٰ کے؟

سکون کے دو معنی ہوئے: یعنی بسنے اور رہنے کے، اور ٹھہرے ہوئے غیر متحرک کے۔ یہ سب اسی ذات پاک کی مخلوقات ہیں، اور ان سب پر اس کا تصرف اور تدبیر کار فرما ہے۔

غیر اللہ کو ولی بنانا کفر ہے:

﴿قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ جو لوگ مشرک تھے وہ اپنے شرک کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ساتھ اتحاد کریں، اور دعوتِ توحید چھوڑ دیں، اور ہمارے دین میں شامل ہو جائیں۔ (مکمل تفصیل آخری پارہ سورۃ الکٰفرون میں دیکھیں)۔

اور یہ بات کوئی نئی نہیں تھی، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے تھے ان کی امتوں نے بھی یہی بات کہی تھی، جیسے سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا﴾[ابراھیم:١٣] (اور جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ: ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے، ورنہ تمہیں ہمارے دین میں واپس آنا پڑے گا)۔

اللہ ربّ العزّت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ ان سے فرمادیں: کیا اللہ جل شانہ کے سوا کسی کو اپنا ولی بنالوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سب کا خالق و مالک اور داتا ہے، بے نیاز ہے، وہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، اور وہ سب کا روزی رساں ہے، جو ساری خلقت کو کھلاتا ہے، اور اس کو کھلایا نہیں جاتا، وہ ہر قسم کے کھانے پینے سونے سے منزہ اور پاک ہے، وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے، جبکہ ہر چیز اپنے وجود اور بقاء میں اس کی محتاج ہے۔ یہ لوگ کتنے بے عقل اور بے وقوف ہیں جو ایسے لوگوں یا بتوں اصنام اور مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں جو خود مخلوق ہیں؟ اپنے وجود و بقاء کے مالک نہیں، بلکہ خود مملوک ہیں، ایک ادنیٰ شئ کی تخلیق پر قادر نہیں، کھانے پینے اور تحفظ کے محتاج ہیں، نہایت عاجز اور کمزور ہیں، اپنے دفاع پر قدرت نہیں رکھتے، بے جان و بے حرکت مردے ہیں۔

فرمایا: اے مشرکو! تم کتنے بیوقوف ہو؟ اور بیوقوفی پر تمہاری بے وقوفی اور نادانی کا یہ عالم ہے کہ مجھے بھی ایسے بے جان بتوں کی عبادت وولایت کی دعوت دیتے ہو۔ ﴿أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللهِ﴾ [الأنبياء: ٦٧] (تف ہے تم پر، اور ان پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو)۔ افسوس ہے تمہاری نادانی پر کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تم سے بھی زیادہ عاجز ہیں، اور تمہاری طرح مخلوق ہیں، بلکہ تمہارے ہاتھوں کے تراشیدہ اور خراشیدہ ہیں۔ فرمایا:

﴿قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ﴾ آپ فرمادیجئے کہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے ربّ کا سب سے پہلا فرمانبردار اور دل وجان سے اس کے احکام کو ماننے والا اور تعمیل کرنے والا بن جاؤں، اور میرے ربّ نے مجھ سے یہ بھی فرمایا کہ: آپ ہرگز مشرکین میں سے نہ ہوجائیں، لہٰذا میرے لئے یہ ممکن نہیں، بلکہ تمہاری فلاح بھی اسی میں ہے کہ مجھ پر ایمان لاؤ، اور شرک چھوڑ کر توحید کے پرستار بنو۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللهِ تَأْمُرُوٓنِّيٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ [الزمر] (کہہ دو کہ کیا پھر بھی اے جاہلو! تم مجھ سے کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں؟ اور یہ حقیقت ہے کہ تم سے اور تم سے پہلے تمام پیغمبروں سے وحی کے ذریعے یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ اگر تم نے کفر کا ارتکاب کیا تو تمہارا کیا کرایا سب غارت ہوجائے گا، اور سخت نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہوجاؤ گے)۔ سورۃ الزمر میں اس آیت کی تفسیر قابلِ دید ہے۔ ملاحظہ کریں۔

﴿اَوَّلَ مَنۡ اَسۡلَمَ﴾ جوفرمایا، یہ اس اعتبار سے ہے کہ آخری امت کے اوّلین مسلم اور فرمانبردار حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں۔ نیز شریعت پر عمل کرنے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوّل ہیں، اور روزِ ازل میں ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ﴾ کے پہلے جواب دینے والے، اور بَلٰی کہنے والے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ﴾ آپ فرمادیجئے: اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ عظیم عذاب کی صفت نہیں، بلکہ ''یَوۡمٍ'' کی صفت ہے۔ بڑے دن سے قیامت کا دن مراد ہے، جس کا عذاب بڑا تو ہے ہی۔

﴿مَنۡ یُّصۡرَفۡ عَنۡهُ یَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَهٗ﴾ روزِ محشر کا ہولناک عذاب بڑا ہی سخت ہے، جس شخص سے یہ عذاب ٹل گیا تو سمجھئے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہوگئی، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ﴾ [آل عمران: ۱۸۵] (پھر جس کسی کو دوزخ سے دور ہٹالیا گیا، اور جنت میں داخل کردیا گیا، وہ صحیح معنی میں کامیاب ہوگیا)۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِیۡنُ﴾ یہ کھلی ہوئی کامیابی ہے۔ کبھی فرمایا: ﴿ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡكَبِیۡرُ﴾ [البروج: ۱۱] (یہ بڑی کامیابی ہے)۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ﴾ [المائدۃ: ۱۱۹]۔

کامیابی ایک ہی ہے، یعنی جہنم کے عذاب سے نجات اور دخولِ جنت، جو کہ لازم وملزوم ہیں، مگر صفات مختلف ہیں، یا تو عظمتِ شان کی وجہ سے، یا جنتیوں کے مختلف درجات کے لحاظ سے۔

﴿وَاِنۡ یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنۡ یَّمۡسَسۡكَ بِخَیۡرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴾
اے مخاطب! اگر اللہ تعالیٰ (باوجود رحم وکرم کے) تجھے کوئی ضرور دکھ یا تکلیف (جانی مالی، مادی خواہ کسی بھی طرح کی) پہنچادے، تو اسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ کوئی خیر (صحت، مال، اور کوئی بھی فائدہ) پہنچادے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ ﴿فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ﴾ [یونس: ۱۰۷] (اس کے فضل کو کوئی رد کرنے والا نہیں ہے)۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر جو غیر اللہ کے دروازے پر سجدہ ریز ہو، وہ تمہارے لئے تو کیا خود اپنے لئے خیر وشر کی قدرت نہیں رکھتے، خوب غور کرو۔

اسلامی قلعہ کا ایک اہم بنیادی ستون:

یہ اسلام کا نہایت اونچا اور بنیادی عقیدہ ہے، جو کہ اسلامی قلعہ کا اہم ستون کہلاتا ہے کہ ہر نفع ونقصان اور خیر و

شر کا خالق و مالک در حقیقت صرف اللہ تعالیٰ جل شانہ ہی کی ذات پاک ہے، کوئی شخص کسی کو حقیقت کے اعتبار سے نہ ادنیٰ نفع پہنچا سکتا ہے، نہ ادنیٰ نقصان، اور ظاہر میں ماتحت الاسباب جو کسی کے ہاتھ سے نفع یا نقصان پہنچتا نظر آتا ہے وہ صرف ایک ظاہری صورت اور حقیقت کے سامنے ایک نقاب اور پردہ سے زائد کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

کار زلف تست مشک افشانی ما عاشقان ☆ مصلحت را تہمت بر آہوئے چین بستہ اند

مشک خالص کستوری بظاہر اگرچہ چینی آہو کے نافہ سے پیدا ہوتا ہے، مگر یہ خاصیت نافہ میں اللہ ربّ العزّت ہی نے تو ودیعت فرمائی ہے۔ یہ عقیدہ اسلام کے ان انقلابی اور بنیادی عقائد میں سے ہے، جس نے مسلمانوں کو تمام ادیانِ باطلہ سے ممتاز کیا ہوا ہے، اور ان کو ساری مخلوقات سے بے نیاز اور صرف اللہ تعالیٰ عزّ شانہ کا نیاز مند بنایا ہوا ہے۔ اسی عقیدہ نے فقراء و مساکین اور دنیا کے کرّ وفرّ سے بے نیاز لوگوں کی ایک بے مثال جری و بہادر جماعت تیار کر کے پوری دنیا پر انہیں برتری و غلبہ دلایا، جو کسی کے چوکھٹ پر یا کسی سرکردہ شخصیت کے سامنے جھکنے پر تیار نہ ہوئے، اور شب و روز اپنے پروردگار کے حضور سجدہ ریز رہے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ☆ ہزاروں سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سواری پر سوار ہوئے، اور مجھے اپنے پیچھے ردیف بنالیا، کچھ دور چلنے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر درافشانی کرتے ہوئے فرمایا: اے لڑکے! میں نے عرض کیا: حاضر ہوں سن رہا ہوں، کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو اللہ تعالیٰ تم کو یاد رکھے گا، اور تم اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر وقت ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے، تم امن و عافیت اور خوش عیشی کے وقت اللہ تعالیٰ کو پہچانو تو تمہاری مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ تم کو پہچانے گا، جب تم کو سوال کرنا ہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے سوال کرو، اور مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو، جو کچھ دنیا میں ہونے والا ہے قلمِ تقدیر اس کو لکھ چکا ہے، اگر ساری مخلوقات مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نفع پہنچادیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں نہیں رکھا تو وہ ہرگز ایسا نہ کرسکیں گے، اور اگر سب مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نقصان پہنچادیں جو تمہاری قسمت میں نہیں ہے تو ہرگز وہ اس پر قدرت نہ پائیں گے، اگر تم ایسا کر سکتے ہو کہ یقین کے ساتھ صبر پر عمل کرو تو ایسا ضرور کرلو، اگر اس پر قدرت نہیں تو صبر کرو، کیونکہ اپنی خلاف طبع چیزوں پر صبر کرنے میں بڑی خیر و برکت ہے، اور خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کے ساتھ ہے اور مصیبت کے ساتھ راحت اور تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔ [أحمد، ترمذي، معالم التنزيل بسند صحيح]

افسوس ہے کہ قرآن حکیم کے اس واضح اعلان اور سرور عالم ﷺ کی عمر بھر کی تعلیمات کے باوجود یہ امت پھر اس معاملہ میں بھٹکنے لگی ہے، سارے خدائی اختیارات مخلوقات کو بانٹ دیئے۔ پیروں، قبروں، فقیروں اور مزاروں پر رات دن اتنا بڑا مجمع ہر لحہ موجود رہتا ہے، نہ سجدوں کی کمی ہے، نہ نذر لغیر اللہ کی کمی ہے، ہر مزار پر یہی سلسلہ صبح و شام جاری رہتا ہے کہ ہزاروں لوگ مرد وزن مخلوط و بے پردہ قبروں پر طواف کر رہے ہیں۔

شاید کسی مسلمان کو شرح صدر نہ ہو تو وہ خود جا کر مشاہدہ اور نظارہ کرے، تب اسے یقین آئے گا کہ قبروں کی عبادت اور غیر اللہ سے مدد مانگنے کا رواج عروج پر ہے۔ انبیاء علیہم السلام و اولیاء کے توسّل سے دعا مانگنا دوسری بات ہے، وہ جائز ہے، اور سرور عالم ﷺ کی تعلیمات میں اس کے شواہد موجود ہیں، لیکن براہ راست کسی پیغمبر، کسی ولی، کسی پیر وفقیر سے کچھ مانگنا، اور کسی برگزیدہ ہستی سے اپنی حاجت اور مراد طلب کرنا صریح شرک اور قطعاً حرام ہے، اور یہ اسلامی تعلیمات اور کتاب وسنت کے فرمودات سے کھلی بغاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صراط مستقیم پر استقامت نصیب کرے، اور ہر قسم کے کفر و شرک سے بچائے۔ آمین

قرآن کریم کا اعلان ہے: ﴿مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ [فاطر: ۲] (جس رحمت کو اللہ لوگوں کے لئے کھول دے، کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے، اور جسے وہ روک لے تو کوئی نہیں ہے جو اس کے بعد اسے چھڑا سکے)۔ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ سرور کائنات ﷺ اپنی دعاؤں میں اکثر یہ کہا کرتے تھے:

"اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ"۔

اے اللہ تعالیٰ جو آپ نے دیا اس کو کوئی روکنے والا نہیں، اور جو آپ نے روک دیا اس کا کوئی دینے والا نہیں، اور کسی کوشش والے کی کوشش آپ کے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی۔ مطلب یہ ہے سب خیر وشر یا نفع ونقصان یہ صرف اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ جسے چاہے دے، جسے چاہے محروم کردے۔

﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہی اپنے سب بندوں پر غالب وقادر ہے، اور سب اس کے تصرف وقدرتِ کاملہ کے ماتحت اور محتاج ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انسان خواہ مقرب اولو العزم پیغمبر ہو یا دنیا کے بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، اپنے ہر ارادہ اور مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا، اور اس کی ہر مراد پوری نہیں ہوتی، وہ حکیم بھی ہے کہ اس کے تمام افعال ہزاروں حکمتوں پر مبنی ہیں، اور ہر ہر ذرّہ اور ہر چیز پر

اس کا علم محیط بھی ہے۔ اس میں لفظ "قاھر" سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا، اور لفظ "حکیم" سے اس کے علمِ محیط کا بیان کر کے بتلا دیا کہ تمام صفاتِ کمال علم وقدرت میں منحصر ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان دونوں میں واحد و یکتا ہے۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ۟ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا
الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ
اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۟﴿۱۹﴾ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ: گواہی کے لئے سب سے بڑھ کر کونسی چیز ہے؟ آپ فرمادیجئے کہ: میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ گواہ ہے، اور میری طرف یہ قرآن وحی کے ذریعہ بھیجا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ تمہیں اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے اسے ڈراؤں، کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود ہیں؟ آپ فرمادیجئے کہ: میں تو ایسی گواہی نہیں دیتا، آپ فرمادیجئے کہ: صرف وہی ایک معبود ہے، اور بلاشبہ میں اُن سے بیزار ہوں جن کو تم شریک بناتے ہو ﴿۱۹﴾ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ رسول کو پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، جن لوگوں نے اپنی جانوں کو ضائع کر دیا سو وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۲۰﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ کی گواہی سب سے بڑی گواہی ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نحام بن زید قروم بن کعب اور بحری بن عمرو (مشرکین) سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، اور کہنے لگے: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو معبود جانتے ہو؟ اسی طرح کفار کے وفد نے یہ بھی کہا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ جو رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر آپ کا گواہ کون ہے؟ اس پر یہ آیت اتری۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) میں اسی کو لے کر بھیجا گیا ہوں، اور اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت شریفہ:

﴿قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً﴾ نازل فرمائی۔ [لباب النقول] کہ آپ فرما دیجئے کہ: اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے، اس سے بڑھ کر کسی کی گواہی نہیں، اس نے مجھے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی دعوت دینے کا حکم فرمایا ہے، میں اس کی دعوت پر قائم ہوں، اور اسی کا پابند ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو معجزات اور آیات عطا فرمائے تھے ان سے آپ کے رسولِ برحق ہونے کی تصدیق ہوتی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعثت اور رسول ہونے کی گواہی ہے۔ مزید فرمایا:

﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾ اور میری طرف یہ قرآن وحی کے ذریعہ اتارا گیا، تاکہ میں تمہیں اس کے ذریعہ ڈراؤں کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے علاوہ اگر دوسرا راستہ اختیار کرو گے تو عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، تمہارے علاوہ اور جس جس کے پاس یہ قرآن پہنچے ان سب کو میں توحید کی دعوت دیتا ہوں، اس میں اس بات کا بھی اعلان ہے کہ سید الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف اپنے زمانہ کے مخالفین ہی کی طرف مبعوث نہیں تھے، بلکہ تا قیامت جس جس شخص کو آپ کی بعثت کا علم ہوتا ہے، اور قرآن پہنچتا رہے گا وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت توحید کے مخاطب ہیں، اور قیامت تک سب آنے والوں پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق اور اقرار فرض ہے۔

سورۂ سبا میں ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [سبأ:۲۸] (اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے پیغامبر بنا کر بھیجا ہے، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یَهُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ"۔ [مسلم]

یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، اس امت میں سے جس کسی کو میرے نبی ہونے کی خبر پہنچے گی، اور وہ اس دین پر ایمان لائے بغیر مر جائے گا جو دین لے کر میں بھیجا گیا ہوں تو وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہوگا، وہ یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ پھر فرمایا:

﴿اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی﴾ کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور بھی معبود ہیں؟ اس کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ لَّآ اَشْهَدُ﴾ آپ فرمائیے: میں اس بات کی گواہی نہیں دیتا، بلکہ میں یہ گواہی دیتا ہوں:

﴿قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾ آپ فرما دیجئے کہ: معبود تو صرف ایک ہی ہے، اور بلاشبہ میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں، یہی برأت عن الشرک وعن جمیع المشرکین سارے انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم نے وضاحت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، جیسے توریت اور انجیل، وہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانتے ہیں، کیونکہ توریت اور انجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اوصاف اور فضائل، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض اصحاب کے حالات بھی مذکور ہیں، جو صفات وعلامات آپ کے بارے میں بتائی گئی تھیں انہیں وہ دیکھ چکے ہیں، مگر ضد وحسد اور بغض کی وجہ سے باوجود پہچاننے کے منکر ہو رہے ہیں، اور اپنی جانوں کو خسارہ میں ڈال رہے ہیں، اور ایمان کی نعمت سے محروم ہو رہے ہیں۔

❁ ❁ ❁

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ
جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْٓا اَیْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ
اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ
وَاِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْكَ یُجَادِلُوْنَكَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ
اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۲۵﴾ وَهُمْ یَنْهَوْنَ عَنْهُ وَیَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ یُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھے؟ س کی آیتوں کو جھٹلائے؟ بیشک بات یہ ہے کہ ظلم کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے ﴿۲۱﴾ اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے پھر ان لوگوں سے ہم کہیں گے جنہوں نے شرک کیا: کہاں ہیں تمہارے شریک جن کے بارے میں تم دعویٰ کیا کرتے تھے؟ ﴿۲۲﴾ پھر نہ ہوگا ان کا فریب اس کے سوا کہ وہ کہیں گے: قسم اللہ تعالیٰ کی جو ہمارا ربّ ہے ہم شرک کرنے والے نہ تھے ﴿۲۳﴾ دیکھو! کیسا جھوٹ بولا اپنی جانوں پر، اور وہ سب کچھ غائب ہوا جو وہ جھوٹ بنایا کرتے تھے ﴿۲۴﴾ اور ان میں بعض وہ ہیں جو آپ

کی طرف کان لگاتے ہیں، اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اس کو سمجھیں، اور ان کے کانوں پر بھاری پن کر دیا ہے، اور اگر یہ لوگ ہر طرح کی نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑا کرتے ہیں، جنہوں نے کفر کیا وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ پچھلوں کی لکھی ہوئی باتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ﴿۲۵﴾ اور وہ لوگ اس سے منع کرتے ہیں، اور اس سے دور ہوتے ہیں، اور وہ نہیں ہلاک کرتے، مگر اپنی ہی جانوں کو اور سمجھتے نہیں ہیں ﴿۲۶﴾

معارف ومنازل

مشرکین عرب اور یہود ونصاریٰ یہ سارے جھوٹے اور ظالم تھے، آیت بالا میں ان کی تردید اور افتراء پر نکیر ہے۔ فرمایا: اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا؟ یا اس کی آیات کو جھٹلایا، بلاشبہ ظالم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ عرب طرح طرح سے اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر جھوٹ باندھتے تھے، یہود اور نصاریٰ یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں، سوائے چند روز کے ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ اور عزیر اور مسیح علیہما السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

مشرکین عرب کہتے تھے کہ بت اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان کی عبادت کا حکم دیا ہے، اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور سائبہ وغیرہ کو ہمارے اوپر حرام کیا ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ تمام غلط عقائد اور غلط اعمال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے افتراء اور جھوٹ باندھتے، یہ بڑے سے بڑے ظالم قرار پائے، جنہوں نے کفر بالائے کفر کا ارتکاب کیا، جنہیں کبھی فلاح نصیب نہیں ہوگی، اور عذابِ الٰہی سے کبھی خلاصی نہیں پائیں گے۔ پھر آخرت کا منظر یہ ہوگا:

﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾

فرمایا: قیامت کے دن ان ظالموں کو اپنی امیدوں کے خلاف ایسی دردانگیز حسرتیں دیکھنی پڑیں گی جو بیان سے باہر ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ عابدوں اور معبودوں کو میدانِ محشر میں جمع کریں گے، پھر مشرکین سے بطورِ توبیخ وسرزنش یہ کہیں گے کہ: تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کے متعلق تم یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ وہ خدا کے شریک ہیں اور معبود ہیں؟ جن کو تم اپنا کارساز اور مددگار سمجھتے تھے؟ آج ایسی سخت مصیبت کے وقت تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر کہاں چلے

گئے؟ تم انہیں بلاؤ، حاضر کرو، تاکہ تمہارے لئے کوئی سفارش کریں، دنیا میں تم تو بڑے فخر سے کہتے تھے: ﴿هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ﴾ [یونس:۱۸] (یہ بت ہمارے لئے سفارش کرنے والے ہیں اللہ کے یہاں) لٰہذا انہیں بلاؤ۔

یہ سن کروہ اپنے کفروشرک سے منکر ہوجائیں گے، اور عذرو بہانہ کرکے یہ کہیں گے:

﴿وَاللهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی قسم ہم تو شرک کرنے والے نہ تھے۔ جب مؤمنین اور اہلِ توحید کے لئے نجات وراحت دیکھیں گے، اور اپنے لئے عذاب وہلاکت کا مشاہدہ کریں گے، تو جھوٹ بول کر عذاب سے بچنے کی خاطر یہ کہیں گے کہ: ہم نے دنیا میں کوئی شرک کیا ہی نہیں۔ اس طرح وہ اپنے محبوب وپسندیدہ معبودوں سے بیزاری کا اعلان کریں گے، جو کہ نفع مند نہ ہوگا۔ تو فرمایا:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ﴾ دیکھو! اپنی جانوں پر کیسا سفید جھوٹ بولا، اور دیکھو تو سہی کہ وہ جھوٹ اور خود ساختہ معبودان سے کیسے غائب ہوئے، اور انہیں کام نہ آئے۔

قیامت کے دن مشرکین کے اقوال مختلف اوقات میں مختلف ہوں گے۔ اوّل تو صاف صریح جھوٹ بولیں گے کہ ہم مشرک نہ تھے، کہ شاید اسی جھوٹ سے کام چل جائے۔ پھر جب ان کے خلاف گواہیوں کا سلسلہ شروع ہوگا اور خود ان کے اعضاء بھی ان کے خلاف گواہی دیں گے تو لامحالہ وہ اپنے جرم کا اقرار کرلیں گے: ﴿فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ﴾ [الغافر:۱۱] (اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، تو کیا نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟)۔

آنے والی آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ ابوسفیان، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث، عتبہ، اور شیبہ پسران ربیعہ، حارث بن عامر، اُبی بن خلف اور اُمیّہ بن خلف سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جمع ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے، ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن سنا، پھر سب نے نضر بن حارث سے پوچھا کہ: اے ابوقتیلہ! کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا کہتا ہے؟ نضر بن حارث نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ کیا کہتا ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی زبان کو ہلاتے ہیں، اور گزشتہ لوگوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں، جیسے میں تمہیں گزشتہ لوگوں (یعنی رستم اور اسفندیار اور اہل فارس) کے قصے سناتا ہوں۔

ابوسفیان نے کہا میرے خیال میں اس کی بعض باتیں سچی معلوم ہوتی ہیں، ابوجہل نے کہا ہرگز نہیں، تو اس کی کسی بات کے سچا ہونے کا اقرار نہ کرو، ہمیں مرنا قبول ہے مگر اس پر ایمان لانا قبول نہیں، اس پر اللہ تعالیٰ جل جلالہ

نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [روح المعاني مظهري وغيره] فرمایا:

﴿وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ‌ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا‌ ؕ وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا‌ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ﴾ اوران میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی تلاوت کی طرف کان لگاتے ہیں، اور سنتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اگر چہ آپ کا قرآن سنتے ہیں، جس کے دلائل اعجاز اور اسرار بلاغت آفتاب کی طرح روشن ہیں، مگر ان کے قلوب چونکہ عناد سے لبریز ہیں، اس لئے قرآن کا سننا ان کو سودمند نہیں ہوتا، اوران کے اسی عناد اور سرکشی کی وجہ سے ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، تاکہ وہ اس کو سمجھ نہ سکیں، اوران کے کانوں پر ڈاٹ لگادی ہے۔

اور اس محرومی کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کان لگاتے ہیں تو سننے اور سمجھنے کے لئے نہیں لگاتے، بلکہ بطور تمسخر اور استہزاء کے کان لگاتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ اگر یہ ساری نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے، کیونکہ یہ ضد پر قائم ہیں، اور ہٹ دھرمی پر کمر بستہ ہیں، یہاں تک کہ جب یہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے جھگڑتے ہیں، قرآن حکیم جو کتاب مبین ہے دلائلِ اعجاز اور اسرارِ بلاغت وغیرہ سے بھری ہوئی ہے، فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ مرتبہ کو پہنچی ہوئی ہے، مگر یہ اندھے اور بہرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں، جیسے ہم رستم و اسفند یار کے قصے بیان کرتے رہتے ہیں، اسی طرح یہ عاد و ثمود، فرعون وہامان کے واقعات بیان کرتا رہتا ہے۔

﴿وَهُمۡ يَنۡهَوۡنَ عَنۡهُ وَيَنۡـَٔوۡنَ عَنۡهُ﴾ یہ لوگ قرآن کے سننے اور اس پر عمل کرنے سے لوگوں کو روکتے اور منع کرتے ہیں، اور خود بھی دور ہوتے ہیں۔ یعنی خود بھی گمراہ ہیں، اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، یہ دُہرے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ایذاء پہنچانے والوں کو روکتے ہیں، اور آپ ﷺ تک پہنچنے نہیں دیتے ہیں، اور آپ ﷺ کی دعوت توحید سے دور رہ کر کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں۔ اگر یہ معنی مراد ہوں تو اس سے آپ ﷺ کے چچا ابو طالب اور دوسرے اقرباء مراد ہیں، ان کو ہرگز گوارا نہ تھا کہ مشرکین آپ ﷺ کو تکلیف پہنچائیں، مگر آپ ﷺ کے دین کے قبول کرنے سے وہ خود دور ہے، اور اسلام نہیں قبول کیا۔ [معالم بغوي وابن كثير]

ابن ابی حاتم نے سعید بن ابی ہلال کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آیت کا نزول سرور عالم ﷺ کے

پچپیروں کے حق میں ہوا، جن کی تعداد دس تھی، علیٰ الاعلان تو وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاون وساتھی تھے، لیکن اندرونی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سخت مخالف تھے، لوگوں کو ایذاء دینے سے روکتے تھے، مگر اتباعِ رسول اور ایمان لانے سے خود دور رہتے تھے۔ [مظهري]

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝۲۷ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا یُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۝۲۸ وَقَالُوْۤا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ۝۲۹ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝۳۰

ترجمہ: اور آپ اگر اس وقت دیکھیں جب وہ کھڑے کئے جائیں گے دوزخ پر تو کہیں گے: ہائے ہماری بربادی! کاش ہم واپس کردیئے جاتے، اور اپنے ربّ کی آیات کو نہ جھٹلاتے۔ اور ہم ایمان والوں میں سے ہوجاتے!۝۲۷ بلکہ بات یہ ہے کہ وہ جس چیز کو اس سے پہلے چھپایا کرتے تھے وہ ظاہر ہوگئی، اور اگر وہ واپس کردیئے جائیں تب بھی وہ کام کریں گے جس سے وہ منع کئے گئے، اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں۝۲۸ اور انہوں نے کہا: بس یہی ہے ہماری دنیا والی زندگی، اور ہم نہیں ہیں اٹھائے جانے والے۝۲۹ اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جب وہ کھڑے کئے جائیں گے اپنے ربّ کے حضور ربّ تعالیٰ شانہ کا سوال ہوگا: کیا یہ حق نہیں ہے؟ جواب میں کہیں گے کہ: ہاں! ہمارے ربّ کی قسم یہ حق ہے۔ ربّ تعالیٰ شانہ فرمائیں گے کہ: چکھو لو عذاب، اس وجہ سے کہ تم کفر کرتے تھے۝۳۰

معارف ومنازل

انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اس دنیا میں جو کچھ اچھا یا برا کررہا ہے اسے مکافاتِ عمل سے غافل نہیں ہونا چاہئے، اس کو اس کے عمل کا نتیجہ ہر حال مل کر رہے گا، جس طرح انسان کو اپنے وجود اور ہستی پر یقین ہے اسی طرح اسے جزائے عمل پر بھی یقین ہونا چاہئے، کہ جس خالقِ کائنات سبحانہ نے انسان کو اس دنیا میں اپنے احکام دے کر بھیجا ہے، اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ سبحانہ اسے اگلے جہاں میں بھی اپنے حضور کھڑا کرے گا، اور اس کے اعمال کی باز پرس ہوگی، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ روزِ محشر کا جو منظر ہوگا وہ اس طرح ہوگا کہ: اگر آپ ان نافرمانوں کا وہ حال دیکھیں جب وہ دوزخ پر کھڑے کئے جائیں گے، تو لرَئَیتَ اَمراً عَظِیماً۔ یہ جوابِ شرط محذوف ہے، وہ منظر قابلِ دید اور نہایت تباہ کن ہو گا۔ جب کفار اس تباہ کن منظر کا مشاہدہ کریں گے، اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ ہم دوزخ میں ہمیشہ گرنے والے ہیں، تو حسرت وافسوس کے ساتھ کہیں گے کہ: کاش! ہم دنیا میں واپس کئے جاتے، اور اب کی بار وہاں جا کر اپنے ربّ کی آیتوں کو نہ جھٹلاتے، اور خوب اچھے اعمال انجام دیتے۔ آپ جب یہ دیکھیں گے تو عجیب منظر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ وہ ایمان کی رغبت اور محبت کی وجہ سے دنیا میں واپس جانے کی آرزو کر رہے ہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ جو کچھ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے تھے، یعنی کفر اب اس کا نتیجہ سامنے آگیا، وہ دنیا میں واپس جانے کی آرزو اس لئے کر رہے ہیں کہ عذابِ جہنم سے خلاصی ہو جائے۔

اس وقت ان سے یہ کہا جائے گا کہ: اس وقت تمہارا تمنا کرنا کوئی مفید نہیں ہے، اب تم اپنے گناہوں اور کفر وشرک کی سزا کے لئے تیار رہو تمہاری دنیوی زندگی عمل وایمان کی زندگی تھی، اُس وقت کا ایمان اور عمل تمہیں آج کام آسکتا تھا، اب تمہاری خواہش پوری نہیں ہوسکتی، چنانچہ انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دنیا کی زندگی اور لمبی عمر ایک ہی دفعہ ہم نے دی تھی، وہ دور ختم ہو چکا، اب دوبارہ واپسی کا کوئی قانون نہیں، لہٰذا اپنے کئے کی سزا بھگتو۔ (مزید تفصیل سورۂ ابراہیم میں دیکھیں)۔

﴿وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ﴾ الخ۔ اگر بالفرض انہیں دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے، تو پھر وہی کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے، اور یہ لوگ اپنی اس بات میں جھوٹے ہیں کہ ہم ایمان لائیں گے، اور آیات کی تکذیب نہیں کریں گے۔

﴿وَقَالُوا إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا﴾ اور یہ لوگ یہ کہتے تھے کہ ہمارے لئے صرف اسی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد کچھ نہ ہوگا، مرنے اور گل سڑنے کے بعد ہمیں کون زندہ کرے گا؟ اور کون حساب وکتاب کرے گا؟ آج تک ہم نے کسی ایک مردہ کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا، تو اس پورے جہاں کے اگلے پچھلوں کو کون اور کیسے کوئی یکبارگی زندہ کرے گا؟ یہ سب دھوکہ اور ڈھکوسلے ہیں کہ قیامت برپا ہوگی، اور سب مردے زندہ ہو جائیں گے، یہ ہوگا وہ ہوگا۔

﴿وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ﴾ جب تو دیکھے اس حالت کو جب انہیں اپنے ربّ کے حضور کھڑا کیا جائے گا، تو اس وقت ان جھٹلانے والوں کی کیا حالت ہوگی؟

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اپنے سامنے کھڑا کر کے اللہ تعالیٰ ہر شخص سے براہِ راست باز پرس فرمائے گا، درمیان میں کوئی ترجمان بھی نہیں ہوگا، اور کوئی بھی شخص کسی کا وکیل نہ ہوگا، اور ہر سوال کا جواب خود ہی دینا پڑے گا۔ سورۂ نحل میں ہے: ﴿یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا﴾ [النحل] (جس دن ہر شخص اپنے دفاع کی باتیں کرتا ہوا آئے گا)۔ ہر جان کو اپنی طرف سے خود ہی جوابدہی کرنا ہوگی، اس دنیا کی طرح کسی وکیل یا بیرسٹر صاحب کی خدمات حاصل نہیں ہوں گی، جو مجرموں کی طرف سے جواب دعویٰ داخل کرے گا۔

﴿قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ﴾ پس اللہ تعالیٰ مشرکین اور کفار سے پوچھیں گے: کیا یہ حق نہیں ہے؟ کیا معاد اور بعث بعد الموت جس کے تم منکر تھے واقع نہیں ہوا؟ اب جب کہ تم اپنے ربّ کے روبرو کھڑے ہو، اب بتاؤ میرے پیغمبروں علیہم السّلام نے جو تمہیں بتایا تھا، کیا وہ سچے نہ تھے؟ اس وقت جھٹلانے والے کہیں گے:

﴿قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا﴾ ہمارے پروردگار کی قسم یہ تو بالکل برحق ہے، ہم نے غلطی کی، اور ہم دھوکے میں رہے، بدنصیب ہوئے۔ ارشاد ہوگا کہ اب اپنے کفر کا مزہ چکھو۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا
عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَمَا
الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ خسارہ میں پڑ گئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو جھٹلایا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس اچانک قیامت آجائے گی تو کہیں گے: ہائے ہماری حسرت! اس پر جو ہم نے دنیا میں کوتاہی کی، اور وہ اپنے بوجھوں کو اپنی کمروں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ خبردار! بُرا ہے وہ بوجھ جسے وہ اٹھا رہے ہوں گے ﴿۳۱﴾ اور نہیں ہے دنیا والی زندگی مگر ایک لعب اور لہو (کھیل تماشہ) اور البتہ آخرت والا گھر ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں، کیا تم سمجھتے نہیں ہو ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اول تو یہ فرمایا کہ جن اشقیاء نے اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ملاقات کو جھٹلایا، یعنی قیامت کے دن کا انکار کیا، وہ خسارہ میں پڑ گئے، اور انہوں نے اپنا نقصان کیا، اور نقصان بھی کیسا؟ دنیا میں کبھی کاروبار میں کچھ مال ہی کا نقصان ہو جاتا ہے اس کی تلافی نہایت آسان ہوتی ہے، جبکہ آخرت کا نقصان جانوں کا ہوتا ہے، جس کی تلافی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

اور پھر یہ نقصان کسی خاص وقت کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ ابدی اور دائمی ہوتا ہے، جن لوگوں نے حق کی تکذیب کی اور پوری زندگی اس پر جمے رہے، یہاں تک کہ جب اچانک قیامت آجائے گی تو کہیں گے: کتنی بڑی حسرت کی چیز ہے جو ہم نے دنیا میں تقصیر اور کوتاہی کی۔ دنیا کو سب کچھ سمجھا، اور اسی کو اپنی منزل قرار دے کر آخرت سے غافل اور منکر رہے۔ اس وقت یہ لوگ اپنے کفر وشرک اور معاصی کے بوجھ اپنے اوپر لادے ہوئے ہوں گے، پس ظاہر ہے کہ کفر وشرک کے بوجھ سے بڑھ کر کوئی بُرا اور بڑا بوجھ نہ ہوگا، اس لئے فرمایا: خبردار! خوب سمجھ لیں کہ جو بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں وہ بہت خطرناک بوجھ ہے جو ان کے ابدی عذاب اور تباہی کا سبب بن رہا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ﴾ دنیا والی زندگی محض لعب ولہو اور باطل وفانی ہے، نہ اس سے حقیقی حاجت (ابدی سعادت) پوری ہو سکتی ہے، نہ اس کو اور اس کی لذتوں کو بقاء ہے، یہ بچوں والا کھیل اور تماشہ کی مانند ہے۔

دلا تا کے درین کاخ مجازی ☆ کنی مانند طفلان خاکبازی

بچے مٹی پر اور پتھروں، درختوں پر کھلونا بناتے، گارے پر مکان تعمیر کرتے ہیں، تھوڑی دیر بعد اپنے ہی ہاتھوں سے انہیں خراب کر کے گھروں کو جاتے ہیں، یہی حال دنیا کا ہے۔ جہاں بڑے بڑے حکمران آئے، عالمگیر بادشاہ آئے، آج ان کے فلک بوس بنگلے اور محلات ویرانی اور تباہی کا منظر پیش کر رہے ہیں، ان کے مقبروں پر کتے گدھے اور کوے تیر رہے ہیں، جہاں ابدی دوزخ کی آگ جل رہی ہوتی ہے۔ البتہ اگر اسی دنیوی زندگی کو آخرت کی فلاح وکامیابی پر لگایا گیا تو پھر خسارہ کے بجائے فوز وفلاح کا دور دورہ ہوگا، اور ایسے مؤمن متقیوں سے کہا جائے گا: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ [الحاقة: ٢٤] یعنی کھاؤ پیو بڑے مزے کے ساتھ بہ سبب اس کے کہ تم نے زندگی کے ایام میں نیک اعمال کمائے، اور دنیا پر مغرور نہ ہوئے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۳۳
وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ
لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳۴ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ
اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۳۵ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۭ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝۳۶
وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۷

ترجمہ: ہم جانتے ہیں کہ بیشک آپ کو ان کی باتیں رنجیدہ کرتی ہیں، سو یہ یقینی بات ہے وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے، اور لیکن ظلم کرنے والے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ۝۳۳ اور بلاشبہ آپ سے پہلے رسولوں کو جھٹلایا گیا، سو انہوں نے جھٹلائے جانے پر اور ایذائیں پہنچنے پر صبر کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی، اور اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور البتہ پیغمبروں کی بعض خبریں آپ کے پاس پہنچ چکی ہیں ۝۳۴ اور اگر آپ کو ان کا اعراض کرنا گراں گزر رہا ہے تو اگر آپ سے ہو سکے تو آپ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ تلاش کر لیں، پھر آپ ان کے پاس معجزہ لے آئیں، تو آپ ایسا کر لیجئے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا، لہٰذا آپ نادانوں میں سے نہ ہو جایئے ۝۳۵ بات کو وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں، اور مردوں کو اللہ تعالیٰ زندہ فرمائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۝۳۶ اور انہوں نے کہا کہ اس کے ربّ کی طرف سے اس پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ آپ فرمادیجئے کہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ نشانی نازل فرمائے، لیکن ان میں سے بہت سے لوگ نہیں جانتے ۝۳۷

معارف ومنازل

ایک دن اخنس بن شریق مشرک کی ابوجہل بن ہشام سے ملاقات ہوگئی، اخنس نے ابوجہل سے کہا کہ اس وقت یہاں تیرے اور میرے سوا کوئی نہیں، تو مجھے سچی بات بتادے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دعوے میں سچے ہیں یا جھوٹے؟ ابوجہل نے کہا: اللہ کی قسم! اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے دعوے میں سچے ہیں، انہوں نے پوری زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، لیکن ہمارے جھٹلانے کی وجہ یہ ہے کہ جب بنو قصی (یہ سرور عالم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاندان ہے، اسی قصی بن کلاب نے تعمیر کعبۃ اللہ کی قیادت کی اور اسے بنایا) کے پاس علمبرداری بھی چلی جائے، اور سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت) بھی چلی جائے، اور کعبہ شریف کی کلید برادری بھی چلی جائے، اور مجلس شوریٰ کی سرداری بھی انہی کو پہنچ جائے، اور نبی بھی ان ہی میں سے ہو جائے، تو باقی قریش کے لئے کیا بچے گا؟

اور بعض روایات میں ہے کہ ابو جہل نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ: ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمت نہیں لگاتے، اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلاتے ہیں، ہم تو اس چیز کو جھٹلاتے ہیں جس کی دعوت لے کر آپ تشریف لائے۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا کہ ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت میں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوے کے سچے ہونے میں کوئی شک نہیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچا کہتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امین سمجھتے ہیں، چنانچہ ابو جہل اور دیگر کفار قریش آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت و امانت، شرافت اور نیک نیتی کے مداح تھے، اور بسا اوقات آپ کی صداقت و شرافت پر فخر بھی کرتے دیکھے گئے، مگر اپنی سیادت و سرداری قائم رکھنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے۔

اور بعض دفعہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچا اور امین سمجھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھوٹا نہیں کہتے، بلکہ وحی الٰہی کا جو پروگرام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں وہ جھوٹا ہے، اور ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ تو مشرکین کی ضد و عناد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالی صفات کے ساتھ نہ تھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اور پیغامِ توحید کی مخالفت پر وہ کمر بستہ رہتے تھے۔

اس کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا﴾ بلاشبہ آپ سے پہلے رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے، انہوں نے مخالفین کی تکذیب اور ایذاء رسانی پر صبر کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آ گئی۔

اس میں دو باتیں ہیں: اوّل تو یہ کہ ان لوگوں کا جھٹلانا اور دکھ اور تکلیف دینا کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کے ساتھ بھی ایسا ہوا، یہ دنیا والے اشقیاء نے کبھی بھی کسی پیغمبر کی آمد پر ان کا استقبال اور خیر مقدم نہیں کیا۔ سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ [یٰس: ۳۰] (افسوس ہے ایسے بندوں کے حال پر، ان کے پاس کوئی رسول ایسا نہیں آیا جس کا وہ مذاق نہ اڑاتے رہے ہوں)۔

پس انبیاء علیہم السلام نے صبر کیا، تو آپ بھی صبر کریں، جیسے سورۂ احقاف میں فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ﴾[الأحقاف:٣٥] (پس تم اسی طرح صبر کئے جاؤ، جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ہے، اوران کے معاملے میں جلدی نہ کرو)۔ دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کے پاس ہماری مدد آ گئی، ان شاء اللہ آپ کے پاس بھی ہماری مدد آ جائے گی۔ الحمد للہ یہ وعدہ بخیر وخوشی پورا ہوا۔

﴿وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اس کی تفسیر اور ربط بیان کرتے ہوئے صاحب معالم التنزیلؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [الغافر: ٥١] (ہم ضرور اپنے رسولوں کی مدد کرتے ہیں، اور جنہوں نے ایمان لایا ہے)۔ اسی طرح: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾۔[الصافات: ١٧١] (اور ہم پہلے ہی اپنے پیغمبر بندوں کے بارے میں یہ بات طے کر چکے ہیں۔ کہ یقینی طور پر ان کی مدد کی جائے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لشکر کے لوگ ہی غالب رہتے ہیں)۔

اسی طرح فرمایا: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ﴾ [المجادلة: ٢١] (اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب آئیں گے)۔ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا، فیصلہ فرمایا کہ میں ضرور بہر صورت غالب ہوں گا، اور میرے رسول علیہم السلام بھی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ سارے رسولوں علیہم السلام کے بارے میں ہے، جیسے انبیاء سابقین علیہم السلام کی مدد ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی مدد ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے کلمات، یعنی اس کے فیصلے اور وعدوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَّبَإِي الْمُرْسَلِيْنَ﴾ اور البتہ آپ کے پاس پیغمبروں کی بعض خبریں آ چکی ہیں۔ یعنی انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات آپ کو معلوم ہیں، اُن کی امتوں نے ان کے ساتھ دشمنی اور ایذاء رسانی کا معاملہ کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی، اور ظالمین اور معاندین ہلاک اور برباد ہوئے۔ آپ بھی انبیاء علیہم السلام کی طرح صبر کریں، اور اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا انتظار کریں۔

﴿وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ﴾ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی بہت زیادہ حرص تھی کہ میری ساری قوم اسلام قبول کر لے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی چاہتے تھے، اور تمام لوگوں کے ایمان پر حریص اور فکر مند رہتے تھے، جیسے ارشاد: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾[الشعراء: ٣] (شاید تم اس غم میں اپنی جان ہلاک کئے

جار ہے ہو کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے)۔مگر لوگ ایمان قبول نہیں کرتے ،اور عناد وسرکشی کی بنیاد پر طرح طرح کے معجزات کی فرمائش کرتے تھے، کہ یہ معجزہ دکھاؤ، یہ کام کر کے دکھاؤ۔

پھر آپ ﷺ کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی فرمائش کے مطابق معجزات ظاہر ہوجائیں، تاکہ لوگ بکثرت مسلمان ہوجائیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی فرمائش پوری نہ کی جاتی تھی، کیونکہ خود قرآن کریم ان کے پاس بہت بڑا معجزہ موجود تھا، اور دوسرے بھی کئی معجزات وقتاً فوقتاً ان کے سامنے آتے رہتے تھے،لیکن وہ یہ کہتے رہتے تھے کہ اگر فلاں معجزہ ظاہر ہوا تو ہم ایمان لائیں گے، جب فرمائشی معجزات کا ظہور نہ ہوتا تھا تو سرور عالم ﷺ کبیدہ خاطر اور پریشان ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے آپ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: اگر آپ کو ان کفار کا اعراض کرنا ناگوار گزرتا ہے تو اگر آپ سے ہو سکے تو آپ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان تک جانے کی کوئی سیڑھی تلاش کرلیں، پھر آپ کسی ذریعہ سے ان کے پاس معجزہ لے آئیں، تو آپ ایسا کرلیجئے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ زمین میں نیچے اُتر کر، یا آسمان کے اوپر چڑھ کر ان کا فرمائشی معجزہ لا سکتے ہیں تو ایسا کرلیجئے، ان کی فرمائش کے مطابق معجزہ پیدا کرنا لازم نہیں ہے، آپ کو اگر اصرار ہے تو آپ خود ہی فرمائشی معجزہ دکھا دیجئے،لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے آپ صبر ہی سے کام لے لیں، اور تکوینی طور پر سب کو مسلمان ہونا بھی نہیں۔

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست ☆ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

اس لئے اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ سب لوگ مسلمان ہوجائیں۔

﴿وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع فرما دیتا، مگر اس کی مشیت اس کے برعکس ہے۔

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ پس تو آپ نادانوں میں سے نہ ہوجایئے، اسی رضا بالقدر والقضاء کو اپنی زندگی کا وظیفہ بنایئے۔ پھر فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ﴾ حق وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو قبول کرنے کے ارادہ سے سنتے ہیں۔

﴿وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ﴾ اور مردہ لوگ یعنی کافر جو سنتے ہی نہیں وہ قبول کیا کریں گے، وہ قیامت کے دن جب اٹھائے جائیں گے تب وہ سب سے زیادہ سننے والے بن جائیں گے، جیسے ارشاد ہے: ﴿اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا﴾ [مریم:۳۸] (کتنے سننے والے اور دیکھنے والے بن جائیں گے جس دن ہمارے پاس آئیں گے)۔ جب دیکھنا اور سننا پھر قبول کرنا مفید تھا، یعنی دنیوی زندگی میں تو یہ کافر اندھے اور بہرے بنے ہوئے تھے، اور قیامت کے دن جب سننا اور دیکھنا کچھ فائدہ نہ دے گا وہاں ان کی آنکھیں اور کان خوب کھل جائیں گے، اس وقت وہ باتیں سنیں گے، اور وہ کچھ دیکھیں گے جن سے جگر پھٹ جائیں، اور وہ منظر دیکھیں گے جس سے چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔ نعوذ باللہ منہ

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اور ان لوگوں نے کہا کہ کیوں نہیں اتاری گئی نشانی ان کے ربّ کی طرف سے، آپ فرما دیجئے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تمہاری مطلوبہ فرمائشی نشانی نازل فرمائے، لیکن ان میں سے بہت سے لوگ نہیں جانتے، اگر جانتے ہوتے تو معجزات اور نشانیوں کا مطالبہ اور فرمائش نہ کرتے، کیونکہ معجزہ ظاہر ہونے کے بعد جب وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، اور فرمائشی معجزہ کی تکذیب اور مخالفت کریں گے، تو قانونِ الٰہی کی زد میں آ کر ملیا میٹ اور تباہ ہو جائیں گے۔

قوم ثمود نے بھی یہی جسارت کی تھی جس کے نتیجے میں ہمیشہ کے لئے ہلاک ہوئے، جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو معجزہ اتارنے میں اس کی قدرت کے سامنے اس کی یہی حکمت ہے کہ وہ لوگ فوراً ہلاکت سے بچ جائیں، تاخیر معجزہ کی یہی حکمت اور مصلحت ہے، یہ لوگ عناد کی وجہ سے اپنا برا بھلا نہیں جانتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا
فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝۳۸ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي
الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۹ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ
اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴۰

بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ۝۴۱

ترجمہ: اور جو بھی کوئی جانور زمین میں چلنے والا ہے، اور جو بھی کوئی پرندہ ہے جو اپنے بازوؤں سے (پروں سے) اُڑتا ہے، یہ سب تمہاری ہی طرح کی امتیں ہیں، ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، پھر سب اپنے رب کی طرف جمع کئے جائیں گے۝۳۸ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھیروں میں ہیں، اللہ تعالیٰ جسے چاہے گمراہ کرے، اور جسے چاہے سیدھے راستے پر ڈال دے۝۳۹ آپ فرمایئے کہ: تم بتاؤ، اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے، یا تم پر قیامت آجائے، کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارو گے اگر تم سچے ہو؟۝۴۰ بلکہ تم اسی کو پکارتے ہو، پھر وہ اگر چاہے تو اس مصیبت کو دور کر دیتا ہے جس کی طرف تم اسے پکارتے ہو، اور تم جو شرک کرتے ہو اسے بھول جاتے ہو۝۴۱

معارف ومنازل

ان آیات میں اوّل تو یہ بتایا کہ زمین پر جو بھی اور جتنے بھی چلنے والے چلتے ہیں، اور فضاء میں جو بھی پرندے اپنے پروں سے اُڑتے ہیں، سب تمہاری طرح کی امتیں اور مختلف جماعتیں ہیں، ان کے احوال محفوظ ہیں، ان سے متعلقہ امور موت وحیات پیدائش ونسل سب مقرر ہیں، ان کی جو مصلحتیں ہیں ان کے مطابق زندگیاں گزار رہے ہیں، ان سب کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تدبیر شامل ہے۔ [روح المعاني] پھر فرمایا:

﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، لوح محفوظ میں ساری کائنات اور اس کے احوال لکھے ہوئے ہیں، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو نہ لکھی ہو، جو جانور اور چرند پرند موجود ہیں، یا فنا ہو چکے، یا آئندہ ہونے والے ہیں، تقدیر ان سب کو بھی شامل ہے، انسان اور جنات جو مکلف ہیں تقدیر صرف انہی پر مشتمل نہیں، بلکہ دوسری مخلوقات کو بھی شامل ہے۔ پھر فرمایا:

﴿ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ﴾ پھر سب اپنے ربّ کی طرف جمع کئے جائیں گے۔ چند آیت قبل بھی یہ ارشاد ہوا تھا: ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا﴾ [الأنعام:۲۳] یعنی جس دن ہم سب کو جمع کریں گے، پھر ان لوگوں سے ہم کہیں گے جنہوں نے شرک کیا: کہاں ہیں تمہارے شریک جن کے بارے میں تم دعویٰ کیا کرتے تھے؟

اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں: توحید، ذات وصفات، رسالت اور عقیدۂ آخرت۔ باقی سب عقائد

انہی تین کے تحت داخل اور مندرج ہیں۔

اور یہ وہ اصول ہیں جو انسان کو اس کی اپنی حقیقت اور مقصدِ زندگی سے روشناس کر کے اس کی زندگی میں اسلامی انقلاب پیدا کرتے ہیں، اور اس کو ایک سیدھی اور صاف راہ پر کھڑا کر دیتے ہیں، خاص کر عملی طور پر عقیدۂ آخرت اور اس میں حساب وکتاب، جزاوسزا کا عقیدہ ایک ایسا انقلابی عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کا رخ ایک عظیم اجتماع یعنی میدانِ حشر کی طرف پھیر دیتا ہے، چنانچہ مذکورہ آیات کا اسی طرف اشارہ ہے۔

سرورِ عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب اللہ تعالیٰ شانہ تم کو میدان حشر میں اسی طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور پچاس ہزار سال اسی طرح رہو گے۔ اور دوسری روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیرے میں رہیں گے آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے۔ [مستدرک حاکم، بیهقي] مزید تفصیل سورۂ معارج میں دیکھیں۔

اس روایت میں جو پچاس ہزار اور ایک ہزار کا فرق ہے یہی فرق قرآن کریم کی دو آیتوں میں بھی مذکور ہے، سورۂ معارج میں ہے: ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ [المعارج:۴] یعنی قیامت کے دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔ اور سورۃ الحج میں ہے: ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [الحج:۴۷] یعنی ایک دن تمہارے ربّ کے پاس ایک ہزار سال کا ہوگا۔

اور وجہ اس فرق کی یہ ہے کہ یہ روز شدّت، تکلیف اور مشقت کے اعتبار سے دراز یعنی بہت لمبا ہوگا، اور درجات محنت ومشقت کے بھی مختلف ہوں گے، اس لئے بعضوں کے لئے یہ دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، اور بعضوں کے لئے ایک ہزار سال کا ہوگا، اور متقی وابرار کے لئے اتنا مختصر محسوس ہوگا جیسے چار رکعت نماز کی ادائیگی کا وقفہ، یا عصر ومغرب کا درمیانی وقت ہے۔ [مشكوٰة]

جیسے بے تاب مریض پر ہسپتال میں گزرنے والی رات، اور دلہا دلہن کے لیے شادی کی پہلی رات، یہ بات ہر شخص کو بآسانی معلوم ہوسکتی ہے، یہ فرق خوشی اور غم کا ہی نتیجہ ہے، نہ اور کچھ۔

فائدہ:

معاندین ایسے معجزات کی فرمائش کرتے تھے جن کو اپنے خیال سے تجویز کرتے تھے، اور حیات بعد الموت کے بھی منکر تھے، اور ان کو یہ اشکال ہوتا تھا کہ اتنی مخلوقات ہیں، اور اگلے پچھلے بے شمار انسان بھی، یہ سب مرے ہوئے

بیک وقت بغیر کسی تقدیم وتاخیر کے ایک ہی میدان میں کیسے اٹھائے جائیں گے؟ اوران سب کے اعمال اچھے اور بُرے کی کیسی یادداشت ہو سکے گی؟ یہ عقلاً محال اور غیر ممکن ہے۔آیت کریمہ نے اس استبعاد اور بیمار عقل کے شکوک و شبہات کو دور فرمایا، کہ نہ صرف بنی آدم، بلکہ جتنی بھی مخلوقات ہیں چرند، پرند تمام چوپائے، حیوانات سب تمہاری طرح کی اُمتیں اور جماعتیں ہیں، اور یہ سب لوحِ محفوظ میں مندرج ہیں، کوئی چیز چھوٹی ہوئی نہیں ہے، تمہارا اور ان سب کا زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل بات نہیں، خالق ومالک جل شانہ کے علم محیط سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، ایک ایک ذرہ کا اسے علم ہے، وہ ساری مخلوقات کے ہر فرد، اور ہر فرد کے عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔ یاد رکھنے کے لئے اسے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی سب کچھ کتاب میں لکھ دیا ہے، روز وشب ہر لمحہ فرشتے لکھ رہے ہوتے ہیں، کہیں بھی زیادتی اور کمی یا کسی فروگزاشت کا امکان ہی نہیں ہے۔ مکلف قومیں جنات اور انسان ان کا حساب تو لازماً ہونا ہی ہے، جانوروں کو بھی دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز تمام جانور، بہائم اور پرندے چرندے بھی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا انصاف اس حد تک ہے کہ اگر کسی سینگ والے جانور نے دنیا میں بے سینگ والے جانور کو مارا ہے تو اس کا انتقام اس سینگ والے سے لیا جائے گا۔ اسی طرح دوسرے جانوروں کے انتقام کا مرحلہ وار فیصلہ ہوتا رہے گا، پھر جانوروں کو حکم ہوگا کہ فنا ہو کر مٹی ہی بن جاؤ، پس سارے مٹی ہو کر ڈھیر ہو جائیں گے، انہیں دیکھ کر کافر ومشرک تمنا کریں گے: ﴿وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنتُ تُرَابًا﴾ [النبأ: ۴۰] یعنی کافر کہیں گے: اے کاش! ہمارا معاملہ ایسا ہی ہوجاتا کہ ہمیں مٹی بنا کر عذاب جہنم سے خلاصی ہوجاتی۔

یہ روایت صحیح مسلم میں بھی مذکور ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تخریج بھی کی ہے۔ سرور عالم شافع محشر (فِدَاهُ اَرْوَاحنا) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز حساب وکتاب کے وقت حق تعالیٰ شانہ حضرت آدم علیہ السلام کو میزانِ عدل کے پاس کھڑا کر کے فرمائیں گے کہ: اپنی اولاد کے اعمال کا اپنی آنکھوں سے خود معائنہ کریں، اور جس شخص کے اعمالِ صالحہ اس کے گناہوں سے ایک ذرّہ بھی بڑھ جائیں تو آپ اس کو جنت میں پہنچائیں، اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ میں جہنم کے عذاب میں صرف اسی شخص کو داخل کروں گا جس کے بارے میں میں جانتا ہوں کہ وہ اگر دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو پھر بھی وہی حرکتیں کرے گا جو پہلے کر گیا ہے۔ [مظهري بحواله طبراني]

صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ شانہ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ: اپنی اولاد میں سے جہنم کا حصہ الگ کرو، وہ عرض کریں گے: یاربّ! جہنم کا حصہ کیا اور کتنا ہوتا ہے؟ حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ: ہزار میں سے صرف ایک جنت کے لئے، باقی نو سو ننانوے دوزخ کے لئے الگ کرو''۔ [بخاري]

پھر فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھلایا گونگے اور بہرے ہیں، اندھیریوں میں ہیں، کفر کی تمام اقسام وانواع کے اعتبار سے۔

''الظُّلُمٰتِ'' (اندھیریاں) جمع کے صیغہ کے ساتھ فرمایا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہل کی ظلمت اور عناد کی ظلمت اور تقلید باطل کی ظلمت اور خود کفر کی ظلمت وغیرہ مراد ہوں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٧٩] (اور ہم نے جنات اور انسانوں میں سے بہت سے لوگ جہنم کے لئے پیدا کئے۔ ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں)۔ یہ لوگ بدتر اور بے عقل ہونے میں حیوانات سے بھی پیچھے ہیں۔ پھر فرمایا:

﴿مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ﴾ جسے اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کردے، اور جسے چاہے صراط مستقیم پر ڈال دے، اس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی ہے کہ آپ کے ذمہ جو کام ہے یعنی تبلیغ آپ اسے کرتے رہیں، اور ہدایت وضلالت اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، آپ کے ذمہ ہدایت دینا نہیں۔ فرمایا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾ [القصص: ٥٦] (آپ جس کو خود چاہو ہدایت تک نہیں پہنچا سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت تک پہنچاتا ہے)۔

البتہ یہ بات ضرور سمجھیں کہ جو شخص ہدایت کا طلبگار ہوگا تو مولا کریم اپنے فضل وکرم سے اسے ہدایت نصیب فرمائے گا، محروم نہیں فرمائے گا۔ ہاں! جو شخص ہدایت نہیں چاہتا، اور ہدایت طلب بھی نہیں کرتا، جیسے ابو طالب، آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی ہدایت کے لئے بڑی کوشش کی، مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ بدنصیب کتنے اچھے محسن اور ہمدرد رہے، مگر سعادت نہ پائی، انہی کے متعلق اس آیت کریمہ کا نزول ہوا۔ اللہ ربّ العزّت تمام

مسلمانوں پر رحم فرمائے۔آمین

مصیبت میں صرف اللہ تعالیٰ کو پکارو:

ارشاد فرمایا:﴿قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ﴾ آپ ان سے دریافت فرمائیے کہ: تم لوگ جو توحیدِ باری تعالیٰ سے دور بھاگ رہے ہو،اور شرک پر ڈٹے رہتے ہو،اگر تمہارے پاس دنیوی عذاب پہنچ جائے،یا قیامت آجائے،تو کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پکاروگے؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ جب بھی مصیبت پڑتی ہے تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتے ہو،اور صرف اسی سے دفعِ مصائب کا سوال کرتے ہو۔اس وقت اپنے معبودانِ باطلہ کو بھول جاتے ہوم اگر تم سچے ہو کہ معبودانِ باطلہ کی عبادت سے نفع پہنچتا ہےم تو ان کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف آڑے وقت میں کیوں متوجہ ہوتے ہو؟

معلوم ہوا کہ یہ جھوٹے معبود جو تم نے بنا رکھے ہیں کسی بھی نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں، پھر عام اوقات میں انہیں پکارنا، اور ان کی عبادت کرنا سوائے حماقت اور نادانی کے کچھ نہیں ہے۔قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾[العنکبوت:٦٥] (جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو پکارتے ہیں کہ ان کا اعتقاد خالص اسی پر ہوتا ہے۔پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں)۔

انہیں پختہ یقین حاصل تھا کہ ہمارے یہ خودساختہ معبود کسی کام کے نہیں،اور ہر نفع ونقصان اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے،مگر حسد وعناد نے انہیں گونگے،بہرے،اندھے بنا رکھا تھا،وہ سب کچھ جانتے ہوئے کفر وشرک کی بوالہوسیوں میں مبتلا رہتے تھے،اور دنیا کی چندروزہ عیش وعشرت پر مرتے رہتے تھے،پس انہیں عنقریب معلوم ہوگا جب ان کے پاس پیغامِ اجل آپہنچے گا،یا قیامت قائم ہوجائے گی۔

﴿بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ﴾ بلکہ تم ایسے وقت میں معبودانِ باطلہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے ہو، پھر وہ اس مصیبت کو دور کردیتا ہے جس کے دور کرنے کے لئے اسے پکارا،اور مصیبت کے وقت سارے معبودانِ باطلہ کو بھول جاتے ہو،جن کو شریک ٹھہراتے ہو۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ يَتَضَرَّعُوۡنَ ۝٤٢

فَلَوۡلَاۤ اِذۡ جَآءَهُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَلٰكِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيۡطٰنُ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝٤٣

فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖ فَتَحۡنَا عَلَيۡهِمۡ اَبۡوَابَ كُلِّ شَىۡءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰهُمۡ

بَغۡتَةً فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ ۝٤٤ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝٤٥

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے بھی امتوں کی طرف رسول بھیجے، سوہم نے ان کو سختی کے ذریعہ اور تکلیف کے ذریعہ پکڑا تاکہ وہ عاجزی کریں ۝٤٢ سوکیوں انہوں نے عاجزی نہ کی؟ جب ان پر ہمارا عذاب آیا، لیکن ان کے دل سخت ہوگئے، اور شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے دکھلایا ۝٤٣ سو جب وہ اس نصیحت کو بھول گئے جو انہیں کی گئی تھی، تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترائے جو ان کو عطا کی گئی تو ہم نے ان کو اچانک پکڑلیا، سواس وقت وہ ناامید ہو کر رہ گئے ۝٤٤ سوان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا، اور سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ۝٤٥

معارف ومنازل

مذکورہ آیات کریمہ میں ربّ العزّت شانہ نے پچھلی امتوں کے واقعات اور ان پر جاری ہونے والا قانونِ قدرت بیان فرمایا ہے۔

﴿وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ﴾ یعنی ہم نے آپ سے پہلے بھی اپنے رسول دوسری امتوں کی طرف بھیجے، اور دو طرح سے ان کا امتحان لیا: اوّل کچھ سختی اور تکلیف ان پر ڈال کر یہ دیکھا گیا کہ تکلیف اور مصیبت سے گھبرا کر بھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا نہیں۔ جب وہ اس آزمائشی امتحان میں ناکام اور فیل ہوئے، اور بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور سرکشی سے باز آنے کے وہ اور زیادہ گمراہ اور سرکش ہوئے، تو اب ان کا دوسری قسم کا امتحان لیا گیا کہ ان پر دنیوی عیش وعشرت خوشحالی وراحت کے تمام دروازے کھول دیئے گئے، اور دنیوی ناز ونعمت کے تمام وسائل ان کو مہیا کئے گئے، کہ شاید وہ اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں کو دیکھ کر اپنے مُنعِم اور محسن کو پہچانیں، اور اس کی نعمتوں کا شکر بجالائیں، اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اہتمام کریں۔

مگر وہ لوگ بجائے شکر وفرمانبرداری کے اور زیادہ سرکش ونافرمان ثابت ہوئے، عموماً یہ حال سرمایہ دار اور

مالدار وخوشحال لوگوں کا ہوا کرتا ہے، کہ بجائے شکر گزاری کے ناشکری پر اتر آتے ہیں: ﴿وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ﴾ [سبأ: ۱۳] (میرے بندوں میں سے بہت کم شکر گزار ہوتے ہیں)۔

یہ لوگ ان بیش بہا نعمتوں کی شکر گزاری کی بجائے عیش وعشرت کی بھول بھلیوں میں ایسے کھو گئے کہ اللہ تعالیٰ اور رسولوں علیہم السلام کے پیغامات اور تعلیمات کو یکسر بھلا بیٹھے، اور چند روزہ زندگی کو اپنی اصلی منزل سمجھ کر مست ہو گئے، تو دونوں طرح کے امتحان اور آزمائش میں ناکامی کے بعد ان پر ہر طرح کی حجت قائم ہوگئی، تو ناگہانی عذاب میں ڈوب کر غرق ہو گئے، اور ایسے نیست ونابود کر دیئے گئے کہ ان کا سلسلۂ نسل بھی باقی نہ رہا۔

یہ عذاب جو گزشتہ مختلف قوموں پر آیا، یہ مختلف نوعیتوں اور مختلف صورتوں میں آتا رہا، ارشاد ہے: ﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۰] (ہم نے ان سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ میں لیا، چنانچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کچھ وہ تھے جن کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا، اور کچھ وہ تھے جن کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کچھ وہ جنہیں ہم نے پانی میں غرق کر دیا۔ اور اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن یہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے)۔

یہ عذاب جو پچھلی قوموں پر آیا کبھی آسمان سے، کبھی زمین سے، کبھی دونوں کے اشتراک سے، کبھی کسی دوسری صورت سے عام عذاب آیا، اور پوری قوم کو بھسم کر کے تباہ وبرباد کیا۔ نوح علیہ السلام کی پوری قوم کو پانی کے طوفان عام سے ہلاک کیا گیا، قوم عاد کو ﴿رِيْحٌ عَقِيْمٌ﴾ تباہ کن ہوا نے تباہ کیا، قوم ثمود تباہ کن آواز سے نیست ونابود ہوگئی، قومِ فرعون کو دریائے قلزم نے غرقاب کیا۔ قوم لوط علیہ السلام کو زیر وزبر کر کے پوری آبادی کو الٹ دیا گیا، قومِ نمرود مچھروں سے ہلاک ہوگئی، وغیرہ۔

آیت کریمہ سے یہ واضح ہوگیا کہ ربّ العٰلمین جلّ شانہ کسی قوم پر عذاب عام دفعۃً نہیں بھیجتے، بلکہ بطور تنبیہ و گوشمالی کے تھوڑی تھوڑی سزائیں نازل فرماتے رہتے ہیں، جن کے ذریعہ سعید ونیک بخت اپنی غفلت سے باز آکر اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہوا کہ دنیوی سزائیں عذاب نہیں ہوتی ہیں، بلکہ غفلت سے بیداری اور اصلاح کے لئے ہوتی ہیں، جو عین تقاضائے رحمت اور مبنی برحکمت ہوتی ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ

﴿ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴾ [الم السجدة: ۲۱] یعنی ہم ان کو عذاب اکبر چکھانے سے پہلے ایک ادنیٰ عذاب چکھاتے ہیں، تا کہ وہ حقیقت کو سمجھ کر سرکشی سے باز آجائیں، اور اپنی اصلاح میں لگ جائیں۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا دار الجزاء نہیں، دار العمل ہے، یہاں کی سزائیں تنبیہ کے لئے ہوا کرتی ہیں، جیسے والدین اپنے بچوں کو، اور استاذ اپنے شاگردوں کو تنبیہ کی خاطر تادیبی سزائیں دیا کرتے ہیں۔ اصل جزاوسزا قیامت کے روز جاری ہوگی، جو سخت بھی ہے، اور دائمی وابدی بھی۔ اَعَاذَنَا اللهُ وَ جَمِيعَ الْمُسْلِمِينَ آمِين۔

اسی طرح یہاں کی راحتیں اور سکون بھی عارضی اور وقتی ہوتے ہیں، محض نمونہ کے طور پر مسلمانوں کے لئے یا بطور استدراج واتمامِ حجت کافروں کے لئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی راحت وکلفت درحقیقت جزاوسزا نہیں، بلکہ یہ جزاوسزا کے نمونے ہیں، اور یہ پوری دنیا دراصل آخرت کا شوروم اور مارکیٹ ہے، جس میں تاجر اپنے مال کے نمونے دکھانے کے لئے دکان کے سامنے لگاتے ہیں، کہ ان کو دیکھ کر خریدار کو رغبت پیدا ہو۔ معلوم ہوا کہ دنیا کا رنج وراحت درحقیقت سزاوجزا نہیں، بلکہ خالق و مالک سے کٹی ہوئی مخلوق کا رشتہ پھر دوبارہ اپنے خالق ومالک سے جوڑنے کی ایک تدبیر ہے۔

﴿ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُونَ ﴾ کے جملہ نے مزید اس کی وضاحت کی کہ مصیبت وتکلیف یہ سزا کے طور پر نہیں، بلکہ اصلاحِ حال اور ہدایت کے لئے ہے، کیونکہ مصیبت میں یہ خاصیت ہے کہ غافل سے غافل اور ہر قسم کے سرکش و نافرمان لوگوں کو بھی خداوند تعالیٰ یاد آجاتا ہے۔

دیکھیں! ڈوبتے وقت فرعون جیسے مدعی اُلوہیت کو بھی خدا یاد آیا، اور ﴿ آمَنتُ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴾ [الشعراء: ۴۸] (میں ایمان لایا ربّ العالمین پر، موسیٰ اور ہارون کے رب پر) کا نعرہ بلند کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ مصائب کے ذریعہ انابت اور اصلاح کی یاددہانی فرماتے رہتے ہیں، تو تکلیف ومصیبت اگر کسی فرد یا جماعت پر بطورِ عذاب ہو پھر بھی دوسروں کے لئے اس میں عبرت وانابت کا پہلو ضرور موجود ہوگا، جیسے ارشادِ ربانی ہے: ﴿ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴾۔ [البقرة: ۶۶] (پھر ہم نے اس واقعہ کو اس زمانے کے اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے عبرت اور ڈرانے والوں کے لئے نصیحت کا سامان بنادیا)۔

جب اللہ تعالیٰ نے ایسی قوموں پر عیش وعشرت اور خوشحالی کے سارے دروازے کھول دیئے تو یہ ایک خطر

ناک امتحان اور استدراج تھا، اس میں تمام دیگر اقوام کے لیئے تنبیہ اور وارننگ ہے، کہ دنیا میں کسی شخص یا جماعت پر عیش وعشرت کی فراوانی دیکھ کر دھوکہ میں مبتلا نہ ہوں، کہ یہ لوگ صحیح راستے پر ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے، تب ہی تو ان کو قسم قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے، بلکہ اکثر اوقات یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خطرناک آزمائش ہوتی ہے، جیسے مشرکینِ مکّہ جو ایسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے تھے، اور مسلمان فقراء کا مذاق اڑاتے تھے، اور اپنے مزعومہ خیالات کے تحت اللہ تعالیٰ کے قرب کے مدّعی تھے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم یہ دیکھو کہ کسی شخص پر نعمت ودولت برس رہی ہے، حالانکہ وہ اپنے گناہوں اور نافرمانیوں پر جما ہوا ہے، تو سمجھ لو کہ اس کے ساتھ استدراج کا معاملہ ہورہا ہے، یعنی اس کی عیش وعشرت اس کو سخت عذاب میں پکڑے جانے کی ایک علامت ہے۔ [رواہ أحمد، ابن کثیر]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا اور بڑھانا چاہتے ہیں تو ان میں دو وصف پیدا کردیتے ہیں: ایک ہر کام میں اعتدال اور میانہ روی۔ دوسرے عفت اور عصمت، یعنی خلافِ حق چیزوں کے استعمال سے پرہیز اور دوری۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک وبرباد کرنا چاہتے ہیں تو ان پر خیانت کے دروازے کھول دیتے ہیں، یعنی وہ اپنی خیانتوں اور بداعمالیوں کے باوجود دنیا میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ [ابن جریر، ابن کثیر]

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس پر رزق وسیع ہوتا ہے وہ اس بات پر غور ہی نہیں کرتا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک سیاست ہے، اور جس کو تنگ حالی ہو وہ بھی غور نہیں کرتا کہ اس کی آزمائش کی گئی ہے، اور مہلت دی گئی ہے۔ ربِ کعبۃ اللہ کی قسم! جب گناہگاروں کو پکڑنا مقصود ہوتا ہے تو دنیا میں انہیں سرسبز وخوشحال رکھا جاتا ہے۔ [ابن کثیر]

﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے حمد وستائش جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔ ظالموں اور نافرمانوں کو ہلاک کرنا، مؤمنوں کو اُن کے شر سے نجات دلانا یہ سب قابلِ حمد وستائش ہیں۔ حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر اُمت کے لئے ایک فتنہ ہے، اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ [مشکوۃ]

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے تمہارے بارے میں تنگدستی کا خوف نہیں، لیکن مجھے تمہارے بارے میں اس بات کا خوف ہے کہ تمہیں دنیا خوب دے دی جائے گی، جیسے تم سے پہلے لوگوں کو دی گئی تھی، پھر تم اس کی رغبت میں آپس میں مقابلہ کرنے لگو گے، جیسے ان لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کا مقابلہ کیا، پھر وہ تمہیں ہلاک کر دے گی، جیسے انہیں ہلاک کیا۔ [متفق علیه]

مالداری اور تنگدستی دونوں کے ذریعہ آزمائش ہوتی ہے، پھر تنگدستی اور فقیری میں راہِ حق پر چلنا اور اعمالِ صالحہ پر باقی رہنا، اور معاصی سے بچنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ مالداری میں حق پر چلنا مشکل و دشوار ہوتا ہے، اور مالداری کا غرور مستقل ایک عذاب ہے، جو کہ عذابِ الٰہی کو دعوت دیتا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ
بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝٤٦ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً
اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝٤٧ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ
فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٤٨ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ
بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝٤٩ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ
اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝٥٠

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ: اگر اللہ تعالیٰ تمہارے کان، تمہاری آنکھیں لے لے، اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے، تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون معبود ہے جو تم کو یہ چیزیں دیدے؟ دیکھ لیجئے! ہم کس طرح دلائل بیان کرتے ہیں؟ پھر وہ اعراض کرتے ہیں ۝٤٦ آپ فرما دیجئے: اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے بے خبری میں، یا خبرداری میں، تو کیا ظالموں کے علاوہ اور کوئی ہلاک کیا جائے گا؟ ۝٤٧ اور ہم پیغمبروں کو صرف خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے بھیجتے رہے ہیں، سو جو شخص ایمان لایا اور اصلاح کر لی پس ان پر کوئی خوف نہ ہوگا، اور نہ غمگین ہوں گے ۝٤٨ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ان کو اس سبب سے عذاب پہنچ جائے گا کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے ۝٤٩ آپ فرما دیجئے کہ: میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں، اور نہ میں یہ کہتا ہوں

کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اسی کا اتباع کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ آپ فرما دیجئے: کیا برابر ہو سکتا ہے اندھا اور دیکھنے والا؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟﴿۵۰﴾

معارف ومنازل

سورۂ ملک میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾ [الملک:۲۳] (کہہ دو کہ: وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تم لوگ شکر تھوڑا ہی کرتے ہو)۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے فیضانِ رحمت کی بنیاد پر تمہیں پیدا فرمایا۔ عالم کبیر کے اندر جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں وہ سب تمہارے اس چھوٹے سے بدن عالمِ صغیر میں پیدا فرمائیں، ان میں سے بطورِ نمونہ وادراک تین چیزوں کا آیت کریمہ میں ذکر فرمایا کہ:

ربّ العزّت نے سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سمجھنے اور جاننے کے لئے دل عنایت فرمایا۔

تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سننے اور دیکھنے کی قوّت کو اگر ختم کردے، اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے؛ جس سے نہ دیکھ سکو، نہ سن سکو، نہ سمجھ سکو، تو بتاؤ اللہ تعالیٰ کے سوا کونسا معبود ہے جو یہ چیزیں تمہیں واپس دیدے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا نہیں، اور نہ ہی کسی مخلوق کی قدرت میں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی عاجز مخلوق کو معبود بنانا سوائے گمراہی اور حماقت کے کچھ نہیں۔

پھر فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک بے خبری میں بھی آسکتا ہے، اور خبرداری میں بھی۔ اگر عذاب آجائے تو ظالم ہی ہلاک ہوں گے، لہٰذا ظلم کرنے والے ظلم سے باز آجائیں۔ سب سے بڑا ظلم شرک اور کفر ہے، اس کو چھوڑ دینا نہایت ہی ضروری ہے، اور دوسرے مظالم سے رکنا بھی واجب ہے۔

پھر فرمایا کہ: پیغمبروں کو خوشخبری سنانے اور ڈرانے کے لئے بھیجا جا تا رہا ہے، ان کی تعلیمات کو جس نے قبول کیا اور ان کی باتوں پر یقین کر کے جس نے معاصی کو چھوڑ دیا اور ایمان قبول کیا اور اعمالِ صالحہ اختیار کیے، سو ایسے لوگوں پر نہ کوئی خوف ہے، اور نہ انہیں کوئی غم ہوگا۔ اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، اور پیغمبروں علیہم السلام کی دعوت پر ایمان نہ لایا، ان کو نافرمانی کی وجہ سے سخت عذاب ہوگا۔

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ﴾ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے، اور

آپ کے اعمال واخلاق کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو کھلا معجزہ ہے (قرآن کی عملی شکل وصورت ہے) بلکہ سارے معجزات کا مجموعہ ہے، مگر جو لوگ رشد وہدایت سے سراسر محروم تھے، اور جانوروں کی زندگی گزار رہے تھے، ان میں سے ان کے لئے ان معجزات میں کوئی جاذبیت اور کشش نہیں تھی۔ وہ اپنی نادانی کے مطابق حسی اور مادی معجزات مانگتے تھے۔ ان میں سے بعض تو ان کی فرمائش کے مطابق پورے ہو گئے، جیسے شق القمر کا معجزہ کہ قریش کے علاوہ دنیا کے بہت سے لوگوں نے اس کو دیکھ لیا، یا مٹی کی کنکریوں سے کلمہ شہادت کی آواز آنا۔ مگر ہٹ دھرم اور گمراہ لوگوں نے پھر بھی نہ مانا، اور ان معجزات کو سحر و جادو کہہ کر ان کی تکذیب کی۔

اس آیت کریمہ میں بھی مشرکین کے تین مطالبوں اور فرمائشوں کی طرف اشارہ ہے، جو انہوں نے پیش کی تھیں: ایک یہ کہ اگر آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو ساری دنیا کے سارے خزانے ہمارے لئے جمع کریں۔ دوسرے یہ آئندہ حالات اور واقعات جو پیش آئیں گے وہ سب ہمیں بتلا دیں، تا کہ ہم نقصانات سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔ تیسرے آپ ہمارے ہی جیسے انسان ہیں، رسول ہونے کے لئے تو آپ کو فرشتہ ہونا چاہئے تھا، انسان کیسے رسول ہو سکتا ہے؟

پیغمبر، نہ فرشتہ ہوتا ہے نہ خدائی خزانوں کا مالک، اور نہ ہی عالم الغیب:

جواب کا حاصل یہ ہے کہ میں نے کب ان چیزوں کا دعویٰ کیا تھا؟ جن کا مجھ سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ نبوت ورسالت کا تو ان چیزوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جس پیغامِ الٰہی کی تمہیں دعوت دے رہا ہوں پہلے میں خود اس کا پابند اور مکلّف ہوں۔ یہود ونصاریٰ نے انبیاء علیہم السّلام کے بارے میں جو غلو کیا تھا، اور اِفراط وتفریط کے ساتھ جو شرک وکفر اختیار کیا تھا ان جملوں میں ان کی مکمل تردید ہے۔ اور انبیاء کرام علیہم السّلام کے بارے میں اعتدال کی تعلیم ہے، یعنی یہ کہ پیغمبر نہ خدائی خزانوں کا مالک ہوتا ہے، نہ وہ فرشتہ ہوتا ہے، اور نہ غیب دان۔

آیت کریمہ نے تینوں کی نفی فرما دی، اور واضح کیا کہ دنیا والوں کے نزدیک مال ودولت کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ پیغمبر کو مال ودولت کے اعتبار سے ہم سے زیادہ مالدار ہونا چاہئے۔ خزانوں کا پاس ہونا نبوت و رسالت اور مقبولیت عند اللہ کی دلیل نہیں ہے، جس بات کی دعوت دی جا رہی ہے اس پر غور کرو، اور ان دلائل کو سمجھو جو اثباتِ رسالت کے لیے پیش کئے جا رہے ہیں، مالداری اور سرمایہ کو نبوّت کا معیار بنانا جہالت اور حماقت ہے۔

اور وہ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ آئندہ کے متعلق ہم کو غیب کی باتیں بتاؤ، تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے، اور

آپ کی صداقت کا بھی اقرار کریں گے۔تو ان کو بھی جواب دیدیا کہ میں غیب نہیں جانتا ہوں، غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اور اسی کی مخصوص ذاتی صفت ہے، اور غیب دانی نبوت ورسالت اسی طرح مقبولیت عند اللہ کی شرط نہیں، اسی پر اجماع ہے۔

بہت سے لوگوں کو آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ مرشد، صالحین اور مصلحین سے رجوع نہیں کرتے، کیونکہ یہ لوگ غیب کی باتیں نہیں بتاتے، اور جو شعبدے باز گدیاں سنبھالے بیٹھے ہیں، اکثر ان کے جہال بے دین اور چند ٹوٹکے یاد کئے ہوئے ہوتے ہیں، اٹکل پچو کاہنوں کی طرح کچھ باتیں بتاتے رہتے ہیں، ان باتوں میں سے ایک بات اتفاقاً صحیح یا ٹھیک نکل جاتی ہے اسی کو چاروں طرف شہرت دے کر اس کو عوام الناس میں پھیلا دیتے ہیں، پس لوگ اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں، اور انہیں اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ وہ محض مردود لوگ ہوتے ہیں، جن کے پاس نہ نمازوں کی پابندی ہے، نہ تقویٰ، نہ اکلِ حلال، نہ طہارت وتزکیہ۔

اور جو لوگ دنیا دار ہوتے ہیں، مال ودولت کے طالب رہتے ہیں، فسق وفجور اور دیگر غیر شرعی اعمال میں ملوث ہوتے ہیں، ان کو مقتدا اور مرشد بنانا بہت بڑی گمراہی ہے۔

اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَآ اَقُوۡلُ لَكُمۡ اِنِّىۡ مَلَكٌ﴾ میں یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، لہٰذا میرے اندر فرشتوں والی صفات تلاش نہ کرو، اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی میں ہے کہ انسانوں کا نبی انسان ہی ہو، انسانوں میں گھل مل کر، اور ان کی حاجات اور صفات کو جان کر ان کو احکام سکھائے، اور ان کی قول سے بھی تربیت کرے، اور عمل سے بھی۔

﴿اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ﴾ آپ فرما دیجئے کہ: میں تو صرف اسی کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، میں وحی الٰہی کا سختی سے پابند ہوں، جو حکمِ الٰہی ہوتا ہے اس پر خود بھی عمل کرتا ہوں، اور تمہیں بھی وہی بتاتا ہوں۔آخر میں ارشاد ہے:

﴿قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ﴾ آپ فرما دیجئے: کیا برابر ہو سکتا ہے نابینا اور بینا؟ یعنی یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے، یہ دونوں اضداد ہیں، رات دن اور سردی گرمی کی طرح۔تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی آیات آگئیں، کلام اللہ تمہیں سنایا جارہا ہے، جس کی فصاحت وبلاغت تمہیں مسلّم ہے، اور جس کے مقابلہ میں تم چھوٹی سی سورت بھی نہیں لا سکتے، اور بھی کئی قسم کے معجزات ہیں، جنہیں تم دیکھتے رہتے ہو، لہٰذا ضد وعناد کو چھوڑ دو اندھے مت بنو، بینائی اختیار کرو، بصیرت کی آنکھوں سے دیکھو، اور غور وفکر کرتے رہو۔

﴿أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ﴾ کیا تم غور نہیں کرتے؟ اگر غور کرو گے تو تمام شکوک وشبہات دور ہو جائیں گے، اور صحیح راستہ بآسانی معلوم ہو جائے گا۔

علم غیب کے متعلق اہل سنت والجماعۃ کا عقیدہ:

اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق سے زیادہ علم دیا، اور علومِ غیبیہ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر کسی مخلوق کو علم نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم تمام اوّلین وآخرین سے زیادہ ہے، اور یہ علم اللہ تعالیٰ ہی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا ہے، جس طرح تمام مخلوقات کا علم ذاتی نہیں ہے، وَھبِی ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم بھی وہبی ہے، ذاتی نہیں ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ﴾ [آل عمران: ۱۷۹] (اور اللہ ایسا نہیں کرسکتا کہ تمہیں غیب کی باتیں بتا دے، لیکن اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے)۔ اور فرمایا: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ﴾ [الجن: ۲۶] (وہی سارے بھید جاننے والا ہے، چنانچہ وہ اپنے بھید پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ سوائے کسی پیغمبر کے جسے اس نے پسند فرمالیا ہو)۔

لیکن تمام کائنات اور غیر کائنات کا علمِ محیط (علم کلّی) ہونا یہ صرف حق تعالیٰ سبحانہ کی صفت ہے، اس لئے عالم الغیب علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ عالم الغیب بھی ہے، اور عالم الشہادۃ بھی، جیسا کہ سورۃ الم السجدۃ اور سورۂ حشر میں فرمایا ہے، اور سورۂ نمل میں فرمایا: ﴿قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ [النمل: ۶۵] (کہہ دو کہ: اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے)۔

بعض لوگ اپنی جہالت اور ہٹ دھرمی سے کہتے ہیں کہ موت سے پہلے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام علومِ غیبیہ عطا کر دیئے گئے تھے، ان لوگوں کا دعویٰ بلا دلیل ہے، اور خالص جھوٹ ہے، اور اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے، کیونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ایسی باتیں بتائیں کہ قیامت کے دن ایسا ایسا ہوگا، اور مجھے اس کا علم اُس وقت دیا جائے گا۔ مثلاً فرمایا کہ حوض کوثر پر میرے پاس بہت سے لوگ آئیں گے، اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا جائے گا، تو میں کہوں گا کہ یہ میرے آدمی ہیں، فرشتے کہیں گے کہ آپ نہیں جانتے، انہوں نے آپ کے بعد دین میں کیسی کیسی نئی باتیں نکالی تھیں، تب میں کہوں گا کہ ان کے لئے دوری ہو، انہیں دور کر دو۔ [بخاري]

ان نئی باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے قرآن وحدیث کے خلاف اپنے عقیدے بنا لئے، اور

طرح طرح کی مذموم بدعتیں دین کے نام پر جاری کرلیں۔ سنتوں کی جگہ بکثرت بدعتوں کی ترویج کی، اور ایسے ایسے عقائد واعمال بنالئے جن کا قرآن وسنت اور صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کی زندگی میں وجود تک نہیں، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کا برابر بتادیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مختار کُل بنادیا، اور ہر جگہ حاضر وناظر کا عقیدہ گڑھ لیا، اور یہاں تک جسارت کی اور صریح کفر کا ارتکاب کیا، اور کہا:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہوکر ☆ اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہوکر

خدا جس کو پکڑے چھڑائے محمد ☆ محمد جو پکڑے چھڑائے نہ کوئی

یہ فرقہ انبیاء علیہم السلام کی بشریت کا بھی منکر ہے، اور اولیاء کرام تک کے لئے علم غیب اور تصرف نفع ونقصان دینے کا بھی قائل ہے (العیاذ باللہ)۔ یہ سارے عقائد اور اعمال روحِ شریعت اور صریح آیات قرآنی اور احادیث کے خلاف اور متصادم ہیں۔ حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں جب شفاعت کے لئے سجدہ میں سر رکھوں گا تو اللہ تعالیٰ کی وہ حمد وثنا بیان کروں گا، جو اُسی وقت حق تعالیٰ شانہ میرے دل میں ڈال دیں گے۔ [مشکوۃ المصابیح]

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۝۵۱ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝۵۲ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۝۵۳ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝۵۴ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ۝۵۵

ترجمہ: اور آپ اس کے ذریعے ان لوگوں کو ڈرایئے جو اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کئے جائیں گے کہ نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا، اور نہ کوئی شفاعت کرنے والا، تاکہ یہ لوگ ڈر

جائیں۞ اوران لوگوں کو دور مت کیجئے جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح وشام، جو چاہتے ہیں اس کی رضا کو، ان کا حساب آپ کے ذمہ کچھ بھی نہیں، اور آپ کا حساب بھی ان کے ذمہ کچھ بھی نہیں کہ آپ اُن کو دور کریں، پھر آپ ظالموں میں سے ہو جائیں۞ اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعہ آزمایا ہے تاکہ وہ کہیں: کیا ہمارے درمیان سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا؟ کیا اللہ تعالیٰ شکرگزاروں کو خوب جاننے والا نہیں ہے؟۞ اور جب آجائیں وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیات پر تو ان سے کہہ دیجئے کہ: تم پر سلامتی ہو، تمہارے ربّ نے اپنے ذمہ رحمت کو مقرر کرلیا ہے کہ جو شخص تم میں سے جہالت کی وجہ سے کوئی گناہ کرلے، پھر اس کے بعد توبہ کرلے، اور اپنا حال درست کرلے، تو بلاشبہ وہ غفور ہے رحیم ہے۞ اور اسی طرح ہم تفصیل سے آیات کو بیان کرتے ہیں تاکہ مجرموں کا راستہ ظاہر ہو جائے۞

معارف ومنازل

قیامت کے متعلق تین طرح کے لوگ ہیں: ایک وہ جو یقینی طور پر قیامت کے معتقد ہیں، جیسے مسلمان۔ دوسرے وہ جو متردد ہیں۔ تیسرے وہ جو بالکل منکر ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام کو تبلیغ وانذار کا حکم اگرچہ ان تینوں طبقوں کے لئے عام ہے، جیسا کہ بہت سے ارشادات قرآنی سے واضح ہے، لیکن پہلے دو طبقوں میں چونکہ اثر قبول کرنے کی توقع زیادہ ہے اس لئے پہلی آیت کریمہ میں خاص طور پر ان کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

﴿وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا﴾ الآیۃ آیت کریمہ میں حشر سے ڈرنے والوں کا خصوصیت سے ذکر اس وجہ سے کیا کہ ڈرانے کا فائدہ انہیں کو پہنچ سکتا ہے، جیسے ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ میں اہلِ تقویٰ کا خصوصی ذکر اس لئے ہے کہ وہی ہدایت قرآنی سے فائدہ اٹھانے والے ہیں، اگرچہ قرآن پاک کی ہدایت عمومی ہے۔

﴿لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ﴾ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مددگار ہوگا، نہ سفارشی۔ اس آیت میں بظاہر شفاعت کی نفی ہے، لیکن دوسری آیات میں اِذنِ خداوندی کے ساتھ شفاعت کا ثبوت موجود ہے۔ اسی طرح مؤمنوں کے لئے مؤمنوں کا حامی ہونا بھی مذکور ہے، اس لئے مثبتینِ شفاعت یعنی اہلِ السنت والجماعۃ کی طرف سے کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بعد شفاعت کا ہونا بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کی حمایت ہے، اور آیت میں نفی ولایت وشفاعت سے بلا اذنِ الٰہی ولایت وشفاعت کی نفی مراد ہے، پس اولیاء کی طرف سے ولایت و

شفاعت جو اذنِ خداوندی کے بعد ہوگی۔ اس کی نفی آیت میں نہیں ہے۔ [مظهري]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سفارش سے وہ سفارش مراد ہے جس کے قائل مشرکین ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہمارا پیر، بزرگ اور معبودانِ باطلہ ہر حال میں ہمیں قہر وغضبِ الٰہی سے چھڑالیں گے، یہاں پر اسی جبری اور قہری سفارش کی نفی کی گئی ہے۔ البتہ جو سفارش، انبیاء، فرشتے، اولیاء، شہداء اور نیک لوگ کریں گے، وہ دوسری سفارش ہے جو باذنِ اللہ ہوگی، اس کی نفی یہاں مقصود نہیں۔ [تفسیر کبیر]

فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم کی فضیلت اور ان کی دلداری کا حکم وفرمان:

معالم التنزيل، درمنثور مظهري روح المعاني وغیرہ میں ہے کہ حضرت سلمان فارسی اور خباب ابن الارت رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی، یعنی فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مفسرین کرام نے اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں متعدد روایات نقل کی ہیں، ان میں سے چند غریب ہیں، خاص کر وہ روایات جن میں اُقرع بن یابس تمیمی، اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور عیینہ بن حصن فزاری وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

یہ آیت مکی ہے، اُقرع بن یابس وغیرہ ہجرت کے بعد مسلمان ہوئے۔ البتہ یہ بات قرینِ قیاس بھی ہے کہ یہ آیت مکی دور کی ہے۔ ابوطالب کے پاس مشرکین کا آنا اور انہیں آمادہ کرنا کہ آپ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہہ دیں کہ جب ہمارا کوئی سردار آپ کے پاس آجائے تو فقراء کو وہاں سے اٹھادینا، وغیرہ۔

بہرحال! مشرکینِ مکہ کے آسودہ حال سرمایہ دار سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بار بار اعتراض کرتے تھے کہ آپ کے اردگرد غریب، غلام اور کمتر لوگ اور نہایت خوار وزار حیثیت کے لوگ جمع رہتے ہیں، اس لئے ہم آپ کے پاس نہیں آتے، اور آپ کی مجلس میں شریک نہیں ہوتے، کیونکہ ایسے غریبوں کے ساتھ بیٹھنے میں ہماری سبکی اور توہین ہوتی ہے، لہٰذا ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہم آپ کی بات سننے کے لئے ایسے وقت آپ کے پاس آسکتے ہیں جب یہ لوگ یعنی، بلال، صہیب، عمار، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ نادار لوگ وہاں موجود نہ ہوں، یا آپ ہماری آمد پر انہیں وہاں سے ہٹا دیں، اور دور کردیں، اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔

بڑے چھوٹے، امیر غریب، آقا وغلام کی تفریق صرف مشرکینِ عرب میں ہی نہیں تھی، بلکہ یہ ناہموار و ناجائز تفریق پہلے انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی موجود تھی۔ اسی طرح یہ تفریق ہمارے زمانہ میں بہت ہی عروج پر ہے، جتنی تفریق موجودہ زمانہ میں ہے شاید گزشتہ ادوار میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ تھا، کیونکہ اس خبیث درخت کی

نگہداشت وآبیاری خصوصیت کے ساتھ انگریزوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ کی، اب یہ مردار ناسور کینسر کی طرح عرب وعجم اور پوری دنیا میں عروج پر ہے۔

پہلے زمانہ میں تو امیر وغریب کے درمیان تفریق ہوتی، انگریزوں نے اسے اتنی بڑی وسعت دی کہ اب عربی وعجمی اور وطنی، لسانی، علاقائی، رنگ ونسل اور دیگر کئی قسموں پر مشتمل تفریقوں کا دوردورہ ہے، جس سے خاص کر مسلمانوں کی وحدت واتحاد کا شیرازہ اتنا بکھرا ہوا ہے کہ ایک ہی پاکستان میں پنجابی، سندھی، پشتون، بلوچ ومہاجر ہر محاذ پر صبح وشام دست بگریبان ہیں، جہاں مذہبی تفریقات کا نام ونشان تک نہیں، لوگ ہر مذہبی تفریق کو برداشت کرتے ہیں، مگر لسانی اور علاقائی تفریقوں پر سیخ بپا اور ناراض ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پڑھے لکھے تعلیم یافتہ اور پابند صوم وصلوٰۃ لوگ بھی اس دلدل میں غرق ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں، اور باقاعدہ اس منحوس تفریق کی اسی طرح تبلیغ کرتے رہتے ہیں جس طرح مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کی ہے۔اَنَا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن

بہرحال! مشرکینِ مکہ کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ جب ہم آپ کے پاس آئیں تو ان غریب چھوٹے لوگوں کو مجلس سے اٹھادیا کریں۔

مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ایمان لانے پر بہت حریص رہتے تھے، اس لئے کسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک میں یہ خیال بھی آیا کہ اپنے مسلمان بھائی اپنے ہی تو ہیں، اگر دوسرے لوگوں کو تبلیغ کی خاطر اِن کو تھوڑی دیر کے لئے مجلس سے بھی علٰحدہ کردیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ بڑے بڑے سردارانِ قریش ایمان لے آئیں، اور ان کے پیچھے اور بھی بہت سے لوگ جو ان کے متبعین ہیں ایمان لے آئیں، اس طرح دین کو تقویت حاصل ہوجائے۔

مگر حکیم وعلیم ربّ العزّت نے ایسا کرنے سے منع فرمایا (جیسے آخری پارہ سورۂ عبس کی تفسیر میں ہے)۔

ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ آپ اس مجلس سے ان لوگوں نہ دھکیلیں، دورنہ کریں جو صبح وشام اپنے ربّ کو پکارتے ہیں، یاد کرتے ہیں، اور اس کی وحدانیت کا ترانہ گاتے ہیں، اور بڑے خلوص کے ساتھ اس کی عبادت کرتے ہیں، یہی تو ہیں اصلی لوگ، یہی تو ہیں مقبول بارگاہ، اور اَصحاب الیمین جن کا مطمع نظر اور نشست وبرخاست ومقصود اصلی ﴿يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی توحید وعبادت

ہے، فقط نہ اور کچھ۔

میری زندگی کا مقصد ترے دین کی سرفرازی ☆ میں اسی لئے مسلمان میں اسی لئے نمازی

سورۂ کہف میں فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ [الکھف:] (اور آپ ان لوگوں کے ساتھ جم کر بیٹھیں جو اپنے ربّ کو صبح وشام پکارتے اور اس کی رضا کو چاہتے ہیں)۔ سرورِ کائنات ﷺ نزولِ آیت سے پہلے غرباء ومساکین کو اپنا رفیق اور محبوب تصور کرتے تھے، جب آیت کا نزول ہوا تو آپ ﷺ کی محبت وشفقت غرباء کے ساتھ مثالی بن گئی، جیسے آپ ﷺ کا ارشادِ دعائیہ اس پر شاہدِ عدل ہے: اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّ اَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّ احْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ۔ اور آپ ﷺ نے یہ بھی دعا کی: اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ حُبَّ الْمَسَاكِيْنِ۔ [مشکوۃ]

اس کے بعد آپ ﷺ مساکین وفقراء کی ہمیشہ رعایت اور دلجوئی فرماتے، اور ان کے ساتھ بیٹھے رہنے پر نہایت خوشی محسوس کرتے، اور کبھی ان کی مجلس سے اُٹھ کر انہیں چھوڑ کر تشریف نہ لے جاتے۔ جب مجلس برخاست کرنے کا وقت ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باری باری سے اٹھتے چلے جاتے تھے، تب آخر میں آپ ﷺ بلا تکلف اٹھ کر تشریف لے جاتے۔

جب یہ ماجرا ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يُمِتْنِيْ حَتّٰى اَمَرَنِيْ اَنْ اَصْبِرَ نَفْسِيْ مَعَ فُقَرَاءِ اُمَّتِيْ۔ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے مجھے اس وقت تک موت نہ دی جب تک کہ مجھے یہ حکم نہ فرمایا کہ میں اپنی امت میں سے ایک جماعت (فقراء) کے ساتھ جم کر بیٹھوں۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے فرمایا: مَعَكُمُ الْمَحْيَا وَ مَعَكُمُ الْمَمَاتُ۔ تمہارے ہی ساتھ میرا جینا ہے، اور تمہارے ہی ساتھ میرا مرنا ہے۔ اور انہیں مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ تم پر سلام ہو تمہارے ربّ نے اپنے اوپر رحمت کو لازم فرمالیا۔ اس سے جہاں ان حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی برتری اور فضیلت معلوم ہوئی، جن کو غریبی کی وجہ سے سردارانِ قریش نے حقیر سمجھا تھا، تو وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہوں ان کی رعایت ولحاظ اور دلداری ان لوگوں سے ہزاروں مرتبہ مقدم ہے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے۔

﴿مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ ان کا حساب آپ کے

ذمہ کچھ بھی نہیں، اور آپ کا حساب ان کے ذمہ کچھ بھی نہیں کہ آپ ان کو دور کردیں، پھر آپ ظالموں میں سے ہو جائیں)۔ اس کا مطلب بعض مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ یہ فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم جو آپ کے پاس آتے ہیں، اور ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، ان کا باطن ٹٹولنا اور سراغ لگانا آپ کے ذمہ نہیں ہے، آپ ان کے اخلاص کی تفتیش نہ کریں، ظاہر حال کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کریں، اور ان کو اپنے پاس بٹھائیں، اور فیض یاب کریں، اور اپنے سے دور نہ کریں، اور ان کے مقابلہ میں ان لوگوں کو ترجیح نہ دیں جنہوں نے ایمان قبول کیا ہی نہیں۔ یہ مطلب اس صورت میں ہے جب ''حِسَابُهُمْ اور عَلَيْهِمْ'' کی ضمیریں مسلمان فقراء کی طرف راجع ہوں۔

اور بعض مفسرین نے ان ضمیروں کو رؤسائے مشرکین کی طرف راجع کیا ہے، اور آیت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ یہ لوگ ایمان لائیں یا نہ لائیں، آپ غرباء مسلمین کے مقابلہ میں ان کی پرواہ نہ کریں، کیونکہ ان کے حساب کی ذمہ داری آپ پر نہیں، جیسا کہ آپ کے حساب کی ذمہ داری ان پر نہیں۔ اگر یہ ذمہ داری آپ پر ہوتی، یعنی ان کے مسلمان نہ ہونے پر آپ سے مواخذہ ہوتا تو اس صورت میں آپ ان کی وجہ سے غرباء مسلمین کو مجلس سے ہٹا سکتے تھے، اور جب ایسا نہیں تو ان غرباء کو مجلس سے ہٹانا بے انصافی ہوگی۔ یہی مطلب ہے: ﴿فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ کا۔

انسانی شرافت کا اصلی معیار ایمان اور تقویٰ ہے:

جن لوگوں کے پاس ایمان، تقویٰ اور اخلاقِ حسنہ ہوں وہی معاشرے میں حقیقی انسان اور شریف کہلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان محبوب ہے، ایمان والے محبوب ہیں، اور اخلاقِ حسنہ والے محبوب ہیں، تقویٰ والے محبوب ہیں، اخلاقِ حسنہ محبوب ہیں، اور اخلاقِ حسنہ والے محبوب اور پسندیدہ ہیں، اعمالِ صالحہ محبوب اور پسندیدہ ہیں، انہی چاروں چیزوں پر اخروی نجات اور ابدی سعادتیں موقوف ہیں، اور افضلیت کی شان انہی بندوں کو حاصل رہے گی جن میں تقویٰ ہو، تقویٰ کا اطلاق انہی چاروں پر ہوتا رہتا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ [الحجرات:١٣] (اللہ کے نزدیک تم میں سے عزت والا تم میں سے تقویٰ دار ہے)۔

جو غریب صحابہ رضی اللہ عنہم تھے ان کی اللہ تعالیٰ نے قدر دانی فرمائی، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ رہو، اور ان کو اپنے پاس رکھو، اور انہیں اپنی مجلس سے مت ہٹاؤ، اور جن دنیاداروں کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پاس بٹھا کر تبلیغ کرنا چاہتے تھے انہوں نے شرط یہی لگائی کہ ہماری آمد پر ان فقراء کو برخاست کیا جائے۔ سبحان اللہ! رب

العزّت کے حقیقی بندے یہی تو تھے جن کی قدر و منزلت ربّ العزّت کے نزدیک بڑے بڑے سلاطین وملوک سے کہیں زیادہ ہے۔ پس اللہ پاک اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ کیسے گوارا کریں گے کہ جنتی اور محبوب مخلوق برخاست کئے جائیں، اور نافرمان ومشرک جہنمی ان کی مسند پر براجمان ہوں؟

مال ودولت شرافت اور برتری کا معیار نہیں:

جن لوگوں کے پاس مال ودولت یا اقتدار ہو یہ چیزیں نہ کسی شرافت کے معیار ہیں، نہ حقیقی انسانیت کی علامت۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ یہ چیزیں بکثرت ناپسندیدہ اور بُرے لوگوں کو عطا کرتے رہتے ہیں، کیونکہ ان چیزوں میں ایک بہت بڑا مہلک مرض بھی ساتھ ہوتا ہے کہ وہ مسکینوں غریبوں کو حقیر سمجھتے ہیں، انہیں اس لائق بھی نہیں سمجھتے کہ وہ ان کے پاس بیٹھیں، حتیٰ کہ وہ سلام بھی کریں، تو سلام کا جواب دینے میں خِفت وذلّت محسوس کرتے ہیں، یہ مہلک مرض تکبر وغرور ہے، جو کہ شیطان کی مذموم صفت ہے، اور تکبر انسان میں بدترین خصلت ہے، یہ صفت انسان کو حق قبول کرنے سے اور کفر ونفاق چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے سے روکتی اور منع کرتی ہے م اور آخرت میں اس کا بہت بڑا عذاب ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ متکبروں کو قیامت کے دن انسانوں کی صورت میں جمع کیا جائے گا، ان کے جسم اتنے چھوٹے ہوں گے جیسی چیونٹیاں ہوتی ہیں، ان پر ہر طرف سے ذلّت چھائی ہوگی، ان کو دوزخ کے جیل خانے کی طرف چلایا جائے گا، جس کا نام بولس ہے، ان کے اوپر آگوں کو جلانے والی آگ چڑھی ہوگی، ان کو دوزخیوں کے جسم کا فُضلہ اور نچوڑ پلایا جائے گا۔ [مشکوٰۃ]

مال ودولت جن کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانی فُضلات سے بھی کم ہے، مال پر گھمنڈ وغرور کرنا، اور اس کی وجہ سے تکبر کرنا، اور دوسروں کو حقیر جاننا بہت بڑی حماقت ونادانی ہے۔ مالدار انسان کا کوئی کمال نہیں، یہ تو انسان کے وجود سے علیحدہ خارجی چیز ہے، انسان کے اپنے ذاتی جو عمدہ اخلاق ہیں، جن میں تواضع اور انکساری سرِ فہرست ہے، ان سے انسان میں فضیلت وبرتری آتی ہے، اور لوگوں میں عزّت واحترام بڑھ جاتا ہے۔

البتہ! اگر مال جائز اور صحیح ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو، اور حقوق اللہ تعالیٰ وحقوق العباد کی پاسداری کے ساتھ ہو، اور صاحبِ مال میں انکساری وتواضع موجود ہو، اور یہ مال جائز حقوق میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ ہو، تو پھر یہ مال اَلْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ کا مصداق ہوگا، اور ذخیرۂ آخرت بنے گا، جس کا ایک ایک ذرّہ اجرو

ثواب کے پہاڑوں جتنا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ فی نفسہٖ مالدار ہونا کوئی انسان کی فضیلت اور کمال کی چیز نہیں، اہلِ دنیا میں جو یہ رواج ہے کہ مالدار اور صاحبِ اقتدار کو بڑا سمجھا جاتا ہے، خواہ کافر اور ملحد اور زندیق اور ظالم اور فاسق و فاجر ہی ہو، یہ دنیا والوں کی جہالت اور حماقت والا غیر دانشمندانہ فیصلہ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک پہاڑوں جتنے مال کی حیثیت مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہاری شکل وصورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا ، اور نہ ہی ان کی کوئی حیثیت ہے، البتہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے احوال اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ [مشکوٰۃ]

غنی اور فقیر کا فرق آزمائش کے لئے ہے:

پھر فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ﴾ (اور ہم نے اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے بعض کو بعض کے ذریعہ تاکہ وہ کہیں: کیا یہی لوگ ہیں جن پر ہمیں چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا)۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ اس دنیا میں غنی اور فقیر کا جو فرق رکھا گیا ہے، اور دوسری حیثیتوں سے جو امتیاز ہے اس میں حکمت ہے، اور وہ حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض کے ذریعے آزمائش میں ڈالا ہے، جو غنی ہیں وہ فقیر کو حقیر سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ یہ حکمت بھی ہے کہ اگر سارے لوگ یکساں غنی ہوں یا سارے فقیر تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو کر رہے گا، اور معاشرہ مکمل مفلوج ہو جائے گا۔

اسی طرح دوسری طرح کی جو چھوٹائی بڑائی پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے بڑے بننے والے چھوٹوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں، یہ ایک آزمائش ہے۔ جن لوگوں کو کسی طرح جو برتری حاصل ہے وہ بجائے نعمت دینے والے کا شکر ادا کرنے کے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں، جو اس نعمت سے محروم ہیں، اگر چھوٹے لوگ نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ نعمت دینے والے کی طرف متوجہ ہوتے ، اور اس کا شکر ادا کرتے۔ لیکن مال و دولت ، اختیار اور اقتدار کے نشہ میں دوسروں کو حقیر جاننے کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں، اور اس طرح سے امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔

اگر سب ہی برابر ہوتے تو کوئی کسی کو حقیر نہ جانتا، جو لوگ مال و دولت اور اقتدار والے ہیں ان کے غرور و تکبر کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے کو ہر خیر کا مستحق سمجھتے ہیں، غریبوں اور مسکینوں کو دینی برتری ملنے کا بھی اہل نہیں سمجھتے ، اور وہ کہتے ہیں کہ کیا یہ لوگ جن کے پاس ایک وقت کا کھانے کو نہیں اس لائق ہیں ان کو ہدایت مل جائے؟ اور ہم ہدایت

سے محروم رہ جائیں؟ جس دین کو انہوں نے اختیار کیا ہے اگر یہ ہمارے دین سے بہتر ہوتا تو یہ لوگ اسے کیوں اختیار کرتے؟ سورۂ احقاف میں فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ﴾ [الأحقاف: ۱۱] (اور کافروں نے مؤمنین کے بارے میں کہا کہ: اگر یہ چیز بہتر ہوتی جو انہوں نے اختیار کی ہے تو یہ ہم سے آگے نہ بڑھ جاتے)۔

دولت مند ہر طرح کی دینی و دنیاوی برتری کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے ہمارے دین کے خلاف دوسرا دین اختیار کیا اگر چہ دلائلِ واضحہ کے اعتبار سے وہ حق ہے، لیکن چونکہ ہم نے اختیار نہیں کیا اس لئے وہ قابلِ قبول نہیں۔ اس طبقہ کے لوگوں نے اپنا یہ حق خود سے تجویز کر لیا ہے اپنے خالق اور مالک کے قانون تکوینی اور تشریعی کو نہیں دیکھتے، اور یہ نہیں سمجھتے کہ جس نے ہمیں مال عطا کیا ہے وہ دوسروں کو ہدایت عطا فرما سکتا ہے، مالدار ہی دین حق پر ہوں اور غریب ہی باطل پر ہوں، یہ کوئی تکوینی قانون نہیں ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے مال و دولت عطا فرمایا ہے وہ غریبوں کو حقیر جاننے کے بجائے منعمِ حقیقی کی طرف رجوع کرے، اور وہ طریقہ تلاش کرے جو اس کے ربّ کو پسند ہے، اور وہ ناشکری و نافرمانی سے پرہیز کرے، اور جب حق بات دیکھے یا سنے تو فوراً اسے قبول کرے۔ چونکہ غریبوں نے حق کو قبول کر لیا ہے اس لئے ہم اسے قبول نہیں کرتے، بلکہ ہم اسے حق سمجھتے ہی نہیں۔

آج کل ہمارے زمانہ میں روشن خیال نام نہاد مسلمان بھی یہی کہتے ہیں، انہیں مغربی تعلیم نے یہی سکھایا اور پڑھایا، جو کبھی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمیں ملاؤں کے اسلام کی ضرورت نہیں، اس کلمۂ کفر کو وہ صبح وشام رٹ لگا کر پڑھتے ہیں، اور جیسے فرعون نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو فسادی اور دہشت گرد کہا تھا، یہ موجودہ مغربی تہذیب وتمدّن کے پجاری علماء حق کو بھی یہی کہتے پھرتے ہیں، اور جدید اسلام اور روشن خیالی پر فخر کرتے ہیں۔

انہیں روزِ قیامت معلوم ہو جائے گا کہ ان کا اسلام خود ساختہ تھا، اور وہ حقیقی اسلام سے بہت ہی دور تھے، اسلام ایک ہے، اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا، اس میں کسی ترمیم اور کمی وزیادتی کی کوئی ادنیٰ گنجائش بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ دینِ الٰہی ہے، اٹل ہے، پختہ ہے، یہ کسی ملک کا آئین نہیں جسے اسمبلیوں کے ذریعہ منسوخ کیا جا سکے، یا اس میں کسی ترمیم کی گنجائش ہو، قرآن کریم نے واضح کیا: ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکھف: ۲۹] (جو چاہے ایمان لے آئے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے)۔

یعنی اسلام قیامت تک بلا کم وکاست یہی رہے گا، خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے، ہر شخص کی اپنی مرضی، نہ

اسلام کسی کا محتاج ہے، نہ پیغمبرِ اسلام، نہ حق تعالیٰ جل شانہ۔ پھر فرمایا:

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ﴾ کیا اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو خوب نہیں جانتا؟ یعنی اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ شکر گزار بندے کون ہیں، غریبوں کے پاس مال نہیں، پھر بھی شکر گزار ہیں، اور اس شکر گزاری کی صفت ان کے لئے حق بات کے اختیار کرنے اور حق پر قائم رہنے کا ذریعہ بن گئی، اور جن لوگوں کے پاس مال و دولت ہے وہ ناشکرے ہیں، اور کفرانِ نعمت و کبر و غرور میں مست ہیں۔

زمانۂ نبوت میں ایسے بہت سے متکبر تھے جن کا ذکر آیت کریمہ میں ہوا، آج بھی ایسے لوگوں کی بہتات ہے جو اپنے مال و سرمایہ اور اقتدار کے نشہ میں دین سے وابستہ رہنے والوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ مالدار لوگ اسلام کے دعوے دار بھی ہیں، مگر اسلام کی روح اور اعمالِ صالحہ کی خوشبو سے ایسے محروم ہیں جیسے غیر مسلم اقوام۔ یہ لوگ اپنے سے کمتر مال والوں اور عوام الناس لوگوں کو اتنا حقیر سمجھتے ہیں، کہ ان کے ساتھ نشست و برخاست تو کجا، ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے ہیں۔ یہ لوگ مساجد، مدارس، طلبہ، علماء طبقہ کو اپنے اوپر بوجھ سمجھتے ہیں، بلکہ صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ معاشرے پر بوجھ ہیں، اور ہر قسم کی ترقی میں رکاوٹ ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اسلام کے سب سے پہلے مؤذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے نام پر اپنے بچوں کا نام بھی رکھنے کو تیار ہیں، لیکن اپنے بچے کو مؤذن تو کیا بناتے دوسرے اذان دینے والوں کو حقیر جانتے ہیں، بلکہ لاؤڈ سپیکر پر اذان سن کر سیخ پا ہو جاتے ہیں کہ ہمارے آرام میں خلل پیدا ہوا، بچوں کی نیند خراب ہوگئی، اس طرح مؤذن کو مسجد کی روٹیاں کھانا حرام کھانے سے ہزاروں درجہ بہتر اور افضل ہے۔

یہ لوگ سودی کاروبار کر کے دفتروں میں محکموں کے فنڈ اپنے کھاتے میں جمع کر کے اور بھاری رشوتیں لے کر کیش جمع کرتے ہیں، یہ سب جہنم کے انگارے بن کر انہیں تباہ کریں گے۔ جب میدانِ محشر میں حاضر ہوں گے تو ان کا حال بُرا اور نہایت قابلِ دید پریشان کن ہوگا، جبکہ مسجد کا مؤذن بغیر کسی دار و گیر کے سیدھا جنت کا رخ کرے گا، اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جس گھوڑے پر ہم سوار تھے وہ لکڑیوں کا بنایا ہوا گدھا تھا، کاش اگر یہ ناعاقبت اندیش اپنی پیدائش اور مرحلہ وار زندگی پر غور کر کے اپنے خالق و مالک کے حکموں پر چلنے کا اہتمام کرتا تو اس کے لئے کتنا اچھا اور مفید ہوتا؟ پھر فرمایا:

﴿وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ﴾ اس کے متعلق ائمہ تفسیر کے دو قول ہیں: اکثر حضرات نے ان آیات کو

آیاتِ سابقہ اور واقعۂ سابقہ ہی سے متعلق قرار دیا ہے، اور اس کی تائید میں یہ روایت پیش کی ہے کہ جب رؤسائے قریش نے بواسطۂ ابو طالب یہ مطالبہ کیا کہ آپ کی مجلس میں غریب اور ادنیٰ درجہ کے لوگ رہتے ہیں، ان کی صف میں بیٹھ کر آپ کا کلام ہم نہیں سن سکتے، اگر ہمارے آنے پر ان لوگوں کو آپ مجلس سے ہٹا دیں تو ہم آپ کا کلام سن سکتے ہیں، اور غور کر سکتے ہیں۔

اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں، مسلمان تو اپنے مخلص ساتھی ہیں، ان سے کہہ دیں گے کہ تھوڑی دیر آپ لوگ مجلس سے دور رہیں، یہ بُرا نہیں مانیں گے، ممکن ہے کہ یہ رؤسائے قریش اللہ تعالیٰ کا کلام سنیں اور مسلمان ہو جائیں۔ لیکن آیاتِ سابقہ میں اس مشورہ کے خلاف یہ حکم نازل ہوا کہ ایسا ہر گز نہ کیا جائے، ایسا کرنا ظلم اور بے انصافی ہے، اس حکم کے نازل ہونے پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنی رائے اور مشورہ کی غلطی واضح ہوئی، اور ڈر گئے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف رائے دے کر گنہگار ہو گیا، اس کی معذرت پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے، اس پر یہ آیات متذکرہ ان کی تسلی کے لئے نازل ہوئیں۔

جن کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو گزشتہ غلطی پر مؤاخذہ نہ ہونے سے مطمئن فرما دیں، بلکہ صرف یہی نہیں کہ اس غلطی پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا، بلکہ اُرحم الرّاحمین کا یہ قانون بھی ان کو بتا دیں کہ جب بھی کوئی مسلمان جہالت سے کوئی گناہ کر بیٹھے، اور پھر اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر اس سے توبہ کر لے، اور آئندہ کے لئے اپنے عمل درست کرنے کا پختہ عزم کر لے، تو اللہ تعالیٰ اس کے گزشتہ گناہوں کو معاف فرما دیں گے، اور آئندہ اسے اپنی دنیوی واُخروی نعمتوں سے محروم نہ فرمائیں گے۔

اور بعض مفسرین حضرات نے ان آیات کے مضمون کو ایک مستقل ہدایت نامہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے، کہ یہ سابقہ واقعہ اور دیگر ان تمام لوگوں کے لئے ہے جن سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا، پھر ندامت ہوئی، اور توبہ کر کے اپنے عمل کو درست کر لیا، تو اللہ تعالیٰ کی مغفرتِ عامہ وتامہ شامل حال ہو کر تمام گزشتہ گناہوں کی مغفرت فرمائیں، یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مرتبہ مذکور ہے، پھر انعام واکرام اور بے پناہ اعزاز کا اظہار فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طرف سے بندوں پر سلام بھیجنا یہ وہ عظیم تحفہ ونعمت ہے جس کے مقابلے میں ہفت اقلیم بھی ہیچ ہیں۔ پھر كَتَبَ کے کلمہ میں اس کی مزید پختگی کا اعلان ہے، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ لکھا گیا ہے، اور کلمہ رَبّ سے اشارہ ہے کہ تمہارے پروردگار

تمہیں نوازے گا، اور کسی صورت تمہارے پالنے والا اپنے پالے ہوئے کو ضائع نہیں کرتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا، اور ہر ایک کی تقدیر کا فیصلہ فرمایا، تو ایک کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ لکھا: اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ (غَلَبَتْ) غَضَبِیْ۔ [متفق عليه] یعنی میری رحمت غضب پر مقدم اور غالب ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمتیں سو (۱۰۰) ہیں، جن میں سے صرف ایک رحمتِ عامہ دنیا والوں کے لئے ہے، باقی ننانوے رحمتیں مؤمنین کے لئے مخصوص ہیں۔ [متفق عليه ومسند أحمد]

﴿اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ لفظِ بِجَهَالَةٍ کے معنی ہیں: نادانی۔ اس سے علمی جہالت مراد نہیں، عملی جہالت مراد ہے، کیونکہ جان بوجھ کر گناہ کرنے والا بھی توبہ واصلاح کے بعد مغفرت کا مستحق ہے۔ گناہ اکثر وبیشتر عملی جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کو گناہ جانتے ہوئے نادانی اور ناعاقبت اندیشی سے گناہ کرنا، اور اس کے مؤاخذہ پر نظر نہ رکھنا، یعنی غافل رہنا یہ ایک قسم کی جہالت ہے۔

قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ کی بے شمار نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ خالص توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے، خواہ غفلت وجہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، یا جان بوجھ کر شرارتِ نفس اور اتباعِ خواہشات کی وجہ سے ہو۔ اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں گناہگاروں سے مغفرت اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے: ایک توبہ، دوسرے اصلاحِ عمل۔ توبہ نام ہے ندامت کا، اور آئندہ اصلاح کے معنی ہیں ترک گناہ کا مُصَمَّم اور پختہ ارادہ اور عملاً اجتناب وپرہیز، اور یہ حقوقِ متروکہ خواہ حقوق اللہ ہوں، مثلاً نماز روزہ، پس قضاء کر کے جان خلاصی کرلے، اگر حقوق العباد ہوں تو ادائیگی کرے، یا صاف ظاہر کر کے پھر معاف ہی کرائے، اگر موقع نہ ملے تو وصیت کرے، اور ورثاء کو مکمل اطلاع دیدے۔

فائدہ:

﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر رحمت لازم کی ہے۔ اربوں کھربوں انسان کفر وشرک اور کبیرہ گناہوں میں ہر لحہ مبتلا ہیں، اسی طرح غیر اسلامی ممالک میں خدا پرستی کا نام ونشان تک نہیں، تمام لوگ گناہوں اور بدترین گناہوں میں مصروف ہیں، اسلامی ممالک میں شرک وبدعت بھی بکثرت ہیں، مسلمانوں کے

پورے معاشرے غیر اسلامی اور باغیانہ ہیں، مگر رحمتِ الٰہی کے سایہ میں پوری خلقت زندگی گزار رہی ہے، کوئی عمومی عذاب نہیں آتا۔ یہی صفت اللہ تعالیٰ کے آخری رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمۃ للعلمین کی صفت سے نوازا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے کفار کی ایذاؤں اور تکالیف سے تنگ آکر طائف کا رخ کیا، شاید وہاں کے لوگ میری دعوت کو قبول کرلیں، فرمایا: جب میں نے طائف میں عبد یالیل بن عبد کلال اور دیگر سرداران کے سامنے اللہ تعالیٰ کا پیغام بیان کیا تو انہوں نے نہ صرف تکذیب کی، بلکہ شہر کے اوباش غنڈوں کو میرے پیچھے لگا دیا جنہوں نے سنگباری کر کے مجھے لہولہان کر دیا، حتیٰ کہ جسم کا خون جوتوں میں آکر جم گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بے ہوشی طاری ہوگئی، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرن ثعالب کے مقام پر بیٹھ گئے۔ اس سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفیق صرف حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے، وہاں حضرت جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تبلیغ اور اس قوم کا جواب اور رویہ اللہ تعالیٰ نے دیکھا اور سنا، اور مجھے ملک الجبال یعنی پہاڑوں کے فرشتے کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا ہے، اس فرشتے نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا، اور عرض کیا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہیں تو میں ان دو پہاڑوں أخشبین کو ملادوں، تاکہ مکہ اور طائف کے تمام لوگ ہلاک ہوجائیں۔ تو حضرت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ یہ سارے لوگ ہلاک ہوجائیں، کیونکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کی اولاد میں سے ایسے لوگ نکالیں گے جو توحید کے پرستار ہوکر شرک سے بیزار ہوجائیں گے، لہٰذا میں ان کی بدسلوکی کو معاف کر کے ان کے لئے اور ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ سے التجاء ودعا کرتا ہوں: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ چنانچہ مختصر عرصہ کے بعد ایسا ہی ہوا۔

قُلۡ اِنِّیۡ نُہِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ قُلۡ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَہۡوَآءَکُمۡ ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۵۶﴾ قُلۡ اِنِّیۡ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنۡ رَّبِّیۡ وَکَذَّبۡتُمۡ بِہٖ ؕ مَا عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ یَقُصُّ الۡحَقَّ وَہُوَ خَیۡرُ الۡفٰصِلِیۡنَ ﴿۵۷﴾ قُلۡ لَّوۡ اَنَّ عِنۡدِیۡ مَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنَ بِہٖ لَقُضِیَ الۡاَمۡرُ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ بِالظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجے: بے شک میں اس بات سے منع کیا گیا ہوں کہ ان کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔آپ فرمادیجئے: میں تمہاری خواہشوں کا اتباع نہیں کرتا، ایسا کروں تو میں گمراہ ہوجاؤں گا، اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ رہوں گا﴿۵۶﴾ آپ فرمادیجئے کہ: بے شک میں اپنے ربّ کی طرف سے دلیل پر ہوں، اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، میرے پاس وہ نہیں ہے جس کی تم جلدی کرتے ہو، کسی کا حکم نہیں ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے، وہ حق کو بیان فرماتا ہے، اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے﴿۵۷﴾ آپ فرما دیجئے: اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کی تم جلدی کررہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے﴿۵۸﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم نے ہمیشہ سے یہ اعلان کیا ہے کہ توحیدِ باری تعالیٰ کے علاوہ جتنے طریقے اور ادیان دنیا میں ہیں وہ سب باطل ہیں، اور گمراہ انسانوں کے خود ساختہ مکروہ طریقے ہیں، اور اہلِ حق حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو مِن جانبِ اللہ یہی حکم ہے کہ ایسے غلط طریقوں کو مٹادیں، اور کسی صورت میں ان مشرکین اور ان کے باطل عقائد واعمال کے ساتھ صلح نہ کریں، چنانچہ ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر خدا! آپ ان لوگوں سے فرمادیں کہ میں اپنے ربّ کے حکم کا پابند ہوں، میں معبودانِ باطلہ کی عبادت نہیں کرسکتا، میں ہر قسم کے غیر اللہ سے بری اور بیزار ہوں، جنہیں تم پکارتے اور ان کی عبادت کرتے ہو، مجھ سے کبھی یہ امید نہ رکھنا کہ میں کبھی تمہارے باطل عقائد واعمال کا ساتھ دے دوں، اور تمہاری نفسانی اور شیطانی خواہشات کا اتباع کروں (العیاذ باللہ)۔ اگر خدانخواستہ میں ایسا کروں تو تمہاری طرح میں بھی گمراہ ہوجاؤں گا، اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ رہوں گا۔ یہ بعینہٖ وہی بات ہے جس کا اعلان سورۃ الکٰفرون میں ہوگیا ہے۔

ثانیاً اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ آپ اعلان فرمادیجئے کہ میں اپنے ربّ کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں، مجھے پورا یقین ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا برحق نبی ہوں، رسول ہوں، اور میں جس بات کی دعوت دے رہا ہوں وہ برحق اور صحیح ہے، دلائلِ واضحہ میری سچائی اور میری دعوت کی حقانیت پر قائم ہیں، جس پر مجھے مکمل یقین ہے، کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے، میں حق کا داعی تمہاری باتوں کا کیسے ساتھ دے سکتا ہوں؟ مجھے اپنے دعوے اور صحتِ دلیل پر پورا یقین

ہے، اور تم اس کی تکذیب کر رہے ہو، تکذیب ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہو کہ اگر آپ سچے ہیں تو ہم پر کوئی عذاب لا کر دکھاؤ، یا قیامت برپا کرلو، ہمارے انکار و تکذیب کی وجہ سے ہم پر کوئی عذاب کیوں نہیں آتا؟

عذاب بھیجنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، میرے اختیار میں کچھ نہیں، حکم تکوینی ہو یا تشریعی سب اسی کے ہاتھ میں ہے، اور وہی مالک مختار ہے، اور تمہارا یہ ضد کرنا کہ عذاب آجائے تب ہی آپ کے دعوے کو سچا مانیں گے، یہ تمہاری جہالت اور حماقت کی بات ہے، کیونکہ عذاب آنے کے بعد جب تم رہو گے نہیں تو کیا تصدیق کرو گے؟ حق ہمیشہ دلائل سے واضح ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حق کو بیان فرمادیا، دلائل سے واضح کردیا، دلائل کے ہوتے ہوئے حق کو نہ ماننا اور عذاب کی آمد کو حق کے ثبوت کا ذریعہ سمجھنا یہ تمہاری غلط سوچ اور بے بنیاد مفروضہ اور فاسد سوچ ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری ہوا و ہوس کا پابند نہیں کہ تم جو کہو وہ ایسا کرے۔

ثالثاً یہ فرمایا کہ آپ اعلان فرمادیں کہ جس چیز کی تم جلدی مچاتے ہو، یعنی لانے کی وہ میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو کبھی سے میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا، یعنی عذاب آگیا ہوتا، وہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے، تم واضح حق کو نہیں مانتے، عذاب چاہتے ہو، اور ظلم کر رہے ہو، حق کو قبول نہ کرنا ظلم ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ظالموں کا پتہ ہے، وہ دنیا میں عذاب نہیں بھیجتا تو یہ نہ سمجھ لینا کہ آخرت میں بھی عذاب نہیں، آخرت کا عذاب بالکل اٹل ہے۔

❁ ❁ ❁

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾

ترجمہ: اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، ان کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہے اور تری میں ہے، اور نہیں گرتا ہے کوئی پتہ مگر وہ اس کو جانتا ہے، اور نہیں ہے کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں، اور نہیں ہے کوئی تر چیز اور خشک چیز مگر وہ کتاب مبین میں ہے ﴿۵۹﴾ اور وہی ہے جو تمہیں قبضہ میں لیتا ہے رات کو، اور

جانتا ہے جو کچھ کرتے ہو دن میں، پھر وہ تمہیں دن میں اٹھاتا ہے تاکہ پوری کر دی جائے میعاد مقرر، پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں ان کاموں کی خبر دے گا جو تم کیا کرتے تھے ﴿٦٠﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت قدرے تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، اجمالی طور پر علمِ الٰہی کو بہت سی جگہ بیان فرمایا ہے۔ اور: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [البقرة:۲۹۔الأنعام:۱۰۱] (وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے) کا عموم ہر چیز اور کائنات کے ہر ذرّہ کے علم کو شامل ہے۔ اس کا عموم موجودات، معدومات، ممکنات، ممتنعات، علویات، سفلیات غرض یہ کہ پوری کائنات کے اعراض واجسام ہر چیز کو شامل ہے۔ سورۂ نمل میں ارشاد ہے: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل:٦٥] (کہہ دیں: آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں جانتا سوائے اللہ کے)۔ اور سورۂ یونس میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ﴾ [یونس:٦١] (اور تمہارے ربّ سے کوئی ذرہ برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں)۔ اور سورۂ مائدہ میں فرمایا: ﴿أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ [المائدة:۹۷] (بیشک اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے)۔ سورۂ تغابن میں فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ﴾ [التغابن:۴] (اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو، اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو)۔ اور سورۂ طلاق میں فرمایا: ﴿وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ [الطلاق:۱۲] (اور یہ کہ اللہ کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے)۔

اسی طرح قرآن کریم کے دیگر بہت سے مقامات پر ربّ العزّت سبحانہ کے علم محیط وعلم کلّی کا بیان ہے، اور تذکرہ ہے۔ آیت بالا میں بیان فرمایا کہ غیب کی کنجیاں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں، انہیں صرف وہی جانتا ہے، خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے سب کو جانتا ہے، ہزاروں قسم کی مخلوقات جن کے متعلق علماء نے کہا کہ ان کی تعداد اسّی (۸۰) ہزار ہے، پھر ان کی اجناس اور انواع واصناف، اور ان کے افراد، نیز ان کے خواص، رنگ ونسل وجود وحیات اور بقاء وفناء وغیرہ، ان سب کا اسے علم ہے۔ ریت کے ذرات، سمندر اور دریاؤں اور بارشوں کے قطرات، درختوں اور جڑی بوٹیوں کے پتے، اور فرمایا کہ جو بھی پتہ گرتا ہے اسے اس کا علم ہے، زمین کی تہہ میں اندھیریوں میں، اور زمین

کے اندر پیٹ میں ساتویں زمین کی منتہٰی تک، اور زمین کے اوپر جو چیزیں ہیں تر ہوں یا خشک، نبات ہو یا جماد، کیڑے مکوڑے تک، یہ سب اس کے علم میں ہیں، اور کتاب مبین لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ (لوح محفوظ کی تشریح سورۂ بروج میں آئے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رطب سے مراد وہ ہے جو اگتا ہے، اور یابس سے مراد وہ ہے جو اگتا نہیں۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ رطب و یابس سے تمام اجسام مراد ہیں، اس لئے کہ اجسام کی دو ہی قسمیں ہیں: یعنی رطب اور یابس۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ رطب سے جاندار، اور یابس سے بے جان چیزیں مراد ہیں۔ اور بھی بہت سے اقوال ائمہ تفسیر سے منقول ہیں۔

مفسرین حضرات کی ایک جماعت نے کتاب مبین سے لوح محفوظ مراد لیا ہے، اللہ تعالیٰ سبحانہ کا علم ازلی اور ابدی ہے، اسے جاننے اور یاد رکھنے کے لئے کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ لوح محفوظ میں لکھنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ جو کچھ وجود میں آتا رہے فرشتوں کو اس کا علم ہوتا رہے کہ یہ سب معلوماتِ الٰہیہ میں سے ہے، اور مخلوقاتِ الٰہیہ میں سے ہے۔ اور ایک حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ مکلف ہیں وہ یہ یقین کرلیں کہ ہمارے اعمال میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو لکھنے سے رہ گئی ہو۔

اس کتاب کو لوح محفوظ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ تحریف سے اور شیاطین کے وہاں تک پہنچنے سے محفوظ ہے، کوئی اس کو بدل نہیں سکتا، اور یہ بھی ہے کہ محفوظ سے مراد مکتوب اور یادداشت ہو، کیونکہ لکھی ہوئی چیز ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رہتی ہے۔

گناہوں سے بچنے کا اکسیری نسخہ:

تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کا طغرائے امتیاز اور اس کا رکنِ اعظم عقیدۂ توحید ہے، جس کی شاخیں تمام عالم میں تکوینی اور تشریعی طور پر پھیلی ہوئی ہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جہاں توحیدِ الٰہی کا منظر و مظہر نہ ہو، اور وہ ذرہ توحید پر گواہ نہ ہو۔

فَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ اٰیَۃٌ ★ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ

اور یہ بات ظاہر ہے کہ توحید اللہ تعالیٰ کو صرف ایک ماننے کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کو تمام صفاتِ کمال میں یکتا و بے مثل ماننے، اور اس کے سوا کسی مخلوق کو ان صفاتِ کمال میں اس کا شریک وسہیم نہ سمجھنے کا نام توحید ہے۔ جس

طرح کلمہ طیبہ نفی واثبات کا نام ہے، ٹھیک اسی طرح تمام صفاتِ کمال کا حق تعالیٰ شانہ کے لئے اثبات، اور تمام مخلوقات سے ان صفات کی نفی کرنے کا نام توحید ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال جنہیں علماء متکلمین نے منتخب کیا وہ یہ ہیں: (۱) حیات۔ (۲) علم۔ (۳) قدرت۔ (۴) سمع۔ (۵) بصر۔ (۶) ارادہ۔ (۷) مشیت۔ (۸) خلق۔ (۹) رزق۔ بعض علماء نے دسواں حساب ومجازات بھی شمار کیا ہے۔ مگر متکلمین کے نزدیک روزِ قیامت حساب ومحاسبہ قدرت والی صفت کا حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ ان سب صفات میں ایسا کامل ہے کہ اس کے سوا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہوسکتی۔ پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں: ایک علم، دوسری قدرت۔ اس کا علم بھی تمام موجود وغیر موجود، ظاہر اور مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ہر ذرہ پر حاوی اور محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی سب پر پوری طرح محیط ہے۔ مذکورہ دو آیتوں میں انہی دو صفتوں کا بیان ہے، اور یہ دو صفتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں پر مکمل یقین اور اس کے استحضار کی کیفیت پیدا کرلے تو اس سے کوئی جرم وگناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔

ظاہر ہے کہ اگر ایک انسان اپنے ہر قول وعمل، اور نشست وبرخاست میں ہر قدم پر ہر لمحہ یہ مستحضر رہے کہ ایک علیم وخبیر اور قادر مطلق مجھے ہر وقت ہر لمحہ دیکھ رہا ہے، اور میرے ظاہر وباطن اور قلبی ارادوں تک سے واقف وباخبر ہے تو یہ استحضار کبھی اس کا قدم اس قادر مطلق کی نافرمانی کی طرف نہ اٹھنے دے گا، اس لئے یہ دونوں آیتیں انسان کو انسان کامل بنانے، اور اس کے اقوال واعمال اور اخلاق کو صحیح کرنے اور درست رکھنے میں اکسیری نسخہ ہیں۔

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ لفظ مَفَاتِح جمع ہے، اس کا مفرد مَفْتَح بفتح میم بھی ہوسکتا ہے، جو خزانہ کے لئے بولا جاتا ہے، اور مِفتح بکسرِ میم بھی ہوسکتا ہے، جس کے معنی ہیں: کنجی لفظ۔ مَفَاتِح میں دونوں کی گنجائش ہے، اس لئے بعض مفسرین اور مترجمین نے اس کا ترجمہ خزانوں سے کیا ہے، اور بعض نے کنجیوں سے، اور حاصل دونوں کا ایک ہی ہے، کیونکہ کنجیوں کا مالک ہونے سے بھی خزانوں کا مالک ہونا مراد ہوتا ہے۔

قرآنی اصطلاح میں علمِ غیب اور قدرتِ عامہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ مخصوصہ ہے، فقط:

لفظ غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں، یا وجود میں تو آچکی ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو مطلع نہیں ہونے دیا۔ [مظهري]

پہلی قسم کی مثال وہ تمام حالات وواقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں، یا کائنات میں آئندہ پیش آنے

والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً یہ کہ کون کب اور کہاں پیدا ہوگا؟ کیا کیا کام کرے گا؟ بارش، قحط، آبادی، جنگ طوفان زلزلے وغیرہ کب آئیں گے؟ کہاں کہاں آئیں گے؟ نتیجہ کیا کچھ ہوگا؟ وغیرہ۔

دوسری قسم کی مثال عورت کے پیٹ کا حمل ہے، جو رحم میں وجود اختیار کر چکا ہے، مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی پیدائش سے لے کر موت تک کیا کیا مراحل ہوں گے؟ اسی طرح اور ایسی چیزیں جو وجود میں آجانے کے باوجود مخلوق کے علم ونظر سے غائب ہیں۔

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں خزانے غیب کے، اس کے پاس ہونے سے مراد اس کی ملکیت اور قبضہ میں ہونا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ غیب کے خزانوں کا علم بھی اس کے قبضہ میں ہے، اور ان کو وجود وظہور میں لانا بھی اسی کی قدرت میں ہے کہ کب کس وقت اور کتنا کتنا وجود میں آئے گا؟ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَاۗىِٕنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ [الحجر: ۲۱] یعنی ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں، مگر ہم ہر چیز کو ایک خاص انداز سے نازل کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جملہ سے حق تعالیٰ کا بے مثال کمال علمی بھی ثابت ہوگا، اور کمالِ قدرت بھی، اور یہ بھی کہ یہ علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ جل شانہ کی مخصوص صفت ہے، اور یہ کسی بھی مخلوق کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ آیت میں لفظ عِنْدَهٗ کو مقدم کر کے قواعدِ عربیت کے مطابق اس حصر اور اختصاص کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے آگے اس اشارہ کو صراحت میں تبدیل کر کے پوری طرح دلنشین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ یعنی ان خزائنِ غیب کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے اس جملہ سے دو باتیں ثابت ہوئیں: اوّل حق تعالیٰ کا تمام غیب کی چیزوں پر علم محیط کے ساتھ مطلع اور ان سب پر قدرتِ کاملہ کے ساتھ قادر ہونا۔ دوسرے ذات حق تعالیٰ جل شانہ کے سوا کسی مخلوق یا کسی چیز کو ایسا علم وقدرت حاصل نہ ہونا۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں لفظِ غیب کے جو معنی اور مطلب جو اس سے پہلے اوپر بیان کئے گئے ہیں کہ وہ چیزیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا آچکی ہیں، مگر ابھی تک کسی مخلوق پر ان کا ظہور نہیں ہوا، اگر ان کو پیشِ نظر رکھا جائے تو مسئلۂ غیب پر سطحی نظر میں جو جو شبہات عوام کو پیش آیا کرتے ہیں خود بخود ختم ہو جائیں، لیکن عام طور پر لوگ لفظِ غیب کے لغوی معنی لیتے ہیں کہ جو چیز ہمارے علم ونظر سے غائب ہو خواہ دوسروں کے نزدیک اس کا علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود

ہوں اس کو بھی غیب کہنے لگتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں، مثلاً علم نجوم، جفر، رمل، یا ہتھیلی کی لکیروں، یا بکری کے شانہ وغیرہ سے جو آئندہ واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے، یا کشف والہام کے ذریعہ کسی شخص کو آئندہ واقعات کا علم ہوجاتا ہے، یا مان سون کا رخ اور اس کی قوّتِ رفتار کو دیکھ کر موسمیات کے ماہرین ہونے والے بادوباران کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہیں، اور ان میں سے بہت سی باتیں صحیح بھی ہوجاتی ہیں، یہ سب چیزیں عوام الناس کی نظر میں علم غیب شمار ہوتی ہیں، اس لئے آیتِ مذکورہ پر یہ شبہات ہونے لگتے ہیں کہ قرآن کریم نے تو علمِ غیب کو ذات حق تعالیٰ کی خصوصیت بتلایا ہے، اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

جواب واضح ہے کہ کشف والہام یا وحی کے ذریعہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندۂ خاص کو کسی آئندہ واقعہ کی اطلاع دے دی تو قرآنی اصطلاح میں وہ علم غیب نہیں کہلائے گا، اسی طرح اسباب وآلات کے ذریعہ جو علم حاصل کیا جاسکے وہ بھی اصطلاح قرآنی کے لحاظ سے علم غیب شمار نہیں ہوگا، بلکہ غیب کی خبر ہوتا ہے، جس کو اَنْبَاءُ الْغَیْبِ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے کہ ارشاد ہے: ﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ﴾ [ھود: ۴۹] یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کے ذریعے بھیجتے ہیں۔ کیونکہ غیب وہ ہوتا ہے جو بغیر کسی واسطے کے معلوم ہو، یعنی نہ تو حواس خمسہ کے ذریعہ معلوم ہو، اور نہ کشف والہام یا وحی کے ذریعے، اور نہ ہی فہم وادراک اور عقل وتجربے کے ذریعہ، کیونکہ یہ سب علم کے ذرائع ہیں، اور غیب وہ ہوتا ہے جو بغیر کسی ذریعہ اور واسطہ کے حاصل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے، جسے کسی چیز کو معلوم کرنے کے لئے نہ کسی واسطے کی ضرورت ہے، نہ کسی سبب وآلے کی، اور نہ کسی مادے کی۔

اب محکمۂ موسمیات کی خبریں یا نبض دیکھ کر، ایکسرے دیکھ کر مریض کے مخفی حالات اندرونی حالات بتلادینا یہ سب اسباب وآلات کے ذریعہ سے ہیں، جو کہ غیب میں شمار نہیں ہوتے، وجہ یہ ہے کہ محکمۂ موسمیات کو یا کسی حکیم اور ڈاکٹر کو ایسی خبریں دینے کا موقع جب ہی ہاتھ آیا جب ان واقعات کا مادہ پیدا ہوکر ظاہر ہوجاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ابھی اس کا ظہور عام نہیں ہوتا، آلات کے ذریعہ ماہرینِ فن کو ظاہر ہوتا ہے، عوام اس سے بے خبر ہوتے ہیں، اور جب یہ مادہ قوی ہوجاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مثلاً محکمۂ موسمیات مہینہ دو مہینہ بعد ہونے والی بارش کی خبر آج نہیں دے سکتا، کیونکہ ابھی اس بارش کا کوئی مادہ سامنے نہیں آیا، اسی طرح کوئی حکیم یا ڈاکٹر سال دو سال پہلے کی کھائی ہوئی، یا دو سال بعد کھائی جانے

والی دوا یا غذا وغیرہ کا پتہ آج نبض دیکھ کر نہیں دے سکتا، کیونکہ اس کا کوئی اثر عادۃً نبض میں نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ کسی چیز کے آثار، علامات نشانات دیکھ کر اس کے وجود کی خبر دے دی جاتی ہے، اور جب اس کے آثار و نشانات اور مادہ ظاہر ہو چکا تو اب وہ غیب میں شامل نہ رہا، بلکہ مشاہدہ میں آگیا۔ البتہ لطیف یا ضعیف ہونے کی وجہ سے عام مشاہدہ میں ابھی نہیں آیا، جب قوت پکڑ لے گا تو عام مشاہدہ میں بھی آجائے گا۔ علاوہ ازیں ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ و اندازہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے، علم جو یقین کا نام ہے وہ ان میں سے کسی چیز سے کسی کو حاصل نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان خبروں کے غلط ہونے کے بے شمار واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ [معارف القرآن]

خلاصہ:

علم غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے، وہ جس کسی کو جتنا علم عطا فرمادے اسی قدر علم حاصل ہو جاتا ہے آلات و اسباب کے ذریعہ جو علم حاصل ہو وہ علم غیب نہیں ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جو تمہیں اٹھالیتا ہے رات کو، یعنی سلا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ شانہ نیند کو طاری فرمادیتا ہے جو ایک گونہ روح قبض کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا: اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ۔ [مشکوۃ] نیند موت کا بھائی ہے۔

یہ سلانا اور پھر جگا دینا سب اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور مشیت سے ہے، جو دوبارہ زندہ ہونے کا نمونہ ہے، اور وہ جانتا ہے جو دن میں تم کاروبار اور اعمال کرتے ہو چونکہ لوگ عام طور پر رات ہی کو سوتے ہیں، اور دن کو کام کرتے ہیں، اس لئے نیند کو رات کی طرف اور کسبِ عمل کو دن کی طرف منسوب فرمادیا، ورنہ جو لوگ دن کو سوتے ہیں رات کو کام کرتے ہیں ان کا بھی ہر عمل اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ سے ہے، اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔ سونا اور جاگنا انفرادی موت و حیات ہے، اور قیامت کا وقوع اجتماعی موت ہے، اور حشر و نشر اجتماعی حیات کا نام ہے۔

فرمایا: اجتماعی موت، یعنی وقوعِ قیامت کے بعد اسی طرح عارضی موت، یعنی رات کے سونے کے بعد تمہیں اٹھاتا ہے، یعنی بیدار کرتا ہے، تاکہ وقتِ مقررہ پورا کر دیا جائے۔ دنیا کی بیداری اور خواب اور موت و حیات اور اکتسابِ اعمال کو بیان فرمانے کے بعد قیامت کی حاضری ہوگی، اور ساری خلقت قبروں سے اٹھ کر زندہ ہو کر

میدانِ محشر کا رخ کرے گی، اور وہاں جا کر ہر ہر طبقہ کے لوگوں کا الگ انبیاء، صدیقین، شہداء، علماء، نمازی، بے نماز، مجاہدین، سود خور، شرابی، زانی، چور وغیرہ الگ الگ، اسی طرح پھر حساب کا مرحلہ اور وزنِ اعمال کا سلسلہ شروع ہو گا، اور تمام دنیوی کردار و اعمال کا نتیجہ سامنے آئے گا، چاہئے کہ ہر شخص ابھی سے فکر مند ہو، اور تیاری کرے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا
وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾
قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ: اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے، اور وہ تمہارے اوپر نگرانی کرنے والے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آجاتی ہے تو اس کو ہمارے فرشتے قبض کر لیتے ہیں، اور وہ کوتاہی نہیں کرتے ﴿۶۱﴾ پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے جو ان کا مالک حقیقی ہے، خبردار اسی کے لئے حکم ہے، اور وہ حساب لینے والوں میں سب سے جلدی حساب لینے والا ہے ﴿۶۲﴾ آپ فرمائیے کہ: کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور سمندر کی اندھیریوں سے؟ تم اسے چپکے چپکے عاجزی کے ساتھ پکارتے ہو، بلاشبہ اگر اس مصیبت سے ہمیں نجات دے دی تو ہم ضرور بالضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے ﴿۶۳﴾ آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ تمہیں مصیبت سے نجات دیتا ہے، اور ہر بے چینی سے، پھر تم شرک کرتے ہو ﴿۶۴﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ جل شانہ کا علم جس طرح کائنات کے ہر ہر ذرہ پر محیط ہے، اسی طرح اس کی قدرت وتصرف بھی سارے جہاں پر محیط ہے، کیوں نہیں یہ پورا جہاں اس کی مخلوق اور اسی کی ملکیت تو ہے۔ آیت کریمہ میں اسی جامع قوت کا اثبات ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنے سب بندوں پر ایک قوتِ قاہرہ رکھتا ہے، اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے، اسے کوئی عاجز نہیں کر سکتا، وہ اپنے بندوں کے بارے میں جو کچھ ارادہ فرمائے اس سے اسے کوئی نہیں روک سکتا، جب وہ انہیں زندہ رکھنا چاہتا ہے تو حفاظت کرنے والے فرشتے ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیتا ہے، کسی کی

مجال نہیں کہ وہ اس کی حفاظت میں رخنہ اندازی کرے، اور جب کسی بندے کا یا بہت سے بندوں کا مقررہ وقت عمر کا پورا ہو جاتا ہے تو یہی حفاظت کرنے والے فرشتے اس کی موت کا فیصلہ کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں وہ فرشتے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کمی یا زیادتی اور کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔

فائدہ:

جاننا چاہئے کہ انسان کے ساتھ متعلق فرشتے تین قسم کے ہیں: پہلی قسم کے وہ فرشتے ہیں کہ انسان کی مضرتوں سے حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الرعد:۱۱] (ہر شخص کے آگے اور پیچھے وہ نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے باری باری اس کی حفاظت کرتے ہیں)۔

دوسری قسم وہ ہے کہ وہ فرشتے انسان کے اچھے بُرے اعمال کی کتابت ولکھائی کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [الانفطار:۱۱] (حالانکہ تم پر کچھ نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔ وہ معزز لکھنے والے۔ جو تمہارے سارے کاموں کو جانتے ہیں)۔ ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ [سورۂ ق:۱۸] (انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا مگر اس پر ایک نگران (فرشتہ) مقرر ہوتا ہے، ہر وقت تیار)

تیسری قسم کے وہ فرشتے ہیں کہ انسان کی جان نکالنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں، یہ ایک بڑی فوج ہے، جن کا سربراہ ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام ہے، اس لئے آیت کریمہ میں تَوَفّی ،اور موت کی اسناد کبھی ملک الموت کی طرف ہوتی ہے، جیسے: ﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ﴾ [الم تنزیل السجدة:۱۱] (تم کو موت دیتا ہے موت کا فرشتہ، جو تم پر مقرر کیا گیا ہے)۔ اور یہاں دیگر ملائکہ کی طرف اسناد ہے، جیسے: ﴿تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾۔ یہ فرشتے ملک الموت کے اعوان ومددگار ہوتے ہیں، اور کبھی یہ نسبت حق تعالیٰ شانہ کی طرف ہے، جیسے ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ [الزمر:۴۲] (اللہ موت دیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت)۔

لہٰذا تینوں اسناد صحیح ہیں، اللہ تعالیٰ حاکم ہے، ملک الموت قابض ونگران ہے، دوسرے فرشتے کام انجام دینے والے ہوتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا کہ عام لوگوں کی ارواح کا قبض فرشتوں کے ذریعہ سے ہے، اور خواص کے لئے حضرت ملک الموت کے ذریعہ ہے، جبکہ اُخص الخواص کے لئے خود ذات باری تعالیٰ ہے۔

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے ☆ کہ بوقت جان سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

(امیر خسرو)

طبرانی اور حلیۃ الاولیاء اور ابن مندہ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک انصاری صحابی موت کی کشمکش میں مبتلا تھے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے، اور وہاں ملک الموت بھی حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملک الموت سے فرمایا: یہ مؤمن ہے، جان کنی میں اس کے ساتھ نرمی اختیار کرنا، ملک الموت نے جواب دیا: آپ یقین جانیں مطمئن رہیں، میں ہر مؤمن کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتا ہوں، میں ہر مؤمن کا بھائی اور دوست ہوں۔

پھر موت کے فرشتوں نے کہا کہ جب ہم کسی شخص کی روح قبض کر کے مکان کے صحن میں ہوتے ہیں تو میت پر رونے چلانے والوں کو کہتے ہیں کہ ہم نے تو کوئی گناہ اور غلطی نہیں کی، ہم نے تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے، اگر تم صبر کرو گے تو اجر پاؤ گے، اگر بے صبری کرو گے تو محروم رہو گے، اور گرفت میں آجاؤ گے، ملک الموت نے یہ بھی کہا کہ میں تو ہر وقت گھروں میں حاضری دیتا ہوں، اور منتظر رہتا ہوں۔

حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ملک الموت نماز کے اوقات پر مسجدوں میں لوگوں کو تلاش کرتا ہے، پھر مرتے وقت نمازیوں پر شفقت کرتا ہے، اور انہیں کلمہ شریف کی تلقین کرتا ہے، وہاں سے شیطانوں کو بھگا دیتا ہے۔ حضرت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی البدور السافرہ میں یہی فرمایا کہ نیک اعمال خاص کر نماز باجماعت کی برکت سے سکرات کی آسانی اور کلمہ طیبہ کا ورد نصیب ہوجاتا ہے۔ [البدور، مظهري]

﴿ثُمَّ رُدُّوٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ﴾ پھر وہ واپس کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف جو ان کا حقیقی اور واقعی مالک ہے۔ مؤمن متقی موحد کی روح کی واپسی مقامِ علیین کی طرف، اور کافر ومشرک فاسق وفاجر کی روح مقام سجین کی طرف۔ سورۃ المطففین میں تفصیل آئے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

﴿اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ﴾ (خبردار! اسی کے لئے حکم ہے، وہی فیصلہ فرمائے گا، وہ حساب لینے والوں میں سب سے جلدی حساب لینے والا ہے) جن لوگوں کا حساب لیا جائے گا ان کے مختلف احوال اور مختلف اعمال اور مختلف مدارج ہوں گے، کچھ لوگوں کا سرے سے حساب ہی نہ ہوگا، وہ بغیر حساب جنت میں جائیں گے، جن کی تعداد روایات کی رُو سے چار ارب نوے کروڑ ہوگی۔ [البدور] باقی حساب چشم زدن میں کسی کا کچھ زیادہ کسی کا مناقشہ کے ساتھ، کسی کا اور بھی سخت ہوگا۔

سب سے خطرناک اور سخت عذاب بادشاہوں، حکام، وزراء، امراء وغیرہ عوامی نمائندوں کا ہوگا، جن سے رعایا کے حقوق کے ہر ذرہ ذرہ کا پوچھا جائے گا، اسی طرح قضاۃ اور ججوں اور دیگر عوامی نمائندوں اور فیصلہ کرنے والوں کا حال ہے۔ حدیث میں ارشاد فرمایا: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ، یعنی تم میں سے ہر شخص اپنی رعایا اور ماتحت لوگوں کا گلہ بان اور مسئول ہے، سو ہر بڑے سے ماتحت لوگوں کے حقوق کا حساب لیا جائے گا۔ [بخاری] یہاں تک کہ عورتوں سے شوہروں اور شوہروں سے بیوی اور بچوں کے حقوق کا سختی سے محاسبہ ہوگا، اور یہ محاسبہ نہایت سخت اور تباہ کن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سب پر رحم فرمائے۔ آمین

﴿قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ آپ فرمادیجئے: کون ہے جو تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں؟) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ظلمت البر والبحر سے شدائد یعنی سختیاں مشکلات اور مصائب مراد ہیں۔

جب انسان مشکلات اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، جو لوگ غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں اور انہیں پکارتے ہیں وہ لوگ بھی مصیبت کے وقت سب کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور:

﴿تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ کہ تم مصیبت کے وقت میں عاجزی اور انکساری کے ساتھ پوشیدہ طور پر دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو، اور یوں کہتے ہو:

﴿لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾ (اگر آج ہمیں اس مصیبت سے نجات دی تو ہم ضرور بالضرور شکر گزار بندوں میں سے ہو جائیں گے) یعنی آئندہ ہمیشہ شکر گزار اور مخلص و مؤمن موحد رہیں گے۔

آپ ان سے یاددہانی اور اتمامِ حجت کی خاطر فرمائیے:

﴿قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں اس مصیبت سے اور ہر پریشانی و غم سے نجات دیتا ہے، کیونکہ اس کے سوا کوئی نجات دہندہ ہے ہی نہیں، وہی سب کچھ کرنے والا ہے، اور وہی سب کچھ دینے والا ہے۔ مگر:

﴿ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ﴾ پھر تم شرک کرنے لگتے ہو۔ مصیبت کے وقت ایمانداری کا وعدہ کرتے ہو، مصیبت دور ہونے کے بعد پھر وہی کفر اختیار کرتے ہو، تم کتنے بے انصاف ہو؟ اور مفاد پرست ہو؟ تمہیں چاہیے تھا

کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت دور ہونے کے بعد ساری زندگی شکر گزار بن کر سربسجود رہتے، مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عابد میں معبود کا اثر آنا لازمی ہوتا ہے، جب ان کے معبود بے جان پتھروں سے بنے ہوئے ہیں تو ان کا اثر یعنی سنگدلی اور وعدہ خلافی اور غفلت کا مشرکین کے دلوں میں آنا ضروری ہوا، پس وہ اپنے ہر وعدہ سے منحرف ہوئے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے ہر وعدہ پر قائم رہتے ہیں، حتی کہ ازلی وعدوں پر بھی ان کا پورا پورا عمل جاری رہتا ہے۔ سورۂ یونس میں ارشاد ہے: ﴿فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ [یونس:۲۳] (جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نجات دے دی تو وہ اچانک زمین میں ناحق بغاوت شروع کرنے لگتے ہیں)۔ سورۂ عنکبوت میں فرمایا: ﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾ [العنکبوت:٦٥] (جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں، اسی کے لئے عبادت کو خالص کر کے، پھر جب وہ انہیں خشکی کی طرف نجات کا راستہ دے دیتا ہے تو اچانک شرک کرنے لگتے ہیں)۔ یہ مشرک انسان کا مزاج ہے کہ مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی طرف اور خوشحالی میں غیر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

فائدہ:

آج کل ضعیف الایمان کمزور عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے، کہ خوشحالی اور آرام کے اوقات میں اللہ تعالیٰ سے غافل رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے، مسلسل نافرمانی اور گناہوں میں لت پت رہتے ہیں، اور غیر اللہ کی طرف زیادہ تر ان کا دھیان ہوتا ہے، اور اپنی خوشحالی کو بجائے اللہ تعالیٰ کے غیر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور انہی کی مرہونِ منت سمجھتے ہیں۔

لیکن جب ان کی خوشحالی کی کشتی مصائب کے گرداب میں غرق ہونے لگتی ہے تو لمبی لمبی دعاؤں اور صدقات، نیز مروجہ ختم قرآن اور آیت کریمہ کے ورد اور وظیفہ شروع کر دیتے ہیں۔ کیا کوئی خدا تعالیٰ کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے؟ حق بندگی تو یہ ہے کہ مسلمان خوشحالی میں زیادہ تر بندگی اور عبادات میں مصروف ہو، قدم قدم پر منعمِ حقیقی جل شانہ کی شکر گزاری میں مشغول ہو۔ پھر اگر کوئی مصیبت ناگہانی پریشانی لاحق ہو تو نہایت خفیہ طور پر تضرع و عاجزی کے ساتھ اپنے محسن عزّ وجل کی بارگاہ میں سرگوشی کے ساتھ متوجہ ہو، تو اجابت میں کوئی دیر نہیں لگتی، اجابت استقبال کر کے تمام پریشانیوں کا قلع قمع کرے گی، کیونکہ رابطہ پہلے سے قائم ہے۔ اگر یہ کیفیت نہ ہو، اور رابطہ منقطع ہو، خوشیوں میں

غفلت ہو، اور مصائب میں لمبی دعاؤں کا رواج ہو، تو ناکامی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا، اور محروم رہیں گے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ
شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَكَذَّبَ
بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر عذاب بھیج دے، تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے، یا بھڑا دے تم کو مختلف جماعتیں کر کے، اور چکھا دے ایک کو دوسرے کی سختی، آپ دیکھ لیجئے کہ ہم کیسے مختلف پہلوؤں سے آیات کو بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں ﴿٦٥﴾ اور آپ کی قوم نے اسے جھٹلایا، حالانکہ وہ حق ہے، آپ فرما دیجئے کہ: مجھے تم پر داروغہ بنا کر مقرر نہیں کیا گیا ﴿٦٦﴾ ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے، اور عنقریب تم جان لو گے ﴿٦٧﴾

معارف ومنازل

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب آیت مذکورہ کا پہلا حصہ یعنی:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ نازل ہوا تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْم۔ اے اللہ تعالیٰ! میں تیری کریم ذات کی پناہ مانگتا ہوں اوپر والے عذاب سے۔ اور جب آیت کا آخری حصہ ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ نازل ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ پہلے والے عذاب سے آسان اور سہل ہے۔ [بخاري]

اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ اوپر سے عذاب بھیج دے، جیسے قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور اصحابِ فیل پر عذاب آئے، یا اوپر سے پتھر برسا کر ہلاک کر دے، یا بہت زیادہ بارش بھیج دے، یا تیز وتند ہوائیں بھیج دے، یا سخت چیخوں کی آوازیں آجائیں، اور اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت ہے کہ بندوں پر نیچے سے عذاب بھیج دے، سیلاب کا آجانا، زمین میں دھنس جانا، یا سخت قحط سالی کا آنا، یہ نیچے سے عذاب آنے کی صورتیں ہیں۔ اوپر اور نیچے دونوں جہتیں بیان فرما دیں جن سے عام طور پر عذاب آنے کا تصور ہو سکتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو ہر چھ جہت سے عذاب بھیجنے

کی قدرت ہے، سورۂ ملک میں فرمایا: ﴿ءَ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوۡرُ ﴿۱۶﴾ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ اَنۡ یُّرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ کَیۡفَ نَذِیۡرِ﴾ [الملک] کیا تم اس سے نڈر ہو گئے جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے، تو وہ ایک دم تھرتھرانے لگے؟ کیا تم اس سے نڈر ہو گئے جو آسمان میں ہے کہ تم پر بھیج دے پتھر برسانے والی ہوا، تو عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کیسا ہے میرا ڈرانا؟)۔

﴿اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا وَّیُذِیۡقَ بَعۡضَکُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ﴾ یا بھڑا دے تم کو گروہ گروہ کرکے، اور چکھا دے بعض کو بعض کی سختی اور عذاب، یعنی قتل وقتال۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تمہارے مختلف فرقے بنا دے، جن کے اہواء وافکار وخیالات مختلف ہوں، ہر فرقہ اپنے اپنے پیشوا وامام کے پیچھے چلتا ہو۔ اور خلط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے درمیان جنگ کھڑی ہو جائے، اور قتل وقتال کے معرکہ میں خلط ملط ہو جائیں، اور ایک فریق دوسرے میں گھس جائے، حتیٰ کہ اپنے اور پرائے کا امتیاز باقی نہ رہے۔ [مدارک التنزیل]

اس آیت کے آخری حصّہ کی تعبیر ہجرت سے ۳۵ سال بعد نظروں کے سامنے آگئی جب جنگ جمل وصفین میں مسلمان آپس میں کشت وخون میں مبتلا ہو گئے، اور ستر ہزار سے زائد اچھے لوگ مارے گئے۔ [مظھري وغیرہ]

خلاصہ:

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت ہے کہ تمہارے بہت سے مختلف نظریات پر مبنی فرقے بنا کر آپس میں ٹکرا دے، اور ان کے درمیان قتل وقتال کے شعلے بھڑکا دے، اور بعض کو بعض کی قدرت وطاقت اور دشمنی کا مزہ چکھا دے، یہ بھی ایک بدترین سزا ہے، نہ تو آسمان سے آتی ہے اور نہ زمین سے نکلتی ہے، انسانوں کے اپنے افکار وتصورات اور معتقدات کی بنیاد پر فرقے بن جاتے ہیں، اور آپس میں لڑائیاں لڑتے ہیں، اور یہ عذاب بہت بڑا عذاب ہے، پہلی امتوں پر بھی آتا رہا ہے، اور اس اُمّت میں بھی اس کے مظاہر رہتے ہیں۔

حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ (مشہور تابعی) نے بیان کیا کہ جب آیت بالا نازل ہوئی تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔ [بخاري] تم لوگ میرے بعد کافر مت ہو جانا، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو تلوار سے قتل کیا کرو گے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ﴿عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ﴾ مشرکین اور کفار کے لئے ہے ﴿اَوۡ یَلۡبِسَکُمۡ شِیَعًا﴾ مسلمانوں کے لئے ہے۔ [درمنثور]

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ قبیلہ بنی معاویہ کی مسجد پر گزرے، وہاں آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی، اور ہم نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ ﷺ نے لمبی دعا کی، اور اس کے بعد فرمایا کہ میں نے اپنے ربّ سے تین چیزوں کا سوال کیا، مجھے دو چیزیں عطا فرمادیں، اور ایک کی قبولیت سے منع فرمادیا۔ میں نے اپنے ربّ سے سوال کیا کہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ فرمانا، یہ دعا قبول ہوگئی، اور میں نے یہ سوال کیا کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ فرمانا، میری یہ دعا بھی قبول ہوگئی، اور میں نے سوال کیا کہ آپس میں ان کی لڑائی نہ ہو، تو اس بات کو قبول نہ فرمایا۔ [مشکوۃ دوم ۵۱۲، معالم التنزیل]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سرور عالم ﷺ نے ایک مسجد میں تین دعائیں کیں، اللہ تعالیٰ نے تو دو دعائیں قبول فرمائیں، اور ایک دعا رد فرمادی۔ پہلی دعا یہ فرمائی کہ میری امت پر کسی غیر دشمن کو مسلط نہ فرمانا کہ وہ سب پر چیرہ دستی کرے، اللہ تعالیٰ نے یہ قبول فرمائی۔ دوسری دعا یہ فرمائی کہ سب امت کو عمومی پیہم قحط سے ہلاک نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ تیسری دعا یہ کی کہ امت باہم خانہ جنگی کے عذاب میں مبتلا نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول نہیں فرمائی۔ [بخاری وغیرہ]

کبھی اگر کہیں سیلاب آجائے کچھ لوگ غرق ہوجائیں یا جزوی قحط سے کچھ لوگ مرجائیں، یہ ایک جزوی مثال ہوگی، حدیث میں سیلاب اور قحط سے عمومی اور پوری امت کی ہلاکت کی نفی ہے، اسی طرح دشمن سے تباہی نہ ہونے کا بھی عمومی معنی مراد ہے۔

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ﴾ آپ دیکھ لیجئے ہم کیسے آیات کو مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں؟ تاکہ وہ لوگ سمجھیں۔

﴿وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ﴾ آپ کی قوم نے اس عذاب کی تکذیب کی، حالانکہ وہ حق ہے، آپ انہیں کہہ دیں کہ عذاب کا لانا میرے بس میں نہیں، میں تمہارے اوپر داروغہ نہیں۔

﴿لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ﴾ ہر ایک خبر کا وقت مقرر ہے، عذاب ہو یا قیامت اپنے مقررہ وقت پر آہی رہے گا، قبل از وقت کسی کے مطالبے سے نہیں آئے گا، اور جب آئے گا تو تمہیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ
وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمَا عَلَى

الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۶۹ وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا
دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ
لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۷۰

ترجمہ: اور اے مخاطب! جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات کے بارے میں عیب جوئی کرتے ہیں تو ان سے کنارہ ہو جا! یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں، اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھ ۝۶۸ اور جو لوگ احتیاط کرتے ہیں ان پر ظالموں کے حساب میں سے کچھ بھی نہیں ہے، لیکن نصیحت ہے کہ تاکہ وہ ڈرنے لگیں ۝۶۹ اور چھوڑ دے ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا لیا ہے، اور دنیاوی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالا ہے، اور قرآن کے ذریعہ ان کو نصیحت کیجئے تاکہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے نہ پھنس جائے جس کے لئے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی حمایتی اور سفارش کرنے والا نہ ہوگا، اور اگر نفس ہر طرح سے جان کا بدلہ دے تو اس سے نہ لیا جائے گا، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے پھنس گئے، ان کے لئے پینا ہے گرم پانی سے، اور دردناک عذاب ہے، کفر کرنے کی وجہ سے ۝۷۰

معارف ومنازل

اہلِ باطل اور بُرے لوگوں کی مجلسوں سے پرہیز کا حکم:

آیاتِ مذکورہ میں مسلمانوں کو ایک اہم اصولی ہدایت دی گئی ہے، کہ جس کام کا خود کرنا گناہ ہے اس کے کرنے والوں کی مجلس میں شریک ہونا بھی گناہ ہے، لہٰذا غلط اور بُرے لوگوں کی مجلسوں اور نشست گاہوں سے دور رہنا ضروری ہے۔ ان تینوں آیتوں کا حاصل مسلمانوں کو بُرے ماحول اور بُری صحبت سے بچنے کی تاکید کرنا ہے، اور انہیں بُری سوسائٹی اور غیر اسلامی صحبتوں، رفاقتوں سے بچانا ہے، جو کہ سم قاتل سے کم نہیں۔

قرآن وحدیث کے بے شمار نصوص کے علاوہ مشاہدہ اور روزمرہ کا تجربہ اس کا گواہ ہے کہ انسان کو تمام برائیوں اور جرائم میں مبتلا کرنے والی چیز اس کی بُری سوسائٹی اور بُرا ماحول اور بُری رفاقت ہے، جس میں پھنسنے کے بعد انسان اوّل تو خلافِ ضمیر اور خلافِ طبع بیماریوں اور برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے تو

برائیوں کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برائیوں کو بھلائی اور بھلائیوں کو برائی سمجھنے لگتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جب کوئی شخص کسی گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، جیسے سفید کپڑے میں ایک سیاہ داغ ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اس کو بھی دل کی ناگواری ہی سمجھو، بشرطیکہ وہ دل انسانی دل ہو (گدھے، کتے، کافر کا نہ ہو)۔

لیکن جب ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا چوتھا گناہ کرتا چلا جاتا ہے، اور پچھلے گناہوں سے توبہ نہیں کرتا، تو یکے بعد دیگرے سیاہ دھبے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دل کی نورانی تختی بالکل سیاہ ہو جاتی ہے، اور قبولِ حق و اعمالِ صالحہ کی استعداد و رغبت ختم ہو جاتی ہے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بھلائی اور برائی کی تمیز رخصت ہو جاتی ہے، ایسا سمجھو کہ انسانی دل بدترین حیوانات کے دل سے بھی نیچے گر گیا، اور ختم ہوا۔ قرآن کریم نے اسی کو "رَان" سے تعبیر فرمایا: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [المطففین: ۱۴] یعنی ان کے قلوب پر ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے زنگ لگ گیا، کہ ساری صلاحیتیں مفقود ہو گئیں، اور یہ سب کچھ غلط ماحول اور بری صحبت اور بری سوسائٹی کی کارستانی اور انجامِ بد ہے۔ شاعر نے فرمایا:

صحبت صالح ترا صالح کند ☆ صحبت طالح ترا طالح کند

حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ بُروں کی صحبت سے اسی طرح پرہیز کرو جیسے زہر سے، اور ان کی صحبت سے اسی طرح بھاگو جیسے جنگل کے درندہ شیر سے بھاگتے ہو۔

اب آیت کریمہ کا مطلب اور معنی یہ ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ مسلمان اور مشرک اکٹھے ایک جگہ بیٹھے تھے، مشرکین کو نہ اسلام کا احترام تھا، اور نہ قرآن کا، نہ ہی مسلمانوں اور ان کے دین کا، بیٹھے بیٹھے اہلِ ایمان کے سامنے قرآن حکیم کا مذاق بنانے شروع کرتے تھے، اور اسلام پر طعن و تشنیع اور استہزاء کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جب تم ان ظالموں کو دیکھو تو ان سے اعراض کرو، اور کنارہ کشی اختیار کرو، اور ان سے مکمل الگ رہو۔

ہاں! اگر وہ اپنی اس حرکتِ بد کو چھوڑ دیں، اور دوسرے کسی کام میں لگ جائیں تو پھر ان کے ساتھ بیٹھ سکتے ہو۔ اگر وہ استہزاء اور تمسخر کر رہے ہوں، اور تم بھولے (نادانی فراموشی) سے ان کے پاس بیٹھے رہو، تو جب تمہیں یاد آجائے تو فوراً اٹھ جاؤ، اور ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔ یہ مضمون سورۂ نساء میں بھی تفصیلاً گزر چکا ہے، جیسے ارشاد ہے:

﴿وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ﴾ [النساء: ۱۴۰] (اوراس نے کتاب میں تم پر یہ حکم نازل کیا ہے کہ جب تم اللہ کی آیتوں کو سنو کہ ان کا انکار کیا جارہا ہے، اوران کا مذاق اڑایا جارہا ہے تو ایسے لوگوں کے ساتھ اس وقت تک مت بیٹھو جب تک وہ کسی اور بات میں مشغول نہ ہو جائیں، ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے)۔

یہاں شبہ ہوتا ہے کہ اہلِ کفر سے اگر بالکل ہی دور رہیں تو ان کو حق بات کیسے پہنچائی جائے، وعظ ونصیحت اور تبلیغ کا راستہ کیسے نکالا جائے، اس کے لئے تو ہر وقت ملنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ اور جو لوگ احتیاط کرتے ہیں، اُن پر ظالموں کے حساب میں سے کچھ بھی نہیں ہے، لیکن نصیحت ہے تا کہ وہ ڈرنے لگیں۔ یعنی اگر دینی یا دنیوی ضرورت سے ان کے پاس جانا ہو جائے تو جو لوگ ایمان میں مضبوط ہیں اور منکر کو منکر جانتے ہوئے اپنی ذات کو محفوظ رکھ سکتے ہوں اُن پر ان لوگوں کے حساب یعنی باز پُرس اور طعن کرنے کے گناہ کا کوئی اثر نہ ہوگا جو تمسخر و استہزاء میں مشغول ہوں، یہ لوگ ان کے پاس جائیں، اور ان کو نصیحت کریں، ممکن ہے نصیحت ان لوگوں کے حق میں کارگر ہو جائے، اور وہ طعن وتشنیع اور عیب جوئی سے باز آجائیں۔ جس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فرعون اپنی خباثت وحماقت سے باز نہیں آئے گا، اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ، اسے نصیحت کرو، ﴿لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ [طٰہٰ: ۴۴] (ہوسکتا ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرے، یا ڈر جائے)۔

صاحب روح المعانی نے ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ: ﴿فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾ نازل ہوئی تو مسلمانوں نے کہا کہ مشرکین جب قرآن حکیم کا استہزاء کرنے لگیں اور ہم اسی وقت وہاں سے اٹھ جائیں، پھر تو ہم مسجد حرام میں نہیں بیٹھ سکتے، اور بیت اللہ کا طواف بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ مشرکین کے استہزاء کا سلسلہ شب وروز جاری رہتا ہے۔ اس پر آیت:

﴿وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ﴾ نازل ہوئی جس میں یہ بتادیا گیا کہ جب تم اپنے اعمال میں لگے ہوئے ہو، ان کی مجلس میں شریک نہیں ہو، تو تم پر ان کے اعمال کی کوئی ذمہ داری نہیں، اور جب اختلاط

ہو جائے تو ان کی خیر خواہی اور نصیحت سے بھی غافل نہ ہونا، جیسے فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾ [الأعلى: ۹] (لہٰذا تم نصیحت کیے جاؤ، اگر نصیحت کا فائدہ ہو) ممکن ہے کہ نصیحت اثر کر جائے، اگر کسی کی قسمت میں ہدایت لکھی ہو۔

دنیاوی زندگی پر فریفتہ لوگوں کو چھوڑ دیجئے:

فرمایا: ﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا﴾ پہلی آیت میں اس بات کا ذکر تھا کہ جو لوگ آیات کا مذاق اڑاتے ہیں ان سے اعراض کرو، اور ان کی مجلس میں نہ بیٹھو۔

اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ دنیا دار اور دنیا پرست لوگوں کی مجلس، اور مجلس کے علاوہ نشست و برخاست اور تعلقات جوڑنے اور ہر قسم کی رفاقت و دوستی وغیرہ سے مستقل پرہیز کرو، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دینِ اسلام اور پاکیزہ شریعت کو چھوڑ کر اسے محض لہو ولعب بنا لیا ہے، اور اس کے قبول کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں، اور دنیاوی عیش و عشرت اور لہو و طرب میں خوش ہیں، اور اسی پر راضی ہیں، اور آخرت کی ابدی سعادتوں پر یقین نہیں رکھتے۔

یا یہ مطلب ہو کہ انہوں نے لہو ولعب ہی کو اپنا دین بنایا ہوا ہے، اس کے علاوہ ان کا کوئی دین نہیں۔ البتہ اس اعراض اور ترکِ تعلقات کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو تبلیغ نہ کی جائے، اس قرآن کے ذریعہ ان کو تبلیغ کرتے رہو، تاکہ کوئی شخص اپنے کردار کی وجہ سے عذاب میں نہ پھنس جائے، اور ہلاک نہ ہو جائے۔ دنیا میں جو لوگ ہدایت سے دور ہیں وہ ہر خیر و بھلائی سے محروم ہیں، وہ حق کو قبول نہیں کرتے، آخرت میں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حمایتی دوست اور سفارش کرنے والا نہ ہوگا۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تو دعوت دینا اور لوگوں تک اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچا دینا ہے، تاکہ لوگ سعادت پائیں اور ابدی ذلت سے بچ جائیں، اگر کوئی شخص اس ہدایت کو نہیں مانتا تو یہ اس کی حماقت اور بدبختی ہے، اور یہ لوگ میدانِ قیامت میں ہر مددگار دوست اور حمایتی سے محروم رہیں گے، اور اس وقت جو لوگ عذاب کی مصیبت میں گرفتار ہوں گے وہ چاہیں گے کہ کچھ دے دلا کر چھوٹ جائیں، جیسے کہ دنیا میں اکثر یہی ہوتا ہے کہ لوگ رشوت دے کر جان چھڑا تے ہیں، مگر کہاں یہ کوڑے کرکٹ کی دنیا، اور کہاں آخرت، جہاں صرف مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا حکم چلتا ہے اور بس۔

اوّل تو وہاں فدیہ یعنی جان کا بدلہ دینے کے لئے کچھ نہ ہوگا، اور اگر بالفرض ہو بھی اور ہر طرح کا عوض دے کر جان چھڑانا چاہے تو کوئی عوض اور بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ

اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [المائدۃ:۳٦] (یقیناً جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے اگر زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب ان کے پاس ہوں، اور اتنی ہی اور بھی ہوں، تاکہ وہ قیامت کے دن کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ سب فدیہ میں پیش کردیں تب بھی ان کی یہ پیشکش قبول نہیں کی جائے گی، اور ان کو دردناک عذاب ہوگا)۔

اور بھی کئی جگہ قرآن مجید میں یہ مضمون صراحۃً بیان فرمایا گیا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی وجہ سے عذاب میں پھنس گئے ان کے لئے ہے پینا گرم پانی سے۔ سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں فرمایا: ﴿وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ [محمد (ﷺ):۱۵] (انہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ٹکڑے ٹکڑے کردے گا ان کی آنتوں کو) اور یہ سب کچھ اور عذابِ الیم ان کے اعمال کی وجہ سے یعنی کفر و شرک کی وجہ سے ہوگا۔

تنبیہ:

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ایسی مجلسوں اور محفلوں میں جانا اور شریک ہونا ممنوع ہے جہاں اللہ تعالیٰ یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یا کتاب اللہ کی یا دیگر اسلامی اقدار و احکام اور دینِ خداوندی کی تکذیب کی جاتی ہو، یا ان کا مذاق اڑایا جارہا ہو، ایسی جگہوں میں جانا ممنوع اور حرام ہے۔

جن ملکوں میں مسلمان رہتے اور بستے ہیں ان میں ایسے ممالک بھی ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور ان کی چنداں قوت و اہمیت بھی نہیں، وہ دوسروں کے تابع ہوتے ہیں، ایسے معاشرے میں دشمنانِ اسلام اپنی اسلام دشمنی میں دین اسلام کا مذاق اڑانے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کتاب اللہ کا تمسخر کرنے سے باز نہیں آتے، اس کے لئے مجلسیں منعقد کرتے ہیں، ڈرامے تیار کرتے ہیں، قرآن حکیم کی بے احترامی بھی کرتے ہیں، اسلامی تعلیمات کو ایسے فرسودہ بھیانک اور ناقابلِ عمل شکل وصورت میں پیش کرتے ہیں، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی زندگی پر نہایت غلیظ اور ناقابلِ برداشت فلم بناتے اور چلاتے ہیں، اس پر بڑے بڑے ایوارڈ اور انعام حاصل کرتے ہیں۔

ستم ظریفی یہ کہ ایسے اکثر کام موروثی مسلمانوں سے لیتے ہیں، حتّٰی کہ باقاعدہ دیدہ و دانستہ بڑے بڑے اجتماع منعقد کرتے ہیں، اور وہاں پروگرام کے مطابق احکامِ شریعت کا مذاق اڑاتے اور قرآن سوزی کرتے ہیں، اور اپنے گماشتے منافق مسلمانوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر مسلمان ملکوں میں نالیوں اور گندی جگہوں پر قرآن حکیم کے

اوراق پھینک دیتے ہیں، اور سبزی اور فروٹ کے کریٹوں میں قرآن حکیم کے مطبوعہ رنگدار اوراق ڈال کر ان کی بے احترامی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ مسلمان ملکوں اور مسلم آبادی کے شہروں میں ہو رہا ہے، مگر وہاں کی حکومت، ذمہ دار، اربابِ حَلّ وعقد ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ عوام الناس بیچارے جلسہ وجلوس اور احتجاج کرتے ہیں تو حکامِ بالا انہیں طفلانہ تسلی دے کر سلاتے اور خاموش کراتے ہیں، گویا کچھ نہیں ہوا۔ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

یورپی ملکوں میں جہاں اسلام کے خلاف محفل منعقد کرتے ہیں، اور اسلام کے خلاف خوب زہرافشانی کرتے ہیں، تو وہاں بسنے والے بدکردار غلامانہ ذہن کی پیداوار مسلمانوں کو بھی دعوت دیتے ہیں، مسلمان جہالت اور حماقت سے بھرپو شرکت کرتے ہیں، اور ملنساری پر عمل کرتے ہوئے سب کچھ گوارا کرتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

اسی طرح بعض دشمنانِ اسلام ایسے مضامین، رسائل، مقالات اور کتابیں شائع کرتے ہیں جن میں اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، بادشاہانِ اسلام کے خلاف فرضی، منگھڑت، بے بنیاد، ناشائستہ اور دلخراش مواد شائع کردیتے ہیں، کوئی ادنیٰ فہم وفراست رکھنے والا آدمی بھی باور اور برداشت نہیں کرسکتا۔ کالج اور یونیورسٹی اور سکولوں میں پڑھانے والے پروفیسر بھی مسلمان، اور پڑھنے والے طلبہ وطالبات اور ان کے سرپرست والدین بھی مسلمان، مملکت اور حکومت بھی مسلمانوں کی، مگر تعلیم دشمنانِ اسلام کی، اور زبان ونظریات بھی ان کے۔ یہ بے علم سٹوڈنٹس ریسرچ (تحقیق) کے عنوان سے وہ وہ مضامین پڑھتے اور سیکھتے ہیں جنہیں دیکھ اور سن کر جگر پھٹ جاتا ہے، اور دماغ ناکارہ ہو جاتا ہے۔

بڑی بڑی ڈگریوں پر فائز مسلمان دانشور سورۂ اخلاص تک پڑھنے سے عاجز ہیں، اور پی ایچ ڈی والے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے ہیں، فخریہ انداز کے ساتھ۔ کیا روزِ قیامت اس ہٹ دھرمی کا جواب دے سکیں گے؟ اسلام نے ہمیں غیرت سکھائی، خودداری سکھائی، یہ کتنی بدبختی کی بات ہے کہ تعلیمی اداروں میں دشمنانِ اسلام کے اسلام کے خلاف مضامین، مخرّب اخلاق باتیں اور اپنے مقدس دین کا مذاق، یہ سب کچھ مسلمان اپنے کانوں سے سنتے ہیں، یا اپنی آنکھوں سے ایسے رسالے پڑھتے ہیں، یہ نہایت بے غیرتی کا مظاہرہ ہے۔ کوئی یہودی یا نصرانی، کوئی ہندو یا بدھ مت اور کوئی سکھ کسی بھی صورت میں اپنے مذہب کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں

ہوتا، اگر کوئی آدھ بات دوتین جملوں پر مشتمل کوئی مقالہ اس کے مذہب کے خلاف استعمال ہوتو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، اور سیخ پا ہو کر ہمہ تن احتجاج بن جاتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ مسلمان اپنے برحق دین کی خاطر نہ پریشان ہوتے ہیں، نہ احتجاج کرتے ہیں، بلکہ اپنے دشمنوں کے سارے اعتراضات کو پی جاتے ہیں، اور ہضم کرتے ہیں۔

عجب دردیست اندردل اگر گویم زبان سوزد ☆ واگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

اند کے باتو بگویم ولے میترسیم ☆ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیارست

مسلمانوں میں خون باقی نہیں ہے ☆ محبت کا جنون باقی نہیں ہے

صفیں کج دل پریشان سجدہ بے ذوق ☆ کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۪ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِىْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے: کیا ہم پکاریں اللہ تعالیٰ کے سوا جو ہمیں نفع نہیں دیتا اور جو ہمیں ضرر نہیں دیتا؟ اور کیا ہم اس کے بعد الٹے پاؤں لوٹا دیئے جائیں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی، کیا ہم اس شخص کی طرح ہو جائیں جسے شیاطین نے جنگل میں بے راہ کردیا ہو؟ اس حال میں کہ حیران ہو کر بھٹکتا پھر رہا ہو، اس کے ساتھی ہیں جو اسے بلاتے ہیں کہ ہدایت کی طرف آجا ہمارے پاس۔ آپ فرمادیجئے: بے شک اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی ہدیت ہے، اور ہم کو حکم ہوا ہے کہ ہم سارے جہانوں کے پروردگار کے فرمانبردار ہوجائیں ﴿۷۱﴾ اور یہ کہ نماز کو قائم کرو، اور رب العلمین سے ڈرو، اور وہی ہے جس کی طرف تم جمع کئے جاؤ گے ﴿۷۲﴾ اور وہی ہے جس نے حق کے ساتھ آسمانوں کو، اور زمین کو پیدا فرمایا، اور جس دن وہ فرمائے گا کہ ہوجا سو وہ ہوجائے گا، اور اس کا فرمان حق ہے، اور اسی کے لیے ہے

ساری حکومت جس دن صور پھونکا جائے گا، وہ جاننے والا ہے غیب کی چیزوں کو، اور ظاہر چیزوں کو، اور وہ حکمت والا ہے، خبر رکھنے والا ہے﴿۷۳﴾

معارف ومنازل

صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے:

تفسیر درمنثور میں منقول ہے کہ مشرکین نے اہل ایمان سے کہا کہ تم ہمارے راستہ کا اتباع کرلو، اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا راستہ چھوڑ دو، اس پر آیت کریمہ: ﴿قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ نازل ہوئی۔

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بطور مثال ایک شخص کی حالت بیان فرمائی ہے جو کہ راستہ سے بھٹک گیا، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے اسے صحیح راستہ کی طرف بلا رہے ہیں، اور جنگل میں جہاں وہ راہ گم کر چکا تھا وہاں شیاطین بھی موجود ہیں، انہوں نے اسے پریشان کررکھا ہے، وہ اسے اپنی خواہشوں پر چلانا چاہتے ہیں، اس حالت میں وہ حیران کھڑا ہے، اگر وہ شیاطین کی طرف جاتا ہے تو ہلاکت میں پڑتا ہے، اور اگر اپنے ساتھیوں کی آواز پر جاتا ہے تو ہدایت پاتا ہے، اور شیاطین سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

اہلِ ایمان کو کافروں نے واپس گمراہی کی طرف لوٹ جانے کی دعوت دی، اور انہیں شرک و بت پرستی کی ترغیب دی، مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ تم ان کو جواب دے دو: کیا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جو پوری طرح نفع و ضرر کا مالک ہے، ہم ان کو پکاریں جو کچھ بھی نفع وضرر نہیں دے سکتے نہ اپنے لئے نفع کے مالک ہیں، اور نہ دوسروں کے لئے؟ اور کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت مل جانے کے بعد الٹے پاؤں واپس ہوجائیں؟ اور کیا روشنی کے بعد پھر تاریکی میں ڈوب جائیں؟

ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ ہدایت و بینائی کے بعد گمراہی اور نابینائی اختیار کریں۔ خدانخواستہ (العیاذ باللہ)! اگر ہم ایسا کرلیں تو ہماری وہی مثال ہوجائے گی جیسے کوئی شخص جنگل میں راہ بھٹکا ہوا کھڑا ہو، اور اسے شیاطین نے حیران پریشان کررکھا ہو، وہ اسے اپنی گمراہی میں ڈالنا چاہتے ہوں، اور اس کے ساتھی اسے ہدایت کی طرف بلا رہے ہوں۔

خدانخواستہ! اگر ہم کافروں کی بات مان لیں تو ہماری وہی حالت ہوجائے گی، جو اس حیران پریشان شخص کی حالت ہوتی ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى﴾ آپ فرما دیجئے: بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے، جب ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی نعمت سے نواز دیا تو اب ہم کفر و شرک کی طرف کیوں جائیں؟

﴿وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ رب العلمین ہی کے فرمانبردار رہیں، جو سارے جہانوں کا پالنے والا پروردگار ہے، اور عاجز و ناتواں بے جان مخلوقات کی عبادت سے بیزار ہو جائیں، جیسے آئندہ آیات میں موحدِ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔

﴿وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴾ اور یہ بھی حکم دیا ہے کہ نماز قائم کرو، اور رب العلمین سے ڈرو، اور وہی رب العلمین ہے جس کی طرف تم جمع کئے جاؤ گے۔ جب اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اس وقت سب کے فیصلے ہو جائیں گے، ہم اس کی عبادت کو کیسے چھوڑ دیں؟ اور توحید کو کیوں ترک کریں؟ پھر فرمایا: ﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ [القمر: ۵۰] (اور ہمارا حکم بس ایک ہی مرتبہ آنکھ جھپکنے کی طرح ہو جاتا ہے)۔ آنکھوں کی لپک کے ساتھ سب کچھ موجود ہوں گے، یعنی ہم چشم زدن میں جو چاہیں کر ڈالیں کسی چیز کے بنانے یا بگاڑنے میں ہم کو دیر نہیں لگتی، نہ کچھ مشقت ہوتی ہے۔ سورۃ النازعات میں فرمایا: ﴿فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ [النازعات] (حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بس ایک زور کی آواز ہوگی۔ جس کے بعد وہ اچانک ایک کھلے میدان میں ہوں گے)۔ ایک ڈانٹ پلانے کے ساتھ سب اگلے پچھلے میدان حشر میں کھڑے دکھائی دیں گے۔ پھر فرمایا:

﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ﴾ اس کا فرمان حق ہے، اور بادشاہی و سلطنت صرف اسی کی ہے۔

﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ﴾ جس دن صور پھونکا جائے گا، ساری حکومت اسی کی ہوگی، کوئی مجازی با اختیار نہیں رہے گا، خود ہی اپنی عظمت و شہنشاہیت کا اعلان فرمائے گا: اَنَا الْمَلِكُ اَنَا الدَّيَّانُ اَيْنَ مُلُوْكُ الْاَرْضِ۔ [بخاري]

صرف میں ہی شہنشاہ ہوں، فیصلہ کرنے والا، کہاں گئے دنیا کے بادشاہ؟ آج کس کی بادشاہی ہے؟ کون ہے فیصلہ کرنے والا؟ خود ہی ارشاد فرمائے گا: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ جتنے جتنے مجازی بادشاہ تھے آج وہ سب ختم ہو گئے، اصلی اور حقیقی مالک باقی رہا۔

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ وہ پوشیدہ اور ظاہری سب چیزوں کا جاننے والا ہے۔

﴿وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ﴾ اور وہ حکمت والا اور خبر رکھنے والا ہے، وہ حکمت اور اپنے علم کے مطابق جزاوسزا دے گا، اسی طرح عفوودرگزر بھی فرمائے گا، اور اس نے ابتداء آفرینش کے ساتھ صور کی جو تخلیق فرمائی ہے یہ بھی کئی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی اس کا فیصلہ ہے، جو اسے معلوم ہے۔

....

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۚ إِنِّيٓ أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَ
كَذٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ
عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّي ۚ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الْأٰفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ
بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّي ۚ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّينَ ﴿٧٧﴾
فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّي هٰذَآ أَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ أَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾

ترجمہ: اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا: کیا تو بتوں کو معبود مانتا ہے؟ بلا شبہ میں تجھے اور تیری
قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں ﴿٧٤﴾ اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی مخلوقات دکھائیں، تا کہ وہ
یقین کرنے والوں میں سے ہوجائے ﴿٧٥﴾ پھر جب اس پر رات کی تاریکی چھا گئی تو ایک ستارہ دیکھا، کہا: یہ میرا ربّ
ہے، پھر جب وہ ستارہ غروب ہوگیا تو یوں کہا کہ: میں غائب ہوجانے والوں سے محبت نہیں رکھتا ﴿٧٦﴾ پھر جب چاند کو
چمکتا دیکھا تو کہا کہ: یہ میرا ربّ ہے، پھر جب وہ غروب ہوگیا تو کہا: میرا ربّ مجھے ہدایت نہ کرتا تو میں ضرور گمراہ
لوگوں میں سے ہوجاتا ﴿٧٧﴾ پھر جب سورج کو چمکتا دیکھا تو کہا کہ: یہ میرا ربّ ہے، یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب سورج
غروب ہوگیا تو کہا: میری قوم! میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ﴿٧٨﴾ بیشک میں نے اپنا رخ
اس ذات کی طرف موڑا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا، میں سب کو چھوڑ کر اسی کی طرف مائل ہونے والا
ہوں، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں ﴿٧٩﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

شروع سورت سے یہاں تک مختلف انداز وپیرایہ پر اثباتِ توحید باری تعالیٰ کا بیان ہوا، اور تردید وابطالِ شرک وعبادۃ غیر اللہ کا پرزور انداز میں بیان ہوتا رہا۔ آیت بالا سابق مضامین کی تائید میں موحدِ اعظم حضرت ابوالانبیاء ابراہیم الخلیل صلوات اللہ وسلامہ علیہ کا واقعہ مذکور ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے وقت میں تشریف لائے جب آپ سے پہلے کئی قومیں شرک وبت پرستی کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے مٹ کر ہلاک ہوچکی تھیں، یعنی قوم نوح علیہ السلام اور قوم عاد وثمود، اور دیگر بہت سی مشرک وبت پرست اقوام۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جس قوم میں مبعوث ہوئے وہ لوگ ایک طرف سے خالص بت پرست مشرک تھے، دوسری طرف سے صابی یعنی ستارہ پرست بھی تھے، وہ کواکبِ سبعہ کو مستقل مؤثر سمجھتے تھے، اور نظامِ عالم کو ستاروں کا تابع ہی مانتے تھے، اور ستاروں کی ہیکل بناکر عبادت گاہوں میں رکھے ہوئے تھے، اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ تقریباً پانچ ہزار اصنام ومجسمے اپنے ہاتھوں سے تیار کرکے مختلف علاقوں اور شہروں میں رکھے ہوئے تھے، اور بابل "کوثی" عراق بشمول ترکی وشام کے اکناف واطراف میں اس وقت کے بت پرست وکواکب پرستوں کا نہایت بڑا ہجوم ہوتا تھا، اور اس وقت کا حکمران نمرود بن کنعان ہوتا تھا، جو اُلوہیت کا مدّعی تھا، اور کواکب پرست وبت پرست بھی تھا، اور لوگوں کو اپنی عبادت اور اُلوہیت پر مجبور کیا ہوا تھا۔ بابل سے لے کر کابل تک اس کی حکمرانی تھی۔

بعضوں نے کہا ہے کہ پوری آبادی پر اس کی حکمرانی تھی، اور چارسو کے قریب ملکوں کے بادشاہ اور حاکم اسے خراج ادا کرتے تھے، اور اس کے تابع تھے۔ اور اکثر مورّخین کا قول ہے کہ چار بادشاہوں نے پوری دنیا پر بادشاہت کی ہے، ان میں سے دو مسلمان موحد حق پرست گزرے ہیں: حضرت ذوالقرنین اور حضرت سلیمان علیہما السلام، اور دو ان میں سے کافر ومشرک گزرے ہیں، یعنی نمرود اور شداد، جس نے دنیا میں اپنے لئے جنت بنائی تھی، پھر تباہ ہوا۔ سورۃ الفجر کی تفسیر میں دیکھیں۔

اس سلسلے میں جو لوگ شداد کی جگہ بخت نصر کا نام لیتے ہیں، میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ بخت نصر مستقل بادشاہ نہیں گزرا ہے، وہ فارس کے بادشاہ لہراسپ اور گشتاسپ کا گورنر تھا، جس نے بیت المقدس کو روندڈالا تباہ کیا، اور بنی اسرائیلیوں کو تہ تیغ کیا۔ تیسرے پارے کے رکوع میں حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ میں تفصیل گزرچکی۔

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ ﴾ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ آزر عجمی نام ہے،

علمیت اور عجمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

صحیح تحقیق یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، عرب چچا کو بھی باپ کہتے ہیں، اس لئے یہاں اور متعدد مقامات پر اسے باپ کہا گیا ہے، جیسے اس آیت میں آیا ہے: ﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰـهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ [البقرۃ:۱۳۳] (ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی، اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی)۔

آزر کا اصل نام ناخور تھا، سعید بن مسیب اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے کہ آزر دراصل بڑے بت کا نام تھا، ناخور نے کثرتِ عبادت اور اس کی خدمت کی وجہ سے جو شب و روز دیکھ بال میں مصروف تھا یہ لقب یعنی آزر حاصل کیا۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ناخور پہلے آباء و اجداد کے دین توحید پر تھا، لیکن نمرود کے وزیر ہونے کے بعد دین حق توحید کو چھوڑ کر دنیاوی لالچ میں کافر ہو گیا۔

علامہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صراحت کی ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، باپ نہ تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا، اور والدہ کا نام شانی تھا، اور یہ دونوں مسلمان تھے۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے بھی سلف کی ایک جماعت کا یہی قول تھا۔ علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح المواہب میں لکھا ہے کہ آزر کے عم حضرت ابراہیم علیہ السلام ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شہاب ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے صراحت کی ہے کہ توریت و انجیل والوں نے اور تمام مورخین نے آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا مانا ہے۔ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہم کو سندوں کے ساتھ یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، سدی اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہم اس بات کے قائل تھے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نہیں تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ تھا۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں مجھے ایک اثر یعنی صحابی کا قول ملا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا۔

قاموس میں ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، باپ تارخ یا تارح تھا، یا دونوں نام ایک ہی شخص کے تھے۔ آزر کے باپ نہ ہونے کی تائید اس تشریح سے ہوتی ہے جو سورۂ بقرہ کی ایت: ﴿وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ [البقرۃ:۱۱۹] (آپ سے نہیں پوچھا جائے گا دوزخ والوں کے بارے میں) کی تفسیر کی ذیل میں ہم نے

کی ہے کہ صحیح روایت میں آیا ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ مِنْهُ"۔ [بخاري]

اس حدیث سے ثابت ہورہا ہے کہ سرور عالم ﷺ کے تمام آباء واجداد موحد مؤمن گزرے ہیں، ان میں کوئی مشرک نہ ہوا، اور آزر مشرک تھا، اس لئے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا ہوسکتا ہے، باپ نہیں ہوسکتا۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت آدم علیہ السلام تک سرور عالم ﷺ کے آباء واجداد کو مسلم ثابت کرنے کے لئے چند رسائل لکھے ہیں۔

محمد ابن اسحاق، ضحاک اور کلبی کا بیان ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تھا، اسی کا نام تارخ بھی تھا، جیسے اسرائیل ویعقوب ایک ہی شخص کے نام تھے۔ مقاتل ابن حیان نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا لقب آزر، اور نام تارخ بتایا ہے، یہ آخری قول مرجوح ہے۔ [مظهري]

دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کرنا صحیح طریقہ ہے:

بہر حال! آزر باپ ہو یا نسبی چچا ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے قابلِ احترام تھا، اسی بنیاد پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دینی شرعی دعوت کا آغاز اپنے گھر ہی سے کیا۔ سرور عالم ﷺ کو بھی یہی حکم ہوا، فرمایا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] (اور اپنے قریب ترین خاندان کو ڈراؤ)۔

دعوت میں ہمیشہ اصولوں کی پابندی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے، وہاں یہ لحاظ نہ ہوگا کہ کون بڑا ہے کون چھوٹا، کیونکہ دعوت کا نتیجہ ہدایت ہے، جس کے لئے ہر شخص محتاج اور حاجت مند ہے۔ جب سرور عالم ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو بنی ہاشم اور بنی عبد مناف کو نام بنام الاقرب فالاقرب اپنی دعوت میں شامل فرمایا، کیونکہ جب گھر والوں، عزیزوں، قرابتداروں کو چھوڑ کر یا مؤخر کر کے پہلے دوسروں کو دعوت دی جاتی ہو تو عام لوگ یہی کہیں گے، اور انہیں کہنے کا بطور اعتراض یا بہانہ موقع ملے گا کہ میاں صاحب پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو! یہ چراغ تلے اندھیرا کیسا؟ ایسی صورت میں دعوت بے اثر اور بے جان ہوجاتی ہے۔

پھر دعوت کا انداز دیکھئے! کتنا دانشمندانہ، ہمدردانہ، مخلصانہ بڑے پیارے اور سلجھے ہوئے انداز میں، تاکہ بڑوں کو ناگوار اور چڑچڑاہٹ نہ ہو، اب وہ اپنے باپ یا چچا کو خطاب کر کے کہہ رہے ہیں: کیا آپ بتوں کو معبود بناتے ہیں؟ آپ خود اندازہ کریں کہ آپ جیسے بولنے والے، دیکھنے سننے والے حرکت کرنے والے اور ہوشیار وعقلمند انسان ایسے بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو کسی چیز میں تمہارے ساتھ اشتراک اور برابری نہیں رکھتے۔ ذرا سورۂ مریم

کا مطالعہ کر کے دیکھو، وہ فرمارہے ہیں: ﴿اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا﴾[مریم:۴۲] (جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ: اباجان! آپ ایسی چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، اور نہ آپ کا کوئی کام کر سکتی ہیں؟)۔ آخر باپ نے جواب دے کر ان کو ڈانٹ پلائی، اور کہا: ﴿قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا﴾ [مریم:۴۶] معلوم ہوتا ہے تو ہمارے معبودوں سے بدعقیدہ اور پھرا ہوا ہے، بس اپنی بداعتقادی اور وعظ ونصیحت کو رہنے دے، ورنہ تجھ کو سنگسار کر دوں گا، اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو میرے پاس سے ایک مدت (عمر بھر) دور ہو جاؤ، تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا، میرے ہاتھ اٹھانے سے پہلے یہاں سے چلا جا۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ انسان بھی عجیب مخلوق ہے، جب یہ ماننے پر آتا ہے تو گوبر کو بھی معبود بنالیتا ہے، کیڑے، مکوڑوں، مکھیوں بلکہ بلی، چوہے، سانپ، اونٹ، گھوڑے، گائے، درخت، قبریں، مزارات کی پوجا کرنے لگتا ہے، اور جب انکار کرنے پر آتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ شانہ کے جلیل القدر پیغمبروں کو جھٹلاتا ہے، پتھر مارنے اور سنگساری کی دھمکی دیتا ہے۔

عکاظ کی منڈی میں لوگوں نے دیکھا کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جارہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں: اے لوگو! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو، کامیابی اور فلاح پاؤ گے۔ آپ کے پیچھے پیچھے لمبا چغہ پہنے ہوئے ایک لمبا دھڑنگا گورا چٹا جوان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتھر مارتے ہوئے کہتا تھا: لوگو! (معاذ اللہ) یہ شخص پاگل ہے، اس کی بات نہ سنو، یہ تمہیں گمراہ کرے گا، پوچھنے والوں نے پوچھا کہ یہ پتھر مارنے والا کون ہے؟ تو بتلایا گیا کہ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی چچا ابولہب ہے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کا حقیقی چچا آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کٹر دشمن اور کٹر مشرک تھا۔

﴿اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ میں تمہیں اور تمہاری پوری قوم کو صاف کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ کھلی گمراہی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم اپنے ہاتھوں کے بنے ہوئے بے جان پتھروں کو تراش کر مجسمہ بناتے ہو، یہ نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں، اور نہ بولتے ہیں، نہ کسی نفع ونقصان کے مالک ہیں جنہیں بنا کر بازاروں میں فروخت کرتے ہو، کبھی تمہارے ہاتھوں سے فرش پر گر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، یہ اپنے نفع نقصان پر کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے، انہیں تم معبود بنا کر ان کی پوجا کرتے ہو؟ یہ کتنی حماقت اور نادانی ہے کہ تم یہ ذرا سوچو کہ تمہارا معبود فٹ دو فٹ کا ہے، اور تم عبادت گزار چھ سات فٹ اپنے معبود سے بڑے بھی ہو، اور زندہ وہوشیار بھی ہو، اور سمجھدار بھی

ہو۔آگے ارشاد باری تعالیٰ سنو!

﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ یعنی جس طرح بت پرستی کی شناعت و قبح ہم نے ابراہیم علیہ السلام پر ظاہر کر کے اس کی قوم کو قائل کیا۔اسی طرح علویات وسفلیات کے نہایت محکم اور عجیب وغریب نظام ترکیبی کی گہرائیوں پر بھی اس کو مطلع کر دیا، تاکہ اسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے وجود و وحدانیت وغیرہ پر، اور تمام مخلوقات سماوی وارضی کے محکومانہ عجز وبیچارگی پر استدلال کرے، اور اپنی قوم کے عقیدہ کواکب پرستی وہیکل سازی کو علیٰ وجہ البصیرت رد کر سکے، اور خود بھی حق الیقین کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو۔

بلاشبہ عالم کا یہ اکمل واحکم اور بہترین نظم ونسق ہی ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر بالبداہۃ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس عظیم الشان مشین کا بنانے والا اور چلانے والا اس کے پرزوں کو نہایت مضبوط ترتیب وسلیقہ سے جوڑنے والا اور ہزاروں لاکھوں برس سے ایک ہی انداز پر اس کی حفاظت کرنے والا بڑا زبردست حکیم وقدیر صانع ہے، جس کے حکیمانہ تصرف اور نفوذ واقتدار سے مشین کا کوئی چھوٹا بڑا پرزہ باہر نہیں جا سکتا، یہ کام یوں ہی بخت واتفاق یا بے شعور طبیعت یا اندھے بہرے مادہ سے نہیں ہو سکتا۔

یورپ کا مشہور ومعروف حکیم نیوٹن کہتا ہے کہ کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ محض عام قوتِ جاذبہ کے فعل کا نتیجہ ہوں، یہ قوتِ جاذبہ تو کواکب کو شمس کی طرف دھکیلتی ہے، اس لئے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کہ کوئی خدائی ہاتھ ہو، جو باوجود قوتِ جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنے مدارات پر قائم رکھ سکے، کوئی سبب طبعی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضاء میں جکڑ کر بند کر دیا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگاتے وقت ہمیشہ معیّن مدارات پر اور ایک خاص جہت ہی میں حرکت کریں جس میں کبھی تخلّف نہ ہو۔

پھر کواکب کی حرکات اور درجات سُرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم دکھایا گیا ہے، کوئی سببِ طبیعی نہیں جس سے ہم ان منظم ومحفوظ نوامیس کو وابستہ کر سکیں، لاچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم وعلیم کے ماتحت اور نگرانی میں ہے جو ان تمام اجرامِ سماویہ کے مواد اور ان کی کمیات سے پورا پورا واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ کس مادہ کی کس قدر مقدار سے کتنی قوتِ جاذبہ صادر ہوگی، اسی نے اپنے زبردست اندازہ سے کواکب اور سورج کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے تصادم وتزاحم نہ ہو، اور عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے، ہر چھوٹا بڑا استارہ نہایت

مضبوط نظام کے ماتحت معین وقت پر طلوع وغروب ہوتا ہے، جب کوئی سیارہ غروب ہو کر دنیا کو اپنے اس فیض وتاثیر سے محروم کر دے جو طلوع کے وقت حاصل تھا تو نہ اس ستارہ کی اور نہ کسی مخلوق کی قدرت میں ہے کہ ایک منٹ کے لئے اسے واپس لے آئے، یا غروب سے روک دے، یہ ربّ العٰلمین ہی کی شان ہے کہ کسی وقت بھی کسی قسم کے افاضہ سے عاجز نہیں۔

﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [یس] (اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ سب اس ذات کا مقرر کیا ہوا نظام ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کا علم بھی کامل ہے۔ اور چاند ہے کہ ہم نے اس کی منزلیں ناپ تول کر مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ جب لوٹ کر آتا ہے تو کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو کر رہ جاتا ہے۔ نہ تو سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے، اور یہ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں)۔

یہ علویات کا حال ہے تو سفلیات کا اسی سے اندازہ کرلو، یہ تکوینی عجائب اور ﴿مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ہی ہیں جن کے دیکھنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ﴾ (میں غائب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا) اور ﴿اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (بیشک میں نے اپنا رخ اس ذات کی طرف موڑا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا، میں سب کو چھوڑ کر اسی کی طرف مائل ہونے والا ہوں، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں) بے ساختہ جاری ہو گیا، جو اگلی آیات میں مذکور ہے۔ [تفسير عثماني]

ملکوت رحموت، جبروت، ملک، رحمت اور جبر سے مشتق ہیں، ان میں واو اور تا مبالغہ کے لئے ہیں، یعنی بڑی حکومت، بڑا اقتدار اور عظیم سلطنت کے معنی میں ہے۔ سعید بن جبیر اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے کہا کہ ﴿مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ سے مراد ہیں: آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کی نشانیاں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک پہاڑ پر کھڑا کیا گیا، اور اوپر نیچے سارے پردے ہٹا دیئے گئے، تمام آسمان وزمین یہاں تک کہ عرشِ بریں اور اسفل السافلین سب ہی کا مشاہدہ کرایا گیا، وہ پورے عالم کے مشاہدہ سے علم الیقین کے بعد عین الیقین اور حق الیقین کے مرتبہ پر فائز ہوئے، یہاں تک کہ انہوں نے بہشت میں اپنی جگہ بھی دیکھ لی، یہی مطلب ہے آیت:

﴿وَاٰتَیۡنٰهُ اَجۡرَهٗ فِی الدُّنۡیَا﴾ [العنکبوت:۲۷] (اور ہم نے ان کو ان کا اجر دنیا میں بھی دیا) کا، یعنی انہیں بہشتی مکان دنیا میں ہی دکھایا گیا۔ [مظهري]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ایک طرف سے بت پرستی میں غرق تھی، تو دوسری طرف صابی کہلاتے، اور کواکب پرستی میں بڑے انہماک سے گمراہ تھی، وہ ساتوں سیارے شمس، قمر، زحل، عطارد، مریخ، مشتری اور زہرہ کی عبادت و پوجا پاٹ کرتے تھے، اور پورے عالم کے نظام کو کواکب سبعہ کی تاثیرات کا تابع مانتے تھے۔ [البداية]

واقعہ یہ ہے کہ ایک موقع پر بڑی کثرت سے لوگ جمع ہوئے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام متفرق مجالس و اجتماعات میں تبلیغی ڈھنگ کے ساتھ مناظرہ اور احقاقِ حق کے طور پر انہیں سمجھاتے رہے، ان کو ایک چمکدار ستارہ نظر آیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ ستارہ مشتری تھا، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ زہرہ سیارہ تھا۔ [روح المعاني]

بہر حال! جو بھی ستارہ ہو خوب چمکدار اور روشن تھا، اپنے پجاریوں کے نزدیک قابلِ احترام اور ان کا معبود تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے دیکھ کر فرمایا: (اس وقت ستارہ پرست موجود تھے) ان سے بطورِ فرض بحیثیتِ الزام دینے والے مناظر کے یوں فرمادیا کہ: یہ میرا ربّ ہے، خود تو موحِّد تھے، غیر اللہ کو وہ کبھی ربّ نہیں مانتے تھے، لیکن لوگوں کو قائل کرنے اور الزام دینے کی خاطر یہ طریقہ اختیار کیا۔ کچھ دیر بعد وہ ستارہ غروب ہو کر چھپ گیا، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ چھپ جانے اور غروب ہونے والوں سے میں محبت نہیں کر سکتا، اور چھپ کر غائب ہونے والے اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کی پرستش کی جائے۔

ابھی صاف واضح بات نہ کہی، حقیقت کی طرف اشارہ فرمادیا، اور آنے والی باتوں کے لئے ایک تمہید باندھی۔ اس کے بعد چاند نظر آیا، جو بہ نسبت ستاروں کے بڑا تھا، اور خوب زیادہ روشنی دینے والا تھا، اس کو دیکھ کر اسی پہلے انداز کے مطابق فرمایا کہ: یہ میرا ربّ ہے، پھر وہ بھی غروب ہوگیا، تو اس مرتبہ فرمایا کہ اگر میرے ربّ نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں گمراہوں میں سے ہو جاتا۔ جب ستارہ غروب ہوا تو فرمایا کہ میں چھپ جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا، یعنی جو غائب ہو جائے، اور ذاتی طور پر ایک حال پر باقی نہ رہ سکے، میں اسے معبود نہیں مان سکتا۔

بات کو اپنے اوپر رکھ کر کہا، جو گمراہوں کو دعوت دینے کا بلیغ طریقہ ہے، اس میں ان لوگوں پر تعریض تھی کہ تم لوگ عجیب ناداں ہو، جس چیز کو اپنے اوپر اختیار نہیں اس کو معبود بنائے ہوئے ہو، چونکہ پہلی مرتبہ ستارہ کے غروب

ہونے پر وہ لوگ کسی درجہ میں قائل ہو چکے تھے، اس لئے چاند کے غروب ہو جانے پر بات کا رُخ بدل دیا۔ اس مرتبہ ﴿لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ﴾ نہیں فرمایا، بلکہ یہ کہا:

﴿لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ﴾ اس میں بھی بات کو اپنے اوپر رکھا، اس میں اشارۃً یہ فرمایا کہ تم لوگ ستارہ پرستی کی وجہ سے گمراہ ہو، پھر جب سورج نکلا وہ اپنی چمک اور روشنی میں ستاروں سے اور چاند سے بڑھ کر تھا۔ آپ علیہ السّلام نے فرمایا یہ میرا ربّ ہے، اور یہ بہت بڑا ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام بھی اسی دنیا میں رہتے تھے، اور روزانہ آفتابِ عالمتاب کو بھی دیکھتے تھے، اور انہیں معلوم تھا کہ آفتاب سے بڑا دوسرا کوئی ستارہ اپنے وجود، مادّہ اور چمک ودمک کے اعتبار سے نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے هٰذَا رَبِّیْ کے ساتھ هٰذَآ اَكْبَرُ بھی کہہ دیا، جب سورج بھی غروب ہو گیا تو بہت زوردار طریقہ پر فرمادیا:

﴿یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾ اے میری قوم! جن چیزوں کو تم شریک بناتے ہو میں ان چیزوں سے بری ہوں، بیزار ہوں، میرا راستہ جو حق وصداقت پر مبنی ہے وہ تمہارے باطل اور بے بنیاد طریقے سے بالکل الگ ہے، جن چیزوں کو تم پوجتے ہو یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور بے اختیار ہیں، تم کتنے احمق ناداں ہو کہ مخلوقات کو خالق کے ساتھ برابر کا شریک سمجھتے ہو؟ یہ سارے بے اختیار تابعِ فرمان ہیں، اُسی خدا کے حکم کے ساتھ آتے جاتے اور غروب ہو جاتے ہیں جس ذات پاک نے انہیں وجود بخشا، اور کام پر لگایا۔

﴿اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾ میں نے اپنا رخ پھیر دیا اس ذات پاک کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا، میں باطل معبودوں کو کچھ بھی نہیں سمجھتا، اور نہ ہی ان کی طرف کبھی متوجہ ہوں گا، میں ان سے منہ موڑے ہوئے ہوں، اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں، میں تمہیں یہی کہتا ہوں کہ جو ذات کائنات کی خالق و مالک اور چلانے والی ہے تم اس کی عبادت کرو، اس کے حضور جھکو، جن بے جان اور بے اختیار چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو انہوں نے آج تک ایک مکھی مچھر بھی نہیں پیدا کیا، اور نہ ہی قیامت تک کرسکیں گے، افسوس ہو تمہاری سوچ و دانشمندی پر، تم کتنے بے سمجھ ہو کہ خود بولنے پر دیکھنے اور سننے پر قدرت رکھنے کے باوجود ایسے عاجز معبودوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ بولتے ہیں، اور نہ سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، یہ کیسے معبود ہیں جو عبادت گزاروں سے بھی نیچے درجے کے اور ان سے بھی کمزور و کمتر ہیں؟ آج ہمارے زمانے میں اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایسے کافر بت پرست اربوں کی تعداد میں ہیں۔

وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ
شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ۝۸۰ وَكَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ
اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ۝۸۱ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝۸۲

ترجمہ: اور اس کی قوم نے حجت بازی کی تو اس نے جواب میں کہا: کیا تم مجھ سے اللہ تعالیٰ کے بارے حجت بازی کرتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھے ہدایت عطا فرمادی، اور میں ان سے نہیں ڈرتا، جن کو تم اس کا شریک بناتے ہو، مگر ہاں! جو کچھ میرا ربّ چاہے میرے پروردگار کا علم ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟۝۸۰ اور میں کیونکر ان سے ڈروں جنہیں تم نے شریک بنایا ہوا ہے؟ حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک بنالیا ہے جس کی کوئی دلیل تم پر اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی، سو دونوں فریقوں میں کون امن کا مستحق ہے اگر تم جانتے ہو؟ ۝۸۱ کہ جو لوگ ایمان لائے، اور انہوں نے اپنے ایمان میں ظلم ،یعنی شرک کی ملاوٹ نہ کی، تو ان کے لئے امن کی ذمہ داری ہے، اور وہ ہدایت پر ہیں۝۸۲

معارف ومنازل

جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے شرک وبت پرستی اور ستارہ پرستی کی تردید اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کی وحدانیت کے حق میں دلیل پیش کی، تو وہ لوگ دلیل کا جواب دلیل سے تو نہ دے سکے، بلکہ:

﴿وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ﴾ آپ علیہ السلام کی قوم نے آپ علیہ السلام سے جھگڑنا شروع کردیا، ایک یہ کہ تمہارے ابراہیم کا ایسا دین وطریقہ جس میں کوئی آپ کا ہمنوا ساتھی نہیں، جبکہ ہمارا دین بہت ہی پرانا وقدیم ہے، جس پر بہت بڑی خلقت کا اتفاق چلا آرہا ہے۔ نیز یہ ہمارے آباء واجداد کا مسلّمہ دین ہے، اور یہ بات بھی کہ تم ایک معبود کے پرستار ہو، کیا ایک معبود اس پورے نظام کے چلانے کی طاقت رکھتا ہے؟

اس حجت بازی وجھگڑے کے بعد اگر ابراہیم علیہ السلام کسی راستے سے گزرتے تھے تو مشرکین آپ علیہ السلام کی طرف اشارہ کرکے کہتے تھے: ﴿اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ﴾ [الأنبياء:٣٦] (کیا یہ ہے وہ شخص جو تمہارے معبودوں پر نکتہ چینی کرتا ہے؟) یہ کہتا ہے کہ تمہارے یہ معبود تمہاری مشکلات کو حل نہیں کرسکتے، پھر کوئی کہتا: اے

ابراہیم! تم ایسی حرکتوں سے باز آجاؤ، کوئی کہتا: ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرو، کچھ لوگ دھمکی دے کر یہ کہتے کہ: خبردار! ایسا نہ کرو، ورنہ خطرہ ہے کہ ہمارے معبود تمہیں پاگل بنائیں گے، اور یہ بھی کہتے تھے کہ تم پر ہمارے معبودوں کی مار پڑگئی ہے، انہوں نے تمہیں مجنون و پاگل کردیا ہے۔

مشرکین قومِ عاد نے حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی چال چلائی، انہوں کہا تھا: ﴿اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ﴾ [ہود: ۵۴] (ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا کر دیوانہ و پاگل کردیا ہے)۔ ہود علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ میں تمہارے شرکاء سے بیزار ہوں، اب تم جو بھی تدبیر کرنا، چاہو کرلو۔ ﴿ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ﴾ [ہود: ۵۵] (پھر بیشک مجھے کوئی مہلت بھی نہ دو)۔

اسی طرح ان کی اقتداء کرتے ہوئے مشرکین مکہ نے بھی یہی کہا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں۔ قریش نے کہا تھا کہ ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہنے کی وجہ سے اس کا دماغ (معاذ اللہ) خراب ہو چکا ہے، کبھی کہتا ہے کہ مردے پھر دوبارہ زندہ ہو جائیں گے، کبھی کہتا ہے کہ قیامت آئے گی، اور محاسبہ ہوگا، ہمارے سارے معبودوں کو غیر اللہ کہتا ہے، ان کی عبادت اور نذر و نیاز کو حرام کہتا ہے، مشکلات میں انہیں پکارنے کو شرک بتاتا ہے، یہ کتنی عجیب بات ہے؟ ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ [ص: ۵] (کیا اس نے سارے معبودوں کی جگہ صرف ایک ہی معبود بنالیا ہے؟) وغیرہ۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے بھی یہی جھگڑا بنالیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اور قوم نے مل کر آپ علیہ السلام کو ایک بہت بڑی تاریخی آگ میں ڈال دیا، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ناکام بنا کر شرمندہ و رسوا کیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی کا نظارہ ہوا۔

﴿اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا: کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں مجھ سے جھگڑا کرتے ہو؟

﴿وَقَدْ هَدٰىنِ﴾ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو مجھے ہدایت عطا کی ہے، اور میری صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کی ہے، تم لوگ مجھ سے کیسے جھگڑتے ہو؟ کیا تم مجھے اپنے زورِ بازو، یا اپنے معبودوں سے ڈراتے اور خوفزدہ کرتے ہو؟

﴿وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ﴾ یاد رکھو! خداوند تعالیٰ سے ڈرنے والا کسی سے نہیں ڈرتا، اور میں تمہارے بے بس و بے اختیار معبودوں سے خوف نہیں کھاتا، جن کو تم خدا کا شریک بناتے ہو، یہ تو بے جان اور بے

حقیقت چیزیں ہیں، ان کے پاس نہ حیات ہے، اور نہ سماع و بصارت، نہ کوئی اختیار، یہ جدھر پڑے ہیں اگر انہیں ہاتھ نہ لگاؤ تو سو سال تک وہیں پڑے رہیں گے، ہر چیز کا خالق و مالک اور متصرف اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا اسی سے سب کو ڈرنا چاہئے، پس تمہارے مردہ بے اختیار معبودوں سے میں نہ ڈرتا ہوں، اور نہ انہیں کچھ سمجھتا ہوں۔

﴿اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ﴾ اختیار اور تصرف میرے ربّ کے پاس ہے، خیر و شر، نفع و نقصان، عزّت و ذلّت سب کچھ اسی کے پاس ہے۔

﴿وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾ میرے ربّ کا علم ہر چیز پر وسیع اور محیط ہے، وہ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ وَالشَّهَادَةِ ہے۔﴿اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ﴾ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ کیا تم نہیں جانتے؟ کیا تم زندہ اور مردہ، اسی طرح با اختیار اور بے اختیار میں فرق نہیں جانتے ہو؟ اُف ہو تم پر۔ مزید فرمایا:

﴿وَكَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ﴾ میں کیوں ڈروں؟ ڈرنے کے لئے کوئی حقیقت تو ہو، جو یہاں کچھ بھی نہیں۔

﴿وَلَا تَخَافُوْنَ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ﴾ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ حقیقی معبود کے ساتھ بے حقیقت موہومی چیزوں کو شریک بنایا، جو:

﴿مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا﴾ جن کے بارے میں اس نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں کی، تم نے بے وقوفی ناسمجھی اور حماقت کی بنیاد پر مردہ بے جان بتوں کو حیّ و قیوم جل شانہ کے ساتھ شریک بنایا، لہٰذا خوف تمہیں ہونا چاہئے کہ تم نے ناشکری اور نمک حرامی کی، اور اَحکم الحاکمین قادر مطلق مالک الملک کے ساتھ ٹکر لے لی، اور اس کی حکومت سے بغاوت کی، پس تمہارے مقدر میں گرفت اور عذابِ الیم کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔ اور وہ دن بھی یاد ہی کرو جب کلہاڑی لے کر تمہارے سارے معبودوں کی ناک اور کان کٹوا کر دم لوں گا۔ پھر فرمایا:

﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ دونوں فریقوں میں سے کونسا فریق یعنی نجات کا زیادہ مستحق ہے؟ ایک فرقہ موحد ہے، مالک کا فرمانبردار، تقویٰ شعار ہے، شرک سے بیزار ہے۔ دوسرا فرقہ بت پرست، ستارہ پرست، مشرک ہے، ربّ العٰلمین کا باغی اور نافرمان ہے، اس کی ذات اور صفات کا منکر ہے، اس کی صفات میں بے جان مخلوقات کے اشتراک کا مدعی ہے، تو بتاؤ ان دونوں فریقوں میں سے اللہ تعالیٰ کی ابدی رحمت و رضا کا کون حقدار اور کون زیادہ مستحق ہے؟ اگر تمہیں کچھ علم اور سمجھ ہے تو خود ہی فیصلہ کرو، پھر ربّ العٰلمین جل شانہ

نے خود ہی جواب دیا کہ امن وسلامتی کے حقدار وہ لوگ ہیں جو:

﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ جو لوگ ایمان لائے، اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم یعنی شرک کے ساتھ نہیں ملایا۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ امن ایسے لوگوں کو حاصل ہوگا، وہی امن کے زیادہ حقدار ہیں، اور یہی ہدایت یافتہ لوگ ہیں۔

اس آیت میں مذکور ظلم کا مفہوم سمجھنے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی قدر اشتباہ واقع ہوا، چنانچہ بخاری، مسلم اور ترمذی کی روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خیال ہوا کہ ظلم سے مراد عام کوتاہی ہے، تو انہوں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ایسا شخص ہے جس سے ظلم یعنی چھوٹی موٹی خطا سرزد نہ ہوئی ہو؟ اگر ہر چھوٹے بڑے گناہ پر گرفت ہوگئی، اور سلامتی ایمان کے لئے ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچنا ضروری ہوا تو پھر نجات مشکل ہو جائے گی۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: یہاں ظلم سے چھوٹا موٹا گناہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد شرک ہے، جیسا کہ حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان:۱۳] (اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک مت کرو، بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔

اب آیت کا مفہوم یہ ہے کہ امن اور نجات ان لوگوں کا حق ہے جنہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ ملوث نہیں کیا، کیونکہ اگر ایمان کے ساتھ کوئی ادنیٰ شائبہ شرک ملوث ہو تو وہ ایمان غیر مقبول اور ضائع سمجھا جائے گا۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مسند احمد کی ایک لمبی حدیث بھی آتی ہے، جسے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے، جو حضرت ابن عباس اور جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم دونوں سے مروی ہے۔ کہتے ہیں:

ایک دفعہ ہم سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ کسی کام سے مدینہ منورہ سے باہر نکلے، تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک سوار کو دیکھا جو اپنی سواری کو دوڑاتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا، اسے دیکھ کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ سوار تمہارے پاس ہی آنا چاہتا ہے، جب وہ ہمارے پاس پہنچا تو اس نے سلام کیا، ہم نے جواب دیا، پھر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے عرض کیا: اپنے پیچھے اہل وعیال بال بچے اور خاندان چھوڑ کر آرہا ہوں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا: کہاں جانے کا خیال ہے؟ وہ کہنے لگا: میں تو اللہ تعالیٰ کے رسول کی

خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آرہا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس تک تم پہنچ گئے ہو، وہ میں ہی ہوں، پھر اس نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! مجھے ایمان سکھا دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اخلاص کے ساتھ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، پھر ظاہری احکام میں نماز قائم کرو، مال کی سالانہ زکوۃ ادا کرو، ماہِ رمضان کے روزے رکھو، اگر استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

جب سرور عالم ﷺ نے یہ باتیں بتائیں تو وہ شخص کہنے لگا: میں نے یہ سب کچھ مان لیا، آپ ﷺ کے ارشادات پر اُسی طرح عمل کروں گا، پھر جب وہ واپس جانے لگا تو اس کے اونٹ کا پاؤں جنگلی چوہے کی بل میں پھنس گیا، جس سے اونٹ گر پڑا، ساتھ ہی وہ شخص سر کے بل زمین پر گرا، اور اس کی گردن ٹوٹ گئی، اور وہ وفات پا گیا۔ سرور عالم ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: اسے جلدی اٹھا کر لے آؤ، حضرت عمار بن یاسر اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما دوڑے، جب اس کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ سرور عالم ﷺ وہاں سے کچھ دور ہٹ گئے، پھر عمار اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں وہاں سے کیوں ہٹ گیا تھا؟ پھر خود ہی فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ دو فرشتے جنت کے پھل اس شخص کے منہ میں ڈال رہے تھے، جس سے میں سمجھ گیا کہ اس کی موت بھوک کی حالت میں واقع ہوئی ہے۔ (ابن عباس کی روایت میں ہے کہ اس شخص نے آتے وقت یہ بھی کہا کہ میں گھاس کھاتے ہوئے آرہا ہوں)۔

ایسا واقعہ غزوۂ خیبر کے موقع پر بھی پیش آیا تھا۔ ایک چرواہے کے متعلق جس نے میدانِ جنگ میں اسلام قبول کیا، پھر لڑائی میں شامل ہو کر شہید ہوا، جسے جنتی حوروں نے بغل میں لے لیا۔

بہر حال! اس واقعہ کے بعد سید کائنات ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: دیکھو! هٰذَا مِنَ الَّذِيْنَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔ یہ شخص ایمان لایا، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا، اور اپنے ایمان کو شرک کی نجاست سے پاک رکھا، اس طرح کی موت شہادت کی موت شمار ہوتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی تجہیز و تکفین کا اور جنازہ کا انتظام مکمل کرا کے اسے دفنا دیا، یہ شخص کتنا خوش قسمت نکلا؟ رضی اللہ عنہ۔ [ابن کثیر]

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَ
وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَ
اَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ
كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾

ترجمہ: اور یہ ہماری حجت تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جس کو چاہیں مرتبوں کے اعتبار سے بلند کرتے ہیں، بے شک آپ کا ربّ حکمت والا ہے، علم والا ہے ﴿۸۳﴾ اور ہم نے ان کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے، اور ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی، اور اس سے پہلے ہم نے نوح کو ہدایت دی، اور ان کی ذرّیت سے داؤد اور سلیمان کو، اور ایوب کو اور یوسف کو اور موسیٰ کو، اور ہارن کو، اور ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں ﴿۸۴﴾ اور زکریا کو اور یحییٰ کو اور عیسیٰ کو اور الیاس کو، سب صالحین میں سے ہیں ﴿۸۵﴾ اور اسماعیل کو، اور الیسع کو اور یونس کو اور لوط کو، اور سب کو ہم نے فضیلت دی جہانوں پر ﴿۸۶﴾

معارف ومنازل

حضرات انبیاء علیہم السّلام کا تذکرہ، اوران کی اقتدا کرنے کا حکم:

ان آیات میں اٹھارہ پیغمبروں علیہم السّلام کے نام اور ان کا اجمالی تذکرہ و بیان ہے۔ اس سے پہلے حجت بیان کی جو ابراہیم علیہ السّلام نے ستارہ پرستوں کو پیش کی، اور انہیں بتایا کہ غروب ہونے والا معبود نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ میں تمہارے معبودانِ باطلہ سے نہیں ڈرتا، یہ دلیل اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السّلام کو بتادی، اور ان کے دل میں ڈال دی، جس سے انہوں نے قوم کو سمجھایا، اور قائل کردیا، اور جواب سے انہیں عاجز کردیا۔ ﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ﴾ کا یہی مطلب ہے۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ﴾ ہم درجات کے اعتبار سے جس کو چاہیں بلند کردیتے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسّلام سب ہی حاملینِ وحی الٰہی کے امین ہیں، اور سب ہی درجاتِ عالیہ والے تھے، اور ان میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر رفعت اور بلندی وفضیلت دی ہے، جیسا کہ: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ [البقرۃ: ۲۵۳] (یہ پیغمبر ہیں، ان کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت عطا کی ہے) میں بیان فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ ابوالانبیاء علیہم السلام بلند درجات والے تھے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے شمار تکلیفیں اٹھائیں، اور اپنی قوم سے بڑے بڑے مقابلے کئے، اور نمرود کے ساتھ بحث ومناظرہ کیا، جس سے وہ لاجواب ہوکر رہ گیا، اور بڑے بڑے کٹھن مراحل اور امتحانات میں جوان مردی کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ ﴿قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ [البقرة: ۱۲۴] (اللہ نے فرمایا: میں آپ کو لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں) کے تمغۂ فضیلت پر فائز رہے۔

اور ان کے بعد جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے سب ان کی نسل میں سے ہیں۔ آپ علیہ السلام پیغمبروں کے باپ اور مقتداء ہیں۔ سید الانبیاء خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بھی آپ علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کا مرتبہ ودرجہ ہے۔

دراصل یہاں سے چھ آیات تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے فضل اضافی کا ذکر ہے، جس میں اٹھارہ انبیاء علیہم السلام کی فہرست شمار کی گئی ہے، جن میں سے بعض حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آباء واجداد ہیں (جیسے نوح علیہ السلام) اور اکثر ان کی اولاد ہے، اور بعض ان کے بھائی بھتیجے ہیں (جیسے لوط علیہ السلام)۔

ان آیتوں میں ایک طرف تو ان حضرات کا ہدایت پر ہونا، صالحین میں سے ہونا، صراط مستقیم پر ہونا بیان فرمایا گیا، اور یہ بتایا گیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے دین کی خدمت کے لئے منتخب اور قبول فرمالیا ہے۔ اور دوسری طرف یہ بتلادیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے باپ، برادری اور وطن کو چھوڑ دیا تھا، ان کو اپنی برادری سے بہتر اور اپنے وطن سے بہتر وطن عطا فرمایا۔ اور یہ شرف عظیم بھی عطا فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جتنے انبیاء اور رسول علیہم السلام مبعوث ہوئے وہ سب ان کی اولاد میں ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کی ایک شاخ حضرت اسحاق علیہ السلام سے چلی، اس میں تمام انبیاء بنی اسرائیل آئے، جن کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ اور دوسری شاخ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے چلی، اس میں صرف حضرت خاتم الانبیاء سید المرسلین صلّی اللہ علیہ وآلہ وأصحابہ وأزواجہ کی ذات گرامی ہے۔

تو آن دُرِ مکنون یک دانۂ ☆ کہ پیرایۂ سلطنت خانۂ

(سعدیؒ)

آیت کریمہ میں جن انبیاء کرام علیہم السلام کا بیان مذکور ہوا اس بارے میں ان کے متعلق اگر تفصیلات درکار

ہوں تو قصص القرآن کا مطالعہ کیا جائے۔

وَمِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ
یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ یَّكْفُرْ بِهَا هٰۤؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِیْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓىِٕكَ
الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۰﴾

ترجمہ: اور ان کے کچھ باپ داداؤں اور کچھ اولاد کچھ بھائیوں کو اور ہم نے ان کو چن لیا، اور ان کو ہدایت دی سیدھے راستے کی طرف ﴿۸۷﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، وہ اس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے جسے چاہے ہدایت دیتا ہے، اور اگر یہ حضرات شرک اختیار کر لیتے تو جو اعمال کیا کرتے تھے وہ سب حبط ہو جاتے ﴿۸۸﴾ یہ وہ حضرات ہیں جن کو ہم نے کتاب دی، اور حکمت اور نبوّت عطا کی، سو اگر زمانہ موجودہ کے لوگ نبوّت کا انکار کریں تو ہم نے اس کے لئے بہت سے لوگ ایسے مقرر کر دیئے ہیں جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں ﴿۸۹﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، سو آپ ان کی ہدایت کی اقتداء کریں، آپ فرما دیجئے کہ: میں اس پر تم سے کسی معاوضہ کا سوال نہیں کرتا، یہ تو صرف نصیحت ہے جہانوں کے لئے ﴿۹۰﴾

معارف ومنازل

﴿وَمِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ﴾ قَالَ صَاحِبُ الرُّوْحِ وَمِنْ اِبْتِدَائِیَةٌ وَالْمَفْعُوْلُ مَحْذُوْفٌ اَیْ وَهَدَیْنَا مِنْ اٰبَاءِهِمْ وَاَبْنَاءِهِمْ وَاَخْوَانِهِمْ جَمَاعَاتٍ كَثِیْرَةً اَوْ مَعْطُوْفٌ عَلٰی كُلًّا فَضَّلْنَا وَمِنْ تَبْعِیْضِیَةٌ اَیْ فَضَّلْنَا بَعْضَ اٰبَاءِهِمْ وَذُرِّیَّاتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ الخ۔ یعنی اوپر جن حضرات کا ذکر ہوا ان کے آباء اور ان کی ذرّیتوں اور ان کے بھائیوں میں سے بھی بہت سوں کو ہدایت دی۔

یہ معنی اس صورت میں ہے جبکہ هَدَیْنَا محذوف مانا جائے۔ اور فَضَّلْنَا سے بھی متعلق ہو سکتا ہے، جس کا معنی یہ ہوگا کہ ان حضرات کے آباء اور ذرّیات اور اخوان میں سے بھی بہت سوں کو فضیلت دی پھر فرمایا:

﴿وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ اور ہم نے ان کو چن لیا، اور ان کو صراط مستقیم کی

طرف ہدایت دی۔ اس میں مضمون سابق کی تاکید اور تقدیر ہے۔ پھر فرمایا:

﴿ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ﴾ یہ صراطِ مستقیم کی ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کی ہدایت کا فیصلہ فرمادے۔ اس میں یہ بتایا کہ ہدایت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، کسی کو غلط فہمی اور گھمنڈ نہیں ہونا چاہئے کہ میں صاحبِ ہدایت ہوں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السّلام ہوں یا اولیاء سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں، سب کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے، اور صراط مستقیم پر باقی رکھا ہے۔ پھر ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا﴾ اگر بالفرض یہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل کیا کرتے تھے وہ سب ثواب کے اعتبار سے باطل ہو جاتے۔ سورہ زُمَر میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ [الزمر:٦٥] (اور یہ حقیقت ہے کہ تم سے اور تم سے پہلے تمام پیغمبروں سے وحی کے ذریعے یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ اگر تم نے شرک کا ارتکاب کیا تو تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے گا۔ اور تم یقینی طور پر سخت نقصان اٹھانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے)۔

کیونکہ شرک اور کفر تمام اعمال کو باطل کر دیتا ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السّلام سے شرک اور کفر کا صدور محال ہے، بلکہ وہ گناہوں سے بھی پاک ہوتے ہیں، کیونکہ وہ من جانب اللہ معصوم ہیں۔ یہ بات بطور فرض فرمائی، اور اس سے دوسروں کو سبق دینا اور تنبیہ کرنا مقصود ہے، کہ جب انبیاء کرام علیہم السّلام کا یہ حال ہے، تو دوسرا کوئی شخص جو مشرک ہوگا اس کے اعمالِ صالحہ کا ثواب کیسے اور کیوں مل سکتا ہے؟ کافر اور مشرک کے اعمال شروع سے غیر معتبر اور باطل ہیں، اور اگر کسی نے اسلام کی حالت میں بڑے نیک اعمال انجام دیئے، پھر شرک کا ارتکاب کیا تو گزشتہ سارے اعمال باطل ہو جائیں گے۔ العیاذ باللہ من الشرک۔ ارشاد ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب دی، اور حکم دیا، اور نبوت عطا کی۔ اس میں جو لفظِ کتاب ہے، اس سے جنس مراد ہے، جس جس نبی کو کتاب ملی عموم جنس میں ان سب کا ذکر آ گیا۔ اور اَلْحُكْمَ جو فرمایا اس سے حکمت یعنی حقائق الاشیاء کی معرفت مراد ہے، اور لوگوں کے درمیان صحیح صحیح فیصلے کرنا بھی مراد لے سکتے ہیں، کیونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السّلام اپنی امتوں کے درمیان فیصلے بھی فرماتے تھے۔

یہاں لفظِ نبوّت وارد ہوا ہے، لفظِ رسالت مذکور نہیں۔ نبی تو ہر پیغمبر ہے، لیکن رسول کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں کہ وہ خاص ہے، کیونکہ رسول وہ ہے جسے نئی شریعت اور نئی کتاب دی گئی ہو، اور رسولوں کی تعداد تین

سو تیرہ، یا تین سو پندرہ، جبکہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ایک حدیث کے حوالے سے پیچھے مذکور ہو چکی ہے۔ [مشکوٰۃ: ۵۱۱]

یہاں لفظِ نبوت لا کر سب کو مضمونِ بالا میں شریک فرمایا۔ آگے ارشاد ہے:

﴿فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِہَا ہٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِہَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِہَا بِکٰفِرِیۡنَ﴾ پس اگر یہ لوگ یعنی اہلِ مکہ اور ان کے علاوہ دوسرے کفار ان پیغمبروں کی نبوت کا انکار کریں، جس میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کا انکار بھی ہے، کیونکہ سابق تمام پیغمبروں کی نبوت کی خبر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید نے دی ہے، سو ہم نے ان کے لئے ایسے لوگوں کو مقرر کر دیا ہے جو اس کے منکر نہیں۔ یعنی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے اور تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کی ہدایات پیش کر دینے کے باوجود وہ انکار ہی پر تُلے ہوئے ہیں تو آپ غم نہ کریں، کیونکہ ہم نے آپ کی دعوت وہدایت کو ماننے اور اپنانے کے لئے ایک بہت بڑی قوم کو مقرر کر رکھا ہے، وہ کبھی کفر و انکار کے پاس نہیں جائیں گے۔

اس میں عہد مبارک کے موجودین مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم بھی داخل ہیں، اور قیامت تک آنے والے بے شمار مسلمان بھی، اور یہ آیت کریمہ ان سب کے لئے مایۂ فخر اور بشارت عظیمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ وَفِیْھِمْ وَاحْشُرْنَا فِیْھِمْ وَمَعَھُمْ وَاکْثُرْ ھٰذَا الْجَمْعَ اِلٰی قِیَامِ السَّاعَۃِ۔ اٰمین

﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ ہَدَی اللّٰہُ فَبِہُدٰىہُمُ اقۡتَدِہۡ﴾ (اقتدہ میں ھا سکتہ ہے، ضمیر نہیں ہے) یہ وہ حضرات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، تو آپ ان کی ہدایت کا اتباع کریں۔

مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ اصولِ ایمان یعنی توحید اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکُتب اور ایمان بالیوم الآخر میں ان حضرات کی اقتداء کا حکم ہے، باقی احکام وفروعات ہر ایک پیغمبر کی شریعت کے دوسروں سے مختلف ہیں، تو فروعی مسائل میں اقتداء کا حکم نہیں۔ نیز حضرات انبیاء علیہم السلام کی جو صفاتِ حمیدہ اور اعمالِ صالحہ مثلاً، استقلال، صبر، زہد، ریاضت، شکر، تواضع، ایثار، تضرّع، خدمتِ خلق، عدل وانصاف، سخاوت وکرم وغیرہ چیزوں میں ان کا اقتداء کرنا مراد ہے۔ ان حضرات نے اپنی قوموں کے انکار اور ایذا رسانی پر صبر کیا، حلم وبردباری سے کام لیا، آپ بھی اس کو اختیار فرمائیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ۳۵] (صبر

کریں، جیسے عزیمت والے پیغمبروں نے صبر کیا) یا ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ [النحل:۱۲۷] (اور صبر سے کام لو، اور تمہارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے)۔

سورۂ صٓ کے سجدہ کے بارے میں اختلاف ہے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورۂ صٓ میں سجدۂ تلاوت واجب نہیں۔ صحیح بخاری میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۂ صٓ کی تلاوت پر سجدہ کیا تو حضرت مجاہد تابعی رحمۃ اللہ علیہ ان کے شاگرد نے دریافت کیا کہ آپ نے کس دلیل سے یہاں سجدہ کیا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ کیا تم یہ آیت نہیں پڑھتے ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ﴾ اِلٰی قَوْلِہٖ تَعَالٰی ﴿فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾۔

حضرت داود علیہ السلام ان حضرات میں تھے جن کی اقتدا کا تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا۔ سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہاں سجدہ کیا، لہٰذا ہم بھی سجدہ کرتے ہیں۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سورۂ صٓ کا سجدہ واجب ہے۔

﴿قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا﴾ میں اس پر تم سے کوئی اُجرت طلب نہیں کرتا، یہ جو تبلیغ اور دعوت کا کام ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہے، اس کا ثواب اللہ تعالیٰ ہی عطا فرمائیں گے، سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدٌ﴾ [سبأ:۴۷] (آپ فرما دیجئے کہ: میں نے تم سے جو معاوضہ طلب کیا ہو وہ تمہارے ہی لئے ہے، بس میرا اجر صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہے، اور وہ ہر چیز پر اطلاع رکھتا ہے) اور باخبر ہے۔

یعنی میں تم سے اپنی محنت کا کچھ صلہ نہیں چاہتا، اگر تمہارے خیال میں کچھ معاوضہ طلب کیا ہو وہ سب تم اپنے پاس رکھو، مجھے ضرورت نہیں، میرا صلہ تو خدا کے یہاں ہے۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ قرآن جو میں تمہیں سناتا ہوں یہ جہانوں کے لئے محض ایک نصیحت ہے۔ یہ ایک عمومی رحمت ہے، جہاں اس کا حامل سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمت للعٰلمین ہے، وہاں ان کی کتاب بھی هُدًی وَ ذِكْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ (ہدایت ہے، اور مخلوق کے لئے نصیحت ہے) ہے۔

اس آیت میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عمومی بعثت کی طرف اشارہ ہے، جب قرآن سارے جہانوں، سارے جنات اور سارے انسانوں کے لئے ہے، اور پھر کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں ہے، تو قرآن لانے والا بھی ان سب کے لئے بھیجا ہوا رسول ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ [الأعراف:۱۵۸] (کہہ دیں: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں)۔ اور فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا

﴿كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا﴾ [سبأ:٢٨] (اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام لوگوں کے لئے، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا)۔ اسی طرح ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبياء:١٠٧] (اور ہم نے آپ کو مخلوقات کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی بعثت دلائلِ قطعیہ سے واضح اور تمام امت کا اتفاقی و اجماعی عقیدہ ہے، جس سے معمولی انحراف بھی کفر ہے۔ [روح المعاني وغيره]

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ
الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ
وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾

ترجمہ: اور لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت نہیں پہچانی جیسے پہچاننی تھی، جبکہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی بھی چیز نازل نہیں فرمائی، آپ فرمادیجئے کہ: کس نے اتاری وہ کتاب جسے موسیٰ (علیہ السلام) لے کر آئے؟ جو نور تھی، اور لوگوں کے لئے ہدایت تھی، تم نے اسے الگ الگ ورقوں میں کر رکھا ہے، جنہیں تم ظاہر کرتے ہو، اور بہت کچھ چھپاتے ہو، اور تم کو وہ باتیں بتائی گئی ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں جانا، آپ فرمادیجئے کہ: اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، پھر ان کو چھوڑ دیجئے اپنی خرافات میں کھیلتے رہیں گے ﴿٩١﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ شانہ کی پہچان ومعرفت ہو، یا اطاعت وفرمانبرداری ہو، اس کے لئے یہ شرط ہے کہ معیاری اور کماحقہ خالص اور کامل ہو، اگر یہ چیزیں صرف برائے نام اور ناقص ہوں، یا صرف خانہ پری کے معیار پر ہوں، تو ناقابلِ قبول ہوں گی۔ یہود کی ہمیشہ یہی عادت رہی ہے کہ ان کے عقائد اور اعمال غیر معیاری رہے ہیں، انہوں نے عقائد واعمال کے معاملات میں کبھی اصلی معیار اور اخلاص کا لحاظ مدنظر نہیں رکھا۔

تفسیر درمنثور میں ہے کہ مالک بن صیف ایک یہودی عالم تھا، وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا کرنے لگا، یہ شخص موٹا بھاری بدن والا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ میں تجھے اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل فرمائی، کیا تم نے توریت میں یہ مضمون پایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھاری جسم والے عالم سے بغض

رکھتا ہے؟ یہ سن کر وہ غصہ ہوگیا، اور کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ بھی نازل نہیں فرمایا، وہ ضد وعناد کی وجہ سے یہ بات کہہ گیا، اور اس کے الفاظ کے عموم سے توریت شریف کے نازل ہونے کی بھی نفی ہوگئی، اس کے یہودی ساتھی جو موجود تھے انہوں نے اسے احساس بھی دلایا، اور کہا کہ افسوس ہے تو ایسی بات کہہ رہا ہے۔ کیا موسیٰ علیہ السلام پر بھی کچھ نازل نہیں ہوا؟ اس نے ضد کی بنیاد پر پھر وہی اپنی بات دہرادی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ بھی نازل نہیں فرمایا۔

اس پر اللہ تعالیٰ جل شانہ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ یہ عناد کی حد ہے کہ ضد میں آکر انسان اپنے مسلمہ عقائد کا انکار کر بیٹھے، اور اپنے دین وایمان کا بھی منکر ہو جائے۔ اسی طرح بعض لوگ اب بھی اس قسم کی خرافات اور غلط باتیں کہا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے۔

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ﴾ (انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو ایسا نہیں مانا جیسا کہ ماننے کا حق تھا) درحقیقت بقول امام ابوحنیفہ وفضیل بن عیاض رحمہم اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی حق ہو سارا جہاں مل کر اگر اسے اسی طرز پر پورا کرنا چاہے جیسا کہ اس کا حق اور شایانِ شان ہے، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا، پس لامحالہ کہنا پڑے گا مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ وَمَاعَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ۔ مگر اس کے باوجود ہر مؤمن پر فرض ہے کہ حتی المقدور جدوجہد جاری رکھے، اور مسلسل سعی وکوشش میں لگا رہے، جیسے فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة:۲۸۶] (اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا) پس اپنی قوت کو حاضر کرنا ضروری ہوا۔ ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را ☆ تو دانی حساب کم وبیش را

یہود قوم اپنی نافرمانی اور عہد شکنی اور استہزاء بالدین میں بڑی شہرت رکھتی تھی، مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے عالم مالک بن الصیف کا محاسبہ کیا، اور اسے اس کے منصب سے فارغ کردیا، صرف اس بنیاد پر کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے بھی آسمانی وحی کی نفی کی تھی، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے انبیاء پر کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے ہیں، اسی کے جواب میں ارشاد ہوا:

﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى﴾ آپ فرمادیجئے: کس نے اتاری وہ کتاب جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام لائے، جو نور تھی اور لوگوں کے لئے ہدایت تھی۔ اس میں بطورِ استفہامِ تقریری ان ہی

لوگوں سے سوال فرمایا جو منکر ہو رہے تھے، اور ضد و عناد میں یوں کہہ گئے کہ: اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ بھی نازل نہیں فرمایا، ان سے سوال فرمایا کہ اب تک تو تم یہ کہتے اور مانتے رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت شریف نازل فرمائی، اور اب یہ کہہ رہے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ بھی نازل نہیں فرمایا، پس یہ حق و صداقت اور ایمان و یقین کا کھلم کھلا انکار ہے۔ اسی کے ساتھ علماء یہود کے ایک بہت برے کردار کا بیان اور مذمت فرمائی:

﴿تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا﴾ کہ تم لوگوں نے توریت شریف کو بجائے اکٹھی مجموعی یک جا کتاب مرتب کرنے کے مختلف اوراق میں رکھ چھوڑا ہے، جس میں سے اپنے مطلب کی خاطر کچھ ظاہر کرتے ہو، اور اپنے برے اور گندے خیالات کے پیش نظر اکثر کو چھپاتے ہو۔

جب ان کے عوام کوئی بات پوچھنے کے لئے آتے تھے تو صندوق میں ہاتھ ڈال کر کوئی سا بھی ایک ورق نکال لیتے تھے، اور سائل کے مطلب کے مطابق پڑھ کر سنا دیتے تھے، تا کہ اس سے کچھ شکرانہ مل جائے۔

نیز توریت شریف میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و صفت بیان کی گئی تھی جسے جانتے ہوئے عوام سے چھپاتے تھے۔ اسی طرح آیتِ رجم کی طرح بہت سے احکام میں تبدیلی اور تحریف کے مرتکب ہو چکے تھے، جیسے فرمایا: ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ [النساء: ۴۶] (الفاظ کو اپنی جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں)۔

﴿وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ﴾ (اور تم کو وہ باتیں بتائی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے، اور نہ تمہارے آباء و اجداد) مطلب یہ ہے کہ توریت کی عبارت سے جن چیزوں کا سمجھنا تمہارے اور تمہارے آباء و اجداد کے لئے غیر واضح تھا ان کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کھول دیا گیا۔ دوسری آیت کا مفہوم بھی یہی ہے فرمایا: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [النمل: ۷۶] (بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان چیزوں کو بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے)۔

پھر فرمایا: ﴿قُلِ اللّٰهُ﴾ آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی۔ یہ جواب ہے: ﴿مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى﴾ کا۔ مطلب یہ ہے کہ جس توریت کی یہ حالت ہے کہ اس کو اولاً تم تو مانتے ہو، دوسرے بوجہ نور اور ہدیٰ کے ماننے کے قابل ہے۔ تیسرے یہ کہ ہر وقت تمہارے ہاتھوں اور استعمال میں ہے، گو استعمال شرمناک ہے، لیکن اس کی وجہ سے گنجائش انکار تو نہیں رہی۔ چوتھے تمہارے حق میں وہ بڑی نعمت اور ملت کی چیز ہے، اس کی بدولت تم عالم بنے بیٹھے ہو، اس حیثیت سے بھی اس میں گنجائش انکار کی نہیں۔ یہ بتلاؤ کہ اس کو کس نے نازل کیا ہے؟

اور چونکہ اس سوال کا جواب ایسا متعین ہے کہ وہ لوگ بھی اس کے سوا کوئی جواب نہ دیتے، اس لئے خود ہی جواب دینے کے لئے سرور عالم ﷺ کو حکم ہے کہ: ﴿قُلِ اللهُ﴾ کہ آپ ہی کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب مذکور کو نازل فرمایا ہے۔[بیان القرآن] پھر فرمایا:

﴿ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ پھران کو چھوڑ دیجئے، اپنی بیہودہ خرافات میں کھیلتے رہیں گے، جیسے پہلے فرمایا: ﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾[الأنعام: ۷۰] آپ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی اختیار فرمایئے جو جانتے ہوئے سب کچھ اپنی خواہشات پر قربان کر بیٹھے ہیں، اور جو کتاب موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی یہ لوگ اسے مانتے بھی نہیں ہیں، اور ضد وعناد میں یوں بھی کہہ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ بھی نازل کیا ہی نہیں۔

چونکہ ان کا کفر کسی جہالت پر مبنی نہیں، بلکہ عناد کی بنیاد پر یہ سب کچھ کرتے رہتے ہیں، پس آپ انہیں چھوڑ دیں، آپ کا فرضِ منصبی صرف ابلاغ ہے، منوانا اور ہدایت دینا نہیں، یہ تمہارے ربّ کے اختیار میں ہے، جو اسے طلب کرے گا اسے عطا فرمائے گا، اور جس کو ہدایت کی طلب نہ ہو وہ محروم ہی رہے گا، اور فضول خرافات میں زندگی بھر مست رہے گا، پھر اس کا انجام جہنم ہی ہوگا۔ پھر: ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾[النبأ: ۴۰] (کاش میں مٹی ہوتا) یا ﴿يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾ [الفرقان:۲۷] (کاش میں نے پیغمبر کے ساتھ ہمراہی اختیار کرلی ہوتی) کہتے ہوئے ابدی شقاوتوں کی نذر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ربّ العلمین ہمیں ہر قسم کی گمراہیوں سے بچائے۔ آمین

فائدہ:

سرور عالم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ میری امت پر وہ دور آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا تھا، (حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)۔[مشکوۃ: ۳۰]

آپ ﷺ کی اس پیشین گوئی کا مظاہرہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ مسلمانوں نے یہود ونصاریٰ، ہنود، روافض وغیرہ کے طور وطریقے اختیار کئے ہوئے ہیں، اور مذہب کے نام پر وہ سارے خرافات بکثرت اپنائے ہوئے ہیں جن کو یہود ونصاریٰ اور دیگر باطل اقوام نے ایجاد کیا، اور ترویج دیا۔ آج ہندوستان کا ہندو برملا فخریہ اور طنزیہ طور پر کہتا ہے کہ مسلمان خواہ مخواہ ہمیں بت پرست غیر مسلم قرار دیتے ہیں، جبکہ وہ اپنے بزرگوں کی قبروں اور مزارات پر سال بھر وہی کچھ شرک کرتے ہیں جو ہمارے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوتے۔

بعض بے دین لوگ تجارت کی خاطر پیری مریدی کی گدیاں سنبھالے بیٹھے ہیں، اور قرآن کریم کی آیتوں کو قراطیس بنا کر تعویذ کے نام پر اتنی بے دردی سے فروخت کر رہے ہیں کہ بڑے کارخانہ داروں کی آمدن بھی ان کے مقابلہ میں ماند پڑگئی ہے، بس اگر کوئی پیسہ کا شوقی ہو تو صرف داڑھی چھوڑ کر ایک مصنوعی قبر و گنبد بنا کر بیٹھ جائے، پھر دیکھیں کہ بدقسمت لوگوں، مَردوں، عورتوں کا کیسا تاریخی ہجوم ہوگا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ ـــ

غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بین خدا تیری قوم کو بچائے
بھلا تجھے ان سے واسطہ کیا یہ اپنی دولت کما رہے ہیں
یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے ☆ گلیم بوذر و دلق اُویس و چادرِ زہرا

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: اور یہ کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے بڑی برکت والی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے، اور تاکہ آپ مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس رہنے والوں کو ڈرائیں، اور جو لوگ آخرت کا یقین رکھتے ہیں اس پر ایمان لاتے ہیں، اور وہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں ﴿۹۲﴾

معارف ومنازل

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ﴾ یہ تنوین تعظیم کے لیئے ہے، اور ﴿مُبٰرَكٌ﴾ اس کی تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بہت بڑی بابرکت عظیم الشان وجلیل القدر کتاب ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں یہ کتاب بہت زیادہ فائدہ والی ہے، اس لئے کہ اس میں دونوں جہاں کے منافع ہیں، اور اولین وآخرین کے علوم ہیں۔ اسی طرح اس کی تلاوت کرنے والے کو ربّ العزّت سبحانہ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہے، اور یہ بہت بڑی خیر وبرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔ آمین

﴿لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ تاکہ آپ ڈرائیں اُمّ القریٰ مکہ والوں کو، اور آس پاس کے لوگوں کو۔ اس سے مراد پوری دنیا کی آبادی ہے، جس کے لئے آپ ﷺ کی بعثت عمومی اور قرآن حکیم کی ہدایت وعمومی

نزول ہے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ﴾[الأنعام: ۱۹]

اُمُّ الْقُرٰی مکہ معظمہ کے ناموں میں سے ہے۔ اُمُّ الْقُرٰی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسی جگہ سے ساری زمین پھیلائی گئی، یا اس لئے کہ مشرق ومغرب، جنوب وشمال تمام اطراف وامکنہ کا قبلہ ہے، یا اس لئے کہ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش والا اور بعثت ورسالت والا مبارک شہر ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ﴾ جولوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں انہیں آخرت کی نجات کا غم وفکر لاحق رہتا ہے، اور وہاں کے عذاب کا ڈر رہتا ہے، یہی چیز انہیں قرآن کریم پر ایمان لانے اور اسے حرزِ جان بنانے پر آمادہ کرتی ہے، یہی وہ چیز ہے کہ قومِ یہود اس سے محروم ہے، تب ہی وہ ایمان بالقرآن سے محروم رہے، اور یہی چیز انہیں بار بار اوقاتِ خمسہ کی نمازوں پر پابندی پر آمادہ اور مجبور کرتی ہے، یہی نماز ستونِ دین اور علامتِ ایمان وتقویٰ ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّمَنْ
قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ
عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ
اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ
زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾

ترجمہ: اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھے؟ یا یوں کہے کہ میری طرف وحی کی گئی؟ حالانکہ اس کی طرف کچھ بھی وحی نہیں کی گئی، اور اس سے بڑھ کر زیادہ ظالم کون ہوگا جو یوں کہے کہ میں ایسا کلام نازل کروں گا جیسا اللہ تعالیٰ نے نازل کیا؟ اور اگر تو اس منظر کو دیکھے جبکہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں، آج تم کو ذلت والے عذاب کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹی باتیں لگاتے تھے، اور اس کی آیتوں کے ماننے سے تکبر کیا کرتے تھے ﴿۹۳﴾ اور البتہ

تم ہمارے پاس آؤ گے الگ الگ، جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، اور تم نے اپنے پیٹھ پیچھے وہ چھوڑ دیا جو ہم نے تمہیں عطا کیا تھا، اور ہم نہیں دیکھ رہے تمہارے ساتھ تمہارے سفارشیوں کو، جن کے بارے میں تم نے خیال کیا تھا کہ وہ تمہارے بارے میں شریک ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارا آپس کا تعلق منقطع ہو گیا، اور تمہارے وہ دعوے گئے گزرے ہو گئے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۹۴﴾

معارف ومنازل

جھوٹے لوگوں پر قرآن حکیم نے لعنت کی ہے، ہر جھوٹا شخص ظالم کہلاتا ہے، اسی بناء پر ظالم لوگوں پر بھی لعنت کا اطلاق ہوا ہے۔ البتہ جھوٹ اور ظلم میں اگر افتراء علی اللہ، یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا عنصر شامل ہو تو اس کا جرم نہایت سخت اور سنگین ہوگا۔ آیت کریمہ میں اسی کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ اس شخص سے بڑا ظالم کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ اور بہتان باندھتا ہے، اور غلط و بے بنیاد باتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، جیسے مالک بن الصیف، جو کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ بھی نازل نہیں کیا، یا عمرو بن لحی الخزاعی جس نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ حام اور بت پرستی وغیرہ کی ترویج اور اشاعت کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا تھا، وغیرہ۔

یہ حکم قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے عام ہے، جو غلط رسوم و رواج اور بدعات ایجاد کرتے ہیں، اور نسبت اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ یا ملت و شریعت کی طرف کر کے سادہ لوح بے علم مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں خاص کر بدعتی لوگ سب سے پیش پیش ہیں، جن کے سارے اعمال جھوٹ اور افتراء پر مبنی ہوتے ہیں۔ منگھڑت اور بے بنیاد خود ساختہ حدیثیں بناتے ہیں، اور فرضی واقعات، جھوٹے قصے کہانیوں کا سہارا لے کر عوام الناس کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، یہاں تک کہ قرآن حکیم کی آیتوں اور احادیثِ شریفہ میں بے دریغ معنوی تحریف کر کے لوگوں کو خوش رکھتے اور گمراہ کرتے ہیں۔

﴿اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ﴾ یہ افتراء علی اللہ کی ایک خاص قسم کا بیان اور نشاندہی ہے۔ یہ آیت مسیلمہ کذاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ قبیلہ بنی حنیفہ کا سردار یمامہ کا باشندہ تھا، وہ سرور عالم ﷺ کے عہد مبارک میں صنعاء یمن کے اسود عنسی کی طرح مسجع فقرے بول کر بزعمِ خود انہیں وحی الٰہی کا لباس پہنا کر عوام کو گمراہ

کرتا تھا۔اس کے قبیلہ کے لوگ اسے نبی مانتے تھے،اور وہ کہتا تھا کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔

ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا قول یہی نقل کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں اس نے دو قاصد بھیجے تھے،سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قاصدوں سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کا دستور نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا۔[مظهري]

اسود عنسی مدعی نبوت کو اس کی مسلمان بیوی کے تعاون سے حضرت فیروز دیلمی صحابی رضی اللہ عنہ نے اس کے مکان میں نقب لگا کر جہنم رسید کیا۔صبح وحی کے ذریعہ مرض وفات میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خوشخبری سنائی، اور حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ کے لئے دعا کی۔

رہا مسیلمہ،اس نے بڑے زور وشور سے لوگوں کو کافر بنانا شروع کیا، چالیس ہزار جنگجو لوگوں کا لشکر تیار کیا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں چار ہزار قدسیوں کا لشکر روانہ فرمایا، اس لشکر کے سات سو خوش قسمتوں نے جام شہادت نوش فرمایا،جبکہ مسیلمہ کے بارہ ہزار ساتھی جہنم رسید ہوئے،اور بڑی تعداد میں زخمی ہوئے،اور بقایا منتشر ہو کر بھاگ گئے،خود مسیلمہ حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔جن جن لوگوں نے نبوت یا اُلوہیت یا مہدویت کے دعوے کئے ہیں ان کی فہرست سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں لکھ چکا ہوں۔

﴿وَمَنْ قَالَ سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کاتب وحی کے بارے میں نازل ہوئی۔یہ کم بخت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا قریبی عزیز رشتہ دار تھا،جو وحی لکھا کرتا تھا،لیکن قرآن میں جس جگہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سَمِيعًا بَصِيرًا لکھواتے،وہ عَلِيمًا حَكِيمًا لکھتا،اور جہاں عَلِيمًا حَكِيمًا لکھواتے وہاں غَفُورًا رَّحِيمًا لکھتا تھا۔(اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچا مسلمان نہ تھا)۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ لکھوائی تو عبداللہ کاتب کو تخلیقِ انسانی کی یہ تفصیل بہت پسند آئی،اور وہ فوراً بول اٹھا: ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون:۱۴] (بڑی شان ہے اللہ کی، جو سارے کاریگروں سے بڑھ کر کاریگر ہے)۔پھر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! اسی طرح لکھو۔﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ اس پر عبداللہ کے دل میں شک پیدا ہوگیا،اور مرتد ہوگیا،اور کہنے لگا کہ: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی اترتی ہے تو مجھ پر بھی

وحی اترتی ہے، میں نے اس کے کہنے سے پہلے ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ کہا تو تھا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خود قرآن گھڑتے ہیں، ایسا قرآن میں بھی گھڑ سکتا ہوں۔ مرتد ہو کر مدینہ سے بھاگ گیا، اور مکہ مکرمہ میں کفار قریش سے جا ملا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مر الظہر ان (وادی فاطمہ) میں تشریف فرما تھے، تو عبد اللہ وہاں دوبارہ اسلام لایا، پھر آخر عمر تک اسلام پر قائم رہا، حتیٰ کہ سجدہ کی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔ [معالم، مظهري، وغيره]

کافروں کی ذلت موت کے وقت:

نشان مرد مؤمن با تو گویم ☆ چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

طبرانی اور حلیۃ الاولیاء کی روایت میں ہے کہ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ موت کی کشمکش میں مبتلا تھے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے گئے، اور ملک الموت سے فرمایا: یہ مومن ہے، جان کنی میں نرمی اختیار کرو، ملک الموت نے کہا: یارسول اللہ! میں ہر مومن کے ساتھ نرمی کا سلوک کرتا ہوں، اور میں ہر مؤمن کا رفیق اور دوست ہوں۔ [حلية الأولياء طبراني] مزید تفصیل سورۂ اعراف میں آئے گی۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

رہا کافر کا معاملہ، وہ نہایت سخت اور تباہ کن ہے، اس کے لئے ذلت کا عذاب سکرات الموت کے وقت سے شروع ہو جاتا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب کافر کے دنیا سے جانے کا اور آخرت کی طرف پہنچنے کا وقت ہوتا ہے تو اس وقت آسمان سے سیاہ چہروں والے فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں بدبودار ٹاٹ ہوتے ہیں، وہ اس کے پاس آ کر وہاں تک بیٹھ جاتے ہیں، جہاں تک نظر پہنچتی ہے، پھر ملک الموت تشریف لاتے ہیں، وہ اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، اور کہتے ہیں: اے خبیث روح! تو نکل اللہ تعالیٰ شانہ کی ناراضگی کی طرف، وہ روح اس کے جسم میں متفرق ہو کر پھیل جاتی ہے، اور نکلنا نہیں چاہتی، ملک الموت زبردستی اس کی جان کو اس طرح سختی اور بے دردی سے نکالتے ہیں جیسے بھیگا ہوا اُون سیخ پر لپٹا ہوا ہو اور طاقت کے ذریعہ اس کو اُون سے نکالا جائے، پھر ملک الموت ان سیاہ چہرے والے فرشتوں کے حوالہ کر دیتے ہیں، وہ اسے ٹاٹوں میں لپیٹ کر جہنم یعنی سجین پہنچا دیتے ہیں۔ یہ لمبی حدیث ہے، مکمل تفصیل سورۂ اعراف میں آئے گی۔ إن شاء اللہ

بہر حال! مؤمن کا معاملہ اوّل سے آخر تک کافر کے معاملہ کا برعکس ہے۔ الحمد للہ اس کی روح بدن سے اس

طرح سہولت سے نکلتی ہے، جیسے مشکیزہ سے پانی کا قطرہ ٹپکتا ہو، اور خوشبودار کفنوں میں سفید نورانی چہرے والے فرشتے اسے اٹھا کر أعلی عِلِّيِين کی طرف لے جاتے ہیں، اور سارے آسمانی دروازے اس کی آمد پر کھل جاتے ہیں، جبکہ کافر کے لئے نہیں کھلتے۔[مشکوۃ اول]

تو فرمایا: ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّٰلِمُونَ فِي غَمَرَٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ ءَايَٰتِهِۦ تَسْتَكْبِرُونَ﴾ (اور اگر تو دیکھے اس منظر کو جب کہ ظالم موت کی سختیوں میں ہوں گے، اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے کہہ رہے ہوں گے کہ: نکالو تم اپنی جانوں کو، آج تم کو اس کے بدلہ ذلّت کا عذاب دیا جائے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ وہ افتراء لگاتے تھے جو ناحق تھا، اور تم اس کی آیات کو قبول کرنے سے تکبر کرتے تھے)۔

جس نے اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹ لگایا، اور یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی بات نازل نہیں فرمائی، اور جس نے اللہ تعالیٰ کے کلام کا معارضہ اور مقابلہ کرنے کی بات کہی، اور جس نے نبوّت کا جھوٹا دعویٰ کیا، ان لوگوں کا یہ سب عمل دنیاوی بڑائی، کبر وغرور اور جاہ واقتدار حاصل کرنے، اور حاصل شدہ قیادت اور پیشوائی اور بڑائی کی حفاظت کے لئے تھا، آج ان کے لئے ذلّت کا عذاب ہے، جو موت کے وقت سے شروع ہوگا، پھر قبر اور برزخ میں، پھر حشر میں، حتیٰ کہ ابدی دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا۔

پھر فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَٰدَىٰ كَمَا خَلَقْنَٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ یہاں قیامت کے دن کی حاضری کی کیفیت بتائی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی جماعت، رفقاء، دوستوں سے کٹ کر اکیلا ربّ العزت کے پاس حاضر ہوگا۔ سورۃ مریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ أَحْصَىٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ ءَاتِيهِ يَوْمَ الْقِيَٰمَةِ فَرْدًا﴾ [مریم:۹۴] (بیشک اس نے سب کو شمار کر رکھا ہے، اور قیامت کے دن ہر ایک اس کے پاس تنہا آئے گا)۔ دنیا میں جو اپنے چیلوں، جماعتوں، لشکروں اور قوموں اور برادریوں پر بھروسہ کر کے زندگیاں گزارتے ہیں، اور برادریوں کے بل بوتے پر بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ٹکر لیتے ہیں، اور کفر وشرک ومعاصی پر آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، قیامت کے روز یہ سارے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں، اور کبر وغرور، ناز نخرے، خرمستیاں سب ختم ہو جاتی ہیں، اور وہاں کوئی کسی کا نہ ہوگا۔ ﴿الْأَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ [الزخرف:٦٧] (اس دن دوست بعض بعض کے دشمن ہوں گے، سوائے پرہیزگاروں کے)۔ متقیوں کا تقویٰ رہے گا، اور بڑا کارآمد بھی ہوگا، کیونکہ

تقویٰ ربّ العزّت جلّ جلالہ کو محبوب اور پسندیدہ رشتہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ قیامت کے دن تم اس حال میں جمع کئے جاؤ گے کہ بدن پر کپڑے نہ ہوں گے، اور سب بے ختنہ ہوں گے، اور ننگے پاؤں حاضر ہوں گے، حفاتاعزاتا غزلا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ انبیاء کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُۥ وَعْدًا عَلَيْنَآ إِنَّا كُنَّا فَٰعِلِينَ﴾ [الأنبياء:۱۰۴] (جیسا کہ ہم نے ابتداء میں پیدا کیا تھا، اسی طرح ہم لوٹائیں گے، ہمارے ذمہ یہ وعدہ ہے، بیشک ہم اس کے مطابق کرنے والے ہیں)۔ پھر فرمایا: سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کپڑے پہنائے جائیں گے۔ [بخاري]

سب مال ودولت اور اقتدار یہاں رہ گئے، بس:

﴿وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُورِكُمْ﴾ (اور تم نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا تھا)۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم نے دنیا میں تمہیں جو کچھ مال ودولت، آل واولاد، حشم وخدم، اقتدار وسرداری عنایت فرمائی تھی وہ سب حسرتوں کے ساتھ دنیا ہی میں چھوڑ کر آ گئے۔ دنیا میں لوگ مال کماتے ہیں، ایک کے دس (۱۰) بناتے ہیں، تھوڑے مال کو ہزاروں کوششوں کے ساتھ بہت زیادہ کر لیتے ہیں۔

اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مال کو شرعی قانون کے تحت کماتے ہیں، اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حصّہ زکوٰۃ وصدقات رکھتے ہیں، اور دوسرے شرعی حقوق ادا کرتے ہیں، اور کثرتِ مال سے تکبر وغرور میں مبتلا نہیں ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہر زمانہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ مال کو ایمان سے زیادہ محبوب ومقصود سمجھتے ہیں، اور اس کے لئے مرتے ہیں، اگر کوئی مذہبی یا دینی نقصان ہو تو اسے بآسانی ہضم کرتے ہیں، لیکن مالی نقصان کو برداشت تو کیا اس پر کٹ مرتے ہیں، اور مرواتے ہیں۔ اگر کسی کا مرنا جینا صرف مال کے لئے ہو تو وہ آخرت میں خوار ہوگا۔ ہاں! اگر مرنا اور جینا دین کے لئے ہو تو دونوں جہانوں میں سرخ رُو ہوگا، اور رضاء الٰہی کا حقیقی طور پر مستحق رہے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں، اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہیں، اور دنیا کے لئے وہ شخص جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں۔ [مشکوٰۃ]

مطلب یہ ہے کہ دنیا وآخرت دو سوکن ہیں، دونوں کو برابر خوش اور آباد رکھنا مشکل ہے، اگر دنیا کو راضی رکھو تو آخرت ناراض ہوگی، اور اگر آخرت کو آباد رکھو تو دنیا ناراض، پس عقلمند وہ ہے جو ابدی سعادت کے لئے اپنی آخرت کو

آباد کرے گا، اور بے عقل چار روزہ زندگی کی خوشحالی پر آخرت کا سودا کر کے خسارہ میں رہے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مرنے والا مرجاتا ہے تو فرشتے آپس میں پوچھتے ہیں کہ اپنے مال اور اعمال سے کیا لے کر آیا؟ جو اس نے آگے بھیجا تھا، اور دنیا کے لوگ یہ پوچھتے ہیں کیا چھوڑ کر گیا؟۔ [بیهقی شعب الإیمان بحواله مشکٰوۃ]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن انسان کو اس حالت میں لایا جائے گا کہ گویا وہ بھیڑ کا بچہ ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا، اس سے اللہ تعالیٰ کا سوال ہوگا کہ ہم نے تجھے مال عطا کیا، اور تجھ پر انعام کیا، سو تو نے کیا کیا؟ وہ جواب دے گا: اے ربّ! میں نے اسے جمع کیا، اور خوب بڑھایا، اور جتنا تھا اس سے خوب زیادہ کر کے چھوڑ آیا، مجھے واپس بھیج دیجئے، میں سب لے کر آپ کے پاس آتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ مجھے وہ دکھا جو تو نے پہلے سے یہاں بھیجا تھا؟ پھر وہی عرض کرے گا کہ میں نے جمع کیا، اور اُسے بڑھایا، اور جتنا تھا اس سے زیادہ کر کے چھوڑ آیا، لہٰذا مجھے واپس بھیج دیجئے، میں سب آپ کے پاس لے کر آجاؤں گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ ایسا شخص نکلے گا جس نے کوئی بھی خیر نہیں بھیجی ہوگی، لہٰذا اس کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ [ترمذي بحواله مشکٰوۃ]

فرمایا: ﴿وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴾ ہم نہیں دیکھ رہے ہیں تمہارے ان سفارشیوں کو جن کی نسبت تم دعوے کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں شریک ہیں، البتہ تمہارا آپس کا تعلق منقطع ہو گیا، اور جو تم دعوے کیا کرتے تھے وہ آئے گئے گم ہو گئے۔ قیامت کے روز سارے حقائق کھل جائیں گے، اور سارے جھوٹ نیست و نابود ہو جائیں گے، عابد و معبود ایک دوسرے سے بیزار ہو جائیں گے، اور ان کے مابین دنیاوی تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ

ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِيۡ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوۡمَ لِتَهۡتَدُوۡا بِهَا فِيۡ ظُلُمٰتِ
الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ‌ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ الَّذِيۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ
فَمُسۡتَقَرٌّ وَّمُسۡتَوۡدَعٌ‌ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّفۡقَهُوۡنَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَ الَّذِيۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً‌ ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا‌ ۚ وَ
مِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا
وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ‌ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَيَنۡعِهٖ‌ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿٩٩﴾

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ دانوں اور گٹھلیوں کا پھاڑنے والا ہے، اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور نکالنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، یہ اللہ تعالیٰ ہے پھر تم کہاں اُلٹے چلے جا رہے ہو؟﴿٩٥﴾ وہ پھاڑنے والا ہے صبح کا، اور اس نے بنایا رات کو آرام کی چیز، اور اس نے چاند اور سورج کو ایک خاص حساب سے رکھا ہے، یہ مقرر کرنا ہے اس کا جو غالب ہے علم والا ہے﴿٩٦﴾ اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کو پیدا فرمایا، تاکہ تم ان کے ذریعہ خشکی اور دریا کی اندھیریوں میں ہدایت پاؤ۔ ہم نے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں﴿٩٧﴾ اور وہ ایسا ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا، سو ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے، اور ایک جگہ تھوڑے سے وقت رہنے کی ہے، ہم نے ان لوگوں کے لئے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھتے ہیں﴿٩٨﴾ وہ ایسا ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعہ ہر قسم کی اُگنے والی چیزیں نکالیں، پھر ہم نے نکالا اس سے سبزہ والی چیزوں کو، ہم نکالتے ہیں اس سے دانے، جو ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں، اور کھجور کے درخت، یعنی اس کے گپھوں سے خوشے نکالے جو جھکے ہوئے ہیں، اور انگوروں کے باغ اور زیتون نکالے، اور انار جو آپس میں ملتے جلتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جو ملتے جلتے نہیں ہیں، اس کے پھلوں کی طرف دیکھو، اور اس کے پکنے کی طرف بے شک اس میں نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں﴿٩٩﴾

معارف و منازل

تمام روحانی بیماریوں کی بنیاد اور جڑ غفلت اور جہالت ہے، پوری کائنات خواہ علویات ہوں یا سفلیات۔ اسی طرح زمینی سطح پر بے شمار مخلوقات جو کہ صبح و شام انسانوں کے سامنے جلوہ افروز موجود ہیں، ان مخلوقات کے ذرہ ذرہ

اور وجود اطوار میں قدرتِ الٰہی کے بے شمار مظاہر و علامات جلوہ افروز ہیں، لیکن غافل انسان اپنی جہالت اور لا پرواہی و نادانی کی وجہ سے مظاہر قدرت کے دیکھنے، اور اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کمالات اور توحید الٰہی سے غافل ہے، پس ضروری ہے کہ قدرت اسے بیدار کر کے جھنجوڑ کر اپنی توحید پر آمادہ کرے، اور اپنی قدرت کی عجیب وغریب تخلیقات وکمالات بیان فرمائے، تاکہ یہ راہ گم کردہ انسان اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات کو دیکھ کر یقین کرے کہ ان چیزوں کا پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور کوئی نہیں۔

پھر اگر غور کیا جائے تو آخرت سے بے فکری ہی اُمّ الامراض ہے، کفر وشرک بھی اسی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور سارے گناہ اور معاصی بھی، سو آخرت پر یقین رکھنے والے آدمی سے اگر کبھی کوئی غلطی اور گناہ سرزد بھی ہو جاتا ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، اور وہ بے چین ہو جاتا ہے، اور بالآخر توبہ کر کے آگے کے لئے گناہ سے بچنے کا عزم کرتا ہے، اور خوفِ خدا و خوف آخرت ہرگز اسے بے لگام نہیں ہونے دیتا۔

درحقیقت خوفِ خدا و فکر آخرت ہی وہ سرمایہ گراں مایہ ہے جو انسان کو انسان بناتا، اور جرائم سے پاک رکھتا ہے، اس لئے قرآن کریم کی کوئی سورت بلکہ کوئی رکوع بھی شاید اس سے خالی نہیں کہ جس میں فکرِ آخرت کی طرف متوجہ نہ کیا گیا ہو۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ جُمْلَةَ هُمُوْمِنَا هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ الْاٰخِرَة۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۭ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ہی پھاڑنے والا ہے گٹھلیوں اور دانہ کو۔ اس میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ بتلایا گیا ہے، کہ خشک دانہ اور خشک گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے ہرا بھرا سبز درخت نکال دینا صرف اسی ذات پاک کا فعل ہے، جو خالق کائنات ہے۔ سورۂ واقعہ میں ارشاد ہے:

﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا﴾ [الواقعة: ٦٥] (اچھا یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم زمین میں بوتے ہو، کیا اسے تم اگاتے ہو یا اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر ڈالیں)۔

جب دانہ یا گٹھلی کچھ عرصہ بعد پھٹتی ہے، تو اس کا ایک سرا اوپر کو اٹھتا ہے، جو تناور درخت بنتا ہے، اور دوسرا حصہ نیچے کی طرف زمین کے اندر جاتا ہے، اور وہ جڑ بنتا ہے۔ اب غور کرو کہ یہ نظام کس کے قبضہ قدرت میں ہے؟ انسان کے سعی وعمل کو گٹھلیوں کو پھاڑ کر ہرا سبزہ پیدا کرنے میں کوئی دخل نہیں، کاشتکار کی ساری کوششوں کا حاصل اس سے زائد نہیں ہوتا کہ گٹھلی اور دانہ کے اندر سے جو نازک کونپل جو قدرتِ خداوندی نے نکالی ہے، اس کی راہ سے موانع

اور مضر اشیاء کو دور کردے، زمین کو ہَل وغیرہ کے ذیعہ ہموار اور نرم کرنا، پھر کھاد ڈالنا، پانی دینا، ان سب اعمال کا اثر زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ نکلنے والی نازک کونپل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، باقی اصل کام کہ دانہ اور گٹھلی پھٹ کر اس میں سے درخت کی کونپل نکلے، اور پھر اس میں رنگ برنگ کے عجیب وغریب پتے، اور پھر ایسے پھل پھول لگیں کہ انسان کی عقل ودماغ اس کا ایک پتہ یا ایک پنکھڑی بنانے سے عاجز ہے، اس میں پھر مختلف ذائقہ اور خواص کا پیدا کرنا، یہ سب کچھ ربّ العزّت کی صنعت گری اور کمالِ تخلیق نہیں تو اور کیا ہے؟ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] (بڑی شان ہے اللہ کی، جو سارے کاریگروں سے بڑھ کر کاریگر ہے)۔ پھر فرمایا:

﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ بے جان اشیاء سے جاندار چیزوں کی تخلیق، اور جاندار چیزوں سے بے جان چیزوں کی تخلیق۔ اسی طرح مردوں یعنی کافروں سے زندہ، یعنی مسلمان اولاد کی تخلیق، مسلمان والدین سے کافر اولاد کی تخلیق، یا عالموں کی نسل سے جہال کی، اور جاہلوں کی نسل سے بڑے بڑے علماء کی تخلیق۔ یہ سب ربّ العزّت کی کمالِ تخلیق اور قدرتِ کاملہ کے کرشمے ہیں۔ پھر فرمایا:

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ﴾ یہ سب کام صرف ایک اللہ تعالیٰ کے کئے اور بنائے ہوئے ہیں، یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے بوجھتے ہوئے تم کس طرف بہکے چلے جارہے ہو؟ کہ خودتراشیدہ بتوں کو قبروں، درختوں، مزاروں کو اپنا مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہو، اور ان کا طواف کرتے ہو۔ فرمایا:

﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ﴾ (اللہ تعالیٰ صبح کی روشنی کا پھاڑنے والا ہے)۔ اسی کی مشیّت اور ارادہ سے رات کی تاریکی پھٹ کر چلی جاتی ہے، جس سے صبح کی روشنی پھٹ کر نکلتی ہے، یہ وہ قدرت وتصرف کا کمالِ کرشمہ ہے جس میں جن وبشر اور ساری کائنات کی قوتیں اور تمام تدابیر ہیچ ہیں، اور ہر آنکھوں والا دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ رات کے اندھیرے کے بعد صبح کا اُجالا پیدا کرنے والا نہ کوئی انسان ہوسکتا ہے، نہ فرشتہ، نہ کوئی دوسری مخلوق، بلکہ یہ صرف اُس مافوق الاسباب، مافوق الادراک ہستی کا کام ہے جو سارے جہانوں کی پیدا کرنے والی ہے، جو رات کو دن پر لپیٹ کر، اور دن کو رات پر لپیٹ کر کائنات کا نظام محکم چلارہی ہے۔

﴿وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ اور اس نے رات کو آرام کی چیز بنایا۔

مخلوقات کے آرام کے لئے رات کی قدرتی اور جبری تعیین عظیم نعمت ہے:

لفظ سَكَنًا سکون سے مشتق ہے، ہر ایسی چیز کو سکن کہا جاتا ہے جس پر پہنچ کر انسان کو سکون واطمینان

اور راحت حاصل ہو۔اسی لئے انسان کے رہنے کے گھر کو قرآن حکیم نے سکن فرمایا ہے:﴿جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا﴾[النحل:۸۰] (اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا)۔کیونکہ انسان کا گھر خواہ ایک جھونپڑی ہی ہو، وہاں پہنچ کر انسان کو عادۃً سکون وراحت حاصل ہوتی ہے، تو معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو ہر جاندار کے لئے سکون وراحت کی چیز بنایا ہے۔

فَالِقُ الْإِصْبَاحِ میں ان نعمتوں کا ذکر تھا جو انسان دن کی روشنی سے حاصل کرتا ہے، وہ رات کی تاریکی میں نہیں ہوسکتی، اس کے بعد ﴿وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ جس طرح دن کا اجالا ایک عظیم نعمت ہے کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے سب کاروبار کرتا ہے، اسی طرح رات کی تاریکی کو نقصان دہ نہ جانو، وہ بھی ایک بڑی بیش بہا نعمت ہے، کہ اس میں دن بھر کا تھکا ماندہ انسان آرام کر کے اس قابل ہوجاتا ہے کہ آئندہ کل میں پھر نشاط اور چستی کے ساتھ کام کر سکے، ورنہ انسانی فطرت مسلسل محنت کو برداشت نہیں کرسکتی۔

رات کی تاریکی راحت کے لئے متعین کر دینا ایک مستقل نعمت اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ایک خاص انوکھا مظہر ہے، مگر یہ نعمت روزانہ بن مانگے پورے جہاں کو مل جاتی ہے، اس لئے انسان کا دھیان بھی کبھی نہیں جاتا کہ یہ کتنا بڑا احسان وانعام ہے۔

غور کیجئے کہ اگر ہر شخص اپنے اختیار وارادہ سے اپنے آرام کا وقت مقرر کرتا، تو کوئی صبح آٹھ بجے سونے کا ارادہ کرتا، کوئی بارہ بجے، کوئی چار بجے، تو کوئی رات کے مختلف حصوں میں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی بھی ایسا گھنٹہ نہ آتا جس میں انسانی کاروبار، محنت، مزدوری، کارخانے اور فیکٹریاں نہ چل رہی ہوتیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ سونے والوں کے آرام میں بھی خلل آتا، اور کام کرنے والوں کے کام میں بھی، سونے والوں کے آرام میں کام کرنے والوں کے شور وشغب اور کھڑکے اور دھماکے مخل ہوتے، اور کام کرنے والوں کے کام میں ان لوگوں کی غیر حاضری مخل ہوتی، جو اس وقت سو رہے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ سونے والوں کے بہت سے وہ کام رہ جاتے جو ان کے سونے کے وقت میں ہی ہوسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ کی قدرتِ قاہرہ نے نہ صرف انسان پر، بلکہ ہر جاندار پر رات کے وقت نیند کا غلبہ واشتیاق ایسا مسلط کر دیا کہ وہ ہر طرح کا کام چھوڑ کر سو جانے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے۔شام ہوتے ہی ہر پرندہ، چرندہ، درندہ اور چوپائے اپنے اپنے مستقر اور گھر کا رُخ کرتے ہیں، ہر انسان جبری طور پر کام چھوڑ کر آرام کرنے کی فکر میں لگ

جاتا ہے۔ پوری دنیا میں بازاروں، شہروں، گلی کوچوں، دفتروں، عدالتوں میں ایک خاموشی اور سناٹا چھا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی کو: ﴿وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ﴾ [الانشقاق: ۱۷] (اور رات کی، اور ان تمام چیزوں کی جنہیں وہ سمیٹ لے) سے تعبیر فرما۔ یارات کی تاریکی نینداور آرام میں مددگار ثابت ہوتی ہے، کیونکہ عادۃً زیادہ روشنی میں نیند نہیں آتی۔

غور کیجئے! اگر ساری دنیا کی حکومتیں اور عوام مل کر بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ سونے کا کوئی ایک وقت مقرر کرنا چاہتے تو اولاً اس میں دشواریاں کتنی ہوتیں، ثانیاً اگر سارے انسان کسی معاہدہ کے پابند ہو کر ایک معیَّن وقت میں سویا کرتے تو جانوروں کو اس معاہدہ کا پابند کون بناتا؟ اور وہ کھلے پھرتے تو سونے والے انسانوں اور ان کے سامانوں کا کیا حشر ہوتا؟

یہ اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرتِ قاہرہ ہے جس نے جبری طور پر ہر انسان اور ہر جاندار پر ایک معین وقت میں نیند مسلّط کر کے ان بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت سے بے نیاز کردیا۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] (بڑی شان ہے اللہ کی، جو سارے کاریگروں سے بڑھ کر کاریگر ہے) [معارف القرآن]

شمسی اور قمری حساب:

ارشاد فرمایا: ﴿وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا﴾ حُسْبَان بالضم مصدر ہے، حساب کرنے اور شمار کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب کے طلوع و غروب اور ان کی رفتار کو ایک خاص حساب سے رکھا ہے، جس کے ذریعہ انسان سالوں، مہینوں، ہفتوں، دنوں اور گھنٹوں کا، بلکہ منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب بآسانی لگا سکتا ہے، اور یہ سلسلہ ہر موسم پر منطبق وحاوی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرتِ قاہرہ کا عمل ہے کہ ان عظیم الشان نورانی کُروں اور ان کی حرکات کو ایسے مستحکم اور مضبوط انداز سے رکھا ہے کہ ہزاروں لاکھوں برس گزر جانے پر بھی ان میں کبھی ایک منٹ یا ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا، ان کی مشینری کو نہ کسی ورکشاپ کی ضرورت پڑتی ہے، نہ پُرزے گھسنے اور بدلنے سے کوئی سابقہ پڑتا ہے، یہ دونوں نور کے کُرے اپنے اپنے دائرہ میں ایک معیَّن رفتار کے ساتھ چل رہے ہیں۔ سورۂ یٰسں میں ارشاد ہے: ﴿لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ﴾ [یٰس: ۴۰] (نہ تو سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے) ہزاروں سالوں میں بھی ان کی رفتار میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آتا۔

مگر نا عاقبت اندیش اور مظاہرِ قدرت کے دیکھنے اور صبح وشام مشاہدہ کرنے والے اندھے انسانوں کی عقل و سوچ پر افسوس ہے کہ قدرت کا یہ محکم اور بے حد مستحکم نظام انسان کے دھوکہ اور فریب کا سبب بن گیا، وہ اس کو مستقل بالذات سمجھ بیٹھا، اور یہ کہا کہ یہ سارا نظام کو خود بخود چل رہا ہے، نہ یہ کسی کی تخلیق ہے، نہ کوئی اس حیران کن نظام کا چلانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اسی بے سرو پا عقیدہ اور مغالطہ کو دور کرنے کے لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سلسلہ جاری فرمایا، تا کہ وہ لوگوں کو سمجھائیں کہ اس سارے نظام کے پیچھے قدرت کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ ؎

ہیچ چیزے خود بخود چیزے نشد ☆ ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد

[مثنوی]

﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ یہ حیرت انگیز مستحکم نظام کائنات اور شمس وقمر کی رفتار اربوں میلوں پر مشتمل سُرعت کے ساتھ رواں دواں رہنا جہاں ہزاروں سالوں کی حرکات میں کبھی ایک منٹ اور سیکنڈ کا فرق بھی نہ آئے، یہ اسی ذات پاک کی قدرت کا کرشمہ اور شاہکار ہوسکتا ہے جو عزیز ہے، قوی وطاقتور اور غالب ہے، اور علیم بھی ہے کہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ یہ چھوٹے بڑے رنگین ستارے فانوس کی طرح لٹکے ہوئے جو آسمانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں، جن کی ہزاروں حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنے بحری اور خشکی کے سفروں میں جہاں رات کی تاریکی کے وقت سمتوں کا پتہ لگانا دشوار ہوتا ہے، یہ ستارے انہیں اطراف وجوانب اور سمتوں کی راہنمائی کے لئے بڑے کارآمد ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ آج اس مشینری کے زمانہ میں بھی انسان ستاروں کی ہدایت سے بے نیاز نہیں ہے۔

اس آیت میں بھی انسان، خاص کر صابی لوگ جو ستاروں کی پرستش کرتے ہیں جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم جن کا ابھی بیان ہوا، کی تردید ہے، اور ان کو تنبیہ ہے کہ یہ ستارے بھی کسی بنانے والے اور چلانے والے کے تابعِ فرمان چل رہے ہیں، یہ نہ اپنے وجود میں مستقل ہیں، نہ اپنی بقاء وعمل میں، جو لوگ صرف انہی پر اپنی نظریں جما کر بیٹھے ہوئے، اور امورِ کائنات میں ان کو متصرف ومؤثر مانتے ہیں، وہ ناداں اور کوتاہ نظر ناقص العقل فریب خوردہ ہیں ؎

آناں کہ بجز روئے تو جائے نگرانند ☆ کوتاہ نظرانند چہ کوتاہ نظرانند

پھر فرمایا: ﴿قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ اکیلا یگانہ اور ایک ہے، نہ کوئی دوسرا ایسی صفات رکھتا ہے، نہ ایسے اختیارات رکھتا ہے، اور نہ کسی کے ایسے حقوق ہیں، اس کی نشانیاں بیان کی جارہی ہیں، مگر کور مغزوں کے لئے نہیں، بلکہ جو لوگ سمجھ بوجھ سے نوازے گئے وہی ان نشانیوں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں، اور کور مغز والے اندھے ہی رہیں گے۔

﴿وَهُوَ الَّذِيۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسۡتَقَرٌّ وَّمُسۡتَوۡدَعٌ﴾ مستقر قرار سے بنا ہے، مستقر اس جگہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کیلئے جائے قرار ہو، اور مستودع ودیعت سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں: کسی چیز کو کسی کے پاس عارضی طور پر چند روز رکھ دینے کے۔ عرب لوگ چیزوں کے گودام کو مستودع اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات پاک ہے جس نے انسان کو ایک جان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا، پھر اس کیلئے ایک مستقر یعنی مدّت تک رہنے کی جگہ بنادی، اور ایک مستودع یعنی چند روز رہنے کی جگہ مقرر فرمائی، جو عارضی ہو۔ قرآن کریم نے ان دونوں الفاظ کو اجمالاً ذکر فرمایا، ان کی تعبیر وتفسیر میں بہت سے اقوال ہیں، اور قدرے مختلف بھی ہیں۔ کسی نے فرمایا: مستودع ماں کا پیٹ اور مستقر یہ دنیا ہے۔ کسی نے فرمایا: مستودع ماں کا رحم ہے، اور مستقر باپ کی پشت ہے۔ کسی نے مستقر ماں کا پیٹ بتایا، اور مستودع باپ کی پشت ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

رحم مادر کو مستقر کہنا تو اس اعتبار سے سمجھ میں آتا ہے کہ رحم میں نطفہ داخل ہونے کے بعد وہاں ٹھہر جاتا ہے، اور مختلف ادوار سے گزر کر انسانی صورت میں باہر آجاتا ہے۔ لیکن باپ کی پشت کو جو مستودع فرمایا، یعنی ودیعت رکھنے کی جگہ، اس کے بارے میں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوم میثاق میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ساری ذُریت کو نکالا تھا، پھر عہد ﴿اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ﴾ [الأعراف: ١٧٢] (کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟) کے بعد ان کو واپس کردیا تھا، تو گویا ان کا پشت آدم علیہ السلام میں واپس کرنا ایک طرح ودیعت رکھنا ہوا، پھر اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس ودیعت کو واپس نکال لے گا۔ [روح المعاني]

کسی نے کہا کہ مستودع قبر ہے، اور مستقر دارِ آخرت ہے۔ کسی نے کہا کہ مستقر سے مراد ہے زمین پر رہنا، اور مستودع سے مراد قبر ہے۔ بہر حال! الفاظِ قرآنی میں ان تمام معانی کی گنجائش ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس کو ترجیح دی کہ مستقر دارُ الآخرت کا مقامِ جنت یا دوزخ ہے، اور انسان کی ابتداء آفرینش سے آخرت تک جتنے مراحل اور درجات ہیں وہ سب مستودع یعنی چند روزہ قیام کی جگہ ہیں، جو کہ سب عارضی ہیں، خواہ شکمِ مادر ہو یا زمین پر رہنے سہنے کی جگہ، یا قبر و برزخ۔ قرآن کریم کی ایک آیت سے بھی اس کی ترجیح معلوم ہوتی ہے، جس میں فرمایا: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ [الانشقاق: ۱۹] یعنی تم ایک درجہ سے دوسرے درجہ کی طرف ہمیشہ چڑھتے رہو گے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ دارُ الآخرت سے پہلے پہلے انسان اپنی پوری زندگی میں ایک مسافر کی حیثیت رکھتا ہے، جو ظاہری سکون و قرار کے وقت بھی درحقیقت سفرِ عمر کے منازل طے کر رہا ہے۔ اس شعر میں اس کی تشریح ہے:

مسافر ہوں کہاں جانا ہے ناواقف ہوں منزل سے ☆ ازل سے پھرتے پھرتے گور تک پہنچا ہوں مشکل سے

اس آیت کریمہ میں ظاہری ٹیپ ٹاپ، اور مخلوقات کی نیرنگیوں میں مشغول ہو کر اپنے اصلی مستقر دارِ آخرت سے اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے غافل رہنے والوں کے لئے نصیحت ہے کہ چند روزہ زندگی کو عارضی سمجھو، اپنی آخری منزل کو یاد رکھو، غفلت و غرور چھوڑ کر اپنی آخرت کو آباد و شاداب رکھو۔ پھر فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس ایک پانی سے ہر قسم کے رنگ برنگ سبزوں اور نباتات کو زمین سے نکالا، ایک ہی پانی، ایک ہی مٹی سے اتنی مختلف قسم کی نباتات جن کے رنگ، بو، ذائقہ، خواص، طبائع اور فوائد بے حد مختلف ہیں، یہ ہماری قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے، جسے تم دیکھ کر اپنے ربّ سے اور دارُ الآخرت سے غافل رہتے ہو، تم کتنے ناشکر و احسان فراموش ہو؟

﴿فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا﴾ پھر ہم نے اس کونپل سے جو پہلے زمین سے نکلتی ہے جسے کھونٹی اور سوئی کہتے ہیں، اور نہایت نازک زرد ہوتی ہے، سبز شاخ نکالی، پھر اس سے دانے نکالتے ہیں، جو ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہوتے ہیں، گندم، جوار، مکئی کے غنچوں کے دانے اس کی واضح مثال ہیں۔

﴿وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ﴾ اور کھجور کے درختوں سے بھی، یعنی اس کے گچھوں سے خوشے نکالے، جو قریب قریب اور وزن دار جھکے ہوئے ہوتے ہیں، کبھی انہیں دیکھو تو محوِ حیرت ہو جاؤ۔

﴿وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ﴾ اور ہم نے انگوروں کے طرح طرح رنگ اور مختلف سائز، مختلف ذائقہ والے

باغ نکالے۔

﴿وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ﴾ اور زیتون وانار کے درخت، پھر درختوں سے پھل نکالے، جو آپس میں دیکھنے میں شکل وصورت مقدار، رنگ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں، اور بعض ان میں سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے، یہ سب چیزیں تمہارے ہوش وحواس اور مشاہدہ میں ہر وقت موجود ہیں۔طَلْعٌ درختِ خرما کا پہلا گچھا خوشہ جو نکلتا ہے وہ طَلْعٌ کہلاتا ہے، واحد طلعة ہے۔قِنْوَانٌ تثنیہ اور جمع دونوں کے لئے ہے، واحد قِنْوٌ ہے، بمعنی خوشہ، گھابا، گُھچا کے ہیں۔

﴿اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ﴾ تم ان میں سے ہر ایک پھل کو دیکھو، ابتداء میں بدمزہ، بے رنگ، بے ذائقہ، ناقابلِ استعمال ہیں، پھر آہستہ آہستہ ہواؤں اور سورج، چاند، ستاروں کی روشنی اور حرارت کے ذریعہ پک جاتا ہے، رنگ، ذائقہ، لذت، شیرینی، ترشی ودیگر صفات کے ساتھ کامل ومکمل ہوجاتا ہے۔یہ نظارہ کرکے دیکھو کہ وہ کونسا مخفی پوشیدہ ہاتھ ہے جو یہ سب کچھ انجام دیتا اور بناتا ہے؟ اور یہ سب کچھ: ﴿يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ﴾ [الرعد:۴] (ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، اور ہم ان میں سے کسی کو ذائقے میں دوسرے پر فوقیت دے دیتے ہیں)۔

﴿اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ ان تمام امور میں دلائلِ توحید موجزن وجلوہ افروز ہیں، گویا باعتبار تبلیغ وانتفاع مومن اور کافر سب کے لئے ہیں، لیکن ایمانی فوائد اور ایمانی انتفاع صرف مومن ہی حاصل کرتے ہیں، اور بس۔

خلاصہ:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اثباتِ توحید کے ضمن میں اپنی قدرتِ کاملہ اور اپنی مخصوص صفات وکمالات اور ماکولات وانعامات کا بیان فرمایا ہے، جو اس کی ذات عالی صفات کے ساتھ مخصوص ہیں۔مثلاً پہلے درختوں کا ذکر فرمایا، جن میں دلائلِ توحید ہیں، اور بندوں پر انعام بھی، آسمان سے پانی کا نازل فرمانا، پھر اس کے ذریعہ بیل والے اور تنے والے پودے نکالنا، اور انہیں بڑھانا، اور بالوں میں دانوں کا ایک دوسرے پر چڑھا ہوا ہونا، ایک ایک خوشہ میں سینکڑوں دانوں کا نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ترتیب دینا، اور کھجوروں کے خوشے جو قابلِ دید ہیں، ان میں وزن اور بوجھ کی وجہ سے جو جھکاؤ ہے نہایت حیران کن ہے، پھر انگور، زیتوں اور انار کے درختوں اور پھلوں کا بیان،

پھر کچے پھلوں کا پک جانا، اور مختلف مقدار، رنگ اور ذائقہ کے ساتھ تیار ہونا، یہ سب دلائلِ توحید ہی ہیں۔

یہ وسیع وعریض دسترخوان ہے، جس پر لاکھوں پھلوں کھانوں ماکولات اور مشروبات نہایت عجیب ترتیب و سلیقہ سے چنے ہوئے ہیں، دوست ودشمن سب کے لئے یکساں استعمال کے مواقع ہیں، کھانے والے بے شمار، مگر شکر گزار لاکھوں میں ایک، بہت بابرکت ہے وہ ذات جو سب کو پالنے والی ہے۔

....

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ
شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ
هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۰۳

ترجمہ: اور ان لوگوں نے جنات کو اللہ تعالیٰ کے شریک بنا رکھے ہیں، حالانکہ اس نے ان کو پیدا فرمایا ہے، اور اس کے لئے انہوں نے بیٹے اور بیٹیاں بغیر علم کے تراش رکھے ہیں، وہ ان باتوں سے پاک ہے، اور برتر ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں ۝۱۰۰ وہ آسمانوں کا اور زمین کا بے مثال پیدا فرمانے والا ہے، کہاں ہوسکتی ہے اس کی اولاد؟ حالانکہ اس کی بیوی نہیں ہے، اور اس نے پیدا فرمایا ہر چیز کو، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۝۱۰۱ یہ اللہ تعالیٰ تمہارا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا پیدا فرمانے والا ہے، لہٰذا تم سب اسی کی عبادت کرو، اور وہ ہر چیز کا نگہبان ہے ۝۱۰۲ نگاہیں اسے احاطہ نہیں کرسکتیں، اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہے، اور وہ بڑا باریک بین، خبردار ہے ۝۱۰۳

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ شانہ نے توحید اور اُلوہیت اور کمالِ قدرت کی پانچ دلیلیں ذکر فرمائیں، اب آئندہ آیات میں ان لوگوں کی تردید اور تہدید فرماتے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوقات میں سے شریک اور سہیم ٹھہرائے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے شریک ٹھہرانے والے تین گروہ ہیں:

ایک گروہ بت پرست مشرکوں کا ہے، جن کا شروع سورت سے مسلسل رد چلا آرہا ہے۔ دوسرا گروہ کواکب

پرستوں کا ہے جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں رد ہو چکا ہے۔ اور مشرکین کا تیسرا گروہ مجوس کا ہے، جو عالم کے لئے دو خدا کے قائل ہیں، ایک خالق خیر جسے یزدان کہتے ہیں، دوسرا خالقِ شر جسے اَہرمن کہتے ہیں۔ اب اس پہلی آیت میں:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ﴾ میں مشرکین کے تیسرے گروہ یعنی مجوس کا رد ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ آیت مجوس کے رد میں نازل ہوئی۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دراصل یہ آیت مجوس کے بارے میں ہے، اور مقصود ان بے عقلوں پر تشنیع کرنا ہے جو اس عالم کے لئے دو خدا مانتے ہیں۔ [کبیر]

اور بعض علماء تفسیر یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت مشرکینِ عرب کے رد میں ہے، چونکہ کفر اور شرک کا ارتکاب اغواء شیاطین سے ہوتا ہے، اس لئے ان کے اغواء اور اِضلال سے غیر اللہ کی عبادت کرنا گویا کہ شیاطین ہی کی عبادت کرنا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کا رد کرتے ہوئے فرمایا: ﴿يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا﴾ [مریم:۴۴] (اے ابا جان! شیطان کی عبادت نہ کرنا، بیشک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے)۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾ [یٰس:۶۰] (کیا میں نے تمہیں یہ تاکید نہیں کردی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا)۔ اسی طرح ﴿اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا﴾۔ [النساء:۱۱۷] (اللہ کو چھوڑ کر جن سے یہ دعائیں مانگ رہے ہیں وہ صرف چند زنانیاں ہیں، اور جس کو یہ پکار رہے ہیں وہ اس سرکش شیطان کے سوا کوئی نہیں)۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں راجح قول یہی ہے کہ یہ آیت مجوس کے بارے میں نازل ہوئی۔ حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے موضح القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا۔

بہر حال! جو بھی شان نزول ہو مطلب ایک ہی ہے کہ آیت میں شرک کی تردید ہے، شرک مجوس کا ہو یا مشرکینِ عرب کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں مذموم اور حرام ہیں۔

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ کہ مشرکین نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک اور سہیم ٹھہرالیا ہے، حالانکہ خود ان لوگوں کے اقرار کے موافق بھی اللہ تعالیٰ ہی نے ان جنات اور ان شریک ٹھہرانے والوں کو پیدا کیا ہے، یہ سب اس کی مخلوق ہیں، جیسا کہ خود وہ بھی یہی اقرار کرتے ہیں کہ جنات اور

شیاطین سب ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، پس کس قدر ظلم و بے انصافی ہے کہ مخلوق کو خالق کا شریک ٹھہرایا جائے؟

حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجوسیوں نے کہا تھا کہ شیطان اللہ تعالیٰ کا شریک ہے، نیکی کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے، اور اس کو یزدان کہتے تھے، اور بدی کو شیطان پیدا کرتا ہے، اور اس کو اہرمن کہتے تھے۔ [موضح القرآن]

﴿وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ ان لوگوں نے گھڑ لئے اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں۔ نصاریٰ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا، اور یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتا دیا، اور مشرکین مکہ نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بتا دیا، اور یہ سب جہالت کے سبب انہوں نے تجویز کیا۔

حیرانی ہے کہ جب واضح نور روشنی اور قرآنی ہدایات ان کے سامنے آچکی تو انہوں نے اسے رد کیا، اور اپنی گمراہی پر ڈٹے رہے، اور انہوں نے یہ نہ جانا کہ ہم جس ذات کی طرف اولاد منسوب کر رہے ہیں اس کے لئے اولاد کا ہونا عیب اور نقص ہے، اور اس کی شان اس سے بہت بلند اور برتر و ارفع ہے کہ اس کی اولاد ہو، اسی کو فرمایا:

﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ (اللہ تعالیٰ اس چیز سے پاک ہے، اور نہایت بلند و بالا ہے، جو یہ لوگ اس کے بارے میں بیان کرتے ہیں) سورۂ جن میں ارشاد ہے: ﴿مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾ [الجن: ۳] (اللہ نے نہ اپنے لئے بیوی اختیار کی، اور نہ بیٹا) اولاد کا ہونا اللہ تعالیٰ کے لئے عیب ہے، اور یہ مخلوق کی صفت ہے، اور بڑی نادانی اور افسوس کی بات یہ ہے: ﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا﴾ [الاسراء: ۴۰] (کیا تمہارے ربّ نے تمہیں تو بیٹے دینے کے لئے چن لیا ہے، اور خود اپنے لئے فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا ہے؟)۔ تم اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہو، اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں، یعنی جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے ہو خدا کے لئے وہی تجویز کرتے ہو۔ ﴿اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا﴾ [الاسراء: ۴۰] تم اپنی چھوٹی زبانوں سے بہت بڑی بات کہتے ہو۔

سورۂ مریم میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝﴾ [مریم] یعنی انہوں نے بہت بری بات کہی جو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائے، اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ ہاں! قیامت کے دن کہنے والوں کی سزا اس سے کہیں زیادہ وزنی اور سخت ہوگی، اللہ تعالیٰ کی شان میں اتنی بڑی گستاخی کا

انجام نہایت خطرناک ہوگا، اور اس کے قہر وغضب کو دعوت دینے کے ساتھ یہ بات گستاخی کے مترادف ہوگی، وہ ذات پاک ہر عیب سے منزہ وبری ہے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب ☆ ہنوز نام تو گفتن ہزار بے ادبیست

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ وہ آسمانوں اور زمینوں کا ایجاد کرنے والا ہے۔ بَدِيْع کا معنی عدم سے وجود میں لانے والا۔ بَدِيْع کا ہم معنی لفظ فاطر بھی ہے، مختلف مقامات پر ارشاد ہے: ﴿فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [الأنعام: ١٤] (آسمانوں اور زمین کا بنانے والا)۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو کتم عدم سے پھاڑ کر نکالنے کے ہیں۔ اِبداع ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بغیر نمونے مادہ اور آلے کے وجود میں آئے۔ یہ لفظ بدیع اور فاطر حق تعالیٰ شانہ کی صفاتِ ذاتیہ مخصوصہ میں سے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بے نظیر گرانقدر تالیف حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل میں فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کی چار صفات بالترتیب کام کرتی ہیں: سب سے پہلے اِبداع، اس کے بعد خلق، اس کے بعد تدبیر، اور آخرت میں تدلی کی صفت۔ اس کی تفصیل آپ نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

صفتِ اِبداع:

جیسا کہ پہلے عرض کیا اِبداع سے مراد ایسی چیز ہے جو بغیر سابقہ نمونے، مادہ، اور آلہ واسباب کے وجود میں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس صفت کے ساتھ کائنات کو مجموعی طور پر کتمِ عدم سے نکالا ہے، اس کو شخص اُکبر بھی کہا گیا ہے۔ مجموعہ کائنات کی ایجاد ایمان بالغیب سے تعلق رکھتی ہے، اور تمام انسان اس کی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مبدِع (یعنی موجد) اور مبدَع (یعنی ایجاد کردہ) کے درمیان عالمِ شہادت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے نظیر کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ یعنی موجد اور ایجاد کردہ کے درمیان ایسی نسبت پائی جاتی ہے کہ اس کی کوئی مثال کائنات میں موجود نہیں، لہٰذا یہ نہایت ہی پوشیدہ اور غامض چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے کائنات کو کس طرح ایجاد کیا؟ یہ انسان کی عقل وفکر سے باہر ہے۔ البتہ یہ ہوا ضرور ہے، اور اس کی موجودگی ہی اس کا ثبوت ہے۔ مجموعی کائنات اللہ تعالیٰ کی تجلیات اور صفات کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی ہے، کیونکہ اس کے وجود سے پہلے نہ کوئی نمونہ تھا، نہ مادہ اور نہ ایجاد کرنے کا کوئی آلہ۔

صفتِ خلق:

جب کائنات بحیثیتِ مجموعی وجود میں آ گئی تو پھر اللہ تعالیٰ شانہ کی صفتِ خَلق کارفرما ہوئی، یعنی اِبداع کے بعد دوسرے نمبر پر صفتِ خَلق نے کام کیا۔ اگر پہلے مادہ موجود ہو تو اس سے کسی چیز کو بنانا خلق کہلاتا ہے، جب مجموعی کائنات بشمولِ زمین اور اس کی مٹی ایجاد ہوگئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی، جیسے فرمایا: ﴿خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ﴾ [آل عمران: ۵۹] (اسے مٹی سے پیدا فرمایا)۔

اِبداع اور خلق میں یہی فرق ہے۔ اِبداع کے ذریعہ مٹی کو بغیر کسی مادہ کے ایجاد فرمایا، اور پھر اس مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام سطحِ زمین سے مٹی لے کر حضرت آدم علیہ السلام کا مجسمہ بنایا، اس کے سارے اعضاء بنائے، اور پھر اس میں روح ڈالی تو انسان زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس ایک نفس سے سلسلۂ تناسل کے ذریعے نسل انسانی کو آگے بڑھایا۔

آدم علیہ السلام کی طرح جنات کی تخلیق کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَخَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ﴾ [الرحمن: ۱۵] (اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا فرمایا)۔ یہاں بھی آگ کا مادہ موجود ہے جس سے جنات کو خلق کیا۔ امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیاطین وغیرہ کے اجسام مختلف عناصر کے گندے اور تعفن زدہ مادے سے اٹھنے والے بخارات سے پیدا کئے جاتے ہیں، پھر ان میں غلیظ قسم کی روحیں ڈالی جاتی ہیں، جن کا مبنیٰ فساد ہوتا ہے۔ بہر حال "خلق" اللہ تعالیٰ شانہ کی وہ صفت ہے جس کے ذریعہ سے وہ پہلے سے موجود مادہ سے کوئی نئی چیز پیدا کرتا ہے۔

صفتِ تدبیر:

جب کوئی چیز تیار ہو جاتی ہے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ شانہ کی صفتِ تدبیر کام کرتی ہے۔ پیدائش کے بعد انسان، حیوان، پرندوں، درندوں کا بتدریج جوانی کی عمر تک پہنچنا، اور پھر بڑھاپے میں اس کے اعضا کا کمزور ہو جانا، حتیٰ کہ بتدریج موت کی آغوش میں چلے جانا اللہ تعالیٰ شانہ کی صفتِ تدبیر کا کام ہے۔ اسی طرح نباتات اور درختوں کی پیدائش کے بعد انہیں بڑھانا ان میں پھل پیدا کرنا، اور ان میں رنگ و ذائقہ پیدا کرنا، اور پھر اپنی مقررہ مدت پوری کر کے ختم ہو جانا، یہ سب اسی صفتِ تدبیر کا کام ہے۔

کائنات میں موجود چاند، سورج اور دیگر سیاروں کو ایک منظم و مربوط نظام کے تحت چلانا، دن اور رات کا آگے پیچھے ہونا، اور کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے ہونا، بادلوں کا آنا جانا، بارش کا نزول، سورج کا ہمیشہ یکساں رہنا، چاند کا

بڑھتے اور گھٹتے رہنا، سردی گرمی کا آنا جانا، ہواؤں کا چلنا اور رکنا، اشیاء خوردونوش کی پیداوار کی کمی زیادتی، مہنگائی گرانی وغیرہ ہر ہر کام کی تدبیر اللہ تعالیٰ شانہ کی صفتِ تدبیر ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اس پاک ذات کا اپنا ارشاد ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ﴾ [السجدۃ: ۵] (آسمان سے لے کر زمین تک معاملہ کی تدبیر کرتا ہے) اسی واحد لاشریک ہی کی ذات ہے جو آسمان سے لے کر زمین تک کے تمام معاملات کی تدبیر کرتی ہے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عرشِ الٰہی کے نیچے "حظیرۃ القدس" میں تمام کے تمام انسانیت کا ایک مجسم نمونہ پایا جاتا ہے، اس کو امامِ نوع انسانی، یا روحِ اعظم کہتے ہیں، اسی نمونے پر دنیا میں ہر انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ جب چوتھے چلّے میں داخل ہوتا ہے تو روح اس میں ڈالی جاتی ہے، وہ "روحِ اعظم" کا عکس ہوتا ہے، اور اس عکس میں اللہ تعالیٰ شانہ کی اس تجلی کا عکس بھی ہوتا ہے جو عرش پر پڑتی ہے، اور پھر اس کا اثر حظیرۃ القدس کی معرفت "روح اعظم" میں بھی ہوتا ہے، اور یہی اثر پھر ہر انسان کی روح میں بھی آتا ہے۔ مقصد یہ کہ ہر نومولود کی روح میں اللہ تعالیٰ شانہ کی تجلی اعظم کا عکس ضرور پایا جاتا ہے، جسے تدلی کا نام دیا گیا ہے۔

صفتِ تدلی:

تجلی اعظم کے عکس کے اثر کی وجہ سے ہر انسانی روح کی کشش اوپر اللہ کی طرف ہوتی ہے، اس دنیا کے مادی دھندوں میں پھنس کر انسانی روح کی حالت ایسے نیم بے ہوش شخص کی سی ہو جاتی ہے جسے مثلاً کلوروفارم سونگھا دیا گیا ہو، جس دن اس کلوروفارم کا اثر زائل ہو جائے گا تو آدمی کو ہوش آجائے گا، اور تجلی اعظم کا عکس انسان کو اوپر کی طرف کھینچے گا، پھر اگر اس نے اس دنیا میں رہ کر ایمان حاصل نہیں کیا تو اس کا اوپر جانا نہایت دشوار ہو جائے گا، اور وہ اوپر کی بجائے نیچے کی طرف جائے گا، جس کی وجہ سے اسے سخت تکلیف ہوگی۔

البتہ جس نے حظیرۃ القدس میں موجود نمونہ کے مطابق زندگی بسر کی ہوگی اسے تجلی اعظم کی کشش آسانی سے اوپر عالمِ بالا میں لے جائے گی۔

بہر حال! حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ شانہ کی چوتھی صفتِ تدلی ہے جس کا تعلق انسان کی روح کے ساتھ ہوتا ہے، اس بارے میں ملاحظہ ہو سورۂ نجم کی آیت: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى ۝۹﴾ [النجم] (پھر وہ قریب آیا، اور جھک پڑا۔ یہاں تک کہ وہ دو کمانوں کے فاصلے کے

برابرآ گیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک)۔یہ سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تدلی اعظم اور قربِ اعظم ہی کی اطلاع ہے۔والعلم عند اللہ اللطیف الخبیر

فائدہ:

سورج کی تجلی ایک عظیم تجلی ہے، جو پورے عالم، دریا، خشکی، صحرا، میدان، شہر، آبادی، انسان، جنات، حیوانات، حشرات الارض، چرند، پرند، ساری مخلوقات کے لئے ہے، اور یہ مادی تجلی تمام عالم کے لئے پیغامِ حیات اور سرمایۂ زندگی ہے۔مگر اندھے نابینا لوگ اس سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔اسی طرح ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کی روحانی تجلی اعظم تمام مخلوقات کے لئے ہے، اور سب کے لئے پیغامِ حیات بھی ہے، لیکن دل ودماغ اور قلب کے اندھے (سارے غیر مسلم) اس بابرکت تجلی اعظم سے جس کا عکس قرآن حکیم ہے مستفید نہیں ہوسکتے، پس ان کی ارواح کو بعداز موت اوپر عالمِ بالا کی طرف اجازت نہیں ہوگی، اور ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے، انہیں نیچے جہنم کے مقامِ سجین میں پہنچایا جائے گا۔

جبکہ مؤمنین کی ارواح کا مستقر جنتوں کے اوپر مقامِ علیین میں ہوگا، اور وہاں سے جنت میں داخل ہوں گی۔ یاد رہے کہ اس تجلی اعظم کا تعلق روح، قلب اور دماغ تینوں کے ساتھ برابر جاری رہتا ہے۔ ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکھف: ۲۹] (جس کی مرضی ایمان لائے، اور جس کی مرضی کفر اختیار کرے)۔

یہ ہے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے بیان کا خلاصہ۔ واللہ اعلم

"وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ اللهَ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِيْ ظُلْمَةٍ فَاَلْقٰى عَلَيْهِمْ مِنْ نُوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَهٗ مِنْ ذَالِكَ النُّوْرِ اهْتَدٰى وَمَنْ اَخْطَأَهٗ ضَلَّ فَلِذٰلِكَ اَقُوْلُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللهِ"۔ [رواه أحمد والترمذي]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق (جن وانس) کو اندھیرے میں پیدا فرمایا، پھران پر اپنے نور کا پرتو ڈال دیا، پس جس کو اس نُور کی روشنی میسر آگئی وہ راہِ راست پر لگ گیا، اور جو اس کی مقدس شعاعوں سے محروم رہا وہ گمراہی میں پڑا رہا، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ تقدیرِ الٰہی پر قلم خشک ہوچکا ہے (کہ اب تقدیر میں تغیر وتبدل ممکن نہیں)۔

﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ﴾ اس کے لئے اولاد کیسے ہوسکتی ہے؟ حالانکہ اس کی کوئی بیوی

نہیں، اور اولاد کے لئے بیوی کا ہونا ضروری ہے۔ اور نصاریٰ اگر چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ شانہ کا بیٹا بناتے ہیں لیکن یہ جرأت اور جسارت وہ بھی نہ کر سکے کہ معاذ اللہ حضرت مریم علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ شانہ کی بیوی قرار دے سکیں۔

اور اللہ تعالیٰ شانہ کے لئے بیٹے اور بیوی کا ہونا اس لئے محال ہے کہ وہ مخلوقات کی صفات سے منزہ اور پاک ہے۔ دوئم یہ کہ بیٹا باپ کے اور بیوی شوہر کے ہم جنس ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ شانہ کا ہم جنس کوئی نہیں، وہ ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [الإخلاص: ۴] (نہ اس نے جنا ہے، اور نہ اس کو جنا گیا ہے، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں) جیسی صفات کے ساتھ موصوف ہے، اور بیٹے، بیوی اور ہمسر ہر قسم کی احتیاج سے پاک ہے۔

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ شانہ ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اسی طرح وہ ہر شئی کا جاننے والا ہے، جب وہ تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے تو سب کا خالق و مالک ہے، اُسے کسی بیٹے کی کیا ضرورت؟ اور پھر مخلوقات سب اس کے محتاج ہو کر کیسے اس کے ساتھ برابر معبود بن سکتی ہیں؟

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ﴾ تمہاری فہم و عقل اور ناقص فکر نے اللہ تعالیٰ کے متعلق جو غلط فیصلہ کیا وہ درست نہیں، کہ تم نے خالق اور مخلوق کے درمیان رشتہ وِلادت قائم کیا، بلکہ حقیقت اور صحیح بات یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا، یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارا ربّ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا پیدا فرمانے والا ہے، لہٰذا تم اس کی عبادت کرو، ان صفاتِ جلیلہ سے جو ذات متصف ہو وہی لائقِ عبادت ہے، مخلوق میں نہ شانِ ربوبیت ہے، نہ شانِ خالقیت، نہ استقلالِ ذاتی، پھر وہ کیسے شریک اُلوہیت ہو سکتے ہیں؟

﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ﴾ اور وہ ہر چیز کا نگہبان ہے، اسے تدبیر و تصرف کا تمام مخلوقات پر پورا پورا اختیار ہے، جب وہ خالق بھی ہے، مالک و مدبر اور متصرف و کارساز بھی ہے، اور ساری خلقت کا محافظ و نگہبان بھی ہے، تو ہر قسم کی جانی اور مالی عبادت کا مستحق و سزاوار بھی وہی ہے۔

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾ معبود برحق جلّ جلالہ کی علو شان کا یہ حال ہے کہ نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں، اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے، یعنی سب نگاہیں اس کے اِدراک اور احاطہ سے درماندہ اور عاجز ہیں، آنکھوں میں یہ طاقت کہاں، اور حواس ظاہری اور باطنی میں یہ قوت کہاں کہ وہ اسے دیکھ سکیں، اور پا سکیں، اور ادراک کر سکیں؟ اور وہ سب آنکھوں، ارادوں، نیتوں پر احاطہ کیا ہوا ہے، اور تمام کائنات

پر اس کا علم احاطہ کیا ہوا ہے، وہ نہایت لطیف باریک بین اور خبردار ہے۔ انسان کیا، اسے مقرب درگاہ فرشتے بھی آج تک نہ دیکھ سکے، اور اس کی ذات کا اِدراک نہ کر سکے۔

جلیل القدر عظیم پیغمبر موسیٰ علیہ السلام شرفِ مکالمہ سے نوازے گئے، مگر رؤیت و زیارت تک نوبت نہیں آئی، کہنے لگے: ﴿رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ﴾ [الأعراف: ۱۴۳] (اے میرے ربّ! مجھے دکھائیں تاکہ میں آپ کو دیکھ سکوں) جواب آیا: ﴿لَنۡ تَرٰىنِیۡ﴾ [الأعراف: ۱۴۳] (تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکو گے)۔

وہ ان چیزوں کا بھی اِدراک کرتا ہے جن کے اِدراک سے تمام نگاہیں قاصر ہیں۔

باریک بین سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء کے اندرونی حالات اور کیفیات سے بخوبی واقف ہے، کوئی چیز خواہ کیسی ہی باریک اور دقیق کیوں نہ ہو وہ اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس بیان سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ لَطِیۡف کا تعلق ﴿لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ﴾ سے ہے، اور خَبِیۡر کا تعلق ﴿وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ﴾ سے ہے۔

بلا تشبیہ اور بلا تمثیل کے ایسا سمجھو جیسے روح ہے، کہ نگاہیں اس کے اِدراک سے بالکل قاصر ہیں، وہ کبھی نظر نہیں آتی، اور خود روح نگاہوں کا اور تمام تر چیزوں کا اِدراک کر سکتی ہے۔ اس وجہ سے افعالِ انسانی کو روح کی طرف نسبت کیا جاتا ہے، کسی اور چیز کی طرف نسبت نہیں کی جاتی، اس سے کافروں کے اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے پوشیدہ کیوں ہے؟ اور وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟

جواب اس طرح ہو گیا کہ وہ معبودِ برحق لطیف وخبیر ہے، کمال لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتا، جیسے روح کمالِ لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی، اسی طرح وہ لطیف وخبیر بھی نظر نہیں آتا، اور اس عالم اجسام میں "ہوا" بھی ایک جسم لطیف ہے، اپنی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔

خلاصۂ کلام یہ کہ معبودِ برحق وہ ہے کہ جو علیم وقدیر، لطیف وخبیر ہو، اور یہ صفت سوائے اللہ تعالیٰ جل شانہ کے کسی دوسرے کے لئے ثابت نہیں، پھر کیسے کوئی اس کا شریک اور سہیم ہو سکتا ہے؟

اس آیت ﴿لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ﴾ سے معتزلہ، خوارج اور شیعہ اور مرجئہ اور اہلِ بدعت وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت میں حق تعالیٰ شانہ کا دیدار نہ ہوگا۔ معتزلہ نے اس آیت سے یہ سمجھا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کا دیدار ممکن نہیں ہے۔ اہل السنت والجماعۃ کا اعتقاد اور فیصلہ اس بارے میں یہ ہے کہ بہشت میں اللہ تعالیٰ شانہ کا دیدار جنتیوں کے لئے افضل ترین نعمت ہے، اور اگر سچ پوچھا جائے کہ اصل بہشت اس

کے دیدار کی لذت وشرف ہی کا نام ہے، وہ بہشت ہی کیا جس میں محبوبِ حقیقی کا دیدار نصیب نہ ہو۔ علاوہ ازیں بہشت میں دیدارِ معبودِ برحق رؤیتِ محبوبِ حقیقی آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ متواترہ اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، جن کا انکار در پردہ شریعت مطہرہ کا انکار ہے۔

آیاتِ قرآنیہ:

(۱) ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾﴾ [القیامة] (اس دن بہت سے چہرے شاداب ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)۔

(۲) ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس: ۲۶] (جن لوگوں نے بہتر کام کیے ہیں، بہترین حالت انہی کے لیے ہے، اور اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی)۔

(۳) ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ [الکهف: ۱۱۰] (جس کسی کو اپنے مالک سے جا ملنے کی امید ہو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے، اور اپنے مالک کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے)۔

(۴) ﴿وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا﴾ [الإنسان: ۲۰] (اور جب تم وہ جگہ دیکھو گے تو تمہیں نعمتوں کا ایک جہاں اور ایک بڑی سلطنت نظر آئے گی)۔

(۵) ﴿كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ [المطففین: ۱۵] (ہرگز نہیں! حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس دن اپنے پروردگار کے دیدار سے محروم ہوں گے)۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو عار دلائی ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے، یعنی ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب اور پردہ ہوگا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کو بغیر حجاب کے دیکھیں گے، کیونکہ وہ بھی اگر کافروں کی طرح حجاب میں رہے تو ان میں اور کافروں میں کوئی فرق نہیں رہا، اور محجوب ہونے میں کافروں کی تخصیص نہیں ہوئی۔

ان آیات کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے رؤیت باری تعالیٰ پر صراحۃً، دلالۃً، اشارۃً، اقتضاءً اس مقصد پر واضح ثبوت موجود ہے۔

احادیثِ نبویہ:

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں ان سے زائد کوئی اور نعمت چاہتے ہو کہ میں تمہیں عطا کروں؟ تو وہ عرض کریں گے: کیا آپ (عزوجل تعالیٰ) نے ہمارے چہرے بارونق نہیں فرمائے؟ کیا آپ (عزوجل تعالیٰ) نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں بخشی؟ اس سے زیادہ ہم کیا چاہیں؟ اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا، اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی، اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس: ٢٦] (وہ لوگ جنہوں نے نیک اعمال کئے ان کے لئے جنت ہے، اور اس سے زائد (اللہ تعالیٰ کی زیارت) ہے۔ [مسلم، بدور سافرۃ وغیرہ]

حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چودہویں کے چاند کی طرف دیکھا، اور ارشاد فرمایا: سن لو! تم عنقریب (جنت میں) اپنے ربّ کی زیارت اسی طرح سے کرو گے جیسے اس چودہویں کے چاند کو دیکھ رہے ہو، اور اس کے نظر آنے میں تم کوئی تکلیف اور دقت محسوس نہیں کرتے ہو، پس اگر تم ہمت کرو کہ تم نماز فجر اور نماز عصر کو نہ چھوٹنے دو تو اس کی پابندی کرو۔ [متفق علیه]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت والے کافور کے ٹیلوں پر بیٹھ کر ہر جمعہ اپنے ربّ جل شانہ کی زیارت کریں گے، ان میں سب سے زیادہ قریب سے (زیارت کرنے) والا وہ شخص ہوگا جو جمعہ کے دن جلدی (مسجد میں) جائے گا، اور صبح جلدی اٹھتا ہوگا۔ [ابن مبارک، البدور، حادي الأرواح]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے کم درجہ کا جنتی وہ ہوگا جو اپنی جنتوں، بیویوں، نعمتوں، خدمت گاروں، اور تختوں کو ایک ہزار سال کی مسافت تک دیکھتا ہوگا، اور ان میں سے زیادہ مرتبہ کا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ شانہ کے چہرۂ اقدس کی صبح وشام زیارت کرے گا۔ پھر سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ○ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ [القیامة: ٢٣] (اس دن جنت میں بہت سے چہرے تروتازہ ہشاش بشاش چمکدار ہوں گے، اپنے ربّ جل شانہ کی طرف

دیکھتے ہوں گے)۔[ترمذي، حاكم، مسند أحمد، مجمع الزوائد، بدور السافرة]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں مؤمنین کی طرف مسکراتے ہوئے تجلی فرمائیں گے۔[ابن كثير، خطيب في التاريخ، اتحاف السادة المتقين، مشكل الحديث وغيره]

اللہ تعالیٰ جل شانہ کے مسکرانے کا معنی علمِ عقائد کے مطابق یہ ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ اہلِ جنت پر اپنے لطف وکرم، فضل وعنایت اظہارِ شرافت کا نزول فرمائیں گے۔زہے سعادت!

اختصار کے ساتھ چند مختصر احادیث پر اکتفاء کیا، ورنہ اس سلسلے میں بڑی طویل احادیث اتنی بکثرت ہیں جن کا اِحصاء باعثِ طوالت ہوگا۔اگر کسی کو مزید احادیث کی ضرورت ہو تو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی البدور السافرۃ، اور علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی حادی الارواح، اور مولانا امداد اللہ انور کی جنت کے حسین مناظر کا مطالعہ کیا جائے۔حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تیس کے قریب راویوں کی روایات نقل کی ہیں۔رحمه الله تعالیٰ

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو ربّ العزّت سبحانہ کی زیارت نہیں ہوسکتی۔حضرت عبادة بن صامت رضی اللہ عنہ جناب سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا، پھر فرمایا: تم جان لو تم اس وقت تک اپنے پروردگار کی زیارت نہیں کرسکتے جب تک کہ تم وفات نہ پاؤ۔[مسند أحمد، البدور السافرة] اوردار آخرت میں ربّ العزّت سبحانہ کی زیارت سے تمام جنتی محظوظ ہوں گے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شبِ معراج میں زیارت ہوئی، وہ بھی درحقیقت عالمِ آخرت ہی کی زیارت ہے، جیسا کہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہاں کا نام ہے جو آسمانوں کے اندر محصور ہے، پس آسمانوں سے اوپر آخرت کا مقام ہے وہاں پہنچ کر جو زیارت ہوئی ہے اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جاسکتا۔

اب سوال یہ باقی ہے کہ آیت قرآنی: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سبحانہ کی زیارت ہو ہی نہیں سکتی، تو پھر بیان شدہ احادیث میں جنتیوں کے لئے جنت میں زیارت کا کیا معنی ہوگا؟

سو اس کا جواب واضح ہے کہ آیت کریمہ میں اِدراک واحاطہ کی نفی ہے، اور وہ بھی دنیا میں، آخرت کی رؤیت کی نفی نہیں ہے، تب ہی تو صحیح احادیث نے بکثرت تواتر کے ساتھ آخرت کی زیارت کا اثبات فرمایا۔تو مطلب واضح ہے کہ آیت نے جس اِدراک واحاطہ کی نفی کی ہے احادیث نے اس کا اثبات نہیں کیا، اور احادیث نے جس

رؤیت کا اثبات کیا ہے آیت کریمہ نے اس کی نفی نہیں فرمائی۔ مسئلہ بے غبار اور واضح ہے۔

البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آخرت کی زیارت میں احاطہ کی اسی طرح نفی ہوگی جس طرح عام اوقات میں، کیونکہ ربّ العزّت سبحانہ کی ذات وصفات غیر محدود ہیں، اور انسانی عقل وحواس ظاہری وباطنی سب محدود ہیں، پس ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود ولامتناہی چیز کسی محدود اور متناہی چیز میں نہیں سما سکتی، اسی لئے تمام جہاں کے عقلاء، وفلاسفر اور مذہبی سطح پر صوفیاء کرام نے اپنی اپنی عمریں پتہ لگانے اور باری تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت وکھوج لگانے میں پوری زندگیاں صرف کی ہیں، مگر اِدراکِ کلّی بجائے خود ایک جزوی نقطہ پر بھی نہیں پہنچ سکے ہیں، اور سب نے ہتھیار پھینک کر یہی کہا: ؎

دور بینان بارگاہ است ☆ غیر ازین پے نبردہ اند کہ ہست

چہ شب ہانشستم درایں سیر گم ☆ کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ☆ واز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم

دفتر تمام گشت بپایان رسید عمر ☆ ماہمچنان دراوّل وصف تو ماندہ ایم

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اگر جہاں کے سارے انسان اور جنات اور فرشتے اور شیاطین جب سے پیدا ہوئے، اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے، اور یہ سارے مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں، تو سب مل کر بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کا اپنی نگاہوں میں احاطہ نہیں کرسکتے۔ [مظهري]

اور حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسہ ہے جس سے صرف محسوس چیزوں کا علم ہوسکتا ہے، ربّ العزّت سبحانہ کی ذات پاک تو عقل وحواس وہم وخیال کے احاطہ سے بالاتر ہے۔ ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ☆ بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی مخلوقات ومصنوعات اور ایجادات میں غور وفکر کرو، اور انہی چیزوں سے اس کی معرفت حاصل کیا کرو اور پختہ یقین کرو مگر اس کی ذات کے متعلق غور وفکر ہرگز نہ کرو۔ واللہ اعلم

قَدْ جَآءَكُم بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ عَمِىَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَآ أَنَا۠

عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۶
وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا ؕ وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۷

ترجمہ: تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے بصیرت والی چیزیں آچکی ہیں، سو جو شخص دیکھے گا سو وہ اپنے ہی لئے، اور جو اندھا بنے گا اس کا وبال اسی کی جان پر ہوگا، اور میں تم پر نگران نہیں ہوں ۝ اور ہم اسی طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں، اور تاکہ یہ لوگ یوں کہیں کہ: آپ نے پڑھ لیا ہے، اور تاکہ ہم اسے ان لوگوں کے لئے بیان کریں جو جانتے ہیں ۝۱۰۵ آپ اس کا اتباع کیجئے جس کی آپ کے ربّ کی طرف سے وحی کی گئی، کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی، اور آپ مشرکین سے روگردانی کیجئے ۝۱۰۶ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے، اور ہم نے آپ کو ان پر نگران نہیں بنایا، اور آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں ۝۱۰۷

معارف ومنازل

بصائر بصیرۃ کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں: روشنی اور واضح ہدایات، نیز عقل و دانائی جو اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہوتی ہے، انسان کی فطرت میں قدرت نے یہ استعداد اور طلب رکھی ہوئی ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے مطلب اور فائدے کی چیزوں کو تلاش کرتا رہتا ہے، اور ضرر و نقصان کی چیزوں سے اجتناب کرتا ہے۔ یہ استعداد اُسے دو طرح سے حاصل ہے کہ دنیاوی اور اخروی دونوں راستوں میں اپنے لئے نفع مند چیزوں کا انتخاب کرے، اور مضرتوں سے پرہیز کرے، تو ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرت کی چیزیں آچکی ہیں، یعنی قرآن مجید آیا، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کریمانہ اخلاقِ حسنہ، معاملاتِ عادلانہ، تعلیماتِ فاضلہ سب آئے، اور تم نے انہیں مشاہدہ بھی کیا، اور یہ سارے واضح اور روشن دلائل تمہارے سامنے ہیں، جن کے جاننے سمجھنے اور پیروی کرنے کی استعداد بھی قدرت نے تمہیں عطا فرمائی، اگر تم اپنی عقل و دانش کو متوجہ کرو گے، اور ان بصیرت کی چیزوں میں غور و فکر کرو گے، تو ہدایت کے حقائق تک پہنچ جاؤ گے، اور اصلی مسئلہ توحید تک تمہاری رسائی ہو جائے گی، اور رُشد و ہدایت کو پالو گے۔ تم میں سے جو شخص غور و فکر کرے گا وہ

بینائی حاصل کرے گا، جیسے کہ کچھ لوگوں نے یہ مقصد بخوشی حاصل کرلیا، اور اس بینائی کا نفع تمہاری جانوں کو حاصل رہے گا۔

اور جو شخص یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے عناد کا شکار ہو کر قبول نہیں کرے گا، اور بدستور اندھا ہی رہے گا، تو اس کا نقصان اسی کو ہوگا۔ پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرمایا کہ آپ کی ذمہ داری صرف پہنچانے کی ہے، عمل کروانا نہیں، تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کردو، اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے، تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمہاری ذمہ داری و جواب طلبی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے، لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو، اندھوں کو کس طرح بینا بنایا جائے، اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔

اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے، تو اللہ تعالیٰ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانون کو حق پرست مسلمان نہ بنا سکتا تھا؟ مگر مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں، مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لئے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے، اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے، وہ عرقِ گلاب پینے کو ترجیح دیتا ہے یا پیشاب کو۔

پس تمہارے لئے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھادی گئی ہے اس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو، اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو، جو لوگ اس دعوت کو قبول کرلیں انہیں سینے سے لگاؤ، اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو، خواہ وہ دنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں، اور یہ کہتے پھریں کہ یہ ناخواندہ اُمّی انسان یہ فصیح وبلیغ بلند وبالا کلام لایا کہاں سے؟ اور چونکہ مخالفانہ تعصب پہلے سے ان کے قلوب پر قبضہ کئے ہوئے ہوتا ہے، اس لئے ایک خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے کے امکان کو چھوڑ کر باقی تمام ممکن التصور صورتیں وہ اپنے ذہنِ مریض سے تجویز کرتے ہیں، اور انہیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا انہوں نے اس کتاب کے ماخذ کی تحقیق کرلی ہے، پس آپ ایسے بیمار ذہنیت رکھنے والوں کے پیچھے نہ پڑیں، جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں، اور جانے پر مُصر ہیں اس کی طرف جانے کے لئے انہیں چھوڑ دیں۔ پھر فرمایا:

﴿اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ کہ آپ اس کا اتباع کیجئے جس کی آپ کے رب کی طرف سے آپ کو وحی کی گئی، پھر اس کی فکر نہ کیجئے کہ کون لوگ راہِ راست پر آتے ہیں، اور کون نہیں آتے۔ اگر اللہ تعالیٰ سارے جہاں والوں کی ہدایت چاہتا تو یہ شرک نہ کرتے، اس ذات پاک نے یہ فیصلہ کیا ہوا ہے کہ جنت اور دوزخ دونوں کو بھر دے گا، وہ کسی کو زبردستی کر کے مسلمان نہیں بنانا چاہتا۔ ﴿لَاۤ اِكۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ﴾ [البقرة:۲۵۶] (دین میں کوئی زبردستی نہیں) ﴿فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَكۡفُرۡ﴾ [الکھف:۲۹] (جس کی مرضی ایمان لائے، اور جس کی مرضی کفر اختیار کرے) کا اٹل قانون ہے۔

درکارخانہ عشق ازکفرنا گزیرست ☆ دوزخ کرابسوز دگر بولہب نباشد

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا﴾ جیسے فرمایا: ﴿لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ﴾ [الغاشیة:۲۲] (آپ ان پر مسلّط نہیں ہیں)۔ ہم نے آپ کو ان کا نگراں اور مسؤل نہیں بنایا، یہ جانیں عمل کریں یا نہ کریں، آپ ذمہ دار نہیں ہیں۔

﴿وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَكِیۡلٍ﴾ آپ ان پر داروغہ بنا کر مسلّط نہیں کئے گئے، لہٰذا آپ اس طرح کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا یَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ﴾ [الشعراء:۳] (شاید تم اس غم میں اپنی جان ہلاک کیے جا رہے ہو کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے)۔ واللہ اعلم

......❀......❀......❀......

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدۡوًۢا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ
عَمَلَهُمۡ ۪ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمۡ مَّرۡجِعُهُمۡ فَیُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾ وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ
جَآءَتۡهُمۡ اٰیَةٌ لَّیُؤۡمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَمَا یُشۡعِرُكُمۡ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾
وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ:۔ اور ان کو برامت کہو جنہیں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں، سو وہ اللہ تعالیٰ کو برا کہیں گے براہِ جہالت حد سے گزر کر، ہم نے ایسے ہی مزیّن کر دیا ہر امت کے لئے ان کے عمل کو، پھر اپنے رب کی طرف ان کا لوٹنا ہے، سو وہ انہیں ان کاموں کو جتلا دے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۰۸﴾ اور انہوں نے اپنی قسموں میں خوب زور لگا کر اللہ

تعالیٰ کی قسم کھائی کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آجائے گی تو وہ ضرور ضرور اس پر ایمان لے آئیں گے، آپ فرما دیجئے کہ: نشانیاں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں، اور تمہیں اس کی کیا خبر کہ جب وہ نشانی آجائے گی تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے ﴿۱۰۹﴾ اور ہم ان کے دلوں کو، اور ان کی آنکھوں کو پلٹ دیں گے جیسا کہ وہ اس پر پہلی بار ایمان نہ لائے، اور ہم ان کو اس حال میں چھوڑے رہیں گے کہ وہ اپنی سرکشی میں اندھے بنے رہیں ﴿۱۱۰﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اوّل تو یہ فرمایا کہ جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں، اور غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، ان کے معبودوں کو بُرے الفاظ میں یاد مت کرو، چونکہ تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو، اور انہیں تم سے دشمنی ہے، اس لئے ضد میں آکر اپنی جہالت سے اللہ تعالیٰ کو بُرے الفاظ سے یاد کریں گے، ضد وعناد والے کو یہ ہوش نہیں ہوتا کہ میری بات کہاں لگے گی۔

یوں تو مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور اس کے بارے میں خالق کائنات ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن وہ جب ضد میں آئیں گے تو صرف یہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں نے ہمارے معبودوں کو بُرا کہا ہے، لہٰذا ہمیں بھی ان کے معبود کو بُرا کہنا چاہئے۔ یہ لوگ ضد اور عناد کے سبب حدود سے تجاوز کریں گے، اور اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کریں گے، چونکہ یہ بُری حرکت ان کی طرف سے تمہارے جواب میں ہوگی، اس لئے ان کے معبودانِ باطلہ کو بُرے الفاظ میں یاد کرکے اس کا سبب نہ بنو کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ جَلَّ شَأنُهٗ وعَمَّ انعَامُهٗ وَتَقَدَّسَ ذَاتُهٗ سُبحَانَهٗ کی شانِ عالی میں نازیبا الفاظ استعمال کریں، جو کہ بہت بے حد بُری بات ہوگی۔

شانِ نزول:

لبابُ النقول میں مصنف عبد الرزاق سے نقل کیا ہے کہ کافروں کے بتوں کو مسلمان بُرے الفاظ میں یاد کرتے تھے، تو وہ ان کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان میں نازیبا کلمات کہہ جاتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرمائی۔ حضرات علماء کرام نے اس سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جو کام خود کرنا جائز نہیں، اس کا سبب بننا بھی جائز نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے عرض کیا کہ یا

رسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے گا؟ فرمایا: کوئی شخص کسی کے باپ کو گالی دے گا تو وہ اس کے باپ کو گالی دے گا، اور کسی کی ماں کو گالی دے گا تو وہ اس کی ماں کو گالی دے گا۔ (اس طرح سے وہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا بن جائے گا۔ [متفق علیہ، مشکوۃ]

پھر فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ﴾ (ہم نے اسی طرح ہر اُمت کے لئے ان کے عمل کو مزین کر دیا) جو لوگ کافر ہیں کفر ہی سے چپکے ہوئے ہیں، کفر کو اچھا سمجھتے ہیں، دنیاوی زندگی ختم ہوگی تو میدانِ قیامت میں سب لوگ پروردگارِ عالم جلّ شانہ کی طرف لوٹیں گے، سو وہ انہیں جتا دے گا کہ وہ دنیا میں کیا کام کرتے تھے؟ پھر اللہ تعالیٰ شانہ ان کو ان کے کاموں کی جزا بھی دے گا، اور یہ ہر امت کے لئے ان کے عمل کو مزین کرنا تکوینی طور پر ہے، اس سے تشریعی امور پر کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ جو لوگ کافر ہیں وہ اپنے اختیار سے کفر وشرک اختیار کئے ہوئے ہیں، ان پر کفر مسلط نہیں کیا گیا ہے، جب ان کے سامنے اسلام کی حقانیت کے دلائل بیان ہوتے ہیں تو وہ اپنے اختیار اور سرکشی سے دور بھاگتے اور انکار کرتے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ [فصلت:۲٦] (اور یہ کافر کہتے ہیں کہ: اس قرآن کو سنو ہی نہیں، اور اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو، تاکہ تم ہی غالب رہو)۔

دعوت وتبلیغ کا زرّین اصول:

دینی دعوت دینے والوں کو بڑی قیمتی نصیحت فرمائی جارہی ہے کہ جوشِ تبلیغ میں وہ اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرہ اور بحث وتکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک پہنچ جائے دوسرے مخالفین اور بدعقیدہ لوگوں کے عقائد اور ان کے پیشواؤں تک کو سُست اور بُرا کہا جائے، اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ درمیانے لوگ بھی بیزار ہو جاتے ہیں، اور دوسرے مخالفین بھی یہی ہتھیار استعمال کر کے فضاء کو مکدر بناتے ہیں، اور بجائے قرب واصلاح کے دوری اور نفرت اختیار کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [النحل:۱۲۵] (اپنے ربّ کی راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو، اور ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو)۔

اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ پھر قرآن کریم نے بتوں اور اصنام کی اتنی بڑی شدت سے کیوں مذمت کی؟ اور ان کے پرستاروں کو بہت سخت سست فرما کر انہیں نجس وناپاک تک کہا، اور ان بتوں اور ان کے ماننے والوں جہنم کا

ایندھن تک کہا، وغیرہ۔

جواب یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اس نے کسی کی دل آزاری کے طور پر یہ نہیں کہا، بلکہ اظہارِ حقیقت کے پیشِ نظر کفار اور ان کے بتوں کی مذمت اور خرابی بیان کی، جس کے بغیر کفر و شرک کے مفاسد سے آگاہ ہونا ممکن نہ تھا، اور اصل چیز مقاصدِ شرعیہ کا بیان ہے، جو کہ ایک لازمی امر اور واجب ہے، اس کے بیان کرنے میں اگر کسی کی دل آزاری ہو تو اس کی خاطر اس لازمی فرض کو ہرگز نہیں چھوڑا جاسکتا، خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو، جیسے قرآن کریم نے اس کی تصریح کی ہے۔ ہاں! امور غیر مقاصد شرعیہ میں پھر دوسروں کے عقائد اور ان کے پیشواؤں کی سخت مذمت بہتر نہیں ہوسکتی۔ واللہ اعلم

کفار کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ﴾ (اور انہوں نے بہت زور دار طریقہ پر اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی کہ ہمارے کہنے کے مطابق اگر فرمائشی معجزہ ظاہر ہوجائے تو ہم ایمان لے آئیں گے)۔ ان لوگوں کی یہ تاکیدی قسمیں سن کر مسلمانوں کو خیال پیدا ہوا کہ یہ لوگ جن معجزات کی فرمائش کر رہے ہیں اگر وہ ظاہر ہوجاتے تو بہتر ہوتا، تاکہ یہ لوگ ایمان لے آتے، لیکن انہیں تو ایمان لانا نہیں ہے، اور معجزات کی فرمائش ایمان نہ لانے کا ایک بہانہ ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ایک دن سرورِ دو جہان ﷺ نے قریش مکہ سے ایمان لانے کے بارے میں بات کی، تو کہنے لگے کہ: اے محمد! (ﷺ) آپ ہمیں بتاتے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس ایک لاٹھی تھی جسے پتھر میں مارتے تھے تو بارہ چشمے پھوٹ پڑتے تھے، اور آپ نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ عیسیٰ (علیہ السلام) مُردوں کو زندہ کرتے تھے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ قومِ ثمود کے لئے بطور معجزہ ایک اونٹنی ظاہر کی گئی تھی، آپ ہمارے لئے بھی کوئی ایسی چیز یعنی نشانی ظاہر کریں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: تم کونسی نشانی چاہتے ہو؟ کہنے لگے کہ: صفا پہاڑ سونا بن جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہوجائے تو میری تصدیق کروگے؟ کہنے لگے: اگر ایسا ہوگیا تو ہم سب آپ کا اتباع کریں گے۔

آپ ﷺ اللہ تعالیٰ شانہ سے دعا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے، جبریل علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے کہا کہ آپ غور فرمالیجئے: دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار فرمالیں: آپ چاہیں کہ پہاڑ صفا کا سونا بن جائے، تو ایسا ہوجائے گا، لیکن اگر ان لوگوں نے تصدیق نہ کی تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دیدے گا، اور اگر آپ

چاہیں تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں، تاکہ کفر سے توبہ کرکے ایمان لائیں۔ (گو اس میں دیر لگے گی مگر ہوگا ایسا ہی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں انہیں اسی حال پر چھوڑ دیتا ہوں، جنہیں توبہ کرنا ہو تو توبہ کرکے ایمان لے آئیں، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾﴾

﴿قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (آپ فرمادیجئے کہ معجزات سب اللہ تعالیٰ شانہ کے قبضہ قدرت میں ہیں) وہ چاہے تو ان کی فرمائشوں کے مطابق معجزات ظاہر فرمادے، اور اگر اس کی مشیت نہ ہو تو کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہو۔

﴿وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ یہ اہل ایمان کو خطاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں کیا خبر ہے کہ ان کی مطلوبہ نشانی آجائے گی جب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے، ان کی قسمیں جھوٹی ہیں، خواہ کیسی ہی زور دار ہوں ان کا مقصد ایمان نہ لانے کا بہانہ تلاش کرنا ہے، انہوں نے اس سے پہلے کئی معجزات شق القمر وغیرہ دیکھے، لیکن ایمان نہیں لائے، اب کسی معجزہ کو دیکھ کر وہ کیا ایمان لائیں گے؟ جیسے ارشاد ہے:

﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـــِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ اور ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے ہم بھی ان کے دلوں کو حق طلبی کے قصد سے، اور ان کی نگاہوں کو حق بینی کی نظر سے پھیر کرنا کارہ کریں گے، اور یہ لوگ خبثِ باطنی کے باعث گمراہ ہی رہیں گے، اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں رہنے دیں گے، راہ حق پر جب وہ خود نہیں آنا چاہتے تو ہم بھی راہِ حق پر انہیں نہیں چلائیں گے۔ معجزاتِ مطلوبہ کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے، جیسا کہ آنے والی آیت میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

جس طرح پہلی دفعہ کھلے ہوئے محسوس معجزات پر ایمان نہیں لائے، مثلاً معجزہ شق القمر وغیرہ دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے، اور معجزات کو دیکھ کر جادو قرار دینے لگے، اور: ﴿وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ﴾ [القمر: ۲] (اور کہتے ہیں کہ یہ تو ایک چلتا ہوا جادو ہے) کہتے رہے آگے مزید وضاحت ہے۔

☆☆☆

﴿اَلْجُزْءُ الثَّامِنُ﴾

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْئِدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ: اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیں، اور ان سے مُردے بات کرلیں، اور ہم جمع کریں ان پر ہر چیز ان کے آمنے سامنے، تب بھی وہ ایسے نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، اور لیکن ان میں اکثر وہ ہیں جو جہالت کی باتیں کرتے ہیں ﴿۱۱۱﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن مقرر کردیئے ہیں، جو شیاطین ہیں انسانوں میں سے اور جنات میں سے، ان میں بعض بعض کو ایسی باتوں کا وسوسہ ڈالتے ہیں جو بظاہر اچھی لگتی ہیں، وہ یہ کام دھوکہ دینے کے لئے کرتے ہیں۔ اور اگر تیرا ربّ چاہے تو یہ لوگ یہ کام نہ کریں، سو چھوڑ دیجئے ان کو اور باتوں کو جو وہ جھوٹ بناتے ہیں ﴿۱۱۲﴾ اور تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوجائیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے، اور تاکہ وہ اسے پسند کریں، اور تاکہ وہ مرتکب ہوجائیں ان کاموں کے جن کا وہ ارتکاب کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾

معارف ومنازل

معاندین کا مزید تذکرہ، اور ان کی ہٹ دھرمی کا بیان:

ان آیات میں معاندین کا مزید عناد بیان فرمایا ہے۔ دراصل یہ ماسبق کا تتمہ ہے، اور ارشاد فرمایا کہ یہ فرمائشی معجزے طلب کرنا حق قبول کرنے کے لئے نہیں، محض باتیں بنانے اور بہانے تراشنے کے لئے ہے، اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ انہوں نے جو فرمائشیں کی ہیں، اور معجزات ظاہر ہونے کے بعد اس کا انکار کیا ہے۔

بالفرض اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیں، اور مُردے زندہ ہوکر ان سے بات کرلیں، اور ہم ہر چیز (عجیب و غریب) ان کے سامنے لے آئیں، یعنی غیب کی چیزیں ان کے سامنے ظاہر کردیں، مثلاً یہ کہ انہیں برزخ دکھائیں، اور جنت ودوزخ دکھائیں، تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ

فرمائشیں تو کرتے ہیں، مگر ایمان لانا ان کا مقصد نہیں ہے، یہ ان کی سراپا جہالت ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ﴾ اس میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ یہ لوگ جو آپ کی دشمنی میں لگے ہوئے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، آپ سے پہلے جو نبی تشریف لائے ہم نے ان کے لئے انسانوں میں اور جنّات میں سے دشمن بنادئے تھے، یہ دشمن شیطان کی شرارتوں سے ایک دوسرے کو ایسی ایسی باتیں سمجھاتے ہیں جو بظاہر بہت اچھی مزیّن معلوم ہوتی ہیں، جیسے کسی بدصورت چیز پر ملمع سازی کر کے بظاہر خوبصورت بنادی جائے، یہ لوگ ایسی باتیں سامنے لاکر اپنے لوگوں کو دھوکہ دیتے تھے، تاکہ ایمان قبول نہ کریں۔ جو حال انبیاء سابقین علیہم السلام کا تھا وہی ان لوگوں کا بھی حال ہے جو آپ کی مخالفت کررہے ہیں، لہٰذا آپ غم نہ کریں، ایسا ہوتا ہی رہا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ [یٰسٓ: ۳۰] (افسوس ہے ایسے بندوں کے حال پر ان کے پاس کوئی رسول ایسا نہیں آیا جس کا وہ مذاق نہ اڑاتے رہے ہوں)۔

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ﴾ (اگر آپ کا ربّ چاہتا تو یہ لوگ ایسا نہ کرتے) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا یہی تقاضا ہے کہ مخالفتیں ہوتی رہیں، اور یہ مخالفت حکمتوں پر مبنی ہے۔

﴿فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ﴾ پس جب اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں تو آپ فکرمند نہ ہوں، یہ جو کچھ افتراء کررہے ہیں انہیں کرنے دیں، اور انہیں چھوڑیئے، یہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ "دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست"۔

﴿وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ اور وہ لوگ فریب دینے والی باتوں کے وسوسے اس لئے ڈالتے ہیں کہ ان کی طرف ان لوگوں کے قلوب مائل ہوجائیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ﴾ [النمل: ۲۴] (شیطان نے ان کے اعمال ان کے لئے بہت اچھے دکھائے ہیں، چنانچہ اس نے انہیں صحیح راستے سے روک رکھا ہے، اور اس طرح وہ ہدایت نہیں پاسکتے)۔

اسی طرح فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ [فاطر: ۶] (شیطان اپنے ماننے والوں کو دعوت دیتا ہے تاکہ وہ دوزخ کے باسی بن جائیں)۔ شیاطین الانس والجن کا مشغلہ یہی ہے کہ لوگ گمراہ ہوں۔

﴿وَلِيَرْضَوْهُ﴾ تاکہ وہ اسے پسند کرلیں۔

﴿وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴾ اور تاکہ ان کاموں کے مرتکب ہوتے رہیں جن کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ملمع ساز فریب دینے والے اور فریب خوردہ جو کچھ برا بھلا کماتے ہیں انہیں کمانے دیں، قیامت کے دن ان کی ساری کمائی سامنے آجائے گی، اور انہیں ہر بات کا جواب دینا پڑے گا، اور انہوں نے دنیا میں جو منصوبہ بندیاں کی ہیں، اور صاحبِ قرآن اور دینِ الٰہی کے خلاف ہتھکنڈے استعمال کئے ہیں، روز قیامت اس کی سزا انہیں بھگتنا ہی پڑے گی۔

.......❁.......❁.......❁.......

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ
اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ
لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ
اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ: تو کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے فیصلہ کرنے والوں کو تلاش کروں؟ حالانکہ اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل فرمائی ہے، اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ جانتے ہیں کہ بلاشبہ آپ کے ربّ کی طرف سے اتاری ہوئی ہے، سو آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوجائیں ﴿۱۱۴﴾ اور آپ کے ربّ کے کلمات سچائی اور عدل کے اعتبار سے پورے ہوگئے، اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾ اور اگر آپ بات مان لیں ان میں سے اکثر لوگوں کی جو زمین میں ہیں تو آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے بہکا دیں گے، وہ نہیں اتباع کرتے مگر گمان کا، اور وہ صرف اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں ﴿۱۱۶﴾ بے شک آپ کا ربّ اس شخص کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ ہدایت پر چلنے والوں کو خوب جانتا ہے ﴿۱۱۷﴾

معارف ومنازل

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی آیات سناتے تھے، اور اس کے احکام بتاتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی قدرتوں کے متعلق عقائد کی تلقین فرماتے تھے کہ وہ خالق ہے، مالک ہے، قادر مطلق

ہے، سمیع وبصیر ہے، علیم وخبیر ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مخلوقات میں تصرف کرتا ہے، وہ واحد لاشریک ہے، اور ہر عبادت کا وہی لائق ہے، لیکن مشرکین یہ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ ان باتوں کو چھوڑ دیں، اور حال یہ ہے کہ وہ خود اپنے باطل معبودوں کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے، اور آپ ﷺ کو بھی اپنی گمراہی کی طرف کھینچنا چاہتے تھے۔

پس اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان سے یوں فرمائیں کہ: میں کائنات کے ربّ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور کس کو فیصلہ کرنے والا مان لوں؟ اس کی ذات تمام صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے، جبکہ اس جیسا کوئی ہے ہی نہیں، تو میں اسے چھوڑ کر اور کس کو حَکَم یعنی فیصلہ کرنے والا بناؤں؟ میں تو صرف اسی کو مانتا ہوں، اور اسی کے ہر حکم اور ہر فیصلہ پر راضی ہوں، اور کوئی نہیں جس کے فیصلہ پر راضی ہونے کا فیصلہ کروں، اس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل فرمائی ہے، جس میں تفصیل کے ساتھ ہدایات بیان فرمائی ہیں۔

جن لوگوں کو اس کتاب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ واقعی آپ ﷺ کے ربّ عزّوجلّ کی طرف سے ہے، لیکن جو ہٹ دھرم معاند ہیں وہ عناد کی وجہ سے شک کرتے ہیں، سو آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں، چونکہ کسی نبی کو اپنی نبوت میں شک کرنے کا کوئی احتمال ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے یہ خطاب اگرچہ بظاہر آپ ﷺ کو ہے، مگر دوسروں کو سنانا اور بیدار کرنا مقصود ہے، کہ کتاب اللہ کی حقانیت میں شک نہ کرو، پھر ارشاد ہے:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ اور آپ کے ربّ کے کلمات کامل ہو گئے صدق اور عدل کے اعتبار سے۔

حق وباطل کی پہچان صرف وحی سے ہوتی ہے، نہ کہ عقل سے:

سچائی اور جھوٹ، انصاف اور ظلم وزیادتی اسی طرح حق وباطل اور سعادت وشقاوت، یہ چیزیں عقل سے معلوم نہیں ہوسکتیں، اور نہ ہی عقل ان کا تعیّن کرسکتی ہے۔ دنیا کے عقلاء ان امور کے تعین میں اتنے اختلاف کرچکے ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا، اور عقلاء نے ان امور کے بارے میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں جنہیں وہ خود مسترد کرچکے ہیں، لیکن چیزوں کا ظاہری حسن وقبح ہو یا معنوی حسن وقبح یہ سارے وحی الٰہی پر موقوف ہیں، اس لئے ارشاد ہوا:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ کلمات سے مراد وہ مضامین ومعارف ہیں جو قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ قرآن کریم نے بہت سے احکام کو تفصیلاً بیان فرمایا، اور بہت سارے احکام وشرائع کی تفصیل وحی خفی یعنی

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق بیان سے ان کی وضاحت اور تفصیل کا حکم سنایا۔ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ [القیمۃ:۱۹] (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو بیان کرنا)۔ ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ [النحل:۴۴] (تاکہ آپ لوگوں کے لئے وہ کچھ بیان کریں جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اللہ تعالیٰ ہی کا فرمان ہے، آپ کا اتباع اور اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اتباع ہے۔ فرمایا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء:۸۰] (جس نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی) اللہ تعالیٰ اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم برحق وسچا بھی ہے اور مبنی بر حکمت وحقیقت بھی ہے۔

بعض علماء کرام نے عدل سے مراد اعتدال لیا ہے کہ قرآن حکیم کے احکام سارے کے سارے مبنی بر اعتدال ہیں، نہ ان میں افراط ہے نہ تفریط، نہ سارے احکام سخت ہیں نہ نرم۔ بہت سی چیزیں حلال ہیں اور بہت سی حرام، اور کچھ مکروہ وخلاف اَولیٰ، کچھ احکام طبائعِ انسانیہ کے موافق اور کچھ مخالف وغیرہ۔ پھر جہاں احکام قدرے سخت ہیں وہاں یہ آسانی رکھی ہے کہ استطاعت کے مطابق عمل ہو۔ فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرۃ: ۲۸۶] (اللہ کسی بھی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا)۔ یا یہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن:۱۶] (جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو)۔ یا یہ ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ [آل عمران:۱۹۱] (جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں)۔ اسی طرح تمام عبادات میں سہولت اور آسانی کا پہلو موجود ہے۔

﴿لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اس کا کلام لفظی اور معنوی تحریفات سے محفوظ ہے، کیونکہ اس نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اور ایسا تکوینی نظام جاری فرمایا ہے کہ سارے عالم میں کہیں بھی دیکھو ایک ہی طرح کا قرآن ہے، ایک ایک لفظ نقطہ زبر زیر پیش شد ومد یکساں محفوظ ہیں، کسی کی مجال نہیں کہ وہ قرآن کریم میں ردوبدل کر سکے۔ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر:۹] (ہم ہی نے قرآن کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اس آیت میں اسی کی بشارت اور حفاظت کا وعدہ ہے۔

آج چودہ سو سال کا عرصہ گزر چکا، مگر کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی کہ کلماتِ قرآنی میں کوئی ادنیٰ تحریف کرے، جس کے کروڑوں کی تعداد میں مرد، عورت، بوڑھے، جوان اور بچے حفاظ موجود ہوں۔ الحمد للہ

اگر کلمات سے احکامِ الٰہی مراد لئے جائیں تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے قرآن حکیم کے ذریعہ جو احکام نازل فرمائے ہیں وہ اٹل اور ابدی ہیں۔ قیامِ قیامت تک جاری رہیں گے، ان میں کسی ترمیم وتبدیلی کا کسی کو اختیار نہ ہوگا، اور کسی مخلوق کی گنجائش نہیں ہوگی کہ وہ احکامِ خالق جلّ شانہ میں تبدیلی کرے۔

حکومتوں میں صبح وشام یہ سلسلہ جاری رہتا ہے کہ آج کوئی جدید آئین، ضابطہ، قانون، آرڈیننس جاری کرتے ہیں، پھر اسے منسوخ کرتے ہیں، یا ترمیم کرتے ہیں، مگر احکامِ الٰہی ہر قسم کے نقائص سے پاک ہوتے ہیں، ان میں سوائے نسخِ شرعی کے دوسری کسی تبدیلی کا امکان تک نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا:

﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔ وہ سب کی باتیں سنتا ہے، دوست، دشمن، موافق، مخالف سب کے اعمال اور رویہ سے باخبر ہے۔ وہ سب کو دیکھنے اور خبر رکھنے کے باوجود ڈھیل دیتا ہے۔ قیامت کے دن دوستوں کو جزا، اور دشمنوں کو سزا دیتا ہے، اور پورے عالم کی سزا وجزاء کا اپنے عدل وانصاف پر فیصلہ صادر فرماتا ہے۔

مغربی جمہوریت سوائے گمراہی کے کچھ نہیں:

فرمایا: ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ﴾ اس میں صاف ارشاد فرمایا کہ زمین پر جو لوگ بستے ہیں اور آباد ہیں ان میں اکثر گمراہ ہیں، اور تجربہ اس پر واضح گواہ وشاہد ہے۔ اگر آپ ان اکثریت والوں کی اطاعت کروگے، اور ان کا کہا مانوگے تو یہ تمہیں گمراہ کریں گے، راہِ حق سے ہٹا دیں گے، کیونکہ اکثریت حق وانصاف کا معیار نہیں ہوتی، بلکہ بے ہنر، بے سوچ، بے علم، بے عقل وبے کمال لوگوں کا ٹولہ ہوتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ﴾[المائدۃ:۱۰۰] (کہہ دو کہ ناپاک اور پاکیزہ چیزیں برابر نہیں ہوتیں، چاہے تمہیں ناپاک چیزوں کی کثرت اچھی لگتی ہو)۔

اکثریت حقانیت کی دلیل ہرگز نہیں ہوتی، اور نہ ہی قوّت فیصلہ اور صداقت کا معیار ہوتی ہے، اور قرآن وسنت، نیز عرف ومحاورہ بشمولِ معاشرہ اس پر دلیل ہیں کہ ''حق'' باطل کے مقابلہ میں ''اسلام'' کفر کے مقابلہ میں، ''طہارت'' خباثت کے مقابلہ میں، علم وانصاف اور تقویٰ جہالت اور ظلم وزیادتی کے مقابلہ میں ہمیشہ ہر زمانہ، ہر معاشرہ اور ہر علاقہ میں اقلیت میں ہوتا ہے۔ ہر زمانہ میں اچھے لوگ ہوں، یا اچھی چیزیں ہوں، یا اچھی خصلت واچھے کردار ہوں اقلیت میں ہوتے ہیں، اور ہر قسم کی برائیاں اکثریت میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ دنیا دار الفساد اور دار الشرور

ہے، نہ کہ دار الصلاح والفلاح۔ اسی طرح قیامت کے روز حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کا حصہ الگ کرلو، وہ دریافت فرمائیں گے کہ یا ربّ جہنم کا حصہ کیا ہوگا؟ تو جواب ملے گا: ہزار میں سے ایک شخص جنت کے لئے، باقی ۹۹۹ دوزخ کے لئے۔ [بخاري]

اسلامی نظام قوّت رائے علم وتقویٰ اور قوّتِ عقل پر مبنی ہے، اسی بنیاد پر حقوق میں اور حقوق کے متعلق گواہوں میں، اسی طرح مسائلِ میراث میں عصبات میں خاص کر اسی صلاحیت استعداد اور عقل و دانشمندی پر مسائل واحکام وضع ہوئے ہیں۔

مغربی جمہوریت جو کہ پورے عالم میں رائج ہے، یہ چونکہ غیر مسلم اقوام کا ایک غیر مہذب، بے انصافی پر مبنی صرف اسلام کے خلاف بنایا ہوا نظام ہے، جس کی ہر دفعہ میں اسلامی نظام کی نفی ہے، اس لئے یہ مغربی نظام غیر اسلامی بھی ہے، اور غیر شرعی بھی ہے۔ نیز مبنی بر بے انصافی بھی ہے، اسے اسلامی جمہوریت کہنا ایسا ہے جیسا کوئی کہے اسلامی شراب۔ اس جمہوری نظام میں پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں، یہ کلمۂ کفر ہے، بلکہ طاقت کا اصلی سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، اور بس۔

پھر اس نظام میں جَو وگندم، خر وآدم برابر ہیں۔ عورت مرد کے ساتھ، کافر ومنافق مسلمان کے ساتھ، ایک ادنیٰ بھنگی بڑے عالم، ڈاکٹر، دانشور کے ساتھ برابر ہے۔ انسانی شرافت کا لازمی عنصر یہی ہوتا ہے کہ فرقِ مراتب ہو، جبکہ جمہوریت میں محض یہ نہیں ہے کہ فرق مراتب کی نفی ہے، بلکہ انسانی شرافت کی نفی ہے، لہٰذا نتیجہ یہ ہے کہ یہ جانوروں کا نظام ہے، انسانوں کا نہیں، عورتوں کا نظام ہے، مردوں کا نہیں، بیوقوفوں کا نظام ہے، عقلمندوں کا نہیں، اور یہ صرف اسلامی نظام کے خلاف بنایا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا: ؎

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو ☆ کہ از مغز دوصد خر فکر انسانی نہ می آید

اور جو لوگ بار بار قدم قدم پر جمہوریت کا نعرہ لگاتے ہیں، اور اس پر بے حد خوش ہوتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا ربّ سمیع وبصیر اور علیم وخبیر بھی ہے، تم مر کر اس کے پاس جاؤ، پھر دیکھو تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟ ﴿الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ [ابراهيم:۲۸] (جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا، اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں لا اتارا)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نِعْمَتَ اللّٰهِ" سے مراد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور "الَّذِيْنَ" سے مراد اہلِ مکہ۔

میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں "نِعْمَتَ اللهِ" سے مراد اسلامی نظام ہے، اور "الَّذِيْنَ" کے مصداق مغربی جمہوریت کے علمبردار اور پیروکار ہیں۔ واللہ اعلم

سورۂ توبہ میں فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [التوبة:۱۱۹] (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کی رفاقت اور معیت اختیار کرو)۔ یعنی کثرتِ خبیث کی بجائے اس قلیل جماعت کے ساتھ رہو جو سچے ہیں، کثرت میں گمراہی کے علاوہ یہ عیب بھی نمایاں ہی ہے کہ:

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ﴾ یہ اکثر لوگ گمان کے اوپر چلتے ہیں، اور:

﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ فرما کر مزید واضح فرمایا کہ یہ لوگ اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں (بے حقیقت بے بنیاد) ان کے اتباع اور ان کی بات ماننے میں سوائے تباہی کے کچھ بھی نہیں۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ بے شک تیرا ربّ اچھی طرح جانتا ہے کہ سچے کون ہیں، اور جھوٹے کون ہیں۔ اسی طرح گمراہ کون ہیں اور ہدایت یافتہ کون۔ دنیا میں انہیں مہلت دے کر ڈھیل دیتا ہے، جب قیامت کے میدان میں جمع ہو کر آئیں گے تو ان سے حساب لے گا، اور اسی کے مطابق ان کے حق میں یا خلاف فیصلہ صادر فرمائے گا۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:۸] (چنانچہ جس نے ذرہ برابر کوئی اچھائی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر کوئی برائی کی ہوگی وہ اسے دیکھے گا)۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ
عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ
بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ
الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ
وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

ترجمہ: سو اس میں سے کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان لائے ہو ﴿۱۱۸﴾ اور تمہارے لئے اس کا کیا باعث ہو سکتا ہے کہ اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا؟ حالانکہ اس نے

تمہیں تفصیل سے بتا دیا ہے جو تم پر حرام کیا گیا، مگر اس صورت میں کہ تمہیں سخت مجبوری ہو، بلاشبہ بہت سے لوگ اپنی خواہشوں کے ذریعہ بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، بے شک تیرا ربّ خوب جانتا ہے حد سے آگے بڑھنے والوں کو ﴿۱۱۹﴾ اور چھوڑ دو ظاہر گناہ اور باطنی گناہ، بے شک جو لوگ گناہ کرتے ہیں عنقریب انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا ﴿۱۲۰﴾ اور مت کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہیں کیا گیا، اور بے شک وہ گناہ ہے، اور بلاشبہ شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں، تاکہ تم سے جھگڑا کریں، اور اگر تم نے ان کا کہا مانا (یعنی اطاعت کی ان کی) تو بلاشبہ تم مشرک ہو جاؤ گے ﴿۱۲۱﴾

معارف ومنازل

تفسیر درمنثور میں ان آیات کا سبب نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہودی آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انہوں نے بطور اعتراض یوں کہا کہ: جس جانور کو ہم قتل کردیں (یعنی ذبح کردیں) اسے تو آپ حلال سمجھ کر کھا لیتے ہیں، اور جس جانور کو اللہ تعالیٰ قتل کردے (یعنی اسے موت دیدے اور بغیر ذبح کے مر جائے) آپ اسے حرام سمجھ کر نہیں کھاتے ہیں، یہ تو بہت الٹا معاملہ ہے۔ ایک روایت یوں بھی ہے، جسے علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ فارس کے لوگوں نے قریشِ مکہ کو آدمی بھیج کر یہ سمجھایا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یوں بحث کرو کہ آپ اپنے ہاتھ میں چھری لے کر جس جانور کو ذبح کرتے ہیں وہ تو آپ کے نزدیک حلال ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ سونے کی چھری سے ذبح کرتے ہیں وہ آپ کے نزدیک حرام ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۃ الانعام میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ کچھ لوگ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ہم جسے خود قتل کرتے ہیں اسے کھا لیتے ہیں، اور جسے اللہ تعالیٰ قتل کرتا ہے اسے نہیں کھاتے (یہ انہوں نے اعتراض کے طور پر کہا)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ: ﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللهِ﴾ نازل فرمائی۔

پہلی روایت سے معلوم ہوا کہ یہ اعتراض یہود نے کیا تھا، اور دوسری روایت سے معلوم ہوا کہ قریش مکہ نے اہلِ فارس کے سمجھانے پر کیا تھا۔ مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہودیوں سے اس اعتراض کا صادر ہونا بعید ہے، کیونکہ وہ غیر ذبیحہ یعنی میتہ کو نہیں کھاتے تھے، لیکن اس بات کی وجہ سے روایت کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ معترض (خاص کر

یہود) تو اندھا ہوتا ہی ہے، جسے اعتراض کرنا ہو وہ کہاں سوچتا ہے کہ یہ بات مجھ پر بھی آسکتی ہے؟ اور وہ اسلام دشمنی میں مشہور ہیں۔ اعتراض کرنے والے جاہلوں نے صرف موت کو دیکھ لیا، اور ذبیحہ اور غیر ذبیحہ کے درمیان جو فرق ہے اس کو نہیں دیکھا، لہٰذا اعتراض کر بیٹھے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ہر جانور کے کھانے کی اجازت نہیں دی، قرآن مجید میں اجمالاً ارشاد فرمایا کہ پاکیزہ جانور حلال ہیں، اور خبیث جانور حرام ہیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا: ﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ [الأعراف:۱۵۷] یعنی سید الانبیاء ﷺ ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ نیز ﴿بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ [المائدۃ:۱] (چوپائے مویشی) کے کھانے کی اجازت دے دی، سوائے ان جانوروں کے جن کا استثناء فرمایا۔ ﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ [المائدۃ:۱] (تمہارے لیے چوپائے مویشی حلال کردیئے گئے، سوائے ان کے جن کے بارے میں تمہیں پڑھ کر سنایا جائے گا)۔ سورۂ مائدہ میں تفصیل گزر چکی ہے، اور مزید تفسیر سید الانبیاء ﷺ کے سپرد فرمایا، اور آپ ﷺ نے حلال اور حرام جانوروں کی پوری تفصیل بتادی۔

لیکن جن جانوروں کو حلال قرار دیا ہے ان کے حلال ہونے کی یہ شرط ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ اعتراض کرنے والوں نے فرق کو تو دیکھا نہیں، اور اس بات کو سمجھا نہیں کہ ذبح کرنے میں کیا حکمت ہے؟ اور ذبح کرنے سے جانور کیوں حلال ہوتا ہے؟ اور اپنی موت مرجانے سے کیوں حرام ہوتا ہے؟ یہ خون یعنی دمِ مسفوح نکلنے والی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی، جو ذبیحہ اور غیر ذبیحہ میں فرق کرنے والی چیز ہے۔

حکایت:

عیسائی پادری این پکتھال کا حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے مناظرہ ہوا۔ پادری نے یہی سوال کیا کہ عجب ہے تمہارے دین میں خدا کا مارا ہوا جانور تو حرام ہے، مگر تمہارا مارا ہوا جانور حلال ہے؟ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے الزامی جواب یہ دیا کہ عجب ہے تمہارے پاؤں کے درمیان میں خدا نے جو ٹوٹی لگوائی اس کا پانی تم حرام سمجھتے ہو، اور گھر کے صحن میں انسان کے ہاتھ کی لگی ہوئی ٹوٹی کا پانی حلال سمجھ کر پیتے ہو؟ پادری لاجواب ہو گیا۔

جب معترضین نے اعتراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے آیات بالا نازل فرمائیں، اور مسلمانوں کو خطاب فرمایا کہ جس حلال جانور پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا، اور اسے ذبح کیا گیا تو اسے کھاؤ، اور جس جانور پر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا

نام نہیں لیا گیا اسے مت کھاؤ، دشمنوں کی باتوں میں نہ آؤ، اور ان کے اعتراض کو اہمیت نہ دو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلال وحرام کی تفصیل بتادی، یہ تمہاری سعادت اور تمہارے پاکیزہ دین کی خصوصیت اور برکت ہے جن سے تمام باطل ادیان محروم اور خالی دامن ہیں، محض چند مأکولات ومشروبات کا معاملہ نہیں، اسلام نے تمہیں ہزاروں چیزوں کے متعلق جائز وناجائز، حلال وحرام تک بتادیا، حتیٰ کہ بول وبراز کے آداب بھی تمہیں بتادیئے، لہٰذا تم اپنے پاکیزہ دین کے اتباع میں زندگی گزارو، اور دشمنوں کے کہنے اور طعن وتشنیع کی پرواہ نہ کرو، یہ تمہاری شان کے خلاف ہوگا، اسی کو فرمایا:

﴿وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ﴾ اگر تم ان دشمنانِ اسلام کی اطاعت کروگے تو شرک کرنے والے ہوجاؤگے، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکموں کو چھوڑ کر اس کے دشمنوں کی باتوں کو مانے گا تو بلاشبہ وہ انہی میں سے ہو کر مشرک شمار ہوگا۔

فائدہ:

ذبح کا مطلب یہ ہے کہ جانور کے گلے کی رگیں کاٹ دی جائیں، جن سے جانور سانس لیتا ہے، اور کھاتا پیتا ہے۔ حلال جانور ذبح کرنے سے تب حلال ہوگا جب ذبح کرنے والا مسلمان ہو، اور ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ کہہ کر چھری چلائی ہو۔ یہود ونصاریٰ اہل کتاب کا مذبوحہ حلال سمجھا جاتا، مگر موجودہ زمانہ کے اہل کتاب دہریہ اور مشرک ہیں، نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے۔ اسی طرح دوسرے کفار اور زندیق اور ملحدوں کا ذبیحہ حرام ہی ہوگا۔

باقی ذبح کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جانور کے اندر جو خون ہے وہ رگیں کٹنے سے نکل جاتا ہے، خون کا کھانا پینا حرام ہے، جب حرام خون نکل گیا تو گوشت حلال ہوگیا۔ پھر فرمایا:

﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ﴾ شیطان ہو یا شیطان کے گماشتے ہوں ان کا مشغلہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ جہالت کی بنیاد پر لوگوں کو گمراہ کرنا اور بہکانا، لہٰذا ایسے ابناءِ شیاطین سے دور رہو، اور اپنا تحفظ کرو، بیشک تیرا ربّ ایسے حد سے تجاوز کرنے والوں سے پورا باخبر ہے، اور انہیں سزا دینے پر قادر ہے۔

☆☆☆

ظاہری وباطنی تمام گناہوں سے بچنے کا حکم:

﴿وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ﴾ (اور چھوڑ دو ظاہری گناہ اور باطنی گناہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ چند جانوروں کو حلال اور چند جانوروں کو حرام سمجھ کر مطمئن رہو کہ ہم دیندار مسلمان ہیں۔ اسلام ایک عالمگیر آفاقی دین ہے، اس کی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ سارے ظاہری اور باطنی گناہوں کو چھوڑ کر تمام اعمالِ صالحہ اور حسناتِ قیمہ کو اپنانا ہوگا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے تمام ظاہری اور باطنی گناہوں کے چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے، جو گناہ ظاہری طور پر علانیہ ہو وہ بھی چھوڑ دو، اور جو پوشیدہ ہو اسے بھی چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے سارے ظاہری باطنی، چھوٹے بڑے، اجتماعی انفرادی ہر قسم کے گناہوں سے باخبر ہے، پھر اس نے ہر گناہ کے لئے جو سزا مقرر کی ہوئی ہے اس کی سزا ضرور ملے گی، لہٰذا ہر قسم کے گناہ چھوڑ دو۔ اگر دنیا میں مواخذہ نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آئندہ بھی گرفت نہ ہو۔

﴿سَيُجْزَوْنَ﴾ عنقریب قیامت کا مواخذہ آنے والا ہے، وہاں ضرور تمہیں سزا ملے گی۔

﴿وَإِنَّ الشَّيٰطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ﴾ بلاشبہ شیاطین اپنے دوستوں کی طرف وسوسہ ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، یہودیوں کا اور اہل فارس کا، نیز قریش مکہ کے سوالات کا ایک ہی رخ اور مقصد تھا کہ مسلمانوں کے قلوب میں شکوک وشبہات پیدا کرنا، اور ان کے ساتھ جھگڑنا، یہ سب شیاطین کے وساوس تھے، جو اپنے دوستوں (یہود نصاریٰ مشرکین مجوس) کے دلوں میں ڈال کر انہیں سمجھا دیا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بحث ومباحثہ اور سوال کرو، چنانچہ انہوں نے سوال کیا، اور آیت کریمہ کا نزول ہوگیا۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ
لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٢﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ
كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢٣﴾

ترجمہ: جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا، اور اس کے لئے ایسا نور مقرر کر دیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کیا یہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیریوں میں ہے ان سے نکلنے والا نہیں؟ کافر جو عمل کرتے ہیں وہ ان کے لئے اسی طرح مزین کر دیئے گئے ﴿۱۲۲﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں

کے بڑوں کو مجرم بنا دیا، تا کہ وہ اس میں مکر کریں، اور وہ صرف اپنی ہی جانوں کے ساتھ مکر کرتے ہیں، اور شعور نہیں رکھتے ﴿۱۲۳﴾

معارف ومنازل

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ معالم التنزیل میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت دو خاص آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی، پھر ان دو آدمیوں کے تعین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا مراد حضرت امیر حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ (حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا ہیں، اور ﴿مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ﴾ سے ابو جہل مراد ہے۔

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ابو جہل نے ایک مرتبہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر گھوڑے کی لید پھینک دی تھی، جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اس کا پتہ چلا جو شکار کر کے ہاتھ میں کمان لئے ہوئے آرہے تھے، اور ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، ابو جہل کی حرکت کا علم ہوا تو غصہ میں پھر گئے، اور ابو جہل کے پاس آکر اس کے سر پر کمان ماردی، وہ عاجزی کرنے لگا، اور کہنے لگا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ کیسا دین لے کر آئے ہمیں بے وقوف بتاتے ہیں، اور ہمارے معبودوں کو بُرا کہتے ہیں، اور ہمارے باپ دادوں کے مخالف ہیں۔ اس پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم سے بڑھ کر بے وقوف کون ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کی عبادت کرتے ہو، پھر انہوں نے اسی وقت اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ پڑھ کر اسلام قبول کرلیا، اس پر یہ آیت کریمہ: ﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾ نازل ہوئی۔ سببِ نزول جو بھی ہو آیت کریمہ کا عموم ہر مؤمن اور کافر کو شامل ہے۔

جو لوگ پہلے کافر تھے وہ کفر کی وجہ سے مردہ تھے، جس نے اسلام قبول کرلیا وہ زندوں میں شامل ہوگیا، اور اسے نورِ ایمان مل گیا، خیر وشر کی پہچان حاصل ہوئی، وہ اسی نورِ ایمان کو لے کر لوگوں میں حسنِ اخلاق اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ پھرتا رہتا ہے، گشت کرتا ہے، اور یہ نور اسے ہر خیر کا راستہ بتاتا ہے۔ قبر میں اسے نور اور روشنی مہیا کرتا ہے، پلِ صراط پر سے پار کر کے جنت تک پہونچا دیتا ہے، پس کیا یہ نور والا مسلمان اس کافر کے برابر ہوسکتا ہے جو کفر کی ظلمتوں اور گناہوں کی اندھیریوں میں مبتلا ہو؟ جسے کبھی ظلمتوں سے نکلنے کا راستہ حاصل نہ ہو۔

تو ظاہر ہے کہ مردہ زندوں کے ساتھ، اور ظلمتوں میں مسلسل گرفتار شخص نور والوں کے ساتھ، اور کافر مسلمانوں کے ساتھ برابر نہیں ہوسکتے۔ پھر فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ جس طرح اہل ایمان کے لئے ایمان مزین کر دیا گیا ہے اسی طرح اہل کفر کے لئے ان کے اعمالِ کفر یہ مزین کر دیئے گئے ہیں، پس یہ دونوں کیسے ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے بڑوں کو مجرم بنا دیا، تاکہ یہ لوگ مکر کریں، اور ان کا مکر ان کی جانوں ہی کے ساتھ ہے، اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے اہل مکہ میں دنیاوی اعتبار سے بڑے لوگ مجرم بنے ہوئے ہیں، اسی طرح ہم نے ہر بستی میں آپ سے پہلے ایسے لوگ مقرر کئے جو ان لوگوں کے سردار تھے، اور گناہوں، تکذیبِ انبیاء ورسل علیہم السّلام میں پیش پیش تھے، شرارتیں کرنے میں بڑے ماہر تھے۔

اہلِ مکہ نے مکہ کے اطراف و جوانب میں ہر راستہ پر چار چار آدمی بٹھا دیئے تھے، تاکہ وہ باہر سے آنے والے لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ مکہ میں ایک شخص لوگوں کے آباء واجداد کے دین تبدیل کرانے میں مصروف ہیں، لٰہذا اس کے پاس نہ جائیں، اور اس کی بات نہ مانیں، کیونکہ وہ شخص جادو کا ماہر ہے، جو بھی اس کے پاس جائے گا بس اس کا ہی ہو جائے گا۔ [معالم بغوي]

دراصل ہر زمانہ، ہر علاقہ، ہر بستی کے رئیس، سردار، اہلِ اقتدار اور مالدار لوگ ہی عوام الناس پر حکومت کرتے ہیں، اور انہیں ہدایت پر نہیں آنے دیتے ہیں، نہ خود ہدایت قبول کرتے ہیں، نہ اپنے عوام کو حق قبول کرنے دیتے ہیں، جیسا کہ اب بھی پورے عالم میں اس نظریہ کا مظاہرہ ہے، یہ سلسلہ قومِ نوح علیہ السلام سے شروع ہے، جو آج تک جاری ہے، بلکہ قیامت تک یہ منحوس سلسلہ جاری رہے گا۔ اگر اس کا مشاہدہ کرنا چاہو تو سیاسی لیڈروں کے طرزِ فکر پر غور کریں۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

ترجمہ: اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے، جب تک کہ ہم کو ایسی چیز نہ دی جائے جیسے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو دی گئی، اللہ تعالیٰ جانتا ہے جہاں اپنے پیغام کو بھیجے، عنقریب ان

لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے یہاں ذلت اور سخت عذاب پہنچے گا، اس وجہ سے کہ وہ مکر کرتے تھے ﴿۱۲۴﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اگر نبوت واقعی کوئی چیز ہے تو میں تم سے زیادہ اس کا اہل ہوں، کیونکہ میری عمر بھی تم سے زیادہ ہے، اور میرا مال بھی بہت کثیر ہے (اس کے دس لڑکے بھی تھے)۔

دوسرا سببِ نزول یہ بھی ہے کہ ابوجہل نے کہا کہ بنوعبد مناف نے شرافت کے سلسلے میں ہم سے مقابلہ بازی کی، یہاں تک کہ ہم گھوڑ دوڑ کے گھوڑے بن کر رہ گئے، اب وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی قسم ہم اس مدعی نبوت پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے پاس بھی اسی طرح کی وحی نہ آجائے جس طرح اس کے پاس آتی ہے۔ [معالم التنزیل وغیرہ]

ربط:

گزشتہ آیت میں فرمایا تھا کہ ہر بستی کے بڑے لوگ عموماً مجرم ہی ہوتے ہیں۔ آیت بالا میں مکہ معظمہ کے دو مجرموں کی نشاندہی ہو رہی ہے، جیسا کہ شانِ نزول میں ان کے نام آئے: ولید بن مغیرہ اور ابوجہل بن ہشام۔ علیهم اللعنة۔

اسی طرح یہ لوگ نبوت کو ایک قومی منصب سمجھتے ہوئے اکثر کہا کرتے تھے کہ قبیلہ کے اعتبار سے اور تجارت و مالداری اور قومی لحاظ سے ہم بہت بڑے ہیں، تو یہ منصب ہمیں کیوں نہیں ملا؟ جس کے حقدار ہم تھے، یہ ایک ایسے شخص کو کیوں ملا جو ذاتی منقبت وشرافت و امانتداری کے علاوہ ہر اعتبار سے ہم سے کمزور اور پسماندہ ہے؟ اور کبھی کہتے: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ [الزخرف: ۳۱] (یہ قرآن دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا؟)۔

چاہئے تھا کہ اس قرآن کا نزول مکہ اور طائف کے بڑے کسی سردار پر ہوتا، ایک ایسے شخص پر کیوں نازل ہوا جو یتیم ہے، اور سردار نہیں، بے مال ہے، مالدار نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ شانہ نے آیت بالا نازل فرمائی، جس میں ولید بن مغیرہ اور ابوجہل وغیرہ سب کا جواب ہوگیا۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ رسالت و نبوت سے سرفراز کرنا یہ اللہ تعالیٰ شانہ کے اختیار اور انتخاب سے متعلق ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس عظیم الشان عہدہ سے سرفراز فرماتا ہے، اور اسے معلوم ہے کہ اس عظیم منصب کا اہل کون ہے، اور اس عہدۂ جلیلہ کا تحمل کس میں ہے، اس عہدہ کا تعلق کسی سرداری، کسی مالداری کے ساتھ نہیں، اس کے حاملین کی تربیت زمانۂ رضاعت سے لے کر زمانۂ بعثت تک ربّ العزّت سبحانہ کی نگرانی میں ہوتی ہے۔

پس تمہارا یہ کہنا کہ ہم لوگ رسالت کے مستحق اور اہل ہیں، کیونکہ ہم سردار اور مالدار ہیں، یہ ایک قسم کا تکبر و غرور اور اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے، اور ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے سخت ترین ذلّت کا عذاب مقرر کیا ہوا ہے۔

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ ☆ اتنا نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت

نبوت و رسالت کا حقدار وہ ذات عالی صفات ہے جس نے پیدائش کے وقت اللہ أکبر کبیراً کا وظیفہ پڑھا، اور چالیس سال کا عرصہ تمہارے اندر گزارا کوئی سوئی کے سوراخ جتنا عیب تم نے اس میں نہیں دیکھا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ‌ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا
حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ‌ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿١٢٥﴾

ترجمہ: سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرمائے اس کے سینہ کو ہدایت کے لئے کھول دیتا ہے، اور جس کے بارے میں یہ ارادہ فرمائے کہ اس کو گمراہ فرمائے اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے، گویا کہ وہ بڑی تکلیف کے ساتھ آسمان میں چڑھ رہا ہے، ایسے ہی ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ عذاب بھیج دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے ﴿١٢٥﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیت میں ان لوگوں کا بیان تھا جنہوں نے اپنے لئے منصبِ نبوت کا تقاضا کیا تھا، اس آیت میں ایسے لوگوں کا جواب ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے عام ہدایت کا حقدار نہیں سمجھا، نبوت تو دور کی بات ہے، آیاتِ قرآنی سن کر آیاتِ تکوینی دیکھ کر پھر بھی ہدایت کی طرف نہ آنا، اور ایمان قبول نہ کرنا سوائے شقاوت و محرومی کے کچھ نہیں، اس حوالہ سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، اور بہت سے لوگ خاص کر مالدار سردار اور قبیلوں کے نامور لوگ اپنے کفر پر جمے رہے۔

اس آیت میں اسی چیز کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو ہدایت دینا چاہتے ہیں تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں، اس کے دل میں اسلام کی طرف سے کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا، اور کفر کے نقصانات اس پر واضح ہو جاتے ہیں، پس وہ بلا خوف وخطر بغیر کسی تردد کے بخوشی اسلام کے حلقہ میں قدم رکھتا ہے، اور پورے اخلاص کے ساتھ اسلام قبول کر لیتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہی میں باقی رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سینہ کو اسلام کے بارے میں تنگ کر دیتا ہے، اسلام کی دعوت اور نام سن کر اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے، اور اسلام قبول کرنا اسے ایسا سخت گلوگیر اور دشوار معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بڑی مصیبت کے ساتھ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ آسمان پر (یا کسی بلندی پر) چڑھ رہا ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا، یعنی اس آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا کہ: جب نور ایمان سینہ میں داخل ہو جاتا ہے تو سینہ کھل جاتا ہے، عرض کیا گیا: یارسول اللہ! کیا کوئی ایسی نشانی ہے جس کے ذریعہ اس کو معلوم کیا جا سکے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! وہ نشانی یہ ہے کہ دار الغرور یعنی دنیا سے بے رغبتی ہو، اور دار القرار آخرت کی طرف اشتیاق اور رجوع ہو، اور موت سے پہلے اس کی تیاری ہو۔ [مشکوۃ]

سینہ کی تنگی کا مطلب بتاتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ شانہ کا ذکر کیا جائے تو دل میں انقباض آجائے، اور گھبراہٹ محسوس ہو، اور اگر بتوں (یاد دنیا اور اس کی لذّت کی) عبادت کا ذکر آجائے تو دل میں خوشی کی کیفیت طاری ہو۔ [معالم] جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ [الزمر:۴۵] (اور جب کبھی تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل بیزار ہو جاتے ہیں، اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ لوگ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں)۔

مشرک کا خاصہ ہے کہ جب حق تعالیٰ جلّ شانہ کی قدرت وعظمت اور اس کے علم کی لامحدود وسعت کا بیان ہو تو ان کے چہروں پر انقباض کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، اور جب بتوں، دیوتاؤں یا پیروں اور فقیروں کی کہانی بیان ہو تو ان کے چہرے روشن ہوتے ہیں۔ آج کل بھی یہی دور ہے۔

تو مؤمن کو چاہئے کہ اپنے ایمان، شرح صدر، اور نورانی اعمال پر شاداں وفرحاں خوب خوش ہو کر اللہ تعالیٰ

عزّ سبحانہ کا شکر بجالائے، اور استقامت کی دعا بھی کرے۔ پھر فرمایا:

﴿يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ﴾ اللہ تعالیٰ ایسے ہی عذاب بھیج دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔

یہاں علماء تفسیر نے "رِجس" کے کئی معنی بیان کئے ہیں۔ روح المعانی میں اولاً عذاب اور خذلان (رسوائی) کا ترجمہ کیا ہے۔ پھر حضرت مجاہد تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ: اَلرِّجْسُ مَالَا خَيْرَ فِيْهِ۔ یعنی جس میں کوئی خیر نہ ہو وہ رجس ہے۔ پھر علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ: اَلرِّجْسُ السَّيِّئُ الْقَذِرُ۔ یعنی ناپاک چیز۔ اور زجاج رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے: هُوَ اللَّعْنَةُ فِي الدُّنْيَا وَالْعَذَابُ فِي الْاٰخِرَةِ۔ یہاں یہ سب معانی مراد ہو سکتے ہیں کہ سینہ کی تنگی، اور "رِجس" بے ایمانوں کے لئے مقدر ہے۔

……❁……❁……❁……

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ
اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ
وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ
اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ: اور یہ آپ کے ربّ کا سیدھا راستہ ہے، بے شک ہم نے واضح طور پر اُن لوگوں کے لئے آیات بیان کردی ہیں جو نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۲۶﴾ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے ربّ کے پاس، اور وہ جو اعمال کرتے ہیں ان کے سبب اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے ﴿۱۲۷﴾ اور جس دن ان سب کو جمع کرے گا، اے جنات کی جماعت! تم نے انسانوں میں سے کثیر تعداد کو اپنا تابع کرلیا، اور انسانوں میں جو ان کے دوست تھے وہ کہیں گے کہ: اے ہمارے ربّ! ہم میں بعض نے بعض سے نفع حاصل کیا، اور ہم پہنچ گئے اس مقررہ میعاد کو جو آپ نے ہمارے لئے مقرر فرمائی، فرمانِ خداوندی ہوگا کہ دوزخ تمہارا ٹھکانہ ہے، اس میں ہمیشہ رہوگے، سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ چاہے، بے شک تیرا ربّ حکمت والا ہے، علم والا ہے ﴿۱۲۸﴾ اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض کا ولی بناتے ہیں، بسبب ان کے اعمال کے جو وہ کرتے ہیں ﴿۱۲۹﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے مومن کے شرحِ صدر، اور کافر کی تنگی سینہ کا بیان فرمایا، اب عمومی دعوت کا تذکرہ ہے کہ تیرے رب کا ایک ہی راستہ صراط مستقیم ہے، آپ سب کو اس کی طرف دعوت دے دیں۔

دینِ اسلام تیرے ربّ کا راستہ ہے جو سیدھا راستہ ہے، اس میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہے، اس کی دعوت بھی واضح ہے، جو لوگ نصیحت قبول کرنے والے ہیں ان کے لئے واضح طور پر آیات بیان کر دیں، پھر صراط مستقیم پر چلنے والوں کے لئے دو عظیم انعام ذکر فرمائے۔

اوّل یہ کہ ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس "دارالسلام" ہے، یعنی سلامتی کا گھر (آٹھ جنتوں میں سے ایک جنت کا نام ہے)۔ اس سے مراد مطلق جنت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جنت میں ہر طرح کے مصائب اور تکالیف و پریشانیوں سے مکمل سلامتی ہوگی، نہ جسمانی تکلیف ہوگی، نہ روحانی، نہ آپس میں بغض ہوگا، نہ کینہ ہوگا، نہ حسد ہوگا، نہ دشمنی ہوگی، نہ عیب جوئی ہوگی، نہ طنز و بدگمانی ہوگی، اور نہ نعمتوں کے ختم ہونے یا کم ہونے یا چھننے کا اندیشہ ہوگا۔

جنتی جب جنت میں داخل ہوں گے تو فرمایا جائے گا: ﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ﴾ [الحجر:٤٦] (داخل ہو جاؤ جنت میں امن وامان اور سلامتی کے ساتھ)۔ اور اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی سلام ہوگا، جیسے سورۂ یٰس میں ارشاد ہے: ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ [یس:٥٨] (رحمت والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا)۔ خلاصہ یہ ہے کہ جنت دارالسلام ہے، وہاں خوشی ہی خوشی اور سلامتی ہی سلامتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں نصیب فرمائے۔ آمین

دوسرے انعام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے بسبب ان کے اعمال کے جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی ولایت اور دوستی وہ عظیم نعمت ہے جو کہ آٹھوں جنتوں سے بھی بلند و بالا اور افضل ہے، بلکہ دخولِ جنت کی علّت بھی ہے۔ یہ نعمتِ عظمیٰ مؤمنوں کو ایمان اور تقویٰ کے صلہ میں میسر آئے گی، جس سے غیر مسلم محروم ہی رہیں گے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرۃ:٢٥٧] (اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ایمان لایا ہے، ان کو نکال لاتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف)۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ [سورۃ محمد ﷺ:١١] (یہ اس لئے کہ اللہ کارساز ہے

ان لوگوں کا جنہوں نے ایمان لایا ہے، اور یہ کہ کافروں کا کوئی کارساز نہیں)۔

زہے سعادت! کہ مومنین کے لئے اپنی ولایت ودوستی کا خود اعلان فرمارہے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان وہ عظیم نعمتِ کبریٰ ہے جس کی قیمت ہر چیز سے زیادہ اور بالاتر ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے ایمان کو سلامت رکھیں، اور معاصی میں ملوث نہ کریں، اس کے بعد قیامت کے دن انسان اور جنات (شیاطین) سے جو سوالات ہوں گے ان میں سے ایک سوال کا ذکر فرمایا:

﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا﴾ جس دن اللہ تعالیٰ شانہ ان سب کو یعنی انسانوں اور جنات کو محشر میں جمع فرمائے گا، اور جنات سے یوں خطاب ہوگا:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ﴾ اے جنات کے گروہ! تم نے کثیر تعداد میں انسانوں کو اپنے تابع کرلیا، اور ایمان سے انہیں محروم کیا۔ جب ابلیس مردود ہوا تھا اس نے کہا تھا: ﴿لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ [الحجر: ٣٩] (ضرور بضرور میں ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے اپنے لیے مخلص بنالیا ہو)۔ ﴿لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ [النساء: ١١٨] (میں ضرور بضرور تیرے بندوں سے ایک طے شدہ حصہ لے کر رہوں گا)۔ ﴿لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ [الأعراف: ١٦] (میں ضرور بضرور تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ رہوں گا، پھر میں ان پر حملے کروں گا، ان کے سامنے سے بھی، اور ان کے پیچھے سے بھی، اور ان کی دائیں طرف سے بھی، اور ان کی بائیں طرف سے بھی۔ اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا)۔

ابلیس نے قسم کھا کر کہا کہ میں اولادِ آدم کو بکثرت کافر، مشرک اور گمراہ کر کے رہوں گا، چنانچہ اس نے جو کہا تھا وہ برابر اپنی کوشش میں لگا ہوا ہے، اور اس کی ذرّیت بھی اس کی کوششوں میں اس کی معاون اور مددگار ہے، اور انسانوں کی غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے شیاطین اپنی محنت میں نمایاں کامیاب ہیں، انہوں نے اکثر انسانوں کو اپنا بنا لیا ہے۔ قیامت کے روز ہزار میں سے صرف ایک فرد جنتی ہوگا، جبکہ نوسو ننانوے (٩٩٩) سب ابلیس کے ساتھی اور جہنمی ہوں گے۔

صراط مستقیم پر چلنے والے لوگ ہر زمانہ میں اتنے قلیل تعداد میں ہوں گے جیسے آٹے میں نمک، شیاطین سے

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ انسانوں میں سے اکثر تعداد کو تم نے اپنا بنالیا، اور ان کو صراط مستقیم سے ہٹادیا۔

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کا یہ خطاب توبیخ وزجر کے طور پر ہوگا، جس کا نتیجہ آگے آرہا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَقَالَ اَوۡلِيٰٓـؤُهُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ﴾ اور شیاطین کے دوست یعنی کفار جو انسانوں میں سے تھے، جنہوں نے حق تعالیٰ جلّ شانہ کی دوستی پر ابلیس کی دوستی کو ترجیح دی، اور اس کے گروہ میں شامل ہوگئے تھے، اور صراط مستقیم پر چلنے سے انکاری ہو چکے تھے، وہ یہ کہیں گے یعنی بصد شرمندگی وافسوس کے ساتھ کہ: اے ہمارے ربّ! ہم میں سے بعض نے بعض سے انتفاع پایا، یعنی ہم نے شیاطین سے اور شیاطین نے ہم سے فائدے حاصل کئے، جو وبالِ جان ثابت ہوا۔

صاحب روح المعانی نے حضرت حسن بصری اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہما وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ انسانوں کا شیاطین سے نفع حاصل کرنا یوں تھا کہ جب ان میں سے کوئی شخص سفر پر جاتا، اور جنات کا خوف ہوتا، تو جس منزل پر اترتا یوں کہتا: اَعُوۡذُ بِسَيِّدِ هٰذَا الۡوَادِیۡ۔ (میں اس وادی کے سردار کی پناہ لیتا ہوں)۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی پناہ لینے کی بجائے شیاطین کی پناہ لیتے تھے، اور شیاطین کا انسانوں سے نفع حاصل کرنا یہ تھا کہ جب یہ لوگ اَعُوۡذُ بِسَيِّدِ هٰذَا الۡوَادِیۡ کہتے تھے تو جنات بڑے خوش ہوتے، اور کہتے تھے کہ دیکھو انہوں نے ہم کو پناہ دینے پر قادر سمجھا، اور جو پناہ انہیں اللہ تعالیٰ شانہ سے مانگنی چاہئے تھی وہ ہم سے مانگی۔ تفصیل سورۃ الجن میں دیکھیں۔

انسانوں کا گروہ آپس میں ایک دوسرے سے نفع حاصل کرنے کا اقرار کرنے کے بعد یوں کہے گا کہ:

﴿وَّبَلَغۡنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِيۡۤ اَجَّلۡتَ لَنَا﴾ اور ہم پہنچ گئے اس مقرر میعاد کو جو ہمارے لئے آپ نے مقرر فرمائی تھی، اس اجل یعنی مقرر میعاد سے بعض حضرات نے موت، اور بعض نے قیامت کا دن مراد لیا ہے، انسانوں (کافروں، جہنمیوں) کا گروہ یہ بات بطور اقرار جرم کہے گا، جس میں اظہارِ ندامت بھی ہے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟ اگر ایسا نہ کرتے تو تباہ نہ ہوتے۔ اب ربّ العزّت عزّ وجلّ کا فیصلہ ہوگا:

﴿قَالَ النَّارُ مَثۡوٰٮكُمۡ﴾ ارشاد ہوگا کہ تمہارے ٹھہرنے کی جگہ دوزخ ہے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے روزِ اول ابلیس کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ وَمِمَّنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ﴾ [ص: ۸۵] (میں ضرور دوزخ کو بھردوں گا تجھ سے اور ان تمام لوگوں سے جو تیرا اتباع کریں گے)۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ زَوَالِ

الْاِیْمَانِ وَمِنِ اتِّبَاعِ الشَّیْطٰنِ۔ اٰمِیْن

اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے یہ اعلان اسی وقت فرمادیا تھا جب ابلیس نے تکبر کیا، اور اس نے بنی آدم کو بہکانے اور گمراہ کرنے کی قسم کھا کر اپنا مضبوط ارادہ ظاہر کیا۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے اس کے دعوے پر اسے اور اس کے ماننے والوں کو دوزخ میں ڈالنے کا فیصلہ صادر فرمایا۔ اسی کے مطابق آج دوزخ میں شیطان کے ماننے والوں کا ٹھکانا ہوگا:

﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ﴾ یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ مگر یہ کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے، یعنی اگر وہ چاہے تو دوزخ سے نکال سکتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، مگر قانون اور ضابطہ اس نے یہ مقرر کیا ہوا ہے کہ کافروں کے لئے جہنم ان کا ابدی ٹھکانہ ہے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا﴾ [النساء:۵۷] (جہنم میں ہمیشہ رہیں گے)۔ بعض علماء مثلاً علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے مناقشہ کا جواب سورۂ نبأ کی آیت: ﴿لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا﴾ [النبأ:۲۳] (جس میں وہ مدتوں رہیں گے) کے ضمن میں دیا جائے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

فائدہ:

بعض علماء کرام نے ﴿رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ﴾ کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ کفار نے ابلیس سے بہت سارے فوائد حاصل کئے، مثلاً یہ کہ ابلیس نے انہیں گمراہ کرکے ایمان، عباداتِ شاقّہ، طاعاتِ شاقّہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، انفاق مال فی سبیل اللہ، جہاد اور دیگر تمام احکامِ الٰہی سے چھٹی دلا کر ہر قسم کی تکالیفِ شرعیہ سے بچا کر انہیں آسودہ رکھا، یہ بہت بڑا فائدہ انہوں نے ابلیس کے کہنے پر حاصل کیا، اور ان کفار نے ابلیس کو یہ فائدہ دیا کہ اس کی سرپرستی قبول کرکے اس کی بات مانی، اور اس کے تمام عزائم پر چل کر اس کو تنہا نہیں چھوڑا، اس کی حوصلہ افزائی کی، اور اسے ایسا سمجھو کہ انہوں نے ووٹ دے کر کامیاب کرانے کی کوشش کی۔ واللہ أعلم وعلمه أتم

پھر فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضًا﴾ اور اسی طرح ہم بعض ظالموں کو بعض کا ولی بناتے ہیں بسبب ان کے اعمال کے جو وہ کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾ [البقرة:۲۵۷] (اور جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں)۔

پس ظالمین سے مراد ابلیس اور اس کے فرمانبردار کفار مراد ہوئے، جن کے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان:۱۳] (بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔اور شیاطین ان کے، اور یہ شیاطین کے بڑے دوست ہی ہیں۔ یہ معنی نہایت دقیق اور برمحل بھی ہے کہ ظالم شیاطین اور ظالم کفار کے درمیان موالات ہے۔دوسرے معنی یہ ہیں کہ ظالمین سے صرف کفار مراد ہوں، تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم ظالموں (کافروں) کو آپس میں ایک دوسرے کا دوست بناتے ہیں، جیسے دنیا میں ہر وقت اس کا مظاہرہ اور تجربہ ہوتا رہا ہے، اور وہ اسی دوستی کی وجہ سے آپس میں ایک ہو کر اتحاد کرتے ہیں، اور اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی میں ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔

اور بعض حضرات نے "نُوَلِّیْ" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز ظالموں کو قریب کر کے ان کا حشر اکٹھا کریں گے، یعنی قیامت کے روز مختلف قسم کے لوگوں کی جماعتیں بنادی جائیں گی، مثلاً نمازیوں کی جماعت الگ، مجاہدین کی الگ، علماء کی الگ، وغیرہ۔ یہ روایت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کی تفصیل ﴿وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ [التکویر:۷] یعنی سورۃ التکویر کے فوائد میں آئے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

....

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝۱۳۰ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝۱۳۱ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۳۲ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝۱۳۳ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۱۳۴ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۳۵

ترجمہ: اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے؟ وہ میرے احکام بیان کرتے تھے، اور تم کو اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے، وہ جواب دیں گے کہ: ہم اپنی جانوں پر گواہی دیتے ہیں، اور ان کو دنیا والی زندگی نے دھوکہ میں ڈالا، اور وہ اپنی جانوں پر گواہی دیں گے کہ بلاشبہ وہ کافر تھے ۝۱۳۰ یہ اس وجہ سے کہ تیرا ربّ بستیوں کو ظلم کے سبب ہلاک کرنے والا نہیں ہے اس حال میں کہ وہاں کے لوگ بے خبر ہوں ۝۱۳۱ اور ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کے سبب درجات ہیں، اور تیرا ربّ ان کاموں سے غافل نہیں ہے جو کام وہ کرتے ہیں ۝۱۳۲

اور تیرا ربّ غنی ہے، رحمت والا ہے، اگر وہ چاہے تو تمہیں ختم کردے، اور تمہارے بعد تمہارے پیچھے جس کو چاہے آباد کردے، جیسا کہ اس نے تمہیں دوسری قوم کی نسل سے پیدا فرمایا(۱۳۳) بلاشبہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور آنے والی چیز ہے، اور تم عاجز نہیں کرسکتے (یعنی روک نہیں سکتے)(۱۳۴) آپ فرمادیجئے: اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو، بلاشبہ میں عمل کررہا ہوں، سو عنقریب جان لوگے کہ کس کے لئے ہے اس عالم کا انجام کار، بے شک کامیاب نہیں ہوتے ظالم لوگ(۱۳۵)

معارف ومنازل

سورۂ ملک میں ارشاد ہے: ﴿كُلَّمَآ اُلۡقِیَ فِیۡهَا فَوۡجٌ سَاَلَهُمۡ خَزَنَتُهَآ اَلَمۡ یَاۡتِكُمۡ نَذِیۡرٌ○قَالُوۡا بَلٰی قَدۡ جَآءَنَا نَذِیۡرٌ ۙ فَكَذَّبۡنَا وَقُلۡنَا﴾ [الملک:] (جب بھی جہنم میں کوئی گروہ پھینکا جائے گا تو اس کے محافظ ان سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ ہاں! بیشک ہمارے پاس خبردار کرنے والا آیا تھا، مگر ہم نے جھٹلادیا) یہ مضمون قرآن حکیم میں بہت سے مقامات میں مذکور ہے۔

ان آیات میں بھی اسی مضمون کا حوالہ دیا جارہا ہے کہ دونوں جماعتوں (جن وانس) کے مجرمین کافرین جو میدانِ محشر میں موجود ہوں گے ان سے ربّ العزّت جلّ جلالہ فرمائیں گے کہ: اے جنات، اے انسانو! کیا تمہارے پاس تم میں سے پیغمبر نہیں آئے؟ جو تمہیں میرے احکام خاص کر توحید بتاتے تھے، اور تمہیں آج کے دن کی حاضری سے اور اعمال کے نتائج کے سامنے آنے سے باخبر کرتے تھے، اور تمہیں میرے عذاب سے ڈراتے تھے، کہ دیکھو! ایک سخت دن ایسا آنے والا ہے، تم اس کے لئے فکرمند ہوجاؤ، اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرکے ایمان لاؤ۔

اوّل تو مجرمین اقرارِ جرم سے گریز ہی کریں گے، اور اپنے کفروشرک کا انکار ہی کریں گے، جیسا کہ دوسری آیت میں ان کا قول مذکور ہے، یعنی: ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشۡرِكِیۡنَ﴾ [الأنعام: ۲۳] (ہمارے پروردگار اللہ کی قسم ہم شرک کرنے والے تھے)۔ پھر ﴿اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیۡدِیۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ﴾ [یٰس: ۶۵] (آج کے دن ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے، اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کمائی کیا کرتے تھے)۔

یہ مرحلہ بڑا خطرناک اور رسواکن ہوگا کہ سارے اعضاء انسان کے خلاف فرفر بیان دینا شروع کریں گے۔

پس یہ مجرم اپنے ہاتھوں اور پیروں کی گواہی سے، اور حضرات انبیاء اکرام علیہم السلام کی گواہی کی وجہ سے مجبور وشرمندہ ہوکر اقرار کریں گے:

﴿قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا﴾ وہ کہیں گے کہ اپنی جانوں کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں کہ واقعی ہم مجرم تھے، اور واقعی ہم کافر تھے۔ درمیان کلام میں ان کی سرکشی اور کفر وشرک کے سبب کا بیان ہے:

﴿وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا﴾ ان ناداں اور ناعاقبت اندیش لوگوں کو دنیاوالی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا، دنیاوی زندگی کو انہوں نے اصل اور آخری منزل سمجھا، اور چندروزہ منافع ولذات اور ثمرات وشہوات ہی کے پیچھے پڑے رہے، اور: ﴿اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ﴾ [الأنعام:۲۹] (بس یہی ہماری دنیاوی زندگی ہے، اور ہم اٹھائے جانے والے نہیں ہیں) کہتے رہے۔

مصلحین، مُبلّغین اور ناصحین کو مجنون و پاگل کہتے رہے، اور خود کو عقلمند وفرزانہ سمجھتے رہے۔

﴿ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ یَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى﴾ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [الإسراء:۱۵] (اور ہم کبھی کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک کوئی پیغمبر نہ بھیج دیں)۔ یعنی یہ رسولوں کا بھیجنا اس وجہ سے ہے کہ تیرا ربّ بستیوں کو یعنی بستیوں میں رہنے والوں کو ان کے ظلم کے سبب اس طرح ہلاک نہیں فرماتا کہ وہ لوگ اپنے ظلم کے انجام سے بے خبر ہوں۔ اللہ جلّ شانہ رحمٰن ورحیم پیغمبر بھیجتا ہے، جو لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہیں، توحید اختیار کرنے والوں کا اچھا انجام، اور مشرکوں کافروں کا بدتر انجام بتاتے ہیں، اور خیر وشر دونوں کی تعلیم دیتے ہیں۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ سب کچھ بتادینے کے بعد جب لوگ باز نہیں آتے تو اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ان لوگوں کی ہلاکت کا فیصلہ ہوجاتا ہے، ہلاکت کا سبب بھی بتادیا کہ وہ ظلم ہے، ہر گناہ ظلم ہے، اور کفر و شرک سب سے بڑا ظلم بھی ہے، اور خالق ومالک سے بغاوت بھی ہے۔ نعوذ باللہ

اعمال کے اعتبار سے لوگوں کے درجات مختلف ہوتے ہیں:

فرمایا: ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ (ہرایک کے لئے اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف درجات ہیں) جیسے ثواب والوں کے باعتبارِ حسنات ونیکیوں کے مختلف درجات ہیں، اسی طرح عقاب والوں کے باعتبار معاصی وسیات بھی مختلف درجات ہیں، اور جس نے جو کچھ کیا اپنے عمل کے اعتبار سے ثواب وعقاب پائے گا۔

﴿وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ تیرا ربّ ان کاموں سے بے خبر نہیں جو وہ کرتے ہیں، اس میں واضح فرمایا کہ حساب لینے والا، جزا و سزا دینے والا بنسبت تمہارے اپنے بندوں کے اعمال سے زیادہ باخبر ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ میری زندگی کے اعمال کا مجھے حساب یاد نہیں، تو اللہ تعالیٰ کو بے حساب بندوں کے بے حساب اعمال کا پھر کیسے علم ہوگا؟ پس اسے معلوم ہونا چاہئے کہ ریت کے ذرات، سمندروں کے قطرات، درختوں جڑی بوٹیوں کے پتے، انسانوں، جانوروں کے بالوں کی تعداد، بے شمار مخلوقات کے دلوں کی حرکات، غرض کائنات کی تمام چیزوں کے حالات حضرت حق سبحانہٗ وتعالیٰ شانہ کے علمِ محیط میں ازل سے ابد تک محفوظ ومرکوز ہیں۔ ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [البقرۃ: ۲۹] (وہ ہر چیز سے باخبر ہے)۔ ساتوں سمندروں کی تہہ میں چلنے والی چیونٹی کے پاؤں کی حرکت کی آواز وہ اپنے عرش پر سنتا ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ الَّذِيْ يَسْمَعُ دَبِيْبَ النَّمْلَةِ السَّوْدَاءِ عَلَى الصَّخْرَةِ الصَّمَّاءِ تَحْتَ ظُلُمَاتِ الْبِحَارِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ سُبْحَانَهٗ۔

فرمایا: ﴿وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ﴾ تیرا ربّ غنی ہے، بے نیاز رحمت والا ہے۔ کیا لطف ونزاکت، اور کیسا پاکیزہ باعظمت خطاب ہے؟ بار بار ارشاد ہوتا ہے: "وَرَبُّكَ" جس کے تصور سے مردہ دل زندہ ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! اسے کسی چیز اور کسی عمل کی حاجت نہیں۔ ہاں! ساری کائنات اس کی محتاج ہے، وہ اپنی مخلوق پر رحم کرتا ہے، مانگنے والوں سے زیادہ خوش ہوتا ہے، وہ وجود بھی بخشتا، رزق بھی بخشتا ہے، ساری حاجتوں کو پوری کرتا ہے، اس کی اتنی کرم نوازیاں ہیں جنہیں عمر بھر شمار نہیں کیا جاسکتا، ایک نیکی کا ثواب دس گنا سے شروع کر کے بیس لاکھ تک بڑھا دیتا ہے۔ [درمنثور]

جان زتن بردی ودر جانی ہنوز ☆ دردہا دادی ودر مانی ہنوز
قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ ☆ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

[امیر خسرو]

درد دو عالم ہیچ نہ بینم غیر تو ☆ بس ترا دانم ترا خواہم زتو (آمین)
درد دو عالم ہیچ نہ بینم غیر تو ☆ بس ترا بینم ترا خواہم زتو

پھر فرمایا: ﴿اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ﴾ اگر پروردگارِ عالم جل شانہ چاہے تو تمہیں ختم کردے، اور تمہارے بعد تمہارے پیچھے تمہاری جگہ اپنی زمین پر دوسروں کو آباد کردے، جیسے کبھی کبھار تم

بھی ایسا کرتے ہو کہ تمہارے پاس کوئی مال ہوتا ہے، ردی ناکارہ جس سے تمہارا مطلب اور مقصد پورا نہیں ہوتا، اور ہر وہ چیز جو تمہارے کام کی نہیں انہیں ختم کرتے ہو، اور اس کی جگہ کارآمد چیز لے آتے ہو۔ قرآن حکیم نے سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس سے بھی واضح فرمایا: ﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ﴾ [محمد (ﷺ):۳۸] (اور اگر تم منہ موڑو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے)۔

آپ لوگ خود دیکھو، تمہاری موت وحیات، قومی عروج وزوال، تمہارے ہاتھ میں ہے ہی نہیں، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ آج وہ تمہارے دادے پردادے کہاں ہیں؟ وہ جن کی نسل سے تم ہو، جس طرح تدریجی طور پر پرانی ایک نسل کے بعد دوسری نسل لانے پر اللہ تعالیٰ شانہ قادر ہے، اسی طرح سے وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ ایک ہی بار میں سب کو ختم کردے، پھر ان کی جگہ دوسروں کو آباد کردے۔ وہ تو بے نیاز ہے، تم بے نیاز نہیں ہو، محتاج اور لاچار ہو، صبح ہنستے شام کو روتے ہو، ایک کمزور مخلوق ہو، اور کتنے ناداں احمق ہو جو اپنی حقیقت سے بے خبر ہو؟ اور اپنے منعم ومحسنِ حقیقی جل شانہ سے غافل ہو، اسے چھوڑ کر اپنے ہاتھوں کے تراشیدہ بتوں اور مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ ﴿أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ [الأنبياء:٦٧] (تف ہے تم پر، اور ان پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو)۔

دار الاسباب دنیا میں یہ بت تمہیں نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتے، تو دار الجزاء آخرت میں تمہیں یہی جہنم رسید کریں گے، خوب غور کرو، ایمان لاؤ، اعمالِ صالحہ کا التزام کرکے ابدی سعادتوں کے حقدار بنو، تمہارا ربّ جل شانہ تمہارے ایمان اور اعمال سے غنی اور بے پرواہ ہے، جبکہ تم قدم قدم پر اس کی رحمتوں کے محتاج ہو۔ پھر فرمایا:

﴿إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾ بلاشبہ جس قیامت کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور آنے والی ہے، اس کی آمد حتمی اور پختہ ہے، اسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ منسوخ کرسکتا ہے، نہ آگے پیچھے کرسکتا ہے، اس کے لئے جو گھڑی مقرر ہے وہ صرف تمہارے ربّ کے پاس ہے، وہ کسی نبی ورسول کو بھی معلوم نہیں، تم اسے جلدی مانگتے ہو، یہ تمہاری حماقت ہے، تم اسے آسان سمجھ کر اس کی آمد کا مطالبہ کرتے ہو، وہ آسان نہیں، وہ شیٔ عظیم اور نبأ عظیم ہے، اور فزع اکبر ہے، اس کی آمد پر تمہارے یہ خوبصورت وخوشحال چہرے مسخ ہوکر سیاہ ہوجائیں گے۔ ﴿فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سِيئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [الملک:۲۷] (پھر جب وہ قیامت کو پاس آتا دیکھ لیں گے تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے)۔

وہ قیامت جب آئے گی تو پورے آب وتاب کے ساتھ آئے گی، یہ پورا جہاں اور پورا نظام درہم برہم ہوکر کھنڈرات بن جائیں گے، بڑے بڑے پہلوان حکمران جنہوں نے اُلوہیت تک کا دعویٰ کیا تھا، اور ہزار سال بادشاہت کی تھی، وہ گھٹنوں کے بل گر جائیں گے، اور منہ میں مٹی ڈال کر اَلْوَیْلُ اَلْوَیْلُ پکاریں گے۔ تم اسے آسان سمجھ کر حماقت نہ کرو، بلکہ سخت اور تباہ کن جانتے ہوئے اس کے لئے تیاری کرو۔

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مَنْ جَاءَ بِجَوَازٍ جَازَ وَاِلَّا سَقَطَ فِی النَّارِ ذَاتِ الْخُلُودِ۔ جس کے پاس ایمان والا پاسپورٹ ہوگا وہ پل صراط پر سے آگے جنت کے لئے پار ہوگا، نہیں تو ہمیشہ کے لئے جہنم میں گر جائے گا، جس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا، اس لئے آگے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ آپ فرما دیجئے: اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو، میں بھی اپنے طور پر عمل کرتا رہوگاں۔ تو ظاہر ہے کہ میرا عمل برحق صحیح اور شرعی ہے، جبکہ تمہارے اعمال مشرکانہ کافرانہ اور غیر شرعی ہیں، ابھی تم نہیں مانتے ہو، تو انتظار کرو آنے والی قیامت کے دن ﴿فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾ تمہیں خود پتہ چلے گا، جب صحیح اور باطل کا، اور کھرے کھوٹے کا راز کھل جائے گا اس وقت تمہیں اپنے کفر وشرک کا برا انجام آمنے سامنے ہوجائے گا۔

جب تمہاری یہ آنکھیں بند ہوجائیں گی، اور آخرت والی آنکھیں کھل جائیں گی، تو تمہیں دیکھ کر افسوس ہوگا کہ ہم اپنے کو کچھ سمجھ رہے تھے، لیکن اب پتہ چلا کہ نفع والے ایمان اور اعمالِ صالحہ والے تھے، اور ہم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ لیکن وہاں سمجھ لینے کا فائدہ کچھ بھی نہ ہوگا، اگر سمجھنا ہو تو یہاں دنیا میں سمجھ کر ایسا ایمان اور اعمال کا ذخیرہ جمع کر لے جو آنے والے جہاں میں سعادت اور سرخ روئی کا ذریعہ ہے۔

﴿اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ بلاشبہ ظالموں کو فلاح نصیب نہ ہوگی۔

فلاح ہمیشہ حق پرستی کے ساتھ وابستہ ہے، جس کے لئے صداقت اور اخلاص شرط ہے، ظالم یعنی مشرک وکافر، اسی طرح منافق، بے دین اور معاصی وگناہوں میں لت پت انسان فلاح کیا پائے گا؟ وہ ناداں تو خسارے میں رہے گا، اندرائن کے تخم سے انار اور سیب کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

از مکافات عمل غافل مشو ☆ گندم از گندم بروید جو ز جو

☆☆☆

کیا جنات میں رسول آئے ہیں؟

جنات کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے تین ہزار سال پہلے ہے، وہ ایک مخلوق ہے جو ہماری طرح مکلف ہے، ان کے اوپر تقریباً وہی احکام واعمال فرض ہیں جو انسان پر فرض ہیں، حساب وکتاب، جنت ودوزخ کے معاملات میں تقریباً اشتراک ہے۔ ان کے جنتی ہونے اور دخولِ جنت کے متعلق تھوڑا سا اختلاف ہے، وہ قیامت میں مؤمن جنتیوں کو نہیں دیکھ سکیں گے، جبکہ جنتی انسان انہیں دیکھتے ہوں گے، وہ ہماری طرح جنتی نعمتوں، حوروں اور غلمان سے استفادہ کر سکیں گے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، ان کے علاوہ اور بہت سے مسائل ایسے ہیں جو تحقیق طلب ہیں، جنہیں آکام المرجان في أحکام الجان کے مؤلف نے عجیب وغریب انداز میں بیان کیا ہے۔ فلیراجع

آیت کریمہ میں یہ جو فرمایا: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنات میں بھی رسول ان ہی میں سے آتے رہے ہیں۔ یہ مذہب حضرت ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ جنات نے اپنے ایک نبی جس کا نام یوسف تھا اسے قتل کیا تھا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے پاس انہی میں سے رسول آئے ہیں، کیونکہ جب وہ احکامِ الٰہی کے مکمل مکلف ہوئے تو تبلیغِ احکام کے لئے اللہ تعالیٰ ان کے پاس اگر نبی نہ بھیجے تو وہ کس طرح احکام پر عمل کریں؟ اور کیسے بغیر تبلیغ احکام کے مکلف ہوں؟ وغیرہ۔

چونکہ یہ خطاب قرآنی انسانوں اور جنوں دونوں کو شامل ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، اس لئے حضرات مفسرین نے اس بارے میں علمائے سلف کے مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ مفسر ابن کثیر دمشقی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ ابن جریر، ضحاک اور بن مزاحم رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جنات میں بھی رسول گزرے ہیں (جیسا کہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا) اور لکھا ہے کہ ان حضرات کا استدلال اسی آیت کریمہ سے ہے۔ پھر لکھا ہے کہ یہ آیت اس معنی میں صریح نہیں ہے، بلکہ محتمل ہے، کیونکہ "مِنْكُمْ" کے معنی "مِنْ جُمْلَتِكُمْ" بھی ہو سکتے ہیں، جس کے معنی ہوں گے کہ مجموعۂ جن وانس سے رسول بھیجے گئے، جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں ارشاد ہے: ﴿ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴾ [الرحمن: ۲۲] (ان دونوں سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے)۔ اس میں مِنْهُمَا کی ضمیر بَحْرَيْن کی طرف راجع ہے، حالانکہ لؤلؤ اور مرجان شور سمندر سے نکلتے ہیں، اس اعتبار سے مِنْهُمَا یعنی مِنْ جُمْلَتِهِمَا کے معنی میں ہوا۔ تو رُسُلٌ مِّنْكُمْ سے بھی یہ معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ جنات میں رسول نہیں آئے، اور اس قول کو امام مجاہد اور

ابن جریج وغیر واحد من الائمۃ من السلف والخلف رحمۃ اللہ علیہم کی طرف منسوب کیا ہے۔اور صاحب روح المعانی نے بعض حضرات کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "رُسُلٌ مِّنْكُمْ" میں جو لفظ "رُسُلٌ" آیا ہے یہ لفظ عام ہے، یعنی حقیقی رسولوں اور رسولوں کے رسولوں کو شامل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو حضرات اللہ تعالیٰ کے رسول تھے صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم وہ اپنے طور پر دینِ حق کے پہنچانے کے لئے جن لوگوں کو امتوں کے پاس بغرضِ تبلیغ بھیجا کرتے تھے، ان کو بھی رسول فرمایا۔یعنی جنات کی طرف جنات میں سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام جو مبلغ بھیجا کرتے تھے ان پر یہ لفظ رسولوں کا فرستادہ ہونے کے اعتبار سے صادق آتا ہے۔رسول تو بنی آدم ہی میں سے تھے، لیکن رسولوں کے ارسال فرمودہ نمائندے جنات میں سے بھی تھے۔انتھی کلامہ

یہ عجیب کمزور قول ہے، بنی آدم کے انبیاء کے زمانے سے ہزاروں سال پہلے جنات آباد رہے ہیں، اس عرصہ میں انبیاء بنی آدم کا تو وجود ہی نہ تھا۔دراصل یہ بات نہایت رکیک ہے، کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ بنی آدم سے پہلے اس جہاں میں جنات آباد تھے، اور بستے تھے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ قوم بھی احکامِ خداوندی کی مکلف ہے، اور جب یہ قوم مکلف ہے تو تبلیغِ احکام کے لئے اگر اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کے پاس رسول نہ بھیجے ہوں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے تو اسی بنیاد پر کہا کہ جنات میں جنات ہی سے نبی آئے تھے۔

اور قرآن کریم یہ بھی کہتا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ [فاطر: ۲۴] (اور کوئی امت ایسی نہیں ہے جس میں کوئی خبردار کرو الا نہ آیا ہو)۔اس آیت کریمہ کا عموم اس بات پر واضح دلالت اور راہنمائی کرتا ہے کہ بنی آدم سے پہلے جنات میں انہی میں سے رسول آتے ہوں گے، ورنہ تو وہ کیسے مکلف ہوئے؟

ہاں! البتہ بنی آدم کے زمین پر آباد ہو جانے کے بعد جنات کو انہیں انبیاء و رسل علیہم السلام کے تابع فرما دیا ہو جو بنی آدم میں سے آتے رہے، تو یہ ممکن تو ہے، لیکن قطعی ثبوت کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے، تو رسولوں کے رسول والی توجیہ اور امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول سب ضعیف ہوئے۔

بہر حال! جو بھی صورت ہو اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت خاتم النبیین سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول الثقلین ہیں، اور قیامِ قیامت تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت انس و جن سب کے لئے ہے۔

سورۂ احقاف کے آخری رکوع میں حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں جنات کی حاضری کا

تذکرہ، پھران کا اپنی قوم کی طرف جانا، اوران کو اسلام کی دعوت دینا: ﴿ یٰقَوۡمَنَاۤ اَجِیۡبُوۡا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوۡا بِهٖ ﴾ [الأحقاف: ۳۱] (اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی بات مان لو، اوراس پر یمان لے آؤ) مذکور ہے۔اسی طرح سورۃ الجن کا نزول اور مقامِ نخلہ میں سفرِ طائف سے واپسی پر جہاں آپ ﷺ صلوۃ التہجد میں سوز و گداز کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت فرمارہے تھے، جنات کے ایک نورکنی وفد کا وہاں سے گزر ہوا، جب وہ قریب آئے تو آپ ﷺ کی تلاوت کا استماع کر کے ایمان لائے، آپ ﷺ سے ملاقات کئے بغیر مبلغِ اسلام بن کر اپنی قوم کے پاس گئے، اور ﴿ اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ﴾ [الجن: ۱] (ہم نے ایک عجیب قرآن سنا، جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پس ہم نے اس پر ایمان لایا) کہتے ہوئے تبلیغ و دعوت شروع کی، جس سے ہزاروں کی تعداد میں جنات نے ایمان قبول کیا۔سورۃ الجن کی تفسیر دیکھیں۔

اور سورۂ رحمٰن میں جنات کو بار بار انسانوں کے ساتھ خطاب کرنا، اور سرورِ عالم ﷺ کا جنات کو سورۂ رحمٰن سنانا، اور ہر ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمٰن: ۱۳] (اے انسانو اور جنات!) تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟) پر ان کا والہانہ جواب دینا، پھر جنات کی دعوت پر ان کی جائے سکونت پر جانا، اور انہیں تعلیم دینا، اور تبلیغ فرمانا، جس کے متعلق احادیث میں تذکرہ ہے۔

اور صاحب آکام المرجان کی تحقیق کے مطابق یہ چھ مرتبہ ہوا کہ آپ ﷺ نے انہیں تبلیغ کی ہے۔اس کے علاوہ ان کے مبلّغ عام اوقات میں مساجد و دیگر دینی محفلوں میں شرکت فرما کر تعلیم حاصل کرتے رہے، اور یہ سلسلہ اب بھی مخصوص علماء کے دروس اور محفلوں میں جاری ہے۔ یہ سب اسی عمومی بعثت کا حصہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ بنی آدم کے دنیا میں آباد ہو جانے کے بعد جنات کی ہدایت کے لئے بھی وہی رسول مبعوث تھے جو بنی آدم کی طرف بھیجے گئے، ان کے اس قول کی اس سے تائید ہوتی ہے کہ جب جنات کی جماعت سرورِ عالم ﷺ کی خدمت گرامی میں حاضری دے کر واپس ہوئی تو انہوں نے اپنی قوم سے جو باتیں کیں ان میں یہ بھی تھا: ﴿ قَالُوۡا یٰقَوۡمَنَاۤ اِنَّا سَمِعۡنَا كِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡهِ یَهۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ وَ اِلٰی طَرِیۡقٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴾ [الأحقاف: ۳۰] (انہوں نے کہا: اے ہماری قوم کے لوگو! یقین جانو ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق بات اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے)۔

ان کا اپنی قوم سے یہ کہنا کہ ہم نے ایسی کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی، جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس کے سامنے ہے (یعنی تورات)۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنات توریت کو جانتے تھے، اور اس پر عمل کرتے تھے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں خود ان میں سے کوئی رسول ہوتا تو وہ اسی کا اتباع کرتے۔

بہر حال! جنات انسانوں کی طرح دنیا میں آباد ہیں، اور بنسبت انسانوں کے ان کی آبادی زیادہ ہے، وہ ہمیں نظر نہیں آتے، ہماری طرح ان میں بھی مسلمان، یہودی، نصرانی، مشرک، مجوسی، ہندو، سکھ، قادیانی، ذکری، پرویزی، شیعہ اچھے، بُرے ہر قسم کے لوگ ہیں، اور ان کا وجود مسلّم ہے۔ اور جو لوگ ان کے وجود کے منکر ہیں وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ نظر کیوں نہیں آتے؟ اگر وہ واقعی موجود ہوتے تو ضرور نظر آتے۔ یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے، کیونکہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی، جیسے باقی اشیاء میں جیسے فرشتے کہ ان کے وجود کا انکار نہیں، جبکہ وہ بھی نظر نہیں آتے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا
كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

ترجمہ: اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ شانہ کے لئے ایک حصہ کھیتوں اور مویشیوں میں سے مقرر کر دیا، جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں، سو انہوں نے اپنے خیال سے یوں کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اور یہ ہمارے شرکاء کے لئے ہے، سو جو ان کے معبودوں کے لئے ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں پہنچتا، اور جو اللہ تعالیٰ کیلئے ہے سو وہ ان کے شرکاء کی طرف پہنچ جاتا ہے، یہ لوگ برا فیصلہ کرتے ہیں ۝

معارف ومنازل

شرک کائنات کی تباہی کا ایک بہت بڑا سبب ہے، اور قیامت کے آنے کا سبب بھی ہے۔ یہ اتنا گندا اور ناپاک عمل ہے کہ اس کے ساتھ معاشرہ اور معاشرہ کے لوگ بھی نجس اور ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم کے قانون میں ہر سخت سے سخت گناہ کی مغفرت کا امکان ہے، مگر شرک خواہ معمولی ہو یا بڑا اس کی مغفرت کا کوئی امکان

نہیں۔شرک کی تقریباً پچیس چھبیس اقسام ہیں جو کہ سب کے سب ناپاک اور حرام ہیں۔سورۂ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے۔زیر نظر آیت میں شرک کی چند خاص اقسام کا بیان ہے۔اللہ تعالیٰ رحم فرمائے،موجودہ مسلمان بکثرت ان کا شکار ہیں۔

مشرکین نے جانوروں اور کھیتوں میں شرک کیا:

مشرکین میں جو طرح طرح سے شرک پھیلا ہوا ہے جس کی کئی صورتیں ہیں،ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اپنے شرکاءِ معبودانِ باطلہ کے نام پر کچھ مال نامزد کر دیتے تھے،اور بہت سا مال ان پر بھینٹ کے طور پر چڑھا تے تھے،ان کے ناموں پر جانوروں کے کان کاٹ دیتے تھے،اور ان کے نام پر بہت سے جانوروں کو آزاد کر کے چھوڑ دیتے تھے۔تفصیل سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔موجودہ مشرکین میں اب بھی یہ مشرکانہ رسم ورواج رائج ہیں، جنہیں شیطان نے خوب پٹی پڑھائی ہوئی ہے۔

آیت بالا میں مالیاتی سلسلہ کے ایک شرک کا تذکرہ فرمایا ہے،اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے کھیتیاں اور مویشی پیدا فرمائے ہیں،اور یہ سب اسی کی ملکیت ہے،مشرکین یہ کرتے تھے کہ ان میں سے کچھ حصّہ اللہ تعالیٰ شانہ کا مقرر کر دیتے تھے،کہ اسے صرف مسکین اور محتاج اور مسافر کھائیں گے،اور کچھ حصّہ اپنے معبودانِ باطلہ کے لئے مقرر کر دیتے تھے،اس کے مصارف بھی انہوں نے تجویز کر رکھے تھے۔

اب ہوتا یہ تھا کہ جو حصّہ اللہ تعالیٰ کے لئے مقرر کیا تھا اس میں سے کچھ حصّہ اگر معبودانِ باطلہ کے حصّہ میں مل گیا تو اسے تو ملا ہی رہنے دیتے تھے،اور اگر معبودانِ باطلہ والے حصّہ میں کچھ حصّہ اس حصّہ میں مل جاتا جو اللہ تعالیٰ شانہ کے لئے مقرر کیا تھا تو اسے جھٹ الگ کر لیتے تھے۔

پہلی حماقت اور ضلالت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے علاوہ معبود تجویز کر لئے۔پھر دوسری گمراہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی پیدا فرمودہ چیزوں میں بہت سا مال معبودانِ باطلہ کے لئے نامزد کر دیا۔پھر تیسری گمراہی یہ ہے کہ اپنے بتوں اور باطل معبودوں کو خالق و مالک جلّ شانہ وعزّ مجدہٗ کے مقابلہ میں فضیلت دے دی، کہ اللہ تعالیٰ شانہ کا حصّہ اگر ان کے حصّہ میں مل جائے تو ملا ہی رہے،جس میں کوئی قباحت نہیں،اور ان کے لئے جو حصّہ مقرر کر لیا تھا اس میں سے اگر اللہ تعالیٰ شانہ کے حصّہ میں کچھ مل جائے تو فوراً جدا کر لیتے تھے،اور اس کو بدشگونی اور تباہی سمجھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے فرمایا:

﴿سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ﴾ یہ لوگ برا فیصلہ کرتے ہیں۔ بعض اکابر علماء نے فرمایا کہ امتِ حاضرہ کا بھی ایسا ہی طریق کار ہے۔

....

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ
نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ
بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ
يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا
اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

ترجمہ: اور اسی طرح مشرکین کے لئے ان کے شرکاء نے اولاد کا قتل کرنا مزیّن کر دیا، تا کہ وہ ان کو ہلاک کر دیں، اور تا کہ وہ ان پر ان کے دین کو رلا ملا دیں، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے، سو آپ ان کو جو کچھ وہ افتراء کرتے ہیں چھوڑ دیجئے ﴿۱۳۷﴾ اور ان لوگوں نے اپنے خیال کے مطابق یوں کہا کہ: یہ مویشی ہیں اور کھیتی ہے جس پر پابندی ہے، اس کو بس وہی لوگ کھائیں گے جن کو ہم چاہیں، اور کچھ جانور ایسے ہیں جن کی پشتیں حرام کی گئی ہیں، اور کچھ جانور ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتے، اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہوئے، عنقریب وہ انہیں سزا دے گا بسبب اس کے کہ وہ افتراء کرتے ہیں ﴿۱۳۸﴾ اور انہوں نے کہا کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹوں میں ہے وہ ہمارے مردوں کے لئے خالص ہے، اور ہماری بیویوں پر حرام قرار دیا گیا ہے، اور اگر وہ مردار ہو تو وہ سب اس میں شریک ہیں، سو وہ انہیں عنقریب اس بات کی سزا دے گا جو وہ بیان کرتے ہیں، بے شک وہ حکمت والا ہے، علم والا ہے ﴿۱۳۹﴾ بے شک وہ لوگ خسارہ میں پڑ گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی سے بغیر علم کے قتل کیا، اور اللہ تعالیٰ شانہ نے انہیں جو رزق عطا فرمایا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہوئے اسے حرام قرار دے دیا، بے شک وہ لوگ گمراہ ہوئے، اور وہ ہدایت پر چلنے والے نہیں ہیں ﴿۱۴۰﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

مشرکین کی بداعمالیوں اورخباثتوں کا بیان:

اس نیرنگیوں کے جہاں میں ہادی عالم رحمۃ للعلمین خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ (فداہ أرواحنا) کی تشریف آوری سے پہلے پوری دنیا، جہالت، درندگی، ضلالت، سفاہت اورکفر وشرک سے بھری تھی، انسانیت وشرافت کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا، پورا جہاں اور چاروں طرف افق آسمان ضلالت وشرک کے اندھیریوں میں ڈوبا ہوا تھا۔عرب کے لوگ جنگلی جانوروں سے بھی زیادہ درندہ اور غیر مہذب تھے،کفر وشرک، جہالت وبے رحمی ان کا شیوہ اورشعار تھا، جہالت وجاہلیت ان کی شناخت تھی۔

مشہور بات ہے کہ " خانہ خالی را دیو میگیرد" خالی گھر پر شیطان کا قبضہ ہوجاتا ہے، پورے جہاں پر ابلیس اوراس کی فوج کا قبضہ ہو چکا تھا، پورے افق میں ایک بھی أعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کہنے پکارنے والا نہ تھا۔ ابلیس نے پورے جہاں پر اپنا تسلط جمایا تھا، کہ سوائے چند گوشہ نشین راہبوں کے کوئی خدا کا نام لیوا کہیں موجود نہ تھا۔ ایک بھیانک بے رحم وبے پردہ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

قدرت نے فیصلہ فرمایا کہ اس تاریکی کوختم کرنے، اورطرح طرح کی جہالتوں کو مٹانے اور بے گناہ ننھی منی بچیوں کو زندہ درگور اور بے رحمانہ رسم سے نکالنے، اور بچانے کی خاطر ایک عالمگیر روشنی کی ضرورت ہے، جس کی کرنوں کا نور پورے جہاں اور پورے افق کے لئے تابانی کا نظام جاری کرے۔ وہاں تاریک اور ستم رسیدہ بے رحم قلوب کے لئے روشنی اور پیغامِ حیات کا نظام بھی جاری کرے، جتنی تاریکی گہری ہے اس کی صبح اس سے ہزار چند روشن اور منور ہو، یہی نور اور پیغام وَالشَّمْسِ، وَالضُّحٰی کی شکل میں سیدۃ النساء حضرت آمنہ بنت وہب رضی اللہ عنہا کی گود سے نکل کر پورے افق پر چھا گیا، جس کی ولادت پر بُصریٰ اور شام کے محلات کی دیواریں مکہ والوں کو نظر آئیں۔

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا ★ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

یہ وہ دور تھا جہاں اللہ ربّ العزّت کا اولین پاکیزہ گھر کعبۃ اللہ شریف تین سوساٹھ بتوں سے بھرا ہوا تھا، مرد وعورت شرم وحیا کے لباس اتار کر اس کا طواف کرتے تھے، شیطان نے انہیں پٹی پڑھائی تھی کہ ان کپڑوں میں تم گناہ کر چکے ہو لہٰذا انہیں اتار کر بے ستر ہو کر طواف کرو، اورطرح طرح کی شرکیہ رسوم انہیں سکھا کر تباہ کیا ہوا تھا، جانوروں اوران کے بچوں اور کھیتوں کے بارے میں طرح طرح کے افعالِ قبیحہ میں مبتلا کیا ہوا تھا، جانوروں کے کان کاٹ کر

انہیں بتوں کے نام کرتے تھے، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام جن کی تفصیل گزر چکی ہے، یہ سارے منگھڑت کافرانہ رسوم تھے۔

الغرض پورا معاشرہ اور سارے اعمال اتنے خراب اور جہالت کی رسومِ ذمیمہ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ الامان والحفیظ۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر ان رسوم کی نشاندہی کی ہے، اور تفاصیل احادیث میں دیکھیں۔

آیت کریمہ میں اوّل تو یہ فرمایا کہ بہت سے مشرکوں کو ان کے شرکاء یعنی شیاطین الانس والجن نے اس پر آمادہ کر دیا کہ اپنی اولاد کو قتل کریں، اور ان کے اس عمل کو ان کی نظر میں مزین اور مستحسن کر دیا، یہ لوگ بیٹیوں کو زندہ در گور کر کے ہلاک کرتے تھے۔ تفصیل آخری پارہ، سورۂ تکویر میں ہے۔ اور وہ اس پر فخر بھی کرتے تھے۔ یہ مضمون عنقریب دوبارہ آنے والا ہے۔

یہ لوگ پہلے حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کے دین پر تھے، مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ آہستہ آہستہ دین سے دور ہوتے گئے، اور عمرو بن لحی بن قمہ خزاعی مردود نے ملک شام جا کر وہاں سے بتوں کی ایک کھیپ لے کر آیا، اور اس بت پرستی کے نظریے کو رفتہ رفتہ پورے عرب میں پھیلا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ شیاطین نے انہیں اپنے دین کے بارے میں شک میں ڈال دیا، یہ لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین کو چھوڑ کر بتوں کے پجاری بن گئے۔ [معالم]

اس کے بعد مشرکین عرب کی ایک اور مشرکانہ حرکت کا تذکرہ فرمایا، اور وہ یہ کہ انہوں نے مویشیوں اور کھیتوں کے بارے میں پابندیاں لگا رکھی تھیں، وہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فلاں مویشی اور فلاں کھیتی کا استعمال ہر شخص کو جائز نہیں، وہ کہتے تھے کہ ان کو صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جن کو ہم چاہیں، اپنے باطل خیال کے مطابق انہوں نے حلال وحرام کے چند قانون بنا رکھے تھے، اور ان تمام خود ساختہ رسوم کو بتوں کی طرف نسبت کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ شانہ تمام چیزوں کا خالق ومالک ہے، چیزوں کے حلال اور حرام کرنے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے، دائمی حلت وحرمت ہو یا عارضی، جیسے حج وعمرہ کے احرام کے وقت شکار ممنوع ہو، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ شانہ کے حکم اور فیصلے پر موقوف ہے۔ پس جو چیز اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے حلال فرمائی اس کو بلا وجہ بعض کے لئے حرام قرار دینا ظلم ہے، اور نظامِ الٰہی میں بے جا مداخلت بھی ہے، اور تعدّی وسرکشی ہے، اس لئے اس کی قباحت بیان فرمائی۔

مشرکین عرب نے یہ بھی کر رکھا تھا کہ بعض جانوروں کو سواری کے لئے حرام قرار دیا تھا، کہ وہ بتوں کے نام

پر مقرر ہوکر آزاد ہوتے تھے، سواری اور بار برداری ان پر حرام سمجھتے تھے، اور کچھ جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینے پر بھی پابندی تھی کہ اس طرح کرنے سے حرام ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا۔ یہ ایک الٹی منگھڑت رسم انہوں نے ایجاد کی ہوئی تھی، ابلیس کے کہنے پر، اور اپنے خود تراشیدہ خیالات کی بنیاد پر۔

اس کے علاوہ حرام وحلال کے خودساختہ خیالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بعض جانوروں کے پیٹوں میں جو حمل ہوتا تھا اس کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے، اور ہماری عورتوں پر حرام ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب بچہ زندہ پیدا ہو جائے، اور اگر بچہ مردہ پیدا ہو جاتا تو کہتے کہ اب مرد وعورت سب کھا سکتے ہیں۔ آخر میں پھر ان کی گمراہی اور اخروی سزا کا اجمالاً ذکر فرمایا کہ یہ لوگ بالکل خسارہ میں پڑ گئے، سب سے بڑا خسارہ ان کا شرک وکفر ہے، اگر دوسرے برے اعمال نہ بھی ہوں صرف کفر ہی ابدی دوزخی ہونے کے لئے کافی ہے، چہ جائیکہ کفر کے ساتھ جب دوسرے برے غیر شرعی مشرکانہ اعمال بھی ہوں تو خسارہ کے اوپر خسارہ ہی ہوگا۔

اور سب سے بری بات یہ کہ ان تمام گندے، برے اور ناپاک عقائد وخیالات کی نسبت وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف کرتے تھے، یہ ایک ایسا ناقابلِ معافی جرم اور بہتان عظیم ہے جس کی سزا بہت ہی سخت ہے۔

ہمارے زمانہ کے اہل بدعت مشرکین ایسے ایسے بھیانک شرکیہ اعمال وضع کر چکے ہیں کہ عرب کے مشرکین بھی لب بدنداں ہوں، جبکہ چاروں افق پر قرآن وسنت کے انوار وبرکات موجزن جلوہ افروز جگمگا رہے ہوں۔ شیاطین کے گماشتوں نے مشرکینِ عرب کے ریکارڈ توڑ دیئے، کہاں وہ تین سو ساٹھ بت اور کہاں لاکھوں بت اور قبور و مزارات۔ إنا للہ وإنا إليه راجعون

فائدہ:

شرکاء شریک کی جمع ہے، یہ لفظ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر جس طرح مشرکین کے معبودانِ باطلہ کے لئے استعمال ہوا ہے اسی طرح سورۂ انعام اور سورۂ یونس اور جن دیگر مقامات پر شیاطین الجن والانس کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جن کے کہنے پر مشرکین نے بتوں کو اللہ تعالیٰ شانہ کے شریک ٹھہرائے۔

فائدہ:

گزشتہ مضامین سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ تمام چیزوں کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کو واحد لاشریک اور تحلیل وتحریم کا حقدار وسزاوار ماننا فرض ہے، کسی بندہ کو یہ اختیار نہیں کہ حلال چیز کو حرام، یا حرام چیز کو حلال

قرار دے۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ مجرم ہیں، اور سخت سزا کے مستحق ہیں، اور یہ عمل کافرانہ ہے۔

مغلیہ دور میں یہ مشرکانہ رواج جاری تھا کہ بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے نام پر نیاز (جس کا نام تھا بی بی سہنک تھا) دی جاتی تھی، جسے عورتیں کھا سکتی تھیں، اور مرد نہیں کھا سکتے تھے، یہ رسم آج بھی مشرک اہل بدعت کے یہاں رائج ہے، خاص کر بڑے گھرانوں میں۔ تو ہے کوئی شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جو ان کفریات پر تلوار چلائے؟ مغلیہ دور کی اس مرَوجہ بدعت کو شاہ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بند کر کے ختم کیا تھا۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖؗ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۴۲﴾

ترجمہ: اور وہ وہی ہے جس نے باغیچے پیدا فرمائے، جو چڑھائے جاتے ہیں چھپریوں پر، اور ایسے بھی ہیں جو چھپریوں پر نہیں چڑھائے جاتے، اور (پیدا فرمائے) کھجور کے درخت، اور کھیتی جس میں مختلف قسم کے کھانے کی چیزیں ہیں، اور (پیدا فرمایا) زیتون کو، اور انار کو، جو ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، اور غیر مشابہ بھی ہیں، کھاؤ ان کے پھلوں سے، جبکہ پھل لائیں، اور کٹائی کے دن اس کا حق دے دو، اور فضول خرچی نہ کرو، اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ﴿۱۴۱﴾ اور (اس نے) چوپاؤں میں سے ایسے جانور (پیدا فرمائے) جو بوجھ اٹھانے والے ہیں، اور ایسے جانور بھی جو زمین سے لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں عطا فرمایا اس میں سے کھاؤ، اور شیطان کے قدموں کا اتباع نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ﴿۱۴۲﴾

معارف ومنازل

قرآن حکیم کی اصطلاح ہے کہ شرک کی تردید اور اثباتِ توحید کے ساتھ تذکیر بالآء اللہ یا تذکیر بما بعد الموت، یا تذکیر بایام اللہ میں سے کسی ایک کا بیان ہو، تاکہ یہ چیز توحیدِ الٰہی کے لئے دلیل ثابت ہو۔ آیات بالا میں

انہی انعامات کا ذکر فرمایا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے لئے پیدا فرمایا، اور اپنی توحید پر گواہ بنایا۔

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے تمہارے لئے دو قسم کے باغ بنائے، ان دو طرح کے باغوں اور ان کے پھلوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ شانہ کی وحدت وقدرت کا اقرار کرو، ان باغوں میں کچھ ایسے ہیں جو معروشات ہیں، یعنی ان کی بیلیں (شاخیں) جو چھپریوں پر چڑھائی جاتی ہیں، جیسے انگور کی، اور بعض سبزیوں کی بیلیں، اور بہت سے ایسے ہیں کہ ان کی شاخیں اوپر نہیں چڑھائی جاتیں۔ اس دوسری قسم میں کچھ درخت ایسے ہوتے ہیں جن کا طاقتور تنا ہوتا ہے، ان کی بیل ہی نہیں ہوتی، جیسے زیتون، انار، انجیر، کھجور، سیب آم وغیرہ بے شمار انواع، اور جیسے گیہوں وغیرہ جو اپنے مختصر کمزور تنے پر کھڑے رہتے ہیں۔

اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی بیلیں تو ہوتی ہیں لیکن انہیں چھپریوں پر چڑھایا نہیں جاتا، جیسے کدّو، خربوزہ، تربوز وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے مختلف ملکوں میں موسم اور آب و ہوا کے لحاظ سے ہزاروں قسم کے درخت، پھل، سبزی، ترکاری، میوے پیدا فرمائے ہیں، جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] (بڑی شان ہے اللہ کی، جو سارے کاریگروں سے بڑھ کر کاریگر ہے)۔

پھر درختوں کا نظام اور ان کے تنے، پھر بلندی، اسی کے ساتھ ان کی عمریں، فوائد، خواص، اثرات، یہ وہ مظاہرِ قدرت ہیں جنہیں دیکھ کر بلا اختیار حق تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا میں صرف رنگدار مختلف رنگ کے پھول سولہ ہزار اقسام کے ہیں، جن میں سات ہزار قسم کے پھول صرف اسپین (سابق اندلس) میں ہیں۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ اب تک سیب کے سولہ سو چونسٹھ اقسام دریافت ہو چکے ہیں۔ یہ کونسا مخفی پوشیدہ باکمال ہاتھ ہے کہ ایک ایک درخت کے نظارہ میں اس کی قدرت جلوہ گر ہے؟

مشرق وسطیٰ میں ایسے ایسے درخت ہیں جن پر بیک وقت آٹھ مختلف رنگوں کے پھول نمایاں ہیں، دور کہاں جاتے ہو ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ [الذاریات: ۲۱] (اور تمہاری اپنی جانوں میں، کیا تم دیکھتے نہیں؟)۔

ماہرین کی تحقیق کی رُو سے انسانی بدن ایک سو تیس عناصر سے مرکب ہے، اور مزید تحقیق جاری ہے، اگر ان مصنوعات کو مکمل معلوم کرنا چاہو تو تفسیر جواہر القرآن طنطاوی کا مطالعہ کریں۔

بہر حال! ہر قسم کے درختوں، سبزوں، سبزیوں، پھلوں، پھولوں اور کانٹوں میں اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمت کے ہزاروں راز مخفی اور پوشیدہ ہیں، جنہیں ماہرین نہ معلوم کر سکتے ہیں، نہ وہاں کے حقائق تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ سبحانہ وتعالیٰ لا إلٰہ إلا ھو العلیم الحکیم۔

حکایت:

ایک منچلے دہریئے کا تربُوز کی فصل پر گزر ہوا، دیکھا کہ آٹھ دس سیر کا تربوز زمین پر رکھا ہوا ہے، اور درخت یعنی بیل بوٹی نہایت کمزور نازک زمین پر پھیلی ہوئی ہے، کہنے لگا: قدرت نے غلطی کی، یہ بڑا پھل اور یہ نازک درخت، کوئی بھی مناسبت نہیں۔ وہاں سے آگے چل کر انار کے باغ میں پہنچا، دیکھا درخت تو کافی بڑا ہے، مگر پھل چھوٹا ہے، کوئی مناسبت نہیں، اُس نازک درخت کے لئے یہ پھل مناسب ہے، اور اس بڑے درخت کے لئے وہ بڑا پھل۔ اتنے میں وہ درختِ انار کے سایہ میں آرام کرنے کے لئے سو گیا، ہَوا کی جھونکے سے ایک انار درخت سے کٹ کر زور دار رفتار کے ساتھ اس کی پیشانی پر لگ گیا، اٹھ کر کہنے لگا: بات سمجھ میں آگئی، اس درخت پر اگر وہ بڑا تربوز ہوتا، اور میری نازک پیشانی پر لگ جاتا تو میرا خاتمہ ہو جاتا، قدرت کا فیصلہ صحیح ہے، اور میں غلط ہوں۔

﴿وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ نے طرح طرح کی کھیتیاں پیدا فرمائیں، جن میں طرح طرح کے کھانے کی چیزیں ہوتی ہیں، ایک ہی موسم، ایک ہی پانی، ایک ہی مٹی یعنی زمین سے پیدا شدہ چیزوں میں کئی قسم کا تفاوت ہوتا ہے، رنگ، سائز، فوائد، خواص، ذائقہ، ہر چیز میں تفاوت۔ اگر پورے جہاں میں ایک شکل وصورت قدو قامت کے دو آدمی آپ کو نظر نہیں آتے تو یہاں بھی وہی صنعت وصورت گری کارفرما ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ نے زیتون اور انار پیدا فرمائے، ان میں سے ایک جنس کے پھل دیکھنے میں دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں، لیکن مزے میں متشابہ نہیں ہوتے، رنگ ایک اور مزہ مختلف ہوتا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ اس کے پھلوں میں سے کھاؤ جب وہ پھل لائے، اور کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس حق سے پیداوار کی زکوٰۃ مراد ہے، جو بعض صورتوں میں عُشر، اور بعض صورتوں نصفِ عشر واجب ہوتی ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ چونکہ آیت کریمہ مکیہ ہے، اور زکوٰۃ مدینہ منورہ میں فرض ہوئی، اس لئے

اس سے زکوٰۃ کے علاوہ مسکینوں اور محتاجوں پر خرچ کرنا مراد ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ آیت کریمہ مدنیہ ہے، اگرچہ سورت مکی ہے، اس صورت میں پیداوار کی زکوٰۃ مراد لینا بھی درست ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ شروع میں کھیتی کاٹنے کے وقت غیر معیّن مقدار محتاجوں کو دینا واجب تھا، پھر یہ وجوب زکوٰۃ کی فرضیت سے منسوخ ہوگیا۔ [روح المعاني]

پھر فرمایا: ﴿وَلَا تُسۡرِفُوۡا﴾ حد سے آگے نہ بڑھو۔ اِسراف کرکے بے شک حد سے آگے بڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ عربی میں اِسراف حد سے آگے بڑھنے کو کہتے ہیں عام طور سے اس لفظ کا ترجمہ فضول خرچی سے کیا جاتا ہے، چونکہ اس میں بھی حد سے بھی آگے بڑھنا ہوتا ہے اس لئے یہ معنی بھی صحیح ہے۔ اور فضول خرچی کے علاوہ جن اعمال اور افعال میں حد سے آگے بڑھا جائے، سب کے بارے میں لفظِ اِسراف مستعمل ہوتا ہے۔

اگر کوئی سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دے، اور تنگدستی کی تاب نہ ہو، تو یہ بھی اِسراف میں شمار ہوتا ہے۔ ہاں! اگر وہ وسیع الظرف، صاحبِ برداشت ہو جیسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو اِسراف میں شمار نہیں ہوگا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر سارا مال صدقہ فرمایا، حتیٰ کہ گھر کے برتن اور عورتوں کے ہاتھ کی سوئی تک خدمت گرامی میں حاضر کی۔ [بخاري]

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس ☆ صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

(اقبالؒ)

صاحب روح المعانی نے حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے ایک دن کھجوروں کے باغ کے پھل توڑے، اور کہنے لگے کہ آج جو بھی شخص آئے گا اسے ضرور دے دوں گا، لوگ آتے رہے اور یہ دیتے رہے، حتیٰ کہ شام کے وقت ان کے پاس کچھ بھی نہ بچا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت مدنیہ ہے۔

حضرت ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیداوار کو گناہوں میں خرچ نہ کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس انعام کو ذکر فرمایا جو انسانوں پر مویشیوں کے ذریعہ فرمایا ہے، اول تو یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ جانور ایسے پیدا فرمائے جو حمولہ ہیں، یعنی بار برداری کا کام کرتے ہیں، اور ان کے قد بھی بڑے ہیں، جیسے اونٹ، گدھے، خچر، گھوڑے وغیرہ۔

اور دوسری قسم کے جانور وہ ہیں جنہیں فرش فرمایا، جن کے قد چھوٹے ہیں گویا کہ وہ زمین پر بچھے ہوئے ہیں، وہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے، جیسے بھیڑ، بکری، دنبہ وغیرہ، ان کے فوائد بھی بہت بکثرت ہیں، ان کا دودھ پیا جاتا ہے، پشم کار آمد ہے، گوشت کھایا جاتا ہے، اور بڑے جانوروں کی نسبت ان کا گوشت عمدہ ہوتا ہے، اور پرانے زمانے میں اکثر ان ہی کے بالوں سے پشمی لباس اور کپڑے خیمے تیار ہوتے تھے، اس کے علاوہ ان کی کھالوں میں بہت سے فوائد ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا:

﴿كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جو رزق عطا کیا ہے اس سے کھاؤ، اور باپ دادوں کی طرح شیطان کے قدموں کا اتباع نہ کرو، بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، وہ کبھی تمہیں ایسا نہیں چھوڑتا کہ تم اپنے ربّ کا شکر گزار فرمانبردار بندہ بنو، لہٰذا تم اپنے ربّ کے حکموں پر چلو، اس کے قانون مین مداخلت ہرگز نہ کرو، جو اللہ تعالیٰ کی شریعت میں حلال ہے اسے حلال رہنے دو، اور جو حرام ہے اسے حرام رہنے دو، تمہارے باپ دادوں نے کھیتی اور جانوروں میں رسومِ قبیحہ جو وضع کئے تھے شیطان کے کہنے پر انہیں اختیار نہ کرو، اللہ تعالیٰ شانہ پر ایمان لاؤ، اور فرمانبردار بنو۔

.......❁.......❁.......❁.......

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّــُٔـوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

ترجمہ: آٹھ طرح کے نر اور مادہ (پیدا فرمائے)، بھیڑ میں سے دو، اور بکری میں سے دو، آپ فرمایئے: کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام قرار دیا ہے، یا دونوں مادہ کو، یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں لئے ہوئے ہوں؟ تم مجھے کسی دلیل سے بتاؤ اگر سچے ہو ﴿۱۴۳﴾ اور اونٹ میں سے دو، اور گائے میں سے دو پیدا فرمائے، آپ فرمایئے: کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام قرار دیا ہے، یا دونوں مادہ کو، یا اس کو جس کو دونوں مادہ پیٹ میں

لئے ہوئے ہیں؟ کیا تم حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی وصیت فرمائی؟ سو اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا؟ تاکہ بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرے، بیشک اللہ تعالیٰ شانہ ظالموں کو راہ نہیں بتاتا ﴿۱۴۴﴾

معارف ومنازل

جانوروں کی آٹھ قسمیں ہیں، ان میں مشرکین نے اپنے طور پر شیطان کے کہنے اور بتانے سے تحریم وتحلیل کر کے اللہ تعالیٰ کے حکموں کی خلاف ورزی کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ ان جانوروں کی آٹھ قسمیں پیدا فرمائیں، جنہیں تم استعمال کرتے ہو، جن کا دودھ پیتے ہو، اور گوشت کھاتے ہو، اور دیگر بہت سے منافع اور فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان میں دو قسمیں بھیڑ سے پیدا فرمائیں نر اور مادہ، اور دو قسمیں بکری سے پیدا فرمائیں یعنی نر اور مادہ، اور دو قسمیں اونٹ کی پیدا فرمائیں یعنی نر اور مادہ، اور دو قسمیں گائے کی پیدا فرمائیں یعنی نر اور مادہ، اب ان جانوروں کی تحلیل وتحریم تم نے اپنے پاس سے کر لی، تم نے کوئی شرط اور قید لگا کر نروں کو حرام قرار دے دیا، کبھی ان کے جوڑوں یعنی مادہ جانوروں کو حرام قرار دیدیا۔

پھر اپنی اس غلط حرکت کو اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف نسبت ومنسوب کرتے ہو، اور کہتے ہو کہ یہ تحلیل وتحریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، بتاؤ اللہ تعالیٰ نے ان کے نروں کو حرام قرار دیا ہے، یا ان کی مادوں کو؟ یا اس چیز کو جس پر مادوں کے رحم (بچہ دانی) مشتمل ہوتے ہیں یعنی نر اور مادہ دونوں کو۔ اس تحریم کی نسبت تم نے اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے کی؟ اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل لاؤ۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیان کے مطابق ان کو حرام قرار دیا؟ اور تم سے فرمایا کہ یہ چیزیں حرام ہیں؟

ظاہر ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حرام قرار دیا، اور نہ تمہارے پاس اس کی دلیل ہے، اور نہ اللہ تعالیٰ نے تم کو بتایا ہے کہ یہ چیز تم پر حرام ہے، اور نہ تم وہاں حاضر تھے، یہ سب تمہارا جھوٹ وافتراء ہی ہے، تم نے خود ہی شرطیں اور قیدیں لگا کر بعض جانوروں کو بعض صورتوں میں بعض افراد کے لئے حرام قرار دیا، اور ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا، اس سے بڑھ کر کون زیادہ ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے؟

یہ جھوٹا شخص بغیر علم کے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، جو صریح ظلم ہے، اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں

دیتے، یعنی جنت کی راہ نہیں دکھائے گا۔

قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِیْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ
خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ
رَّحِیْمٌ ۝۱۴۵ وَعَلَی الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ
اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَایَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۱۴۶
فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝۱۴۷

ترجمہ: آپ فرما دیجئے: جو کچھ میری طرف وحی بھیجی گئی میں اس میں کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ بلاشبہ وہ ناپاک ہے، یا ایسی چیز کو حرام پاتا ہوں جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، سو جو شخص حالتِ اضطراری میں ہو اس حال میں کہ باغی اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو سو تیرا ربّ بخشنے والا مہربان ہے ۝۱۴۵ اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والا جانور حرام کر دیا، اور گائے اور بکری میں سے ہم نے ان پر دونوں کی چربیاں حرام کر دیں، سوائے اس کے جو ان کی پشت پر یا ان کی آنتوں پر لگی ہوئی ہو، یا جو ہڈی کے ساتھ مل جائے، یہ ہم نے ان کی بغاوت کی وجہ سے ان کو جزا دی، اور بیشک ہم سچے ہیں ۝۱۴۶ سو اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ فرما دیں کہ تمہارا ربّ وسیع رحمت والا ہے، اور اس کا عذاب مجرموں سے نہیں ٹالا جائے گا ۝۱۴۷

معارف و منازل

مشرکینِ عرب نے جانوروں کے کھانے پینے اور استعمال کرنے میں جو اپنی طرف سے تحلیل و تحریم کا خود ساختہ معاملہ کیا تھا جس کا اوپر کی آیات میں ذکر ہو چکا، اس کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ میرے ربّ نے میری طرف جو وحی بھیجی ہے میں اس میں صرف ان چیزوں کو حرام پاتا ہوں:

اوّل: میتہ، مردار (جو جانور خود اپنی موت سے مر جائے)۔

دوئم: دمِ مسفوح، یعنی بہنے والا خون۔ یہ قید اس لئے لگائی کہ ذبح شرعی کے بعد جو خون گوشت میں لگا رہ جاتا ہے اس کا کھانا جائز ہے، نیز جگر اور تلی (منجمد خون) یہ دونوں بھی جمے ہوئے خون ہیں، ان کا کھانا بھی جائز ہے۔

سوئم: خنزیر کا گوشت، اس کے بارے میں فرمایا: ﴿فَإِنَّهُ رِجۡسٌ﴾ وہ پورا کا پورا تمام اجزاء کے ساتھ نجس العین اور ناپاک ہے۔ اس کا گوشت، پوست، ہڈی، چربی، رگ وریشہ، بال کوئی چیز بھی پاک نہیں ہے، کیونکہ یہ نجس العین ہے، اس لئے ذبح کر دینے سے بھی اس کی کوئی چیز پاک نہ ہوگی، برخلاف دوسرے جانوروں، بکری، دنبہ وغیرہ اگر وہ بلا ذبح اپنی موت مرجائیں تو ان کے بال اور ہڈی پاک ہیں۔

چہارم: وہ جانور جس پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے، یا غیر اللہ کے نام پر اس کو مقرر کیا جائے، بس یہ حرام ہی ہوگا، پس ذبح کے وقت باوجود بسم اللہ اللہ اکبر پڑھنے کے حلال نہ ہوگا، یہی مفتیٰ بہ قول ہے۔

چار چیزوں کی حرمت بیان فرما کر حالتِ اضطراری میں ذرا سا کھانے کی اجازت دیدی، جس سے دو چار لقمے کھا کر وقتی طور پر جان بچ جائے، یا اتنا کھائے پیئے کہ وہاں سے چل کر حلال کھانے کی جگہ تک پہنچ سکے۔ ان مسائل کی تشریح سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡمَيۡتَةَ وَٱلدَّمَ وَلَحۡمَ ٱلۡخِنزِيرِ﴾ [البقرۃ:۱۷۳] (بیشک تمہارے اوپر حرام کر دیا ہے مردار، خون اور سور کے گوشت کو)۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت: ﴿حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ ٱلۡمَيۡتَةُ وَٱلدَّمُ﴾ [المائدۃ:۳] (حرام کر دیا گیا ہے تمہارے اوپر مردار اور خون) کے تحت گزر چکی ہے، وہاں دیکھا جائے۔

آیت بالا میں یہ بتایا ہے کہ کسی چیز کی حلت وحرمت کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوسکتا ہے، اور یہ چیز وحی کے ذریعہ معلوم ہوسکتی ہے، اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ سرور عالم ﷺ سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے علوم ومعارف کے جامع اور خاتم الانبیاء ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کی وحی کا انحصار آپ ﷺ پر ہو گیا، اور آپ ﷺ پر اس وقت تک جو وحی آئی تھی اس کے موافق صرف مذکورہ چار چیزیں حرام تھیں، بعد میں دوسری بہت سی چیزوں کی حرمت نازل ہوئی، جو سورۂ مائدہ میں مذکور ہیں۔

حلت وحرمت کا اصول اجمالی طور پر سورۂ اعراف میں آنے والا ہے، فرمایا: ﴿يُحِلُّ لَهُمُ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ ٱلۡخَبَٰٓئِثَ﴾ [الأعراف:۱۵۷] (اللہ حلال کر دیتا ہے ان کے لئے پاکیزہ چیزیں، اور حرام کر دیتا ہے ان پر گندی چیزیں)۔ لہٰذا کوئی شخص آیت بالا سے یہ استدلال نہیں کر سکتا کہ مذکورہ بالا چار چیزوں کے علاوہ باقی سب حلال ہیں، کیونکہ یہ اس وقت کی بات ہے، خاص کر مکی سورتوں میں کہ جب قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا، اور شریعت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی، چنانچہ باقی احکام بہت سارے اکثر وبیشتر ہجرت کے بعد مدینہ شریف میں مدنی

سورتوں میں نازل ہوئے، جیسے پہلے بیان ہوا۔

قوم یہود مغضوب اور معتوب قوم ہے:

یہودیوں پر ان کی مسلسل بغاوت مثلاً شرک وکفر قتل انبیاء علیہم السلام استخفاف بالدین، نقض عہد وغیرہ وغیرہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ شانہ نے تہدید وتوبیخ اور دنیاوی سزا کے طور بعض مرغوب وپسندیدہ حلال چیزوں کو حرام کر دیا، یہ چیزیں یہود پر حرام ہوئیں، جو امت محمدیہ کے لئے حلال ہیں۔

ان حرام کردہ چیزوں میں اوّل تو وہ جانور تھے جو ناخن والے ہیں، ناخن والے جانوروں سے وہ جانور مراد ہیں جن کا پنجہ یا کھر پھٹا ہوا نہ ہو، جیسے اونٹ، شتر مرغ، مرغابی اور بطخ وغیرہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت سعید بن جبیر، حضرت قتادہ، حضرت مجاہد رحمہم اللہ نے اس کی یہی تفسیر فرمائی ہے۔ اونٹ کے بارے میں گزر چکا ہے کہ ملّتِ ابراہیمیہ میں یہ حلال تھا، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کو اپنے نفس پر حرام قرار دیا تھا، پھر روایتی طور پر ان کی اولاد میں اونٹ کی حرمت چلی آئی۔

پھر شریعت موسوی میں بھی بنی اسرائیل پر اونٹ کا دودھ اور گوشت حرام رہا۔ تفصیل ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسۡرَٰٓءِيلُ﴾ [آل عمران:۹۳] (کھانے کی تمام چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، سوائے اس چیز کے جو اسرائیل (یعنی یعقوب (علیہ السلام) نے اپنے اوپر حرام کر لی تھی) چوتھے پارہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

﴿وَمِنَ الۡبَقَرِ وَالۡغَنَمِ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ شُحُومَهُمَآ إِلَّا مَا حَمَلَتۡ ظُهُورُهُمَآ أَوِ الۡحَوَايَآ﴾ گایوں اور بکریوں کا گوشت تو یہودیوں کے لئے حلال تھا، البتہ ان کی چربیاں حلال نہ تھیں، صرف دو تین چربیاں حلال تھیں جو ان کی پشت پر ہو، یا ان کی آنتوں پر لگی ہوئی ہو، یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا ان کے ظلم و زیادتی اور بغاوت کی وجہ سے دے دی۔ یہ مضمون سورۂ نساء میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَبِظُلۡمٖ مِّنَ الَّذِينَ هَادُواْ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبَٰتٍ أُحِلَّتۡ لَهُمۡ﴾ [النساء:۱۶۰] (یہودیوں کی سنگین زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال کی گئی تھی)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قانون سے بغاوت کرنا درحقیقت گناہ کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرنا ہے، اور پاکیزہ چیزوں سے اور دنیاوی امن وسکون اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محرومی کا سبب ہے، یہودیوں پر تو تشریعی طور

پاکیزہ چیزیں حرام کردی گئی تھیں، لیکن خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم ہو جانے کی وجہ سے اب تشریعی طور پر کوئی حلال چیز حرام نہیں ہوسکتی، لِعَدَمِ اِحتِمَالِ النَّسخِ۔

البتہ تکوینی طور پر طیبات سے محرومی اور بے برکتی قلّت اور فقدان، مہنگائی اور گرانی وغیرہ ہوسکتی ہے، اور ہوتی رہتی ہے، جس کا مشاہدہ ہر وقت ہو رہا ہے۔ صرف خوراک ولباس کی قلت وگرانی نہیں، بلکہ دیگر زندگی کے کئی شعبے اس کی زد میں ہیں۔

﴿فَاِنۡ كَذَّبُوۡكَ فَقُلۡ رَّبُّكُمۡ ذُوۡ رَحۡمَةٍ وَّاسِعَةٍ﴾ اگر وہ آپ کی تکذیب کریں، اور تکذیب کے لئے بہانہ بنائیں کہ اگر آپ سچے ہیں، اور ہم مجرم ہیں، تو ہم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب کیوں نہیں آتا؟ تو آپ ان کو بتائیں کہ تمہارا ربّ جل شانہ وسیع رحمت والا ہے، وہ اپنی حکمت کے مطابق جب چاہتا ہے عذاب بھیج دیتا ہے، اور حتیٰ المقدور عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا، اس کا رحم وکرم بے حد اور بے مثال ہے۔ البتہ دنیا میں عذاب نہ بھیجنے پر کوئی مغرور نہ ہو، آخرت کا عذاب اٹل اور پختہ ہے، کفار ومشرکین آخرت میں ہر لطف وکرم سے محروم ہی رہیں گے۔

❁ ❁ ❁

سَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَيۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ
الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ حَتّٰى ذَاقُوۡا بَاۡسَنَا ؕ قُلۡ هَلۡ عِنۡدَكُمۡ مِّنۡ عِلۡمٍ فَتُخۡرِجُوۡهُ لَنَا ؕ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ
اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَخۡرُصُوۡنَ ۝١٤٨ قُلۡ فَلِلّٰهِ الۡحُجَّةُ الۡبَالِغَةُ ۚ فَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰٮكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝١٤٩
قُلۡ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيۡنَ يَشۡهَدُوۡنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنۡ شَهِدُوۡا فَلَا تَشۡهَدۡ مَعَهُمۡ ۚ
وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ وَهُمۡ بِرَبِّهِمۡ يَعۡدِلُوۡنَ ۝١٥٠

ترجمہ: جن لوگوں نے شرک کیا وہ عنقریب یوں کہیں گے کہ: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، اور نہ ہمارے باپ دادے، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے، اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھ لیا۔ آپ فرمادیجئے: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے؟ سو تم اسے ہمارے سامنے ظاہر کرو، تم صرف گمان کے پیچھے چلتے ہو، اور صرف اٹکل سے باتیں کرتے ہو۝١٤٨ آپ فرمادیجئے کہ: اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے حجتِ بالغہ، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۝١٤٩ آپ فرمادیجئے کہ: لے آؤ اپنے گواہوں کو

جواس بات کی گواہی دیتے ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا، سو اگر وہ گواہی دیں تو آپ ان کے ساتھ گواہی نہ دیں، اور آپ ان لوگوں کی خواہش کا اتباع نہ کریں جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور دوسروں کو اپنے ربّ کے برابر ٹھہراتے ہیں ﴿۱۵۰﴾

معارف ومنازل

انسان کی فطرت اور ایسا مزاج ہے کہ گناہ بھی کرتا ہے، اور گناہ کے ساتھ حجت بازی بھی، نہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے، نہ کسی کی نشاندہی پر تسلیم کرتا ہے، ہٹ دھرمی اس کی عادت ہے، اِلّا ماشاء اللہ۔ مخلص اور صادق مسلمان اس قسم کی ضد وعناد سے پاک ہیں، مگر کافر اپنی بدبختی اور شیطانی فریب کی بنیاد پر یہ چاہتا ہے کہ اپنی رائے اور اپنی طبیعت کے مطابق کام بھی کرتا رہوں، اور جو شخص گناہگاری پر تنبیہ کرے جواب دے کر اس کا منہ بھی بند کردوں، اور اس کے لئے طرح طرح کی تروخشک دلیلیں تراشتا ہے، اور منگھڑت حجتیں نکالتا ہے۔

مشرکین کو جب بتایا گیا کہ خالق ومالک جل جلالہ کے ساتھ شرک کرتے ہو، حالانکہ وہی خالق ومالک رازق خودمختار ہے، اور تم اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ شانہ کی مخلوق میں تحریم کی رسمیں جاری کرتے ہو، اور حلال چیزوں کو حرام قراردیتے ہو، تو اس کے جواب میں مشرکین نے یہ حجت بازی شروع کی کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے، اور ہم نے اور ہمارے باپ دادوں نے جو شرک کیا، اور جو حلال چیزوں کو حرام قرار دیدیا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہوا، اگر وہ ہمارے اس عقیدہ وعمل سے ناراض ہوتا تو یہ سب کچھ ہمیں کیوں کرنے دیتا؟

ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ان عقائد اور اعمال سے ناراض ہے تو ہمیں ان کاموں سے روکتا کیوں نہیں؟ اور کیوں ہمیں بدستور کرنے دیتا ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا﴾ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ان لوگوں نے حجت نکالی اور رسولوں کی تکذیب کی، یہاں تک کہ ہمارا عذاب چکھ لیا، اسی طرح یہ لوگ بھی تکذیب کررہے ہیں، ان کو بھی عذاب کا منتظر رہنا چاہئے۔ ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾﴾ [المرسلات] (کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے بعد والوں کو بھی چلتا کردیں گے۔ ایسا ہی سلوک ہم مجرموں کے ساتھ کیا کرتے ہیں)۔

ان لوگوں نے اپنے عقیدہ اور عمل کے بارے میں دلیل دی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ شانہ راضی نہ ہوتا تو ہمیں شرک پر کیوں قائم رہنے دیتا؟ اس کے جواب میں فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ آپ فرما دیجئے: کیا تمہارے پاس کوئی ایسا علم ہے جسے تم ہمارے لئے ظاہر کرو؟ یہ استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس نہ کوئی علم ہے، اور نہ کوئی ثبوت، جس پر تمہاری حجت قائم ہو، بلکہ:

﴿اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ﴾ تم صرف گمان کے پیچھے چلتے ہو، اور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تم اٹکل سے بے بنیاد بات کرتے ہو، اور یہ جو تم نے دلیل دی ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی نہ ہوتا تو ہمیں دینِ شرک پر کیوں قائم رہنے دیتا؟ اور ہم اپنی طرف سے چیزوں کو کیوں حرام قرار دیتے؟ یہ دلیل جاہلانہ اور نہایت احمقانہ ہے۔

یہ محض تمہارا ایک بے بنیاد خیال ہے، اور سراسر ایک اٹکل ہے، اللہ تعالیٰ شانہ نے انسانوں کو دنیا میں ابتلاء اور امتحان کے لئے بھیجا ہے، اور انہیں اچھے اور برے ہر کام کا مکمل اختیار دیا ہوا ہے، اور امتحان اس صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ عمل کرنے والوں کو احکام دیئے جائیں، اور اوامر ونواہی پہنچا دیئے جائیں، ان کو عمل کرنے نہ کرنے کا اختیار بھی ہو، اگر انسان کو تکوینی طور پر مجبور کیا جاتا کہ چاہتے نہ چاہتے فلاں عمل ضرور کرے، اور عمل کرنے نہ کرنے کا اختیار نہ ہوتا، بلکہ عمل کرنے پر مجبور ہوتا، تو ابتلاء وامتحان کیسے ہوتا؟

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ اس نے بندوں کو عقل اور ہوش دیدیا، اور عمل کرنے کی قوت بھی دیدی، اور کرنے نہ کرنے کا اختیار بھی دیدیا، اب جو شخص شرک اختیار کرتا ہے، اور اپنے ظن وگمان سے چیزوں کی تحلیل اور تحریم کرتا ہے، پس وہ اپنے اختیار سے کرنے کی وجہ سے ماخوذ ہے، ہوتا تو سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ وجود میں آئے اللہ تعالیٰ اس سے راضی بھی ہو، وہ راضی ان اعمال سے ہے جن کے بارے میں اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ صاف صاف بتادیا کہ یہ عقائد اور اعمال میری رضا کے ہیں، اور جو عقائد غلط ہوں، اور جو اعمال وافعال ممنوع ہوں، وہ میری مرضی کے خلاف ہیں۔

پس مکلف انسان اپنے اختیار سے اگر غیر مرضیات کا ارتکاب کر رہا ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے جب روکتا نہیں، تو وہ میرے اس غلط عمل پر راضی ہے، تو کیا کوئی چور یہ کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے

مجھے چوری سے نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے راضی ہے؟ پس یہ تمہارا عمل اس کی رضا کی نشانی اور علامت نہیں، کیونکہ اس نے تمہیں اچھے برے دونوں کا مکمل اختیار دیا ہوا ہے۔

تم زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہو کہ وہ میرے شرک اور کفر سے باخبر و عالم ہے، تو یاد رکھو کسی چیز کا علم اس کی رضا کی علامت نہیں ہوتی۔ ٹھیک ہے اس کو تمہارے شرک کا مکمل علم حاصل ہے، مگر امتحان و ابتلاء اسی میں ہے کہ تمہارے ہاتھ پکڑ کر تمہیں کسی عمل پر مجبور نہ کرے، اور کھلی چھٹی دے کر آزمالے کہ تم کیا کرتے ہو۔

﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ آپ فرمادیجئے کہ: اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے حجۃ بالغہ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی حجت کامل اور پوری ہے، اور تمہاری کٹ حجتی ناقص اور غلط ہے، اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت پر لے آتا، لیکن چونکہ حق اور باطل دونوں کے وجود میں آنے اور باہمی ایک دوسرے کے مقابل چلنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اِیصال اِلیٰ المطلوب والی ہدایت سے سب کو نہیں نوازا۔ البتہ ہدایت بمعنی اِرادۃ الطریق راہِ حق بتانے والی سب کے لئے عام ہے، تاکہ اِتمامِ حجت ہو۔

﴿هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ﴾ آپ فرمادیجئے کہ: اپنے گواہوں کو لے آؤ، جن کا تم اتباع کرتے ہو، اور جن کے حکموں پر چلتے ہو، اور ان سے کہو کہ اس بات کی گواہی دیں کہ یہ چیزیں جو تم نے حرام کر رکھی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، لیکن وہ گواہی نہیں دے سکتے، سو بالفرض اگر یہ گواہی دیں تو آپ ان کے ساتھ گواہی نہ دیجئے۔

مطلب یہ ہے کہ آپ ان جھوٹوں کی تصدیق نہ کریں۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾

آپ ان کی خواہش کا اتباع نہ کریں جنہوں نے نفسانی اور شیطانی خواہشات پر چل کر ہماری آیات کو جھٹلایا، اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے ربّ کے برابر باطل معبودوں کو ٹھہراتے ہیں، اور انہیں اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کرتے ہیں، وہ گمراہ اور حق سے تجاوز کرنے والے بے انصاف اور دوزخی ہیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا

أَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ إِمۡلَاقٍ ۖ نَّحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَإِيَّاهُمۡ ۖ وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا
بَطَنَ ۖ وَلَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالۡحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّاكُمۡ بِهِ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُونَ ﴿۱۵۱﴾
وَلَا تَقۡرَبُوا مَالَ الۡيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيزَانَ
بِالۡقِسۡطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَا ۖ وَإِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوا وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبَىٰ ۖ وَبِعَهۡدِ
اللَّهِ أَوۡفُوا ۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّاكُمۡ بِهِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ ﴿۱۵۲﴾ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسۡتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَنۡ سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّاكُمۡ بِهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ﴿۱۵۳﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ: آؤمیں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر بتاؤں جوتمہارے ربّ نے تم پرحرام کی ہیں، یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی چیز کوشریک نہ ٹھہراؤ، اوراپنے والدین کے ساتھ احسان کرو، اوراپنی اولادکوتنگدستی کے ڈرسے قتل نہ کرو، ہم تم کورزق دیں گے، اوران کو بھی، اورمت قریب جاؤ بے حیائی کے کاموں کے جوان میں سے ظاہرہیں اورجوپوشیدہ ہیں، اورمت قتل کرواس جان کوجسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا،مگرحق کے ساتھ، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں تاکیدی حکم دیاہے، تاکہ تم عقل سے کام لو ﴿۱۵۱﴾ اورقریب مت جاؤیتیم کے مال کےمگراسی طریقے سے جواچھاہو، یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کوپہنچ جائے۔ ناپ اورتول کوانصاف کے ساتھ پوراکرو، ہم کسی جان کواس کی طاقت سے زیادہ عمل کرنے کاحکم نہیں دیتے، اورجب تم بات کروتوانصاف کواختیارکرو، اگرچہ وہ تمہارا قرابت دارہی ہو، اوراللہ تعالیٰ کے عہدکوپوراکرو، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں تاکیدی حکم دیا، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۱۵۲﴾ اوربلاشبہ یہ میراسیدھاراستہ ہے، سوتم اس کااتباع کرو، اورمت اتباع کرودوسرے راستوں کا ،سووہ راستے تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستہ سے ہٹادیں گے، یہ وہ چیزیں ہیں جن کاتمہیں تاکیدی حکم دیاہے، تاکہ تم تقویٰ اختیارکرو ﴿۱۵۳﴾

معارف ومنازل

مسائلِ عشرہ جوتورات وانجیل اورقرآن حکیم تینوں میں مشترک ہیں:

یہ دس چیزیں ایسی ہیں جن کاذکروبیان تورات اورانجیل دونوں میں ہے۔ تورات کے شروع میں ان دس

امور کا تذکرہ ہے، گویا یہ امور آسمانی شریعت کے اصول میں شمار ہیں، اسی وجہ سے تمام شرائعِ سابقہ میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سے بعض اوامر ہیں اور بعض نواہی، جن چیزوں کو بصورتِ امر بیان فرمایا، چونکہ ان کے مقابل چیزیں حرام ہیں اس لئے یوں بیان فرمایا کہ آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے ربّ نے تم پر حرام کی ہیں:

(۱)......اپنے ربّ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

(۲)......والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

(۳)......اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔

قتلِ اولاد کے اسباب:

عرب کے جاہل و بے رحم اپنی اولاد کو عموماً دو وجہ سے قتل کر دیتے تھے: اول یہ کہ یہ بچے کھائیں گے کہاں سے؟ ان کو کھلانے سے فقر و فاقہ آجائے گا، یہ نہیں سمجھتے تھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ خالق ہیں اسی طرح رازق بھی ہیں، جب اسے پیدا کیا تو رزق ضرور دے گا، اسی لئے فرمایا ہم تمہیں رزق دیں گے اور انہیں بھی۔ اولاد کو قتل کرنے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ عرب کے بعض علاقوں اور بعض خاندانوں میں جس کسی کے گھر میں لڑکی پیدا ہو جاتی تو وہ مارے شرم کے لوگوں کے پاس نہیں آتا تھا، منہ چھپا چھپا کر پھرتا تھا، جیسا کہ سورۂ نحل میں ہے: ﴿يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ﴾ [النحل: ۵۹] (اس خوشخبری کو برا سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے)۔

جب بچی پیدا ہوتی تھی تو اسی وقت اسے زندہ درگور کرتے تھے، اسی کو سورۃ التکویر میں یوں بیان فرمایا: ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝﴾ [التکویر: ۹] (اور جس بچی کو زندہ قبر میں گاڑ دیا گیا تھا اس سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم میں قتل کیا گیا؟)۔ اس رسمِ بد کی پوری تفصیل سورۃ التکویر کے فوائد میں ملاحظہ کریں۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ﴾

(۴)......بے حیائی سے بچو، یعنی بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، جو ظاہر ہیں اور جو باطن ہیں۔ اس میں ہر طرح کی بے حیائی کے کاموں کی ممانعت آگئی، زنا، لوازماتِ زنا، بے پردگی، برہنہ، اور ننگا پھرنا، غرض یہ کہ شرعی بے حیائی ہو یا عرفی سب ممنوع اور حرام ہیں۔ سنن ترمذی میں ہے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چار چیزیں پیغمبروں علیہم السلام کے سنن و پسندیدہ چیزیں ہیں: (۱) حیاء۔ (۲) عطر لگانا۔ (۳) مسواک کرنا۔ (۴) نکاح کرنا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس کی حیاء نہ ہو اس کا ایمان نہیں۔[مشکوٰۃ]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک حیاء اور ایمان دونوں ساتھ ساتھ ہیں، سو جب ان میں سے ایک اٹھا دیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اٹھالیا جاتا ہے۔[مشکوٰۃ]

(۵)......ناجائز طور پر خون کرنے کی ممانعت۔ فرمایا کسی جان کو قتل نہ کرو جس کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا۔ البتہ حق کے ساتھ حرام نہیں، جیسے شادی شدہ زانی کا قتل، یا مرتد کا قتل، یا قتل کے قصاص میں قتل کرنا۔ قتلِ مسلم کا گناہ اور وبال نہایت سنگین ہے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آسمان و زمین والے سب مل کر اگر کسی مؤمن کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان سب کو اوندھا منہ کرکے دوزخ میں ڈال دے گا۔[مشکوٰۃ]

(۶)......یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، سوائے اس صورت کے کہ اچھی خیر خواہی اور خدمت گاری کی صورت ہو۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا﴾[النساء: ۱۰] (یقیناً جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں، اور انہیں جلد ہی ایک دہکتی آگ میں داخل ہونا ہوگا)۔

یتیم کے مال کے متعلق سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور متعدد سورتوں میں اور بکثرت صحیح احادیث میں ہدایات ہیں، ان کے خلاف کرنا گویا کہ جہنم کی آگ اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

(۷)......انصاف کے ساتھ ناپ تول کو پورا کرو، بہت سے لوگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اپنے لئے پورا پورا وصول کرتے ہیں، اور دوسرں کو کم کر کے دیتے ہیں، یہ اتنا سخت کبیرہ گناہ ہے کہ قابلِ معافی نہیں۔ اس کی اقسام اور تمام احکام کی تفصیل سورۃ المطفّفین میں ہے، وہاں دیکھا جائے۔

ایک پوری قوم کی بربادی اور آسمانی عذاب کے ذریعہ ان کی ہلاکت کے واقعات بار بار قرآن حکیم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے کہ قوم شعیب علیہ السلام ایک چیخ کے ساتھ مکمل ہلاک ہوگئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جس قوم میں خیانت کا رواج ہو جائے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں دشمن کا رُعب ڈال دے گا، اور جس قوم میں زنا کاری پھیل جائے ان میں موت زیادہ ہوگی (طبعی موت اور قتل دونوں) اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کریں گے ان کا رزق منقطع ہو جائے گا، اور جو لوگ عہد کی خلاف ورزی کریں

گے ان پر دشمن مسلط کر دیئے جائیں گے۔[رواہ مالک في الموطأ]

فائدہ:

ناپ تول میں کمی کرنے کو تطفیف کہتے ہیں۔تطفیف کے تمام شعبے اور اقسام حرام ہیں،اسی طرح جو لوگ ملازم اور مزدور اور پورا وقت نہیں دیتے اور تنخواہ پوری لیتے ہیں یہ بھی تطفیف ہے اور حرام ہے۔پوری تفصیل سورۃ المطففین کی تفسیر میں دیکھ لیں۔

(۸)...... اِنصاف کی بات کرو، یعنی جب بھی بات کہو تو اِنصاف کو سامنے رکھو، اور یہ نہ دیکھو کہ ہماری اِنصاف کی بات کس کے مخالف پڑے گی۔دوسروں کے بارے میں اِنصاف کرنا ذرا آسان ہوتا ہے،مگر اپنے بارے میں اور اپنے عزیزوں کے بارے میں سخت اور مشکل ہوتا ہے،اسی میں ایمان کا امتحان ہے۔گواہی دینی ہو تو حق کے موافق گواہی دو، اِنصاف کرنا ہو تو حق کے موافق فیصلہ کرو،اگر تمہارا قریبی عزیز ہو اور اس کے خلاف سچی گواہی دینی پڑے،اور اس کے خلاف حق کا فیصلہ کرنا پڑے ایسے وقت میں عباد الرحمن اور عباد الشیطان کا بخوبی امتیاز ہوگا،پس جن لوگوں کے دل خوفِ خدا اور محبتِ الٰہی واتباعِ سنت سے لبریز ہوں وہ ایسے منصفانہ فیصلے کرتے ہیں جن کے انوار و برکات سے پورا معاشرہ منور ہو جاتا ہے،ورنہ تو ظاہر ہے کہ معاشرہ پر ابلیس اور اس کے گماشتوں کا راج ہوگا،اور اِنصاف کا خون ہوگا۔

(۹)...... اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو۔یہ مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کے تیسرے رکوع،اور سورۂ مائدہ کے شروع میں گزر چکا ہے۔

(۱۰)......صراط مستقیم کا اتباع کرو، بے شک یہ میرا سیدھا راستہ ہے،پس تم اس کا اتباع کرو،اور دوسرے راستوں سے اجتناب کرو،کیونکہ دوسرے جتنے راستے ہیں وہ سب ٹیڑھے اور کج ہیں،اور وہ سب شیطانی راستے ہیں، وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستے سے دور کریں گے،ہٹا دیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرمایا،اور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کا مُبلّغ (بیان کرنے والا) بنایا، اور ساری خلقت پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت فرض کی۔

اللہ تعالیٰ اور سورل اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت صراط مستقیم ہے،اور یہی سیدھا راستہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام اور علماء سلف رحمہم اللہ علیہم سے لے کر ہم تک صحت کے ساتھ پہنچا ہے۔فرمایا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى

اللهِ عَلٰی بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ﴾ [یوسف:۱۰۸] (کہہ دو کہ: یہ میرا راستہ ہے، میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی)۔

پس جو لوگ یہود ونصاریٰ ہیں، یا مسلمان ہیں مگر اتباعِ سنت نہیں کرتے، وہ اپنی خواہشات اور بدعات و رسوم کا اتباع کرتے ہیں، وہ صراطِ مستقیم اور سیدھی راہ پر نہیں ہیں، وہ مدّعی اسلام ہوتے ہوئے مشرک اور سنت کے باغی ہیں، ایسے لوگ ملحد اور زندیق ہیں، ان کا شمار دشمنانِ اسلام میں ہے۔

جو لوگ مکمل اتباعِ سنت کرتے ہیں، اپنے پیٹ کا ہر قسم کی ناپاک غذاء سے تحفظ کرتے ہیں، اور زمانۂ خیر القرون کے بعد جو بدعات دین کے نام پر ایجاد ہوئی ہے، اِن سب سے پرہیز کرتے ہیں، یہی لوگ متبعِ شریعت وسنت، موحّد اور حق والے کہلاتے ہیں، ان کے برعکس جو لوگ اپنی خواہشات کے مطابق دین بناتے ہیں، ان کے اعمال کا خیر القرون میں وجود تک نہیں۔ اتباعِ سنت کی بجائے اہل کتاب سے، اور کچھ شیاطین سے مسائل سیکھ کر بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ یہ سارے پیٹ کے غلام ہیں، اور سنّت نبوی کے دشمن ہیں، یہود ونصاریٰ نے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ﴾ [المائدة:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے، اور اس کے محبوب ہیں) کہا، اور ان لوگوں نے ان کے نعرے میں تبدیلی کر کے اپنے کو عاشق کا درجہ دیدیا۔

دعویٰ محبت میں بدعات سے الفت کیوں ☆ سنت کی ضیاؤں میں بدعات کی ظلمت کیوں

ان لوگوں کے راستے پر جو شخص چلے گا وہ صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا، اور قبروں مقبروں پر سجدہ ریز ہو کر قبروں کا طواف شروع کرے گا، وہ سراسر اسلام کا دشمن ہوگا، جو اس کی توقیر واحترام کرے گا وہ اسلام کے قلعے کے منہدم کرنے میں اس کا شریک ہوگا۔ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَهٗ عَلٰی هَدْمِ الْاِسْلَامِ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچا، اور فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے، اور اس کے دائیں بائیں بہت سے خطوط کھینچے، اور فرمایا: یہ مختلف راستے ہیں، ان میں سے ہر راستہ پر شیطان ہے، جو اس کی طرف بلاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ﴾ [أحمد، نسائي، دارمي وغيره] پھر ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تمہیں اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا (یہ کلمات ان امورِ عشرہ میں تین مرتبہ مذکور ہوئے) تاکہ تم (۱) عقل سے کام لو، تاکہ تم (۲) نصیحت حاصل کرو۔ اب

فرمایا: تا کہ تم (۳) تقویٰ اختیار کرو۔ تقویٰ اختیار کرنے میں ہر بات آگئی، عقائدِ باطلہ اور شرک سے اجتناب، افکارِ باطلہ اور عقائدِ مردودہ کفریہ سے بیزاری، اوامرِ الٰہیہ کی پابندی اور منہیات سے بیزاری، اور بدعات سے اجتناب۔ مطلب یہ ہے کہ مکمل قرآن وسنت پر عمل پیرا ہونا یہ تمام امورِ عشرہ وغیرہ سب تقویٰ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

فائدہ:

آیاتِ بالا میں دس (۱۰) باتوں کا حکم دیا ہے، یہ دس باتیں بہت اہم اور نہایت ضروری ہیں، ان میں حقوق اللہ وحقوق العباد سب کا بیان وتاکید ہے، اور آخر میں صراط مستقیم کا بیان ہے، اور اس سے ہٹنے کی ممانعت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو دیکھنا چاہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر لگی ہوئی ہے تو یہ آیت بالا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تک پڑھ لے یعنی ﴿قُلْ تَعَالَوْا﴾ سے آخر ﴿تَتَّقُوْنَ﴾ تک۔ [رواه الترمذي في تفسير سورة الأنعام]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورۂ انعام میں یہ آیات محکمات ہیں، جو اُمّ الکتاب ہیں، پھر انہوں نے آیات بالا کی تلاوت کی۔ [ابن کثیر]

....

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ۝ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ۝

ترجمہ: پھر ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب دی جس سے اچھے عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہوگئی، اور جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان ہے، اور جو ہدایت ہے، اور رحمت ہے، تا کہ وہ اپنے ربّ کی ملاقات کا یقین کریں۝ اور یہ کتاب ہم نے نازل کی جو بابرکت ہے، سو اس کا اتباع کرو، اور ڈرتے رہو، تا کہ تم پر رحمت ہو۝ تا کہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ: ہم سے پہلے دو جماعتوں (یہود ونصاریٰ) پر کتاب نازل ہوئی تھی، اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے

غافل تھے ﴿۱۵۶﴾ یا تم یوں کہنے لگتے کہ: اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان لوگوں سے بڑھ کر زیادہ ہدایت پر چلنے والے ہوتے، سو تمہارے ربّ کی طرف سے دلیل اور ہدایت اور رحمت آ گئی ہے، پس اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائے، اور ان سے روکے؟ ہم عنقریب ان کو برے عذاب کی سزا دیں گے، جو ہماری آیات سے روکتے ہیں، اس وجہ سے کہ وہ روکا کرتے تھے ﴿۱۵۷﴾

معارف ومنازل

توریت ہدایت اور رحمت والی جامع کتاب تھی:

یہاں ثُمَّ ترتیبِ ذکری کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ دس (۱۰) باتوں کے بعد یہ بات جان لو کہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی تھی، اور اس میں ان لوگوں کے لئے نعمت کی تکمیل ہے جو نیکوکار ہیں جو اس کتاب پر اچھی طرح عمل کریں گے، اور یہ کتاب ایسی تھی جس میں ہر چیز تفصیل سے بیان ہوئی تھی، اور رحمت بھی۔ اس کتاب سے توریت شریف مراد ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی، تاکہ بنی اسرائیل اس کتاب پر ایمان لائیں، اور آخرت کی تصدیق کریں۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں دیکھیں۔

قرآن پاک سرچشمۂ ہدایت اور سراسر رحمت اور نور ہے:

قرآن حکیم تمام آسمانی ہدایات کا آخری بابرکت نور اور ہدایتوں کا جامع صحیفہ ہے، توریت کے بعد قرآن حکیم کے متعلق فرمایا کہ ہم نے یہ بابرکت کتاب نازل کی جو مبارک ہے، یعنی دین و دنیا کے اعتبار سے اس میں خیر ہی خیر ہے، لہٰذا تم مکمل اس کا اتباع کرو، اور تقویٰ اختیار کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اور دین و دنیا کی سعادتوں سے تمہیں نوازا جائے۔

اہل عرب کی کٹ حجتی ان کی فطرت ومزاج کا حصہ ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان پر اتمامِ حجت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ تم یوں کہنے لگو کہ: ہم سے پہلے دو جماعتوں پر (یہود و نصاریٰ پر) کتاب نازل ہوئی تھی، اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے غافل تھے، وہ ہماری زبان میں نہ تھی، لہٰذا ہم اس سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرما کر کافروں کے عذر کو ختم کر دیا، اور یہ بھی ممکن تھا کہ تم یوں کہتے کہ ہمیں کتاب نہیں دی گئی، اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم خوب اچھی طرح عمل کرتے، اور گزشتہ

اقوام سے زیادہ ہدایت یافتہ بن جاتے، اور اعمال میں ان سے زیادہ بڑھ چڑھ کر ثابت ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ﴾ تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے، یعنی قرآن کریم، وہ سراسر ہدایت ہے، اور رحمت بھی، اب اس پر عمل کر کے ہدایت و رحمت حاصل کرو، چونکہ وہ لوگ انقیاد و تسلیم اور ایمان سے بہت دور تھے، تو فرمایا:

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا﴾ اس شخص سے بڑھ کر بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائے؟ اور جو شخص اگر ان پر عمل کرنا چاہے تو یہ اس کو اس پر عمل کرنے سے روک دے؟ جیسے مشرکینِ مکہ مسلسل اس عملِ بد کا ارتکاب کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل نہ کرنا، اور اس کی تکذیب کرنا، اور دوسروں کو منع کرنا، اور روکنا یہ سارے جرائم ہلاکت و تباہی کے اسباب ہیں، تو فرمایا:

﴿سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ﴾ جو لوگ ہماری آیات سے روکتے ہیں ہم ان کے اس عمل کی وجہ سے انہیں برا عذاب دیں گے، یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے تھے کہ ہم سے پہلے اہل کتاب کو کتاب دی گئی تھی، ہم ان کی لغت کو نہیں جانتے تھے، اب جب ان کی اپنی لغت عربی میں کتاب اللہ نازل ہوگئی تو ان کا یہ عذر و بہانہ ختم ہوگیا۔ اسی طرح وہ کہتے تھے کہ اگر ہم پر نازل ہوتی تو ہم ایسا ایسا کرتے، اور یوں عمل کر کے جوہر دکھاتے، اور خوب بڑھ چڑھ کر ہدایت میں آگے بڑھتے، اس بارے میں ان پر حجت پوری ہوگئی۔ مزید تفصیل سورۂ شعراء کے آخر میں آئے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

........❁........❁........❁........

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ
رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ
مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

ترجمہ: یہ لوگ بس اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں، یا آپ کا رب آجائے، یا آپ کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی ایک نشانی آجائے، جس دن آپ کے رب کی نشانیوں میں سے ایک نشانی آجائے گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا، جو پہلے سے ایمان نہیں لایا تھا، جس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک

عمل نہ کیا ہو، آپ فرما دیجئے کہ: تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کر رہے ہیں ﴿۱۵۸﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کا بے شمار فضل وکرم ہے کہ اپنے بندوں کے لاکھوں، بلکہ بے شمار خطاؤں سے توبہ وندامت کے ساتھ درگزر فرماتے ہیں، اگر قیامت کے روز مشرک جیسے ظلم وزیادتی کی مغفرت نہیں ہوسکتی تو اس سے یہ اخذ کرنا کہ دنیا میں بھی یہی قانون ہے ہرگز نہیں، اگر ہزار سالہ کافر ومشرک موت کے غرغرہ سے پہلے توبہ کرے گا، اور اخلاص کے ساتھ کلمۂ طیبہ پڑھ کر اپنے ہزار سالہ شرک سے تائب ہوگا، تو اس کے ہزار سالہ ہر قسم کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ گناہ گاروں کے بار بار توبہ سے ناراض نہیں ہوتے، بلکہ بڑے خوش ہوتے ہیں، توبہ کی قبولیت کے لئے جو شرائط مقرر ہیں ان میں سے اہم ترین شرط یہ ہے کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، کیونکہ اس کے ساتھ توبہ کا دروازہ ہی بند ہوگا۔

جب سورج کا مغرب سے طلوع ہوگا تو ہر قسم کی توبہ کا دروازہ بند ہوگا:

پہلی آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارے پاس جو واضح حجت آچکی ہے، قرآن نازل ہو چکا ہے، جو ہدایت بھی ہے، اور رحمت بھی، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ حق واضح ہونے کے بعد اور ہدایت سامنے آجانے کے بعد اب کسی انتظار کی ضرورت نہیں، بس کفر وشرک سے تائب ہو کر حق قبول کرو، اور ہدایت کو سینے کے ساتھ لگاؤ، اب بھی حق قبول نہیں کرتے تو کیا انتظار ہے؟ (ان کا ڈھنگ ایسا ہے) جیسے اسی انتظار میں ہیں کہ فرشتے ان کے پاس آجائیں، یا اللہ تعالیٰ ہی ان کے پاس تشریف لائے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی بڑی نشانی کے انتظار میں ہیں۔

لیکن خوب یاد رکھو! جس دن اس کی ایک نشانی ظاہر ہو جائے گی تو کسی کافر کو اس وقت اس کا ایمان لانا نفع نہ دے گا، اور جو کوئی صاحب ایمان بداعمالیوں میں مبتلا ہو جس نے اپنے ایمان میں کوئی عمل خیر نہ کیا ہو اس کی بھی توبہ قبول نہ ہوگی۔

﴿بَعۡضُ اٰیٰتِ﴾ بعض آیات سے مراد یہ ہے کہ مغرب کی جانب سے سورج طلوع کرے، جب مغرب کی طرف سے سورج نکلے گا تو کسی کافر کو ایمان لانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، اور ایسی حالت میں ایمان معتبر نہ ہوگا، جب قیامت ہوگی تو اس وقت سب لوگ مومن ہو جائیں گے، مگر اس وقت ایمان لانا بے مقصد اور بے فائدہ ہوگا۔ مغرب

سے سورج کا طلوع کرنا بہت بڑی نشانی ہے، اس وقت ہر قسم کے گناہوں کی مغفرت کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ اسی طرح جو شخص موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جسے غرغرہ کا وقت کہتے ہیں، ایسے وقت میں بھی توبہ قبول نہ ہوگی، اور اگر کوئی کافر (فرعون کی طرح) اپنے ایمان کا اقرار کر کے کلمہ پڑھے گا تو یہ بھی قبول نہیں ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک مغرب سے سورج کا طلوع نہ ہو، سو جب سورج مغرب سے طلوع کرے گا، اور لوگ اسے دیکھ لیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے، اور اس وقت کسی شخص کو ایمان نفع نہ دے گا، اس کے بعد آپ ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ [بخاری]

حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مغرب کی جانب ایک دروازہ بنایا ہے، جو اتنا چوڑا ہے کہ اس کی دونوں جانبوں کے درمیان ستر (۷۰) سال تک چل سکتے ہیں، یہ دروازہ توبہ کا دروازہ ہے، جب تک اس کی جانب سے سورج نہیں نکلے گا اس وقت تک بند نہ کیا جائے گا، اور اس وقت تک توبہ قبول ہوتی رہے گی، اللہ تعالیٰ جل شانہ نے: ﴿يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ﴾ میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔ [ترمذي وابن ماجة]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ ہجرت منقطع نہ ہوگی جب تک توبہ منقطع نہ ہوگی، اور توبہ منقطع نہ ہوگی جب تک مغرب سے سورج نہ طلوع کرے۔ [أبو داؤد، والدارمي]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ظاہر ہونے کے اعتبار سے سب سے پہلی نشانی مغرب سے سورج کا نکلنا، اور ﴿دَابَّةُ الْاَرْض﴾ کا ظاہر ہونا ہے، جو چاشت کے وقت لوگوں پر ظاہر ہوگا، ان دونوں میں سے جو بھی ظاہر ہوگی دوسری نشانی اس کے بعد قریبی زمانہ میں ظاہر ہوجائے گی۔ [مسلم]

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ مغرب سے سورج نکلنے سے پہلے ایک رات تین راتوں کے برابر ہوجائے گی، لوگ گھبرا اٹھیں گے کہ صبح ہوتی ہی نہیں، اور چیخنے لگیں گے، گھبرا کر مسجدوں کی طرف چلے جائیں گے، اچانک مغرب کی طرف سے سورج طلوع کرے گا، اور آسمان کے درمیان تک پہنچ کر واپس ہوجائے گا، اور اس کے بعد اپنے اسی مطلع سے طلوع کرے گا جہاں سے

ہر وقت طلوع کرتا تھا۔ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کر کے کوئی کلام نہیں کیا،صرف اتنا کہہ دیا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے،اور صحاح ستہ میں نہیں ہے۔فرمایا:

﴿قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ﴾ اس میں زجر اور تہدید ہے کہ وضوحِ حق کے بعد ایمان نہیں لاتے تو کب ایمان لائیں گے؟ جب مغرب سے نکلنے والی نشانی ظاہر ہوگی تو کیا اس وقت ایمان لائیں گے؟ لیکن اس وقت ایمان لے آنا مقبول و معتبر نہ ہوگا،لہٰذا اس سے پہلے ابھی سے ایمان لاؤ،اگر ایمان نہیں لاتے تو انتظار کرتے رہو،ہم بھی انتظار کرتے ہیں،آخر الامر وہ دن ضرور آجائے گا کہ ایمان والے جنت میں جائیں گے،اور کفر و شرک والے ابدی دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

فائدہ:

تقریباً علاماتِ قیامت تین سو کے قریب ہیں،اور بڑی بڑی علامتیں دس ہیں،اکثر لوگوں کو ان کی ترتیب میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں،اور ان کی تقدیم وتاخیر میں غلطی کرتے ہیں،سورۂ نمل کی آیت: ﴿وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ﴾ [النمل:۸۲] (اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان لوگوں پر آپہنچے گا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے) کے تحت پوری تفصیل ترتیب کے ساتھ بیان کریں۔ان شاء اللہ تعالیٰ

اس کے علاوہ ریاضی دان اور علم ہیئت پر ایمان لانے والے ملحد طلوع شمس من المغرب کے بارے میں بہت واویلا کرتے ہیں،کہ یہ محال ہے،اور جھوٹ ہے،اور یہ قطعاً ممکن ہی نہیں،وغیرہ۔دراصل ان زندیقوں کو نہ خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے،اور نہ ہی اس کی بے مثال صفات اور قدرتوں کا پتہ ہے،وہ کائنات اور اس کی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوق ہی نہیں سمجھتے ہیں،ان کے نزدیک یہ پورا عالم از خود موجود ہے،اور عناصر کے زور اور نشیب و فراز اسے چلا رہا ہے۔﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [الزمر:٦٧] (اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر ہی نہیں پہچانی جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا،حالانکہ پوری کی پوری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی،اور سارے کے سارے آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔وہ پاک ہے،اور بہت بالا و برتر اس شرک سے جس کا ارتکاب یہ لوگ کر رہے ہیں)۔

تو ندیدی گہے سلیمان را ☆ پس چہ دانی زبان مرغانرا
ہیچ چیزے خود بخود چیزے نشد ☆ ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد
(مثنوی)

....

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ
اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق کردی، اور گروہ گروہ بن گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، بس ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ ہی کے حوالہ ہے، پھر ان کے وہ کام ان کو جتادے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۵۹﴾

معارف ومنازل

انسان میں تو سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک پروردگار کو نہ مانے، یا مانے لیکن اس کے ساتھ شرک کرے، اور اللہ تعالیٰ نے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اپنا دین بھیجا اس کی تکذیب کرے، اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اور اس کے دین کو جھٹلائے۔ اور دوسری گمراہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بھی مانے، اس کے بھیجے ہوئے دین کے ماننے کا دعویدار بھی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی طرف سے ایسی باتیں داخل کرے جو اللہ تعالیٰ کے دین میں نہیں ہیں۔

شیطان کی یہ بہت بڑی چالاکی ہے، بہت سے لوگ جو یوں کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کیا جو اس نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ بھیجا، ان میں بعض لوگوں پر شیطان اپنا یہ داؤ چلاتا ہے، اور ان کو ایسے افکار و آراء اور اوہام واہواء پر ڈال دیتا ہے جن کی وجہ سے وہ خداوند قدوس کے بھیجے ہوئے دین کے دائرہ سے باہر ہو جاتے ہیں، مگر وہ اپنے فاسد خیال میں دین کے دائرہ میں ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں دین سے خارج ہوتے ہیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے ہیں، لیکن وہ بارگاہِ خداوندی میں مردود ہوتے ہیں۔

اس اُمّت سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں انہوں نے ایسی حرکتیں کیں، یہود ونصاریٰ کی گمراہی معروف ہے، یہودیوں کا دعویٰ تھا، اور اب بھی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے لاڈلے محبوب اور مقرب بندے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے دین

کو چھوڑ کر جس کی بنیاد ہی توحید پر ہے مشرک ہو گئے، اور حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سختی سے تکذیب کی، اور ان کے قتل کے در پے ہو گئے۔

پھر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں لائے، تورات میں مکتوب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کو حذف کر دیا، اور چھپا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں ضد وعناد کی بنیاد پر مشرکین اور بت پرستوں کی بت پرستی کو ترجیح دے کر اسلام کے مقابلہ میں ان کے دین کو اچھا اور برحق کہا، اور اسلام کے خلاف سیاسی سطح پر مشرکین کا ساتھ دیا۔

یہی حال جو یہود کا رہا نصاریٰ نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا، اور یہ بھی کہنے لگے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ ایک ذات کا نام ہے۔ اور ان کے بعض نے کہا کہ معبود تین ہیں: یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام بھی معبود ہیں۔ اس طرح ان کے بعض نے حضرت روح القدس علیہ السلام کو شامل کر لیا۔

پھر یہود نے انہیں گمراہ کر کے عقیدۂ کفارہ پر ڈال دیا، اب نصاریٰ اس بات کے معتقد ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قتل (العیاذ باللہ) ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، اب وہ یہ کہتے ہیں کہ قیامت تک نصاریٰ جتنے اور جس قسم کے گناہ کریں گے ان سے کوئی مواخذہ اور باز پرس نہیں ہوگی، ان سب گناہوں کا کفارہ ادا ہو چکا ہے، اور جب ہم ہر اتوار کو چرچ جائیں گے تو مزید کفارہ کی تجدید اور صفائی ہوگی، بس گناہ ختم اور حقوق ہضم (معاذ اللہ)۔

رہا مشرکین عرب کا معاملہ، یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہونے کے مدعی تھے، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین توحیدِ خالص کا سرچشمہ تھا، انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں، آگ میں ڈالے جانے تک منظور کیا، مگر توحید کی دعوت نہ چھوڑی، لیکن ان کے دین حنیف کے ماننے والوں نے (جن میں مشرکین عرب سرفہرست تھے) بت پرستی شروع کر دی، اور عین کعبہ شریف میں تین سو ساٹھ بت رکھ دیئے، اور اللہ تعالیٰ کی توحید سے منحرف ہو گئے۔

بت شکن خلیل اللہ علیہ السلام کے تعمیر کردہ بیت اللہ شریف کو بتوں سے بھر دیا، اور جب اسلام آیا، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے ابراہیمی توحید پیش کی، تو یہ گدھے کی طرح شور کرنے لگے، اور یہ توحید انہیں ایک غیر مانوس اجنبی معلوم ہوئی، اور کہنے لگے: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴾ [ص:۵] (کیا اس

نے سارے معبودوں کو ایک ہی معبود میں تبدیل کر دیا ہے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے)۔ اور جب ان کی بت پرستی کی مخالفت کی گئی اور بتایا گیا کہ یہ شرک ہے، اللہ تعالیٰ سے ایک قسم کی بغاوت ہے تو کہنے لگے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللهِ زُلْفَىٰ﴾ [الزمر:۳] یعنی ہم تو ان کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے نزدیک کرتے ہیں۔ اور کبھی کہتے تھے: ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِندَ اللهِ﴾ [یونس:۱۸] (یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں)۔ یہ ساری باتیں ملّتِ ابراہیمی کے خلاف تراش کر ایک دین کی حیثیت دے کر اس پر ڈٹے رہے، اور پھر بھی اسی خیال میں غرق رہے کہ ہم ابراہیمی ہیں، اور ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر چل رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں، اور اس کے وجود کو تسلیم بھی کرتے ہیں، لیکن اس کے رسولوں علیہم السلام کتابوں اور بھیجے ہوئے احکام کو نہیں مانتے، اور اللہ تعالیٰ کے دین میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی باتوں کو شامل کر کے ترمیم وتحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، اور خود تراشیدہ خواہشات کا اتباع کرتے ہیں، اور طرح طرح کی تفریق کر کے دین کی شکل و صورت اور اس کا اصلی حلیہ بگاڑ دیتے ہیں، یہود و نصاریٰ دونوں قوم اس طریق کار کے بانی اور ماہر ہیں۔

صاحب روح المعانی نے حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا کہ آیت بالا یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے دین کے ٹکرے ٹکرے کر دیئے، ہر فرقے نے کچھ لے لیا اور کچھ چھوڑ دیا۔ پھر لکھتے ہیں کہ یہ لوگ بہت سے مختلف فرقوں میں بٹ گئے، ہر فرقہ نے اپنا مستقل پیشوا بنالیا، اسی کے پیچھے چلتے رہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اپنے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا:

﴿لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ آپ ان سے بری ہیں، آپ کا منصب ہے اتباعِ حق، آپ کو ان ہوا پرستوں سے کیا واسطہ؟ آپ کا ان سے نہ کوئی تعلق ہے نہ مناسبت، آپ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے فرائض واحکام کی امانت داری اور نگہبانی کرنے والے ہیں، آپ خود معیارِ حق اور حق کے علمبردار ہیں۔

﴿إِنَّمَآ أَمْرُهُمْ إِلَى اللهِ﴾ آپ انہیں چھوڑ دیں، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فیصلہ فرمائے گا، اور ظالموں اور دینِ الٰہی میں تفرقہ ڈالنے والوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچائے گا، آپ سے ان کے بارے میں کوئی سوال نہ ہوگا۔

☆☆☆

اہلِ بدعت کی توبہ نہیں:

صاحب روح المعانی نے سنن ترمذی اور حلیہ ابونعیم اور شعب الایمان للبیہقی سے نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اے عائشہ! جن لوگوں نے اپنے دین سے جدائی اختیار کی، اور فرقے فرقے بن گئے، یہ بدعتوں والے لوگ ہیں، اور وہ لوگ ہیں جو اپنی خواہشوں پر چلتے ہیں، اور جو اس امت کے گمراہ لوگ ہیں، ان کے لئے کوئی توبہ نہیں۔ اے عائشہ! ہر گناہ والے کے لئے توبہ ہے سوائے اہل بدعت اور اصحاب اہواء کے، کیونکہ ان کے لئے توبہ نہیں، میں ان سے بری ہوں، اور وہ مجھ سے بری ہیں۔ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس روایت کے پیش نظر اب یوں کہا جائے گا کہ مشرکین کا حال بیان کرنے کے بعد اہلِ بدعت کا حال بیان فرمایا کہ اہلِ بدعت کا حال اہل شرک سے بعید نہیں ہے۔

گمراہ فرقوں کا تذکرہ:

شیطان اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ گمراہی پر لگاؤں۔ اول تو ایمان قبول نہیں کرنے دے گا، دوئم جو لوگ مؤمن ہیں ان کے دلوں میں ایمان کی طرف سے شکوک وشبہات ڈالتا ہے، پھر جو لوگ استقامت کے ساتھ ایمان پر رہیں، اور شکوک وشبہات سے متاثر نہ ہوں ان کو ایسی ایسی باتیں سمجھا دیتا ہے جو ایمان کے لئے خطرناک ہوتی ہیں۔

پہلی امتوں کے ساتھ اس نے جو حرکتیں کیں اس امت کے ساتھ بھی اس کا وہی طرزِ عمل ہے۔ اہل ایمان کے دلوں میں ایسے ایسے وساوس ڈالتا ہے جو گمراہی کی علامات ہوتی ہیں، خدا نہ کرے ایسی چیزیں ایمان کے لئے بڑی خطرناک ہوتی ہیں، اس امت میں جتنے ملحد اور زندیق گزرے ہیں یا فی زمانہ موجود ہیں، ایمان کا نام لیتے ہوئے بھی کفر اختیار کئے ہوئے ہیں، اور چونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو صحیح راہ پر سمجھتے ہیں اس لئے توبہ نہیں کرتے، توبہ تو وہ کرے گا جو خود کو غلطی پر سمجھے گا، یہی وہ نکتہ علمیہ ہے جس نے اہلِ بدعت پر طلوع شمس من المغرب سے پہلے توبہ کا دروازہ بند کیا ہوا ہے۔

جو لوگ اپنے امام کے اندر اللہ تعالیٰ کا حلول مانتے ہیں (جیسے شیعہ، اسماعیلیہ، علویہ اور بوہرہ وغیرہ) اور جو لوگ قرآن کریم کی تحریف کے قائل ہیں (جیسے روافض، اثنا عشریہ وغیرہم) اور جو لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خدا مانتے ہیں، اور جو لوگ ابو طالب کو پیغمبر مانتے ہیں، اور جو لوگ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے کے منکر ہیں،

اور جولوگ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل کو حجت نہیں مانتے، اور جولوگ عقیدۂ "بَدَا" کے قائل ہیں، یہ سب لوگ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے بَری ہیں، اسلام سے خارج ہیں، اور آنحضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سب سے بیزار ہیں۔

پھر اگر کوئی شخص ایسی بدعتِ اعتقادیہ میں مبتلا نہ ہوا جو اسلام سے نکال کر کفر میں داخل کر دے، تو شیطان اسے اعمالِ بدعت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اہلِ بدعت نے طرح طرح کے اعمالِ شرکیہ اور غیر شرعی رسوم کی آبیاری کی ہے، اور کر رہے ہیں، اور بدعات کی وجہ سے بہت سے فرقے بنے ہوئے ہیں، اور یہ سارے اہلِ بدعت سے توبہ کی توفیق اللہ تعالیٰ نے سلب فرمائی ہے، کیونکہ وہ ان غیر شرعی کفریہ وشرکیہ اعمال کو کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں، اور جس بدعت وشرک کو ثواب سمجھتے ہیں اس سے توبہ کیوں کرنے لگے؟

بدعت اعتقادی ہو یا عملی، اس کے ایجاد کرنے والوں کو اور اس پر عمل کرنے والوں کو "أصحاب الْأَهْوَاءِ" خواہشات کے بندے کہتے ہیں۔ أهواء هواء کی جمع ہے، ہر خواہش نفس کو عربی میں هواء کہتے ہیں۔ جو لوگ بدعتیں نکالتے ہیں وہ قرآن وحدیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اور اعمالِ حسنہ کی طرف رجوع نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ اپنے آپ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بہتر اور سنجیدہ سمجھتے ہیں، تب ہی تو ان کے خلاف بدعتوں اور شرکیہ اعمال کی بھرمار لگا کر سادہ لوح بے علم مسلمانوں کا ایمان خراب کرتے ہیں۔

اہلِ بدعت کے قلوب پر وہی مہر لگ چکی ہے جو مشرکین کے قلوب پر لگ چکی، اسی وجہ سے انہیں لاکھ سمجھاؤ کہ یہ عمل قرآن وسنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی اور اعمال کے خلاف ہے، مگر ہرگز نہیں مانتے، ان کے اعمال پچھلے لوگوں کی جہالت پر مبنی ہیں، جبکہ ان کے سرغنہ اور پیشوا محض حطام دنیا اور محبت ہوا وہوس کا شکار ہیں۔ سنتوں پر چلنے سے وہ خوش نہیں ہوتے، بدعتوں پر خوب میلہ اور چراغاں اور دیگر مخرّب اخلاق خرافات پر مر مٹتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت پر ضرور ایسا زمانہ آئے گا جیسا بنی اسرائیل پر آیا تھا (پوری طرح ان کے مطابق عمل کریں گے) جیسا کہ ایک جوتا دوسرے جوتا کے موافق بنایا ہوا ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی شخص اپنی ماں سے علانیہ زنا کرے گا تو میری امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو ایسا کریں گے۔ پھر فرمایا کہ بنی اسرائیل کے (۷۲) بہتر فرقے ہو گئے تھے، اور میری امت تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے، اور یہ سارے دوزخ میں ہوں گے، سوائے ایک ملت کے۔ صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ ملّتِ واحدہ کونسی ہے جو جنت والی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ "۔ کہ جس ملّت اور دین پر میں ہوں، اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں وہ جنت والی ہے۔ [ترمذي]

اب سارے فرقے غور کریں کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کس دین پر تھے؟ اور ان کی زندگی کے اعمال کس نہج پر تھے؟ انہوں نے پوری زندگی کن عقائد اور اعمال میں گزاری؟ ان کا مشرب کیا تھا؟ پس جو لوگ ان کے طریقے سے ہٹے ہوئے ہیں وہ اپنا انجام سوچ لیں۔ اور خاص طور پر وہ لوگ غور کریں جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے اور نہیں مانتے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی معیارِ حق ہیں، جنہوں نے اسلام اور اس کی تعلیمات کا تحفظ بھی کیا، اور پورے جہاں میں اشاعت بھی، پس جو لوگ ان کی زندگی میں عیب تلاش کر کے کیڑے نکالتے ہیں وہ یہودی ہیں، اور یا یہودیت کے کارندے۔

مکن عیبش کہ اولعنت زمیراث پدر دارد

فائدہ:

بعض بے علم لوگ جو اجتہاد اور استنباطِ شرعی سے ناواقف ہیں وہ لوگ چاروں اماموں کے چاروں مذہبوں کو بھی انہی فرقوں میں شمار کرتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں۔ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ دین کے پیشوا اور روشن چراغ گزرے ہیں، ان کے مسلک خیر وصلاح اور قرآن وحدیث سے استنباط واجتہاد پر مبنی برحق طریقے ہیں۔ ائمہ اربعہ کے مقلدین ایک ہی فرقہ ناجیہ اہل السنت والجماعۃ کے افراد ہیں، وہ سارے حضرات اصول میں متفق ہیں، اور جزئی مسائل میں اپنے اپنے اجتہاد پر عامل رہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا نہایت اچھے انداز میں احترام کرتے ہیں، ان کی زندگی اور زبان وقلم ہر قسم کے طعن وتشنیع سے پاک ہیں۔

چونکہ فروعی مسائل میں اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی تھا، اسی کو بنیاد بنا کر انہوں نے مسائل استنباط کئے، اور تمام فروعی مسائلِ اجتہادیہ میں صراط مستقیم اور کتاب وسنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اعمال پر قائم رہے۔

ہاں! جو فرقہ بنام غیر مقلدین بڑے زور وشور کے ساتھ پھیل رہا ہے، اور پیسوں کے زور سے گامزن ہے، ائمہ اربعہ سے متنفر ہے، اور انہیں گالیاں دے رہا ہے، خاص کر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو۔ یہ فرقہ انگریزوں عیسائیوں کی پیداوار ہے، اور روافض کے مشرب کا حصہ ہے، اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا منکر بھی ہے، اور ان سے

منحرف بھی۔ ھداھم اللہ تعالیٰ

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

ترجمہ: جوشخص نیک کام کرے سواسے اس جیسے دس (۱۰) حصّے ملیں گے، اور جو شخص بُرائی کا کام کرے تو اسے صرف اس کے برابر ہی سزا ملے گی، اور ان لوگوں پر ظلم نہ ہوگا ﴿۱۶۰﴾

معارف و منازل

ایک نیکی پر کم از کم دس ثواب، زیادہ سے زیادہ بیس لاکھ تک:

اس آیت کریمہ میں نیکیوں کی جزا اور برائیوں کی سزا کا قانون بتایا ہے، اللہ تعالیٰ أرحم الراحمین ہے، اس نے اپنے بندوں پر یہ کرم فرمایا کہ ایک نیکی کرنے پر اس جیسی کم از کم دس نیکیاں کرنے کا ثواب دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اور اپنی کتاب کریم میں اس کا اعلانِ عام فرمادیا، اور جو شخص کوئی گناہ کرلے تو اس میں اضافہ نہیں ہوگا، بلکہ ایک گناہ پر ایک ہی گناہ کی سزا ملے گی۔

پھر یہ کوئی ضروری نہیں کہ گناہ پر سزا مل ہی جائے، بلکہ توبہ واستغفار سے بھی گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اور نیکیوں سے بھی معاف ہوتے رہتے ہیں، اور نیکی کا جو دس ثواب بتایا ہے یہ کم سے کم ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعًا روایت ہے کہ ایک نیکی کے عوض اللہ تعالیٰ بیس لاکھ کا ثواب عنایت فرماتا ہے۔ [در منثور]

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کا ثواب بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک دانہ ہو، اس دانہ سے سات بالیں نکلیں، اور ہر بال میں سو دانہ ہوں، پھر آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [البقرة: ۲۶۱] یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے چند در چند اضافہ فرماتا ہے۔ پس یہ بخشش کسی معلوم حد تک منحصر نہیں ہے، بلکہ عطا کرنے والی ذات کے جود وکرم پر ہے، وہ چاہے تو بے حساب ہی عطا فرمائے۔

متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مجاہدین کے لئے خرچہ بھیج دیا، اور وہ اپنے گھر ہی میں رہا، تو اسے ہر درہم کے بدلہ سات سو درہم کا ثواب ملے گا، اور

جس نے اپنی جان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے مال خرچ کیا، اس کے لئے ہر درہم کے بدلہ سات لاکھ درہم کا ثواب ہوگا، پھر آپ ﷺ نے آیت کریمہ: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ تلاوت فرمائی۔ [ابن ماجة]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور برائیوں کے قانون کو لکھ دیا ہے، سو جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے، پھر اسے نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اپنے پاس سے ایک پوری نیکی لکھ دیتا ہے، اور اگر ارادہ کرنے کے بعد اس نیکی کو کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے اس جیسی دس نیکیاں سات سو گنا تک، بلکہ اس سے بھی زیادہ چند در چند کر کے لکھ دیتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی بُرائی کا ارادہ کرتا ہے، پھر وہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے اسے چھوڑ دیتا ہے، اور اپنے ارادہ پر عمل نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک نیکی لکھ دیتا ہے، اور اگر برائی کے ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ایک گناہ لکھ دیتا ہے۔ [متفق عليه]

دوسری روایت میں ہے کہ جب گناہ کا ارادہ کر کے چھوڑ دیتا ہے، اور گناہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے گناہ چھوڑنے کی وجہ سے نیکی لکھی گئی، کیونکہ اس نے گناہ میری وجہ سے چھوڑا ہے۔ [مسلم]

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گناہ کے ارادہ کے بعد اسے اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے ترک کیا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ہوا، اس پر اسے ایک نیکی کا ثواب ملے گا، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گناہ کا کام وہ شخص باوجود ارادہ کے بھول کر چھوڑ دیتا ہے، تو اب اس کے لئے نہ سزا ہے نہ جزا، کیونکہ اس نے خیر کی نیت تو نہیں کی تھی، لیکن شر کا فعل بھی نہیں کیا۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ شخص گناہ کو عمل میں لانے کی پوری کوشش کرتا ہے، اس کے اسباب بھی فراہم کرتا ہے، لیکن عملی طور پر وہ کسی رکاوٹ وغیرہ کی وجہ سے گناہ کو صادر کرنے سے عاجز رہتا ہے، ایسا شخص اگرچہ مرتکبِ گناہ نہ ہوا، مگر اس سے مؤاخذہ ہوگا، جیسے حدیث میں آیا ہے کہ اگر دو مسلمان دو تلواریں لے کر آپس میں لڑنے لگے، تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں، لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ! قاتل تو ظاہر ہے کہ دوزخی ہوگا، لیکن بے چارہ مقتول کیوں دوزخی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے کے درپے تھا، اگر مقتول کا داؤ چل جاتا تو وہی قاتل بن جاتا، اب اگر وہ قاتل نہیں بنا ہے تو یہ اس کی مجبوری کی بناء پر، ورنہ وہ قتل کے ارادہ سے نکلا تھا۔ [بخاري، ابن كثير]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کوئی نیک عمل کیا اس کے لئے دس حصے کا ثواب ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، اور اگر اس نے ایک بدی کی تو اس کی سزا ایک حصہ ہی ہے، بلکہ شاید وہ بھی معاف ہو جائے، جو مجھ سے ملے اور دنیا بھر کی خطائیں بھی لائے لیکن شرک نہ لائے تو بھی میں اس پر اتنی ہی مغفرت نازل کروں گا، جو میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں، اور جو ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں، اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑتا ہوں۔
[ابن کثیر، مشکوۃ وغیرہ]

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ: بلا شبہ میرے ربّ نے مجھے سیدھے راستہ کی ہدایت دی ہے، یہ مستحکم دین ہے جو ابراہیم کی ملت ہے، جو حق کی راہ اختیار کرنے والا تھا، اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا ﴿۱۶۱﴾ آپ فرما دیجئے کہ: بلا شبہ میری نماز اور میری سب عبادتیں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو کہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے ﴿۱۶۲﴾ اس کا کوئی شریک نہیں، اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے، اور میں ماننے والوں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں ﴿۱۶۳﴾

معارف ومنازل

بندگی کا اعلیٰ مقام وہ ہوتا ہے جسے ربّ العزّت سبحانہ انبیاء علیہم السلام کو عطا کرتا ہے، پھر درجہ بدرجہ جتنا کسی کا مقام ومرتبہ ہوگا اسی کے مطابق اس کی بندگی وانقیاد وتسلیم ہوگی، یہاں اور بار بار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام و مرتبہ اور اس کی خدمات اور بے مثال قربانیوں کا تذکرہ اسی مقصد کے لئے ہے، کہ سارے لوگ اس کو مقتدا تسلیم کریں، اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کا پختہ عزم کریں۔

مشرکینِ عرب اور یہود ونصاریٰ سے تعریضاً کہا جارہا ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے

دعوے دار ہو، اوراس کی ملّت میں ہونے پرفخر کرتے ہو، حالانکہ تم سارے کے سارے ان کی ملّت اور تعلیمات سے محروم اور دامن خالی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام موحّد اور موحّدوں کے مقتدا تھے، جبکہ تم مشرک ہو، اور وہ حق کے بانی اور محافظ رہے، جبکہ تم حق کے دشمن ہو، ان کی پوری زندگی، حیات وموت صرف اللہ تعالیٰ کے دینِ مبین کی احیاء کے لئے تھی، جبکہ تمہاری پوری زندگی دنیا اور متاعِ دنیا کے حصول کے لئے ہے، اور وہ صرف صراط مستقیم کے ساتھ وابستہ رہے، جبکہ تم بے مقصد اور بے شمار باطل فرقوں میں منقسم ہو۔

البتہ! اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ دینی، مذہبی، اخلاقی، نسبی کوئی تعلق ورشتہ ہوتو وہ حضرت سید الانبیاء خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاصل ہے، جیسے کہا جارہا ہے کہ جیسا آپ کا عمل ہے اسی کے مطابق آپ اعلان فرمایئے کہ میرے ربّ نے مجھے ہدایت عطا کی ہے، صراط مستقیم پرڈال دیا ہے، جوکہ خالص اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے، یہ مضبوط راستہ ہے، یہ مستحکم طریق حیات ہے، شیطانی راستوں سے الگ اور ممتاز ہے۔ یہ میرے جداعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا راستہ اوران کی ملّت ہے، وہ موحّد اور موحدوں کے مقتدا تھے، جبکہ میں ان کا خلیفہ اور وارث ان کی ملّت پر چلنے اور چلانے والا ہوں۔ میری زندگی، نماز، قربانی، طاعات، عبادات، زندگی اور موت سب کچھ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس طرح صاحبِ ملّت میرے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تھے۔

اور رہا یہ کہ: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾[البقرۃ: ۱۳۱] (جب ان کے پروردگار نے ان سے کہا کہ: سرتسلیم خم کردو! تو وہ بولے: میں نے ربّ العالمین کے آگے سرجھکادیا) مجھے بھی یہی حکم ہورہا ہے، یعنی: ﴿وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ اس کی تفصیل آنے والی ہے۔ اِن شاءاللہ

سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًاؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾[آل عمران: ٦٧] (ابراہیم نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ وہ توسیدھے سیدھے مسلمان تھے، اور شرک کرنے والوں میں کبھی شامل نہیں ہوئے)۔ تینوں گروہوں سے نفی اوران کی تردید، آگے اثبات اور اِحقاقِ حق فرمایا: ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾[آل عمران: ٦٨] (ابراہیم کے ساتھ تعلق کے سب سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، نیز یہ نبی (آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم) اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے ہیں)۔

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ میری نماز اور میری دوسری تمام عبادتیں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو تمام جہانوں کا پالنے والا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

اس میں دو باتیں بتائی گئیں: اوّل یہ کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہونا چاہئے۔ دوئم یہ کہ مومن کی طاعت ہو یا زندگی یہ دونوں قیمتی ہیں، اور موت بھی، پس وہ کھائے پیئے اٹھے چلے سوئے بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے، اور عبادات وطاعات نماز سے لے کر پوری شریعت پر عمل، حتّٰی کہ غیر اختیاری موت بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔

یہ مقام بڑا اونچا ہے، جسے بڑے مشائخ نے اور صوفیاء کرام نے حاصل کیا، کہ پوری زندگی اور زندگی کے اعمال عام اَکل وشرب، نشست وبرخاست، شادی نکاح، آل واولاد، شب وروز اللہ تعالیٰ کی یاد میں اور اس کی رضاء میں، قرآن وحدیث کے اتباع میں، شریعت مطہرہ کے سایہ میں، آخرت کے تصوّر میں، جنت کے مناظر میں گزر جائے، اور موت اسی حالت میں آجائے، کبھی سجدہ میں، رکوع میں، یا تلاوتِ قرآن اور ذکر واذکار میں، یا تصوّرِ محبوب کے جلوؤں میں، یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔ بہرحال ایسے لوگ جب بھی مریں گے، جس کیفیت میں مریں گے، جس رنگ وصورت میں مریں گے نظارہ سے محظوظ رہیں گے۔

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہان نیاز مندے ☆ کہ بوقت جان سپردن بسرش رسیدہ باشی

ایسے لوگوں کی ارواح قبض کرنے پر حضرت ملک الموت مامور نہیں ہوگا، بلکہ ان کی ارواح کو قبض کرنے والا اور ساتھ لے کر اپنے حضور پہنچا کر مغفرت کا لباس پہنانے والا حضرت حق تعالیٰ جلّ شانہ ہی ہوگا۔ فرمائیں گے میرا یہ بندہ سارے جہاں سے میرے لئے خفا تھا، آج میں اس کی تمام وحشتوں کی تلافی کروں گا، ﴿ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾﴾ [الفجر] (اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اس سے راضی ہو، اور وہ تجھ سے راضی۔ اور شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں۔ اور داخل ہو جا میری جنت میں)۔

برکف جام شریعت برکف سندان عشق ☆ ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختن

یہ مقام بہت اونچا مقام ہے، اور انسانوں کے لئے ہے، جو نفس وشیطان کے ساتھ جہاد میں مصروف ہوتے ہیں، اس کی پہلی شرط ترکِ دنیا اور ترکِ لذّات ہے، اگر یہ شرط نہ ہو تو یہ مقام نصیب نہ ہوگا، خواہ کتنی ریاضت و

زہد کیوں نہ ہو۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرّہٗ کے ملفوظات میں دیکھا کہ دیوبند اور اس کے اطراف میں طاعون کا مرض پھیل گیا، ایک شخص کے گھر سے بیک وقت گیارہ جنازے اٹھے، وہ معمر شخص نہایت ہشاش بشاش نظر آرہا تھا، شاید اس کی نگاہ اسی آیت پر ہو کہ: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ آپ فرما دیجئے کہ: بلا شبہ میری نماز اور میری سب عبادتیں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو کہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

زندہ کسی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ☆ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کسی رضائے تو

جان ز تن بردی و در جانی ہنوز ☆ درد ہا دادی و در مانی ہنوز

قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ ☆ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(امیر خسرو)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا سے کہا کہ نکاح کرو، یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے، اور اس میں بہت بڑی برکت ہے، کہنے لگی: میرا نکاح کب سے ہو چکا ہے، میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے ساتھ نکاح کر چکی ہوں، پھر یہی آیت پڑھی۔ رضي الله عنها

پس چاہئے کہ ہر مومن بندہ اپنی زندگی کو قیمتی سمجھے، اور اس کو قیمتی بنائے، تاکہ اس کی موت بھی قیمتی ہو، تو اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے سپرد فرمائے، اور دل میں یہ عہد کرے کہ بالفرض اگر میری زندگی ایک ارب سال کی ہو، اور سارا جہاں اور اس کی تمام نعمتیں میرے پاؤں تلے ہوں، میں یہ پوری زندگی اطاعتِ الٰہی میں گزاروں گا، اور دنیا کی لذتوں کی طرف التفات تک نہیں کروں گا۔

دیکھیں! سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت جبریل علیہ السلام نے چھ پہاڑوں کے متعلق پیش کش کی کہ اگر آپ راضی رہیں تو یہ سونے جواہرات میں تبدیل ہو جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبول ومنظور نہ کیا۔ اب اگر آپ اتباعِ سنت کرنا چاہیں گے تو باقی سنتوں پر عمل کرنے کے ساتھ اس سنت پر بھی عمل کریں، اور تارکِ دنیا بن جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ ایک محبوب کی محبت میں دوسرے محبوب کو شریک نہ کریں۔ ہم خدا خواہی وہم دنیا والا نہ بنو۔

﴿وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ (اور مجھے اسی کا حکم ہوا ہے، اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں) یہ اوّلیت اس امت کے اعتبار سے ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی

امتِ موجودہ میں جو آخری امت ہے میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ اسلام سارے انبیاء علیہم السلام کا دین ہے۔ اسطرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی اپنی امتوں میں سب سے پہلے مسلم اور فرمانبردار تھے۔

روح المعانی میں ہے: هٰذَاشَانُ كُلِّ نَبِيٍّ بِالنِّسْبَةِ اِلٰى اُمَّتِهٖ۔ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ میں صرف دعوت دینے والا نہیں ہوں، بلکہ خود بھی عمل کرنے والا ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا تھا: ﴿سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [الأعراف:۱۴۳] (پاک ہے آپ کی ذات۔ میں آپ کے حضور توبہ کرتا ہوں، اور میں سب سے پہلے ایمان لاتا ہوں)۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر نبی ایمان لانے کا، اور اپنی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنے کا مکلف ہوتا تھا۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [البقرة:۲۸۵] (یہ رسول (ﷺ) اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو ان کی طرف ان کے ربّ کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور تمام مسلمانوں نے بھی)۔ پس امت کی بنسبت نبی کے ایمان کو یقیناً اوّلیت کا مقام حاصل رہے گا۔

آیت بالا میں چونکہ امت کو دعاء کی تعلیم دینا تھی، اور قربانی میں وقت کا لحاظ رکھا ہوا تھا، اس لئے کبھی اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ، اور کبھی صرف مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ فرمایا گیا۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ
وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

ترجمہ: آپ فرمادیجئے: کیا میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ربّ تلاش کروں؟ حالانکہ وہ ہر چیز کا ربّ ہے، اور جو بھی کوئی شخص کوئی گناہ کرے اس کا وبال اسی پر ہے، اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، پھر تم سب کو اپنے ربّ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، سو وہ تمہیں وہ چیزیں جتادے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے ۝

معارف ومنازل

ساری کائنات کا خالق ومالک ایک ہی ربّ تعالیٰ ہے، جس نے مجھے صراط مستقیم پر ہدایت عطا فرمائی، اور جس کی وحدانیت کی دعوت میں لے کر آیا ہوں، اور جس کی وحدانیت کا اعلان سارے انبیاء کرام علیہم السلام نے بشمول

حضرت ابراہیم علیہ السلام کر چکے ہیں، اور وہی سب کا معبودِ برحق ہے۔

پس اعتقادی یا عملی طور پر اگر کسی نے غیر اللہ کو ربّ بنایا ہوتو وہ سراسر گمراہ اور ابدی جہنمی ہوگا، اور ملّتِ ابراہیمی سے خارج ہی ہوگا۔ فرمایا:

﴿قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ﴾ آپ فرما دیجئے: کیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا ربّ تلاش کروں؟ حالانکہ وہ ہر چیز کا ربّ ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، اور مطلب یہ ہے کہ میں تو ایسا ہرگز نہیں کرسکتا، اور کرہی کیسے سکتا ہوں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ سب کا ربّ ہے، اپنی جہالت سے تم جن چیزوں کو ربّ بنائے ہوئے ہو اللہ تعالیٰ ان کا بھی ربّ ہے۔ اپنی جیسی مخلوق کو، بلکہ اپنے سے بھی کمتر چیزوں کو معبود بنانا حماقت اور سفاہت ہے، میں تمہاری سفاہت کا کیسے ساتھ دے سکتا ہوں؟

سورۂ زُمَر میں فرمایا: ﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ﴾ [الزمر: ٦٤] (کہہ دو کہ کیا پھر بھی اے جاہلو! تم مجھ سے کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرو؟)۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ یعنی جو شخص کوئی بھی عقیدہ رکھے گا، یا کوئی بھی گناہ کرے گا تو اس کا وبال اسی پر ہی ہوگا، کوئی دوسرا کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، خواہ اس کا قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔ جو لوگ دنیا میں کہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ہمارے گناہوں میں شریک ہوجاؤ، اور ہمارے غیر اسلامی رسم و رواج میں ہمارا ساتھ دو، تمہارا گناہ ہم پر ہوگا، یہ اس لئے کہہ دیتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی وعیدوں کا اندازہ نہیں ہے۔ قیامت کے روز کسی کے گناہ کا وبال کوئی اپنے سر نہیں لے گا، بلکہ وہ کف افسوس ملتا ہوا یہی کہے گا: ﴿يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴾ [الفرقان: ٢٨] (ہائے میری بربادی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا)۔

﴿ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ﴾ پھر تم من مانی کرتے ہوئے اختلاف کرتے تھے، یہ تمہارا اختلاف کسی جہالت پر مبنی نہ تھا، جہالت کی تاریکیوں کو قرآن حکیم کے نور روشنی نے ختم کیا تھا، یہ اختلاف ضد وعناد اور سرکشی پر مبنی تھا، آج اس کا بھیانک نتیجہ اور تباہ کن انجام تمہارے سامنے آئے گا، آج یوم الفصل کا دن ہے، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا، حق وباطل ظاہر ہوں گے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا، اور درجات کے اعتبار سے تم میں ایک کو دوسرے پر فوقیت دی، تاکہ وہ تمہیں ان چیزوں کے بارے میں آزمائے ان نعمتوں میں جو تم کو عطا فرمائیں، بے شک آپ کا ربّ جلد سزا دینے والا ہے، اور بلاشبہ وہ ضرور بخشنے والا مہربان ہے ﴿۱۶۵﴾

معارف ومنازل

یہ عظیم الشان سورت جو اپنے گرانقدر مضامین کے اعتبار سے آسمانی شریعت کا ایک روشن ستارہ ہے ختم ہو رہی ہے، اس میں بار بار بکثرت دین کی دعوت دی، توحید کی طرف بلایا، مشرکین کی حماقت بیان فرمائی، ان کے باطل عقائد اور شرکیہ رسوم کی تردید فرمائی، اہل کتاب کی سرزنش ہوئی، توحید پر دلائل قائم ہوئے، اب آخر میں چند نعمتوں کا تذکرہ فرما کر سورت ختم کر دی۔

درجات کی تقسیم ایک آزمائش ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ تم یکے بعد دیگرے زمین میں بستیاں بساتے ہو، اور تمہارے اسلاف کے بعد اخلاف کا زمانہ آتا رہتا ہے، ایک دوسرے کے جانشین بنتے چلے جاتے ہو، جیسا کہ فرمایا کہ اگر ہم چاہتے تو تمہارے جانشین تمہاری اولاد یا کسی اور کو بنانے کی بجائے فرشتوں کو بنا دیتے، اور تمہارے بعد وہ تمہاری جگہ لے لیتے، اور فرمایا کہ یہ زمین اس نے تمہیں یکے بعد دیگرے دی ہے، اور فرمایا کہ میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں، اور فرمایا:

ممکن ہے عنقریب تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور تم کو اس کی جگہ پر لا کر بٹھائے، اور پھر یہ دیکھے کہ اس کے بعد تم آ کر کیا کردار پیش کرتے ہو، اور فرمایا کہ ایک سے اوپر ایک کے درجات بنائے گئے ہیں، یعنی رزق، علم، اخلاق، محاسن اور مساوی، مناظر اور اشکال ان میں سب لوگ ایک دوسرے سے کم زیادہ ہیں، جیسا کہ فرمایا:

ہم نے ان کی دنیاوی زندگی میں ان کی باہمی معیشت کو تقسیم کر دیا ہے، اور بعض کے درجے بعض سے اونچے رکھے ہیں، کوئی امیر ہے، کوئی غریب، کوئی حاکم ہے، کوئی محکوم، کوئی آقا ہے، کوئی اس کا غلام، اور فرمایا:

تم غور تو کرو کہ ہم کسی کو کسی پر کیسی برتری اور فوقیت دیتے ہیں؟ لیکن دنیاوی درجات سے قطع نظر آخرت کے درجات بہت بڑے اور قیمتی ہیں، اور فرمایا کہ:

یہ تفریق مدارج اس لئے ہے تاکہ ہم تمہیں آزمائیں، دولت مند کو دولت دے کر اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے دولت کا شکر کس طرح ادا کیا؟ اور غریب سے پوچھا جائے گا کہ صبر کیا تھا یا نہیں؟

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا سرسبز وشاداب ہے، اللہ تعالیٰ نے دوسروں کے بعد اب تم کو دنیا سے مُتمتّع ہونے کا موقع دیا ہے، اور تمہیں ان کا جانشین بنایا ہے، اب ہم دیکھیں گے کہ ان کے بعد تم کیا کردار پیش کرتے ہو؟ اے لوگو! دنیا سے ڈرو، اور عورتوں سے ڈرو، پہلا فتنہ جو بنی اسرائیل میں پیدا ہوا تھا وہ عورتوں ہی سے متعلق تھا، اور فرمایا کہ:

ربّ تعالیٰ جلد تر سزا دینے والا ہے، اور عاقبت وسزا سے تمہیں ضرور سابقہ پڑ جائے گا، اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ دیکھو! خوف وترغیب دونوں اکٹھے بیان ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عقاب اور عذاب بہت جلد آنے والے ہیں، رسولوں کی مخالفت کرنے والوں پر تباہی آجائے گی، اور اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں یعنی فرمانبرداروں پر بڑا مہربان اور بہت مغفرت کرنے والا ہے۔

قرآن کریم میں بکثرت یہ دونوں صفتیں یعنی غفور اور رحیم ساتھ ساتھ آئی ہیں، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿نَبِّئۡ عِبَادِیۡۤ اَنِّیۡۤ اَنَا الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۝ وَاَنَّ عَذَابِیۡ هُوَ الۡعَذَابُ الۡاَلِیۡمُ ۝﴾ [الحجر] یعنی تمہارا ربّ اپنے بندوں کے گناہوں کو بخشنے میں بڑا صاحبِ مغفرت اور بڑا مہربان ہے، مگر اس کی پکڑ بھی بہت ہی سخت ہوتی ہے۔

قرآن کریم ایک ایسا بے مثال باغ ہے جس میں ہر قسم کے درخت اور پھلوں کی کثرت ہے، کبھی جنت کی نعمتوں اور آسائشوں کی ترغیب ہے، کبھی دوزخ کے کانٹوں، ضریع وزقّوم جیسے عذابوں سے ترہیب ہے، کبھی دونوں چیزوں کا اکٹھا بیان ہے، ترغیبی اشیاء علاج ومنفعت ہیں، جبکہ ترہیبی چیزیں مریض کے لئے پرہیز کا درجہ رکھتی ہیں، کیونکہ پرہیز کے بغیر علاج کارگر نہیں ہوتا۔

دعا:

اے ہمارے ربّ! ہماری مغفرت فرما، ہمیں اپنے عذابوں سے بچا۔ آمین

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مومن یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کتنا سخت ہوتا ہے تو وہ جنت کی طمع

تک نہ کرے گا، اور کہے گا کہ دوزخ سے خلاصی پا جاؤں تو کافی ہے، اور اگر کافر یہ معلوم کر لے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو، حالانکہ اس کو جنت کا استحقاق ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے رحمت کے سو حصے رکھے ہیں، اس میں سے ایک حصہ اپنی ساری مخلوقات کے درمیان تقسیم کر دیا، کہ اسی کے حصہ رسدی کے سبب دنیا میں لوگ اور جانور ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں، اور باقی ننانوے حصے صرف مؤمنوں کے لئے رکھے ہیں، قیامت کے روز کے لئے۔ [متفق علیہ]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسے شخص کو دیکھے جو مال اور شکل صورت میں اس سے بڑھ کر ہے تو اس کو بھی دیکھ لے جو اس سے کم ہے۔ ایک راویت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس کو دیکھو جو تم سے کم ہے، اور اس کو نہ دیکھو جو تم سے زیادہ ہے، ایسا کرو گے تو تم پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں ان کو حقیر نہ جانو گے۔

۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص میں دو باتیں ہوں تو اللہ تعالیٰ اسے شاکر اور صابر لکھ دے گا: دین میں اسے دیکھے جو اس سے بڑھ کر ہے پھر اس کی اقتداء کرے، اور دنیا میں اسے دیکھے جو اس سے کمتر ہو پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرے کہ اس شخص پر اللہ تعالیٰ نے اسے فضیلت دی ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ شاکر اور صابر لکھ دے گا۔ [مشکوۃ، مسلم]

تَمَّتْ سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ بِعَوْنِ اللّٰهِ وَ حُسْنِ تَوْفِيْقِه

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ

مكيةٌ آياتها ۲۰۶ ركوعاتها ۲۴

سورۂ اعراف مکی ہے، اس میں دوسو چھ (۲۰۶) آیتیں، اور چوبیس (۲۴) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام اَعراف ہے، اس سورت کی آیت ۴۸ میں اَعْرَاف کا جولفظ موجود ہے، سورت کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔ ترتیبِ تلاوت میں یہ ساتویں سورت ہے، اور ترتیبِ نزول میں ۳۹ نمبر پر ہے۔ اس میں کُل رکوع ۲۴ ہیں، اور آیات ۲۰۶۔ تعدادِ کلمات ۳۳۸۷، اور ۱۴۶۳۵ حروف پر مشتمل ہے۔ اس کا نزول سورت صٓ کے بعد ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، مگر آیت نمبر ۱۶۳ ﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ﴾ سے لے کر آیت ۱۷۱ ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ﴾ تک آیات کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا۔

ربط:

(۱)......سورۃ الاَنعام کے آخر میں نزولِ قرآن اور اتباعِ قرآن کا بیان تھا، جیسے فرمایا: ﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ﴾ [الأنعام: ۱۵۵] (اور یہ برکت والی کتاب ہم نے اتاری ہے، پس تم اس کی پیروی کرو)۔ اور اس سورت کے شروع میں بھی نزولِ قرآن اور اتباعِ قرآن کا حکم ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ﴾ [الأعراف: ۲]

(۲)......سورۂ اَنعام کی ابتداء میں دلائلِ عقلیہ کے ساتھ توحیدِ خداوندی کا ذکر تھا، جیسے ارشاد ہے: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾[الأنعام:۱] (آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے) اس سورت کی ابتداء میں بھی دلائلِ عقلیہ کے ساتھ توحیدِ خداوندی کا ذکر ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ﴾[الأعراف:۱۱] (اور یقیناً ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، پھر ہم نے تم کو شکل دی ہے)۔

(۳)......سورۂ اَنعام کے آخر میں سید الانبیاء ﷺ کے فرائضِ منصبی کا ذکر تھا، جیسے فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾[الأنعام:۱۶۲] (آپ فرمادیجئے کہ: بلاشبہ میری نماز اور میری سب عبادتیں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو کہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔) اس سورت کے آخر میں بھی سید الانبیاء ﷺ کے فرائضِ منصبی کا ذکر ہے، ارشاد فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ﴾ [الأعراف:۲۰۵]

(۴)......سورۂ اَنعام کی ابتداء میں مشرکین کے خبائث اور نتائج کا بیان تھا، جیسے فرمایا: ﴿ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾[الأنعام:۱] (پھر جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے وہ دوسروں کو اپنے پروردگار کے برابر قرار دے رہے ہیں) اس سورت کے آخر میں بھی مشرکین کے خبائث ونتائج کا ذکر ہے، جیسے فرمایا: ﴿اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا﴾[الأعراف:۱۹۱] (کیا وہ شریک کرتے ہیں وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرسکتا؟)۔

(۵)......سورۂ اَنعام کے آخر میں صداقتِ قرآن کا ذکر ہے، فرمایا: ﴿اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ﴾ [الأنعام:۵۰] (میں اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے) اور اس سورت کے شروع میں بھی صداقتِ قرآن کا بیان ہے: ﴿كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾[الأعراف:۲] (کتاب ہے جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے)

مختصر موضوع:

دلائلِ ثلاثہ کے ساتھ اِثبات توحید، رسالت، قیامت، صداقت عهدِ اَلست، تذکیر بأیَّام الله، تذکیر بآلاء الله، تذکیر بِما بَعدالموت، فرعون کی سرکشی، بنی اسرائیل کی سرکشی اور عہد شکنی، اور یَومُ السَّبت کی بے احترامی، اور دیگر بہت سے مضامین کا بیان۔

"أصحاب الأعراف" کا بیان:

"أصحاب الأعراف" کون لوگ ہیں؟ اس بارے میں مفسرین کرام کے بارہ (۱۲) سے زائد اقوال ہیں،

مگر جمہور علماء کرام ان کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ وزنِ اعمال کے بعد جن لوگوں کی نیکیاں زیادہ ہوں گی، وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور جن کی برائیاں زیادہ ہوں گی، وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، اور جن کی نیکیاں اور برائیاں بالکل برابر رہیں گی وہ اُصحابِ اُعراف ہیں۔

حافظ ابوبکر ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جو روایت مرفوعاً نقل کی ہے، اس میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اسی طرح سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبدالرحمٰن مزنی رحمۃ اللہ علیہ سے، اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے اس سلسلہ میں جو مرفوع روایتیں نقل کی ہیں کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے اُصحاب الاعراف، اور ان لوگوں کے متعلق جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہیں جب سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے باپ کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوئے، اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے راستہ میں شہید ہوگئے۔ ان روایات سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ درحقیقت یہ شہداء بھی اس کلیہ میں داخل ہیں کہ ان کی نیکی اور بدی برابر ہے۔

جمہور علماء نے کثرتِ روایات کی بناء پر اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور یہی حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت حذیفہ رِضوَانُ اللهِ عَلَيهِم أجمَعِين اور اکثر سلف وخلف سے منقول ہے۔ [ابن کثیر] مزید تفصیل اپنے موقع پر آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

.......❁.......❁.......❁.......

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

المّٓصٓ ① كِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ فَلَا يَكُنۡ فِىۡ صَدۡرِكَ حَرَجٌ مِّنۡهُ لِتُنۡذِرَ بِهٖ وَذِكۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ② اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ③ وَكَمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا فَجَآءَهَا بَاۡسُنَا بَيَاتًا اَوۡ هُمۡ قَآئِلُوۡنَ ④ فَمَا كَانَ دَعۡوٰٮهُمۡ اِذۡ جَآءَهُمۡ بَاۡسُنَاۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ⑤

ترجمہ: المّٓصٓ ① یہ کتاب ہے جو آپ کی طرف اتاری گئی، سو آپ کے سینہ میں کوئی تنگی نہ ہوتا کہ آپ اس کے ذریعہ ڈرائیں، اور ایمان والوں کے لئے نصیحت ہے ② اس چیز کا اتباع کرو جو تمہارے ربّ کی جانب سے تمہاری

طرف اُتاری گئی، اور اس کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع نہ کرو، تم کم نصیحت حاصل کرتے ہو ③ اور کتنی ہی بستیاں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، سو ان پر ایسے وقت میں ہمارا عذاب آیا جب وہ رات گزار رہے تھے، یا ایسی حالت میں عذاب آیا کہ وہ دوپہر کے وقت سوئے ہوئے تھے ④ سو جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو ان کی پکار اس کے علاوہ کچھ نہ تھی کہ: بلاشبہ ہم ظالم تھے ⑤

معارف ومنازل

حروفِ مُقطّعات اور ان کے معنی اور ان سے متعلق اختلاف کے بارے میں سورۂ بقرہ کے شروع میں بات گزر چکی ہے۔ یہ کتاب تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کی گئی ہے، جو کہ نصیحت اور ہدایت ہے، اب اس کی تبلیغ میں آپ کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور اس کے ذریعہ لوگوں کو ڈرائیں، انہیں ایمان کی دعوت دیں، اور یہ واضح کریں کہ جو لوگ اُسے نہیں مانیں گے، اور اس پر ایمان نہیں لائیں گے تو گزشتہ اقوام کی طرح وہ عذاب میں ہلاک ہو جائیں گے، اور جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے، اور اس کے احکام کو قبول کریں گے، وہ ابدی سعادت حاصل کریں گے۔

البتہ! اگر آپ کے مخالفین آپ کی تکذیب کریں، اور آپ کا مقابلہ کریں تو آپ اُولُوا العزم پیغمبروں کی طرح صبر کریں، برداشت کریں، اور اپنے سینے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ یہ ہدایت اور نصیحت والی کتاب ہے، مؤمنین اس پر ایمان لائیں گے، اور آپ کا اتباع کریں گے۔

پھر لوگوں سے خطاب فرمایا کہ تمہارے ربّ کی طرف سے جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کریں، اور اپنے پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کو والی اور دوست نہ بنائیں۔ تمہارے سامنے ہدایت کی جو قیمتی باتیں آتی ہیں ان کی قدر کریں، مگر تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔ پھر فرمایا:

دیکھو، اور عبرت حاصل کرو کہ ہم نے بہت سی بستیوں کو ہلاک کر دیا، جن پر ہمارا عذاب رات کے وقت میں آیا (جیسے قوم لوط)، اور بعض کے پاس ایسے وقت میں عذاب پہنچا جب وہ دوپہر کو قیلولہ کر رہے تھے (جیسے قوم ثمود)۔ جو لوگ ہدایت کو قبول نہیں کرتے، اور حق سے روگردانی کرتے ہیں، ان پر دنیا میں بھی عذب آتا ہے، اور آخرت میں تو تباہ ہی ہو جائیں گے، اور دائمی عذاب میں ابدالآباد گرفتار ہو جائیں گے۔

ان بستی والوں پر جب عذاب آیا تو بس یہی کہنے لگے کہ ہم ظالم تھے، ہمیں پیغمبروں نے ہر چند خبردار کیا، ہم

نے ان کی باتوں پر توجہ نہ کی، اور اپنے کفر و شک پر جمے رہے، اور سرکش رہے۔ عذاب آجانے کے بعد اپنے ظلم کا اعتراف کرنے سے آیا ہوا عذاب تو واپس نہیں ہوتا، وہ اپنا کام پورا کر کے رہے گا، یعنی تباہی اور ہلاکت و بربادی۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٦ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝٧

ترجمہ: سو جن لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے، ہم ان سے ضرور سوال کریں گے، اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے ⑥ سو ہم ان کے رُوبرُو علم کے مطابق بیان کر دیں گے، اور ہم غائب نہ تھے ⑦

معارف ومنازل

سورۂ مائدہ کے آخر میں ارشاد ہوا تھا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۖ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ [المائدۃ:۱۰۹] (جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا تو کہے گا: تمہیں کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے: ہمیں معلوم نہیں، پوشیدہ باتوں کا تمام تر علم تو آپ ہی کے پاس ہے)۔ یہاں یہ مضمون اس مرکزی مضمون کا تتمہ اور بقیہ ہے، جس میں دوطرفہ سوال و جواب کا تذکرہ ہے۔

قیامت کے دن رسولوں علیہم السلام سے اور اُن کی اُمّتوں سے سوال ہوگا، ان آیات میں آخرت کے سوال و جواب کا بیان ہے۔ قیامت کے روز پیغمبروں علیہم السلام سے اور ان کی اُمتوں سے الگ الگ سوالات ہوں گے۔ جب ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہو، اور پھر نامۂ اعمال میں ہر چیز کا اندراج بھی ہو، اور کسی ذرّہ کی فروگزاشت کا امکان بھی نہ ہو، اور اعضاء انسانی بھی گواہی دیتے ہوں، تو پھر سوالات کس لئے ہوں گے؟

جواب: سوالات کا مطلب یہ ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ مجھ سے پوچھے بغیر میرے خلاف فیصلہ ہوا، پس سوالات کے بعد یہ عذر و بہانے ختم ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن اُمتوں سے سوال ہوگا کہ تمہارے پاس رسول آئے تھے، تو تم نے ان کو کیا جواب دیا تھا؟ سورۂ قصص میں ہے: ﴿وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [القصص:۶۵] (اور جس دن اللہ ان کو پکارے گا، اور کہے گا: تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا؟) اور حضرات رُسُل عظام اور انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی سوال ہوگا کہ کیا آپ حضرات نے ہمارا پیغام پہنچایا؟ اور یہ بھی سوال ہوگا کہ اُمتوں نے اس کا کیا جواب دیا؟

صحیح مسلم میں ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا (اور متعدد نصیحتیں فرمائیں) اور آخر میں فرمایا کہ قیامت کے روز میرے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا، تو تم کیا جواب دو گے؟ حاضرین نے عرض کیا کہ ہم یہ جواب دیں گے کہ آپ نے (اللہ کا پیغام) پہنچایا، اور اپنی ذمہ داری پوری کی، اور اُمت کی خیر خواہی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی شہادت والی انگلی کو آسمان کی طرف اٹھایا، اور پھر لوگوں کی طرف جھکایا، اور تین بار اللہ تعالیٰ کے دربار میں عرض کیا: اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ. اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ. اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ. اے اللہ! تو گواہ ہو جا، اے اللہ! تو گواہ ہو جا، اے اللہ! تو گواہ ہو جا۔ وَذٰلِکَ فِی حجۃِ الوِدَاع. [مسلم]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز حضرت نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا، اور ان سے سوال ہوگا کہ تم نے تبلیغ کی ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ: اے میرے ربّ! میں نے واقعۃً تبلیغ کی ہے۔ پھر ان کی اُمت سے سوال ہوگا کہ انہوں نے تمہیں احکام پہنچائے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس کے بعد نوح علیہ السلام سے سوال ہوگا کہ تمہارے دعویٰ کی تصدیق کے گواہ کون ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ سید کائنات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اُمتی ہیں۔

یہاں تک واقعہ نقل کرنے کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس کے بعد تم کو لایا جائے گا، اور تم گواہی دو گے کہ بیشک نوح علیہ السلام نے اپنی اُمت کو تبلیغ کی تھی۔ اس کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرۃ: ۱۴۳۔ بخاری] (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے، تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے)۔

اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی اُمتیں بھی اسی طرح انکاری ہوں گی، اور کہیں گی کہ ہم کو تبلیغ نہیں کی گئی۔ ان کے پیغمبروں علیہم السلام سے سوال ہوگا کہ تم نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے کہ ہم نے تبلیغ کی تھی۔ ان سے گواہ طلب کئے جائیں گے، تو وہ سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کو گواہی میں پیش کریں گے، چنانچہ یہ حضرات گواہی دیں گے کہ ہم پیغمبروں علیہم السلام کے دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے تبلیغ کی تھی۔

پھر ان سے سوال ہوگا کہ تمہیں ہزاروں سال بعد میں آنے کے بعد ان معاملات کی کیا خبر؟ وہ جواب عرض

کریں گے کہ ہمارے پاس خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ تشریف لائے، اور انہوں نے ہمیں خبر دی کہ تمام پیغمبروں علیہم السلام نے اپنی اپنی اُمتوں کو تبلیغ کی تھی، لہٰذا ہم ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ [درمنثور]

﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ﴾ سو ہم ان کے رُوبرُو ضرور بیان کریں گے علم کے مطابق، اور ہم غائب نہ تھے۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ! جو پروردگار ذرّہ ذرّہ کا علم رکھتا ہے، اور گلے کی شہ رگوں سے نزدیک تر ہے، اور ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحدید:۴] (وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو) والی صفت سے متصف ہے، تو کیا کائنات کا کوئی ذرّہ، یا بندوں کا کوئی حال اس سے پوشیدہ رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ قیامت کے روز اعمال نامے رکھ دیئے جائیں گے، وہ تمام اعمال کو ظاہر کر دیں گے، پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے اقوال اور اعمال و افعال سب بتادے گا، چھوٹے اعمال ہوں یا بڑے اعمال ہوں، کیونکہ اُس جلّ شانہ کا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑧ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ⑨

ترجمہ: اور اس دن وزن واقع ہونے والا ہے، سو جن کے وزن بھاری ہوئے ایسے لوگ کامیاب ہوں گے ⑧ اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے، سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنی جانوں کا نقصان کرلیا، اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظلم کرتے تھے ⑨

معارف و منازل

اللہ ربّ العزّت عزّوجلّ ہمیشہ سے ساری مخلوقات کے احوال و افعال، اور ہر چیز سے واقف و باخبر ہے۔ اگر محشر کے میدان میں صرف اپنی معلومات کی بنیاد پر بندوں کو جزا و سزا دیدے تو ان کو ایسا کرنے کا پورا حق ہے، اور یہ عینِ انصاف بھی ہے۔ لیکن میدانِ حشر میں ایسا نہ کیا جائے گا، بلکہ تمام بندوں کے سامنے ان کے اعمال نامے پیش کئے جائیں گے، اور وزن ہوگا، گواہیاں ہوں گی، شہادت اعضاء کا مرحلہ ہوگا، اور مجرمین انکاری بھی ہوں گے، اور دلائل سے اثباتِ جرم بھی ہوگا، تاکہ سزا بھگتنے والے یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم کو بن پوچھے ظلماً بلاوجہ عذاب میں ڈالا گیا۔

ہاں! جیسے دنیا کی عدالتوں میں قانونی کارروائیوں اور قانونی چارہ جوئیوں کے بعد عدل وانصاف کی روشنی میں فیصلے صادر ہوتے ہیں، دراصل یہ دنیاوی ضابطے خواہ کچھ بھی ہوں، یہ اُخروی قانون سے ماخوذ ہیں، تو فرمایا:

﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ﴾ سورۂ انبیاء میں فرمایا: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴾ [الأنبياء:۴۷] (اور ہم قیامت کے دن ایسی ترازویں لارکھیں گے جو سراپا انصاف ہوں گی، چنانچہ کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے سامنے لے آئیں گے، اور حساب لینے کے لیے ہم کافی ہیں)۔ یعنی اس روز کا وزن برحق اور ضروری ہوگا، سو جن کی تولیں بھاری ہوں گی وہی لوگ بامراد ہوں گے، فلاح پائیں گے، اور جن کی تولیں ہلکی پڑیں وہی ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کا نقصان کیا، اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے۔

وزنِ اعمال کا ذکر متعدد سورتوں میں مختلف انداز میں ہے۔ سورۂ اعراف، سورۂ مؤمنوں، سورۂ انبیاء، اور سورۂ القارعہ وغیرہ سب میں ہے۔ سورۂ القارعہ میں ایک خاص انداز سے ہے، فرمایا: ﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝﴾ [القارعة] (سو جس کے وزن بھاری ہوئے وہ خوشی کی پسندیدہ زندگی میں ہوگا، اور جس کے وزن ہلکے ہوئے تو اس کا ٹھکانہ دوزخ کا نچلا حصہ ہوگا۔ (دوزخ کا سب سے نچلا ساتواں طبقہ هَاوِيَةٌ ہے)۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز اعمال تولنے کی ترازو رکھ دی جائے گی، اور وہ اس قدر لمبی چوڑی ہوگی کہ اگر اس میں سارے آسمان وزمین رکھ کر وزن کیے جائیں تو اس میں آجائیں۔ اس کو دیکھ کر فرشتے بارگاہِ خاوندی میں عرض کریں گے کہ یہ کس کے لئے تولے گی؟ اللہ تعالیٰ جل شانہ فرمائیں گے کہ میں اپنی مخلوق میں سے جس کے لئے (حساب کرنے کے واسطے) تول قائم کروں (اس کے لئے یہ تولے گی)۔ یہ سن کر فرشتے عرض کریں گے کہ: اے اللہ جل شانہ! آپ پاک ہیں، جیسا کہ عبادت کا حق ہے ہم نے ایسی عبادت نہیں کی۔ [رواہ الحاکم والترغیب والترهیب]

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز ترازو پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا (اعمال کو وزن کرنے کے لئے) انسان اس ترازو کے پاس لائے جاتے رہیں گے، جو آئے گا ترازو

کے دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کر دیا جائے گا، پس اگر اس کے تول بھاری ہوئے تو وہ فرشتہ ایسی بلند آواز سے پکار کر اعلان کرے گا جسے ساری خلقت سنے گی، کہ فلاں شخص ہمیشہ کے لئے سعادت مند ہوگیا، اب اس کے بعد وہ بد نصیب نہ ہوگا۔ اور اگر اس کے تول ہلکے رہے تو وہ فرشتہ ایسی بلند آواز سے پکار کر اعلان کرے گا جسے ساری مخلوق سنے گی کہ فلاں ہمیشہ کے لئے نامراد ہوگیا، اب کبھی اس کے بعد وہ خوش نصیب نہ ہوگا۔ [بزار، بیهقي، ترغیب وترهیب]

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں لکھتے ہیں کہ ہر شخص کے عمل وزن کے موافق لکھے جاتے ہیں، ایک ہی کام ہے اگر اخلاص ومحبت سے حکمِ شرعی کے موافق کیا، اور برمحل کیا، تو اس کا وزن بڑھ گیا، اگر دکھاوے کیلئے کیا، یا موافقِ حکم نہ کیا، یا ٹھکانے پر نہ کیا، تو وزن گھٹ گیا۔

آخرت میں وہ کاغذ تلیں گے، جس کے نیک کام بھاری ہوئے تو برائیوں سے درگزر ہوا، اور جس کے نیک کام ہلکے ہوئے تو پکڑا گیا۔ بعض علماء نے کہا کہ قیامت کے روز اعمال (جو کہ اعراض ہیں) کو جسم دے کر حاضر کیا جائے گا، اور ان اجسام کو وزن کیا جائے گا۔

کاغذوں کو تولنا یا اجسام کو تولنا کوئی بعید نہیں۔ ہمارے آج کے زمانے میں حرارت، برودت، سردی، گرمی وغیرہ اعراض کو تولا جاتا ہے، تو قادر مطلق فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ جل شانہ جس طرح اور جس کیفیت میں انسانی اعمال کا وزن کرلے، تو لے کس کو حیرانی ہوگی؟ اور کون لب کشائی کی جرأت کرسکے گا؟ ﴿وَاللهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [البقرة:۲۸۴] (اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے)۔ ﴿وَهُوَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ [البروج:۱٦] (جو ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے)۔

فائدہ:

آج جبکہ سائنس کا دور اور عروج ہے، اور ایجادات بے شمار انداز میں ترقی پر ہیں، اعمال کا تول میں آجانا جس طرح سمجھ میں آرہا ہے اسی طرح روز افزوں اس کا مشاہدہ بھی ہورہا ہے۔ یہ ضعیف وعاجز بندے جن کو اللہ تعالیٰ جلّ شَانہ وَعَمَّ نَوالُہ نے تھوڑی سی سمجھ اور تھوڑا علم دیا ہوا ہے، وہ تھرمامیٹر کے ذریعہ جسم کی حرارت کی مقدار بتادیتے ہیں، اور اسی طرح کے بہت سے آلات ہیں جو اجسام کے علاوہ دوسری چیزوں کی مقدار معلوم کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں، پس اس وَحدَہٗ لاشریکَ لَہٗ کی قدرت سے یہ کیسے باہر مانا جائے کہ اعمال تول میں نہ آسکیں؟

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اعمال تو حسّی وجود نہیں رکھتے، اور وجود میں آنے کے ساتھ ہی فنا ہوتے رہتے ہیں، پھر

آخرت میں یہ فنا شدہ اعمال کیونکر جمع شدہ ملیں گے؟

اس شبہ کی موجودہ دور میں کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ اب تو ٹیلی ویژن اور وی سی آر اور دیگر ایجادات نے بتادیا کہ حرکات، سکنات اور آواز کو ریکارڈ کیا جاسکتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو الفاظ وکلمات، حرکات و سکنات کو گرفت میں لاکر اکٹھا کرنے، اور ریکارڈ میں لانے کی طاقت دی ہے، تو وہ اس پر ضرور قادر ہے کہ یہ سب کچھ ازل سے ابد تک جو کچھ ہورہا ہے اسے ریکارڈ فرمانے کے بعد کھول دے، اور ہر شخص کی پوری زندگی ریکاڈ شدہ اس کے سامنے آجائے۔ سورۂ کہف میں اسی بات کو واضح کرکے ارشاد فرمایا: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ [الکھف: ۴۹] (اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے۔ اور تمہارا پروردگار کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا)۔ لوگ اپنی زندگی کی پوری تفصیل سامنے پائیں گے، اور اپنی آنکھوں سے سب کچھ مشاہدہ کریں گے، اور تیرا ربّ کسی پر کوئی زیادتی نہیں کرتا۔

صاحب تفسیر مظہری علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل فرماتے ہیں کہ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ مؤمنین کے اعمال کا صرف وزن ہوگا یا کافروں کے اعمال بھی تولے جائیں گے؟ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ صرف مؤمنین کے اعمال تولے جائیں گے، کیونکہ کافروں کی نیکیاں تو اُکارت ہوجائیں گی، پھر جب نیکی کے پلڑے میں رکھنے کے لئے کچھ نہ رہا تو ایک پلڑے سے کیا تولا جائے گا؟ اس جماعت نے ﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ [الکھف: ۱۰۵] (چنانچہ قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن شمار نہیں کریں گے) سے استدلال کیا ہے۔

جبکہ دوسری جماعت کہتی ہے کہ کفار کے اعمال بھی تولے جائیں گے، لیکن وہ بے وزن نکلیں گے، ان کا استدلال آیت: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُمُّهُ هَاوِيَةٌ﴾ [القارعۃ: ۹] (اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا ایک گہرا گڑھا ہوگا) سے ہے۔ اسی طرح آیت: ﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ﴾ [الأعراف: ۹] (اور جن کی ترازو کے پلے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ زیادتیاں کرکے خود اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالا ہے) سے ہے، کیونکہ دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے، اور دوزخ کے طبقہ "ہاویہ" میں ڈالے جانے والے کفار ہی ہوں گے۔

اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ کوئی بھی مؤمن خواہ کتنا ہی بے عمل ہو جہنم میں ہمیشہ کے لئے نہیں رہے گا۔ اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اعمال کے علاوہ نفسِ کفر میں بھی سارے کافر برابر نہیں، تو وزن کا ہونا اس لئے بھی ضروری

ہے کہ ہر کافر کے کفر کی حیثیت معلوم ہو، تا کہ اسی کے مطابق جہنم کے درجات اور طبقات میں انہیں ڈالا جائے۔ کیا فرعون وابوجہل کا کفر عام کافروں کے کفر جیسا ہے؟ اس کے علاوہ ارتکابِ معاصی میں بھی سارے کفار ایک جیسے برابر نہیں ہوتے۔

شرح عقائد سکی میں حضرت امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے کہ کفار کے لئے میزانِ تمیز ہوگا کہ اس کے ذریعہ کفار کے مختلف طبقات میں ان کے اعمال تول کر یہ فیصلہ ہوگا کہ کن کفار کے گناہ زیادہ اور بہت بڑے ہیں، اور کن کے کم ہیں، تا کہ ابدی عذاب میں شریک ہونے کے باوجود ان کے گناہوں کی کثرت وقلت کے مطابق ان کے مناسب طبقات متعین کئے جائیں۔

پھر جیسا کہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا، اور دیگر بکثرت علماء کرام کا بھی یہی مذہب ہے کہ ترازو میں نامۂ اعمال رکھے جائیں گے، اور ان کا وزن ہوگا، جن کا بوجھل اور ہلکا ہونا اعمال کی نوعیت پر ہوگا۔ ان حضرات نے حدیث البطاقۃ سے استدلال کیا ہے، جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کر کے اس کی تحسین بھی کی ہے، اور علامہ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو اپنی صحیح ابن حبان میں تخریج کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: يُؤْتى بِتِسعٍ وَتِسعِينَ سِجِلًّا فَتُوضَعُ فِي كَفَّةٍ وَيُؤْتى بِالْبِطَاقَةِ فَتُوضَعُ فِي أُخرىٰ فَطَاشَتِ السِجِلَّاتُ وَثَقُلَتِ البِطَاقَةُ.

وہ بطاقہ کیا ہوگا؟ کاغذ کا ایک پرزہ ہوگا، جس پر کلمہ، یعنی أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ لکھا ہوا ہوگا۔ ان ننانوے دفتروں کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا، اور دوسرے پلڑے میں وہ پرزہ ہوگا، تو دفتروں والا پلڑا اڑنے لگے گا، اور یہ پرزہ بھاری ہوگا۔

وازن کون ہوگا؟

رہا یہ مسئلہ کہ وزن کرنے والا کون ہوگا؟ حق تعالیٰ جلّ شانہ ہوگا، یا ملک الموت ہوں گے، یا حضرت آدم علیہ السلام ہوں گے، یا حضرت جبرائیل علیہ السلام ہوں گے؟ پہلا قول امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ دوسرا قول حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ تیسرا قول حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ معجم صغیر طبرانی میں چوتھا قول حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ابوالقاسم الاسکائی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب السنۃ میں ہے کہ درحقیقت چاروں اقوال میں اختلاف کوئی نہیں، مطلب

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ حکم کرنے والا ہے، اس کی حیثیت سب سے مقدم ہے کہ وہی وزن کرنے کا حکم اور فیصلہ کرنے والا ہوگا۔ ملک الموت کی حیثیت وہی ہوگی جیسا کوئی مجرموں کا چالان پیش کرے، ان کو روح قبض کرتے وقت ہر شخص کا پورا حال معلوم ہوا، وہ اسی چالان کو پیش کرے گا اور بیان دے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی حیثیت سرپرست کی ہوگی کہ وہ سارے بنی آدم کے سرپرست اور باپ ہیں، انہیں حکم ہوگا: یَا آدَمُ قُمْ عِنْدَ الْمِیْزَانِ۔ اے آدم! کھڑے رہو، حاضر رہو، دیکھو کہ تمہاری اولاد کا فیصلہ ہونے کا وقت یہی ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی کے ذریعہ قانونِ الٰہی کے پہنچانے والے ہیں، وہ معلوم کریں گے کہ قانون شکنی کرنے والے کون ہیں، اور قانون کا احترام کرنے والے کون ہیں۔ بحیثیت ایک خبر دینے والے قانون دان کے ہوں گے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ
صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ
مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ قَالَ فَاهْبِطْ
مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾
قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ
اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے تمہیں زمین میں رہنے کی جگہ دی، اور ہم نے تمہارے لئے اس میں زندگی کا سامان پیدا کیا، تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو ﴿۱۰﴾ اور بلاشبہ ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، سو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا ﴿۱۱﴾ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوا کہ تجھے کس چیز نے اس بات سے روکا کہ تو سجدہ کرے؟ جبکہ میں نے تجھے حکم کیا، اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں، مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا، اور اس کو پیدا کیا کیچڑ سے ﴿۱۲﴾ پس فرمایا: تو یہاں سے اُتر جا، سو تجھے کوئی حق نہیں کہ اس میں تکبر کرے، سو تو نکل جا، بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے ﴿۱۳﴾ وہ کہنے لگا کہ مجھے اس دن تک

مہلت دیجئے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے⑭ فرمایا: بے شک تو ان لوگوں میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی⑮ وہ کہنے لگا: سو اس وجہ سے کہ آپ نے مجھے گمراہ کیا، میں ضرور بضرور ان لوگوں کے لئے آپ کے سیدھے راستہ میں بیٹھوں گا⑯ پھر ضرور آؤں گا ان کے پاس ان کے سامنے سے، اور ان کے پیچھے سے، اور ان کی داہنی جانب سے، اور ان کی بائیں جانب سے، اور ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے⑰ فرمایا: تو یہاں سے نکل جا، ذلیل اور خوار ہو کر، اس میں شک نہیں کہ جو شخص ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں ضرور تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا⑱

معارف ومنازل

بنی آدم پر اللہ تعالیٰ کے احسانات وانعامات، اور شیطان کی ملعونیت کا تذکرہ یہ متعدد آیات ہیں، پہلی آیت میں (جو بعد میں آنے والی آیات کی تمہید ہے) فرمایا کہ ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی، اور نہ صرف جگہ دی بلکہ تمہارے لئے معیشت کا سامان بھی پیدا کیا، تمہارے لئے بے شمار کھانے پینے کی چیزیں پیدا کیں، پہننے اور اوڑھنے، بچھانے کے لئے کپڑے پیدا کئے، اور زمین کو سازگار اور نرم پیدا فرمایا، اس میں کھدائی کر کے مکانات کی بنیاد ڈالو، اور ہر طرح سے جیسے چاہو عمارتیں بناؤ، درخت، باغات لگاؤ، کھیتیاں کرو۔ اپنے جانوروں کے لئے چراگاہیں اور گھاس چارے لگاؤ، پانی کے لئے کنواں کھودو، غرض یہ کہ تمہاری پوری زندگی کی خوشحالی کے لئے ہم نے ہر چیز بکثرت پیدا کی۔ طرح طرح کا سامان پیدا فرما کر تم پر احسان کیا۔ ان سب نعمتوں کو استعمال کرو، اور خالق کائنات جلّ شانہ کا شکر ادا کرو، لیکن تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

اس تمہید کے بعد جس میں یہ بتادیا کہ خالق و مالک کا شکر ادا کرنا فرض ہے، مزید دو نعمتوں کا تذکرہ فرمایا کہ ہم نے تمہیں (تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو) پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی، پہلے مٹی کو زمین کے مختلف حصوں سے جمع فرمایا، جس سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنا تھا، پھر اس مادہ سے ان کی صورت بنائی، جو آدم علیہ السلام کی صورت تھی، وہی صورت ان کی ذرّیت کی بھی ہوگئی۔

یہی وہ اعلیٰ و بے مثال صورت ہے جس کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ﴾ [التین: ۴] (ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے)۔ اور حدیث میں فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوۡرَتِہٖ. [مشکوٰۃ]۔ پھر اس صورت میں روح پھونک دی، پہلے وہ ایک مجسمہ کی شکل تھی، پھر جیسے ہی

اس میں روح پھونک دی، وہ جیتی جاگتی دیکھتی بھالتی عقل اور سمجھ رکھنے والی ایک جاندار چیز بن گئی۔ پھر انہیں چیزوں کے نام سکھا دیئے، پھر فرشتوں کے سامنے یہ پیش کیا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ، وہ نہ بتا سکے، اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی علمی برتری اور فضیلت فرشتوں پر ثابت ہوگئی۔

ابلیس کی گستاخی اور حکم ماننے سے انکار پر لعنتی بن جانا:

سورۂ بقرہ میں مکمل تفصیل گزر چکی ہے، یہاں اس کا مختصر خلاصہ ذکر ہو رہا ہے۔ علمی فضیلت ثابت ہونے پر فرشتوں کو حکم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اس پر سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ یہ سجدۂ تعظیمی تھا، عبادت کا سجدہ نہیں تھا۔ وہاں ابلیس بھی تھا، یہ تھا تو جنات میں سے، لیکن زیادہ عبادت کرنے کی وجہ سے وہیں آسمان میں فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا، اور "طاؤس الملائکۃ" کہلاتا تھا۔ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اس کو بھی حکم ہوا تھا، جیسے ﴿اِذْ اَمَرْتُكَ﴾ کے معنی ہیں۔ ابلیس نے صرف اتنا نہیں کیا کہ حکم عدولی کی، اور سجدہ نہیں کیا، بلکہ ربّ العزّت عزّوجلّ نے جب سوال فرمایا کہ میں نے جب تجھے ان کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟

اِس پر اُس نے غرور و سرکشی کے ساتھ مناظرہ شروع کیا، اور کہا:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ کہ آپ مجھے یہ کیسے حکم دیتے ہیں کہ میں اپنے سے کسی کمتر کو سجدہ کروں؟ میں تو اس سے بہتر ہوں، اور جو بہتر ہے اُسے حکم دینا کہ اپنے سے کمتر کا سجدہ کرے، یہ تو حکمت کے خلاف ہے۔ پھر بہتر ہونے کی یہ دلیل پیش کی کہ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے (تمام جنات کی تخلیق آگ سے ہے) اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، اور آگ مٹی سے بہتر ہے، لہٰذا میں بھی اس سے بہتر اور افضل ہوں۔

شیطان نے جو دلیل بیان کی وہ نہایت غلط دلیل ہے، کیونکہ آگ کی طبیعت میں فساد کا غلبہ ہے، اور وہ تباہ کن اور ضرر رساں ہے، اسی وجہ سے جہنم کا عذاب آگ ہی پر منحصر ہے۔ اور مٹی کی طبیعت میں انکساری اور تعمیر ہے، اس میں آباد کاری کا عنصر نمایاں ہے۔ دنیا میں ہزاروں کھانے پینے، رہنے سہنے کی چیزوں کا مرکز اور بنیاد زمین اور اس کی مٹی ہے۔ آگ کے منافع نہایت محدود ہیں۔ ابلیس کو "اَنَا" لے ڈوبا، اور ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوا۔

اگر وہ واقعۃً حضرت آدم علیہ السلام سے افضل ہوتا تب بھی اَحکَمُ الحَاکِمین جلّ شانہ کا حکم بجالانا ضروری تھا، لیکن اس ازلی بدبخت نے اللہ تعالیٰ شانہ کے حکم کو غلط قرار دیا، اور حجت بازی پر اُتر آیا، تو ارشاد ہوا کہ:

﴿فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا﴾ تو یہاں سے اُتر جا، تیرے لئے یہ مناسب نہیں کہ تو

اس میں تکبر کرے، تو یہاں سے نکل جا۔

﴿فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ﴾ بیشک تو ذلیلوں میں سے ہے۔ مِنْهَا اور فِيْهَا دونوں کی ضمیر کس طرف راجع ہیں؟ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہ ضمیر جنت کی طرف راجع ہے، اور ابلیس پہلے سے وہاں رہتا تھا، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد دنیا کا ایک باغیچہ ہے، جو عدن میں تھا، حضرت آدم علیہ السلام وہیں پیدا کئے گئے تھے، اور ابلیس کو وہیں سجدہ کرنے کا حکم ہوا تھا۔ اس نے سجدہ سے انکار کیا تو وہاں سے نکل جانے کا اُسے حکم ہوا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ بعض حضرات نے ضمیروں کو آسمان کی طرف راجع کیا ہے، اور لکھا ہے کہ یہ ایک جماعت کا قول ہے۔

لیکن اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ ابلیس کے ملعون اور مردود ہونے کے بعد حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کو جنت عالیہ میں ٹھرایا گیا، اور اس کے بعد ابلیس نے وسوسہ ڈالا، اور ان کو دھوکہ دیا، اور بہکایا۔ اگر وہ اس سے پہلے ہی آسمان سے اتار دیا گیا تھا تو پھر اس نے کیسے وسوسہ ڈالا؟ اور یہ اشکال اس صورت میں بھی ہوتا ہے جبکہ سجدہ کا واقعہ عدن والے باغ میں مانا جائے۔ سجدہ کا انکار کرنے کے بعد، عدن والے باغ سے نکال دینے کے بعد اس نے کیسے وسوسہ ڈالا؟

سیدھی اور صاف بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہی ہے کہ ابلیس عالم بالا میں یعنی اوپر ہی رہتا تھا، اور سجدہ کا حکم جو ہوا وہ بھی وہیں عالمِ بالا میں ہی ہوا تھا، جب ابلیس نے سجدہ نہ کیا تو ابلیس کو وہاں سے نکال دیا گیا، اور حضرت آدم و حواء علیہما السلام کو جنت میں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا۔ ابلیس عالمِ بالا سے نکالا تو گیا، مگر ابھی زمین پر نہیں آیا تھا کہ اس نے دونوں میاں بیوی کے دل میں وسوسہ ڈالا، اور انہیں بہکا کر شجرۂ ممنوعہ کھانے پر آمادہ کیا۔ وسوسہ کیسے ڈالا؟ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں دیکھیں۔

ابلیس کا زندہ رہنے کے لئے لمبی مہلت مانگنا، اور اس کی منظوری:

چونکہ ابلیس پہلے سے جانتا تھا کہ یہ نئی مخلوق زمین میں آباد کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے، اور اُسے زمین پر خلافت کا شرف اور تاج پہنایا جائے گا، اور شیطان کو جو ملعونیت کا داغ اور ذلت وخواری جو نصیب ہوئی وہ بھی اسی بشری مخلوق کی وجہ سے ہوئی، اس لئے اس نے پہلے تو اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی کہ میری عمر اتنی لمبی کر دی جائے کہ جس دن قیامت قائم ہو جائے، اور لوگ قبروں سے اٹھیں گے اس وقت تک زندہ رہوں۔ اللہ تعالیٰ نے یوں تو نہیں

فرمایا کہ قبروں سے اٹھنے کے دن تک تجھے مہلت ہے، البتہ یوں فرمایا کہ: ﴿فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ﴾ [الحجر:۳۷۔ص:۸۰] (تجھے مہلت دے دی گئی۔ایک ایسی میعاد کے دن تک جو معلوم ہے) کہ تجھے وقت معلوم کے دن تک مہلت دی گئی۔سور"حجر" اور"ص" میں یہی الفاظ ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو لمبی عمر عطاء فرمانے کا وعدہ فرمالیا، تو ابلیس نے اپنے کینہ اور دشمنی کا کھلم کھلا اظہار و اعلان کر کے کہا کہ میں آپ کی عزّت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان سب کو ضرور بضرور گمراہ کروں گا۔یعنی اولاد آدم علیہ السلام سے اپنی ملعونیت کا ضرور بدلہ لوں گا۔عجیب بات ہے کہ خود تو قیامت کو مانتا ہے، اور قیامت تک کی مہلت بھی مانگتا ہے، مگر اپنے فرمانبرداروں سے کہتا رہتا ہے کہ قیامت اور حشر و نشر کچھ نہیں، وغیرہ۔

سورۂ حجر میں یہ الفاظ ہیں: ﴿قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ﴾ [حجر:۳۷] (شیطان نے کہا: اے میرے ربّ! مجھے اس دن تک مہلت دیدے جب لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے)۔سورۂ ص میں یہ ہے: ﴿قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ﴾ [ص:۸۰] (شیطان نے کہا: اے میرے ربّ! مجھے اس دن تک مہلت دیدے جب لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے)۔

یہاں سورۂ اعراف میں یہ الفاظ ہیں: ﴿فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ اس سبب سے کہ آپ نے مجھے گمراہ کیا، میں آپ کے سیدھے راستے میں پہرہ دوں گا، اور ان کی راہ ماروں گا، یعنی سیدھے راستے سے ہٹاؤں گا، ان کے پاس ضرور آؤں گا، ان کا محاصرہ کروں گا، آگے پیچھے دائیں بائیں ان کے تمام راستوں کو بند کر کے ہر طرف سے چھاپہ مار کارروائی کر کے انہیں راہِ حق اور صراطِ مستقیم سے دور کرنے کی کوشش اور جدو جہد کروں گا، اور انہیں وہ وہ پٹی پڑھاؤں گا کہ وہ کھلم کھلا میری حمایت میں آپ کی اُلوہیت و وحدت کا انکار کر کے دم لیں گے۔

سورۂ حجر میں ہے کہ اس نے انسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے قسم کھاتے ہوئے یوں کہا: ﴿لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [الحجر:۳۹] (میں ضرور ان انسانوں کے لیے دنیا میں دلکشی پیدا کروں گا، اور ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا)۔اور سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [الاسراء:۶۲] (اگر آپ نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیدی تو بجز چند قلیل لوگوں کے

اس کی ساری ذریت کو اپنے قابو میں کرلوں گا)۔

ابلیس تو اپنی قسم کو نہیں بھولا، اور اپنے عزائم سے باز نہیں آیا، اور نہ ہی کوئی کمزوری اور غفلت دکھائی، بڑی چالاکی اور مستعدی کے ساتھ کام کر رہا ہے، اور فرائض پورا کر رہا ہے، اور ہر آن اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ بنی آدم کو بہکانے ورغلانے اور گمراہ کرنے میں اس نے اور اس کی ذریت نے کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بنی آدم کو شرک اور کفر پر، اور اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی انوکھی اور عجیب وغریب نافرمانیوں پر شب وروز آمادہ کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ بقول اس کے ﴿اِلَّا قَلِيلًا﴾، یعنی اکثریت کو گمراہ کر کے رہوں گا، البتہ کچھ تھوڑے سے ایسے ہوں گے جو میری بات میں نہیں آئیں گے۔

دوسرے مقام پر ہے: ﴿لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ [الحجر: ۴۰] (میں ضرور ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے اپنے لیے مخلص بنالیا ہو) کہہ کر استثناء کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ﴾ [الحجر: ۴۲] (یقیناً میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، سوائے ان گمراہ لوگوں کے جو تیرے پیچھے چلیں گے)۔ پھر ارشاد ہے:

﴿قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو یہاں سے نکل جا، ذلیل وخوار ہوکر۔ یہ حکم دوسری بار ہے، اس سے پہلے بھی یہ حکم ہو چکا تھا، لیکن وہ سجدہ نہ کرنے اور تکبر کی وجہ سے ہوا تھا، اب دوبارہ یہ حکم اس لئے ہے کہ اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی، تو اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے یہ بھی فرمایا کہ نکل جاؤ، یا یہ پہلے قول کی تاکید ہے۔

ابلیس اور اس کے اَتباع کے لئے دوزخ کا اعلان:

﴿لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ بنی آدم میں سے جو تیرا اِتباع کرے گا تو تم میں سے میں دوزخ کو بھر دوں گا۔ ابلیس نے قسم کھا کر اپنی بات بتادی کہ میں ان سب کا ستیاناس کروں گا، اور راہِ حق وصراطِ مستقیم سے ہٹاؤں گا۔ اس پر ربّ العزّت سبحانہ نے اعلان فرمادیا کہ تجھے اور تیرے ماننے والوں کو سب کو دوزخ میں ڈال دوں گا، اور جہنم کو تیری ذریت اور تیرے اِتباع کرنے والوں سے بھر دوں گا۔

دیکھیں! ابلیس نے جو اعلان کیا وہ اپنی جگہ پر، پھر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عقل جیسی نعمت سے نوازا، اور انہیں

طرح طرح کی نعمتیں عطاء فرمائیں، پھر ان کے پاس ہر زمانہ میں انہیں میں سے انبیاء کرام علیہم السّلام مبعوث فرمائے، تا کہ وہ انہیں ہدایت کا راستہ بتائیں، اور راہِ حق کی تبلیغ کریں، اور ڈرائیں، اور شیطان کی دشمنی سے انہیں مطلع کریں، اور اس کی گمراہیوں اور ورغلانے سے انہیں آگاہ فرمائیں، وغیرہ۔

اب اِتمامِ حجت ہو چکا، اس کے بعد پھر بھی اگر کوئی اپنے ربّ کی ناشکری کر کے اس کی ہدایات اور انبیاء کرام علیہم السّلام کی بات نہیں مانے گا، اور شیطانی باتوں پر عمل کر کے اس کا اِتباع کرے گا تو وہ جہنم ہی کا حقدار ہوگا، اور ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری حفاظت فرما، ہمیں ابلیس کے شر سے بچا۔ آمین

......❁......❁......❁......

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝١٩ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا
رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝٢٠ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ
النّٰصِحِيْنَ ۝٢١ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ
وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ
مُّبِيْنٌ ۝٢٢ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝٢٣ قَالَ
اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝٢٤ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ
وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝٢٥

ترجمہ: اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، پھر جس جگہ سے چاہو تم دونوں کھاؤ، اور اس درخت کے پاس مت جاؤ، کبھی ان لوگوں میں شمار نہ ہو جاؤ جو ظالم ہیں ۝١٩ پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا، تا کہ ان دونوں کے جسم کا وہ حصہ ظاہر کر دے جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھا (یعنی ان کو بے ستر کر دے) اور کہنے لگا کہ: اس درخت سے تمہارے ربّ نے تمہیں اسی لئے روکا ہے کہ تم دونوں اُسے کھا کر فرشتے بن جاؤ گے، یا ہمیشہ جنت میں رہنے والے ہو جاؤ گے ۝٢٠ اور اس نے ان کے سامنے قسم کھائی کہ بلاشبہ میں تمہاری خیر خواہی کرنے والوں میں سے ہوں ۝٢١ سو فریب دے کر ان دونوں کو نیچے لے آیا، سو جب ان دونوں نے اس درخت کو

چکھ لیا تو ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں، اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے، اور ان دونوں کو ان کے ربّ نے پکارا: کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہ کیا تھا؟ اور کیا میں نے تم سے یہ نہ کہا تھا کہ بلا شبہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے؟ ﴿۲۲﴾ وہ دونوں کہنے لگے: اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ فرمائیں گے، اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو ضرور ہم تباہ کاروں میں سے ہو جائیں گے ﴿۲۳﴾ فرمایا: تم اُتر جاؤ، تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں، اور تمہارے لئے زمین میں رہنے کی جگہ ہے، اور نفع حاصل کرنا ہے ایک وقت تک ﴿۲۴﴾ فرمایا: تم اسی میں جیو گے، اور اسی میں مرو گے، اور اسی سے نکالے جاؤ گے ﴿۲۵﴾

معارف ومنازل

شیطان تو مردود اور ذلیل ہو کر عالمِ بالا سے نکالا گیا، اور حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں رہو، اور خوب بلا روک ٹوک اس میں سے کھاؤ، اور بس اتنی پابندی ہے کہ فلاں درخت کے پاس نہ جانا، اس میں تاکید کی گئی کہ کھانا تو کیا اس کے پاس بھی نہ جانا، یہ نہی مؤکد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے ان دونوں سے پہلے فرمایا تھا کہ: ﴿يٰآدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى﴾ [طٰہٰ:۱۱۷] (اے آدم! یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، لہٰذا ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے، اور تم مشقت میں پڑ جاؤ)۔

شیطان اس فکر میں تھا کہ خود تو جنت سے محروم ہو کر نکلا ہی ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو بھی وہاں سے نکلوائے، چنانچہ اس نے تدبیر کرنا شروع کر دی، اور تاک میں لگا رہا، تو ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ دیکھو! تمہیں اس درخت کے کھانے سے اس لئے منع فرمایا ہے، اور اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اس درخت میں سے جو کھا لے گا وہ شخص فرشتہ بن جائے گا، اور اسے یہاں ہمیشہ رہنے کی دولت مل جائے گی، اور اس نے قسم کھائی کہ میں تمہاری خیر خواہی کی بات کر رہا ہوں۔ جھوٹی قسم کھائی، اور فرشتہ بن جانے کی، اور ہمیشہ رہنے کی بات ان کے سامنے رکھی۔ وہ یہ سن کر ان کی باتوں میں آ گئے، اور بھول گئے، جیسے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۵] (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک بات کی تاکید کی تھی، پھر ان سے بھول ہو گئی، اور ہم نے ان میں عزم نہیں پایا)۔

چنانچہ فریب خوردہ ہو کر بھولے انداز میں اس درخت میں سے کھا گئے۔ ابھی ٹھیک طرح سے کھانے بھی نہ

پائے تھے، بلکہ اس درخت سے چکھا ہی تھا کہ ان کے جسم سے کپڑے اُتر گئے، اور بے ستر ہو کر دونوں کی شرمگاہیں نظر آگئیں۔ وہ اپنی شرمگاہوں کو ڈھکنے کے لئے جنت کے پتے لے کر اپنے جسموں پر جوڑنے لگے، جس سے اسی وقت ظاہر ہو گیا کہ یہاں ہمیشہ رہنا تو کجا اس درخت کو کھا کر یہاں کے کپڑے تک جسم پر نہیں رہ سکتے۔

حضرت آدم وحضرت حواء علیہما السلام کی ندامت اور توبہ کرنا:

اللہ تعالیٰ نے دونوں کو پکارا کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت کے پاس جانے سے منع نہ کیا تھا؟ اور کیا میں نے تم دونوں سے نہ کہا تھا کہ بلا شبہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے؟ چونکہ وہ دونوں برگزیدہ اور سچے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت وصداقت پر کس کو شک ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ﴾ [آل عمران:۳۳] (بیشک اللہ نے چن لیا ہے آدم، نوح اور ابراہیم کے خاندان کو) سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی﴾ [طٰہٰ:۱۲۲] (پھر ان کے ربّ نے انہیں چن لیا، چنانچہ ان کی توبہ قبل فرمائی، اور انہیں ہدایت عطا فرمائی)۔ اسی بناء پر انہیں اللہ تعالیٰ نے توبہ کے متعلق الہام فرمایا، اور انہوں نے فوراً توبہ کی، اور وہ قبول بھی ہوگئی، جبکہ ابلیس توبہ سے محروم رہا۔

خطاء واقع ہونے کے بعد بغیر کسی حیلہ وحجت کے دونوں نے اپنا قصور مان لیا، اور لغزش کا اقرار کیا، اور مغفرت طلب کی، اور رحمت کی درخواست پیش کردی، اور کہا:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر آپ نے ہماری بخشش نہ فرمائی، اور ہم پر رحم نہ فرمایا، تو ہم تباہ کاروں میں سے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ﴿فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾ [البقرۃ:۳۷] (پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ الفاظ سیکھ لیے، چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی، بیشک وہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے)۔

حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کی خطاء تو معاف ہوگئی، مگر تقدیر وقضاء کا جو فیصلہ ان کی تخلیق سے پہلے ہو چکا تھا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ [البقرۃ:۳۰] (میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں)۔ جب ان کی تخلیق خلافت ارضی کے لئے ہو تو لازماً قضاء وقدر کے فیصلوں کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے، اور ان کو اپنے وطن اصلی (کیونکہ ان کا وطن اصلی زمین ہی تو ہے، جس سے ان کی پیدائش ہے) کی طرف روانہ کرنا ہوگا، اس لئے

قبولیتِ توبہ کے بعد نہ بطورِ سزا، اور نہ بطورِ سرزنش، اور نہ بطورِ عقاب وعتاب، بلکہ تکمیل وتنظیمِ خلافت کی خاطر انہیں ھبوط اِلَی الأرْضِ کا حکم ملا، اور تخلیق و پیدائش کے بعد ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ [البقرۃ: ۳۱] (اور آدم کو سارے نام بتادیئے) بھی اسی مقصد کے لئے ہوا کہ تمام چیزوں کے نام، اجناس، انواع، خواص، فوائد ومنافع وغیرہ انہیں بتائے گئے۔ اور یہ تمام اشیاء اور چیزیں زمین ہی کے حصے اور زمین ہی کے ساتھ وابستہ ہیں، اس لئے فرمایا:

﴿قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ تم یہاں سے اُتر جاؤ، تم میں بعض بعض کے دشمن ہوں گے، اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے، اور ایک وقت تک نفع حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ان کا زمین پر ہبوط ہوگیا، اور بود وباش شروع ہوگئی۔ ہر شخص آتا ہے مدّت مقرر تک زمین میں رہتا ہے، اور کچھ نفع حاصل کرتا ہے، پھر مرجاتا ہے، اور زمین کے اندر چلا جاتا ہے، اور قیامت کے روز اسی زمین سے اٹھائے گا، اور حساب وکتاب کے لئے میزان کے پاس آکر کھڑا ہوگا۔

حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کے قصہ، اور ابلیس کی شرارت، اور شقاوت کے متعلق سورۂ بقرہ میں مکمل تفصیل گزرچکی ہے، وہاں دیکھا جائے۔

❀ ❀ ❀

يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ قَدۡ أَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمۡ لِبَاسٗا يُوَٰرِي سَوۡءَٰتِكُمۡ وَرِيشٗاۖ وَلِبَاسُ ٱلتَّقۡوَىٰ
ذَٰلِكَ خَيۡرٞۚ ذَٰلِكَ مِنۡ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُونَ ۝٢٦ يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ لَا يَفۡتِنَنَّكُمُ ٱلشَّيۡطَٰنُ
كَمَآ أَخۡرَجَ أَبَوَيۡكُم مِّنَ ٱلۡجَنَّةِ يَنزِعُ عَنۡهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوۡءَٰتِهِمَآۚ إِنَّهُۥ يَرَىٰكُمۡ
هُوَ وَقَبِيلُهُۥ مِنۡ حَيۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡۗ إِنَّا جَعَلۡنَا ٱلشَّيَٰطِينَ أَوۡلِيَآءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤۡمِنُونَ ۝٢٧

ترجمہ: اے آدم کی اولاد! بیشک ہم نے تمہارے لئے لباس اُتارا، جو تمہاری شرم کی جگہوں کو چھپاتا ہے، اور وہ سببِ زینت ہے، اور تقویٰ کا لباس یہ بہتر ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں ۝۲۶ اے آدم کی اولاد! تمہیں شیطان ہرگز فتنہ میں نہ ڈالے، جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے ایسی حالت میں نکالا کہ وہ ان کا لباس اُتروا رہا تھا، تاکہ دکھادے ان دونوں کو ان کی شرمگاہیں، بیشک وہ اور اس کی قوم تمہیں ایسے طور پر دیکھتے ہیں کہ تم انہیں نہیں دیکھتے، بیشک ہم نے بنادیا شیطانوں کو ان لوگوں کا دوست جو ایمان نہیں

لاتے ﴿۴۷﴾

معارف ومنازل

گزشتہ رکوع میں شیطانوں کی انسان دشمنی کا ذکر تھا، جبکہ شیطان نے جم کر اعلان کیا تھا کہ میں اولادِ آدم کو چاروں جہتوں سے گمراہ کر کے ہی رہوں گا، اور ہر طرح ورغلا کر بہکاؤں گا، اور ان میں سے بہت تھوڑے ہی لوگ خداوند جل شانہ کے شکر گزار بندے ہوں گے، اور اس کا بھی ذکر ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم وحضرت حواء علیہما السلام کو جنت سے نکلوادیا، اب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے خطاب ہو رہا ہے کہ شیطان کی شرارت سے ہوشیار رہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے لباس اُتار کر تمہیں ننگا نہ کر دے، اور تمہارے باطنی لباس تقویٰ کو ضائع نہ کر دے، لہٰذا خبردار رہو۔

لباس اللہ تعالیٰ کی نعمت بھی ہے، اور پردہ پوشی وزینت بھی ہے:

اوّل تو اولادِ آدم کو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اپنی ایک بہت بڑی قیمتی نعمت کی یاددہانی فرمائی، اور وہ نعمت لباس ہے۔ اس کو لفظ "اَنْزَلْنَا" سے تعبیر فرمایا۔ لباس کا مادہ روئی وغیرہ محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ وبخشش ہے، جیسے بحکمِ خداوندی آسمان سے بارش اترتی ہے، ایسے ہی لباس کا مادہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ پیدا نہ فرمائے تو بندے کچھ نہیں کر سکتے۔

پھر لباس کے دو فائدے بتائے: اوّل سترِ عورت، یعنی وہ شرم کی جگہوں کو ڈھانکتا ہے۔ اور دوسرا فائدہ یہ بتایا کہ لباس انسان کے لئے بہت بڑی زینت ہے، انسان لباس میں جمیل وحسین، خوبصورت نظر آتا ہے۔ سورۂ نحل میں لباس کا فائدہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُمْ بَأْسَكُمْ﴾ [النحل: ۸۱] یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایسے کُرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کرتے ہیں، اور ایسے کُرتے بنائے جو تمہاری لڑائی میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔ علماء کرام نے فرمایا کہ یہاں "تَقِيكُمُ الْحَرَّ" جو فرمایا یہ برسبیلِ کفایت ہے، یعنی گرمی کا ذکر فرمادیا، چونکہ سردی اس کی مقابل ہے، اس لئے ایک کے ذکر کرنے سے دوسرے کا تذکرہ بھی ہو گیا۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ سردی سے بچنے کا ذکر سورۂ نحل کے شروع میں فرمادیا ہے، وہ یہ ہے: ﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ﴾ [النحل: ۵] (اور چوپائے اسی نے پیدا کیے جن میں تمہارے لیے سردی سے بچاؤ کا سامان ہے، اور اس کے علاوہ بہت سے فائدے ہیں، اور انہیں میں سے تم کھاتے بھی

ہو) اس لئے دوسری جگہ سردی کا ذکر نہیں فرمایا۔

بہر حال! لباس اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، اس سے ستر بھی پوشیدہ رہتا ہے، سردی وگرمی سے بھی حفاظت ہوتی ہے، اور اس کے ذریعہ انسان حسین وجمیل خوبصورت بھی نظر آتا ہے۔ لوگ اسی خوبصورتی اور زیب وزینت کے حصول کی خاطر بے شمار ڈیزائنوں میں بے شمار مہنگے اور قیمتی لباسوں کا انتظام کرتے ہیں، اور بکثرت طرح طرح کے قیمتی لباس تیار کرتے رہتے ہیں۔

لباس پہلے تو روئی اور اُون تک منحصر تھا، لیکن اب تو بہت سی چیزوں سے بنایا جاتا ہے۔ یہ سب اشیاء واجناس اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتیں ہیں، جن سے لباس بھی بنایا جاتا ہے، اور دوسرے کاموں میں بھی آتے ہیں۔

فائدہ:

لباس میں جہاں خوبصورتی کا راز چھپا ہوا ہے، وہاں یہ لباس ایک عظیم نعمت، اور بہت بڑا شرف بھی ہے، اسی نکتہ کے پیش نظر قرآن کریم کے مختلف مقامات میں جب جنت اور جنتی نعمتوں کا تذکرہ ہوتا ہے تو وہاں جنتی لباسوں کا تذکرہ سرِ فہرست رہتا ہے۔ جنتیوں کے عمدہ اور ریشمی لباس کا ذکر بار بار بکثرت ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح دنیا میں بھی لوگ لباس کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، یہاں تک کہ خوشحال لوگ ہزاروں درہم کا ایک ایک جوڑا اور قیمتی پوشاک تیار کروا تے ہیں۔ ایک اموی بادشاہ ہشام بن عبد الملک کے متعلق سنا ہے کہ خالص ریشم کے ایک لاکھ بیس ہزار جوڑے انہوں نے اپنے لئے سلوائے تھے، جبکہ اس کے پیشرو خلیفہ راشد سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا جمعہ اور عیدین اور عام اوقات کے لئے صرف ایک ہی جوڑا ہوتا تھا۔ یہ بات تاریخ ہزار سالہ کے مؤلف نے لکھی ہے۔

ابھی ہمارے زمانے میں بھی ایسے دنیادار عیاشوں کی کوئی کمی نہیں، جو ایک سوٹ پانچ لاکھ روپیہ میں بنواتے ہیں، اور صرف ایک ماہ استعمال کرنے کے بعد پھینک دیتے ہیں۔ عقلمند لوگ اپنے اصلی اور دائمی لباس کے متعلق فکر مند ہوتے ہیں، اور اسی کی تیاری میں لگے رہتے ہیں، جس کا بیان عنقریب آنے والا ہے۔

کیا اچھا ہوتا کہ یہ انسان اپنے کفن کا اندازہ لگا کر دنیوی غرور اور اسراف سے بچ کر کفایت شعاری اختیار کرتا، اور سنت پر عمل کرتا۔ قرآن کریم نے جسم چھپانے والے لباس کی نعمت کا ذکر فرمانے کے بعد ایک اصلی اور عظیم لباس کی طرف (جو کہ عظیم بھی ہے، اور پائیدار بھی) توجہ دلا کر ارشاد فرمایا:

﴿وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ اور تقویٰ کا لباس یہ بہتر چیز ہے۔ تقویٰ گناہوں سے بچنے کا نام ہے،

جوشخص گناہوں سے بچے، اور فرائض وواجبات کی ادائیگی کرے، اور اعمالِ صالحہ بجالائے، اور غیر شرعی اعمال و منکرات سے بچے، وہ شخص تقویٰ والا ہے، اور تقویٰ کے لباس میں ہے، سمجھو باپردہ وباحیاء ہے۔

پھر تقویٰ اُسے سارے انسانی عیوب ونقائص سے بچاتا ہے، فواحش ومنکرات سے دور رکھتا ہے، اور ہر قسم کی بے حیائی سے باز رکھتا ہے۔ جس میں تقویٰ ہوگا خواہ مرد ہو یا عورت وہ ستر ڈھانکنے کی کوشش کرے گا، اور جس میں تقویٰ نہیں وہ زینت وخوبصورتی کے لئے لباس تو پہنے گا، لیکن سترِ عورت کا اس میں جذبہ نہ ہوگا، اور اللہ تعالیٰ وشریعت کے حساب سے وہ ننگا ہوگا، اور ننگے لوگوں کی طرح بے وقار وبے شرف ہی ہوگا، اسی لئے دیکھا جاتا ہے کہ جن قوموں میں ایمان نہیں تو ان میں تقویٰ بھی نہیں، پس حیاء بھی نہیں، تو ستر پوشی بھی نہیں۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے:

اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيْمَانِ. [متفق عليه] حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے۔

حیاء انسان کا فطری تقاضا وعلامت ہے:

چونکہ تقویٰ ہی ستر پوشی کرواتا ہے، اس لئے تقویٰ کے لباس کی اہمیت بیان فرمادی۔ پہلے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ستر پوشی انسان کا فطری تقاضا ہے، اس لئے تو حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام نے جب شجرۂ ممنوعہ کھالیا، اور ان کے جسم سے کپڑے گر گئے، تو فوراً جنت کے درختوں کے پتے جوڑ کر ستر ڈھانکنے لگے، حالانکہ دونوں آپس میں میاں بیوی تھے۔

شیطان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ فواحش ومنکرات میں مبتلا کر دے، اور بے ستری وبے حجابی کی ترغیب دے۔ یہی بات ہے کہ آج دنیا کے بیشتر ممالک جہاں خداوند تعالیٰ کا تصور اور قانون نہیں، شرعی حجاب برقعہ اور ستر پوشی پر مستقل قانوناً پابندی ہے، اور زنا کی کھلی اجازت ہے، اور کثرتِ ازدواج پر مکمل پابندی ہے، اور بکثرت ننگوں کے کلب چل رہے ہیں، اور ان کے لباس ایسے غیر فطری غیر اخلاقی ہیں جنہیں دیکھ کر انسانیت کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ اور جن اعضاء کو چھپانا فطری جوہر ہے وہ شیشے کی طرح کھلے ہوئے ننگے ہیں۔

ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ مرد کی پتلون ٹخنوں تک ہے، اور عورتوں کی پتلون بمشکل گھٹنوں تک۔ عورتوں کا لباس، چُست لباس اور باریک لباس، یہ سب غیر فطری اور بے حیائی کا نتیجہ ہے۔ پس ایسے غیر فطری، غیر اخلاقی معاشرے میں اگر کوئی شلوار وقمیص پہن کر جائے گا تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے، اور اسے معتوب کہیں گے، اور دقیانوسی سمجھ کر اس سے دور بھاگیں گے۔

مشکل یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں اور مسلم معاشرہ میں بھی یہ مرض عام ہوتا جارہا ہے کہ شرعی لباس اور شرعی وضع وقطع سے لوگ نفرت کررہے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

باریک لباس جس سے جسم نظر آئے اس کا پہننا نہ پہننا برابر ہے، جو مرد وعورت ایسا لباس پہنے وہ شرعاً ننگوں میں شمار ہے، اور خاص کر عورتوں کے لئے اس بارے میں حدیث شریف کی وعید شدید ہے کہ ایسی عورتوں پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوزخیوں کی دو جماعتیں ہیں، جنہیں میں نے نہیں دیکھا (کیونکہ وہ میرے زمانہ کے بعد ظاہر ہوں گی) اوّل تو وہ لوگ جن کے پاس یعنی ان کے ہاتھوں میں بیلوں کی دُموں کی طرح کوڑے ہوں گے، ان سے وہ لوگوں کو مارا کریں گے۔ اور دوسری جماعت ایسی عورتوں کی ہوگی جو کپڑے پہنے ہوئے بھی ننگی ہوں گی، مردوں کو مائل کرنے والی، اور خود مردوں کی طرف مائل ہونے والی ہوں گی، ان کے سر بڑے بڑے اونٹوں کے کوہانوں کی طرح ہوں گے، جو جھکے ہوئے ہوتے ہیں، یہ عورتیں نہ جنت میں داخل ہوں گی، اور نہ اس کی خوشبو سونگھیں گی۔ [مسلم]

اس حدیث میں ایسی عورتوں کے بارے میں پیش گوئی فرمائی جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں گی، پھر بھی ننگی ہوں گی، یعنی ان کے کپڑے ایسے باریک ہوں گے، جس سے کپڑے پہننے کا فائدہ نہ ہو، اور جسم نظر آئے، اور کپڑے ایسے چُست ہوں کہ بدن کی ساخت پر کس جائیں۔ یہ عریانی اور ننگا پن کا ایک انداز ہے جو کہ انسانی فطرت اور شرافت کے خلاف اور حرام ہے، جس سے معاشرہ میں آزادی اور بے حیائی پھیل جاتی ہے، اور ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر معلوم ہوجاتے ہیں، پھر وہ لوگ ننگا ہونے کو اچھا سمجھنے لگیں گے، اور ستر پوشی کو عیب شمار کریں گے، اور شیطان کے نرغے میں رہیں گے۔

قرآن کریم پر ایمان لانے والے مسلمان مرد اور عورتیں غور کریں، اور تمام غیر شرعی لباس اور غیر شرعی وضع قطع سے اجتناب کریں، کیونکہ اسلام تنہائی میں بھی پردہ کا حکم دیتا ہے، اور بے ستری سے منع کرتا ہے۔ ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر کوئی شخص تنہائی میں ہو تو شرم کی جگہ کھولنے میں کیا حرج ہے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ [ترمذي]

پھر مردوں کو چاہیے کہ عورتوں کے لباس اور وضع قطع سے پرہیز کریں، اور عورتوں کو چاہیے کہ مردوں کے لباس اور وضع قطع سے اجتناب کریں، ورنہ وہ لعنت کے مستحق ہوجائیں گے۔ اور قبر میں ایسے لوگوں اور بے پردہ

مردوں اور عورتوں کے چہرے قبلہ شریف سے ہٹا دیئے جائیں گے۔ نعوذ باللہ

مرد کا مرد سے، اور عورت کا عورت سے، اسی طرح عورت کا مردوں سے، اور مردوں کا عورتوں سے، اور محرم وغیر محرموں سے کتنا پردہ ضروری ہے؟ یہ سب مسائل کتبِ فقہ میں لکھے ہوئے ہیں، اور علماء کرام نے ان مسائل پر مستقل عمدہ کتابیں لکھی ہیں، ان سے رہنمائی حاصل کرلیا کریں، اور اپنے معاشرے کو یورپ کے معاشرے سے الگ اور ممتاز کرلیں۔ مزید تفصیل سورۃ النور میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

ارشاد فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ﴾ کہ یہ لباس کا پیدا فرمانا، اور اس کے ذریعہ تمہاری شرم وحیاء اور عزّت کا تحفظ فرمانا، اور اس کے ذریعہ تمہیں حیوانات اور جانوروں سے خصوصی امتیاز عطا فرمانا، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی نشانیوں میں سے ہے، جن سے اللہ تعالیٰ شانہ کے فضل عظیم، اور کرم عمیم کا پتہ چلتا ہے کہ انسان پر اس کا کتنا بڑا کرم اور بخشش ہے؟ لوگ اگر اس میں غور کریں تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچان سکتے ہیں، اور نصیحت حاصل کرسکتے ہیں، اور انسانی حیاء وادب پر چل کر شریعت کے انوار پاسکتے ہیں۔

بنی آدم کو تنبیہ کہ شیطان تمہیں شکار نہ کرپائے:

فرمایا: ﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ﴾ اے بنی آدم! ہرگز شیطان تمہیں فتنہ میں نہ ڈالے، جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا۔ یعنی ان کو قسمیں کھا کر دھوکہ میں ڈالا، اور ایسا کام کروایا جو ان کے جنت سے نکالے جانے کا سبب بن گیا۔

﴿يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا﴾ اور وہ اتروا رہا تھا ان کا لباس تاکہ انہیں دکھادے ان کی شرم کی جگہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ جب تمہارے ماں باپ کو شیطان نے معاف نہیں کیا، تو تمہیں کیسے معاف کرے گا؟ اسی طرح تم اس سے کبھی دوستی نہ کرو، جو تمہارے ماں باپ کا دشمن ہو۔ سوئم یہ کہ لباس جس طرح تمہارے ماں باپ کی حیاء کی علامت رہی، اور اسی طرح تمہارے لئے بھی ضروری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ماں باپ والے لباس کو نظر انداز ہی کرو۔

پھر ارشاد ہوا کہ ظاہری دشمن سے تم اپنی حفاظت کرنے کو ضروری اور آسان سمجھتے ہو، اسی طرح باطنی اور مخفی دشمن سے ذرا زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنا تحفظ کرو، جو کہ ذرا مشکل بھی ہے، اور دشوار بھی، کیونکہ:

﴿اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ﴾ بیشک شیطان اور اس کی جماعت تمہیں ایسے طور

سے دیکھتی ہے کہ تم انہیں نہیں دیکھتے۔ شیاطین عموماً انسانوں کو نظر نہیں آتے، وسوسے ڈالتے ہیں، وہ تمہارے جسم میں خون کی طرح چکر لگاتے اور دوڑتے ہیں، طرح طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ جو دشمن نظر نہ آئے اس سے بچاؤ مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ اور ان کے پوشیدہ رہنے میں بڑی حکمت بھی ہے، اس لئے تنبیہ فرمائی کہ جب تم انہیں نہیں دیکھتے، اور وہ تمہیں دیکھتے ہیں، لہٰذا تم ان سے ہوشیار رہو، اور جب بھی کسی غیر شرعی عمل کو دیکھو، یا اپنا قلبی رجحان کسی گناہ کی طرف محسوس کرو تو استعاذہ کرو، اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو، اور اس کی پناہ میں آجاؤ، کیونکہ شیطان وسوسے ڈالتا ہے، اور تم سے گناہ کراتا ہے، گناہوں کو خوبصورتی کے ساتھ لوگوں کے قلب وخیال اور نظر میں بڑے عجیب انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے اس فن میں اتنا چالاک اور ماہر ہے کہ عوام الناس تو کیا بڑے مذہبی شہسواروں کو لمحات ولحظات میں گھوڑے سے گرا کر انہیں گمراہ کرتا ہے۔

حکایت:

بنی اسرائیل میں ایک معروف عابد ہوتا تھا جو تنہا پہاڑوں میں رہتا تھا، پانچ سو سال سے عبادت میں مصروف رہا، دن کو روزہ رکھتا اور رات کو عبادت میں لگا رہتا۔ ایک روز کسی کام کی خاطر پہاڑ سے نیچے اتر کر آبادی کا رُخ کیا، راستے میں پانی کا چشمہ تھا، وہاں ایک عورت پانی لینے کے لئے آئی ہوئی تھی، اس کے ساتھ بدکاری کی، اور پانچ سو سالہ عبادت وزہد پر پانی پھیر کر سب کو ضایع کیا۔ [درمنثور، کہف]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اولادِ آدم میں جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے پیدائش کے وقت شیطان اسے چھوتا ہے، اور وہ شیطان کے ہاتھ لگانے سے چیخ اٹھتا ہے، سوائے مریم علیہا السلام اور اس کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ دونوں محفوظ رہے۔ [بخاري]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشاد فرمایا کہ قضائے حاجت کی جگہیں (بیت الخلاء، حمام) شیاطین کے حاضر ہونے کی جگہیں ہیں (شیاطین کو ناپاک جگہوں سے محبت ہے) اس لئے جب تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کے لئے جائے تو یہ دعاء پڑھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّی أعوذُبِکَ مِنَ الْخُبثِ وَ الْخَبائِثِ۔ اے اللہ تعالیٰ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں شیاطین سے، ان کے ناپاک مردوں اور ناپاک عورتوں سے۔ [أبو داؤد، مشکوٰۃ]

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا ذکر ہوا کہ وہ صبح

تک سویا رہتا ہے، اور نماز کے لئے نہیں اٹھتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص ایسا ہے جس کے کانوں میں شیطان نے پیشاب کر دیا۔ [بخاري]

بہر حال! زندگی میں ہر وقت اور ہر عمل کے ساتھ خاص کر مسلمانوں کے ساتھ شیاطین کا عمل دخل جاری رہتا ہے، کوئی لمحہ رات دن کے اوقات میں ایسا نہیں ہوتا کہ شیاطین کسی کو چھوڑ کر اس سے الگ اور لاتعلق ہوں۔ وہ اپنی ڈیوٹی اور کام سے کبھی نہ چھٹی کرتے ہیں، نہ غفلت، پس جتنا کسی کا تقویٰ اور عقیدہ وعمل پختہ ہوگا اتنا زیادہ شیاطین کا اس کے ساتھ زیادہ تعلق رہے گا، کیونکہ چور ہمیشہ ایسی جگہوں کی تاک میں رہتے ہیں جہاں قیمتی سرمایہ اور سامان ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ بیشک ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا دوست بنادیا جو ایمان نہیں لاتے۔ دوسرے مقام پر سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾ [البقرة:۲۵۷] (اور جنہوں نے کفر کیا ہے ان کے رکھوالے وہ شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر اندھیریوں میں لے جاتے ہیں)۔ جس طرح ابلیس کافروں کا دوست ہے، اسی طرح کفار ابلیس کے دوست ہیں۔ یہ دوستی جانبین سے ہے۔ اور ان کی یہ دوستی برابر پکی ہے۔

البتہ شیطان کی دوستی بسا اوقات نافرمان گنہگار مؤمنوں کو بھی پہنچتی ہے، جیسا کہ روزمرہ مشاہدہ کر رہے ہیں، مگر یہ دوستی ایمان کی وجہ سے ناقص ہے۔ ہاں! جن لوگوں کا ایمان کامل ہے، پس شیطان کے ساتھ ان کی کوئی دوستی نہیں ہوتی، بلکہ مکمل عداوت اور دشمنی ہوتی ہے، اور ان پر شیطان کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ﴾ [النحل:۱۰۰] (یقیناً ان لوگوں پر اس کا قابو نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، اس کا قابو انہیں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں، اور ان لوگوں پر جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں)۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ رِضَاكَ وَحُبَّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُنَا اِلٰى حُبِّكَ وَنَعُوْذُ بِكَ مِنْ سَخَطِكَ وَمِنْ اِبْلِيْسَ وَجُنُوْدِهٖ. اَللّٰهُمَّ اكْتُبْنَا فِي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ. آمین!

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ
اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۟ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ
وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ
الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اور جب کوئی کام فحش کر لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو اس پر پایا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے، آپ فرما دیجئے کہ بیشک اللہ تعالیٰ فحش کاموں کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے ﴿۲۸﴾ آپ فرما دیجئے کہ: میرے ربّ نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے، اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رُخ سیدھا رکھو، اور اس طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو کہ اس عبادت کو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خالص کرنے والے ہو، جیسا کہ اس نے تمہیں شروع میں پیدا فرمایا، اسی طرح تم دوبارہ لوٹو گے ﴿۲۹﴾ ایک جماعت کو ہدایت دی، اور ایک جماعت ایسی ہے جس پر گمراہی مقرر ہو چکی ہے، بلا شبہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوست بنایا، اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ بیشک وہ ہدایت پر ہیں ﴿۳۰﴾

معارف ومنازل

اس سے قبل لباس کے فوائد بیان ہوئے، جو فطری، اخلاقی اور اسلامی تعلیمات کی رُو سے نہایت ضروری اور لازمی ہیں۔ ان آیات میں جاہلیت کے زمانہ کی ایک نہایت قبیح اور شرمناک رسم کی تردید ہے، جو کہ لباس کے متعلق ہے، وہ یہ کہ جہالت اور کفر کے زمانہ میں لوگ کعبۃ اللہ شریف کا ننگے ہو کر کپڑے اُتار کر طواف کرتے تھے، مرد بھی عورتیں بھی، اور اپنے اس شیطانی فعل کی دلیل یہ بیان کرتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں ان کپڑوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے گھر کا طواف کرنا بے ادبی اور بے احترامی ہے۔

اور یہ عقل کے اندھے یہ نہ سمجھتے تھے کہ ننگے ہو کر طواف کرنا اس سے زیادہ خلاف ادب اور بے احترامی ہے۔ آیت کریمہ میں اس بیہودہ رسم کی تردید ہے۔ وہ یہ کہ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ خلافِ انسانیت اور خلافِ ادب ہے، تو وہ یوں کہتے تھے کہ یہ ہمارے آباء واجداد کے زمانہ سے چلا آرہا ہے، اس پر ہم نے اپنے بڑوں کو دیکھا اور پایا ہے، اب اپنے بڑوں کے طریقوں کو چھوڑنا ہمارے لئے باعثِ شرم ہے۔ اور یہ طریقہ وہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے

ہمیں دیا ہوا ہے۔

فحش، فاحشہ، فواحش ان برائیوں کو کہتے ہیں جن کی برائی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو، اور عقل وفہم وفطرتِ سلیمہ کے نزدیک اس کی خرابی واضح اور کھلی ہوئی ہو۔ یہاں فاحشہ سے مراد شرک اور ننگا طواف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ فواحش کا ارتکاب کرتے ہیں، اور بے حیائی کا کام کرتے ہیں، جب انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ یہ کام برا ہے، تو وہ اپنی بدعملی اور بے حیائی کے جواز کے لئے یوں کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے باپ دادے ایسا ہی کرتے آئے ہیں، کیا ہمارے باپ دادوں کو اچھے برے کی تمیز نہ تھی؟ اس کا جواب سورۂ مائدہ میں دیدیا گیا، فرمایا: ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾[المائدة:۱۰۴] (کیا اپنے باپ دادوں کی اقتداء کریں گے اگرچہ وہ کچھ بھی علم نہ رکھتے ہوں، اور نہ ہدایت پر ہوں؟)۔

اقتداء کے لئے یہ شرط ہے کہ مقتدا شخص صاحبِ علم بھی ہو اور صاحبِ عقل اور صاحبِ ہدایت بھی ہو، پس تمہارے آباء واجداد ان تمام صفات سے محروم تھے، اور محض جاہل وبے عقل اور بے شعور تھے، تو اقتداء کس کی؟ اور تمہارے باپ دادے تمہاری طرح اتنے بے سوچ وبے علم تھے جو کہتے تھے کہ: ﴿وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا﴾ (اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے)۔ نعوذ باللہ

کعبۃ اللہ کو جو احترام حاصل ہے وہ اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ تمہاری جہالت کا یہ حال ہے کہ کپڑوں کے ساتھ اس کے طواف سے شرماتے ہو، اور اس کے مالک حق تعالیٰ شانہ کی طرف برائیوں کی نسبت کرنے سے نہیں شرماتے ہو، اور کہتے رہتے ہو کہ: ﴿وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شرک اور ننگے ہو کر طواف کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ تمہاری کتنی بڑی ڈھٹائی ہے کہ اپنے برے کاموں کو اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگادیا کہ اس نے ہمیں حکم دیا ہے؟

﴿قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ﴾ آپ فرمادیجئے کہ بیشک اللہ تعالیٰ شانہ برے کام کا حکم نہیں دیتا، وہ ہر عیب اور ہر برائی سے پاک اور منزہ ہے، اس کی شان تو یہ ہے کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾[النحل:۹۰] (اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا، اور بھلائی کرنے کا، اور قرابتداروں کو دینے کا، اور منع کرتا ہے بے حیائی سے، اور نامعقول کام سے، اور سرکشی سے، تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو)۔

آیت میں تین چیزوں کا امر فرمایا: عدل، احسان، ایتاء ذی القربیٰ۔ اور تین چیزوں سے منع فرمایا: بے

حیائی، منکر اور سرکشی سے۔ یہ نہایت جامع آیت ہے۔

﴿اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کیا تم اللہ تعالیٰ شانہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں؟ بلا سند و ثبوت غلط، اور بے بنیاد باتیں کہتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے کہ:

﴿قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ آپ فرما دیجئے کہ میرے ربّ نے مجھے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے، اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رُخ سیدھا رکھو۔ اس میں ان لوگوں کی تردید ہے جنہوں نے اپنی جہالت سے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فحش کاموں کا حکم دیا۔

پہلے تو سلبی طور پر ان کی تریدی فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فحش کاموں کا حکم نہیں دیتا، پھر ایجابی طور پر ان کی تردید فرمائی، اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان کو تو نہیں کرتے ہو، اور جن کاموں سے منع فرمایا ان کو کرتے ہو، اور پھر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب بھی کرتے ہو۔ یہ کھلی اور سراپا گمراہی ہے۔

اب تم سن لو کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے کن چیزوں کا حکم دیا ہے: اوّل تو یوں فرمایا:

﴿اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ﴾ کہ میرے ربّ نے مجھے انصاف کرنے حکم دیا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کو سامنے رکھو، اسی میں یہ بھی ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ کے ساتھ شرک نہ کرو، کیونکہ یہ بہت بڑی بے انصافی ہے کہ خالق و مالک قادر و رازق جل شانہ کے ساتھ کسی ناتواں عاجز مخلوق کو عبادت میں شریک کر دیا جائے۔ انصاف میں سب احکام شرعیہ، یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی، اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی دونوں باتیں داخل ہو گئیں۔

اور لفظ ﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ ہر طرح کے اخلاص کو شامل ہے۔ غیر اللہ کی عبادت ہو، یا کسی غیر اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کوئی بھی عمل ہو، اللہ تعالیٰ شانہ کی مرضی کے خلاف تصور ہوگا، اور شرک جلی یا شرک خفی کا حصہ ہوگا۔ پس اگر کسی کا عمل پہاڑوں کے برابر ہو مگر اخلاص سے خالی ہو تو اس پر ذرہ برابر بھی ثواب مرتب نہ ہوگا، لیکن اخلاص والا عمل اگر ذرہ برابر ہو تو اس پر پہاڑوں کے برابر ثواب مرتب ہوگا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کریں میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے پونے دو سیر جَو کے صدقہ کے ساتھ برابر نہیں ہوگا۔ کہاں پہاڑ جتنا سونا، اور کہاں جَو کے پونے دو سیر؟ [مشکوٰۃ]

یہ سب کچھ اخلاص کی بناء پر فیصلہ ہے۔

پھر فرمایا: ﴿وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ لفظ "مسجد" اکثر مفسرین کے نزدیک بمعنی سجدہ و

عبادت آیا ہے، اور معنی یہ ہیں کہ ہر عبادت ونماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا رکھا کرو۔ اور اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا ٹھیک قبلہ کی طرف کرنے کا اہتمام کرو۔ اور رُخ سیدھا کرنے کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ اپنے ہر قول وفعل اور عمل میں اپنا رُخ اپنے ربّ جلّ شانہ کے حکم کے تابع رکھو، اس کے حکم سے اِدھر اُدھر نہ ہونے پائے۔

اس معنی کے لحاظ سے یہ حکم صرف نماز کے لئے خاص نہیں، بلکہ زندگی اور تمام اعمال، کردار، عبادات اور معاملات پر یہ حکم حاوی ہے۔ یہی بہتر معنی ہے۔ پس: ﴿وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ اور ﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ دونوں حکموں کو اکٹھا ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ مؤمن پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر اور باطن دونوں کو شریعت کا تابع بنائے۔ پس ظاہری عبادت بغیر باطنی اخلاص کے، اور باطنی اخلاص بغیر ظاہری اطاعت اور اتباعِ سنت کے کارآمد نہیں ہوں گے۔ فرمایا:

﴿كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ﴾ یعنی جیسے تمہیں ابتداءً پیدا فرمایا تھا، اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا فیصلہ اور تقاضا تھا، پس مرنے کے بعد اسی طرح تمہیں دوبارہ زندہ فرمائیں گے، اور اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے، اور حساب دینا ہے۔ اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں، اور یہی چیز اس کی قدرت کا تقاضا بھی ہے۔

﴿فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ﴾ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کو ہدایت دی، اور ایک جماعت ایسی ہے جس پر گمراہی مقرر ہو چکی ہے۔

﴿اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ بلاشبہ ان لوگوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کو چھوڑ کر شیاطین کو دوست بنالیا، اور یہ گمان کررہے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اوّل تو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے، جب انہوں نے شرک کیا، پھر شیاطین کو دوست بنالیا، جو کام ہی گمراہ کرنے کا ہے، پھر گمراہی کے باوجود اپنے بارے میں یہ خیال کہ ہم ہدایت پر ہیں یہ سب گمراہی در گمراہی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کے پیر پرست مشرک، اور ان کفار میں شاید ایسا تعلق اور جوڑ ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ یہ لوگ بھی ہزاروں شرک اور شرکیہ عقائد واعمال کے باوجود خود کو ہدایت پر سمجھتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت عام ہے، اس کے قبول کرنے پر کوئی پابندی نہیں، پس شیطانوں سے دوستی رکھنے والوں نے خود ہدایت کو مسترد کیا ہوا ہے، لہٰذا قیامت کے روز ان کا کوئی عذر و بہانہ نہیں چلے

گا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احکامِ شرعیہ سے جہل اور ناواقفیت کوئی عذر نہیں۔ ایک شخص اگر گمراہی کو ہدایت سمجھ کر پورے اخلاص اور محنت کے ساتھ اسے قبول کرلے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معذور نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ہوش وحواس اور عقل ودانش اسی لئے عطا کی ہے کہ وہ ان سے کام لے کر صحیح اور غلط، کفر اور ہدایت کو پہچان لے، پھر اس کو صرف اس کی عقل ودانش پر نہیں چھوڑا، بلکہ انبیاء ورُسل علیہم السلام بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، جن کے ذریعہ حق و باطل، کفر واسلام، صحیح اور غلط، ہر چیز کا علم ہوگیا، اور کوئی وہم اور شک وتردد کا امکان باقی نہیں رہا۔

تجربہ شاہد ہے کہ دنیا میں کفر وضلالت اور گمراہی کی جتنی اقسام ہیں ان کی بنیاد سرکشی اور عناد پر مبنی ہے، نہ کہ جہالت اور ناواقفیت پر، جیسے فرمایا: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۴۶] (ان (پیغمبر علیہ السلام) اتنی اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: اے اولادِ آدم! تم مسجد کی حاضری کے وقت اپنی آرائش لے لیا کرو، اور کھاؤ، اور پیو، اور حد سے آگے نہ بڑھو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ﴿۳۱﴾ آپ فرمادیجئے: اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے جو زینت نکالی ہے، اور جو کھانے پینے کی چیزیں پیدا فرمائی ہیں انہیں کس نے حرام قرار دیا؟ آپ فرمادیجئے کہ: یہ چیزیں دنیاوی زندگی میں اہلِ ایمان کے لئے ہیں، قیامت کے دن ان کے لئے خالص ہوں گی، ہم اسی طرح ان لوگوں کے لئے آیات بیان کرتے ہیں جو جانتے ہیں ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

مشرکینِ عرب طرح طرح کے شرکیہ عقائد وافعال اور خودساختہ بے شرمی اور بے مروّتی کے اعمال میں مبتلا تھے۔ ان کے مرد وعورت ننگے ہوکر طواف کرتے تھے، اس طرزِ بے حیائی کو کارِ ثواب سمجھ کر بڑے فخر سے کرتے، اور ایک دوسرے کو مبارکباد بھی دیتے۔ اس کے علاوہ ان میں یہ رسم بھی جاری رہی کہ حج کے ایّام میں کھانا پینا بھی چھوڑ

دیتے تھے، اور صرف اتنا بقدر گزارہ کھاتے تھے جس سے سانس چلتا رہے، اور موت واقع نہ ہو، خصوصاً گھی، گوشت، دودھ اور دیگر پاکیزہ غذاؤں سے بالکلیہ اجتناب کرتے تھے۔

ان کے اس بیہودہ طریقہ کار کے خلاف یہ آیات نازل ہوئیں، اور ان کی دونوں بیہودہ رسموں کی تردید ہوئی۔ پہلی آیت میں پہلی رسم کی، دوسری آیت میں دوسری رسم کی تردید ہے، ارشاد فرمایا:

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ﴾ یہاں تک پہلی رسم کی تردید ہے۔ ﴿وَّ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا﴾ سے اختتام آیت تک دوسری رسم کی تردید ہے۔

نماز میں ستر پوشی فرض ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی:

اس آیت سے جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور ائمہ مجتہدین رحمۃ اللہ علیہم نے کئی احکام نکالے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں جس طرح ننگے طواف کو منع کیا گیا ہے اسی طرح ننگے نماز پڑھنا بھی حرام اور باطل ہے، کیونکہ حدیث میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلطَّوَافُ بِالْبَیْتِ صَلٰوۃٌ. یعنی کعبۃ اللہ کا طواف نماز کے حکم میں ہے۔ [مشکوۃ، ترمذي]

جبکہ لفظِ "مسجد" سے جمہور مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک مراد سجدہ ہے، تو بحالتِ سجدہ عریانی کی ممانعت خود آیت میں صراحت کے ساتھ آجاتی ہے، اور جب سجدہ میں عریانی ممنوع ہوئی تو رکوع، قیام اور قعود اور نماز کے تمام افعال میں اس کا لازم ہونا ظاہر ہے۔ پھر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات نے اس کو اور بھی واضح کر دیا۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ کسی بالغ عورت کی نماز بغیر دوپٹے کے جائز نہیں۔ [ترمذي]

اور نماز کے علاوہ دوسری حالت میں بھی ستر پوشی کا فرض ہونا دوسری آیات اور روایات حدیث سے ثابت ہے، جن میں سے ایک آیت اسی سورت میں گزر چکی، یعنی: ﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ﴾ [الأعراف: ۲۶] (اے آدم کی اولاد! بیشک ہم نے تمہارے لئے لباس اُتارا، جو تمہاری شرم کی جگہوں کو چھپاتا ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ستر پوشی انسان کے لئے پہلا انسانی اور اسلامی فرض ہے، جو ہر حالت میں اس پر فرض ہے، اور لازم ہے، پھر نماز اور طواف میں بدرجہ اولیٰ فرض ہے۔

نماز کے لئے زینت والا لباس بہتر ہے:

آیت کریمہ میں لباس کو لفظِ "زینت" سے تعبیر فرما کر اشارہ ہوا کہ نماز کے لئے بہتر یہ ہے کہ صرف ستر

پوشی پر اکتفاء نہ ہو، بلکہ اپنی وسعت کے لحاظ سے بہتر اور اچھے اور صاف ستھرے لباس کا اہتمام کیا جائے، میلے کچیلے، بدبودار کپڑے پہن کر نماز پڑھنے سے نماز اور مسجد دونوں کی توہین اور بے احترامی ہے، جس سے اجتناب ضروری اور لازم ہے۔ جو لوگ مزدوری کرتے ہیں، اور نماز انہیں کام والے میلے کچیلے کپڑوں میں پڑھتے ہیں، ان کی نماز نہایت ناقص ہوتی ہے۔

اور بعض علماء کا فتویٰ ہے کہ مسجد کی صفوں کے میلا ہونے کے پیش نظر ایسے لوگوں کو (خاص کر گیراج میں کام کرنے والوں کو) مسجد میں نماز پڑھنے سے روکا جائے، اور باہر صحن میں نماز پڑھنے کا کہا جائے۔ پس محض ستر عورت پر اکتفاء نہ ہو، بلکہ پسندیدہ، مرغوب، نظیف و پاکیزہ کپڑوں میں اس عظیم عبادت نماز کی ادائیگی کا اہتمام ہو، اسی لئے ارشاد ہوا:

﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ﴾ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نمازوں کے لئے خاص لباس کے اہتمام کی تاکید فرماتے تھے، اور اپنی نمازوں کے لئے مخصوص اعلیٰ لباس تیار کرتے تھے، جو صرف نماز کے وقت زیب تن فرما کر نماز ادا فرماتے تھے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ

﴿وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ اور کھاؤ، اور پیو، اور حد سے آگے مت بڑھو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ جس طرح آیت کا پہلا جملہ اگرچہ جاہلیت عرب کی رسم عریانی کو مٹانے کے لئے نازل ہوا، مگر عمومِ الفاظ سے اور بہت سے احکام ومسائل معلوم ہوئے، اسی طرح آیت کا دوسرا جملہ: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ بھی اگرچہ جاہلیت عرب کی اس رسم کو مٹانے کے لئے نازل ہوا کہ ایام حج میں اچھی غذا کھانے پینے کو گناہ سمجھتے تھے، لیکن عموم الفاظ سے یہاں بھی بہت سے احکام ومسائل ثابت ہوتے ہیں۔

اوّل یہ کہ کھانا پینا بقدر ضرورت لازم اور فرض ہے، اور یہ شرعی حکم بھی ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص باوجود قدرت کے کھانا پینا چھوڑ دے یہاں تک کہ مرجائے، یا اتنا کمزور ہوجائے کہ فرائض وواجبات کی ادائیگی نہ کرسکے تو یہ شخص عنداللہ مجرم اور سخت گناہگار ہوگا۔

﴿وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ آخری جملہ ہے، جو کہ بہت اہم ہے۔ یہ صرف کھانے پینے میں اسراف سے منع نہیں کرتا، بلکہ اپنے عمومِ الفاظ کے لحاظ سے زندگی کے تمام اعمال، اقدار، افعال، کردار، گفتار سب کو شامل ہے۔ اسراف کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا، پھر حد سے تجاوز کرنے کی کئی صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ حلال سے تجاوز کر کے حرام تک پہنچ جائے، اور حرام چیزوں کو کھانے پینے برتنے لگے، یہ سخت گناہ اور حرام ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو بلاوجہ شرعی حرام سمجھ کر چھوڑ دے۔ پس جس طرح حرام کا استعمال جرم اور گناہ ہے، اسی طرح حلال کو حرام سمجھنا بھی قانونِ الٰہی کی مخالفت اور سخت گناہ ہے۔ [روح، ابن کثیر، مظهری]

قرآن کریم نے جہاں اسراف وتبذیر سے روکا ہے وہاں ضرورت سے کم چیزوں کے استعمال سے بھی منع فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ افراط وتفریط دونوں مذموم ہیں، اور اعتدال محمود ہے۔ اسی طرح اسراف وتبذیر اور تقتیر دونوں مذموم ہیں، اور اعتدال ومیانہ روی محمود ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سونے میں، جاگنے میں، بولنے میں، کاروبار میں، پڑھنے پڑھانے میں، لباس میں، مکان میں، معاملات میں، عبادات اور طاعات میں، غرض یہ کہ زندگی کے تمام شعبوں میں، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ [الفرقان: ٦٧] (اور جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں، نہ تنگی کرتے ہیں، بلکہ ان کا طریقہ اس کے درمیان اعتدال کا طریقہ ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جو چاہو کھاؤ پیو، اور جو چاہو پہنو، مگر صرف دو باتوں سے بچو: ایک یہ کہ اسراف نہ کرو، دوسرے یہ کہ فخر وغرور نہ کرو۔ [مشكوٰة]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ مِنَ الإِسرَافِ أَنْ تَأكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ۔ [ابن ماجة] کہ جب کسی چیز کو جی چاہے تو اس کو ضرور ہی کھالے، یہ اسراف ہے۔

سلف صالحین حضرات رحمۃ اللہ علیہم نے اس بات کو اسراف میں داخل کیا ہے کہ آدمی ہر وقت کھانے پینے پہننے ہی کی فکر میں لگا رہے، اور ان کو دوسرے کاموں سے مقدم اور اہم سمجھے، جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس کا مقصدِ زندگی یہی پیٹ کا دھندا ہے۔ اور بعض لوگ پندرہ بیس، بلکہ سو تک شادیاں کرتے ہیں، جس سے یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے زندگی کا مقصد شہوت رانی کو ہی سمجھا ہے۔ اس بارے میں اتباعِ سنت نہایت اہم اور ضروری ہے، جس کے خلاف سوائے ہلاکت اور تباہی کے کچھ نہیں۔

مشہور مقولہ ہے کہ خوردن برائے زیستن است، نہ زیستن برائے خوردن۔ یعنی کھانا اس لئے ہے کہ زندگی قائم رہے، یہ نہیں کہ زندگی کھانے پینے کے لئے ہو، یہ جانوروں اور انسانوں میں کافروں کی صفت ہے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ کثرتِ اُکل سے پرہیز کریں، کیونکہ زیادہ کھانا صحت کا دشمن ہے، اسی طرح زیادہ ہنسا، یعنی کثرتِ ضحک یہ دل کی نورانیت کا دشمن ہے، اور بُری چیز ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: زیادہ کھانے پینے سے بچو، کیونکہ یہ جسم کو خراب کرتا ہے، بیماریاں پیدا کرتا ہے، عمل میں سستی پیدا کرتا ہے، زیادہ سونے کی عادت بھی پیدا کرتا ہے، بدن کو موٹا کرتا ہے، بلکہ کھانے پینے میں میانہ روی اختیار کرو، اس لئے کہ یہ جسم کی صحت کے لئے بھی مفید ہے، اور اسراف سے بھی دور ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فربہ جسم (موٹے) عالم کو پسند نہیں فرماتے، اور فرمایا: جو لوگ نفسانی خواہشات کو دین پر ترجیح دیتے ہیں وہ ہلاک ہوجاتے ہیں۔ [روح المعاني، أبو نعيم]

فائدہ:

اطباء حضرات نے زیادہ کھانے، زیادہ پینے، زیادہ سونے، اور کثرتِ جماع کے ستر (۷۰) سے زائد نقصانات بیان کئے ہیں، لہٰذا ان چاروں چیزوں میں اعتدال اور میانہ روی ضروری ہے، تاکہ آدمی موت مقررہ سے پہلے نہ مرے۔ واللہ اعلم

اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ اس آیت کریمہ سے آٹھ مسائل شرعیہ معلوم ہوئے۔

آیت کریمہ: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ کے کلمات سے بادی النظر میں آٹھ مسائلِ شرعیہ ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے یہ واضح ہوا کہ اشیاءِ عالم میں اصل اباحت اور جواز ہے، جب تک کسی دلیل سے کسی چیز کی حرمت اور ممانعت ثابت نہ ہو، کوئی چیز بھی حرام نہیں ہوتی۔ یہ بات آیت کریمہ کے سیاق سے اس طرح معلوم ہوئی کہ: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ جو فرمایا اس کا مفعول، یعنی "مأکول اور مشروب" کو ذکر نہیں فرمایا کہ کیا چیز کھاؤ اور پیو، اور علماءِ عربیت کی تصریح ہے کہ ایسے موقع پر خاص مفعول ذکر نہ کرنا اس کے عموم کی طرف اشارہ ہوا کرتا ہے کہ ہر چیز کھا پی سکتے ہو، بجز ان اشیاء کے جن کو بالتصریح حرام کردیا گیا۔ [أحكام القرآن للجصاص رحمہ اللہ]

☆......اوّل یہ کہ کھانا پینا بقدرِ ضرورت فرض ہے۔

☆......دوسرے یہ کہ جب تک کسی چیز کی حرمت کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہوجائے، تو وہ حلال ہے۔

☆......تیسرے یہ کہ جن چیزوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع کردیا، ان کا استعمال اسراف اور ناجائز ہے۔

☆...... چوتھے یہ کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہیں، ان کو حرام جاننا بھی اسراف اور سخت گناہ ہے۔

☆...... پانچویں یہ کہ پیٹ بھر جانے کے بعد اور کھانا جائز نہیں، یہ اسراف ہے۔

☆...... چھٹے یہ کہ اتنا کم کھانے کا خیال کرنا اور اہتمام کرنا کہ کمزوری اور ضعف کی وجہ سے ادائے فرائض و عبادت کی قدرت نہ رہے، اس طرح کی نفس کشی درست نہیں، یہ عیسائیوں والی رہبانیت کا حصہ ہے۔

☆...... ساتویں یہ کہ ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں مستغرق رہنا بھی اسراف ہے۔

☆...... آٹھویں یہ کہ ہر مرغوب چیز کے پیچھے لگا رہنا، اور پسندیدہ چیزوں کی تلاش میں لگا رہنا بھی اسراف ہے۔

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں، یعنی ملبوسات اور مطعومات اور مشروبات کو بغیر دلیل، بلکہ خلافِ دلیل حرام سمجھ رہے ہیں، آپ ان سے فرمادیجئے کہ یہ بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو جو اس نے اپنے بندوں کے استعمال کے واسطے بنائے ہیں اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے حلال قرار دیا ہے، ان اشیاء کو کس شخص نے حرام کیا ہے؟ یعنی چیزوں کو حلال وحرام قرار دینا تو خالق و مالک کائنات کا کام ہے، تم اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام کہنے والے کون؟ یہ حلت وحرمت تمہارے اختیار میں کیسے اور کیوں؟

آیات مذکورہ میں لباس اور کھانے پینے کی چیزوں کو انعامِ خداوندی قرار دیا گیا ہے، اس سے کفار کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انعام تو ہمیں خوب مل رہا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا، اور ہمارے عقائد و اعمال اس کے خلاف ہوتے تو یہ انعام ہمیں کیوں دیتا؟ اس شبہ کے جواب میں فرمایا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ان سے فرمادیجئے:

﴿قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ کہ انعاماتِ الٰہیہ کے متعلق استعمال کی اجازت جو تمہیں حاصل ہے، یہ کسی مقبولیت کی دلیل نہیں، البتہ یہ بات متحقق ہے کہ جس استعمال کے بعد کوئی وبال اور گرفت نہ ہو وہ دلیل مقبولیت ہے، اور ایسا استعمال خالص اہلِ ایمان کا حصہ ہے، کیونکہ تم لوگ کفار جتنا زیادہ دنیاوی نعمتوں کو استعمال کرو گے تو اتنا ہی ان کا وبال اور عذاب آخرت میں بڑھتا ہی رہے گا، اس لئے فرمایا کہ یہ اشیاء (لباس اور کھانے پینے کی چیزیں) اس طور پر کہ قیامت کے روز بھی کدورات اور عذاب سے خالص رہیں، دنیاوی زندگی میں خاص اہل ایمان ہی کے لئے ہیں۔

بخلاف کفار کے کہ اگر چہ دنیا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کر کے عیش وعشرت میں بسر کیا، مگر چونکہ ان نعمتوں کا شکر ایمان اور طاعت کے ذریعہ ادا نہیں کیا اس لئے وہاں یہ نعمتیں عذاب اور وبال بن جائیں گی۔

مطلب یہ ہے کہ ایسے نافرمان کفار کو سرزنش اور زجر کے انداز میں تنبیہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی زینت، یعنی عمدہ لباس جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا فرمایا ہے، اسی طرح پاکیزہ اور عمدہ غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے عطاء کی ہیں، ان کو کس نے حرام کیا؟

فائدہ:

بعض مفسرین نے آیت کا یہ معنی بتلایا ہے کہ یہ طیبات اور پاکیزہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں دنیاوی زندگی میں اصالۃً مؤمنین کے لئے ہیں، گو کافر بھی انہیں استعمال کر لیتے ہیں، اور قیامت کے دن خالص مؤمنین کے لئے ہوں گی۔ آخرت میں کافروں کے لئے ان کا ذرا سا حصہ بھی نہ ہوگا۔ دنیا میں یہ چیزیں مؤمنین کے لئے ہیں، مگر ان کے طفیل کفار بھی استعمال کر لیتے ہیں، جبکہ آخرت میں ایسا نہیں ہوگا۔

درحقیقت کافر ربّ العزّت کا باغی ہے، وہ اس بات کے لائق اور حقدار نہیں ہے کہ کوئی بھی نعمت اسے دی جائے، اور وہ کسی نعمت سے منتفع ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا بے حیثیت اور بے قدر ہے، اس لئے وہ کافروں کو بھی دے دیتا ہے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی کوئی حیثیت رکھتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ پلاتا۔ [أحمد، ترمذي، بن ماجة، مشكوة]

بعض حضرات مفسرین نے آیت کا یہ معنی بتلایا ہے کہ دنیا میں ساری نعمتوں اور راحتوں کے ساتھ محنت و مشقت، اور پھر زوال کا خطرہ، اور پھر طرح طرح کے رنج وغم لگے ہوئے ہیں، خالص نعمت اور خالص بے غبار راحت کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔ البتہ قیامت میں جس کو یہ نعمتیں اور راحتیں ملیں گی، وہ خالص ہو کر ملیں گی، نہ ان کے ساتھ کوئی محنت و مشقت ہوگی، اور نہ ان کے زوال ونقصان کا کوئی خطرہ ہوگا، اور نہ ان کے بعد کوئی رنج ومصیبت، یہ تینوں معنی آیت کریمہ میں کھپ سکتے ہیں، اس لئے مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے ان کو اختیار کیا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ ہم اپنی قدرتِ کاملہ کی نشانیاں سمجھدار لوگوں کے لئے اسی طرح تفصیل اور وضاحت سے بیان کرتے ہیں، جن سے ہر عالم وجاہل حقیقت کا پتہ اور سراغ لگا کر کامیابی حاصل

کرسکتا ہے، بشرطیکہ وہ طالبِ حقیقت بھی ہو۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ
تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ
فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ
مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ: میرے ربّ نے فحش کاموں کو جو ظاہر ہوں، اور جو چھپے ہوں، اور گناہ کو، اور ظلم کو جو ناحق ہوتا ہے، حرام قرار دیا ہے، اور اس بات کو حرام قرار دیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کریں، جس کی کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی، اور یہ بھی حرام قرار دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جنہیں تم نہیں جانتے ﴿۳۳﴾ اور ہر اُمت کے لئے ایک وقت مقرر ہے، سو جب ان کی اجل آگئی تو اس سے ذرا دیر بھی پیچھے نہ ہٹیں گے، اور مقدم بھی نہ ہوں گے ﴿۳۴﴾ اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس میرے رسول آئیں، جو تمہارے سامنے میری آیات بیان کریں، سو جس نے تقویٰ اختیار کیا، اور اصلاح کی، سو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور ان سے تکبر کیا، وہ لوگ دوزخ والے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۳۶﴾

معارف ومسائل

یہاں سے کفار ومشرکین کی دُہری جہالت کا بیان ہو رہا ہے کہ یہ عقل کے اندھے، احمق اور نادان ہیں، جن میں حلال وحرام کی تمیز تک نہیں۔ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی عمدہ اور نفیس وپاکیزہ چیزوں کو اپنے اوپر بلاوجہ حرام کر کے ان نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ اور دوسری طرف جو چیزیں حقیقۃً حرام تھیں، اور جن کے استعمال سے اللہ تعالیٰ کا غضب اور آخرت کا شدید ترین عذاب نتیجہ میں آنے والا ہے، ان محرمات کے استعمال میں مبتلا ہو کر آخرت کا وبال خرید لیا، اور اس طرح دنیا وآخرت دونوں جگہ نعمتوں سے محروم ہو کر خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ کے حقدار بن گئے۔ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ آپ فرما دیجئے کہ: میرے ربّ نے فحش چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، تمام فحش باتیں، اور فحش کام حرام ہیں، خواہ ظاہری طور پر ہوں، خواہ باطنی طور پر۔ ہزاروں گناہ اور فواحش کا سلسلہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اکثر و بیشتر فواحش مسلمانوں میں کفار کے راستے، اور ان کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، جنہیں مسلمان معاشرہ نے اپنے اندر ضم کیا ہوا ہے۔ اور کچھ مسلمانوں کے اپنے فواحش و منکرات ہیں، جن کے موجد وہ خود ہیں، پس فواحش و منکرات اپنے ہوں یا غیروں کے، ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے، اسلامی معاشرہ میں نہ ان کا جواز ہے، اور نہ گنجائش۔ یہ سب ناجائز اور حرام ہی ہوں گے۔

﴿وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے گناہ کو بھی حرام قرار دیا۔ اِثم میں ذنوب، خطایا، سیآت، معاصی، صغیرہ و کبیرہ، وغیرہ سارے آگئے۔ یہ سب حرام اور ناجائز ہیں۔ اور بغاوت وظلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، جو ناحق ہی ہوتا ہے۔

﴿وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا﴾ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حرام قرار دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کرو، اور تمہارا یہ شرک کرنا سراسر بے بنیاد ہے، آباء واجداد کی منگھڑت، غیر شرعی، غیر عقلی تقلید کا نتیجہ ہے، جس کی کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نازل نہیں فرمائی۔ اور تم جھوٹ بول کر کہتے ہو کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ان امور کا امر کیا ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کو تم نے بلا سند خواہ مخواہ حرام ٹھہرا لیا، وہ تو حرام نہیں، مگر اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے تمام بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے، خواہ وہ ظاہر ہوں، خواہ چھپے ہوئے۔ اور ہر گناہ کے کام کو، اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلا دلیل کسی کے شریک ٹھہرانے کو، اور اس بات کو کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی کوئی سند تمہارے پاس نہ ہو۔

لفظ ''اِثم'' میں وہ تمام گناہ آگئے ہیں جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔ اور ''بغی'' میں وہ تمام گناہ آگئے جن کا تعلق دوسروں کے معاملات اور حقوق سے ہو، اور شرک اور اِفتِراء عَلَی اللّٰہ یہ عقیدہ کا گناہ عظیم ہے، جو حقوق اللہ سے متعلق ہے۔

اس تفصیل میں وہ سارے محرمات آگئے، خواہ عقیدہ سے متعلق ہوں، یا عمل کے ساتھ، زبانی ہوں یا عملی، اپنی ذات سے متعلق ہوں، یا حقوق العباد، یا حقوق اللہ کے ساتھ ہوں۔ اور امورِ دینیہ میں غلو اور نو ایجاد بدعت کا یہ

لازمی خاصہ ہے کہ جو شخص ان چیزوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، وہ دین کی اصلی اور اہم ضروری احکام سے عادۃً غافل ہو جاتا ہے، اس لئے غُلُو فِي الدِّين اور بدعت کا نقصان دُہرا ہو جاتا ہے، ایک تو غُلُو فِي الدِّين اور بدعت کا گناہ، دوسرا صحیح احکامِ دینیہ اور سنّتِ مطہرہ کا ترک، اور اتباعِ شریعت سے محرومی۔

کافروں کا یہی حال رہا کہ وہ حرام شدہ اشیاء کو سینے کے ساتھ لگا کر ان کے دلدادہ ہو گئے، جس کے نتیجہ میں حلال شدہ چیزوں سے محروم ہو گئے۔

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ﴾ یعنی یہ مجرمین، کفار و مشرکین جو ہر طرح کے کفر و شرک کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں پل رہے ہیں، اور عیش کر رہے ہیں، اور دنیا میں بظاہر ان پر کوئی عذاب نہیں آتا، وہ اس پر مزید سرکشی میں مبتلا ہیں کہ اگر ہمارا دین غلط ہوتا تو ہم پر عذاب آجاتا، جب عذاب نہیں آرہا تو یہ ہماری حقانیت کی دلیل ہے، اس پر ارشاد فرمایا کہ تم عادۃُ اللہ سے غافل نہ رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو اپنی رحمت سے ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی حرکتوں سے شاید باز آجائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اس ڈھیل اور مہلت کی ایک میعاد معیّن ہوتی ہے، جب وہ مقرر میعاد آپہنچتی ہے تو ایک گھڑی بھی آگے پیچھے نہیں ہوتی، اور یہ عذاب میں پکڑ لئے جاتے ہیں۔ کبھی دنیا ہی میں کوئی عذاب آجاتا ہے، اور اگر دنیا میں عذاب نہ آیا تو مرتے ہی عذاب میں داخل کئے جاتے ہیں۔

صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی جب لوگوں نے عذاب کا سوال کیا، یعنی یوں کہا کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم پر عذاب کیوں نہیں بھیجتا؟ اور ہمیں ہلاک کیوں نہیں کرتا؟ اس کے بعد پھر بنی آدم سے خطاب فرمایا، اور مؤمنین اور کافرین کے انجام سے باخبر فرمایا، تو ارشاد فرمایا:

﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ إِمَّا يَأۡتِيَنَّكُمۡ رُسُلٞ مِّنكُمۡ يَقُصُّونَ عَلَيۡكُمۡ ءَايَٰتِي فَمَنِ ٱتَّقَىٰ﴾ [الآیہ] اے آدم کی اولاد! اگر تمہارے پاس میرے رسول علیہم السلام آئیں جو تم میں سے ہوں گے، جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے، تو جن لوگوں کے پاس میرے رسول علیہم السلام آئیں، اور انہوں نے ان کی بات مانی، اور کفر و شرک سے تائب ہوئے، اور اپنے اعمال کی اصلاح کر لی، بس یہ لوگ فلاح پائیں گے، اور آخرت میں ایسے لوگوں پر کوئی خوف نہیں ہو گا، اور رنجیدہ و پریشان بھی نہ ہوں گے۔

﴿وَٱلَّذِينَ كَذَّبُواْ بِـَٔايَٰتِنَا وَٱسۡتَكۡبَرُواْ عَنۡهَآ أُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِ﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور ان سے تکبر اور اعراض کیا، اور ان کے قبول کرنے میں غرور کی وجہ سے اپنی ہتک سمجھی، اور اپنے کو بڑا سمجھا

تو یہ لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔

استکبار کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے، اور اس کے رسولوں علیہم السلام کی تصدیق کرنے، اور اس کے احکام ماننے میں اپنی ذلت محسوس کرتے ہیں، اور اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ سورۂ صافات میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ﴾ [الصافات: ۳۵] یعنی مشرکین کا حال یہ تھا کہ جب ان کو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی دعوت دی جاتی تھی تو تکبر کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اپنے معبودوں کو کسی مجنون شاعر کے کہنے پر ہرگز نہیں چھوڑ سکتے۔ قرآن کریم نے مشرکین کے استکبار وغرور کا متعدد مقامات پر تذکرہ فرمایا ہے۔ دراصل ابلیس نے انہیں یہی پٹی پڑھا کر راہِ حق سے ہمیشہ کے لئے کوسوں دور رکھا تھا۔

❁ ❁ ❁

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى
اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَ
شَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝٣٧ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ
الْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ
لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۬ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝٣٨
وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝٣٩

ترجمہ: سو اُس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھے، یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا لکھا ہوا حصہ مل جائے گا، یہاں تک جب ان کے پاس ہمارے فرستادہ ان کی جان قبض کرنے کے لئے آئیں گے تو وہ کہیں گے کہ وہ کہاں ہیں جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا کرتے تھے؟ جواب میں کہیں گے کہ وہ سب ہم سے غائب ہو گئے، اور اس وقت یہ لوگ اپنے بارے میں اقرار کرلیں گے کہ ہم کافر تھے ۝٣٧ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوگا کہ دوزخ میں ان جماعتوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ جو جنات میں سے اور انسانوں میں سے تم سے پہلے ہو گزریں، جب ایک جماعت داخل ہوگی، تو اپنی جیسی دوسری جماعت پر لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جب سب دوزخ میں جمع ہو جائیں گے، تو پچھلے لوگ پہلے لوگوں کے بارے میں کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! ان لوگوں نے

ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا انہیں خوب زیادہ بڑھتا چڑھتا دوزخ کا عذاب دیجئے، اللہ تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہوگا کہ سب ہی کا دوگنا ہے، لیکن تم جانتے نہیں ہو ۳۸ اور جو پہلے لوگ تھے وہ پچھلے لوگوں سے کہیں گے کہ پھر تم کو ہم پر کوئی فضیلت نہیں، سو چکھ لو عذاب اپنے اعمال کے بدلے میں ۳۹

معارف ومنازل

ان آیات میں پہلے تو یہ فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ شانہ پر جھوٹا بہتان باندھے، یا اس کی آیات کی تکذیب کرے؟ طرز تو سوال کا ہے، لیکن بتانا یہ ہے کہ ایسے لوگ ظلم میں سب ظالموں سے بڑھ کر ہیں۔

پھر یہ فرمایا: ان کا رزق مقدر ہے، اور جو عمر مقرر ہے، وہ تو اس دنیا میں ان کو مل جائے گی، ہاں موت کے وقت اور موت کے بعد ان کا بُرا حال ہوگا، اور برا انجام ہوگا۔ موت کے وقت جو فرشتے ان کی جانیں قبض کرنے لگیں گے، تو ان سے سوال کریں گے: اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کو تم اپنی حاجتوں کے لئے پکارا کرتے تھے، اور انہیں مشکل کشا، حاجت روا سمجھتے تھے، اور ان کی عبادت کرتے تھے، وہ کہاں ہیں؟

اس موقع پر مذکورہ سوال کا باعث یہ ہوسکتا ہے کہ اب تم دنیا سے جا رہے ہو، موت سر پر کھڑی ہے، تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کو پکارا کرتے تھے، اس آڑے وقت میں ان کو تم کیوں نہیں پکارتے ہو؟ اگر وہ مدد کر سکتے ہیں تو تمہیں موت سے بچالیں۔ یہ سوال تہدید وسرزنش کے لئے ہوگا تا کہ موت کے وقت انہیں اپنے شرک اور کفر کی قباحت اور شناعت معلوم ہو جائے۔

وہ بے کسی کے عالم میں جواب دیں گے کہ جن معبودوں کو پکارا کرتے تھے، آج وہ سب غائب ہو گئے، اور ساتھ ساتھ وہ اقرار کریں گے کہ واقعی ہم کافر تھے۔ اس طرح کا سوال قیامت کے دن بھی ہوگا، جیسا کہ سورۂ انعام رکوع ۳ میں گزر چکا ہے۔

برزخ کے عذاب میں مبتلا رہ کر جب قیامت کے دن اٹھیں گے، اور سوال وجواب، حساب وکتاب کے بعد کافروں کے بارے میں دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہوگا تو جماعتیں بن بن کر دوزخ میں آتے رہیں گے۔ کچھ جماعتیں پہلے داخل ہوں گی، اور کچھ بعد میں، جو لوگ بعد میں داخل ہوں گے ان سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوگا کہ تم سے پہلے جنات میں سے اور انسانوں میں سے جو جماعتیں دوزخ میں جا چکی ہیں تم بھی دوزخ کے عذاب میں ان کے ساتھی بن

جاؤ، اور اکٹھے رہو۔

﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا﴾ کہ جب ایک جماعت دوزخ میں جائے گی تو اپنی جیسی دوسری جماعت پر لعنت کرے گی۔ دنیا میں جو آپس میں ایک دوسرے سے تعلق تھا، اور باہمی تعاون تھا، وہ سب ختم ہو جائے گا، اور ہر بعد والی جماعت اپنی جیسی پہلی جماعت پر لعنت کرے گی، اور وہاں بغض وعداوت کا بازار گرم ہوگا۔ اور بعد میں داخل ہونے والے اپنے سے پہلے داخل ہونے والوں کے بارے میں کہیں گے کہ: اے ہمارے ربّ! ان لوگوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا انہیں بڑھتا چڑھتا دوزخ کا عذاب دیجئے۔

یہ تفسیر اس صورت میں ہے کہ اُخْرٰىهُمْ سے اَتباع مراد لئے جائیں، اور اُوْلٰىهُمْ سے ان کے سردار و سرغنہ مراد لئے جائیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی مانا جائے کہ سردارانِ قوم دوزخ میں اپنی قوم سے پہلے جائیں گے۔ [معالم، ابن کثیر] اور بعض حضرات نے اُخْرٰىهُمْ سے نیچے درجے کے لوگ، اور اُوْلٰىهُمْ سے سردارانِ قوم مراد لئے ہیں، اور اس میں دخولِ نار کی اوّلیت اور اُخرویت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ یہ قول روح المعانی میں لکھا ہے۔

دنیا میں تو اپنے بڑوں کی بات مانتے تھے، اور ان کے کہنے پر چلتے تھے، اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے جو ہدایت پہنچانے والے ہدایت وایمان کی طرف بلاتے تھے تو الٹا انہیں ایذائیں دیتے تھے، اور برا کہتے تھے، اور اپنے بڑوں ہی کی باتوں پر چلتے تھے، اور جب آخرت میں عذاب دیکھیں گے تو گمراہ کرنے والے بڑوں پر لعنت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ انہیں دوگنا عذاب دیں، ان کا عذب ہمارے عذاب سے خوب بڑھا چڑھا کر ہونا چاہئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا:

﴿لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ﴾ ہر ایک کے لئے خوب زیادہ عذاب ہے، لیکن تم نہیں جانتے۔ یعنی تم میں سے ہر ایک کو جس قدر عذاب ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ اسے کہا ہی نہیں جاسکتا، بیان سے باہر ہے۔ پھر یہ عذاب ایک حالت پر نہیں رہے گا، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا جائے گا، جیسے ارشاد ہے: ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾ [النبأ: ۳۰] (بس چکھتے رہو، ہم تمہارے لیے عذاب کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کریں گے)۔

جس طرح جنتیوں کے لئے جنت میں بار بار نعمتوں اور راحتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، اسی طرح دوزخیوں کے عقاب وعذاب میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہے: ﴿زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ﴾ [النحل: ۸۸] (ہم نے ان کے لیے عذاب کے اوپر عذاب بڑھایا، بسبب اس کے کہ وہ فساد

مچاتے تھے)۔جن لوگوں نے کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکا، ہم ان کو عذاب پر عذاب بڑھادیں گے، بہ سبب اس کے کہ وہ فساد کرتے تھے۔

﴿وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ﴾ پہلے والے بعد والوں سے کہیں گے کہ جب سب کی سزا کا یہ حال ہے، تو پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت نہ ہوگی، کیونکہ عذاب کی تخفیف نہ ہمارے لئے ہے نہ تمہارے لئے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کہا جائے گا:

﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ﴾ سو تم اپنے اعمال کے بدلے عذاب چکھ لو۔بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ جہنمیوں کا قول ہے، جو ایک فریق بطورِ الزام دوسرے فریق کو کہے گا۔

بہر حال! اہلِ جہنم کی باہم اس طرح کی الزام تراشی اور شیاطین کے ساتھ ان کے مکالمے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہیں کہ چھوٹے مجرم بڑے مجرموں پر تنقید کریں گے کہ تم نے ہمیں گمراہ کر کے جہنم کے راستہ پر ڈال دیا، اور بڑے مجرم انہیں کہیں گے کہ تم نے اپنی مرضی سے یہ سب کچھ قبول کیا، ہم نے زبردستی کر کے کبھی تمہارا راستہ نہیں روکا، اس میں مجرم تم خود ہو، وغیرہ۔

❁ ❁ ❁

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ
لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾
لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور ان سے تکبر کیا، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے، اور ہم ایسے ہی مجرموں کو سزا دیتے ہیں ﴿۴۰﴾ ان کے لئے دوزخ کا بچھونا ہوگا، اور ان کے اوپر سے اوڑھنے کا سامان ہوگا، اور ہم اسی طرح ظالموں کو بدلہ دیتے ہیں ﴿۴۱﴾

معارف ومنازل

مکذّبین و مستکبرین کے متعلق عجیب مثال، یعنی تعلیق المحال بالمحال کی تمثیل، کیونکہ عرب میں اونٹ، اور پھر نر

اونٹ سب سے بڑا جانور ہے، اس کا سوئی کے ناکے سے جس طرح گزرنا ناممکن اور محال ہے اسی طرح مکذّبین و مستکبرین کا جنت میں جانا بھی ناممکن اور محال ہے۔ حدیث شریف میں مؤمن اور کافر کی موت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ جب حضرت ملک الموت مؤمن کی روح کو قبض کرتے ہیں، تو وہ ایسی آسانی سے نکل آتی ہے جیسے پانی کا بہتا ہوا قطرہ مشکیزہ سے باہر آتا ہے (یا آنسو کا قطرہ آنکھ سے ٹپکتا ہے)۔

جب وہ اس روح کو لے لیتے ہیں تو ان کے پاس جو دوسرے فرشتے جنتی کفن اور جنتی خوشبو لئے ہوئے موجود ہوتے ہیں، پل بھر بھی ان کے ہاتھ میں اس کی روح کو نہیں چھوڑتے، پھر وہ اسے جنتی کفن اور جنتی خوشبوؤں میں لپیٹ کر آسمان کی طرف لے کر چل دیتے ہیں، جب وہ آسمان کی طرف چڑھنے لگتے ہیں تو فرشتوں کی جس جماعت پر ان کا گزر ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ کون پاکیزہ روح ہے؟ وہ اس کا اچھے سے اچھا نام لے کر جواب دیتے ہیں، جس سے دنیا میں اس کا تعارف ہوتا تھا کہ فلان بن فلان ہے۔

اس طرح پہلے آسمان تک پہنچتے ہیں، اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں، چنانچہ دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور وہ اس روح کو لے کر اوپر دوسرے آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اسی طرح ساتویں آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہر آسمان کے مقربین دوسرے آسمان تک رخصت کرتے ہیں۔ جب ساتویں آسمان تک پہنچ جاتے ہیں تو ربّ العزّت جلّ جلالہ فرماتے ہیں کہ میرے بندے کی کتاب علّیّین میں لکھ دو، اور اسے زمین پر واپس لے جاؤ، کیونکہ میں نے ان کو زمین ہی سے پیدا کیا، اور اسی میں اس کو لوٹا دوں گا، اور اسی سے اس کو دوبارہ نکال دوں گا، چنانچہ اس کی روح اس کے جسم میں واپس کر دی جاتی ہے، اس کے بعد جو قبر میں سوال و جواب ہوگا، اور صحیح جواب کے بعد قبر میں جو اس کا اکرام ہوگا اس کا تذکرہ فرمایا۔

پھر کافر کی موت کا تذکرہ فرمایا، اور فرمایا کہ بلاشبہ جب کافر انسان دنیا سے جانے اور آخرت کا رُخ کرنے کو ہوتا ہے، تو سیاہ چہروں والے فرشتے آسمان سے اس کے پاس آتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں ٹاٹ ہوتے ہیں، اور اس کے پاس اتنی دور تک بیٹھ جاتے ہیں جہاں تک اس کی نظر پہنچ جاتی ہے، پھر حضرت ملک الموت تشریف لاتے ہیں، اور اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اے خبیث جان! اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی طرف نکل۔ ملک الموت کا یہ فرمان سن کر روح اس کے بدن میں اِدھر اُدھر بھاگی پھرتی ہے، لہٰذا ملک الموت اس کی روح کو جسم سے اس طرح نکالتے ہیں جیسے بوٹیاں بھوننے کی سیخ بھیگے ہوئے اُون سے صاف کی جاتی ہے۔ یعنی کافر کی روح کو جسم سے

زبردستی اس طرح نکالتے ہیں جیسے بھیگا ہوا اُون کانٹے دار سیخ پر لپٹا ہوا ہو، اور اس کو زور سے کھینچا جائے۔

پھر اس کی روح کو ملک الموت اپنے ہاتھ لے لیتے ہیں، اور ان کے ہاتھ میں لیتے ہی دوسرے فرشتے پلک جھپکنے کے برابر بھی ان کے پاس نہیں چھوڑتے، اور ان سے فوراً لے کر ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں، اور وہ جہنمی ٹاٹ اتنا بدبودار ہے کہ نعوذ باللہ، جیسے کبھی کسی بدترین سڑی ہوئی مردہ نعش سے روئے زمین پر بدبو پھوٹی ہو۔

وہ فرشتے اسے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں، اور فرشتوں کی جس جماعت پر بھی پہنچتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ کون خبیث روح ہے؟ وہ اس کا برے سے برا وہ نام لے کر کہتے ہیں جس سے وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ فلاں کا بیٹا فلاں ہے، حتی کہ وہ اُسے لے کر قریب والے آسمان تک پہنچتے ہیں، اور دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں، مگر اس کے لئے دروازہ نہیں کھولا جاتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، اور نہ وہ کبھی جنت میں داخل ہوں گے، جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ میں نہ چلا جائے۔ [مشکوۃ المصابیح] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ کافروں کے اعمال اوپر نہیں اٹھائے جاتے، اور نہ ان کی دعاء اوپر اٹھائی جاتی ہے۔ [ابن کثیر]

تعلیق بالمحال کا مطلب بتا چکے کہ نہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہوسکتا ہے، اور نہ یہ لوگ جنت میں داخل ہوسکتے ہیں۔

﴿مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ﴾: کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ڈھاپنے والی چیز بھی دوزخ سے ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٤٢ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٤٣

ترجمہ: اور جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کئے، ہم کسی جان کو مکلف نہیں بناتے مگر اس کی طاقت کے

موافق، یہ لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۴۲﴾ اور جو کچھ ان کے سینوں میں کدورت ہوگی، ہم اسے نکال دیں گے، اور وہ کہیں گے کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جس نے ہمیں یہاں پہنچا دیا، اور ہم راہ پانے والے نہ تھے، اگر وہ ہم کو ہدایت نہ دیتا، بلاشبہ ہمارے پاس ہمارے ربّ کے رسول حق کے ساتھ آئے، اور ان کو آواز دی جائے گی کہ یہ جنت ہے، جو تمہیں دی گئی ان اعمال کا بدلہ جو تم کیا کرتے تھے ﴿۴۳﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم میں ترغیب اور ترہیب، نیز نافرمانوں کے بیان کے ساتھ فرمانبرداروں کا بیان سلسلہ وار چلتا ہے، تاکہ اِنذار وتبشیر کا تقاضا پورا ہو۔ گزشتہ دو تین رکوعات میں اہل جہنم کے کردار اور ان کے انجام کا بیان ہوتا رہا۔ آیت بالا میں ان کے بالمقابل اہل جنت کا تذکرہ بیان فرمایا، ارشاد ہوا کہ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا، اور اعمالِ صالحہ بجالائے، ان کے لئے جنت ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

درمیان میں بطورِ جملہ معترضہ ارشاد فرمایا کہ ہم کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتے جو اس کی قوت وطاقت سے باہر ہو، جیسے سورۂ بقرہ کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة:۲۸۶] (اللہ کسی جان کو مکلف نہیں بناتا مگر اس کی طاقت کے موافق)۔

شریعت کا اصول ہے کہ تکلیف مالایُطاق ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ کی رحمتِ واسعہ کا یہی تقاضا ہے کہ اپنے بندوں کو ان کی طاقت واستطاعت کی بنیاد پر مکلّف بنایا جائے، اور اسی کے مطابق انہیں احکامِ شرعیہ کا حکم دیا جائے، جیسے فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج:۷۸] (اور اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی رکھی)۔

اہل جنت جن نعمتوں اور راحتوں میں ہوں گے قرآن حکیم میں بار بار ہر جگہ ان کا ذکر ہے۔ یہاں ایک خاص نعمت کا تذکرہ فرمایا، اور وہ یہ کہ دنیا میں ان کے دلوں میں تھوڑا بہت بغض وکینہ ہوتا تھا، اور کدورتوں کی بھرمار ہوتی تھی، جنت دار الخلد میں ایسی چیزوں کی گنجائش نہیں ہوگی، وہاں پہنچنے سے پہلے پہلے اس طرح کے بغض وکینہ سے ان کے سینوں کو صاف اور پاک کیا جائے گا، اور یہ تمام نقائص ان کے قلوب سے دور کئے جائیں گے، کیونکہ دنیا کے ماحول سے جنت کا ماحول سراسر ممتاز اور پاکیزہ ہے۔ جنتی ماحول میں بغض، عداوت، بدگمانی، بدخواہی، کبر وغرور، اور دیگر تمام روحانی امراض کا نام ونشان تک نہ ہوگا۔ سورۂ واقعہ میں ارشاد ہے: ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا

﴿لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِیْمًا اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ [الواقعة: ۲۶] (وہ اس جنت میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے۔ اور نہ کوئی گناہ کی بات۔ ہاں جو بات ہوگی سلامتی ہی سلامتی کی ہوگی)۔

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنتی جب جنت کی طرف لے جائے جائیں گے تو جنت کے دروازہ کے سامنے ایک درخت ہوگا، جس کے نیچے دو نہریں جاری ہوں گی، ایک نہر سے پانی پیتے ہی دنیا کے سب تکدر ڈھل جائیں گے، اور دوسری نہر میں غسل کرتے ہی سب تر و تازہ صاف ہو جائیں گے۔ پھر فرشتے انہیں کہیں گے: دل صاف ہو گئے، آئندہ کبھی ناگواری نہیں ہوگی، ہمیشہ زندہ رہو گے، موت کبھی نہیں آئے گی، ہمیشہ جوان رہو گے، بڑھاپا نہیں آئے گا، خوش رہو گے مایوسی نہیں آئے گی۔ [ابن ابي حاتم]

صحیح بخاری میں ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو پہلی جماعت داخل ہوگی، ان کے چہرے چودہویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے، پھر جو لوگ ان کے بعد داخل ہوں گے ان کے چہرے ایسے روشن ہوں گے جیسے کوئی بہت روشن ستارہ ہو، ان سب کے دل ایک شخص کے دل کی طرح ہوں گے، نہ ان کے درمیان کوئی اختلاف ہوگا، اور نہ ہی آپس میں کچھ بغض و حسد ہوگا۔

(یہ جو فرمایا کہ ان کے دل ایک ہی شخص کے دل پر ہوں گے) اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب میں ایسی یگانگت ہوگی کہ گویا سب شخص واحد ہیں، ان کے درمیان باہمی کسی طرح کی کوئی رنجش اور افتراق نہیں پایا جائے گا۔ جیسے چند چھوٹے بچے آپس میں کھیلتے اور رہ رہے ہوں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مؤمنین دوزخ سے چھوٹ جائیں گے (یعنی پُل صراط سے پار ہو جائیں گے) تو ان کو جنت و دوزخ کے درمیان ایک پُل پر روک دیا جائے گا، اور آپس میں ایک دوسرے پر دنیا میں جو کوئی ظلم اور زیادتی ہو گئی تھی، اس کا بدلہ دلا دیا جائے گا (تاکہ جنت میں رنجش اور کدورت کے ساتھ داخل نہ ہوں)۔

یہاں تک کہ جب حقوق کی ادائیگی سے صاف ستھرے ہو جائیں گے، تو انہیں جنت میں داخلہ کی اجازت ہو جائے گی۔ (یہ بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا):

قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے، یہ لوگ اپنے جنت والے گھر کو اس سے زیادہ پہچاننے والے ہوں گے جو ان کا گھر دنیا میں تھا۔ [بخاري]

اہل جنت کی نعمتوں کا اجمالی تذکرہ فرمانے کے بعد ان کے تشکر کا تذکرہ فرمایا کہ جنت میں جنتی اللہ تعالیٰ

شانہ کا شکر ادا کرتے ہوئے یوں کہیں گے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا، اور ہم ہدایت پانے والے نہ تھے، اگر اللہ ہم کو ہدایت نہ دیتا۔ یہ سب کچھ اس کا کرم اور عنایت ہے کہ ہمیں ابدی جنت عطا فرمائی۔ دنیا میں ہمیں ایمان کی دولت اور اعمالِ صالحہ کی توفیق نصیب فرمائی، یہ اس کا فضل ہے، اگر وہ ہدایت نہ دیتا تو کسی کو ہدایت نہ ملتی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس دنیاوی ہدایت کو دخولِ جنت کا ذریعہ بنا دیا، یہ اس کی عنایت ہے، اللہ کے ذمہ کسی کا کچھ واجب نہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ﴾ [الزمر: ۷۴] (اور جنتی کہیں گے کہ تمام تر شکر اللہ کا ہے، جس نے ہم سے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا، اور ہمیں اس سرزمین کا ایسا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانا بنالیں)۔

مطلب یہ ہے کہ جنت میں جانے کا حقیقی اور اصلی سبب اللہ تعالیٰ شانہ کی رحمت اور کرم ہے، اعمالِ صالحہ ظاہری اسباب ہوتے ہیں، اور وہ بھی توفیقِ الٰہی کے تابع ہیں۔

﴿لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ تحقیق اللہ تعالیٰ کے رسول علیہم السلام حق بات لے کر آئے، ہم نے ان کی بات سنی، اور تسلیم کی، ایمان لائے، اور اعمالِ صالحہ انجام دیئے۔ اور پھر ان کو پکارا جائے گا: اے ایمان والو! اے اہل جنت! (پکارنے والا فرشتہ کہے گا) یہ ہے تمہاری جنت، جو تمہیں وراثت میں دی گئی ہے، اس چیز کے بسبب جو تم عمل کرتے تھے۔

وراثت کے متعلق حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر شخص کے دو ٹھکانے ہیں: ایک جنت میں، اور ایک دوزخ میں۔ عالمِ برزخ میں دونوں ٹھکانے انسان کو دکھا دیئے جاتے ہیں، پھر اگر وہ صاحب ایمان ہے تو اُسے جنت والا ٹھکانا دے دیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اگر تم ایمان نہ لاتے تو تمہیں دوزخ والا ٹھکانا مل جاتا۔ اسی طرح کافر و مشرک کو دوزخ میں اس کے ٹھکانے پر پہنچایا جاتا ہے، اور اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آتا تو اسے جنت والا ٹھکانا مل جاتا۔ مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ مؤمن کو جنت میں اس کا اپنا ٹھکانا بھی مل جاتا ہے، اور کافر کا وہ ٹھکانا بھی اسے حاصل ہو جاتا ہے جو اسے ایمان لانے کی صورت میں ملتا۔

اسی طرح کافر کو دوزخ میں اس کا اپنا مقام بھی حاصل ہو جاتا ہے، اور اس مؤمن کا مقام بھی جو ایمان نہ

لانے کی صورت میں اس کو ملتا۔ اس طرح گویا ایمانداروں کو کافروں کی، اور کافروں کو ایمانداروں کی وراثت مل جائے گی۔

....

وَنَادٰٓى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ
مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا ؕ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ لَّعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ ۝۴۴
الَّذِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ ۝۴۵

ترجمہ: اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہمارے ربّ نے جو وعدہ فرمایا تھا وہ ہم نے حق پایا، سو کیا تم نے بھی اُسے حق پایا جو تمہارے ربّ نے تم سے وعدہ فرمایا تھا؟ وہ کہیں گے کہ ہاں! پھر ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان اعلان کرے گا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ظالموں پر۝۴۴ جو اللہ کی راہ سے روکتے تھے، اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے، اور وہ لوگ آخرت کے منکر تھے۝۴۵

معارف ومنازل

جنتیوں اور دوزخیوں کی آپس میں بات چیت کا ذکر قرآن کریم کی مختلف سورتوں میں موجود ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، چنانچہ اس آیت کریمہ میں بھی اسی قسم کے ایک مکالمہ کا ذکر ہے۔ سورۂ صافات میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جنت والا ایک شخص اپنے ایک دوست سے ملاقات کا خواہش مند ہوگا، جب اسے جنت میں نہ پائے گا تو جہنم میں تلاش کرے گا، ﴿فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيۡ سَوَآءِ الۡجَحِيۡمِ﴾ [الصافات:۵۵] (وہ دوزخ میں جھانکر دیکھے گا، تو اس کا دوست اُسے جہنم کے درمیان میں پڑا ہوا ملے گا)۔

جنت ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے، اور جہنم ساتوں زمینوں سے نیچے ہے، کروڑوں میلوں کے فاصلے کے باوجود وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، اور ان میں مکالمہ ہوگا۔ جنت والا کہے گا: ﴿تَاللّٰهِ اِنۡ كِدۡتَّ لَتُرۡدِيۡنِ﴾ [الصافات: ۵۶] (خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر دیتا)، اگر میں تیری باتوں میں آکر قیامت کا انکار کر دیتا، تو آج میں بھی تیرے ساتھ جہنم میں ہوتا، مگر ربّ العزت کا احسان عظیم ہے کہ میں تمہاری باتوں سے متاثر نہ ہوا، اور قیامت کا انکار نہ کیا، اور اللہ تعالیٰ شانہ نے مجھے اپنی رحمت کے مقام جنت میں پہنچا دیا۔ یہاں بھی اسی قسم کا مکالمہ

ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَنَادٰٓى اَصۡحٰبُ الۡجَنَّةِ اَصۡحٰبَ النَّارِ﴾ اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہم نے پالیا اس چیز کو جو ہمارے ربّ نے ہم سے وعدہ کیا بالکل سچ، اور برحق۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ تھا کہ اگر تم ایمان لاؤ گے، تقویٰ اور عملِ صالح کی راہ اختیار کرو گے، انبیاء علیہم السلام کے حکموں پر چلو گے، معاصی سے اجتناب کرو گے، تو میں تمہیں جنت میں پہنچاؤں گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اور رحمت کی منزل جنت میں داخل فرمایا۔

﴿فَهَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمۡ حَقًّا﴾ اب یہ بتاؤ کہ تمہارے ربّ نے تمہارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا کیا تم نے بھی اُسے سچ پایا؟ تمہارے ساتھ اس کا وعدہ یہ تھا کہ اگر کفر اور شرک اختیار کرو گے، انبیاء کرام علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تکذیب کرو گے تو تمہیں جہنم میں پہنچایا جائے گا، اب بتاؤ تو سہی کیا وہ وعدہ پورا ہوا؟ اور تم اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے؟

﴿قَالُوۡا نَعَمۡ﴾ وہ جواب دیں گے: ہاں! وہ وعدہ بھی سچا ہو گیا، اور اس کے مطابق ہم تباہی کے مقام دوزخ میں پہنچ گئے۔ اس قسم کا مکالمہ صحیحین کی حدیث میں بھی آیا ہے۔ جنگ بدر میں جب بڑے بڑے سردار کافر مارے گئے، تو سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیدیا کہ ان صنادید کی لاشوں کو گھسیٹ کر اس خبیث ومخبث کنویں میں ڈال دو۔ کئی لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے، اور کچھ سلامت تھیں، ان کی ٹانگوں میں رسی ڈال کر ان کو بشمول ابو جہل گھسیٹ کر اس کنویں میں گرادیا گیا۔

مقامِ جنگ سے مدینہ کی طرف روانگی کے وقت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کنویں پر کھڑے ہو کر ائمہ کفر صنادیدِ قریش سے یہی خطاب فرمایا: ﴿هَلۡ وَجَدۡتُمۡ مَاوَعَدَكُمۡ رَبُكُمۡ حَقًا فَاِنَا قَدۡ وَجَدۡنَا مَاوَعَدَنَا رَبُنَا حَقًّا﴾ ہم نے تو اپنے ربّ کا وعدہ سچا پایا، کیا تم نے بھی اپنے ربّ کا وعدہ سچا پالیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ایک کو اس کے، اور اس کے باپ کا نام لے کر خطاب فرمایا، یَا فُلَانُ بنُ فُلَان کہتے ہوئے، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اے بدنصیبو! کتنا اچھا ہوتا کہ اگر تم ایمان لے آتے، آج تمہارا یہ حال نہ ہوتا، جس عذاب میں تم مبتلا ہو۔

علماء کرام نے فرمایا: جتنا کسی نبی کا مقام اونچا ہوتا ہے، اتنا ہی اس کے ماننے والوں کا مرتبہ ومقام اونچا ہوگا، اور اس کے نہ ماننے والے بدنصیبوں کا عذاب بھی اتنا بڑا اور زیادہ ہوگا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خطاب اور مکالمہ پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یَارَسُولَ اللهِ! مَا تَكَلَّمُ

اِلَّا أجسادًا لَا أرْوَاحَ لَهَا۔ آپ ایسے مردوں سے خطاب فرما رہے ہیں، جن میں روحیں موجود نہیں ہیں، یہ تو مرے ہوئے ہیں، اور مردار ہیں۔ اس پر سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا: وَالَّذِی نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ مَا أَنْتُم بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُولُ مِنْهُمْ۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، میں جو باتیں کر رہا ہوں تم ان کو ان سے زیادہ نہیں سنتے۔ یعنی میری باتوں کو یہ اسی طرح سن رہے ہیں جیسا کہ تم سن رہے ہو، البتہ اتنا فرق ہے کہ وہ جواب نہیں دے سکتے۔

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو تھوڑی دیر کے لئے زندہ فرمایا، اور انہیں سید الانبیاء ﷺ کی بات سنوائی تا کہ ان کی حسرت و افسوس، اور پشیمانی، اور شرمساری و ندامت میں اضافہ ہو، اور دوسرے لوگوں کے لئے عبرت ہو۔ بہر حال! آیت کریمہ کے مطابق جنتی لوگ دوزخیوں سے یہی پوچھیں گے، اور وہ جواب دیں گے کہ ہاں! ہم نے اس وعدۂ عذاب اور جہنم کو پالیا۔

﴿فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ پھر ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ تعالیٰ شانہ کی لعنت ہو۔ جن لوگوں نے کفر و شرک کیا، انبیاء و رسل علیہم السلام اور کتابوں کو جھٹلایا، توحید اور قیامت کا انکار کیا، وہ ظالم ہیں، اور ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اور اس کی رحمتوں سے دور ہیں۔

ظالموں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ یہ ظالم خود بھی گمراہ ہیں، اسلام کی طرف نہیں آتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے راستے سے منع کرتے اور روکتے ہیں۔ ہر پیغمبر کے دور میں معاند، مالدار، سرمایہ دار، اور قومی سرداروں کا یہی شیوہ اور طریقہ رہا ہے کہ عوام الناس کو طرح طرح کے حربے، اور چالوں کے ذریعہ توحیدِ الٰہی اور احکامِ الٰہی قبول کرنے سے، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کرنے، اور ان پر ایمان لانے سے روکتے اور منع کر چکے ہیں۔ قرآن کریم میں جا بجا اس کا تذکرہ موجود ہے۔

﴿وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ اور اس میں کجی اور عیب تلاش کرتے ہیں۔ یعنی اسلام اور احکامِ اسلام کی ایسی عیب جوئی کرتے ہیں، اور اپنی طرف سے ایسے خودساختہ عیوب و نقائص اور گمراہ کن باتیں شامل کرتے ہیں کہ کوئی شخص اسلام کے قریب آنے، اور اُسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

یہود و نصاریٰ اسلام کے حقیقی دشمن ہیں:

مخالفینِ اسلام، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کو موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، چونکہ تمام روئے

زمین پر برحق دینِ الٰہی صرف اسلام ہی ہے، جس کی تمام تعلیمات نفس وخواہشات، اور شیطانی ہتھکنڈوں کے خلاف ہیں، جس کی پاکیزہ تعلیمات فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں، جس کی تعلیمات کی بنیاد توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت پر مبنی ہے، جس میں قدم قدم پر جائز وناجائز، اور ثواب وگناہ کا تذکرہ ہے، اس لئے کرۂ ارض پر جتنے باطل اور شیطانی مذاہب وادیان ہیں سب کے سب اسلام کے دشمن اور اس کے مٹانے اور کمزور کرنے کے درپے ہیں۔

خیر القرون سے لے کر آج تک یہ سارے ادیان ہر محاذ پر اسلام کے خلاف کام کرتے چلے آرہے ہیں، مگر دینِ الٰہی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے سے عاجز رہے ہیں، اور آئندہ بھی عاجز رہیں گے۔ اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہی ایک بات کافی ہے کہ سارا جہاں اپنے بے شمار وسائل کے باوجود اس غیر مسلح نہتے اسلام کو مٹانے اور کمزور کرنے سے بدستور عاجز ہے۔

بظاہر یہودیت، نصرانیت، بدھ مت، ہندومت، مجوسیت، صابیت، اشتراکیت وغیرہ اگرچہ مختلف عقائد و نظریات رکھتے ہیں، مگر اسلام دشمنی اور اسلام کی بدخواہی میں یہ سارے متحد اور متفق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے، جس اسلام نے طہارت ونظافت کو جزو ایمان قرار دیا ہے، اور ظاہری وباطنی طہارت پر ایمان کی بنیاد رکھی ہے، طہارتِ بدن، طہارتِ مکان، طہارتِ لباس، طہارتِ برتن، طہارتِ پانی، وغیرہ بہت سی طہارتوں کے حصول پر مسلمان کو پرکھا، اور مکلّف بنایا ہے۔

اس کے خلاف گائے اور خود اپنا پیشاب پینے والوں نے دنیا کو باور کرانے کی لاحاصل سعی ناتمام کی ہے کہ ہم پاکیزہ ہیں، اگر ہمارے اوپر، یا ہمارے کھانے پر مسلمان کا سایہ پڑجائے تو ہم اور ہمارا کھانا ناپاک اور نجس ہوجاتے ہیں۔ یہ کتنا گھٹیا اور احمقانہ اور بے سروپا عقیدہ ہے ہندوؤں کا؟

بہر حال! کافروں اور غیر مسلمانوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی اتنی عیب جوئی کی جائے کہ کوئی اس کے قریب نہ جائے، اور کوئی اسے قبول ہی نہ کرے۔ یہ سب حربے سورج کو انگلی سے چھپانے کے ناکام ہتھکنڈے ہیں۔ یہودیوں اور نصرانیوں نے ہمیشہ یہی ہتھیار استعمال کیا ہے، اور کر رہے ہیں۔ یہودی تو اس معاملے میں بہت ہی آگے ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے نصرانیت کو بھی الجھنوں میں ڈال کر نہ اِدھر کا چھوڑا نہ اُدھر کا۔ آج عیسائیت ان کے رحم و کرم پر جی رہی ہے، اسے اپنے دین کا کوئی پتہ نہیں، اور اسلام دشمنی میں عیسائی بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو انہیں یہود نے سکھایا، اور بتایا۔

اور وہ مسلمانوں کو طرح طرح سے شکار کرنے، اور اسلام سے دور اور بدظن کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، وہ لوگوں کو مفت تعلیم، مفت علاج اور ملازمتوں کی لالچ دے کر ان کے ایمان اور اسلامی اقدار پر چھاپہ مار رہے ہیں۔ ہسپتال قائم کر رہے ہیں، سکول بنا رہے ہیں، سڑک اور پُل بنا رہے ہیں، این جی اوز چلا رہے ہیں، یہاں تک کہ عورتوں کے ذریعہ بھی اپنے نظریات وکفریات کی اشاعت کر رہے ہیں، جو کہ درحقیقت اسلام کے خلاف سازش ہے۔ یورپ والے اسلام دشمن سرگرمیوں پر بے انتہا دولت خرچ کر رہے ہیں۔ این جی اوز کی آڑ میں مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

اسی طرح غیر مسلم قومیں اسلام کی حدود کو اکثر اپنے پروپیگنڈے کا ذریعہ بناتی ہیں، کہتے ہیں کہ اسلام نے وحشیانہ سزائیں مقرر کی ہیں، قطعِ ید اور زنا کی صورت میں رجم کو غیر انسانی سزا بتاتے ہیں، اور یورپ میں جو ڈکیتیاں ہو رہی ہیں ان سے صرف نظر کر کے اپنے کو انسان اور مہذّب کہنے سے نہیں شرماتے۔

سعودی عرب کے ملک میں قطعِ ید نے وہ امن وسلامتی قائم کی ہوئی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یورپ کو چھوڑیئے آج روشن خیال لوگ جو کسی مصلحت کے تحت اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، وہ بھی قرآن وحدیث اور سرور دوجہاں حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے نظام پر تنقید کرتے ہیں، اور یورپ کی اقتداء پر فخر کر کے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کر رہے ہیں۔ یہ مفلوک الحال فقراء حق نمک ادا کرتے ہوئے اپنے ایمان پر خود ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ روزِ قیامت ان کا حشر یہود ونصاریٰ اور بدھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہوگا۔ قرآن حکیم نے یہ فیصلہ سنایا: ﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ [المائدۃ: ۵۱] (تم میں سے جو بھی ان سے دوستی کرے گا وہ انہیں میں سے ہوگا) جو کوئی کسی غیر مسلم کے قانون وعمل سے محبت رکھے گا، اس کا حشر انہیں کے ساتھ ہوگا۔

اسی طرح ان اقوام میں سب سے بڑا جرم جس سے انسانی شرافت والی نسل کا خانہ خراب ہوا، یعنی زنا، یہ ان کے ہاں عام ہے، اور اس پر کوئی قدغن و پابندی نہیں، اگر رضامندی سے ہو۔ البتہ ایک سے زائد نکاح پر پابندی ہے۔

یورپی مرد اور عورت کو پچاس تک دوست اور آشنا رکھنے کی کھلی اجازت ہے، البتہ دوسرے نکاح پر پابندی ہے۔ یہ کیسی اُلٹی سمجھ اور اُلٹی سوچ ہے؟ اور اس سوچ والوں سے پوچھئے کہ تمہاری شرافت اور مہذّب انسانی نسل کا بیڑا کیسا غرق ہوا؟ مہذب قوموں کے اندر جانوروں، کتوں، گدھوں، گھوڑوں اور اونٹوں کی نسل کا تحفظ موجود ہے کہ جب جانوروں کو خریدتے ہیں تو ان کی نسل کو ذہن میں رکھ کر خریدتے ہیں، وغیرہ۔

﴿وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ كٰفِرُوۡنَ﴾ اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔کافر ویسے ہی آخرت کا منکر ہے، جس کے سبب وہ ابدی دوزخی ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ مسلمان آخرت پر ایمان تو رکھتا ہے، مگر مال ودولت اور دنیاوی زندگی کے آرام وعیش اور پرتکلّف زندگی کی فکر نے اُسے آخرت سے غافل بنا کر رکھا ہے۔

دعاء:

اے ارحم الرّاحمین! دنیا کی محبت سے نجات عطاء فرما، اور آخرت کا طالب بنا۔آمین

وَبَيۡنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الۡاَعۡرَافِ رِجَالٌ يَّعۡرِفُوۡنَ كُلًّاۢ بِسِيۡمٰهُمۡ ۚ وَنَادَوۡا اَصۡحٰبَ الۡجَنَّةِ اَنۡ
سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ ۟ لَمۡ يَدۡخُلُوۡهَا وَهُمۡ يَطۡمَعُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتۡ اَبۡصَارُهُمۡ تِلۡقَآءَ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۙ
قَالُوۡا رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ الۡاَعۡرَافِ رِجَالًا يَّعۡرِفُوۡنَهُمۡ
بِسِيۡمٰهُمۡ قَالُوۡا مَاۤ اَغۡنٰى عَنۡكُمۡ جَمۡعُكُمۡ وَمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَاۤءِ الَّذِيۡنَ
اَقۡسَمۡتُمۡ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ ؕ اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡكُمۡ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: اور دونوں کے درمیان پردہ ہوگا، اور اعراف پر بہت سے لوگ ہوں گے، جو ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے، اور وہ جنت والوں کو پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلام ہو، یہ لوگ جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے، اور اُمید کر رہے ہوں گے ﴿۴۶﴾ اور جب ان کی نظریں دوزخ والوں کی طرف پھیر دی جائیں گی، تو کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ فرمایئے ﴿۴۷﴾ اور اعراف والے بہت سے آدمیوں کو پکاریں گے، جنہیں وہ ان کی نشانی سے پہچانتے ہوں گے کہ تمہارے کام نہ آئی تمہاری جماعت، اور نہ تمہارا تکبر کرنا ﴿۴۸﴾ کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے قسم کھا کر کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں فرمائے گا؟ ان کو یوں حکم ہوگیا کہ داخل ہوجاؤ جنت میں، تم پر کوئی خوف نہیں، اور نہ تم رنجیدہ رہوگے ﴿۴۹﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ میں تین مقامات کا تذکرہ ہے:

پہلا مقامِ فضیلت اور رحمتوں والا مقام، یعنی جنت ہے۔دوسرے مقام میں نقمتوں اور عذابوں کے سوا کچھ

نہیں، یعنی دوزخ۔ تیسرے مقام میں معاملہ بین بین کا ہوگا، نہ دائمی راحت اور نہ عذاب، یعنی اعراف۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ جن کے لئے دوام ثابت ہے یہ دو جماعتیں ہوں گی، اور ہر جماعت اپنے اپنے مقام اور مستقر پر ہوگی، ان دونوں کے درمیان ایک اونچا پردہ (دیوار) حائل ہوگا۔ یہ پردہ ایک دیوار کی صورت میں ہوگا، جس کو بَیْنَهُمَا حِجَابٌ سے تعبیر فرمایا۔ اس پردہ کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، اور بات چیت کرسکیں گے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ﴾ [الأعراف: ۴۴] (اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے)۔ اور عنقریب دوسری آیت میں دوزخیوں کا جنتیوں سے پانی طلب کرنے کا ذکر آرہا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان کچھ جھروکے ہوں گے، جن سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے، اور بات کرسکیں گے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہ پردہ ایسا ہوگا کہ جنت کا اثر اہلِ دوزخ کی طرف، اور دوزخ کا اثر اہلِ جنت کی طرف نہیں پہنچنے دے گا، البتہ آپس میں ایک دوسرے کی آواز پہنچے گی، اور آپس کا مکالمہ جاری ہوگا۔ واللہ اعلم

پھر اس کا جواب دیتے ہوئے کہ دیوار کے درمیان میں حائل ہوتے ہوئے آواز کیسے پہنچے گی؟ تحریر فرماتے ہیں کہ اُمورِ آخرت کو اُمورِ دنیا پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور یہ عمومی قاعدہ بھی ہے۔ صاحب روح المعانی نے درست فرمایا، لیکن اب تو دنیا میں بھی لاسلکی نظام نے یہ ثابت کردیا کہ آواز پہنچنے، اور بات کرنے کے لئے درمیان میں کسی چیز کا حائل ہونا، اور ایک دوسرے سے بعید ہونا مانع نہیں، موجودہ وقت میں یہ سب چیزیں واقع ہیں۔ ایک شخص مشرقِ بعید میں بیٹھے ہوئے بے تکلف مغرب کے لوگوں سے بات کر رہا ہے، بلکہ انہیں دیکھ بھی رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ اَعراف پر بہت سے لوگ ہوں گے، جو ہر ایک کو، یعنی اہلِ جنت اور اہلِ نار کو ان کی نشانیوں اور علامات سے شناخت کریں گے، اور پہچانیں گے۔

لفظِ "اَعْرَاف" عرف کی جمع ہے، ہر چیز کے بلند حصے کو عرف کہا جاتا ہے۔ آیت کریمہ میں جس اَعراف کا ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ البتہ مفسرین حضرات رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان جو دیوار ہوگی، جسے حِجَاب سے تعبیر فرمایا ہے، وہ اَعْرَاف کہلائے گی۔

آیت کریمہ میں اس کی تصریح ہے کہ اَعراف میں بہت سے لوگ ہوں گے، جو اہلِ جنت کو پہچانتے ہوں

گے، اور اہلِ دوزخ کو بھی۔ اور یہ پہچاننا ہر ایک فریق کو علامتوں سے ہوگا، کیونکہ میدانِ حشر میں بھی اہلِ جنت اہلِ دوزخ سے ممتاز ہوں گے۔ اہلِ جنت کے چہرے سفید نورانی ہوں گے، اور تروتازہ، اور خوش بھی، جبکہ اہلِ دوزخ کے چہرے پژمردہ اور سیاہ ہوں گے، اور ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اور جنت و دوزخ کے داخلہ کے بعد ہر فریق کی صورتوں کا ممتاز ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ اُعراف والے اہلِ جنت کو اور اہلِ دوزخ کو ان کی نشانیوں سے پہچان لیں گے، خود تو ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، البتہ دخول کے اُمیدوار ہو رہے ہوں گے کہ انہیں بھی جنت میں داخلہ نصیب ہو جائے گا، اسی طمع اور امید کے حال میں وہ جنت والوں سے خطاب کریں گے کہ تم پر سلام ہو سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ.

ان کا یہ کہنا بطور اخبار یا تحیہ کے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیاوی تکلیفوں سے بچا دیا، اور آئندہ ہمیشہ کے لئے ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ رہو گے۔

یہ ''اصحاب اعراف'' کون ہوں گے؟ اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے حضرات سلف رحمۃ اللہ علیہم سے متعدد اقوال نقل کئے ہیں، مشہور ترین قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نیکیوں کی وجہ سے پل صراط کو پار کریں گے، دوزخ سے تو بچ گئے، لیکن ان کی نیکیاں اس قدر نہ تھیں کہ جنت کے داخلہ کا ذریعہ بن جائیں، یعنی ان کی نیکیاں اور گناہ برابر ہیں۔ کَمَا مَرَّ۔ چنانچہ انہیں اُعراف پر لوگوں کے درمیان فیصلہ ہونے تک روکا جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ شانہ اپنی رحمت و فضل سے ان کو جنت میں داخل فرما دیں گے۔

''اُعراف'' والے حضرات اہلِ جنت سے بھی خطاب کریں گے (جس کا ابھی ذکر ہوا) اور اہلِ دوزخ سے بھی خطاب کریں گے۔ جب وہ دوزخیوں کی ہلاکت و بدحالی کا ملاحظہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ جل شانہ سے عرض کریں گے: اے ہمارے ربّ! ہمیں ظالموں میں شمار نہ فرمانا۔ یعنی دوزخ میں داخل نہ فرمانا۔ اسی طرح وہ اہلِ جہنم کے سرداروں اور بڑوں کو جب دیکھ کر پہچانیں گے، جنہیں اپنی جماعت پر گھمنڈ تھا، اور تکبر کرتے تھے، نہ خود دینِ حق قبول کرتے تھے، اور نہ اپنے ماننے والوں کو قبول کرنے دیتے تھے، اور اہلِ ایمان کا مذاق اڑا کر انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، اور نہ صرف یہ کہ ان کو اپنے طور پر حقیر جانتے تھے، بلکہ یوں کہتے تھے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی رحمت شامل ہو ہی نہیں سکتی: ﴿لَا یَنَالُہُمُ اللّٰہُ بِرَحۡمَۃٍ﴾ (اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں فرمائے گا)۔

تو اصحاب اُعرف ان متکبر سرداروں سے کہیں گے کہ تمہاری جماعت نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا، جن کے تم سردار بنے ہوئے تھے، اور جو کچھ تم تکبر کرتے تھے، اس نے بھی تم کو فائدہ نہ پہنچایا۔ یہ اہلِ ایمان کیا وہ لوگ نہیں ہیں

جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں شامل نہ فرمائے گا؟ اب بتاؤ تمہاری وہ قسمیں کہاں گئیں؟ اور تمہارا وہ غرور کہاں گیا؟ یہ سب ختم ہو گئے۔ آج دیکھو وہ لوگ کیسے کامیاب ہو گئے؟ اور رحمتِ الٰہی کے مستحق بنے؟ اور جنت میں شاداں و خراماں داخل ہو گئے؟ اور ابدی سعادتوں کو حاصل کر گئے؟ انہیں فرمایا جائے گا:

﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ﴾ جنت میں داخل ہو جاؤ، نہ تم پر اب کچھ خوف ہے، نہ آئندہ کبھی تم رنجیدہ اور پریشان ہو گے۔ وہ تو اپنے ایمان کی وجہ سے کامیاب ہو گئے، اور تمہارا تکبر تمہیں کھا گیا، تم کفر پر جمے رہے، تباہ ہو گئے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝٥٠ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝٥١ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝٥٢ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝٥٣

ترجمہ: اور دوزخ والے جنت والوں کو آواز دیں گے کہ ہمارے اوپر کچھ پانی بہا دو، یا ان نعمتوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہیں، وہ جواب میں کہیں گے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ان دونوں چیزوں کو کافروں پر حرام کر دیا ہے ۝٥٠ جنہوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنایا، اور انہیں دنیا والی زندگی نے دھوکہ دیا، سو آج ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں گے، جیسا کہ وہ آج کے دن کی ملاقات کو بھول گئے، اور جیسا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے ۝٥١ اور اس میں شک نہیں کہ ہم نے انہیں ایسی کتاب دی ہے جسے علم کے مطابق کھول کر بیان کر دیا، جو ہدایت ہے، اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں ۝٥٢ یہ لوگ بس اس انتظار میں ہیں کہ اس کا انجام ان کے سامنے آ جائے، جس دن اس کا انجام سامنے آئے گا تو وہ لوگ کہیں گے جو اس کو پہلے بھول گئے تھے کہ ہمارے رب کے پیغمبر حق

لے کر آئے، سوکیا ہمارے لئے سفارش کرنے والے ہیں جو ہمارے لئے سفارش کریں ؟ یا ہم واپس لوٹا دیئے جائیں؟ سو ہم اس عمل کے علاوہ عمل کریں، جو کیا کرتے تھے، ان لوگوں نے اپنی جانوں کو تباہی میں ڈالا، اور جو کچھ افترا پردازی کیا کرتے تھے وہ سب بے کار چلی گئی ﴿۵۳﴾

معارف ومنازل

اہلِ اعراف سے مکالمے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت کا تذکرہ فرمایا ہے:

﴿وَنَادٰۤى اَصۡحٰبُ النَّارِ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ اَنۡ اَفِيۡضُوۡا عَلَيۡنَا﴾[الآیہ] دوزخ والے جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ خدا کے لئے ہمارے اوپر تھوڑا سا جنت کا پانی بہادو، تمہارے پاس باغات ہیں، نہریں ہیں، ہر قسم کی آسائش اور راحت کی نعمتیں ہیں، دیکھو ہم شدّت پیاس کے عالم میں یہاں تڑپ رہے ہیں، لہٰذا مہربانی کرو، ہمیں تھوڑا سا پانی دیدو، یا اس روزی میں سے کچھ دیدو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطاء کی ہے، ہم یہاں بھوک اور پیاس میں نہایت بے تاب ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ نعمتوں میں سے ہمیں بھی کچھ دیدو۔

ایسے جہنمیوں کی حالت تو اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ عذاب میں جل رہے ہوں گے، جب وہ پیاس سے بیتاب ہو جائیں گے تو وہ پانی کی طرف اس طرح دوڑتے ہوئے جائیں گے جس طرح پیاسے اونٹ پانی پر جاتے ہیں، مگر وہ جہنم کا پانی: ﴿لَهُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ﴾[یونس:۴] (ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا)۔ اگر صرف ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتار دیں گے تو وہ آنتوں کو کاٹ کر ٹکڑہ ٹکڑہ کر کے نیچے اتار دے گا۔

اس کے ساتھ کھانے کے لئے تو: ﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ طَعَامُ الۡاَثِيۡمِ﴾[دخان:۴۳] (بیشک زقوم کا درخت گنہگار کا کھانا ہوگا)۔ سورۂ واقعہ میں ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّكُمۡ اَيُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُكَذِّبُوۡنَ لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَيۡهِ مِنَ الۡحَمِيۡمِ فَشٰرِبُوۡنَ شُرۡبَ الۡهِيۡمِ﴾[الواقعة:۵۵] (پھر اے جھٹلانے والے گمراہو! تم لوگوں کو ایک ایسے درخت میں سے کھانا پڑے گا جس کا نام زقوم ہے۔ پھر اسی سے پیٹ بھرنے ہوں گے۔ پھر اس کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی پینا پڑے گا۔ اور پینا بھی اس طرح جیسے پیاس کی بیماری والے اونٹ پیتے ہیں)۔

جہنم کا تھوہڑ نہایت بے پناہ کڑوا ہوگا، اور بہت ہی بد بودار اور مہلک ہوگا۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ بِكَرَمِهٖ. آمين.

دوزخیوں کی فرمائش کے جواب میں اہلِ جنت کا جواب یوں ہوگا:

﴿قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ جنت والے کہیں گے: بلاشبہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں پر، یعنی کافروں پر حرام کردی ہیں۔ جب کافروں پر جنت کی خوشبو تک حرام ہو تو کھانے پینے کی چیزوں کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔

حکایت:

ایک لڑکی نے خواب میں جنت اور دوزخ دیکھی، میدانِ محشر کا منظر دیکھا، آگے بڑھ کر اپنے والد کو جنت میں دیکھا، بڑے خوش و خرم حالت میں، پوچھا: ابا جان! میری والدہ کہاں ہیں؟ والد نے کہا: وہ جہنم میں ہے، وہاں جا کر جب والدہ کو دیکھا تو وہ سخت عذاب میں تھی، والدہ نے بیٹی سے فرمائش کی کہ اپنے والد کے پاس جاؤ، اسے خدا کا واسطہ دے کر میرے لئے تھوڑا سا پانی لے کر آؤ۔ لڑکی والد کے پاس پہنچ کر کہنے لگی: ابا جان! ایک گلاس جنت کا پانی مجھے دے دو، میری والدہ نہایت تباہ کن حالت میں ہے۔ باپ نے کہا: بیٹی یہ جنت کا پانی دوزخیوں پر حرام ہے۔ لڑکی زبردستی گلاس پانی سے بھرا ہوا اٹھا کر بھاگ گئی، ایک فرشتہ نے اس سے گلاس لے کر واپس کیا، اور اسے مُکا مارا، اسی حالت میں خواب سے بیدار ہوگئی، تو اس کا ہاتھ شل اور ناکارہ تھا۔

فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾۔ دوزخی کافروں کا تعارف ہو رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنایا، یا یوں کہو کہ انہوں نے کھیل اور تماشا کو اپنا دین قرار دیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں، اور ان کے برحق دین کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اس کی ایک نظیر یہ ہے: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ﴾ [المطففين: ۳۰] (اور جب ان کے پاس سے گزرتے تھے تو ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتے تھے)۔

جب ایمان والوں کے پاس سے گزرتے تھے، تو ان کا مذاق اڑاتے تھے، اور اشارے کرتے تھے، اور کہتے رہتے تھے: دیکھو! یہ جنت کے وارث اور حوروں کے خاوند جا رہے ہیں، جن کے پاس نہ پہننے کو کپڑا، اور نہ کھانے کو روٹی، اور نہ مکان، نہ سواری، نہ خادم، نہ سرمایہ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو جنت کے وارث کہتے ہیں۔ طرح طرح کے استہزاء اور طعن و تشنیع کیا کرتے تھے۔ اس قسم کے استہزاء منافقین بھی کرتے تھے۔ سورۂ توبہ میں ارشاد

ہے: ﴿قُلْ اَبِاللّٰهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُوْلِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ﴾[التوبة:۶۵] (کہہ دیں: کیا تم اللہ، اس کی آیتوں اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے تھے؟)۔

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بھی مذمت فرمائی ہے، جو کافروں کی طرح دینِ الٰہی، اور پیغمبروں کا مذاق اڑاتے تھے، اور اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنالیا تھا۔ دراصل ان کی بدنصیبی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا، ارشاد فرمایا:

﴿وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ دنیا کی زندگی، اور اس کی نیرنگیوں نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے دنیا کے آرام وآسایش کو ہی اوّل وآخر سمجھ لیا تھا، اور دنیا ہی کو اصلی منزل سمجھ کر مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے، اور زندہ ہونے کو محال جانتے تھے، اور کہتے تھے: بس یہی زندگی اصلی ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ سرورِ عالم ﷺ کی مناجات ہے: اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا وَ لَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا۔ اور دوسری روایت میں یہ زیادتی بھی ہے: وَلَا غَايَةَ رَغْبَتِنَا۔ [ترمذي] اے اللہ تعالیٰ! دنیا ہی کو ہمارا منتہائے مقصود نہ بنادے کہ ہم اس میں مشغول ہو کر آخرت کو بھول جائیں۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دعا نقل کی ہے: اَللّٰهُمَّ صَغِّرِ الدُّنْيَا بِأَعْيُنِنَا وَعَظِّمْ جَلَالَكَ فِی قُلُوْبِنَا وَوَفِّقْنَا لِمَرْضَاتِكَ وَثَبِّتْنَا عَلٰى دِيْنِكَ. [نسائي] زندگی کیا ہے؟ کھانا پینا، رہنا سہنا، پہننا، جائیداد، بیوی، اقتدار، کاروبار وغیرہ۔ یہ سب چار روزہ ہیں۔ یہی چیزیں انسان کو آخرت سے بے گانہ اور غافل کرنے والی ہیں، جو شخص ان چیزوں میں الجھ کر رہ گیا، وہ دھوکہ کھا گیا، وہ دنیا میں شاید چار دن خوش رہے، مگر ابدی سعادتوں سے محروم ہی رہا، اسے جنت کی خوشحالی میسر نہیں آسکے گی۔ مزید بدقسمتی یہ ہوگی جو فرمایا:

﴿فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا﴾ آج کے دن ہم انہیں فراموش کردیں گے، یعنی نظر انداز کریں گے، جس طرح انہوں نے اس قیامت کے دن کو فراموش کیا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتے رہتے تھے: کوئی حساب کتاب نہیں، نہ جنت ہے، نہ دوزخ، مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں، مرنے والوں میں سے آج تک کوئی زندہ نہیں ہوا وغیرہ۔ "نِسیان" کا لفظی معنی بھول جانا، وہ یہاں مراد نہیں ہے، کیونکہ اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر محال ہے۔ اس کا مطلب وہی ہے جو وَهُوَ خَادِعُهُمْ میں بیان ہوا کہ ان کے ساتھ مخادعت اور نسیان والا سلوک ہوگا، یعنی نظر اندازی اور رحمت وعنایت سے دوری اور محرومی۔

﴿وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ﴾ جنت اور رحمتِ الٰہی سے دوری کا دوسرا سبب یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں ہماری

آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے، انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کرتے تھے۔ کافر کے پاس اگر بُرے اعمال کا انبار نہ بھی ہو، اس کے ابدی دوزخی ہونے کے لئے تنہا کفر ہی کافی ہے۔ پھر اتمامِ حجت کے لئے فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ﴾ البتہ تحقیق ہم لائے ہیں، ان کے پاس کتاب، جس میں ہم نے تفصیل بیان کی ہے۔ یہ ایسی مفصل کتاب ہے جس میں عقائدِ حقہ، مبدأ اور معاد، امورِ تکوینیہ، واحکامِ شرعیہ، احقاقِ حق، اِبطالِ باطل، امثال، مواعظ، تذکیراتِ ثلاثہ، دلائلِ عقلیہ ونقلیہ وغیرہ تمام چیزوں کا دلکش وروح پرور انداز سے تفصیلی بیان ہے۔ پھر اندازِ بیان فصاحت وبلاغت کے وہ اصول اور گرانقدر انمول موتیوں سے مرکب ترکیبی جملے جن سے مسائل اور احکام تک ذہنوں کی رسائی، اور غیر منصوص احکام کا استنباط، دلالات واشارات، الغرض جس طرح یہ کتاب اپنی نظم ومبانی کے اعتبار سے بے مثال ہے، اسی طرح مسائل اور احکام کے اعتبار سے مزید لاثانی اور بے مثال ہے۔ یہ ہدایت، رحمت، برکت، موعظت، نور وروشنی والی کتاب ہے۔ ذِكْرىٰ وَهُدًى لِلنَّاسِ وَهُدًى لِلْعٰلَمِيْنَ بھی ہے۔

تفصیل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ نے صاحبِ کتاب رسول اکرم سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ یہ فرضِ منصبی لازم کیا ہوا ہے کہ ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ [النحل:۴۴] یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ وحی کے اغراض ومقاصد، اور تفصیلات کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں، تاکہ کسی کو کسی مسئلہ میں اشتباہ نہ رہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ [القیمۃ:۱۹] یعنی ہمارے ذمہ ہے کہ اس کا ہر حکم آپ کو بیان کر کے سمجھائیں۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ﴾ فرمایا: جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لاتے جو کہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ نازل ہوئی، جس میں ہر چیز کی تفصیل بھی ہے، اور وہ سراسر ہدایت اور رحمت بھی ہے، آخر یہ لوگ کس چیز کے منتظر ہیں؟ کیا وہ اس تاویل کا انتظار کر رہے ہیں؟ تاویل سے مراد عاقبت وانجام، اور اظہار مصداق ہے۔ تو انہیں خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جس دن اس عاقبت وانجام کا بشکلِ عذاب ظہور ہوگا، تو پھر اس روز ندامت وافسوس انہیں کچھ کام نہ آئے گا۔

اس کا مصداق تو یہ ہے کہ قیامت واقع ہو جائے، اور مکذّبین پر عذاب ٹوٹ پڑے، تو کیا یہ لوگ اسی قیامت کے منتظر ہیں؟ کہ وہ برپا ہوگی، تو قرآن پر وہ ایمان لائیں گے؟ مگر یاد رکھو، جس دن اس کا مصداق ظاہر

ہوجائے گا تو جو لوگ اس سے پہلے اسے فراموش کر چکے ہوں گے، وہ اس وقت کہیں گے:

﴿قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ تحقیق ہمارے ربّ کے رسول علیہم السّلام حق بات لے کر آئے تھے۔ تو یہ لوگ اس وقت رسولوں علیہم السّلام اور کتابوں کا اقرار کریں گے، مگر وہ اقرار مفید نہ ہوگا، پھر مایوس ہو کر شفاعت کے طالب ہوں گے، اور کہیں گے:

﴿فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ﴾ کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے جو ہماری سفارش کرے؟ تاکہ ہم کسی طرح بچ جائیں۔ جب کوئی سفارش نہیں ہوگی تو تمنا کریں گے:

﴿اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ﴾ یا ہمیں دنیا میں واپس پلٹا دیا جائے، پس وہ کام نہیں کریں گے جو پہلے کیا کرتے تھے۔ یعنی اگر ہمیں مہلت دی گئی تو اس مرتبہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے رسولوں علیہم السّلام اور کتابوں اور آخرت سب پر ایمان لے آئیں گے، اور کفر و شرک سے بیزار ہوں گے، غیر اللہ کی عبادت اور پرستش نہیں کریں گے، نیکیوں اور اعمالِ صالحہ میں حصہ لیں گے، اہلِ ایمان کا احترام کریں گے، وغیرہ۔

مگر قرآن کریم نے صاف انکار کر دیا کہ نہ تو انہیں واپس دنیا میں دوبارہ بھیجا جائے گا، اور نہ ان کو کوئی سفارش مفید ہوگی۔ تو یہ واضح ہے کہ انبیاء کرام علیہم السّلام، ملائکہ، شہداء، مؤمنین میں سے کوئی بھی کسی مشرک و کافر کے حق میں سفارش نہیں کرے گا، اور نہ وہ قبول ہوگی، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے متعلق گزرا کہ ان کی شفاعت ان کے باپ آزر کے بارے میں قبول نہیں ہوگی، جیسے سورۂ بقرہ میں ﴿وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ [البقرۃ: ۱۲۳] (اس کو کوئی سفارش فائدہ نہیں دے گی) فرما کر اس کی نفی کی۔

رہا دوبارہ دنیا میں واپسی، یہ تو ممکنات میں نہیں، اور قرآن پاک بار بار اس کی نفی کر چکا ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دفعہ ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی، اور آزمائش بھی ایک دفعہ ہوتی ہے، کوئی پاس ہوگا کوئی فیل ہوگا، دوبارہ موقع ملنے کا کوئی قانون نہیں ہے۔ پس جب تمام پردے اٹھ جائیں گے، تو پھر مشرکین سفارش تلاش کریں گے، یا دوبارہ دنیا میں واپس جانے کا مطالبہ کریں گے، مگر ان کی کوئی تمنا پوری نہ ہو سکے گی، اور وہ عذاب میں گر جائیں گے۔

﴿قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾ بلاشبہ انہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا، تباہ کیا، اور جھوٹی باتیں اور جھوٹے وعدے لئے پھرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے شریک تجویز کرتے تھے، اور اپنے معبودانِ باطلہ کو بارگاہِ الٰہی میں شفعاء اور سفارشی قرار دیتے تھے۔ یہ سب ختم ہو کر غائب ہو جائیں گے،

پس ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ﴾[البقرۃ:۱۶] (ان کی تجارت نے نفع نہیں کیا) کا مصداق بنیں گے۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ﴾[الفاطر:۳۷] (کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا وہ اس میں نصیحت حاصل کر لیتا؟ اور تمہارے پاس ڈرانے والے بھی آئے، اب مزا چکھو، ظالم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں)۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حواس بھی دیئے، عقل، شعور، قویٰ، جسم، جان، روح، یہ سب کچھ عطاء کئے، تم اندھے، بہرے، گونگے بن کر بے شمار بے جان مردہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا۔

کچھ بدنصیبوں نے تمہیں دیکھ کر درختوں، قبروں، مزاروں پر جھکنا شروع کیا۔ آج یہی فیصلہ ہے کہ نہ کوئی سفارشی ہوگا، اور نہ دنیا میں واپس جانے کا کوئی قانون ہے، اس لئے ابدالآباد ہمیشہ جہنم تمہارا ٹھکانا رہے گا، لہٰذا تم سمجھ لو تمہارے لئے کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہوگا۔

...... ✿ ...... ✿ ...... ✿ ......

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى
الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ
مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: بیشک تمہارا ربّ اللہ تعالیٰ ہے، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا، پھر عرش پر استواء فرمایا، ڈھانپ دیتا ہے رات سے دن کو، رات اُسے طلب کرتی ہے جلدی سے، اور پیدا فرمایا چاند کو اور سورج کو، اور ستاروں کو، اس حال میں کہ اس کے حکم سے وہ مسخر ہیں، خبردار! پیدا فرمانا، اور حکم دینا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہے، بابرکت ہے وہ ذات پاک جو سارے جہانوں کا ربّ ہے ﴿۵۴﴾

معارف ومنازل

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران ☆ گفتہ آید در حدیث دیگران

عرش عظیم نے سارے جہاں کا احاطہ کیا ہوا ہے، اور جو چیز عرشِ مجید کا احاطہ کئے ہوئے ہے وہ باری تعالیٰ جل شانہ کی توحید ہے۔ جہاں توحید ہو وہاں سب کچھ ہے، جدھر توحید نہ ہو وہاں جہنم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پس موحد

حضرات ہی کائنات کی زینت ہیں، اور خوشنما و معطر پھول ہیں، اور جو توحید سے محروم ہیں وہ کائنات کے کچرے اور سڑی ہوئی مردار لاشیں ہیں، جن کا شمار انسانوں میں نہیں، وہ مردار جانوروں اور کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر ہیں۔

کائنات کی تخلیق اور تسخیر کا بیان:

یہاں سے پھر ایک نئے انداز میں توحیدِ باری تعالیٰ کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظیم مخلوقات اور بے مثال مصنوعات اس کی خالقیت و مالکیت اور قدرتِ کاملہ پر واضح دلائل ہیں۔ دنیا کی معمولی چیزیں کسی بنانے والے پر جب دلالت کرتی ہوں، تو یہ بے مثال عظیم حیران کن کارخانۂ عالم اپنے موجد و خالق کی ہستی و وحدانیت پر کیوں دلالت نہ کرے؟ ؎

فَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ آیَۃٌ ★ تَدُلُّ عَلٰی أَنَّہٗ وَاحِدٌ

کائنات کی یہ عظیم مخلوقات اس کی توحید و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے تو اپنی ربوبیت کا اظہار فرمایا:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ﴾ بیشک تمہارا پروردگار تخلیق کائنات کے سلسلے میں، یہاں صفت ربوبیت کو ذکر فرمایا، کیونکہ عام لوگوں کا فہم صفتِ ربوبیت کو آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی سورت "الفاتحہ" میں بھی اسی صفت کا ذکر ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور آخری سورت "الناس" میں بھی اسی کا تذکرہ ہے: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ اور یہ صفت مختلف انداز میں قرآن حکیم میں نوسو ایک مرتبہ مذکور ہے، جس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔

قرآن کریم میں جب بھی اُلوہیت کا مسئلہ بیان ہوتا ہے، اس کی ابتداء اسی صفت سے ہوتی ہے۔ یہاں صفتِ ربوبیت کے ساتھ "اللہ" اسم جلالہ بھی مذکور ہے۔ خواص اسے سمجھنے کی صحیح صلاحیت رکھتے ہیں جو بڑے خوش قسمت ہیں۔

﴿الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو۔

﴿فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾ چھ دن میں۔ یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا، کیونکہ یہ متعارف و مشہور دن اور رات تو سورج کے طلوع و غروب سے وابستہ ہیں، جب اُس وقت سورج ہی پیدا نہ ہوا تھا تو دن رات کہاں سے ہوتے؟ یا یہ کہا جائے کہ عالمِ شہادت کے دن رات مراد نہیں، بلکہ عالمِ غیب کے دن رات مراد ہیں، جیسے کسی عارف نے فرمایا ہے: ؎

غیب راابرے وآبے دیگرست ☆ آسمان وآفتابے دیگرست

پہلی صورت میں پھر علماء کا اختلاف ہے کہ یہاں چھ دن سے ہمارے چھ دن کی مقدار مراد ہے، یا ہزار برس کا ایک ایک دن (یہ چھ ہزار برس ہوں گے) جیسے دوسرے مقام پر فرمایا ہے: ﴿اِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّكَ كَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ﴾ [الحج:۴۷] (یقیناً تمہارے ربّ کے یہاں کا ایک دن تمہاری گنتی کے مطابق ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے)۔ میرے نزدیک یہ آخری قول راجح ہے۔

بہر حال! مقصود یہ ہوا کہ آسمان وزمین دفعۃً بنا کر نہیں کھڑے کئے گئے۔ شاید پہلے ان کا مادہ پیدا فرمایا، پھر اس کی استعداد کے موافق بتدریج مختلف اشکال وصُور میں منتقل کرتے رہے ہوں، حتی کہ چھ دن (چھ ہزار سال) میں وہ بِجَمِیعِ مُتَعَلِّقَاتِهِمَا موجودہ مرکب شکل میں موجود ہوئے، جیسا کہ آج بھی انسان اور کُل حیوانات ونباتات وغیرہ کی تولید وتخلیق کا سلسلہ تدریجی طور پر جاری ہے۔

اور یہ اس کی شان ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' کے منافی نہیں، کیونکہ ''کُنۡ فَیَکُوۡنُ'' کا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو وجود کے جس درجہ میں لانا چاہے، اس کا ارادہ ہوتے ہی وہ اس درجہ میں آجاتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو وجود کے مختلف مدارج سے گزارنے کا ارادہ نہیں کرتا، بلکہ ہر شئ کو بدونِ توسطِ اَسباب وعِلَل کے دفعۃً موجود کرتا ہے۔ [تفسیر عثمانی]

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ جو حبرُ الامۃ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں، فرماتے ہیں کہ کائنات کو چھ دن میں پیدا کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو تعلیم دینا چاہتا ہے کہ کسی بھی کام کے کرنے اور انجام دہی میں عُجلت اور جلد بازی اختیار نہیں کرنی چاہئے، بلکہ تمام کاموں کو آہستہ آہستہ بتدریج سکون کے ساتھ انجام دیا کریں۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ آہستگی رحمٰن جلّ شانہ کی طرف سے ہے، اور عُجلت شیطان کی طرف سے ہے۔ [مشکوٰۃ]

جو کام جلد بازی میں انجام پائے گا وہ خراب اور ناقص رہے گا۔ دور مت جاؤ، کائنات کا قریب سے مشاہدہ کرو، انسان، حیوانات، اور نباتات کی پیدائش پر غور کرو، انسان کا بچہ نو ماہ میں پیدا ہوتا ہے، حیوانات کے بچے کبھی سال، کبھی دس ماہ، کبھی چھ ماہ، کبھی تین ماہ، اور کتوں کے بچے صرف چالیس روز، بہت سے پرندوں کے بچے ایک ماہ، کبھی بیس روز میں۔ اسی طرح پھل، میوے، سبزیاں، ترکاریاں ودیگر نباتات، ان سب کا پیدا کرنے والا صرف

ربّ العزّت جلّ شانہ ہے۔جو ''كُنْ فَيَكُوْنُ'' کا مالک ہے۔

مگر اس نے اس تکوینی نظام کو تدریجی طور پر کیسا روح پرور اور آہستہ مرتب فرمایا ہے، جس کی حکمتوں کو شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر روزمرہ اور دفعۃً پیدائش کا سلسلہ ہوتا، تو سارا نظام اور سکون وراحت سب درہم برہم ہوکر زندگی عذاب بن جاتی۔ آسمانوں اور زمین کی نیز وَمَا بَيْنَهُمَا کی پیدائش کی تفصیل سورۂ حم سجدہ میں آنے والی ہے۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ پھر عرش پر استواء فرمایا۔ استواء قائم ہونے، قرار پکڑنے کو کہتے ہیں۔ عرش کے معنی تختِ شاہی، جیسے بلقیس ملکہ سبا کے بارے میں ہے: ﴿وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ﴾ [النمل:۲۳] (اور اس کے لیے ایک بڑا تخت ہے) ﴿اَيُّكُمْ يَأْتِيْنِىْ بِعَرْشِهَا﴾ [النمل:۳۸] (تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لائے گا؟) ﴿قَالَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ﴾ [النمل:۴۲] (اس نے کہا: کیا تمہارا تخت ایسا ہی تھا؟)۔

اِسْتَوٰى ماضی کا صیغہ ہے، باب استفعال سے اَلْاِسْتِوَاء اس کا مصدر ہے۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر مختلف معنی میں مستعمل ہے۔ مثلاً:

﴿قُلْ لَا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ﴾ [المائدۃ:۱۰۰] (آپ کہہ دیں: برابر نہیں ہیں ناپاک اور پاکیزہ) برابری کے معنی میں۔ اسی طرح:

﴿لَا يَسْتَوِىْ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ﴾ [الحشر:۲۰] (برابر نہیں ہیں آگ والے اور جنت والے)۔ اسی طرح:

﴿لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ﴾ [الحدید:۱۰] (تم میں جنہوں نے (مکہ کی) فتح سے پہلے خرچ کیا، اور لڑائی لڑی وہ (بعد والوں کے) برابر نہیں ہیں)۔ اسی طرح:

﴿فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى﴾ [النجم:۷] (وہ سیدھا ہوگیا، جبکہ وہ بلند افق پر تھا) سیدھا ہونے کے معنی میں۔ فرمایا:

﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ﴾ [ھود:۴۴] (کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی) ٹھہرنے کے معنی میں، اسی طرح:

﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى﴾ [القصص:۱۴] (اور جب جوانی کو پہنچ گئے، اور سنبھل گئے)۔ سنبھلنے کے معنی میں۔ فرمایا:

﴿لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾[الزخرف:۱۳] (تا کہ تم اس کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ) بیٹھنے،قرار پکڑنے کے معنی میں۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ﴾[البقرۃ:۲۹] (پھر اس نے آسمان کا قصد کیا) قصد کرنے کے معنی میں۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾[طٰہٰ:۵] (رحمٰن نے عرش پر قرار پکڑا) قائم ہونے،قرار پکڑنے اور تمکن کے معنی میں ہے۔واللہ اعلم!

اَلْاِسْتِوَاءُعَلَى الْعَرْشِ ایسا تمکن جو اس کی شان کے مناسب ہو۔یہ بالاتفاق متشابہات میں سے ہے۔ متشابہات کی تفصیل کئی مرتبہ گزر چکی ہے۔اِسْتِوَاء کا ترجمہ اکثر محققین نے تمکن و استقرار،یعنی قرار پکڑنے،اور قائم ہونے سے کیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ تختِ حکومت پر اس طرح قابض ہونا کہ نہ اس کا کوئی حصہ اور کوئی گوشہ حیطۂ اقتدار سے باہر ہو،اور نہ قبضہ و تسلط میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت اور گڑ بڑ ہو۔

غرض سب کام اور انتظام درست اور صحیح ہو۔اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبدأ اور ظاہری صورت ہوتی ہے،اور ایک حقیقت یا غرض و غایت،یعنی ملک پر پورا تسلّط اور اقتدار اور نفوذ و تصرّف کی قدرت حاصل ہونا۔پس ربّ العزّت جلّ شانہ کے اِسْتِوَاءعَلَى الْعَرْش میں یہ حقیقت اور غرض و غایت بدرجۂ کمال موجود ہے کہ تمام مخلوقات اور ساری کائنات پر پورا پورا تسلّط اور اقتدار،اور مالکانہ اور شہنشاہانہ تصرّف و نفوذ، بلا روک ٹوک صرف اسی کو حاصل ہے۔

آیت کریمہ:﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۣ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ﴾ پھر قرار پکڑا عرش پر،اُڑھاتا ہے رات پر دن کو کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے،دوڑتا ہوا،اور آفتاب،ماہتاب اور ستارے سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔اور آیت کریمہ:﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ﴾[یونس:۳] (پھر قائم ہوا عرش پر،وہ تدبیر کرتا ہے کام کی،کوئی سفارش نہیں کرسکتا مگر اس کی اجازت کے بعد) سے بخوبی اس مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔

رہا ''اِسْتِوَاءعَلَى الْعَرْش'' کا مبدأ،اس کی ظاہری صورت و کیفیت،پس دیگر صفات سمع و بصر کی طرح یقیناً اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی کہ اس میں مخلوق کی صفت اور حدوث کا ذرا سا بھی شائبہ ہو،پھر وہ کیونکر ہے؟ اور کس طرح ہے؟ تو اس کی کیفیت کے لئے اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے کہ:﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾[الشوریٰ:۱۱]

(نہیں ہے اس سا کوئی)۔ ہمارا کیا مایۂ علمی کہ اس کی کیفیت بیان کرسکیں؟ ﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ﴾۔ [البقرة:۲۵۵] (اللہ جانتا ہے جو لوگوں کے آگے ہے، اور جو ان کے پیچھے ہے، اور لوگ احاطہ نہیں کرسکتے اللہ کے علم میں سے کسی بھی چیز پر)۔

وہ تو جو کچھ لوگوں کے آگے پیچھے ہے سب جانتا ہے، مگر لوگ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ ﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾[طٰه:۱۱۰] (اور وہ اس کے علم کا احاطہ نہیں کرسکتے)۔

امّ المؤمنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”اَلْاِسْتِوَاءُ غَیْرُ مَجْهُوْلٍ وَالْکَیْفُ غَیْرُ مَعْقُوْلٍ وَالْاِقْرَارُ بِهٖ اِیْمَانٌ وَالْجُحُوْدُ بِهٖ کُفْرٌ“۔[روح المعاني، فتح البیان بحواله ابن مردویة والأکائي في کتاب السنة۔لغات القرآن]۔ اِستواء معلوم ہے، اور اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی، اس کا اقرار ایمان ہے، اور انکار کفر ہے۔

قاضی ابو العلاء صاعد بن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاعتقاد میں حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے: ”لَایَنْبَغِیْ لِأَحَدٍأَن یَّنْطِقَ فِی اللّٰهِ تَعَالٰی بِشَیْءٍ مِن ذَاتِهٖ وَلٰکِن یَصِفُهُ بِمَا وَصَفَ سُبْحَانَه وتَعَالٰی بِهٖ نَفْسَهُ وَلَا یَقُوْلُ فِیْهِ بِرَأْیِهٖ شَیْئًا تَبَارَکَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ“۔[روح المعاني] یعنی کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کی ذات کے متعلق ذرا بھی زبان کھولے، بلکہ اسی طرح بیان کرے جس طرح کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمایا ہے، اپنی رائے سے کچھ نہ کہے، بڑی برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو ربّ ہے سارے جہانوں کا، اس کی ذات، اس کی صفات بے انتہاء بلند ہیں، جیسے فرمایا: ؎

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ☆ وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم

دفتر تمام گشت وبپایان رسید وعمر ☆ ماہمچنان در اوّل وصف تو ماندہ ایم

خلاصہ:

اس بارے میں حضرات سلف صالحین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم سے جو بات منقول ہے وہ یہ ہے کہ انسانی عقل اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات کو پوری طرح سمجھنے اور احاطہ کرنے سے عاجز ہے، لہٰذا جو کچھ فرمایا ہے ان سب پر ایمان لائیں، اور سمجھنے کے لئے کوئی کھوج وکرید نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں میں غور وفکر درست اور صحیح ہے، لیکن ذات وصفات میں، اسی طرح تقدیر کی گہرائیوں میں غور وفکر مفید نہیں ہوگا۔ یہی مسلک بے غبار اور صحیح و

مفید ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اِسْتِوَاءعلَی الْعَرْش کا معنیٰ پوچھا، توان کو پسینہ آگیا، اور تھوڑی دیر سر جھکانے کے بعد فرمایا: استواء کا معنیٰ تو معلوم ہے، اور اس کی کیفیت سمجھ سے بالاتر ہے، اور ایمان اس پر لانا واجب ہے، اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ پھر سائل سے فرمایا کہ میرے خیال میں تو گمراہ آدمی ہے۔ اس کے بعد اُسے اپنی مجلس سے نکلوادیا۔ [معالم] اس بارے میں سوال کرنے کو بدعت اس لئے فرمایا کہ جو چیز سمجھ سے بالا ہو، اس کی حقیقت تک عقل کی رسائی نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ اس کے متعلق سوال کرنا سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بہت سی آیات متشابہات تھیں، لیکن انہوں نے سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے بارے میں کیفیت اور حقیقت سمجھنے کے لئے کوئی سوال نہیں کیا، اور آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان متشابہات کی وضاحت نہیں فرمائی۔

تو مسئلہ یہ ہے کہ متشابہات پر بغیر چون وچرا کے اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے۔ کَمَامَرَّ۔ فرمایا:

﴿یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ ڈھانپ دیتا ہے رات کو دن پر۔ سورۂ زُمر میں یوں ارشاد فرمایا: ﴿یُکَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُکَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ﴾ [الزمر: ۵] (وہ رات کو دن پر لپیٹ دیتا ہے، اور دن کو رات پر لپیٹ دیتا ہے)۔ ایک کے جانے کے ساتھ دوسرا دوڑتا ہوا بغیر کسی وقفہ کے فوراً موجود ہوتا ہے۔

﴿یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا﴾ یعنی رات جلدی جلدی چل کر دن کو طلب کرتی ہے۔ (فوراً ساتھ لے آتی ہے، بغیر کسی توقف کے) دن آناً فآناً گزرتا ہوا معلوم ہوتا ہے، یہاں تک کہ رات فوراً اس کے جانے کے ساتھ بلا توقف آجاتی ہے، اور دن ختم ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح رات دن پر چھا جاتی ہے اسی طرح پھر دن رات پر مسلط ہو جاتا ہے، اسی طرح شب وروز کی بھاگ دوڑ جاری رہتی ہے۔

﴿وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ نے سورج اور چاند اور ستاروں کو بھی کمال قدرت سے پیدا فرمایا۔ یہ سارے نشاناتِ قدرت اور توحید کے روشن دلائل میں سے ہیں۔ سورج جو تیرہ لاکھ مرتبہ زمین سے بڑا ہے اس میں تیز روشنی اور حرارت پیدا کی ہے، جس سے پوری کائنات استفادہ کرتی ہے۔ چاند کی اپنی شان ہے، وہ مدہم اور خوشنما بغیر حرارت کے روشنی پیدا کرتا ہے۔ ستاروں، سیاروں میں الگ الگ فوائد اور خاصیت رکھی ہے۔ سبع سیارات کے باقی پانچ ارکان میں سے زحل کی روشنی نیلگوں ہوتی ہے، مشتری کی روشنی خاکستری مائل ہے۔ مریخ آگ

کے شعلے کی طرح سرخ ہے۔عطارد کی روشنی زردی مائل ہے۔اور زہرہ میں خاص قسم کی تیز چمک ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا جدا رنگ، جدا خاصیت، جدا جسم، جدا کیفیت، اور الگ رفتار مقرر فرمائی ہے۔ باقی سیارے بھی مختلف مادوں سے بنے ہوئے ہیں۔

امریکی خلاباز قریب ترین سیارہ چاند کی سطح سے جو مٹی لائے تھے، اس پر سائنسدانوں نے تجربات کئے، اس میں بھی زمین والی نشوونما کی خاصیت پائی جاتی ہے، تاہم زمین کے عناصر چاند کی نسبت زیادہ کثیف ہیں، اور فلکیات کے عناصر لطیف ہیں۔

آج سے نصف صدی پہلے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پہلا امریکی خلاباز مصر کے دارالحکومت قاہرہ کے دورہ کے موقع پر مسلمان ہو چکا ہے، اس نے چاند کی سطح پر مسلسل پانچ وقت آذان کی آواز سنی، اور حیران رہا کہ یہ کیا آواز ہے۔ واپسی کے بعد جب مصر آیا، اور آذان کی آواز سنی، اور پوچھنے پر اسے بتایا گیا کہ یہ آذان پانچ وقت نمازوں کے لئے ہے تو اس کو اسلام کی حقانیت کا یقین آ گیا، اس پر اس نے اسلام قبول کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم ہے کہ اس نے چاند پر آذان کا نظام جاری کیا ہوا ہے، تا کہ دنیا کو معلوم ہو کہ اسلام کا نظام آفاقی اور ہمہ گیر ہے۔

﴿مُسَخَّرٰتٍ م بِأَمْرِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع اور مسخر ہیں۔ جس فلک اور جس مدار میں، اور جس چال کے ساتھ انہیں مسخر کیا ہوا ہے، شب وروز اپنی رفتار کے ساتھ بغیر کسی توقف کے ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [الأنبياء: ۳۳] (سب اپنے مدار میں رواں دواں چل رہے ہیں) مجال نہیں کہ ان کے اس عالمی اور ہمہ گیر نظام میں کوئی گڑبڑ ہو، یا وہ آپس میں ٹکرائیں، یا اپنے مدار سے سرک جائیں، یا کوئی تبدیلی پیدا کریں۔

ہزاروں لاکھوں سال گزر گئے، مگر وہ کبھی اِدھر اُدھر اپنے نظام سے ہرگز نہیں ہٹے۔ بغیر ایندھن، بغیر انجن، بغیر آلہ واسباب کے یہ نظام کامل جاری ہے، فرمایا:

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ خبردار! اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے پیدا فرمانا، اور حکم دینا، اور تکوینی نظام چلانا۔ یہ دونوں صفات اسی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہیں، کائنات کے ہر ذرہ پر اس کا احسان ہے کہ اسے تخلیق فرمایا، اور اپنے حکم اور امر کے ساتھ اسے تحفظ دیا، اور باقی رکھا۔

﴿تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ برکت والا ہے، برتر ہے، عظمت والا ہے، ہر عیب سے پاک ہے، واحد لاشریک، اکیلا یگانہ ہے، وہ اپنی صفاتِ عالیہ سے متصف ہے، ازلی ابدی ہے، سارے جہانوں کا ربّ ہے، لہٰذا:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

ترجمہ: تم اپنے ربّ کو پکارو عاجزی کے ساتھ، اور چپکے چپکے، بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان کو ناپسند فرماتا ہے جو حد سے آگے بڑھنے والے ہیں ۝ اور فساد نہ کرو زمین میں، اس کی اصلاح کے بعد، اور پکارو اپنے ربّ کو ڈرتے ہوئے، اور اُمید رکھتے ہوئے، بیشک اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی رحمت اچھے کام کرنے والوں سے قریب ہے ۝

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ شانہ کی خالقیت اور حاکمیت بیان فرمانے کے بعد حکم فرمایا کہ تم اپنے معاملات اور تمام حاجات میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو، اور اسے ہر وقت پکارو، اور دعاء میں ہر قسم کی ظاہری وباطنی تضرّع وعاجزی اختیار کرو۔

طریقِ دعاء اور آدابِ دعاء:

اس آیت میں صراحۃً دو امر بیان ہوئے ہیں: ایک تَضَرُّعًا۔ بتادیا ہے کہ دعاء عاجزی اور فروتنی کے ساتھ ہو، اور آہستہ آہستہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور تجاوز کی مد میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جو عادۃً یا شرعاً محال ہوں، جن کو کوئی مانگے، یا معاصی اور لغو چیزیں طلب کرے، یا کوئی ایسا سوال کرے جو اس کی شان کے مناسب نہ ہو، اور ایسے مقام پر جہاں شرعاً ثابت نہیں۔ بلند آواز سے ذکر اور دعا کرے، یہ سب امور اِعْتِدَاء فِی الدُّعاء میں داخل ہیں، جن سے اجتناب ضروری ہے۔

معلوم ہوا کہ دعاء میں اخفاء بنسبتِ جہر کے اولیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ [مریم:۳] (یعنی انہوں نے اپنے پروردگار کو آہستہ اور چپکے سے پکارا)۔ حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آمین دعا ہے۔ [بخاري] اور سب کو معلوم ہے کہ دعاء میں اخفاء بہتر ہے۔ اس لئے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز میں آہستہ آمین کہنا بہتر ہے۔ اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی مذہب ہے کہ دعاء اخفاء کے ساتھ ہو۔

آہستہ دعاء کے فوائد:

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ آہستہ دعاء کرنے کے بارے میں دس فوائد اور حکمتیں بیان کرتے ہیں، جن کا مختصر

خلاصہ یہ ہے:

(۱) آہستہ دعاء کرنا ایمان کی بڑی عظمت ہے۔(۲) اس سے ادب کا بہت بڑا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔(۳) عاجزی اور خشوع میں اس کا بڑا دخل ہوتا ہے۔(۴) اخلاص میں اس کا بہت بڑا دخل ہے۔(۵) اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے جمعیتِ قلب ہوتی ہے۔(۶) آہستہ دعاء میں قربِ الٰہی کا صحیح تصور ہوتا ہے۔(۷) یہ دوام طلب کی طرف داعی ہوتا ہے۔(۸) یہ خشوع قطع کرنے والے اسباب سے بعید تر ہے۔(۹) حاسد کے مکر سے بعید تر ہے (یعنی شیطانی مکر)۔(۱۰) دعاء چونکہ ذکر ہے، اور اذکار میں اخفاء اولیٰ ہے۔[بدائع الفوائد]

دعاء کی حقیقت:

حدیث پاک میں ارشاد ہے: اَلدُّعَاءُ مُخ العِبَادَةِ۔ دوسری روایت میں یوں ہے: اَلدُّعَاءُهُوَ الْعِبَادَةُ۔ دعاء عبادت کا مغز اور اس کا خلاصہ ہے، اور دعاء عین عبادت ہے۔ جو دعاء کا التزام کرتا ہے سمجھو اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ دعاء کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بہت ہی پسند کرتا ہے، کیونکہ دعاء کرنے والا اپنا عجز، انکساری اور احتیاج کو اللہ کے حضور پیش کر کے یہ اقرار کرتا ہے کہ میرا مالک وخالق اور قادر مطلق میری درخواست سنتا ہے، اور میری دعا قبول کرتا ہے۔

اس میں توحید باری تعالیٰ کے اعتراف واقرار کے ساتھ اپنی بندگی کا اظہار بھی ہے، اور ربّ العزّت سبحانہ کی عظمت وکبریا کا اعتراف بھی ہے۔ اسی کو فرمایا: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ﴾ [غافر: ۶۰] (مجھ سے دعاء کیا کرو، میں قبول کروں گا، جو اللہ تعالیٰ کے سامنے دعاء کرنے سے تکبر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کر کے جہنم میں داخل کرے گا)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پکارنا، اور اس کے سامنے دست سوال دراز کرنا اور مانگنا عین ایمان اور عین عبادت ہے۔ فرمایا: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾ [البقرۃ:۱۸۶] (اور جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے پوچھیں تو بیشک میں نزدیک ہوں) بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا تھا: یارسول اللہ! کیا ہمارا ربّ قریب ہے تاکہ ہم اس سے مناجات وسرگوشی کریں، یا دور ہیں جسے ہم زور سے پکاریں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[درمنثور]

صحیح بخاری میں ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي

بِی وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي وَتَحَرَّكَتْ بِي شَفَتَاهُ۔ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں، وہ میرے بارے میں جوگمان کرلے، اور میں اپنے بندہ کے ساتھ ہوں، جب وہ مجھے یاد کرے، اور جب اس کے ہونٹ میری یاد میں حرکت کرتے ہوں۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ تمہارا ربّ تم سے اس سے بھی زیادہ قریب ہے جتنی تمہاری سواری والی اونٹنی کی گردن تم سے قریب ہے۔ [مشکوٰۃ] ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ [الحدید:۴] (وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو)۔

پس جب اللہ تعالیٰ شانہ بندوں سے اس قدر قریب ہے تو دعاء میں چیخنے اور زور زور سے پکارنے کی ضرورت نہیں، آہستہ دعاء کریں، دل لگا کر کریں۔ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ غزوۂ خیبر اور دوسرے مواقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بلند آواز سے ذکر کیا، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِرْبَعُوا عَلٰی أَنْفُسِكُمْ إِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلَا غَائِبًا۔ [متفق علیہ] اپنے نفسوں پر نرمی کرو، مت چیخو، تم کسی ایسی ہستی کو نہیں پکار رہے ہو جو معاذ اللہ بہری ہو، یا غائب ہو، بلکہ تم سمیع وبصیر اور قریب ہستی کو پکار رہے ہو، لہٰذا ادب اور احترام اسی میں ہے کہ نہایت پستی اور اخفاء کی عادت سیکھو۔ دعاء اور ذکر کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آہستہ آہستہ، اور پوشیدہ طور پر ہونا چاہئے۔ قرآن وسنت میں اس کی صراحت موجود ہے، اور علماء کا اس پر اتفاق ہے۔

مخصوص حالات میں جہری ذکر لازم ہے:

کچھ حالات ومواقع ایسے ہیں جہاں ذکر بالجہر ضروری ہے، مثلاً آذان، صلوات خمسہ وغیرہ، اور اقامت۔ اسی طرح ایامِ تشریق کی تکبیرات، حج اور عمرہ کا تلبیہ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ۔ امام تین نمازوں میں قراءت بالجہر کرے، اور دو نمازوں میں آہستہ۔ امام نماز باجماعت میں ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہو کر تکبیر بالجہر کہتا ہے، اگر امام سے سہو ہو جائے تو مقتدی بلند آواز سے سُبْحَانَ اللهِ کہہ دے۔ قرآن کریم کی تلاوت کا بھی یہی حکم ہے کہ تعلیم میں جہر کے ساتھ ہو، اور بغیر تعلیم آہستہ پڑھنا بہتر رہے گا۔ سورۂ اعراف کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ [الأعراف:۲۰۵] (اور یاد کرتا رہ اپنے ربّ کو اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا، ڈرتا ہوا، اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو)۔ [شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ]

بہرحال! دعا ہو یا ذکر سوائے چند مخصوص جگہوں کے کہ جہاں جہر ضروری ہو دیگر عام حالات میں میانہ روی اور اعتدال بہتر ہے۔ بہت جہر بھی نہ ہو، بہت اخفاء بھی نہ ہو۔ تلفظ میں اعتدال ہو کہ خود جو کچھ پڑھ رہا ہے اسے کم از کم

سنے کہ میں کیا کچھ پڑھ رہا ہوں۔ چونکہ ذکر لسانی بھی ہے اور قلبی بھی، لہٰذا دعاء اور ذکر میں فرق کرنا ضروری ہے، کیونکہ دعاء صرف لسانی ہوتی ہے قلبی نہیں ہوتی۔ سورت بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا …﴾ [الإسراء:١١٠] (تم اپنی نماز نہ بہت اونچی آواز سے پڑھو، اور نہ بہت پست آواز سے، بلکہ ان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ اختیار کرو)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یہ دعاء کے بارے میں ہے۔ [بخاري]

مسند ابویعلیٰ میں امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مخفی اور سرّی ذکر جہری ذکر سے ستر (۷۰) مرتبہ زیادہ افضل ہے۔ فرمایا: قیامت والے دن ایک شخص حساب وکتاب کے لئے پیش ہوگا، اللہ تعالیٰ اعمال لکھنے والے اور نگرانی کرنے والے فرشتوں سے فرمائیں گے کہ اس شخص کا اگر اور کوئی عمل ہے تو حاضر کرو، فرشتے عرض کریں گے: باری تعالیٰ جل جلالہ! اس کا کوئی عمل باقی نہیں، ہم نے تمام اعمال جو لکھے تھے پیش کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ فرمائے گا: اے فرشتو! اس شخص کا ایک عمل ایسا بھی ہے جسے تم نہیں جانتے، اسے میں جانتا ہوں، یہ اس کا قلب و روح کے ساتھ ذکر ہے، جو تم نے نہیں لکھا، مگر میرے علم میں ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ بے شک اللہ تعالیٰ شانہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ذکر کرتے وقت چیخنا چلانا، شور کرنا، یا غلط چیز مانگنا، ناجائز چیز طلب کرنا، جو چیز ممکن نہ ہو اسے طلب کرنا، یہ سب تعدی میں داخل ہے۔

اس آیت کے عموم میں تمام اعمال میں حد سے تجاوز، اعتداء اور اسراف ممنوع قرار پایا۔ یہ اعتداء دعاء میں ہوتا ہے، جس سے بچنا ضروری ہے۔ حضرات مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے دعاء میں اعتداء کی مثال یہ لکھی ہے۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو یوں دعا کرتے ہوئے سنا: اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ الْقَصْرَ الْأَبْيَضَ عَنْ يَمِينِ الْجَنَّةِ۔ اے اللہ تعالیٰ! میں آپ سے جنت کی دائیں جانب سفید محل کا سوال کرتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے بیٹا! تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کر، اور دوزخ سے پناہ مانگ (اپنی طرف سے سفید محل تجویز نہ کر) میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عنقریب اس اُمت میں ایسے لوگ ہوں گے جو طہور، وضو، غسل وغیر میں اور دعاء میں اعتداء (زیادتی) کریں گے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو حدودِ شرعیہ سے آگے بڑھ جاتے ہیں اس کی ممانعت بھی آیت کریمہ کے

عمومِ الفاظ میں داخل ہے۔ نیکی تو بہت بڑی چیز ہے، لیکن شرعًا اس کی بھی حدود مقرر ہیں، کوئی شخص راتوں رات نماز پڑھے، اپنی بیوی اور مہمانوں کی خبر نہ لے، یا رات دن ذکر وتلاوت میں لگا رہے، اور بیوی بچوں کی معاش کے لئے فکر مند نہ ہو، اور ان کے لئے اتنی روزی نہ کمائے جس سے واجبات ادا ہوں، یہ بھی اعتداء ہے۔

﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو۔ اس سے زمین کی ظاہری اصلاح اور باطنی اصلاح دونوں مراد ہو سکتی ہیں۔ ظاہری اصلاح تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بارش برسا دی، درخت نکال دیئے، کھیتی اگا دی، اور اس میں طرح طرح کے فوائد رکھ دیئے، اس کو خراب نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا فرمودہ چیزوں کو نہ اُجاڑ دو۔ اور ان سے انتفاع کی جائز صورتیں ہیں، ان میں رخنہ پیدا نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو ان سے منتفع ہونے دو۔

اور باطنی اصلاح اگر اس سے مراد لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیجا، اور کتابیں نازل فرمائیں، دلائل سے حق کو واضح فرمایا، اعمالِ صالحہ کا حکم دیا، اور بُرے کاموں سے منع فرمایا، لوگوں نے کثیر تعداد میں ایمان قبول کیا، اور اسلامی معاشرہ قائم کیا، اور ایک پاکیزہ ماحول تیار ہوا، اب اس سدھار اور اسلامی پاکیزہ معاشرہ کو خراب نہ کرو، ہدایت کی راہ اختیار کرو، اسی پر خود رہو، اور دوسروں کو اسی پر رہنے دو۔

مذکورہ بالا آیات سے چند آداب معلوم ہوئے:

☆ اوّل یہ کہ خفیہ طور پر دعا کرو۔ ☆ دوئم یہ کہ ڈرتے ہوئے دعا مانگو کہ ممکن ہے قبول نہ ہو۔ ☆ سوئم یہ کہ پختہ اُمید کرتے ہوئے دعا مانگو۔ ☆ چہارم یہ کہ ادب وطہارت کے ساتھ دعا مانگو۔ ☆ پنجم یہ کہ دعاء میں اعتداء اور زیادتی نہ کرو۔ ☆ ششم یہ کہ ہمیشہ بغیر کسی انقطاع کے یہ سلسلہ جاری رکھو۔ ☆ ہفتم یہ کہ زمین میں فساد نہ کرو۔ یعنی معاصی سے اجتناب کرو، جو کہ فساد کی جڑ ہیں۔

﴿وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ اللہ تعالیٰ کو خوف اور اُمید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پکارو، کیونکہ ایمان خوف ورجاء دنوں کے ساتھ قائم ہے۔ دوسرے مقام پر انہی نیک بندوں کی تعریف ہے۔ فرمایا: ﴿وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا﴾ [الأنبياء: ٩٠] (وہ ہمیں پکارتے ہیں، ہماری نعمتوں کی طرف رغبت کرتے ہوئے، اور ہماری گرفت سے ڈرتے ہوئے) یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ پس جن لوگوں میں یہ صفات موجود ہوں، ان کا شمار محسنین میں ہوگا۔ پس ان کے بارے میں فرمایا:

﴿اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہوتی ہے، جو کوئی شرک سے تائب ہوگا، اعمالِ صالحہ کو بجالائے گا، معاصی سے پرہیز کرے گا، احکامِ الٰہی کا مکمل پابند ہوگا، تو وہ محسن ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے قریب ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اُسے شامل حال رہے گی۔

وَهُوَ الَّذِىۡ يُرۡسِلُ الرِّيٰحَ بُشۡرًاۢ بَيۡنَ يَدَىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰى لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۵۷﴾ وَالۡبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخۡرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذۡنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِىۡ خَبُثَ لَا يَخۡرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: اور وہ ہی ذات ہے جو چلاتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے والی، اس کی بارانِ رحمت سے پہلے، یہاں تک کہ جب وہ اٹھاتی ہیں بوجھل بادلوں کو تو ہم چلاتے ہیں اس کو مردہ شہر (خشک بستی) کی طرف، پس ہم اتارتے ہیں اس سے پانی، پھر ہم نکالتے ہیں اس پانی کے ساتھ ہر قسم کے پھل، اسی طرح ہم زندہ کریں گے مُردوں کو تاکہ تم نصیحت پکڑو ﴿۵۷﴾ اور جو شہر پاکیزہ ہوتا ہے نکلتے ہیں اس کے پودے، اپنے ربّ کے حکم سے، اور جو خراب ہوتا ہے نہیں نکلتے اس کے پودے، مگر ناقص، اسی طریقے سے ہم پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں آیتوں کو، ان لوگوں کے لئے جو شکر ادا کرتے ہیں ﴿۵۸﴾

معارف ومنازل

پچھلی آیات میں ان نعمتوں کا ذکر تھا جو عالمِ علوی سے متعلق ہیں، درمیان میں عجز وانکساری، اور تضرّع و عاجزی کے ساتھ دعاء، اور رازِ کار کا بیان ہوا، جو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحقاق، اور حقدار ہونے کے اسباب ہیں۔

اب اُن آیات میں ان نعمتوں کا بیان ہے جو عالمِ سفلی سے متعلق ہیں۔

اُن آیاتِ کریمہ میں بہت سی ایسی چیزوں کی نشاندہی فرمائی، جو توحیدِ باری تعالیٰ کے لئے واضح دلائل اور علامات ہیں، مثلاً ہواؤں کو ترتیب دے کر ایک خاص انداز ہ اور مخصوص رفتار کے ساتھ بھیجنا، پھر انہی ہواؤں کے ذریعہ بادلوں کو جہاں جہاں ضرورت ہو وہاں تک پہنچانا، سمندر کی لہروں سے بادلوں کو پیدا کرنا، اور ان میں پانی جمع کرنا، زمین کے مختلف حصوں پر بارش برسانا، اور بارش کے ذریعہ مردہ اور خشک زمین کو زندہ کرنا، اور سرسبز وشاداب

کرنا، ہر قسم کے درخت، سبزہ، غلّہ، گھاس، پھل، پھول، میوہ، طرح طرح کی ہزاروں قسم کی غذائی اشیاء پیدا کرنا، یہ ساری چیزیں ربّ العزّت سبحانہ نے تمہارے لئے بلا قیمت مُفت پیدا فرمائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بارش بادلوں سے برستی ہے، جیسا کہ مشاہدہ ہے، پس جن آیات میں آسمان سے بارش برسنا مذکور ہے وہاں بھی لفظِ سماء سے بادل مراد ہے۔ اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ براہِ راست آسمان سے بارش کا نزول ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ بارش میں آسمان کے پانی کا بھی تعلق ہے، مثلاً: آبِ زمزم شریف میں اگر دوسرا پانی شامل کریں تو سارا متبرک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بارش کے پانی میں آسمان کا پانی شامل کیا جاتا ہے تاکہ برکت ہو جائے۔ اس بارے میں حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی قدس سرّہٗ فرماتے ہیں کہ اگر بارش میں آسمانی پانی شامل نہ ہوتا تو جتنی بھی بارشیں ہوتیں زمین سے کوئی چیز نہ اُگتی۔ [عزیزی]

دوسری بات یعنی اگر یہ تسلیم ہو کہ بارش صرف بادل سے ہوتی ہے تو کیا یہ خود بخود برستی ہے، یا اُسے کوئی حکم دیتا ہے؟ اور یہ چیز ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ بعض اوقات کئی گھنٹے، اور کئی دن بادل موجود ہوتے ہیں مگر بارش نہیں برستی، اور اگر برستی ہے رُکتی نہیں۔ اور پھر کسی کی مرضی کی جگہ پر نہیں برستی، بلکہ جہاں اُسے حکم ہوتا ہے وہاں برستی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں بادل محض علامت ہے (تاکہ لوگ ہوشیار اور بیدار ہوں، اپنے ساز و سامان کی حفاظت کی کوئی تدبیر کریں) اور اسے چلانے والی، حکم دینے والی کوئی مخفی طاقت ہے، جس کی مرضی اور حکم پر بادل نمودار ہو کر برسنے اور نہ برسنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ زمین میں جتنے کام ہوتے ہیں، ان کا صدر دفتر سدرۃ المنتہیٰ پر ہے، وہیں سے سارے احکامات جاری ہوتے ہیں۔ اور بسا اوقات لوگوں کی بدعملی، اور گناہوں، نیز فریضۂ زکوٰۃ وعُشر کی عدمِ ادائیگی کی وجہ سے بارش کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔ [ترمذي]

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نسلِ انسانی کے لئے مرد و عورت دونوں کا اختلاط ضروری ہے، تنہا مرد اور تنہا عورت کافی نہیں، اسی طرح آسمان و زمین میں میاں بیوی جیسا تعلق ہے، آسمان نے پانی برسایا، زمین نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا، ان دونوں کے اختلاط سے ہزاروں قسم کے ثمرات، پھل فروٹ، فواکہ، سبزی، ترکاری، غلّہ، گیہوں پیدا ہو گئے۔ یہی ان کی نسل کہلاتی ہے۔ [احیاء العلوم]

﴿وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ وہی ذات پاک، قادر مطلق ہے کہ

ہواؤں کو بھیجتا ہے، جو اس کی رحمت یعنی بارش سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عام عادۃُ اللہ یہ ہے کہ بارش سے پہلے ایسی ٹھنڈی ہوائیں بھیجتے ہیں جن سے خود بھی انسان کو راحت و بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ گویا آنے والی بارش کی خبر و مژدہ پہلے دیدیتی ہیں۔ اس لئے یہ ہوائیں دو چیزوں یعنی دو نعمتوں کا مجموعہ ہیں: خود بھی انسان اور عام مخلوقات کے لئے نافع و مفید ہیں، اور بارش کے آنے سے پہلے بارش کی خوشخبری دیدیتی ہیں، تاکہ انسان اپنی جان و مال اور سامان کی حفاظت و تحفظ کر سکے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا﴾ یعنی وہ ہوائیں جب بھاری بادلوں کو اٹھالیتی ہیں۔ بھاری بادلوں سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادل ہیں، جو ہوا کے کاندھوں پر سوار ہو کر اوپر جاتے ہیں، اور اس طرح ہزاروں لاکھوں وزن کا پانی ہوا پر سوار ہو کر اوپر پہنچ جاتا ہے۔ اور حیرت انگیز بات ہے کہ نہ اس میں کوئی مشین کام کرتی ہے، نہ کوئی انسانی محنت اس میں شامل ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو جاتا ہے تو خود بخود دریا سے بخارات (مان سون) اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں، اور اوپر جا کر بادل بنتا ہے۔ اور یہ لاکھوں گیلن پانی سے بھرا ہوا جہاز خود بخود ہوا کے دوش پر سوار ہو کر آسمان کی طرف چڑھتا ہے، پھر جہاں بارش برسانا مقصود ہو وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پانی برساتے ہیں۔ فرمایا:

﴿سُقۡنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ﴾ کہ جب ہواؤں نے بھاری بادلوں کو اٹھالیا، تو ہم نے ان بادلوں کو ہانک دیا، یعنی چلا دیا ایک مرے ہوئے خشک شہر کی طرف، مرے ہوئے شہر سے مراد وہ بستی ہے جو پانی نہ ہونے کے سبب ویران ہو رہی ہے۔ اس جگہ بجائے عام زمین کے خصوصیت سے شہر اور بستی کا ذکر کرنا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اصل مقصد برق و باران، اور ان سے زمین کی سیرابی کا انسان کی ضروریات مہیا کرنا ہے، جس کا مسکن شہر ہے۔

﴿فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ﴾ پھر ہم نے اس کے ذریعہ اپنی حکمت و مصلحت کے تحت بندوں اور جانوروں کی فلاح و آبادی کی خاطر ہواؤں کو چلا کر بادلوں کو ہانک دیا، وہاں جہاں ضرورت ہو پانی نازل کرتے ہیں تاکہ خشک زمین سیراب ہو کر:

﴿فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ ہم پانی کے ذریعہ ہر قسم کے پھل و میوہ پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿لِنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا وَّجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا﴾ [النبأ: ۱۶] (تاکہ اس کے ذریعہ غلہ، سبزیاں اور گھنے باغات پیدا کریں)۔ فرمایا: ﴿وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ﴾ [الأنبیاء: ۳۰] یعنی ہر چیز کی حیات اور نشو و نما

کا انحصار پانی پر ہے۔ تمام جاندار، انسان حیوانات، بلکہ نباتات وحشرات الارض تک کی مخلوقات کی حیات پانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ پھر فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ کہ ہم اسی طرح مردوں کو قبروں سے نکال کر زندہ کریں گے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے مردہ زمین کو زندہ کیا، اور اُس سے غلہ، درخت، پھل اور پھول نکالے، اسی طرح قیامت کے دن مردوں کو زمین سے نکال کر زندہ کریں گے۔ سورۂ حٰم سجدہ میں فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰيَاتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [حٰم سجدۃ: ۳۰] (اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ وہ دبی ہوئی ہے، پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر پانی تو وہ لہلہانے لگتی ہے، اور بڑھنے لگتی ہے، بلاشبہ جس نے اس کو زندہ فرمایا، وہ مردوں کو زندہ کردے گا، بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں صُور دو مرتبہ پھونکا جائے گا: پہلے صُور پر تمام عالم فنا ہو جائے گا، کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، اور دوسرے صُور پر دوبارہ ازسرِنو نیا عالم پیدا ہوگا، اور سب مردے زندہ ہو جائیں گے۔ حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ دونوں صُور کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا، اور ان چالیس سالوں میں عرشِ عظیم سے مسلسل بارش ہوتی رہے گی، اور یہ پانی ماءُ الحَیاۃ کہلائے گا، جس کا نزول عرشِ مُعلّٰی سے ہوگا، جس سے خاکی قالب لحمی قالب کی شکل اختیار کرے گی، جس کو کبھی تغیر اور فنا نہیں ہوگا۔ انسان کا پہلا وجود ماءُ الفَناء اور زمینی پانی سے تھا، اور یہ عرشی پانی ماءُ الحَیاۃ ہی ہوگا۔ جب دوسرا نفخہ پھونکا جائے گا تو تیار شدہ قالبوں میں روحیں منتقل ہوں گی، اور مردے زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔ [بخاري، مسلم، أبو داؤد، علوم القرآن وغیرہ]

﴿وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا﴾ اور جو اچھی زمین ہے اس سے سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے، اور جو خراب زمین ہے اس میں سے نہیں نکلتا مگر ناقص۔

﴿نَكِدًا﴾ بے مقصد و بے فائدہ، اور مقدارِ اصلی سے کمتر چیز مراد ہے۔ بارش تو ہر جگہ ہوتی ہے، اچھی باصلاحیت زمین پر بھی، اور ناکارہ زمین پر بھی اس کا نزول وفیضان عام ہے، لیکن اچھی زمین بارش کو قبول کرتی ہے، اور اس کے اندر بارش کا پانی جذب ہوتا ہے، جس سے باغ و بہار اور ہر قسم کے میوے پھل، غلہ اور تمام غذائی اشیاء

بکثرت پیدا ہوجاتی ہیں، اور مخلوقات ان سے نفع اور فائدہ حاصل کرتی ہیں، لیکن ناکارہ، ناقابلِ کاشت، بنجر، شورہ اور سخت زمین جو پانی کو جذب نہیں کرتی، یا اس میں اگانے کی صلاحیت کا فقدان ہے، اس زمین سے کوئی نفع مند اور فائدہ بخش چیز پیدا نہیں ہوتی۔

بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ اس آیت میں مؤمن اور کافر کی تمثیل ہے۔ مؤمن کا دل طیّب ہے، اور پاکیزہ ہے، اس کے سامنے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایتیں وحی کے ذریعہ آتی ہیں، اور وہ جو قرآن کی آیات کی سماعت کرتا ہے، وہ اس کے قلب وباطن پر اثر کرجاتی ہیں، اور وہ ہر قسم کے اعمالِ صالحہ کے لئے تیار ہوتا ہے، اور وہ عبادات کی لذّتوں کو ایسا محسوس کرتا ہے جیسے مختلف قسم کے پھل، فروٹ، میوے، اور ترکاریاں، سبزیاں ہوں۔ جبکہ کافر اپنے خبث باطن کی وجہ سے شمعِ ہدایت اور انوار وبرکاتِ وحی سے منتفع نہیں ہوتا، کیونکہ اس کا باطن خباثت کی وجہ سے تمام دینی لذّتوں سے محروم رہتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت، آسمانی کتابیں اور انبیاء علیہم السلام پھر ان کے نائب علماء ومشائخ کی تعلیم وتربیت بھی بارش کی طرح سارے انسانوں کے لئے عام ہے، اور وحی الٰہی بمنزلہ بارش ہے، مگر جس طرح بارانِ رحمت سے ہر زمین فائدہ نہیں اٹھاتی، اسی طرح اس روحانی بارش کا فائدہ بھی صرف وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے، اور جن لوگوں کے قلوب ناکارہ زمین کی طرح بے صلاحیت ہوں تو قرآنی ہدایات اور وحی الٰہی کے فوائد وبرکات وہاں مؤثر نہیں ہوتے، اور وہ لوگ بدستور اپنی گمراہی اور سرکشی پر جمے رہیں گے، اور ہر قسم کی ہدایات سے محروم رہیں گے۔

﴿كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ﴾ ہم اپنے دلائلِ قدرت پھیر پھیر کر ہر طرح سے بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو قدرداں اور شکرگزار ہیں۔

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست ☆ در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم وخس

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ

يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۵۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۶۰ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِىْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّىْ

رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَ
عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ: بیشک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، سوانہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، بیشک میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف کرتا ہوں ﴿۵۹﴾ ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا کہ: بلا شبہ ہم تجھے کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں ﴿۶۰﴾ انہوں نے جواب دیا کہ: اے میری قوم! میرے ساتھ کوئی گمراہی نہیں ہے، لیکن میں سارے جہانوں کے ربّ کی طرف سے رسول ہوں ﴿۶۱﴾ میں تمہیں اپنے ربّ کا پیغام پہنچاتا ہوں، اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۶۲﴾ کیا تم کو اس بات سے تعجب ہے کہ تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے تم ہی میں سے ایک شخص کے پاس نصیحت کی باتیں آگئیں تا کہ وہ تمہیں ڈرائے، اور تا کہ تم ڈر جاؤ، اور تا کہ تم پر رحم کیا جائے؟ ﴿۶۳﴾ سو ان لوگوں نے نوح کو جھٹلایا، سو ہم نے اسے اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دیدی، اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا، جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، بلا شبہ وہ لوگ اندھے تھے ﴿۶۴﴾

معارف ومنازل

تذکیر بایامِ اللہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے پیغمبروں علیہم السلام کی تکذیب کی، اور ایمان نہیں لائے، بلکہ اپنے کفر وشرک پر جمے رہے، اور انبیاء علیہم السلام پر طرح طرح کے بہتان باندھے، اور ان کی مخالفت کی، اور انہیں تکلیفیں پہنچائیں، پس اپنے مسلسل کفر وشرک کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

قرآن مجید میں اُمت حاضرہ کی یاددہانی اور عبرت دلانے کے لئے جگہ جگہ انبیاء سابقین علیہم السلام کے اور ان کی اُمتوں کے واقعات مختلف انداز میں ذکر فرمائے ہیں، کہیں ایک نبی کا تذکرہ فرمایا، کہیں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا، پھر یہ واقعات کہیں مختصر ہیں، اور کہیں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ یہاں سورۂ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب علیہم السلام کی تبلیغ وتذکیر اور ان کی اُمتوں کی تکذیب وانکار، پھر اس پر ان کی سزا وتعذیب اور ہلاکت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے دشمن فرعون کا،

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا بہت تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہے۔ پھر سورۂ ہود میں بھی اس ترتیب سے ان حضرات کے واقعات کا تذکرہ فرمایا، پھر اسی ترتیب سے سورۂ شعراء میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے، چونکہ عبرت دلانا مقصود ہے، اس لئے یہ تکرار نہایت ہی مفید ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت اس زمانے کے تمام انسانوں کیلئے تھی جو اس وقت دنیا میں آباد تھے۔ آپ علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام سے دس قرن بعد مبعوث ہوئے۔ آپ علیہ السلام سے پہلے جتنے پیغمبر علیہم السلام مبعوث ہوئے وہ سب کے سب انبیاء گزرے ہیں، ان میں رسول کوئی نہیں تھا۔ دنیا میں سب سے پہلے رسول آپ علیہ السلام ہیں۔ **كَمَا فِي حَدِيثِ الشَّفَاعَةِ فِي الصَّحِيحَين.**

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت نوح علیہ السلام کے والد ماجد تک تقریباً تمام لوگ مؤمن موحّد گزرے ہیں۔ شرک واصنام پرستی کا رواج نہ تھا۔ ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [البقرة:۲۱۳] (سارے لوگ ایک ہی جماعت تھے) حضرت نوح علیہ السلام سے چند وقت پہلے اصنام پرستی کا دور شروع ہوا۔ کچھ بڑے صالح نیک لوگوں نے عبادت گاہ اور مساجد تیار کی تھیں، وہاں رات دن عبادت واذکار میں مشغول رہتے تھے۔ مرورِ زمانہ کے بعد یکے بعد دیگرے وہ سب وفات پاگئے۔ ان کے متبعین ان کی جدائی پر غمگین و پریشان ہوئے۔ جب وہ عبادت گاہوں میں بیٹھتے تھے تو اپنے اسلاف وبزرگوں کا تذکرہ کرکے ان کی جدائی پر غمزدہ رہتے تھے۔

شیطان نے موقع کو غنیمت سمجھا اور عمامہ وقباء وعصاء کے ساتھ ان کی محفل میں آیا، ایک خیر خواہ ناصح بن کر انہیں بتایا کہ اپنے بزرگوں کے مجسمے بنا کر مسجدوں میں رکھو، جب عبادت میں مصروف ہوں تو انہیں دیکھتے رہو، اور ان کے قدموں پر بوسہ دیا کرو، تمہاری پریشانی دور ہوجائے گی، اور عبادت میں لطف وسرور بھی پہلے کی طرح حاصل ہوگا، انہوں نے ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ عبادت کی شکل وصورت اختیار کرلی، اور بات صرف قدم بوسی وسجدے کی حد تک رہ گئی۔

یہ نسل ختم ہوئی، تو نئی نسل نے شیطان کے ورغلانے پر ان مجسموں کو معبود کا درجہ دے کر ان کی عبادت شروع کی، رفتہ رفتہ یہ وباء کی طرح پوری آبادی میں پھیل گئی، وہاں سے دوسرے علاقوں تک یہ رسم بد عام ہوگئی، اور دیگر اقوام بھی اس کی لپیٹ میں آکر غرق ہوگئیں، تب حضرت نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ بعثت کے وقت بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی۔ اور بقول حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ آپ علیہ السلام کی عمر پچاس

سال تھی۔

ساڑھے نوسوسال کا بڑا عرصہ تبلیغ میں گزارا۔[العنکبوت] پوری جماعت انبیاء علیہم السّلام میں آپ علیہ السّلام کا ایک خاص امتیازی مقام ہے کہ اتنی بڑی مدت جو کئی پشتوں پر مشتمل ہو آپ علیہ السّلام نے مسلسل تبلیغ میں گزاری، اور تبلیغ کے سلسلے میں اتنی تکالیف برداشت کیں جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اور لوگ آپ علیہ السّلام کو مار مار کر زخمی کر دیتے، آپ علیہ السّلام بیہوش ہو جاتے، وہ آپ علیہ السّلام کو کہیں پھینک دیتے، جب آپ علیہ السّلام ہوش میں آتے تو دوبارہ تبلیغ شروع کرتے، اور ان کے لئے ہدایت کی دعاء کرتے۔

پھر آپ علیہ السّلام کی تبلیغ اتنی ہمہ گیر ہوتی کہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ محفلوں میں، تقریبات میں، بازاروں میں، صحراؤں میں، گھروں میں، اجتماعات میں، انفرادی طور پر یہاں تک کہ سوئے ہوئے لوگوں کے بستروں میں جا جا کر ہر وقت صبح وشام، رات دن تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھتے، اور انہیں مختلف قسم کے عذاب ومؤاخذوں سے ڈراتے، اور جنت کی خوشخبری سناتے، مال واولاد، عزّت وخوشحالیوں کا یقین دلاتے، بارشوں اور ملکی آبادی، باغات ودیگر راحتوں کا وعدہ دیتے۔ اور اتنی محنت وجانفشانی سے تبلیغ کرتے کہ اپنی ذاتی راحتوں سے بے خبر رہتے۔[تفسیر عزیزی، قرطبی، معالم وغیرہ]

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت نوح علیہ السّلام نے تبلیغ دین کے جو راہنما اصول وضع کئے، وہ اتنے بابرکت اور قیمتی ہیں جو رہتی دنیا تک حق وصداقت کے مبلغین کے لئے نمونہ ہیں۔ ساڑھے نوسوسال شب وروز، خلوت وجلوت میں لوگوں کو دعوت حق دینا، اور مسلسل اس دعوت میں منہمک ومشغول رہنا، اور ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرنا، اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لانا، یہ منصب نبوت ہی کا طرّہٗ امتیاز ہے، اور صبر واستقلال کی وہ شان وہمت ہے جس کے سامنے پہاڑ بھی عاجز ہیں۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات میں آپ علیہ السّلام کی شان تبلیغ اور دعوتِ حق کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سورۂ ہود میں قدرے تفصیل کے ساتھ آپ علیہ السّلام کا تذکرہ ہے۔

بالآخر ہزار سالہ تبلیغ کا نتیجہ صفر نکلا، اور تقریباً بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما صرف اسی آدمیوں نے ایمان قبول کیا۔ اور کعب الاحبار کہتے ہیں کہ ۷۲ لوگ ایمان لائے۔ اور جب حضرت نوح علیہ السّلام ہر طرح، ہر سمت سے مایوس ہو گئے، باوجودیکہ تقریباً ستر سال اسی حال میں گزرے کہ پوری قوم کی نسل منقطع ہو گئی، کسی عورت سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا، اور بارشیں بند ہو گئیں، معیشت پر تباہی آئی، لیکن لوگ وہی کے وہی رہے۔ بہت تنگ آئے، پریشان

ہوئے، نہایت مایوسی کے عالم میں ہاتھ اٹھا کر اپنے محسنِ حقیقی کے سامنے الحاح وزاری شروع کی، اور قوم کی تباہی کی التجاء کی۔ بالآخر دعاء منظور ہوئی، طوفان آنے کا مژدہ سنایا گیا، فرشتوں نے کشتی بنانے پر مدد کی، کشتی بن گئی، ہر قسم کے زمینی جانوروں کے لئے خانے بنائے گئے۔ آسمان کے دروازے کھل گئے، زمینی تنور سے پانی اُبلنا شروع ہو گیا، جن کو نجات دلانا تھی انہیں کشتی میں سوار کیا گیا۔

جبل ابوقبیس سے حضرت آدم علیہ السلام کو نکال کر ان کے جسدِ خاکی کو تابوت میں رکھ کر کشتی میں رکھا گیا۔ دس رجب المرجب کو کشتی روانہ ہوئی۔ دس محرم کو چھ ماہ مسلسل پانی بر رہنے کے بعد جبل جودی پر رُک گئی۔ ڈرامہ بازوں کا ڈرامہ اختتام کو پہنچا، سارے ڈرامہ باز غرق ہوئے، پوری انسانیت تباہ ہوگئی۔ بیوی اپنے نافرمان بیٹے کنعان سمیت ڈوب گئی، باقی دیگر تینوں فرمانبردار بیٹے سام، حام، یافث نجات پا گئے۔ انہیں کی نسل سے دوبارہ انسانیت روئے زمین پر پھیل گئی۔ جبکہ اسی آدمی جو کشتی میں سوار تھے ان کی نسل آگے نہیں چلی۔ یہ ہے مختصر قصہ وروئیدادِ آدمِ ثانی سیدنا حضرت نوح علیہ السلام کا۔ یہ ان کا مقدس نسب نامہ ہے:

نوح بن لامک بن متوشلخ بن ادریس (أخنوخ پیغمبر) بن یرد بن مهلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام ابی البشر. علیهم السلام

حضرت نوح علیہ السلام طوفان کے بعد ساڑھے تین سو سال زندہ رہے۔ [اثمار و ازہار]

تینوں بیٹوں کی نسل کا مختصر تعارف:

عن سمرة بن جندب مرفوعًا سام ابو العرب و حام ابو الحبش و یافث ابو الروم. [رواه أحمد] و عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ مرفوعا ولد لنوح علیه السلام سام حام یافث. فولد لسام العرب و فارس و الروم و الخیر فیهم. وولد لیافث یاجوج و ماجوج و الترک و السقالبة ولا خیر فیهم. وولد لحام القبط و البربَر و السودان. [أخرجه البزار] برصغیر ہندو پاک کے لوگ بقولِ محققین اولادِ سام ہیں، اور بقول بعض اولاد حام ہیں۔ واللہ اعلم

فائدہ:

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ قرآن کریم میں اجمالاً وتفصیلاً تینتالیس (۴۳) مقامات پر مذکور ہے۔ طوفانِ نوح کا تذکرہ قرآن کریم نے جغرافیائی لحاظ سے بیان نہیں کیا، بلکہ اسے قومِ نوح کے ساتھ مقید کر کے بیان کیا۔ اس

سے مؤرخین نے ایک اختلافی نتیجہ اخذ کیا، اور کہا: علماء اسلام میں سے ایک جماعت، بعض ماہر فلکیات، طبقات الارض اور تاریخِ طبعیات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر نہیں آیا تھا، بلکہ صرف اس خطہ میں محدود تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھیں (یعنی نینویٰ، عراق، دجلہ وفرات مابین) اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کیلومیٹر مربع ہے، کیونکہ اس زمانے میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی، اور وہی خطہ تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم آباد تھی۔

ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا، جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا، لہٰذا وہی مستحقِ عذاب تھے، اور انہی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا۔ باقی کرۂ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا (بلکہ باقی کرۂ ارض انسانی آبادی سے خالی تھا) علماء یہود ونصاریٰ بھی یہی کہتے ہیں، اور بعض علماء اسلام، ماہرین فلکیات وطبقات الاض، اور علماء طبعیات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا، مگر صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا، عام نہ تھا۔ پوری تحقیق قصص القرآن میں ہے۔ اور یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کَآفَّةً لِّلنَّاسِ سارے اقوام عالم کیلئے نہیں تھی، بلکہ یہ منصب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔ نوح علیہ السلام کی بعثت صرف ان کی قوم کیلئے ہے۔ یہ معنی تقریباً لفظِ "اِلٰى قَوْمِهٖ" چالیس کے قریب مقامات میں مذکور ہے۔

دوسری وجہ تاریخی حوالے سے یہ ہے کہ بعثت نوح علیہ السلام کے وقت دنیا کی آبادی نہایت محدود اور مختصر تھی، کیونکہ ان کی بعثت حضرت آدم علیہ السلام سے صرف دس قرن بعد ہے۔ البتہ طوفان کے بعد پھر اکناف واطراف عالم میں آہستہ آہستہ انسانی آبادی عام ہوتی گئی۔ اور ظاہر بھی یہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت سارے جہاں کے لئے نہیں، بلکہ ایک مخصوص قوم کے لئے ہے، جن کی تعداد لاکھوں میں نہیں، بلکہ ہزاروں میں ہے، تو پھر پورے عالم پر طوفان آنے کا کوئی مطلب نہ ہوگا۔

ربطِ آیات:

اوپر توحید خداوندی کا ذکر دلائلِ عقلیہ کے ساتھ تھا، اب دلائلِ نقلیہ کے ساتھ توحیدِ خداوندی کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ اوپر تذکیر بآلاءِ اللہ تعالیٰ کا ذکر تھا۔ اب تذکیر بایّامِ اللہ کا بیان ہے۔ تیسرے یہ کہ اوپر زمینِ طیب اور زمینِ خبیث کا ذکر ہوا، اب زمینِ طیب کا مصداق حضرت نوح علیہ السلام اور زمینِ خبیث کا مصداق ان کی نافرمان قوم کا بیان ہو رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖ فَقَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ﴾ البتہ تحقیق ہم نے بھیجا نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام (مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے آپ علیہ السلام کے تین نام لکھے ہیں: شاکر، سکن، عبدالغفار۔ واللہ اعلم۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تینوں آپ علیہ السلام کے نام ہوں) کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا، پس انہوں نے اپنی قوم سے یوں خطاب فرمایا: اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سارے جہاں کا معبود برحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاء علیہم السلام کی ابتدائی تعلیم و دعوت یہی رہی ہے، اور سب نے اپنی اپنی قوم کو یہی توحید اور اخلاص عبادت کا درس دیا ہوا ہے، اور عقیدۂ توحید کے ساتھ عقیدۂ آخرت پر یقین کرنے کا سبق پڑھایا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے عقیدۂ توحید کے ساتھ قوم کے سامنے واضح فرمایا کہ اگر تم میری بات کو تسلیم نہیں کرو گے، اور اپنے پروردگار برحق کو واحد لاشریک نہیں مانو گے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں کی پرستش کرو گے، تو میں بیشک ڈرتا ہوں، اور میرا خوف برحق ہے کہ تم پر بڑے دن کا عذاب آئے گا۔ بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے جو بہت ہولناک و سخت بھی ہے، اور طویل و لمبا بھی ہے، اور ساری خلقت کے اجتماع کا بھی دن ہے۔ تو ہر اعتبار سے بڑا ہی رہا، چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بڑے دن کے عذاب سے خبردار کر کے انہیں توحید و ایمان کی دعوت دیدی، اور انہیں بڑے دن کے عذاب سے ڈرایا۔

﴿قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ﴾ آپ علیہ السلام کی دعوت اور پیغام کے جواب میں قوم کے سرداروں نے کہا: ہم تو تمہیں کھلی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں، تم عجیب و غریب بہکی باتیں کر رہے ہو، اور اپنے باپ دادوں کے دین کو باطل کہتے ہو، اور آباء و اجداد کے دین کو مٹانا چاہتے ہو۔

تاریخ انبیاء علیہم السلام شاہد ہے کہ حق کی مخالفت میں ہمیشہ بڑے لوگ ہی پیش پیش رہے ہیں، اور ہر پیغمبر کے اوّلین پیروکار غریب لوگ ہی ہوتے ہیں، اور مالدار و سرمایہ داروں کی قسمت میں سوائے لعن وطعن، عیب جوئی اور کبر و غرور کے کچھ نہیں ہوتا۔ وجہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اگر حق قبول کر لیں گے تو ان کی سرداری اور منصب خاک میں مل جائے گا، اور ان کی حیثیت عام لوگوں کے ساتھ برابر ہو جائے گی۔

ابوسفیان بن حرب بیس سال تک اسلام اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف برسر پیکار رہا، پھر تھک ہار کر اسلام قبول کیا۔ ایک روز وہ اور سہیل بن عمرو حضرت امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ملنے آئے، اور اُدھر سے حضرت

بلال اور حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ عنہما بھی تشریف لائے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دربان نے اندر جا کر اطلاع کر دی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نبض شناس تھے، دربان سے کہا کہ قریش کے سرداروں سے کہو: تم اپنی باری کا انتظار کرو، اور حضرت بلال وخباب رضی اللہ عنہما کو میرے پاس لاؤ، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس پر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے سہیل رضی اللہ عنہ سے کہا: دیکھو! ہمیں سرداروں کو نظر انداز کر کے انتظار کا کہا، اور غلاموں کو پہلے موقع دیا۔ حضرت سہیل رضی اللہ عنہ نے کہا: بہت ہی اچھا کیا، ان غلاموں نے سبقت کر کے اسلام قبول کیا، جبکہ آپ اور میں بیس سال تک اسلام کے خلاف لڑتے رہے۔ جب قیامت برپا ہوگی وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور یہ لوگ سبقت کریں گے، اور ہم پیچھے ہی رہیں گے۔ ہمیں ہماری سرداری نے پیچھے دھکیلا، انہیں فقر نے آگے رکھا۔

تو ظاہر ہے کہ جو جواب حضرت نوح علیہ السلام کو ملا یہی جواب قوم کے سرداروں نے اپنے اپنے زمانے میں ہر پیغمبر کو دیا، خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ان حالات سے گزرنا پڑا، یہاں تک کہ قوم کے بڑوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنون تک کہا۔

﴿قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ارے میری قوم! میں گمراہی میں تو ملوث نہیں ہوں، گمراہی تو کیا میں اعلیٰ درجے کی ہدایت پر ہوں، اور اللہ تعالیٰ رب العلمین کا برحق رسول ہوں۔ تمہیں گمراہیوں سے نکال کر حق وصداقت اور ہدایت پر لانے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ﴾ میں اپنے ربّ کے برحق روشن پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں، اور تمہاری خیر خواہی اور نجات کی بات کرتا ہوں، تاکہ تم شرک وکفر کی اندھیریوں سے نکل کر اسلام کی روشنی میں قدم رکھو، اور دنیا وآخرت کی فلاح حاصل کرو، اور جہنم کے ابدی عذاب سے بچ جاؤ، اور جنت کی راحتوں تک پہنچ جاؤ۔

بہر حال! نوح علیہ السلام نے قوم سے کہا کہ مجھے گمراہ مت سمجھو، میں تمہارا خیر خواہوں۔ میں تمہیں وہی نصیحت کی بات کہتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کا ہر نبی کہتا آیا ہے، اور:

﴿وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ اور میں اللہ تعالیٰ کا پیغام بصیرت کے ساتھ لے کر آیا ہوں، اور وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ میں قطعی یقینی علم کی بات کرتا ہوں، وحی الٰہی کے اسرار وبرکات کے مطابق تمہاری راہنمائی کرنے آیا ہوں میں ایمان وکفر دونوں کے انجام سے واقف ہوں، جبکہ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ لہٰذا میرے پیچھے چلو، میری باتوں پر ایمان لاؤ، ہر طرح کی کامیابی حاصل کرو۔

﴿اَوَ عَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ ......﴾ کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے پاس نصیحت آئی ہے، تم ہی میں سے ایک مرد پر؟ مطلب یہ ہے کہ اس میں کونسی انوکھی اور باعثِ تعجب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی اس کے بندوں میں سے تمہاری قوم میں سے ایک شخص پر آجائے؟ یہ تو معروف بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت عطا فرمائی، تو ان کی بعض خصوصیات ان کی اولاد میں بھی رکھیں، چنانچہ آپ علیہ السلام کی اولاد میں سے اللہ تعالیٰ نے ایسے باکمال، صاحبِ استعداد بندے پیدا کئے جنہیں نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا، تو اسی طرح تم ہی میں سے ایک مرد کو یہ شرف بخشا کہ اس کے پاس نصیحت اور آسمانی وحی آئی، لہٰذا کسی نبی یا رسول کا اس کی اپنی قوم میں سے ہونا اور آنا کوئی اچنبھے اور تعجب کی بات نہیں، بلکہ یہ تو عین فطرت کا تقاضا ہے۔

دراصل کفار کا نظریہ یہ تھا کہ اگر کوئی رسول ہماری طرف آتا ہے تو اس کو ہماری طرح کا انسان نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ضروری ہے کہ وہ فرشتہ ہو، جو نہ کچھ کھائے، نہ پیئے، نہ سوئے، نہ گلیوں بازاروں میں پھرے، نہ اس کی بیوی ہو، نہ بچے ہوں، یہی کافروں کا خود ساختہ عقیدہ ہوتا تھا۔ سورۂ انعام کے شروع میں گزر چکا ہے کہ کافر لوگ کہتے تھے کہ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم کسی فرشتے کو نازل کر دیتے تو ان کا کام ہو چکا ہوتا، کیونکہ یہ لوگ فرشتہ کو برداشت کرنے کی سکت اور طاقت ہی نہ رکھتے، اور فوراً اہلاک ہو جاتے۔ اور اگر ہم فرشتے کو انسانی صورت میں بھیج دیتے، تو یہ پھر اسی شک و شبہ میں مبتلا رہتے کہ یہ تو ہماری طرح کا انسان ہے، پس ایمان نہ لاتے، اور ضد و ہٹ دھرمی پر جمے رہتے۔

مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں جب فرشتوں کے دیکھنے، اور ان سے استفادہ کرنے کی قوت برداشت نہیں تو ضروری ہوا کہ ان کی ہدایت کے لئے ان میں سے، ان کی زبان بولنے والا انسان نبی بن کر تشریف لائے۔

﴿لِيُنۡذِرَكُمۡ وَلِتَتَّقُوۡا وَلَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ﴾ تاکہ یہ نبی علیہ السلام تم کو اللہ کے عذاب اور کفر و شرک کے انجام سے ڈرائے، اور تاکہ تم تقویٰ و ایمان اختیار کر کے جہنم کے عذاب سے بچ جاؤ، اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آخرت پر، اور آسمانی کتابوں پر، اور پیغمبروں علیہم السلام پر ایمان لائے گا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوگی، جیسا کہ چند آیت پہلے ذکر ہوا تھا: ﴿اِنَّ رَحۡمَتَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ مِّنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾ [الأعراف: ۵۶] اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہوتی ہے، پھر دعوت کا نتیجہ جو سامنے آیا وہ یہ ہے کہ:

﴿فَكَذَّبُوهُ﴾ پس قوم کے لوگوں نے عموماً، اور بڑے سرداروں نے خصوصاً آپ علیہ السلام کو اور آپ علیہ السلام کے پیغام کو جھٹلا دیا، پس جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آپہنچا تو:

﴿فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ﴾ تو ہم نے نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھ کشتی میں سوار بیاسی کے قریب لوگوں کو بچالیا۔ یہ کشتی عجیب کشتی تھی، تورات کے بیان کے مطابق چار سو پچاس فٹ لمبی تھی، پچھتر فٹ چوڑی، اور پینتالیس فٹ اونچی تھی۔

﴿وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ﴾ اور ہماری آیات کو جھٹلانے والوں کو ہم نے طوفان کے پانی میں غرق کر دیا، بے شک وہ لوگ اندھے تھے۔ ظاہری اندھے نہیں تھے، باطنی اندھے تھے۔ فرمایا: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ [الحج: ۴۶] یعنی ان کی ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ سینوں میں رکھے ہوئے دل اندھے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جب انسان مادیات کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے محروم ہو جاتا ہے، تو جیسے پرندہ شکاری کے قفس میں بند ہوتا ہے یہ شخص اسی طرح خواہشات کے قفس میں بند ہو کر ابلیس کے تسلط اور گرفت میں پھنس جاتا ہے، فطری استعداد اور پیدائشی صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو جاتا ہے۔ پس جہنم کا راستہ اختیار کر جاتا ہے۔ قوم نوح کا یہی شیوہ رہا، جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ
الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ
لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾
اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۗ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ
مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوْٓا
اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ
اٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾

ترجمہ: اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، کیا تم ڈرتے نہیں؟ ﴿۶۵﴾ ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا، جواب میں کہنے لگے کہ: بلا شبہ ہم تجھے بیوقوفی میں دیکھ رہے ہیں، اور بلا شبہ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ تو جھوٹوں میں سے ہے ﴿۶۶﴾ ہود نے کہا: اے میری قوم! مجھ میں بیوقوفی نہیں ہے، اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں، امانتدار ہوں، اللہ رب العٰلمین کا تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں ﴿۶۷﴾ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والا، تمہیں نصیحت کرنے والا، خیر خواہ اور امانتدار ہوں ﴿۶۸﴾ کیا تمہیں اس بات سے تعجب ہوا کہ تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آگئی، تم ہی میں سے ایک شخص کے واسطہ سے؟ تاکہ وہ تمہیں ڈرائے، اور یاد کرو جب کہ اس نے تمہیں قوم نوح کے بعد خلیفہ بنا دیا، اور جسمانی طور پر تمہارے ڈیل ڈول میں پھیلاؤ زیادہ کر دیا، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ شانہ کی نعمتوں کو یاد کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿۶۹﴾ وہ کہنے لگے: کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم تنہا اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اور ہمارے باپ دادا جس کی عبادت کرتے تھے اسے چھوڑ دیں؟ سو ہمارے پاس وہ چیز لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو سچوں میں سے ہے ﴿۷۰﴾ ہود نے کہا: تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے عذاب اور غصہ نازل ہو چکا، کیا تم مجھ سے جھگڑتے ہو ان ناموں کے بارے میں جو نام تم نے، اور تمہارے باپ دادوں نے خود سے تجویز کر لئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، سو تم انتظار کرو، بلا شبہ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ﴿۷۱﴾ پھر ہم نے ہود کو، اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ تھے، اپنی رحمت سے نجات دیدی، اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور وہ لوگ ایمان والے نہ تھے ﴿۷۲﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم میں قومِ عاد کا ذکر:

قومِ عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے۔ یعنی اعراف، ہود، مؤمنون، شعراء، فُصّلت، احقاف، الذاریات،

القمر اور الحاقہ میں۔ اسی طرح اختصار کے ساتھ سورۃ الفجر میں بھی یہ کُل دس مقام ہوئے۔ اور حضرت ہود علیہ السلام کا سات جگہ ذکر آیا ہے، یعنی اَعراف میں ایک مرتبہ، شعراء میں ایک مرتبہ، اور سورۂ ہود میں پانچ مرتبہ۔

عاد عرب کے قدیم قبیلہ یا اُمَمِ سامیہ (اولاد سام بن نوح علیہ السلام) کے صاحبِ قوت واقتدار افراد جماعت کا نام ہے۔ تاریخِ قدیم کے بعض یورپی مصنّفین عاد کو ایک فرضی کہانی (متھالوجی) یقین کرتے ہیں، مگر ان کا یہ یقین بالکل غلط اور وہم ہے، بلکہ ان کا مقصد قرآنی ارشادات اور تاریخی فرامین کی تکذیب ہے۔ اس لئے کہ جدید تحقیقات کا یہ مسلّم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرتِ افراد وقبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت وسطوت جماعت کی حیثیت میں تھے، جو عرب سے نکل کر شام، مصر اور بابل کی طرف بڑھے، اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کیں۔ اب فرق صرف اس قدر ہے کہ عرب کے اِن باشندوں کو اُمَمِ بائدہ (ہلاک ہوجانے والی قومیں) یا عربِ عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد، ثمود، طسم اور جدیس کہتے ہیں۔ اور مستشرقین یورپ (اُمَمِ سامیہ) نام رکھتے ہیں۔

پس اصطلاحات وتعبیرات کے فرق سے حقیقت وواقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوجاتی۔ اس لئے قرآن عزیز نے ان کو عاد اُولیٰ کہا ہے کہ یہ واضح ہوجائے کہ عرب کی قدیم قوم بنوسام اور عاد اُولیٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ مزید تفصیل سورۃ الفجر کے تحت لکھ چکے ہیں۔

عاد کا زمانہ:

عاد کا زمانہ تقریباً دوہزار قبلِ مسیح مانا جاتا ہے، اور قرآن عزیز میں عاد کو ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ﴾ (قومِ نوح کے بعد) کہہ کر قومِ نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد اُمَمِ سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مسکن:

عاد کا مرکزی مقام اَرضِ اَحقاف ہے۔ یہ حضرت موت کے شمال میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے مشرق میں عمان ہے، اور شمال میں "ربع الخالی" ہے، مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضرت موت اور یمن میں خلیج فارس کے سواحل سے حدود عراق تک وسیع تھی، اور یمن ان کا دار الحکومت تھا۔

عاد کا مذہب:

عاد بت پرست تھے، اور اپنے پیشرو قوم نوح کی طرح بت اور صنم پرستی، اور صنم تراشی میں بڑے ماہر تھے۔ تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطلہ بھی قوم نوح کی طرح وَدّ، سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نسر ہی تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اثر منقول ہے، اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام "صمود" اور ایک کا نام "ہتار" تھا، اور ایک بت کا نام "صدا" تھا۔

عاد اپنی مملکت کی سطوت و جبروت، جسمانی قوت وصولت کے غرور میں (ان لوگوں کا قد تین میٹر ہوتا تھا) ایسے چمکے کہ خداوند ذوالجلال کو بالکل بھلا دیا، اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال کرنے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت ہود علیہ السلام عاد کی سب سے معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے۔ سرخ وسفید اور وجیہ تھے، ان کی داڑھی بڑی تھی۔ [قصص القرآن]

جب ہود علیہ السلام نے ان کو توحید کی دعوت دی، اور عذاب سے خبر دار کیا، تو وہ اپنی قوت اور طاقت جتلانے لگے، اور کہنے لگے: ﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ [فصلت:۱۵] (ہم سے کون زیادہ طاقت والا ہے؟) ان ناعاقبت اندیشوں نے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں خالقِ کائنات کی طاقت کا اندازہ نہیں لگایا۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے انہیں یوں جواب دیا: ﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ [فصلت:۱۵] (کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے انہیں پیدا کیا وہ ان سے زیادہ طاقتور ہے)۔

حضرت ہود علیہ السلام ہر موقع، ہر محل، ہر مجلس میں نہایت حلم و بردباری اور طرز و بیان سے انہیں سمجھاتے رہتے تھے، مگر ان کا کبر و غرور بدستور زیادہ ہوتا رہتا تھا، اور انہیں صاف صاف کہتے رہتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ عذاب جس سے ہمیں ڈرایا کرتے ہو۔ تو حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا کہ بس اب تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اور غصہ نازل ہو ہی چکا۔ یعنی اب اس کے آنے میں دیر نہیں ہے، تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا، تو حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھی جنہوں نے ایمان قبول کیا تھا، سب کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا، اور باقی پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد کیا۔

سورۃ الحاقۃ میں فرمایا: ﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِیَةِ۝۵ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَةٍ۝۶

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۞ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۞﴾[الحاقة] (اور لیکن عاد، سو وہ ہلاک کئے گئے ٹھنڈی تیز ہوا کے ذریعہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اس ہوا کو مکمل سات دن اور آٹھ رات لگا تار مسخر فرما دیا۔ اے مخاطب! تو دیکھے قوم کو کہ اس ہوا میں پچھاڑے ہوئے پڑے ہیں، گویا کہ وہ کھوکھلے تنے ہیں کھجور کے، کیا تو ان میں دیکھتا ہے کہ کوئی باقی رہا؟)۔

سورۂ احقاف میں ہے کہ جب ان لوگوں پر عذاب آنا شروع ہو گیا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی وادیوں کی طرف بادل آرہا ہے، وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا (برسنے والا بادل کہاں تھا؟) بلکہ وہ تو عذاب ہے، جس کی تم جلدی مچا رہے تھے۔ وہ تو تباہ کن ہوا ہے، جس میں دردناک عذاب ہے۔ وہ اپنے ربّ کے حکم سے ہر چیز کو ہلاک کر رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہو گیا کہ وہ لوگ اس حال میں ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ہم اس طرح مجرموں کو سزا دیتے ہیں۔

قومِ عاد کا تاریخی پس منظر:

اکثر و بیشتر لوگوں کو یہ اشکال پیش آتا ہے کہ آج کا متمدن اور ترقی یافتہ دور نہایت سنجیدہ ہے، جبکہ ہزاروں سال پہلے کے لوگ نہایت کمزور، غریب، مفلوک الحال گزرے ہیں، ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا، وہ سیدھے سادے لوگ ہوتے تھے، تو قدرت نے انہیں آسمانی عذابوں کے ذریعہ کیوں ہلاک کیا؟

دوئم یہ کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو مہلت اور ڈھیل دیتا ہے، بہت بڑے عرصے کے بعد انہیں سزا دیتا ہے، جبکہ قومِ عاد کو اس طرح مہلت کے بغیر جلدی عجلت میں کیوں سزا ملی؟

جواب: مختصر جواب یہ ہے کہ قومِ عاد کے لوگ سیدھے سادے، غریب، مفلوک الحال لوگ نہیں تھے، بلکہ یہ لوگ بڑے ترقی یافتہ، متمدن اور دنیاوی لحاظ سے اونچے درجے کے ہوشیار اور سنجیدہ لوگ تھے۔ پھر ان کی ہلاکت کسی عجلت اور جلد بازی کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کی طرف سے مبعوث پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام نے مسلسل چار سو چالیس سال تک انہیں تبلیغ کی ہے، اور توحید الٰہی کی دعوت دی ہے۔ جب چار سو چالیس سال مسلسل دعوت و تبلیغ کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا، اور صرف معدودے چند مسلمانوں کے علاوہ پوری قوم اپنے کفر و شرک، اور فساد چھوڑنے پر تیار اور آمادہ نہیں ہوئی، اور بار بار پیغمبر علیہ السلام سے عذاب کا مطالبہ کرتی رہی، تب بامر مجبوری پیغمبر علیہ السلام نے نہایت مایوسی کے عالم میں دعاء کی، اور عذاب آپہنچا، جیسے نوح علیہ السلام کے واقعات میں مذکور ہے۔

اب اس اجمال کی تفصیل کا مختصر بیان کریں گے، جو یہ ہے:

قوم عاد:

یہ لوگ خالص عرب تھے، اور قوم ثمود سے دو سو سال پہلے تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ چھٹی پشت پر جا کر ملتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے صحرائے اعظم وادی دہنا متصل احقاف وحضر موت میں آباد تھے۔ احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ یہ خالص ریگستانی علاقہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد اس قوم نے دنیا میں بڑا عروج حاصل کیا، ان کے بنائے ہوئے مضبوط قلعے، مضبوط عمارات اور قصور نہایت عمدہ، پختہ، بلند و بالا اور مثالی ہوتے تھے۔ اور خاص طور پر یمن میں تعمیر شدہ قصر غمدان جو اُن کے پادشاہ کا مخصوص قصر ہوتا تھا، وہ تیس ہزار فٹ پر بنا ہوا تھا، اسی ۸۰ منزلوں پر، اور ہر منزل کا فاصلہ چالیس فٹ کا ہوتا تھا۔ اس طرح سطح زمین سے اس کی بلندی تقریباً تین ہزار دو سو فٹ پر مشتمل ہوتی تھی۔

اس قصر کے کھنڈرات زمانۂ رسالت تک پائے جاتے تھے، جنہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے معائنہ کیا تھا۔ اس قصر کا طرزِ تعمیر اس طرح تھا جیسے کہ اہرام مصر ہیں، جو کہ آج بھی موجود ہیں۔ اور یہ اہرام بھی اسی زمانہ کے ہیں جس زمانہ میں قصر غمدان تعمیر ہوا تھا۔ یہ اہرام ساڑھے چار سو فٹ سے لے کر پانچ سو فٹ تک بلند، سہ گوشہ مینار ہیں، اور ایک طرح کے پتھروں سے تعمیر شدہ ہیں۔ ان پر چھ ہزار سال گزر چکے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے نہیں، بلکہ نئے ہیں۔ ان اہراموں میں فرعونوں کی لاشیں ممی کر کے رکھی گئی ہیں۔ یہ عمارات بڑے بڑے اور مضبوط پتھروں سے اس طرح بنائی گئی ہیں کہ وہ ہر قسم کے حوادثات سے تقریباً محفوظ ہیں۔ نیز ان کے راستے اس طرح اور اس قدر پُر پیچ بنائے گئے ہیں کہ کوئی ناواقف شخص اندر داخل نہ ہو سکے۔ آج بھی لوگ بہت دور سے مختلف ملکوں سے انہیں دیکھنے کے لئے بکثرت آتے ہیں۔

ان کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا ہے۔ ان عمارات کے بعض پتھر پچھتر من وزنی ہیں، جنہیں عجیب طریقے سے تراشا گیا ہے، جس کی صفائی کی مثال نہیں، اور پھر اتنی بلندی پر چڑھا دیا گیا ہے، اور انہیں جوڑنے کے لئے خاص ترکیب اور خاص مسالہ استعمال کیا گیا ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور کے انجنیئر بھی انگشت بدندان اور نہایت حیران ہیں۔

قصر غمدان جس کی بلندی تین ہزار دو سو فٹ ہوتی تھی اس کی طرز تعمیر تقریباً انہیں اہراموں کی مانند بے مثال

تھی، جسے عذابِ الٰہی کے جھٹکوں نے تہس نہس کر کے صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ اہرامِ مصر پر چونکہ کوئی آسمانی عذاب نہیں آیا، اس لئے وہ آج بھی اپنی اصلی شکل وصورت اور مضبوطی کے ساتھ باقی ہیں۔

قرآن کریم میں اس قومِ عاد کی کئی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ یہ قوم بڑی جسیم اور طاقتور تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ اس قوم کے عام آدمیوں کا قد ۱۱ ہاتھ، یعنی ۱۸ فٹ ہوتا تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر فتح العزیز میں اٹھارہ گز لکھا ہے۔ یہ شاید کاتب کی غلطی ہو، یا گز سے مراد فٹ ہو، یہاں تک کہ بعض مؤرخین نے اسی ہاتھ، یعنی ایک سو بیس فٹ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور یہ کوئی بعید نہیں، کیونکہ ان کے اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان دو ہزار سال کا فاصلہ ہے، اور اس وقت کے لوگ بڑی عمر والے اور بڑے قد آور ہوتے تھے۔

اور یہ صرف انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دیگر مخلوقات وعام چیزوں کا بھی یہی حال ہوتا تھا۔ کہتے ہیں مرغی اتنی بڑی ہوتی تھی جیسے بکری کا بچہ، اور اس کا انڈا بڑے سیب جتنا ہوتا تھا، اوسیب وانار تربوز جتنے، اور تربوز مٹکے جتنے بڑے ہوتے تھے۔ پوری تفصیل حیات الحیوان میں دیکھی جائے۔

سورۂ شعراء میں ان لوگوں کے بارہ میں ہے: ﴿وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ﴾ [الشعراء: ۱۳۰] (اور جب کسی کی پکڑ کرتے ہو تو پکے ظالم وجابر بن کر پکڑ کرتے ہو)۔ ان لوگوں کی پکڑ اور گرفت نہایت سخت ہوتی تھی، اس لئے کہ یہ سارے قد آور، جسیم وبڑے پہلوان تھے، جیسے سورۃ الفجر میں ارشاد ہے: ﴿إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ﴾ [الفجر: ۸] (اس اونچے ستونوں والی قوم ارم کے ساتھ جس کے برابر دنیا کے ملکوں میں کوئی اور قوم پیدا نہیں کی گئی)۔ تمام بلاد یعنی کائنات میں ان لوگوں کا ہم پلہ کوئی پیدا نہیں کیا گیا، تو اسی قوت و پہلوانی کے غرور وگھمنڈ نے انہیں ناسمجھ بنایا، جو انہوں نے سرکشی کی، اور کہا:

﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ ہم سے زیادہ طاقتور کوئی نہیں۔

اسی بت پرست، مغرور وطاقتور قوم میں ربّ العزت سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں میں سے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ آپ علیہ السلام کا نام "عابر" بھی بیان کیا جاتا ہے۔ آپ علیہ السلام سام بن نوح کے بیٹے اِرم کی چھٹی پشت میں پیدا ہوئے۔ آپ علیہ السلام کے والد کا نام عبداللہ یا شالخ تھا۔ آپ علیہ السلام کی والدہ بھی قوم عاد ہی سے ہیں، جن کا نام مقعمہ تھا۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طوفانِ نوح کے دو ہزار چھ سو سال بعد مصر بن بیصر کے دور حکومت میں

حضرت ہود علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ آپ علیہ السلام چار سو ساٹھ یا چار سو اسی سال تک زندہ رہے۔ اور اس پوری مدت میں نہایت محنت اور تندہی سے تبلیغ و دعوت اِلی اللہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ قوم نے مسلسل انکار کیا، اور آپ علیہ السلام کا مذاق اڑایا، اور لوگ طرح طرح کے بہتان باندھتے ہوئے آپ علیہ السلام کو مجنون، بیوقوف، ناہنجان، جادوگر کہتے رہے۔

سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾ [یٰس: ۳۰] (افسوس ہے ایسے بندوں کے حال پر، ان کے پاس کوئی رسول ایسا نہیں آیا جس کا وہ مذاق نہ اڑاتے رہے ہوں)۔

یہ صرف قومِ عاد کا شیوہ نہیں، بلکہ تمام اقوام کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے، اور تاریخ بھی اس پر گواہ ہے، اور قیامت تک یہ ہوتا رہے گا کہ لوگ دینِ حق کو بآسانی قبول نہیں کریں گے، اور دعوت دینے والوں کی محض یہ نہیں کہ ان کی دعوت کو مسترد کریں گے، بلکہ ان کا مذاق اڑائیں گے، اور انہیں پاگل، سفیہ، مجنون اور ساحر کہتے رہیں گے۔ یہ سب کچھ آج ہمارے مشاہدہ میں نمایاں ہے۔

مولویوں، غازیوں، قاریوں، مفتیوں، ائمۂ مساجد اور خطیبوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، اور یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ قوم سے چندہ، خیرات، زکوٰۃ و عشر لے کر مدرسہ بنا رہے ہیں، قوم کے بچوں کو مفلوج اور ناکارہ بنا رہے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ دنیا کدھر سے کدھر جا رہی ہے، لوگ آسمانوں پر کمندیں ڈال رہے ہیں، اور یہ مولانا صاحبان ابھی تک طہارت، پاکی اور پلیدی کے مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

یہ بات وہ بات ہے جو قومِ عاد نے اپنے عظیم المرتبت پیغمبر ہود علیہ السلام کے متعلق کہی تھی، کہ ہم تو تجھے بیوقوف سمجھتے ہیں، چنانچہ وہاں سے اور ان سے پیشتر قومِ نوح سے یہ سلسلہ برابر چلتا رہا، اور یہ شیطانی ترانہ ہر پیغمبر علیہ السلام کے زمانہ میں لوگ بجاتے، اور کہتے رہے، یہاں تک کہ آخری پیغمبر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کے قریش اور طائف کے سرداروں نے کہا، اور سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین علماءِ اُمت کو بھی یہی کہا جا رہا، اور سنایا جا رہا ہے، اور یہ سلسلہ قیامِ قیامت تک شاید جاری رہے گا۔

....

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ

اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا
وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ
اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ
قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَعَقَرُوا
النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَ
نَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: اور قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، صالح نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی
عبادت کرو، تمہارے لئے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے پاس دلیل آچکی ہے، یہ
اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے، جو تمہارے لئے نشانی ہے، سو تم اسے اللہ تعالیٰ کی زمین میں چھوڑے رکھو، وہ کھاتی پھرے، اور
اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگاؤ، ورنہ تمہیں دردناک عذاب پکڑ لے گا ﴿۷۳﴾ اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں عاد کے
بعد زمین میں رہنے کا ٹھکانا دیدیا، تم اس زمین کے نرم حصہ میں محلّات بناتے ہو، اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو،
سو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو، اور زمین میں فساد مت کرو ﴿۷۴﴾ ان کی قوم کے جو متکبر سردار تھے انہوں نے ضعیفوں سے
کہا، جو ان میں سے ایمان لائے تھے: کیا تم اس بات کا یقین کرتے ہو کہ صالح اس کے ربّ کی طرف سے بھیجا ہوا
رسول ہے؟ انہوں نے جواب دیا: بیشک جو کچھ ان کو دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں ﴿۷۵﴾ متکبر
سرداروں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ تم جس پر ایمان لائے ہو ہم اس کے منکر ہیں ﴿۷۶﴾ سو انہوں نے اونٹنی کو کاٹ
ڈالا، اوا پنے ربّ کا حکم ماننے سے سرکشی کی، اور کہنے لگے کہ اے صالح! اگر تم پیغمبروں میں سے ہو تو جس چیز کی تم
ہمیں دھمکی دیتے ہو وہ لے آؤ ﴿۷۷﴾ سو پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے، سو وہ اوندھے منہ ہو کر اپنے گھروں میں پڑے رہ گئے ﴿۷۸﴾
پھر صالح نے ان سے منہ موڑا، اور فرمایا کہ اے میری قوم! بلاشبہ میں نے تم کو اپنے ربّ کا پیغام پہنچا دیا، اور تمہاری
خیر خواہی کی، لیکن تم خیر خواہی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو ﴿۷۹﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

قومِ ثمود کا مختصر تعارف:

قومِ ثمود سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے۔ سامی اقوام کو عرب مؤرخین "اُمَمِ بائدہ" (ہلاک شدہ اقوام) کہتے ہیں، کیونکہ وہ انقلابات اور حوادث کی نذر ہو کر فنا و ہلاک ہوگئیں۔ اور "عربِ عاربہ" بھی کہتے ہیں، کیونکہ وہ عرب کے خالص النسل لوگ تھے۔ ان میں غیر عرب قوموں کا پیوند نہیں لگا تھا۔ ان اُمَمِ بائدہ، یا عربِ عاربہ کا سلسلۂ نسب تمام مؤرخین کے بیان کے مطابق اِرم بن سام بن نوح پر منتہی ہوتا ہے۔

تحقیقاتِ جدیدہ، اور قدیم تاریخ دانوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے، یعنی اُمَمِ سامیہ بڑی پُر شکوہ اور باعظمت قومیں تھیں، جنہوں نے بابل، واسیریا، مصر، شام، یمن اور قرطاجنہ میں بڑی بڑی متمدن سلطنتیں قائم کیں، اور مدتِ دراز تک ان ممالک کو اپنے زیرِ نگیں رکھا۔ عرب مؤرخین ان ہی اُمَمِ سامیہ کو عرب بائدہ یا عربِ عاربہ، اور ان کے مختلف قبیلوں کو عاد، ثمود، طسم، جدیس کہتے ہیں۔

اندرونِ عرب میں حضرموت سے سواحلِ خلیج فارس کے طول میں عراق تک عاد، اور حجاز سے حدودِ سینا تک ثمود، یمامہ میں طسم وجدیس اور یمن میں اہلِ معین حکمران تھے۔

قومِ ثمود کا دورِ ترقی ہلاکتِ عادِ اُولیٰ کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اور ثمود جس کو عادِ دوُم کہتے ہیں عادِ اُولیٰ کی ہلاکت سے دو سو سال بعد اس کی ترقی اور تمدّن، پھر ہلاکت کا مرحلہ ہے۔ یہ دونوں قومیں بھائی ہیں، اور خالص عرب ہیں، جیسے ابھی بیان ہوا۔ ثمود شمالی عرب کی ایک زبردست اور پُرشکوہ قوم تھی، اور قومِ ثمود کے متعلق شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ بڑے متمدّن لوگ تھے۔ ان میں بڑے بڑے انجنیئر اور کاریگر تھے۔ تبوک سے لے کر وادی القریٰ تک اس قوم کے ایک ہزار سات سو بڑے بڑے شہر اور قصبے آباد تھے۔ اور یہ لوگ عام معمولی مکان بنانے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ عالیشان، وسیع وعریض، بڑے بڑے نقش ونگار سے مزیّن محلّات اور کوٹھیاں تعمیر کرتے تھے۔

اس قوم کی ہلاکت کو تقریباً پانچ ہزار سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، مگر پہاڑوں کے اندر کے مکانات ابھی تک ثابت ہیں، اور مکینوں کی ہلاکت کی گواہی دے رہے ہیں۔ یہ لوگ قدوقامت، اور کسب وہنر، اور فنِ تعمیر میں

اپنے بھائیوں قومِ عاد سے کسی معاملہ میں کم نہ تھے۔ یہ ہزاروں کمالات کے باوجود اپنے شرک و بت پرستی کی وجہ سے ربّ العزّت کی مخلوق دھرتی پر بڑے بوجھ تھے۔ بُت پرستی ان کا مذہب تھا، طرح طرح کے مختلف ناموں کے مختلف مقاصد کے لئے قوم عاد کی طرح بُت بنا رکھے تھے، اور ان کی عبادت کرتے تھے، اور ستاروں کی ہیکلوں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ چنانچہ سنّتِ الٰہیہ کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے، اور انہیں دینِ حق کی دعوت دی، لیکن بدبخت اور عاد کی طرح بدنصیب قوم نے قبول نہ کیا، اور معجزہ کی طالب ہوئی کہ فلاں نامی پہاڑ کے فلاں چٹان سے خوبصوت گابھن اونٹنی کی پیدائش ہو۔

حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں خبردار کیا کہ فرمائشی معجزہ اللہ تعالیٰ کے بہت ہی آسان ہے، مگر دیکھو! اگر معجزہ کے ظہور کے بعد تم لوگ ایمان لانے، اور حکم ماننے سے انکاری ہوئے، تو اس کا نتیجہ تمہارے حق میں نہایت خطرناک ہوگا، اور یہی معجزہ تمہاری تباہی اور ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ قومی سرداروں نے عہد و پیمان کر کے اقرار کیا کہ معجزہ ظاہر ہونے کے بعد ہم آپ علیہ السلام کی تصدیق کریں گے، اور ایمان لائیں گے، چنانچہ پیغمبر علیہ السلام نے ان کی فرمائش والا معجزہ اللہ تعالیٰ شانہ سے مانگا، اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر درخواست پیش کی۔ لوگوں کے بڑے مجمع کی موجودگی میں مطلوبہ پتھر سے خوبصورت گابھن اونٹنی ظاہر ہوئی، جسے پورے مجمع نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کے ساتھ دیکھ لیا، اسی نظارے کے دوران اس کا بچہ بھی نہایت آسانی کے ساتھ ماں کی ہمشکل رنگ و صورت میں پیدا ہو کر ہنہنانے لگا، گویا کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا پڑھی، اور بیان کی۔

قوم نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہمارا مطالبہ پورا ہو گیا تو ہم بلا چون وچرا ایمان لائیں گے، مگر وہ کہاں ایمان لانے پر آمادہ ہوتے؟ بلکہ وہ آپس میں طے کر کے ایمان لانے سے منحرف ہو گئے، صرف چند خوش قسمت لوگ سرِ تسلیم خم کر کے ایمان لانے پر تیار ہو گئے، جن کی تعداد چھ ہزار تھی، باقی پوری قوم پہلے کی طرح سرکشی اور عداوت پر اتر آئی، اور پیغمبر علیہ السلام کو جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ پس انہوں نے چند مفسدوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ رات کی تاریکی میں جا کر حضرت صالح علیہ السلام کو شہید کریں۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنے گھر کے قریب مسجد تعمیر کرائی تھی، جہاں وہ ساری رات عبادت و نماز میں مصروف رہتے تھے۔ یہ لوگ وہاں پہنچے تو حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں بددعاء دی، وہ آٹھ نو آدمی سب کے سب اندھے ہوئے، پھر مر گئے۔ صبح قوم نے واویلا شروع کر کے حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف لشکر کشی کا بہانہ بنایا۔ جن

چھ ہزار لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، وہ فوری طور پر پیغمبر علیہ السلام کی حفاظت وحمایت پر وہاں پہنچے، اس طرح یہ کارزار دم توڑ گئی، اور اندر اندر مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔

دوسری طرف صالح علیہ السلام نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ مخصوص جگہ جو اونٹنی کے چرنے اور گھاس کھانے کے لیے مقرر ہے، وہ اپنے مال مویشی وہاں نہیں اتاریں گے، اور جس مخصوص کنویں سے مویشیوں کو پانی پلایا جاتا تھا ایک دن وہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلائیں گے، اور ایک دن اونٹنی کیلئے مخصوص ہوگا، بصورتِ خلاف ورزی وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا شکار ہو جائیں گے۔

ابتداء میں قوم نے یہ فیصلہ تسلیم کیا، مگر رفتہ رفتہ وہ انکار پر اتر آئے۔ ادھر اونٹنی کا یہ حال ہے کہ وہ ایک دن میں سارا پانی پی جاتی ہے، جو ہزاروں اونٹوں کو سیراب کرتا ہے۔ جب وہ لوگ اس مصالحت کے خلاف متفق ہو گئے، اور اونٹنی کو مار ڈالنے کا مصمّم ارادہ کر لیا تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے، ایک مالدار فاحشہ عورت نے قدار بن سالف زانی بدمعاش کے ساتھ معاہدہ کیا کہ اگر تم نے اس اونٹنی کو ہلاک کیا تو میں تجھ سے شادی کروں گی۔ وہ خبیث النفس شریر اس پر آمادہ ہوا، اور اپنے چند دیگر ہمنوا ساتھیوں کو لے کر اس میدان میں پہنچا جہاں سے اونٹنی کو گزرنا تھا۔

جب صالح علیہ السلام نے انہیں طرح طرح سے سمجھایا، اور عذابِ الٰہی سے انہیں ڈرایا، یہ لوگ اور زیادہ بدمعاشی پر اتر آئے، اور اونٹنی کے پچھلے پاؤں کی رگوں کو تلوار سے کاٹ لیا، اس طرح وہ گر گئی، اور مجرموں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا گوشت تقسیم کر لیا۔ جب وہ اونٹنی پر وار کر رہے تھے تو اس کا بچہ اپنی ماں کا یہ حال دیکھ کر جنگل کی طرف بھاگ نکلا، اور غائب ہو گیا۔

پھر صالح علیہ السلام نے انہیں دوبارہ کہا کہ اگر تم لوگ اونٹنی کے بچے کو تلاش کر کے جنگل سے لے آؤ گے تو پھر بھی عذاب سے بچ سکو گے، مگر وہ کہاں تیار ہوتے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے چند مسلمانوں کو جنگل روانہ کیا کہ اونٹنی کے بچے کو تلاش کر کے لے آؤ، جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو وہ بچہ انہیں دیکھ کر اسی پتھر کی طرف بھاگا جہاں اس کی والدہ کا مستقر تھا، جب وہاں پہنچا تو اسی پتھر میں ہمیشہ کیلئے غائب ہو گیا۔ تب صالح علیہ السلام نے قوم کو عذابِ الٰہی کی آمد کا حال سنایا، اور اپنی جماعت (مسلمانوں) کو لے کر وہاں سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔

انہوں نے قوم سے کہا تھا کہ تین دن کے بعد تمہارے اوپر عمومی عذاب آنے والا ہے، پہلے دن تم سب کے چہرے زرد ہو جائیں گے۔ دوسرے دن سرخ، اور تیسرے دن مکمل سیاہ ہو جائیں گے۔ تین دن گزرنے پر جب

عذاب کے آثار شروع ہو گئے، اور سب کے چہرے زرد ہو گئے، دوسرے دن سب کے چہرے سرخ ہو گئے، تو اس وقت تمام اہلِ ایمان شہروں سے نکل چکے تھے، اگلے دن جب سب کے چہرے سیاہ ہو گئے تو انہیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا۔ پھر انہوں نے اپنے بنائے ہوئے مضبوط قلعوں اور مکانات میں داخل ہو کر بزعمِ خود پناہ لی، اور محفوظ ہو گئے۔ ادھر سیاہ وحشت ناک آندھی چلی، تباہ کن زلزلہ آیا، اور تین بار سخت ہیبت ناک کڑک کی زوردار آوازیں آئیں کہ ان کی ناپاک مردار روحیں ان کے منحوس جسموں سے جدا ہو گئیں، اور ان کے کلیجے پھٹ گئے، اور سب اپنے محلات اور قلعوں میں منہ کے بل مردے پڑے رہ گئے۔ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ. اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ بَطْشِكَ وَ غَضَبِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ. فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ.

تین دن کے وقفہ ومہلت کے بعد ان کے ربّ نے ایک ہمہ گیر عمومی عذاب سے ان کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا، ان کے شرک و نافرمانی اور دیگر گناہوں کے سبب سے، یعنی تکذیب صالح علیہ السلام اور قتلِ ناقہ وغیرہ سے۔ ﴿فَسَوّٰىهَا﴾ [الشمس: ۱۴] (سب کو برابر کر دیا) یعنی تباہی و ہلاکت ایسی کر دی کہ سب زمین کے ساتھ برابر ہو گئے۔ پوری قوم کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا۔

البتہ قوم کا ایک شخص ابورغال نامی کسی کام پر مکہ شریف گیا تھا، وہ سزا سے بچا رہا، کیونکہ وہ بلدِ امین مکہ مکرمہ میں تھا، مگر جب وہ مکہ مکرمہ سے نکل کر طائف کی طرف روانہ ہوا تو اس پر بھی وہی عذاب نازل ہوا جو اس کی قوم پر ہوا تھا۔ [مسند احمد، ابن کثیر]

اس کی قبر کا نشان وہاں موجود تھا، لوگ اس پر پتھر مارتے تھے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ وہاں گزر ہوا تو فرمایا: معلوم ہے کہ لوگ اس قبر پر کیوں پتھر مارتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: حضور! اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ ابورغال کی قبر ہے، یہ قومِ ثمود کا ایک شخص تھا، جب تک حرم میں موجود رہا عذاب سے محفوظ رہا، مگر جب وہاں سے نکلا تو اس کو بھی عذاب نے پکڑ لیا۔ فرمایا: اس کی نشانی یہ ہے کہ اس شخص کے پاس سونے کی ایک چھڑی تھی، جب اس کی قبر اکھاڑی گئی تو لاش گل سڑ چکی تھی، مگر سونے کی چھڑی وہاں موجود تھی۔ اس طرح اس معتوب شخص کی نشاندہی بھی ہو گئی۔

بعض مؤرخین نے لکھا کہ یہ ابورغال نامی شخص قومِ ثقیف کا ایک نامور سردار تھا، جو ابرہہ اشرم کے لشکر کی راہنمائی کرتے ہوئے طائف سے مزدلفہ وادی محسر تک ان کے ساتھ چلا تھا، پھر راستے میں مر گیا تھا، اور لوگ اس کی

قبر پر سنگباری کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دوسرا شخص ہو، اس کا نام بھی ابورغال ہو۔ واللہ اعلم

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ تم کو بتاؤں کہ سب سے بڑا شقی کون ہے؟ عرض کیا: فرمایئے، ارشاد فرمایا: ایک تو وہ جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کیا، اور اس سے بڑا بد بخت شقی وہ ہے جو تمہارے سر پر تلوار مار کر تمہاری داڑھی خون سے رنگین کردے گا، [تفسیر مظہری بروایت احمد] یہ شقی عبدالرحمٰن بن ملجم خارجی تھا، جس نے سیدنا حضرت علی امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ پر ماہِ رمضان میں مسجد کے اندر تلوار سے وار کیا، آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کا خاتمہ ہوا، جس سے پوری اُمت کو وہ نقصان پہنچا جس کی تلافی قیامت تک نہ ہوسکی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

جس طرح عنیزہ نامی منحوس عورت کو حاصل کرنے کیلئے قدار بن سالف شقی نے حضرت صالح علیہ السلام کی بابرکت اونٹنی کو ہلاک کیا تھا، بعینہٖ اسی طرح اُمت کے شقی ابن ملجم ملعون نے قطامہ نامی خارجی عورت کو حاصل کرنے کیلئے امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو شہید کیا۔

انسانی خواہشات اور شہوتوں میں فرج کی شہوت سب سے زیادہ شرمناک اور بدترین اور نہایت خبیث ہے۔ اسی شہوت فرج ہی کی کارستانی نے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل کو اپنے بھائی حضرت ہابیل کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔ قیامت تک جتنے بھی قتل ہوں گے ان میں قابیل کا حصہ برابر ہوگا۔ فرمایا:

﴿وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ اور قومِ ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا، انہوں نے بھی اپنی قوم کو وہی سبق دیا جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قوموں کو دیتے آئے ہیں۔ فرمایا: اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ مَافوقَ الْاَسباب صرف وہی تمہارا مشکل کشا حاجت روا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت صالح علیہ السلام کا نام آٹھ جگہ آیا ہے: سورۂ اعراف کے اسی رکوع میں تین مرتبہ، سورۂ ہود میں چار مرتبہ، اور سورۂ شعراء میں ایک مرتبہ۔ اور ثمود کا ذکر نو سورتوں میں چھبیس مرتبہ آیا ہے، یعنی سورۂ اعراف، سورۂ ہود، سورۂ حجر، سورۂ نمل، سورۂ فصلت، سورۃ النجم، سورۃ القمر، سورۃ الحاقۃ اور سورۃ الشمس میں۔

حضرت صالح علیہ السلام کا نسب نامہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے:

صالح بن عبید بن آصف بن ماشح بن عبید بن حادر بن ثمود۔ پس اس قوم کو ثمود اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے

نسب نامہ کا جدِّ اعلیٰ ثمود ہے، اور اسی کی طرف یہ قوم منسوب ہے۔

﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً﴾ بلا شبہ تمہارے پاس کھلی نشانی یا دلیل آچکی ہے، تمہارے ربّ کی طرف سے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے۔ یہ تمہارے لئے واضح نشانی ہے۔ تمام اونٹنیاں اور سارے جانور اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور مخلوق ہیں، مگر اس اونٹنی کو خاص شرافت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کہا گیا، جیسے کتاب اللہ، کعبۃ اللہ، مساجد اللہ، سب میں اضافت شرافت کی وجہ سے ہے۔ مؤرخین اور سیاح لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جس پتھر سے اونٹنی کو نکالا گیا تھا اس میں سات فٹ کا شگاف اب بھی موجود ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں اس علاقے میں گیا جہاں وہ اونٹنی بیٹھا کرتی تھی، میں نے اس کے بیٹھنے کی جگہ نوے ۹۰ فٹ پیمائش کی۔ [تفسیر عزیزی]

﴿فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ اس کو آزاد چھوڑ دو، یہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں جہاں سے چاہے کھائے، اس کے راستے میں حائل نہ ہوں، اور اسے کسی بُرے ارادے، اور بدنیتی سے ہاتھ نہ لگاؤ، اور کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ، یہ بہت بابرکت ہے، جسے ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں ربّ العزّت نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے معجزے کے طور پر پتھر سے نکالا ہے، لہٰذا تم سب اس کی بے احترامی سے بچو، ورنہ تمہارے اوپر دردناک عذاب کا نزول ہوگا۔

﴿وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ﴾ ......تا...... ﴿الْجِبَالَ بُيُوْتًا﴾ اور یہ یاد رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں قومِ عاد کے بعد نائب بنادیا، یعنی تمہیں ان کا جانشین بنایا (دراصل یہ لوگ قومِ عاد کے بقایا تھے، جو کہ عاد کی ہلاکت سے کچھ پہلے وہاں سے ہجرت کرکے مقامِ حجر اور وادی القریٰ کے زرخیز علاقے میں آباد ہوچکے تھے، انہیں قومِ عاد کی تباہی کا اچھی طرح سے علم تھا، مگر ان کی عقلوں پر شیطان کا تسلّط رہا، اور انہوں نے اپنے پیشرو قوم عاد کی ہلاکت سے سبق نہ سیکھا، اور عبرت حاصل نہ کی)۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین میں ٹھکانہ دیا، تم اپنے آرام اور خوشحالی کے لئے اس سرزمین کی نرم جگہوں پر محلات وقصور تعمیر کرتے ہو، اور پرتکلف پہاڑوں سے بڑے بڑے مکانات اور عمدہ بلڈنگیں تیار کرتے رہتے ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور بخشش نہیں تو اور کیا ہے کہ مضبوط پہاڑوں کو تراش تراش کر تم لوگ اپنے لئے گھر بناتے ہو۔

﴿فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرو، اس کی

احسان فراموشی نہ کرو، اور زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے نہ چلو۔ یہاں تک حضرت صالح کی تقریر اور نصیحت تھی، جو انہوں نے قوم کے سامنے کی۔ اب قوم کا جواب ہوگا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا﴾ سے تا ﴿اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾ آپ علیہ السلام کی قوم کے سربرآوردہ لوگ جنہوں نے تکبر کیا، وہ جواب میں کہنے لگے: ان مسلمان غریب لوگوں سے جو کمزور وضعیف خیال کئے جاتے تھے، ان کی تعداد چھ ہزار کے قریب تھی۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مال ودولت اور اقتدار کی وجہ سے بڑے تھے، اور نہایت متکبر ومغرور بھی تھے، انہوں نے غریب اور کمزور مسلمانوں سے کہا کہ کیا تم جانتے اور باور کرتے ہو کہ حضرت صالح علیہ السلام واقعی اپنے ربّ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں؟ تو ایمان والوں نے کہا کہ بیشک ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو صالح علیہ السلام کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فلاح اور کامیابی صرف ان پر ایمان کے ساتھ وابستہ ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سچے اور برحق پیغمبر ہیں، اور ان کی تعلیم حقیقی اور سچی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور یہ جان لو کہ اس کے سوا کوئی معبود ومسجود نہیں ہے۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴾ قوم کے سرمایہ دار متکبرین نے کہا کہ جس چیز پر تم ایمان لائے ہو، ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہر نبی کے دور میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ اوّلین ایماندار غریب لوگ ہوتے ہیں، اور اوّلین معاندین امیر لوگ ہوتے ہیں۔ یہ اگر ایمان لائیں گے تو بہت مجبوری کے بعد دیر سے، پھر اتباعِ حق وعمل بالشریعۃ ان میں برائے نام ہی ہوتا ہے۔ آج بھی امراء وغرباء میں یہ فرق نہایت واضح اور عیاں ہے۔ ؎

امراء نشہ دولت میں ہیں بیزار ہم سے ☆ زندہ ہے ملت بیضاء غرباء کے دم سے

(اقبالؒ)

﴿فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ﴾ ان شریروں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ لئے، اور اپنے ربّ کے حکم کی نافرمانی کی۔ اس پر انہوں نے اکتفاء نہیں کیا، بلکہ حضرت صالح علیہ السلام کو بھی راتوں رات شہید کرنا چاہا، جیسا کہ سورۂ نمل میں ارشاد ہے، فرمایا: ﴿وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ [النمل: ۴۸] (اور شہر میں نو آدمی ایسے تھے جو زمین میں فساد مچاتے تھے)۔ یہ لوگ مسلح ہو کر حضرت صالح علیہ السلام کے پاس پہنچے، مگر اللہ

تعالیٰ نے انہیں اندھا کر کے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی حفاظت فرمائی۔ اس موقع پر اہلِ ایمان بھی پہنچے، انہوں نے پیغمبر علیہ السلام کے تحفظ کا سامان کر دیا، اور حضرت صالح علیہ السلام محفوظ رہے۔

﴿وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو دھمکی آمیز لہجہ میں کہا کہ اگر تو واقعی رسولوں میں سے ہے تو وہ چیز لے آ جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے۔ اتنے بیباک اور جری ہو چکے تھے کہ خود عذاب کا مطالبہ کرنے لگے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا:

﴿تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ﴾ [هود:٦٥] (تین دن تک خوب فائدہ اٹھاؤ، پھر وہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہوگا) اور تم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ پہلے دن تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے، دوسرے دن سرخ، اور تیسرے روز سیاہ ہو جائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

کاش یہ نافرمان قوم اگر اوّل روز اپنے چہروں کی زردی دیکھ کر قومِ یونس کی طرح سارے مل کر توبہ کر لیتے، تو شاید کچھ ہو جاتا۔ ربّ العزّت سبحانہ نے ارشاد فرمایا کہ میری رحمت نے میرے غضب پر سبقت کی ہے۔ [بخاري]
مگر یہ لوگ اپنے کبر و غرور کی انتہاء کو پہنچے ہوئے تھے، وہ کہاں توبہ پر آمادہ ہوتے؟ پہلا دن جمعرات کا تھا، دوسرا جمعہ، اور تیسرا ہفتہ کا، جس میں ان کے چہرے سیاہ ہوئے، چوتھے روز اتوار کو عذابِ موعود نے انہیں تباہ و ہلاک کر دیا، اور ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا کر ختم کر دیا۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ﴾ ان کو سخت زلزلہ نے پکڑ لیا سورۂ ہود میں فرمایا:
﴿وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ﴾ [هود:٦٧] (اور جن لوگوں نے ظلم کا راستہ اپنایا تھا ان کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا)۔ سورۂ ذاریات میں فرمایا: ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ﴾ [الذاريات:٤٤] (ان کو چیخ نے آ پکڑا) فرشتے نے ایسی زوردار ہولناک چیخ ماری کہ لوگوں کے دل اور جگر پھٹ گئے، ان میں سے کوئی زندہ نہ بچا، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لا چکے تھے۔

﴿فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ﴾ پس وہ ہو گئے اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل گرے پڑے۔ جب زبردست زلزلہ آیا تو سارے زمین پر گر پڑے، دوبارہ اُٹھنے کی ہمت نہ رہی، اور ساتھ ہی خوفناک چیخ سنائی دی، جس نے باقی کسر پوری کر دی، اور سب اوندھے پڑے رہ گئے، جیسے ان میں کبھی رہے ہی نہ تھے۔

﴿فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ﴾ پھر صالح علیہ السلام وہاں

سے پلٹے، اور اپنی ہلاک شدہ قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے میری قوم! میں نے تو تمہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا، اور تم سے پوری پوری خیر خواہی کی۔ کہتے ہیں کہ ان کی تبلیغ کا عرصہ تیس سال ہے۔ واللہ اعلم!

بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ جب قوم پر عذاب آنے کے آثار دیکھ لئے، اور محسوس فرمایا کہ عذاب آنے ہی کو ہے، تو حضرت صالح علیہ السلام ان کو چھوڑ کر اپنے چھ ہزار ساتھی مسلمانوں کو لے کر وہاں سے روانہ ہو گئے، اور قوم سے یہ آخری خطاب فرمایا، جو حسرت بھرے انداز میں ہے۔

اور بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ جب قوم پوری طرح برباد ہو گئی تو حضرت صالح علیہ السلام نے ان کی پڑی ہوئی تباہ شدہ لاشوں سے خطاب فرمایا۔ یہ خطاب ایسا ہی ہے جیسا کہ غزوۂ بدر میں مرے ہوئے اور کنویں میں پھینکے ہوئے صنادید قریش کی نعشوں سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطاب فرمایا تھا، جس کا بیان دو رکوع پہلے گزر گیا۔ پھر حضرت صالح علیہ السلام نے وہاں رہنا پسند نہیں فرمایا، جہاں خوفناک عذاب آ گیا ہو۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ مکہ شریف چلے گئے۔ بعض حضرات نے کہا کہ آپ علیہ السلام فلسطین چلے گئے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۹ سنہ ھ کو جب غزوۂ تبوک کے سلسلے میں تبوک تشریف لے جا رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر مدائن صالح علیہ السلام (وادی حجر، وادی القریٰ) سے ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چہرۂ انور پر نقاب ڈال کر گزرے، اور بڑی سرعت وتیزی کے ساتھ گزرے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: یہاں سے جلدی گزرو، اور روتے ہوئے، استغفار کرتے ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ مانگتے ہوئے گزرو، ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہ عذاب پہنچ جائے جو ان مجرموں کو پہنچا تھا۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ عذاب کی جگہ پر کوئی نہ جائے، اور نہ وہاں کے کنویں کا پانی استعمال کرے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم نے تو یہاں کے کنوؤں کے پانی کو استعمال کیا ہے، اور اس پانی سے آٹا گوندھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ پانی گرا دو، اور جو آٹا گوندھا ہے اسے اونٹوں کو کھلا دو۔ [بخاري]

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿٨١﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ

قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: اورہم نے لوط کو بھیجا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیاتم بے حیائی کا کام کرتے ہو؟ جسے تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا ﴿۸۰﴾ بیشک تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت رانی کے لئے مردوں کے پاس آتے ہو، بلکہ تم لوگ حد سے گزر جانے والے ہو ﴿۸۱﴾ اوران کی قوم کا جواب اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو، بیشک یہ ایسے لوگ ہیں جو پاکباز بنتے ہیں ﴿۸۲﴾ سو ہم نے نجات دی لوط کو، اوراس کے گھر والوں کو، سوائے اس کی بیوی کے کہ وہ رہ جانے والوں میں سے تھی ﴿۸۳﴾ اور ہم نے ان پر ایک بڑی بارش برسادی، سو دیکھ کیسا انجام ہے مجرمین کا؟ ﴿۸۴﴾

معارف ومنازل

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ان کے والد کا نام ہاران تھا۔بعضوں نے عمران لکھا ہے۔لوط علیہ السلام کی پرورش اورنشوونما حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیرسایہ ہوئی، چنانچہ وہ اورحضرت سارہ ملت ابراہیمی کے پہلے مسلم اور ﴿اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ [التوبة:۱۰۰] (آگے بڑھنے والے پہلے) ہیں۔حضرت لوط علیہ السلام کا نام قرآن کریم کی چودہ سورتوں میں ستائیس مرتبہ مذکور ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام اوران کی بدکردار قوم کا مفصّل قصہ سورۂ ہود، سورۂ حجر، سورۂ شعراء اور سورۂ عنکبوت میں مذکور ہے۔دوسرے مقامات پر مختصرً اتھوڑا تھوڑا مذکور ہے، اورکُل ستائیس مقامات ہیں۔یہاں سورۂ اعراف میں ان کی قوم کی صرف ایک بدکاری کا تذکرہ ہے، وہ یہ کہ مرد مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے تھے۔حضرت لوط علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ یہ بے حیائی خلافِ فطرت ایسا بُرا کام ہے جسے تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔یہ جانوروں سے بھی بدتر کام ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے خلاف کام ہے، یہ انسانی فطرت کے بھی خلاف ہے، اور نہایت بُرا اور بے مقصد عمل ہے۔

اس قوم کی دوسری بدکرداری یہ تھی کہ راہزنی اورلوٹ مار کرتے تھے، فرمایا: ﴿وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ﴾ [العنكبوت:۲۹] (اورتم راہزنی کرتے ہو)۔حضرت لوط علیہ السلام نے بارہ تیرہ سال تک مسلسل انہیں

سمجھایا، اورنہایت سوز وگداز سے انہیں تبلیغ کی، لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ وہ بیک وقت کفر وشرک اوراس منحوس عمل اغلام بازی میں مبتلا رہے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ لوط (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اوراس کے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دو، یہ پاکیزہ بننا چاہتے ہیں، اورہمیں گندہ اورناپاک کہتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے مزاق واستہزاء کرکے کہی کہ وہ پاکیزہ بننا چاہتے ہیں۔ لوط علیہ السلام شب وروز انہیں تبلیغ کرتے رہتے تھے، اوروہ کبھی توان کوشہر سے نکالنے کی دھمکی دیتے تھے، اورکبھی یہ کہتے کہ اگرتوواقعی سچاہے تولے آ وہ عذاب جس سے توہمیں ڈرایا کرتا ہے۔

وہ دراصل عذاب کے بارے میں مذاق کرتے تھے، اورلوط علیہ السلام اوران کے کہنے پر یقین نہیں کرتے تھے، کیونکہ جولوگ خدا کے منکر، رسالت کے منکر، اورقیامت کے منکر ہوں ان کوتوکسی عذاب کا یقین ہی نہیں ہوتا۔ اس پورے عرصہ میں قوم میں سے کوئی شخص بھی مسلمان نہیں ہوا، البتہ ان کی بچیاں مسلمان ہوگئیں، مگران کی بیوی نوح علیہ السلام کی بیوی کی طرح بدستور کافرہ رہی، اورقوم کے اوپر آنے والے عذاب میں ہلاک ہوگئی۔

حضرت لوط علیہ السلام جن بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے وہ کُل سات بستیاں تھیں، تین چھوٹی، اور چار بڑی بستیاں ہوتی تھیں، جن کی مرکزی بڑی بستی کا نام "سدّوم" تھا۔ دوسری "عامورا"۔ تیسری "اومہ"۔ چوتھی "صبویر"۔ پانچویں "صوغر"۔ چھٹی "بالع"۔ ساتویں "صبوہیم"۔ قرآن کریم نے ان کے مجموعہ کو "مُؤْتَفِكَةٌ" اور "مُؤْتَفِكَات" کے ناموں سے ذکرکیا ہے، یعنی اُلٹی ہوئی بستیاں۔

یہ بستیاں اُردن اور بیت المقدس کے درمیان واقع تھیں۔ یہ علاقہ اس زمانہ میں نہایت سرسبز وشاداب، گنجان درختوں اورمچھلیوں کا گہوارہ شمارہوتا تھا۔ عذاب آنے کے بعد ایسا سمٹ گیا کہ وہاں بربادی، اورنہایت تلخ و بدبودار پانی، اورشورہ ناک عذاب کے پانی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا، جنہوں نے خدائی نعمتوں کی مسلسل ناشکری کی، انہیں صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا کرانتقام کا نشانہ بنایا گیا۔

﴿وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ﴾ حضرت لوط علیہ السلام نے جب اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو:

﴿مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہ تم سے پہلے جہاں بھر میں یہ کام کسی نے کبھی نہیں کیا؟ زنا ہو یالواطت دونوں حرام اور بے حیائی کے گندے عمل ہیں۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہ لواطت طبعًا، عقلاً شرعًا اورعرفا ہرلحاظ سے قبیح وحرام ہے۔ زنا قطعًا حرام ہے، اگرچہ طبعی محل میں ہوتا ہے، مگرلواطت کا تعلق توغیرطبعی

محل سے ہے، لہٰذا اس کا جرم زنا سے بھی شدید اور سخت ہے۔ کہتے ہیں کہ سدوم اور اس کے اطراف میں باغات بہت بکثرت تھے، اِدھر اُدھر کی بستیوں سے بچے بکثرت پھل توڑنے کے لئے آتے تھے، شیطان نے باغ والوں کو پٹی پڑھائی کہ آنے والوں یعنی بچوں کو سزا دیدو، ان کے ساتھ یہ فعل کرو، پھر وہ تمہارے پھل توڑنے کے لئے نہیں آئیں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا، اس طرح اس فعلِ بد کی ابتدا ہوئی، اور لوگ آہستہ آہستہ اس فعلِ بد کے عادی ہو گئے، اور ان کی فطرت مسخ ہوگئی۔ اس سے پہلے اس کام کا پورے عالم میں نہ رواج تھا اور نہ ہی اس کو کوئی جانتا تھا۔

﴿اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ﴾ تم مردوں پر شہوت رانی کرتے ہوئے دوڑتے ہو، عورتوں کو چھوڑ کر۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تسکین اور جائز مقصد پورا کرنے کے لئے عورتوں کو پیدا فرمایا ہے، تم انہیں چھوڑ کر غیر فطری، غیر اخلاقی، بے حیائی کا ارتکاب کر کے نہایت بدکار ہو گئے ہو، کیونکہ حیوانات میں بھی یہ کام نہیں ہوتا۔ خوب اندازہ لگاؤ کہ تم حیوانات سے بھی بدتر ہو۔

﴿وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ﴾ تو نہیں تھا قوم کا جواب سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ لوط اور اس کے ماننے والوں کو اپنے شہر سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں، انہیں ہم گناہگاروں کی بستی سے کیا سروکار؟ انہیں یہاں سے کسی اور اچھی جگہ چلے جانا چاہئے۔ لوط علیہ السلام نے پہلے سے کہا تھا: ﴿اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ﴾ [الشعراء: ۱۶۸] (میں تمہارے عمل سے نفرت کرتا ہوں)۔ اور دعا کرتے رہے: ﴿رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الشعراء: ۱۶۹] (اے میرے ربّ! مجھے اور میرے خاندان کو نجات دے اس عمل سے جو وہ کرتے ہیں)۔ اس عرصہ میں لوگوں نے آپ علیہ السلام کو کئی مرتبہ مارا پیٹا، گالیاں دیں، آپ علیہ السلام پر پتھر برسائے، آپ علیہ السلام کا تمسخر اڑایا۔

﴿فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ﴾ ہم نے آپ علیہ السلام کو اور آپ علیہ السلام کی دونوں پاکیزہ بچیوں کو بچایا، سوائے بیوی کے کہ وہ اپنی قوم کے مذہب پر تھی، اور انہی کے ساتھ جہنم رسید ہوگئی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے بحکمِ الٰہی راتوں رات بچیوں کو ساتھ لے کر وہاں سے ہجرت فرمائی، اور بیوی ساتھ جانے سے منکر ہوئی۔ صحیح روایت یہی ہے کہ وہ جانے پر تیار نہیں ہوئی۔ پیچھے سے فرشتوں کے سردار حضرت جبریل علیہ السلام نے کارروائی شروع کر کے وہ نظارہ پیش کیا کہ الامان والحفیظ۔ فرمایا:

﴿وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا﴾ ہم نے ان پر خاص قسم کی بارش برسائی۔ سورۂ ہود میں یوں ارشاد فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَاءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ﴾ [هود:۸۳] (جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے زمین کے اوپر والے حصے کو نیچے والا حصہ کر دیا، اور ہم نے اس زمین پر کنکر کے پتھروں کی بارش برسادی، جو لگا تار گر رہے تھے، جو آپ کے ربّ کے پاس نشان لگے ہوئے تھے۔ اور یہ ظالموں سے دور نہیں ہیں)۔

سورۂ حجر میں فرمایا: ﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ [الحجر: ۷۴] (چنانچہ سورج نکلتے ہی ان کو چنگھاڑ نے آ پکڑا۔ پھر ہم نے اس زمین کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا، اور ان پر پکی مٹی کے پتھروں کی بارش برسادی)۔ اور سورۂ ذاریات میں فرمایا: ﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ﴾ [الذاریات: ۳۴] (تا کہ ہم ان پر پکی مٹی کے پتھر برسائیں جن پر حد سے گزرے ہوئے لوگوں کے لیے تمہارے پروردگار کے پاس سے خاص نشان بھی لگا ہوگا)۔

اسی طرح سورۂ شعراء، سورۂ نمل، سورۂ عنکبوت اور دیگر سورتوں میں مختلف الفاظ اور مختلف کلمات کے ساتھ اس بدنصیب، گمراہ، ناعاقبت اندیش قوم کی تباہی اور ہلاکت کا بیان ستائیس مقامات پر مختلف اسلوب میں مذکور ہے۔

ان سب آیاتِ کریمہ کے ملانے سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر تینوں طرح کا عذاب آیا، فرشتہ کی چیخ نے بھی پکڑا، ان کی سرزمین کا تختہ بھی اُلٹ دیا گیا، فرشتہ نے باقی زمین سے اس حصہ کو کاٹ کر الگ کر دیا، اور اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر طشت کی طرح آسمانوں تک اوپر اٹھالیا، پھر اسے اُلٹا کر واپس اسی جگہ پٹخ دیا، اوپر کا حصہ آبادی والا نیچے، اور نیچے والا حصہ اوپر رکھ دیا، کہیں پورے علاقے کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا، اور ان پر پتھر کنکر بھی برسا دیئے۔

اس قوم کا عذاب گزشتہ تمام عذابوں سے ممتاز اور نرالا رہا۔ جو لوگ اپنے پیغمبر کو بستی سے نکالنا چاہتے ہیں ان کا حشر یہ ہوا جو رہتی دنیا تک لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہے۔ اسی لئے فرمایا: ﴿وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ﴾ [هود:۸۳] (اور وہ ظالموں سے دور نہیں ہیں)۔ اور سورۂ صافات میں فرمایا: ﴿وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [الصافات: ۱۳۷] (اور تم ان پر سے گزرا کرتے ہو، صبح ہوتے۔ اور رات کے وقت، کیا پھر بھی تمہیں عقل نہیں آتی؟)۔ تم وہاں سے گزرتے ہو، اور نظروں سے مقامِ عذاب کا مشاہدہ بھی کرتے ہو، پھر کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے ہو؟

گزشتہ دونوں آیتوں کی تصریح سے معلوم ہوا کہ جو پتھر ان لوگوں پر برسائے گئے وہ عام پتھر نہ تھے، بلکہ وہ پتھر ایسے تھے جو مٹی سے پکا کر بنائے گے ہوں، جیسے اینٹوں کو بناتے ہیں، جس کا ترجمہ کنکر سے کیا گیا۔اور مُسَوَّمَةً کا مطلب یہ ہے کہ ہر پتھر پر نشان لگا ہوا تھا کہ یہ فلاں شخص پر ہی گرے گا، اور سورۂ ہود میں ''مَنۡضُوۡدٌ'' کا کلمہ جو مذکور ہے اس کا معنی ہے کہ لگا تار یہ پتھر برسائے گئے تھے۔

فائدہ:

اگر کوئی یہ سمجھے کہ لواطت کا کام مردوں نے کیا، عورتیں اور بچے بے گناہ تھے، وہ کیوں ہلاک ہوئے؟ پہلا جواب تو یہ ہے کہ اصل سبب ہلاکت کا کفر وشرک رہا ہے، جیسے کہ قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود کی ہلاکت سے معلوم ہوا۔ البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ مردوں کی ہلاکت کے اسباب دو رہے، یعنی کفر وشرک اور لواطت، باقی عورتوں اور بچوں کی ہلاکت کا سبب ایک ہی رہا، یعنی کفر وشرک، جس کا واضح ثبوت اور مثال پیغمبر علیہ السلام کی بیوی کی ہلاکت ہے۔

فائدہ:

قرآن حکیم کی تصریح سے معلوم ہوا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم جس فاحشہ اور بدکرداری میں مبتلا رہی، اور اسے اپنی شہوت رانی کا واحد ذریعہ بنایا، یہ عمل ان سے پہلے کسی قوم نے نہیں کیا۔ یہ عمل عقلاً، فطرتاً، اخلاقاً، شرعاً ہر اعتبار سے مذموم اور نہایت قبیح ہے، اور کبائر میں سے ہے، پس اس کی سزا کیا ہو؟ اس بارے میں صاحبین امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کا زنا ہے، اس کی سزا بھی وہی ہے جو سزا زنا کی ہے، یعنی غیر شادی شدہ کیلئے سو کوڑے، اور شادی شدہ کے لئے رجم وسنگساری۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے، اور ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ دونوں یعنی فاعل اور مفعول کو قتل کیا جائے، اور یہ بھی ان کا قول ہے کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے، خواہ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں۔ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کی کوئی ایسی سزا مقرر نہیں کہ ہمیشہ ہر وقت اسی کو اختیار کیا جائے، بلکہ اگر حاکم مناسب سمجھے تو دونوں کو قتل کر دے، اور اگر یہ مناسب سمجھے تو انہیں جیل میں ڈال دے، یہاں تک کہ وہیں مر جائیں، یا پختہ توبہ کریں، پھر اگر توبہ کے بعد اس عمل کو دوبارہ کریں، تو پھر ان کی سزا قتل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایسے لوگوں کو آگ میں جلایا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آبادی میں جو سب سے اونچی عمارت ہو وہاں سے اوندھے منہ گرا کے پھینک دیا جائے، پھر پیچھے سے پتھر

مارے جائیں۔ بہر حال یہ تمام سزائیں تعزیر کے قبیل سے ہیں۔ تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

فائدہ:

اس شنیع فعل کے موجد قومِ لوط کے لوگ ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے وہ سزادی، اور تباہ کیا کہ ان کے مردار اجسام اور لاشوں سے زمین کے اوپر والے حصے کو ہمیشہ کے لئے پاک فرمایا، یہ مردار عمل اس وقت تقریباً دنیا کے بہت حصوں میں موجود ہے، اور یورپ کی تہذیب یافتہ انسانی شرافت کے دشمن اُسے پسندیدہ عمل قرار دیتے ہوئے باقاعدہ اُسے قانونی شکل اور تحفظ دے چکے ہیں، حتیٰ کہ برطانوی اور فرانسیسی پارلیمنٹ تو یہ قانون تالیوں کی گونج میں فخریہ طور پر پاس کر چکے ہیں کہ اگر دو بالغ مرد، اسی طرح دو بالغہ عورتیں رضامندی سے ہم جنسی کا اہتمام کرلیں تو وہ کر سکتے ہیں، اور ان پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کسی کے ساتھ زبردستی ہو تو پھر قابلِ مؤاخذہ ہے۔

خنزیر کھانے والے لوگ اسی طرح بے غیرت ہوتے ہیں، انگریز، عیسائی اور سکھ قوم خنزیر پالنے اور کھانے میں مشہور ہیں، اور ان کا شمار دنیا کے بدترین بے حیاؤں میں ہے۔ سکھوں میں یہ رواج عام ہے کہ چار بھائیوں کی ایک بیوی ہوتی ہے۔ انگریزوں کا معاشرہ اور ازدواجی قانون اتنا غیر مہذب اور ناپاک ہے کہ کتوں سے بدتر اور مردار ہے۔

مقامِ عبرت:

﴿وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ﴾ زمانۂ رسالت کا ظالم ہو یا آج کا فاسق وفاجر غیر مہذب درندہ صفت انسان ہو، اُسے چاہئے کہ اس منظر کو بغور مطالعہ کرے، اور بچشمِ عبرت دیکھ کر اس فعلِ شنیع سے توبہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کی گرفت اور بطشِ شدید سے اس کی پناہ طلب کرے۔ یہ ہولناک منظر آج بھی موجود ہے۔ بیت المقدس اور نہرِ اُردن کے درمیان آج بھی یہ قطعۂ زمین بحرِ لوط یا بحرِ میّت اور بحرِ مردار کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی زمین سطح سمندر سے چار سو فٹ سے زیادہ گہرائی میں ہے۔ اس کے ایک خاص حصہ پر ایک دریا کی صورت میں ایک نہایت پر خطر، بدبودار، عجیب قسم کا گاڑھا پانی موجود ہے، جس میں کوئی بھی جاندار مچھلی یا مینڈک یا مگرمچھ، یا اور کوئی ذی روح جانور زندہ نہیں رہ سکتا، اس لئے اس کو بحرِ میّت بولتے ہیں۔ سدّوم کا یہی مقام اور جائے وقوع ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِهٖ وَغَضَبِهٖ۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۚ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ

مِّنۡ رَّبِّکُمۡ فَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ

اِصۡلَاحِہَا ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸۵﴾ وَلَا تَقۡعُدُوۡا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوۡعِدُوۡنَ وَتَصُدُّوۡنَ عَنۡ

سَبِیۡلِ اللّٰہِ مَنۡ اٰمَنَ بِہٖ وَتَبۡغُوۡنَہَا عِوَجًا ۚ وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ کُنۡتُمۡ قَلِیۡلًا فَکَثَّرَکُمۡ ۪ وَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ

عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنۡ کَانَ طَآئِفَۃٌ مِّنۡکُمۡ اٰمَنُوۡا بِالَّذِیۡۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖ وَطَآئِفَۃٌ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا فَاصۡبِرُوۡا

حَتّٰی یَحۡکُمَ اللّٰہُ بَیۡنَنَا ۚ وَہُوَ خَیۡرُ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آگئی ہے، سو ناپ اور تول پورا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر مت دو، اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مؤمن ہو ﴿۸۵﴾ اور مت بیٹھ جاؤ ہر راستہ میں کہ تم لوگوں کو دھمکیاں دیتے ہو، اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہو، جو اس پر ایمان لائے، اور اس میں کجی تلاش کرتے ہو، اور یاد کرو جبکہ تم تھوڑے سے تھے، سو اللہ تعالیٰ نے تم کو زیادہ کر دیا، اور دیکھو فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا ﴿۸۶﴾ اور اگر تم میں سے ایک جماعت اس حکم پر ایمان لے آئی جسے دے کر میں بھیجا گیا ہوں، اور ایک جماعت ایمان نہ لائی تو صبر کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے، اور وہ سب حاکموں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۸۷﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم میں حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ سورۂ اعراف، سورۂ ہود اور سورۂ شعراء میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے، اور سورۂ حجر اور سورۂ عنکبوت میں بہت ہی مختصر ہے۔ ان سورتوں میں حضرت شعیب علیہ السلام کا دس جگہ تذکرہ ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اور ان کی بعثت:

حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین میں ہوئی تھی۔ مدین کسی مقام کا نام نہیں ہے، بلکہ قبیلہ کا نام ہے۔ یہ قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے "مدین" کی نسل سے تھا، جو ان کی تیسری بیوی حضرت قطورا سے پیدا ہوا، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ خاندان بنی قطورا ہی کہلاتا ہے۔ مدین اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پہلو ہی میں حجاز مقدس میں آباد ہو گئے تھے، یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا، اور شعیب علیہ السلام بھی چونکہ اسی نسل اور اسی قبیلہ سے تھے اس لئے ان کی بعثت کے بعد یہ قوم شعیب کہلائی۔

مدین یا اصحابِ ایکہ:

مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم اس بارے میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحابِ ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں، یا دو جدا جدا قبیلے ہیں۔ اکثر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کا یہی خیال ہے کہ یہ جدا جدا قبیلے ہیں۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ ابن مردویہ اور ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مدین اور اصحابِ ایکہ دو اُمتیں ہیں، جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تھا۔ [فتح القدير لشوكاني]

مفسرین سلف وخلف رحمۃ اللہ علیہم کی اکثریت اسی جانب مائل ہے کہ مدین اور اصحابِ ایکہ دو جداگانہ قومیں تھیں۔ تاریخ طبری اور مستدرک حاکم میں مشہور تابعی اور مفسر حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو دو قوموں کی طرف مبعوث فرمایا تھا، ایک اہلِ مدین کی طرف جو خود ان کی قوم تھی، دوسرے اصحاب الایکہ۔ یہ ایکہ (بن جنگل) گھنے درختوں کا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو عذاب دینا چاہا تو ان پر سخت گرمی مسلّط کر دی، اور عذاب بادل کی شکل میں لایا گیا، جیسے یہ بدلی قریب ہوئی لوگ اسے ٹھنڈا سایہ سمجھ کر اس کی طرف دوڑے کہ شاید کچھ ٹھنڈک حاصل ہو، جب اس کے نیچے پہنچے تو اس میں سے آگ برسنے لگی۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ [الشعراء: ۱۸۹] (پھر ان کو سائبان والے دن کے عذاب نے آ پکڑا) جو کہ بڑا تباہ کن عذاب تھا۔ [طبری، مستدرک، دائرۃ المعارف وغیرہ]

ابن اسحاق اور ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت عکرمہ اور سدی رحمۃ اللہ علیہما سے روایت کی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے سوا اور کسی نبی کو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ مبعوث نہیں فرمایا۔ یہ ایک دفعہ مدین کی طرف مبعوث ہوئے، ان پر عذابِ الٰہی چیخ کی شکل میں آیا، اور دوسری دفعہ اصحابُ الایکہ کی طرف مبعوث ہوئے، جن پر سائبان والا عذاب نازل ہوا۔ [فتح القدیر]

بعد کے علماء ومفسرین میں علامہ بغوی، خازن، بیضاوی، زمخشری، ابوحیان اندلسی، بدرالدین عینی، شوکانی، محمود آلوسی، فخر الدین رازی، رشید رضا مصری وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کی یہی تصریح ہے کہ قرآن کریم کے مطالعہ سے بھی بظاہر

یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ مدین اور اصحابُ الایکہ دو جدا جدا قومیں ہیں، کیونکہ ان دونوں قوموں کے حضرت شعیب علیہ السلام سے سوالات و جوابات، ان کا طرزِ خطاب، پھر انجامِ کار عذاب، اور طریقہ عذاب مختلف ہے۔

نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اصحابِ مدین کے ذکر میں قرآن کریم کی تصریح ہے:

﴿وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا﴾۔ اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، لیکن اصحابُ الایکہ کے متعلق ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ﴾ [الشعراء: ۱۷۷] (جب شعیب نے ان سے کہا کہ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اصحابُ الایکہ کے خاندان سے نہ تھے، اور مدین کے خاندان میں سے ضرور تھے۔ [معالم التنزیل]

ایک دوسری جماعت کا خیال ہے کہ اہلِ مدین اور اصحابُ الایکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں، اور یہ دو جدا جدا قومیں نہیں ہیں، بلکہ دونوں ایک قوم ہیں۔ یہ حضرت علامہ ابن کثیر، اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے۔ انہوں نے تفسیر ابن کثیر، اور البدایہ والنہایہ میں، اور حافظ نے فتح الباری میں تفصیلاً اس پر کلام کیا ہے۔ واللہ اعلم

مدین کا قبیلہ بحیرۂ قلزم کے مشرقی ساحل کے ساتھ جزیرۂ عرب کے شمال مغرب میں، اور خلیج عقبہ کے مشرقی ساحل پر اسی نام کی بستی کے آس پاس آباد تھا۔ یہ جگہ شام (اُردُن) کے متصل حجاز کا آخری حصہ تھی، اور عہدِ نبوی میں حجاز والوں کو شام، فلسطین، بلکہ مصر تک جانے میں مدین کے کھنڈرات راہ میں پڑتے تھے۔ مدین کا علاقہ تبوک کے بالکل بالمقابل واقع ہے۔

قرآن حکیم میں مدین سے گزرنے والے اہلِ حجاز کے تجارتی راستے کو اِمَامٍ مُّبِیْنٍ یعنی کھلی اور صاف شاہراہ قرار دیا گیا ہے، جو قومِ لوط اور اہلِ مدین دونوں کے علاقوں سے گزرتی تھی۔ اہلِ مدین کی بستیاں خلیج عقبہ کی بندرگاہ ایلہ کے جنوب میں خلیج عقبہ اور بحیرۂ قلزم کے ساتھ ساتھ، اور مشرق میں تبوک تک واقع تھی۔ مدین کے علاقے میں ان دنوں الحمیدہ، مقنا، الخریبہ، تریم، المویلع اور ضبا نامی بستیاں آباد ہیں۔ مدین کا خلیج عقبہ کے اسرائیلی شہر ایلہ سے فاصلہ سوا سو کلومیٹر ہے۔ اس لحاظ سے مدین ایک بہت بڑا تجارتی مرکز بن چکا تھا، یہ وہی مدین ہے جس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے: ﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ ۬ وَ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٜ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ كَبِیْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰی لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾﴾ [القصص:

۲۳] ترجمہ: (اور جب پہنچا مدین کے پانی پر، پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی پانی پلاتے ہوئے، اور پایا ان سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنے جانور کے ساتھ، بولا تمہارا کیا حال ہے؟ بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لے جانے تک، یعنی ان کے چلے جانے کے بعد بچت پانی کے ساتھ، اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے، بڑی عمر کا۞ پھر اس نے پانی پلا دیا ان کے جانوروں کو، پھر ہٹ کر آیا سایہ کی طرف، بولا: اے ربّ! تو جو چیز اتارے میری طرف اچھی میں اس کا محتاج ہوں۞)

﴿وَاِلٰی مَدۡیَنَ اَخَاهُمۡ شُعَیۡبًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ﴾ ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا، انہوں نے فرمایا: اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں۔ گزشتہ آیات میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا یہی درس رہا کہ عقیدہ کی اصلاح ہو، اور توحیدِ باری تعالیٰ کا اقرار ہو، جو کہ سارے اعمال کی بنیاد ہے، اور صحیح عقیدہ کے بغیر کوئی عمل وطاعت کارگر نہیں۔ تمام اعمال کی عمارت عقیدہ پر تعمیر ہوتی ہے۔

﴿قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ بَیِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ تحقیق تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے بینہ، نشانی، واضح دلیل، معجزہ آ گیا ہے۔ بَیِّنَة کا لفظ ان چاروں معانی پر مشتمل ہے۔ یہاں بَیِّنَة سے چاروں معانی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ سورۂ بینہ میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ اس لفظ سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لی ہے۔ نبی کی ذات، صفات، اعمال، کردار، گفتار، معجزات، سب پر بینہ کا اطلاق ہوتا ہے، حتیٰ کہ پیغمبر کی شکل وصورت، اور آواز بھی بینہ شمار ہوتے ہیں۔ حضرت رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ؎

خرق عادت ہر چہ او را معجزہ ست ☆ روئے او، آواز او ہم معجز ہست

﴿فَاَوۡفُوا الۡكَیۡلَ وَالۡمِیۡزَانَ﴾ پس پورا کرو ناپ اور تول کو۔

﴿وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَهُمۡ﴾ اور نہ گھٹاؤ لوگوں کو ان کی چیزیں۔ مطلب یہ ہے کہ تطفیف سے بچو۔ دراصل یہ لوگ شدید ترین برگشتہ کفار ہونے کے باوجود اس گناہ کبیرہ میں شدّت کے ساتھ مبتلا رہے، اور اس بُری خصلت کو پورے زور وشور سے عام کرتے رہے۔ تطفیف کی اقسام اور پوری تفصیل سورۃ المطففین میں دیکھ لیں۔

﴿وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا﴾ نہ فساد کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد توحید اور احکام الٰہی کا اتباع ہی ہے، اور یہ ان کی اصلاحی پروگرام کی بنیاد ہے، جس سے

چاروں طرف کرۂ ارض میں امن وامان، اور اصلاحی امور کی ترویج ہوگی، اور ہر قسم کے ظلم اور زیادتیوں، اور بے انصافیوں کا خاتمہ ہوگا۔ خیر القرون اور اس کے بعد والا زمانہ اس پر واضح دلیل اور ثبوت ہے بخلاف کفر اور معاصی کے کہ ان سے ہر قسم کا فساد پھوٹ پڑے گا، اور تمام اصلاحی اعمال، اور اصلاحی معاشرہ یکسر تباہ ہوجائے گا، اور یہ چیز ہر زمانہ کے لوگوں نے بآسانی مشاہدہ کی ہے اور کررہے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان میں امن وصلاح ہے، اور کفر ومعاصی میں فساد وبدامنی کا مادہ موجزن ہے۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ یہ چیز تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم مؤمن ہو۔ اشارہ ہے کہ ان چیزوں پر عمل اور توجہ وہی لوگ کرتے ہیں کہ جن میں ایمان ہوتا ہے، اور جہاں ایمان نہیں ہوتا وہاں اصلاح کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔

﴿وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ﴾ اور ہر راستے میں مت بیٹھو، تم لوگوں کو ڈراتے ہو، اور ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہو۔ ان لوگوں کی عادت تھی کہ دو دو، چار چار اشخاص راستوں پر بیٹھ جاتے اور راہ گیروں کو ڈراتے دھمکاتے، اور ان کے اموال ومویشی چھین لیتے، اور جو شخص حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس جانا چاہتا اس کو سمجھاتے کہ وہ شخص جھوٹا ہے، اور پاگل بھی ہے، اور اس کے خیالات اچھے بھی نہیں۔

﴿وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ اور دین کے راستے میں کجی تلاش کرتے ہو۔ دینِ الٰہی جو کہ تمام بھلائیوں اور سچائیوں کا گہوارہ ہے، اس میں خواہ مخواہ پروپیگنڈے کے ذریعہ خامیاں اور نقائص تلاش کرتے ہو، تاکہ کوئی شخص اس کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو۔ دراصل مشرکین وکفار اور یہود ونصاریٰ اسی طرح دوسرے تمام باطل فرقے اسلام دینِ الٰہی کی مخالفت پر سب متفق ہیں، کیونکہ شیاطین اور اس کے گماشتہ حواری کبھی یہ نہیں چاہتے کہ اسلام اور اسلامی اقدار کو برتری حاصل ہو۔ یہ کوئی نئی اور وقتی بات نہیں، یہ ازل سے ابد تک رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ☆ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

حضرت ضماد بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ ازدِ شنوءۃ سے ہے۔ آپ اسلام لانے سے پہلے بہت بڑے کاہن اور طبیب تھے، وہ مکے آئے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اس پر مشرکین نے کہا کہ وہ تو پاگل ہے، اس کے پاس جاکر کیا کروگے؟ کہنے لگے: میں طبیب ہوں، اگر وہ پاگل ہے تو اس کا علاج کروں گا۔ پس وہ

آپ ﷺ کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر علاج کی پیش کش کی، تو آپ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ طبیب صاحب خطبہ سننے کے بعد اپنے مرضِ کفر کے علاج کے خواہاں ہوئے، اور فوراً اسلام قبول کیا۔ زہے سعادت! رضی اللہ عنہ

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ﴾ یاد کرو کہ جب تم قلیل تعداد میں تھے، تو اللہ نے تمہیں زیادہ کر دیا، تمہاری نسل میں برکت پیدا فرما دی، جس کی وجہ سے تمہاری نسل خوب پھیل گئی، اور تمہیں عددا کثریت حاصل ہوگئی، جو کہ تمہارے اوپر حق تعالیٰ شانہ کا خاص انعام ہے۔

﴿وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ دیکھو، فساد کرنے والوں کا کتنا بُرا انجام ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے بُرے لوگوں کی برائیوں پر تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خوب نظارہ کرو، دیکھو، فساد کرنے والوں کا کیسا بُرا انجام ہوا؟ سورۂ عنکبوت میں ارشاد فرمایا: ﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَّمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا...﴾ [العنکبوت: ۴۰] (ہم نے ان سب کو ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ میں لیا چنانچہ ان میں سے کچھ وہ تھے جن پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی، اور کچھ وہ تھے جن کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا، اور کچھ وہ تھے جن کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کچھ وہ جنہیں ہم نے پانی میں غرق کر دیا)۔

دیکھو، قومِ نوح کا کیا حال ہوا؟ قومِ عاد اور ثمود کو کیسے تباہ کیا گیا؟ قومِ لوط کس انجام کو پہنچی؟ اس کے بعد فرعون، قارون، ہامان اور دیگر نافرمان اقوام کس طرح تباہ و برباد ہوئے؟

﴿وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ﴾ تم میں سے ایک گروہ ایمان لایا ہے، اس چیز پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں۔

﴿وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا﴾ اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا۔

﴿فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا﴾ تم صبر کرو، اور صبر کا دامن تھامے رکھو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے۔

﴿وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ﴾ اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ اہلِ ایمان کو ہمیشہ سے ہر پیغمبر نے صبر و استقامت کی تلقین کی ہے، اور نتیجہ آخر کار ان کے حق میں بہتر رہا ہے۔ اور ظالم لوگ ناکام و بے مراد رہے ہیں۔ یہاں تک حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر اور پیغام کا بیان رہا، آئندہ آیات میں قوم کا جواب مذکور ہے۔

الجُزءُ التَّاسِعُ

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ
لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا
اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَی اللّٰهِ
تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ
جٰثِمِیْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ۛۚ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا شُعَیْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۲﴾
فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ: ان کی قوم کے سردار جو تکبر کرنے والے تھے کہنے لگے کہ اے شعیب! ضرور بضرور ہم تجھے اور ان
لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے، اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔ انہوں نے
جواب دیا: کیا ہم تمہارے دین میں واپس آجائیں گے اگرچہ دل سے بُرا جانتے ہوں؟ ﴿۸۸﴾ اگر ہم تمہارے دین میں
واپس ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگانے والے بن جائیں، اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ
نے اس سے ہم کو نجات دی، اور ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہارے دین میں واپس آجائیں، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے،
جو ہمارا ربّ ہے، ہمارے ربّ کا علم ہر چیز کو محیط ہے، ہم نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا، اے ہمارے ربّ! ہمارے اور
ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمادے، اور تو فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ﴿۸۹﴾
اور کہا ان کی قوم کے سرداروں نے جو کفر پر تھے کہ اگر تم شعیب کی راہ پر چلنے لگو گے تو بلاشبہ بڑے نقصان میں پڑ جاؤ
گے ﴿۹۰﴾ سو پکڑ لیا ان کو زلزلہ نے، سو وہ صبح کے وقت اس حال میں ہو گئے کہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گرے ہوئے
تھے ﴿۹۱﴾ جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا گویا کہ وہ ان گھروں میں رہے ہی نہیں تھے، جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی
نقصان میں پڑنے والے ہیں ﴿۹۲﴾ سو پشت پھیری ان کی طرف سے، اور کہا کہ اے میری قوم! بیشک میں نے تم کو اپنے
ربّ کے پیغام پہنچا دیئے ہیں، اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی، سو پھر میں کفر اختیار کرنے والی قوم پر کیوں رنج

کروں؟ (یا پریشان ہو جاؤں؟)۔

معارف ومنازل

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے متکبر سرداروں نے جواب دیا:

﴿لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ﴾...... تا ...... ﴿اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ﴾ اے شعیب! ہمیں صبر کرنے کی، اور فیصلہ کے انتظار کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تم پر غلبہ دیا ہے، اور تمہارے نکالنے کی ہم کو قدرت دی ہے، یادرکھو، ہم تجھ کو اور جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال کر رہیں گے، یا یہ کہ تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ، تو پھر ہم تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔

یہ واپس ہمارے دین میں آنے والی بات حضرت شعیب علیہ السلام کے ساتھیوں کے اعتبار سے ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے سے پہلے کفر وشرک کے طریقہ پر تھے، اور کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ باقی خود حضرت شعیب علیہ السلام اس میں شامل نہیں، کیونکہ کسی نبی کے متعلق یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ پہلے کافر ہو، پھر اسلام میں داخل ہو جائے، اس لئے کہ سارے انبیاء علیہم السلام ابتداءً ولادت ہی سے کفر اور شرک سے معصوم ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی نبی نبوت سے پہلے کفر اور شرک کی نجاستوں میں ملوّث ہو، اور بعد میں نبی ورسول بنا دیا گیا ہو۔ بہر حال! یہ خطاب تغلیبی ہے، عام مؤمنین کے لئے ہے۔

اور یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ کفار اپنے زعم وگمان کے مطابق کہہ رہے ہوں، کیونکہ نبوت سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام ان کے پاس رہے، اور انہیں توحید کے متعلق کوئی تبلیغ نہیں کی، تو وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ ہمارے دین پر ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو جواب دیا کہ کیا ہم تمہارے دین میں داخل ہو جائیں اگر چہ ہم تمہارے دین سے ناخوش اور بیزار ہوں۔ یعنی دلیل اور حجت اور چشمِ بصیرت سے ہم پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ جن بیہودہ کفریات میں تم مبتلا ہو وہ زہرِ قاتل سے زیادہ خطرناک ہیں، پھر ہم کیونکر اس زہر کو نوش کریں؟ یہ ایک خودکشی ہوگی، جو ہمارے لئے ممکن نہیں۔

﴿قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ﴾...... تا ...... ﴿وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ﴾ بالفرض اگر ہم تمہارے دین میں (معاذ اللہ) داخل ہو جائیں، بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو تمہارے اس باطل دین سے نجات دے چکا ہے، تو ضرور ہم نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا (اور یہ ہمارے لئے ممکن نہیں) یعنی اگر ہم تمہارے باطل

دین میں شامل ہوجائیں، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے ہمیں نجات دی۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ہم پھر تمہارا دین اختیار کرلیں، تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہمارا یہ اعتقاد غلط ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، اور جو دین وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں یہ حق ہے، اس طرح سے تو ہم اللہ تعالیٰ شانہ پر بہتان باندھنے والے ہوجائیں گے، کیونکہ کفر کا عقیدہ رکھنا، اور کفر کو برحق سمجھنا، اور کفر اختیار کرنا، یہ اللہ تعالیٰ شانہ پر تہمت باندھنے کے مترادف ہے، کیونکہ یہ بدترین ناجائز عمل ہے جس کو کبھی اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے۔ لہٰذا ہم سے یہ ممکن نہیں کہ کفر وشرک کی ملّت میں داخل ہوجائیں، مگر یہ کہ ربّ العزّت سبحانہ ہمارا پروردگار کسی کو اگر گمراہ کرنا چاہے تو وہ اور بات ہے، اس کی قضاء وقدر کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ جب ہم کفر کی قباحت اور شناعت وبطلان، اور اس کے انجامِ بد سے بخوبی واقف ہیں، تو پھر کیونکر ہم اس کو اختیار کرسکتے ہیں؟ ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کو ہماری ہدایت منظور نہ ہو، اور اسی نے ہماری قسمت میں کفر لکھ دیا ہو تو ہم مجبور ہیں۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، اور اس کی مشیت انسان کے ارادہ پر غالب ہے۔ انسان کی سعادت وشقاوت کا وہ فیصلہ کرتا ہے۔ تمام قلوب بنی آدم کے اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ اس کی مرضی کہ وہ ان قلوب کو جدھر پھیر دے، چاہے ہدایت کی طرف، چاہے گمراہی کی طرف۔

دعاء:

اے ہمارے مہربان پروردگار! ہمارے قلوب کو اپنی طرف پھیر دے، ہر قسم کی شقاوتوں سے پناہ میں رکھ۔ اگر ہمارے حق میں کوئی شقاوت لکھی ہوئی ہو اُسے مٹا کر اس کی جگہ سعادت لکھ دے۔ ہمارے ایمان آپ کے پاس امانت ہیں، ان کی حفاظت فرما۔ آمین۔ ہمارے ایمانوں کا ایسا تحفظ فرما جیسے آپ نے اپنے پاکیزہ اور بابرکت کتاب مبین اور ذکر حکیم کا تحفظ فرمایا۔ آمین ثم آمین

اس کے بعد ارشاد ہے: ہمارے پروردگار کا علم کائنات کے ہر ہر ذرہ پر محیط ہے، ہم نے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا، اور اسی ذات پاک پر ہمارا اعتماد ہے، وہ اپنی عنایت سے ہم کو اپنے دین پر قائم رکھے گا۔ انہوں نے دعا کرکے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ کردیجئے۔ یعنی کافروں پر عذاب

نازل فرما، تاکہ ان کا باطل پر ہونا، اور ہمارا حق پر ہونا کھلم کھلا واضح ہو جائے، اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

یہ دعا حضرت شعیب علیہ السلام نے اس وقت کی جب وہ قوم کے ایمان سے مکمل نا اُمید ہو گئے۔ جب ان کی اس تقریر دلپذیر کو سن کر قوم کے سرداروں نے مسلمانوں سے کہا:

﴿وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴾ قوم کے سرداروں نے اپنے عوام سے کہا کہ اگر تم نے شعیب (علیہ الصلوۃ والسلام) کا اتباع کیا تو تم ضرور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ گویا انہوں نے اپنے عوام کو ایمان لانے سے روکا، اور ڈرایا۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ﴾ سو ان لوگوں کو زلزلہ نے پکڑ لیا، پس وہ اپنے گھروں میں صبح کے وقت اوندھے منہ پڑے ہوئے رہ گئے۔ اسی نہج پر تباہ ہوئے جیسے قوم ثمود تباہ ہوئی تھی۔ سورۂ ہود میں اسی کو بیان فرمایا: ﴿اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ﴾ [هود:۹۵] (خبردار! مدین کے لئے رحمت سے دوری ہے، جیسے قوم ثمود رحمت سے دور ہوئی)۔

﴿اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ ...... تا ...... ﴿هُمُ الْخٰسِرِيْنَ﴾ جن لوگوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا، ایسے ہو گئے کہ گویا وہ کبھی وہاں بسے بھی نہ تھے، جنہوں نے شعیب علیہ السلام کو جھٹلایا وہ خسارہ میں رہے، دنیا بھی برباد، آخرت بھی تباہ، اور ابدی جہنم کی نا قابلِ برداشت سزا میں گرفتار ہوئے۔

﴿فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ﴾ ...... تا ...... ﴿عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ﴾ پھر ان کی تباہی کے بعد، یا عذاب کے آثار اور علامات کے ظہور کے وقت حضرت شعیب علیہ السلام نے ان سے منہ پھیرا، اور کہا: اے قوم! میں نے تم کو اپنے ربّ جلّ شانہ کے پیغامات پہنچا دیئے، اور تمہاری خیر خواہی کی، پس میں کافر قوم کی ہلاکت پر کیوں غم کھاؤں؟ اگر یہ لوگ میری بات مانتے تو ہلاک ہی نہ ہوتے۔

ان لوگوں نے مسلسل اللہ تعالیٰ کے حکموں کی مخالفت کی، اور اپنے منہ سے اس کے عذاب کا مطالبہ کیا، اور چند غریبوں نے جو ایمان لایا، انہیں اپنی بستی سے بشمول پیغمبر علیہ السلام نکالنے اور باہر کرنے کی دھمکی دی۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی پوشیدہ قوت پر ہرگز یقین نہیں تھا، لہٰذا بہتر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین ایسے ناپاک اور نجس لوگوں سے پاک ہوئی۔ ایسے لوگوں کی تباہی عین انصاف، اور مسلمانوں کے حق میں ایک گونہ رحمت ہے، جس پر بجائے غم کے خوشی ہونی چاہئے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

فائدہ:

اہلِ مدین کی ہلاکت یہاں "رجفة" کے ساتھ مذکور ہے، اور سورۂ ہود میں "صیحة" یعنی چیخ سے، پس دونوں معنی واقعی اور صحیح ہیں، کیونکہ ان پر دونوں طرح کا عذاب آیا تھا۔ البتہ خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین کی ہلاکت کے بعد اَصْحٰبُ الْاَیْكَة کی طرف ہوئی۔ یہ قوم مدین کے علاقے کے ساتھ تھی، جب ان لوگوں نے بھی اپنے شرک وکفر، اور ناپ تول کے معاملہ میں پیغمبر علیہ السلام کی بات نہ مانی، اور مسلسل تکذیب کرتے رہے، تو ان پر ظُلَّة والا، یعنی بادل والا عذاب آیا۔ سورۂ شعراء میں ارشاد ہے: ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ [الشعراء: ۱۸۹] (انہوں نے شعیب کو جھٹلایا، پھر انہیں سائبان والے دن کے عذاب نے آ پکڑا)۔ یہ سایہ بادل کا تھا، جب بے پناہ گرمی کے بعد بادل کی طرف دوڑے تو آگ کی بارش برسا کر انہیں نیست و نابود کر دیا۔

درمنثور وغیرہ نے قوم لوط کی تعداد چار لاکھ بتائی، اور قومِ شعیب کی تعداد تین لاکھ سے کچھ زائد۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے مؤمن ساتھیوں کے ساتھ مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے، اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی قبر حجر اسود کے آمنے سامنے مطاف شریف میں ہے۔ واللہ اعلم۔ [روح المعاني]

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ۝۹۴ ثُمَّ
بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝۹۵ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۹۶ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ
يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ۝۹۷ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ
يَلْعَبُوْنَ۝۹۸ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ۝۹۹

ترجمہ: اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ اس کے رہنے والوں کو ہم نے سختی اور تکلیف کے ساتھ نہ پکڑا ہو تاکہ وہ عاجزی کریں۝۹۴ پھر ہم نے بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی، یہاں تک کہ وہ بڑھتے چلے گئے، اور کہنے لگے ہمارے باپ دادوں کو تکلیف اور خوشی پہنچ چکی ہے، سو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا، اس حال میں کہ انہیں خبر

بھی نہ تھی ﴿۹۵﴾ اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے، اور پرہیزگاری اختیار کرتے، تو ہم ان پر آسمان کی اور زمین کی برکتیں کھول دیتے، لیکن انہوں نے جھٹلایا، تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے انہیں پکڑ لیا ﴿۹۶﴾ کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ہمارا عذاب ان کے پاس رات کے وقت اس حال میں آ جائے کہ وہ سو رہے ہوں؟ ﴿۹۷﴾ یا بستیوں والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آ جائے، جبکہ وہ کھیل رہے ہوں؟ ﴿۹۸﴾ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے نڈر ہو گئے؟ سو اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے بے خوف نہیں ہوتے مگر وہ لوگ جن کا برباد ہونا ہی طے پا چکا ہو ﴿۹۹﴾

معارف ومنازل

نمونہ کے لئے تذکیر بایّامِ اللہ کے ضمن میں پانچ پیغمبروں علیہم السلام کی اُمتوں کی ہلاکت کا بیان ہوا۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں صرف یہی پانچ پیغمبر علیہم السلام تو مبعوث نہیں ہوئے، بلکہ ہر قوم اور ہر بستی کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول آیا، اور اپنی قوم تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ اب یہاں آیاتِ بالا میں بحیثیتِ مجموعی اقوامِ عالم کی ذہنیت اور ناکامی کے اسباب کا تذکرہ ہے۔ یعنی ایک عمومی دستور کا بیان ہے کہ انعام اور سزا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا اصول ہمیشہ یکساں رہا ہے، اس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔ اگر کسی قوم پر انعام ہوتا ہے تو وہ بھی کسی خاص بنیاد کی وجہ سے، اور اگر کسی کو سزا ملتی ہے تو اس کے لئے بھی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ سنّتُ اللہ ہمیشہ جاری ہے، اور انعام وسزا کے اسباب ذرائع کے تحت فیصلہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ﴾ نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں رسول۔ قریہ کسی بھی آبادی کو کہتے ہیں، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ تو فرمایا: ہمارا دستور ہر نبی کی بعثت کے ساتھ یہی رہا ہے کہ:

﴿اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ کہ ہم پکڑتے ہیں اس بستی کے رہنے والوں کو بدحالی اور تکلیف کے ساتھ۔ سورۂ انعام میں بھی اس عمومی دستور اور قانون کا تذکرہ فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوۡلَاۤ اِذۡ جَآءَهُمۡ بَاۡسُنَا تَضَرَّعُوۡا وَلٰكِنۡ قَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیۡطٰنُ مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖ فَتَحۡنَا عَلَیۡهِمۡ اَبۡوَابَ كُلِّ شَیۡءٍ ؕ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰهُمۡ بَغۡتَةً فَاِذَا هُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ

﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنعام] (اور تم سے پہلے ہم نے بہت سی قوموں کے پاس پیغمبر بھیجے، پھر ہم نے انہیں سختیوں اور تکلیفوں میں گرفتار کیا، تا کہ وہ عجز و نیاز کا شیوہ اپنائیں۔ پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ان کے پاس ہماری طرف سے سختی آئی تھی، اس وقت وہ عاجزی کا رویہ اختیار کرتے؟ بلکہ ان کے دل تو اور سخت ہو گئے، اور جو کچھ وہ کر رہے تھے شیطان نے انہیں یہ سمجھایا کہ وہ بڑے شاندار کام ہیں۔ پھر انہیں جو نصیحت کی گئی تھی جب وہ اسے بھلا بیٹھے تو ہم نے ان پر ہر نعمت کے دروازے کھول دیئے۔ یہاں تک کہ جو نعمتیں انہیں دی گئی تھیں، جب وہ ان پر اترانے لگے تو ہم نے اچانک ان کو آ پکڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل مایوس ہو کر رہ گئے۔ اس طرح جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی، اور تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جو تمام جہاں کا پروردگار ہے)۔

سورۂ انعام اور سورۂ اعراف کی مذکورہ آیتوں کا تقریباً خلاصہ اور مطلب ایک ہی ہے، جیسا کہ دونوں آیتوں کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے۔ پچھلی آیتوں میں اُمتوں کی ہلاکت کا بیان ہوا، اور سرور عالم ﷺ کو خطاب کر کے عمومِ ضابطہ ارشاد فرمایا کہ کسی قوم یا بستی کی طرف ہم اپنا رسول بھیج کر انہیں یوں ہی نہیں چھوڑ دیتے، بلکہ انہیں خوب آزماتے ہیں۔

عام طور پر آزمائش کے دو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کو مشکل اور تکلیف میں ڈال کر آزمایا جائے کہ وہ کس حد تک صبر اور برداشت سے کام لے سکتے ہیں، اور دوسرا یہ کہ آرام اور راحت وخوشحالی دے کر آزمائش کی جائے کہ یہ کس طرح شکر ادا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ [الأنبياء: ۳۵] (ہم تمہیں بھلائی اور برائی کے ذریعہ آزمائیں گے)۔

یہاں بھی یہی فرمایا کہ ہم نے بستی والوں کو آزمایا تکلیف اور بدحالی دے کر۔ بَأْسَاء بیرونی تکلیف کو کہتے ہیں، قحط اور خشک سالی وارد ہو جائے، زلزلہ اور سیلاب آجائے، اور طوفان آجائے، مہنگائی اور بدامنی آجائے، سخت سردی اور گرمی کی لہر آجائے۔ یہ سب بیرونی مصیبتیں ہیں، جو کسی قوم پر نازل ہو سکتی ہیں۔

اور اَلضَّرَّآء انسان کی اندرونی تکلیف کو کہتے ہیں، جیسے وباء کی بیماری، ذہنی پریشانی، بدنی امراض، خوف و خطرہ، بھوک و پیاس وغیرہ۔ یہ سب اندرونی تکالیف ہیں۔ فرمایا: ہماری آزمائش کی پہلی صورت یہ ہے کہ کسی قوم کو اندرونی یا بیرونی تکلیف میں مبتلا کر دیں، اور ایسا کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے:

﴿لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ﴾ تا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑائیں، اور اپنی بے بسی عجز وانکساری کا اظہار

کریں۔ جب کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو عام طور پر لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور خوب دعا کرتے اور توبہ کرتے رہتے ہیں۔ حدیث میں فرمایا: عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَهُ ضَرَّاءُ فَصَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَهُ سَرَّاءُ فَشَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ۔

یعنی مؤمن کی حالت بڑی عجیب ہے، اگر اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، اور یہ اس کے لئے بہتر ہوتا ہے، اور اگر اس کو راحت پہنچتی ہے، صحت وعافیت، عزّت وترقی، مال واولاد وغیرہ تو شکر کرتا ہے، یہ چیز اس کے لئے بہتر ہوتی ہے۔

دراصل ایمان انہی دو چیزوں صبر اور شکر سے مرکب ہے، نصف حصّہ صبر اور نصف حصہ شکر میں، اور مؤمن کبھی بھی آزمائش سے نہیں نکلتا۔ صبح وشام مصائب کا شکار رہتا ہے، یہاں تک کہ گناہوں سے چاندی کی طرح نکھر کر صاف ہوجاتا ہے۔ یہی عجز ونیاز، صبر وشکر اسے اونچے اور بلند وبالا مقامات تک پہنچا دیتا ہے۔

آزمائش کا دوسرا طریقہ یہ ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ﴾ پھر ہم برائی کو بھلائی میں بدل دیتے ہیں، تکلیف کے بعد راحت اور بیماری کے بعد صحت، غم و پریشانی کے بعد خوشحالی، غربت وفقر کے بعد مال ودولت کی فراوانی، خوف کے بعد امن و سلامتی، یہاں تک کہ یہ تمام آسائشیں بڑھ کر عام ہوجاتی ہیں۔ فرمایا:

﴿حَتّٰى عَفَوْا﴾ عفو کے معنی ہیں بڑھنا، پھلنا پھولنا، زیادہ ہونا۔ یعنی ہر قسم کی فراوانی اور بہتات کا حصول۔

﴿وَقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ﴾ پس انہوں نے بجائے شکر واقرار نعمت کے الٹا ناشکری اور کفرانِ نعمت کر کے یہ کہا کہ یہ چیزیں خواہ از قبیلِ تکالیف ہوں، یا راحت وسکون کا حصول ہو، یہ کوئی نئی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ ہمارے آباء واجداد کے زمانے میں بھی آتی رہی ہیں۔ ان چیزوں کا تعلق زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ہے۔ دنیا کے دور اسی طرز پر چلا کرتے ہیں، یہ ہمارے اوپر کوئی خاص احسان اور تمغہ عنایت نہیں۔ دنیا دراصل انہیں رنگوں اور نیرنگیوں کا نام ہے، کبھی کیسا کبھی کیسا، وغیرہ۔

افسوس کہ لوگوں نے ماضی سے، اور ہلاک شدہ نافرمان وناشکر اقوام کی ہلاکت سے کوئی سبق نہیں سیکھا، بلکہ انہیں روزمرہ کا معمول سمجھ کر ان سے پہلوتہی کر کے ناشکری پر اتر آئے۔ یہ کافر وناشکر انسان کی مثال ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی نافرمان قوم کی ہلاکت وتباہی کا فیصلہ ہوجاتا ہے، تو اتمامِ حجت

کے طور پر ہلاکت سے پہلے ان لوگوں کو دو طرح آزمایا جاتا ہے: پہلے یہ کہ انہیں طرح طرح کی پریشانیوں سے آزمایا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ وہ کہاں تک گڑگڑائیں گے، اور توبہ وعاجزی کے ساتھ صبر کریں گے۔ دوسرے یہ کہ ان بدحالیوں، پریشانیوں کو امن وراحت اور مال وخوشحالی کے ساتھ تبدیل کر کے، انہیں خوب راحتوں اور خوشحالیوں کا مالک بنا کر آزمایا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے یا نہیں۔

لیکن جب پہلی صورت میں وہ بجائے عجز و نیاز، تضرّع وعاجزی کے مزید طغیانی اور سرکشی پر، اور تکذیب حق پر اتر آئے، اور دوسری صورت میں بجائے شکر واحسان مندی کے الٹا دہ یہ کہتے رہے کہ یہ خوشحالی وبدحالی ہمارے باپ دادوں پر آتی رہی ہیں، یہ دنیا کا اُلٹ پھیر اور گردش ہے، لہٰذا ہم ان چیزوں کے بدلے اپنا دین نہیں چھوڑ سکتے۔

جب یہ سب کچھ ظاہر ہو کر ان کی خرمستی نہیں ختم ہوتی:

﴿فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً﴾ کا فیصلہ ہو کر رہے گا، اور ایسے ناشکر و بے صبر قوموں کے مقدر میں سوائے ہلاکت کے کچھ نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے نہ تنگدستی اور سختی سے عبرت لی، اور نہ خوشحالی اور نعمتوں پر شکر گزار ہوئی، لہٰذا ان کی گرفت کا اچانک فیصلہ ہوا، اور وہ مبتلائے عذاب ہو کر ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

اگر بستی والے ایمان لے آئیں تو ان پر برکات کھل جائیں:

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے، اور پرہیز کرتے، تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔

﴿وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ لیکن انہوں نے جھٹلایا، لہٰذا ہم نے ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے ان کی گرفت کر لی۔ اس آیت میں ایک عمومی تکوینی قانون بتایا ہے، اور وہ یہ کہ جب لوگوں میں ایمان ہوگا، اعمالِ صالحہ ہوں گے، کفر اور شرک اور گناہوں سے پرہیز کرتے ہوں گے، تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکتیں کھول دی جائیں گی، آسمان سے بھی برکتیں نازل ہوں گی، اور زمین سے بھی نکلیں گی، تو لوگ بہت ہی خوشحالی کی زندگی گزاریں گے۔ اور اگر ایمان نہ ہوگا، اعمالِ صالحہ نہ ہوں گے، کفر وشرک اور گناہوں کا دور دورہ ہوگا، تو گرفت ہوگی، اور نعمتیں چھن جائیں گی، اور عذابوں کا نزول ہوگا۔

شاید کسی کو یہ وسوسہ آئے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ کافر تو خوشحال رہتے ہیں، نعمت و دولت ان کے پاس وافر

مقدار میں ہوتی ہے، اور نزولِ عذاب کے ذریعہ ان کی گرفت نہیں ہوتی، وہ آئے دن ترقی کرتے رہتے ہیں۔

تو یہ وسوسہ غلط ہے، کیونکہ آیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ سارے عالم کے کافروں اور نافرمانوں پر ایک ہی وقت میں عذاب آئے گا۔ اللہ تعالیٰ شانہ کی حکمت کے مطابق دنیا کے مختلف علاقوں میں عذاب آتے رہتے ہیں، جنہیں جاننے والے جانتے ہیں۔ پھر عذابوں کی بھی کئی قسمیں ہیں: زلزلے آنا، آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا، سیلابوں سے بربادی، کئی قسم کی بیماریوں سے کھیتیوں کا نقصان، نئے نئے مہلک امراض کا پیدا ہونا وغیرہ۔ یہ سب عذاب کی صورتیں ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ شانہ کا ایک قانون استدارج کا بھی ہے، وہ یہ کہ کافروں کو ڈھیل دیدی جاتی ہے، اور یہ دنیا ان کے لئے جنت بھی ہے، تاکہ وہ نعمتوں میں مست ہوکر مزید بغاوت پر اتر آئیں، پھر اچانک گرفت کے ساتھ ہلاک کئے جائیں، اور موت کے بعد جو عذاب اور مؤاخذہ ہے وہ اس کے علاوہ ہے، جو کہ بہت سخت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نڈر رہنا خطرناک ہے:

اس کے بعد زمانۂ رسالت کے کافروں کو تنبیہ فرمائی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے گزشتہ قوموں پر عذاب بھیجا، ان پر بھی اسی قسم کا عذاب آسکتا ہے۔ کیا یہ لوگ اس بات سے نڈر اور بے خوف ہیں کہ ان کے پاس ہمارا عذب رات کے وقت آجائے، جبکہ یہ سورہے ہوں؟ یا اس بات سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن کے شروع حصہ میں آجائے، جبکہ یہ لوگ کھیل رہے ہوں؟

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف نہ ہوں، پہلی اُمتوں کے عذاب سے عبرت حاصل کریں، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب سے باز آجائیں۔ پھر فرمایا:

﴿اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے نڈر بنے ہوئے بے خوف ہیں؟ یہ استفہامِ انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نڈر نہ بنیں، اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوف نہ ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہے، تو چاہئے کہ لوگ سنجیدہ ہوں، اور ایمان قبول کرکے ہر قسم کے عذاب سے مطمئن ہوجائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے وہی لوگ بے خوف ہوجاتے ہیں جن کو تباہ ہی ہونا ہے۔ عذاب کی تاخیر سے یہ نہ سمجھنا کہ عذاب نہیں آئے گا۔ جب عذاب آجائے گا تو دیکھتے ہی رہ جائیں گے، اور عذاب سے بچ نہ سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے مکر سے مراد خفیہ تدبیر ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ شانہ نعمت عطاء فرماتے ہیں، اور عذاب بھیجنے میں اس کی طرف سے تاخیر ہو جاتی ہے۔ اس ڈھیل سے نافرمان لوگ دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں، اور مزید بر مزید نافرمانی میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، اور نتیجہ سے بے خبر رہتے ہیں۔ ؎

تو مشو مغرور بر حلم خدا ☆ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

فائدہ:

اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف ہو جانا کبیرہ گناہ ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگانِ دین فرماتے ہیں: اَلْإِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔ یعنی ایمان خوف اور اُمید کے درمیان میں ہے۔ مؤمن کی نشانی اور خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ بے مثال ایمان وتقویٰ کے باوجود خوفِ خدا کی بھٹی میں جل رہا ہوتا ہے، ہزاروں طاعات واعمالِ صالحہ کے باوجود رات دن غمگین اور پریشان رہتا اور روتا رہتا ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رو رو کر کہا کرتے تھے: کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا، یا صغر سنی میں مر گیا ہوتا، یا کوئی گھاس ہوتا، جسے جانوروں نے کھا کر ہضم کیا ہوتا۔ غور سے سنیں یہ اس عظیم ہستی کا قول ہے جسے انبیاء علیہم السلام کے بعد پوری خَلقِ خدا پر برتری حاصل ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مؤمن آدمی نیک اعمال بھی انجام دیتا ہے، اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا بھی ہے، مؤمن کا اللہ تعالیٰ سے سب سے بڑا ڈر یہ ہوتا ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسی کوتاہی نہ ہو جو حق تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن جائے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مؤمن سے کوئی ادنیٰ گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اس کے سر پر بڑا پہاڑ آ گرا ہے، اور منافق بڑے سے بڑا گناہ بھی کرتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے جیسے ناک پر مکھی بیٹھ گئی، اس نے بس یوں کیا، اور وہ اڑ گئی، اسے گناہ کا اتنا بھی خوف نہیں ہوتا جتنا مکھی کے بیٹھنے کا۔ [مشکوۃ] اسی لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب یا اس کی ناراضگی سے بے خوف اور لاپرواہ ہونا نقصان اٹھانے والوں کا شیوہ ہے، جبکہ مؤمن ہر وقت اس کے عذاب اور ناراضگی سے خوفزدہ ہی رہتا ہے۔ اَلحمدُلِلّٰہ

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَّوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ
قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَائِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿١٠١﴾
وَمَا وَجَدْنَا لِأَكْثَرِهِمْ مِنْ عَهْدٍ ۖ وَإِنْ وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفَاسِقِينَ ﴿١٠٢﴾

ترجمہ: جولوگ زمین کے وارث ہوتے ہیں کیا انہیں مذکورہ اقوام کے واقعات نے نہیں بتایا کہ ہم چاہیں تو
ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو ہلاک کر دیں؟ اور ان کے دلوں پر ہم مہر لگائے ہوئے ہیں سو وہ نہیں سنتے ﴿١٠٠﴾ یہ
بستیاں ہیں، ان کی بعض خبریں ہم آپ کو سناتے ہیں، اور بیشک ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے، تو جس
چیز کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان لانے والے نہ تھے، اللہ تعالیٰ ایسے ہی مہر لگا دیتا ہے کافروں کے دلوں پر ﴿١٠١﴾
اور ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد کا پورا کرنا نہ پایا، اور ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان ہی پایا ﴿١٠٢﴾

معارف ومنازل

ہر بعد میں آنے والوں کو چاہئے کہ پہلے لوگوں سے عبرت سیکھیں:

ہلاک شدہ چند اقوام، مثلاً قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ شعیب علیہم السلام کے جو واقعات اور ان کی ہلاکت وتباہی سے ان کے بعد آنے والی قومیں عبرت حاصل کریں۔ آیت کریمہ میں اسی بات پر تنبیہ ہو رہی ہے۔ فرمایا کہ جو اُمتیں ہلاک کی گئیں، ان کی جگہ جو لوگ زمین پر آباد ہوئے، کیا ان کے بعد میں آنے والوں کو ان واقعات سے عبرت نہ ہوئی؟ اور کیا انہیں اس بات کا علم نہیں کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے بعد میں آنے والوں کو بھی ان کے شرک و کفر اور گناہوں کے سبب ہلاک کر دیں؟

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ لوگوں کی طرح ان کو بھی ہلاک کرنے پر قادر ہے۔ دراصل یہ لوگ نہ عبرت پکڑتے ہیں، اور نہ ہی ہدایت حاصل کرتے ہیں، بلکہ گزشتہ لوگوں کی طرح شرک وکفر پر جمے رہتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، جیسے سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرة:٧] (اللہ نے مہر لگا دیا ہے ان کے دلوں پر)۔ اور سورۂ نساء میں فرمایا: ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ [النساء:١٥٥] (بلکہ ان پر اللہ نے مہر لگا دیا ہے ان کے کفر کی وجہ سے)۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ

قُلُوْبَهُمْ﴾ [الصف:۵] (جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کردیا) علیٰ هذاالقیاس دوسرے بہت سے مقامات پر بیان فرمایا کہ جولوگ مسلسل حق سے اعراض کرتے ہیں تو اس کالازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ان کے قلوب پر مہر لگائی جاتی ہے، یہ قدرت کی طرف سے ایسے نافرمان لوگوں کی سزا ہوتی ہے۔

﴿تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا﴾ یہ بستیاں ہیں جن کے قصے ہم آپ کوسناتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾......تا......﴿قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اوران کے پاس ان کے پیغمبر واضح معجزات لے کرآئے، اور وہ لوگ ایسے نہ تھے کہ جس چیز کو انہوں نے جھٹلادیا تھا (یعنی اس سے پہلے جھٹلا دیا تھا) اس پر ایمان لے آتے۔ان کے پاس حق آیا، تو اس کی تکذیب جو پہلے کردی تھی اسی تکذیب پر جمے رہے۔ پس ایسے ہی اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگادیتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [المطففین:۱۴] (ہرگز نہیں! بلکہ جوعمل یہ کرتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے)۔

﴿وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ﴾ اور ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد کا پورا کرنا نہ پایا۔ انسانوں کا یہ عجیب مزاج ہے کہ اکثر وپیشتر لوگ مفاد پرست ہی ہوتے ہیں کہ جب مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو بڑے زوروشور سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، اور پکے مشرک بھی اس وقت اپنے باطل معبودوں کونظرانداز کردیتے ہیں، اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ اگر یہ مصیبت دور ہوئی تو ایمان قبول کرتے ہیں، لیکن جب مصیبت دور ہوگئی تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:﴿لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾[یونس:۲۲] (یااللہ!) اگر تو نے ہمیں اس (مصیبت سے) نجات دے دی تو ہم ضرور بالضرور شکرگزار لوگوں میں سے ہوجائیں گے) ﴿فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ﴾.[العنکبوت:۶۵] (پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں)۔

﴿وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ﴾ اور بیشک ہم نے ان کے اکثر کو فاسق پایا۔اب فسق یا نافرمانی کی تین قسمیں ہیں، جن میں سے کسی نہ کسی قسم میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں:

پہلی قسم کا نافرمان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اوراس کے احکام کا صریحاً انکار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نبیوں علیہم السلام کو جھوٹا کہتا ہے، ایسا آدمی کافر ہوتا ہے، یہ سب سے بڑا فاسق شمار ہوتا ہے۔

دوسری قسم کا فاسق وہ ہے جو زبان سے تسلیم کرتا ہے، مگر دل سے انکار کرتا ہے۔اس کو عام اصطلاح میں

اعتقادی منافق کہتے ہیں، اور یہ بھی فاسق ہے۔

تیسری قسم کا فاسق وہ ہے جو دل وزبان سے اقرار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اور اس کے رسولوں علیہم السلام کی رسالت، اور آسمانی کتابوں اور روزِ قیامت اور دیگر سارے احکام کو مانتا ہے، مگر عمل نہیں کرتا۔ یہ عملی منافق ہے، مگر ابدی دوزخی نہیں، اور کافر بھی نہیں، مگر بہت گندا، اور نہایت بُرا ہی ہے۔ اور آج ایسے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

ایسے عملی منافقوں کی تعداد بنسبت اعتقادی منافقوں کے بہت زیادہ ہے۔ منافق عملی پورے معاشرے پر بوجھ ہیں، انہی کی وجہ سے اسلام کمزور اور غیر مسلموں کی نظر میں معیوب اور نا قابلِ قبول ہے۔ اسلامی معاشرہ انہی منافقوں کی وجہ سے بدنام بھی ہے۔

تاریخی واقعات کے نتائج کا بیان:

گزشتہ واقعات اور نافرمانوں کی ہلاکت اور تباہی پر غور کرنے سے جو نتائج معلوم ہوئے، وہ اختصار کے ساتھ یہ ہیں:

(۱) قبولِ حق کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ آباء واجداد کی تقلید ہے۔

(۲) انبیاء علیہم السلام کی بعثت اپنی قوم، اپنی برادری، اپنی بستی میں ہوا کرتی ہے۔

(۳) انبیاء علیہم السلام منصبِ نبوت کے حامل ہوتے ہیں، ان میں کوئی بادشاہ یا امیر وسردار نہیں ہوتے۔

(۴) اصولی پیغام سب کا ایک ہی ہوتا ہے، فروعی مسائل ہر ایک کے الگ الگ ہوتے ہیں۔

(۵) پیغمبر علیہم السلام کبھی ایک دوسرے سے اختلاف نہیں کرتے، بلکہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔

(۶) انبیاء علیہم السلام کا انتخاب کسی قوم کے ہاتھ میں نہیں ہوتا، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

(۷) انبیاء کرام علیہم السلام مالدار نہیں ہوتے، اور نہ ہی دنیاوی ساز وسامان کے طلبگار رہوتے ہیں۔

(۸) انبیاء کرام علیہم السلام مخلص، محنتی، جفاکش ہوتے ہیں، اور سب کچھ برداشت بھی کرتے ہیں۔

(۹) سارے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہی ہوا کہ غریبوں میں ان کی مقبولیت ہوئی، وہ بھی جزوی طور پر، اور امیر وسردار ہر محاذ پر ان کی مخالفت پر کمربستہ رہے۔

(۱۰) سارے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مجموعی طور پر قوموں، اُمتوں کا رویہ معاندانہ رہا ہے۔

(۱۱) جب تک لوگوں کے ایمان لانے سے مکمل نا اُمید نہیں ہوئے کوئی بددعا نہیں کی۔

(۱۲) آخری نتیجہ ہمیشہ ان کے حق میں رہا، اور نافرمان اقوام، انبیاء علیہم السّلام کے دشمن، اور ان کے ساتھ جبر و تشدد کرنے والے، ان کو پریشان اور ان کی تکذیب کرنے والے، ان کے راستے روکنے والے، ان پر تہمت لگانے والے، اور ان کے رفقاء مٹھی بھر ساتھیوں پر ظلم وستم ڈھانے والے، حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئے، اور طرح طرح کے عذابوں کے ذریعہ ہلاک و برباد ہو گئے۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں عذابِ الٰہی کے شکنجہ سے نجات نہ دے سکی، بچا نہ سکی۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنۢ بَعْدِهِم مُّوسَىٰ بِـَٔايَٰتِنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَإِي۟هِۦ فَظَلَمُوا۟ بِهَا ۖ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلْمُفْسِدِينَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ يَٰفِرْعَوْنُ إِنِّى رَسُولٌ مِّن رَّبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰٓ أَن لَّآ أَقُولَ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ بِـَٔايَةٍ فَأْتِ بِهَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿۱۰۶﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿۱۰۷﴾ وَنَزَعَ يَدَهُۥ فَإِذَا هِىَ بَيْضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ:۔ پھر ہم نے ان کے بعد اپنی آیات کے ساتھ موسیٰ کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، سو انہوں نے ان آیات کے ساتھ ظلم والا معاملہ کیا، سو تو دیکھ لے فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا؟ ﴿۱۰۳﴾ اور کہا موسیٰ نے کہ اے فرعون! بیشک میں رب العلمین کی طرف سے رسول ہوں ﴿۱۰۴﴾ میرے لئے یہی شایان شان ہے کہ سچ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف کسی بات کو منسوب نہ کروں، میں تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے دلیل لایا ہوں، سو تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے ﴿۱۰۵﴾ فرعون کہنے لگا کہ اگر تو کوئی نشانی لایا ہے تو اسے پیش کر دے، اگر تو سچا ہے ﴿۱۰۶﴾ موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی تو اچانک وہ بالکل واضح طور پر ایک اژدہا بن گئی ﴿۱۰۷﴾ اور اپنا ہاتھ نکالا تو یکایک وہ دیکھنے والوں کو سفید چمکدار نظر آنے لگا ہے ﴿۱۰۸﴾

معارف ومنازل

نسب وولادت:

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السّلام تک پہنچتا ہے، ان کے والد کا نام عمران، اور والدہ کا نام "یوکابد" تھا۔ بعض علماء نے "یوحانذ" بتایا ہے۔ باپ کا سلسلہ نسب یہ ہے: عمران بن

قامت بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم الخلیل علیہم السلام۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسم گرامی قرآن کریم میں ۱۳۶ مرتبہ، اور حضرت ہارون علیہ السلام کا نام ۲۰ مرتبہ مذکور ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے واقعات تقریباً بیس (۲۰) سے زائد سورتوں میں مختلف انداز اور نئے نئے طرز پر مختصراً اور تفصیلاً مذکور ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ایسے زمانہ میں ہوئی جب فرعون اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا فیصلہ کر چکا تھا، مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے، اللہ تعالیٰ شانہ نے تمام فرعونی تدابیر کو ناکام کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے گھر پہنچا کر، اسی کے زیر سایہ ان کی پرورش کا انتظام فرمایا، اور بصد خوشی وفراوانی ان کی والدہ کی گود میں پہنچایا۔ پوری تفصیل آئندہ ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

اس سورت میں جتنے قصص اور واقعات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے ذکر کئے گئے ہیں، یہ ان میں سے چھٹا قصہ ہے، اس کو کئی رکوع تک تفصیل اور زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کرنے کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلے یہ کہ جماعت انبیاء علیہم السلام میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ممتاز اور خصوصی مقام ہے۔ آپ علیہ السلام کلیم اللہ کے عظیم لقب سے موصوف ہیں، آپ علیہ السلام کے معجزات بنسبت دوسرے انبیاء سابقین علیہم السلام کے کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے زیادہ ہیں۔

اسی طرح اس کے بالمقابل ان کی قوم بنی اسرائیل کی سرکشی، جہالت اور کفر وعناد بھی پچھلی اُمتوں کے مقابلہ میں زیادہ اور اشد ہے، اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس قصہ کے ضمن میں بہت سے معارف ومسائل، اور احکام بھی بیان ہوئے ہیں، جیسے آئندہ معلوم ہوگا۔

فرعون:

فرعون مصر کے ہر بادشاہ کا لقب ہوتا تھا۔ اصل نام ولید بن مصعب بن الولید تھا۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نام قابوس لکھا ہے۔ یہ خبیث اُلوہیت کا مدعی، اور بہت بڑا ظالم وجابر تھا۔ اس سے پہلے فرعون جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں تھا اس کا نام ریان بن ولید تھا، وہ حضرت یوسف علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا، اور اس زمانہ کا عزیز مصر (زلیخا کا شوہر) وہ بھی مسلمان ہو چکا تھا، اور اس کی بیوی راحیل (زلیخا) نے بھی اسلام قبول کیا تھا۔ عزیز مصر کا نام اطفیر تھا۔ [ابن خلدون]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے ساتھ ابتدائی مکالمہ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے سامنے تفصیلی مکالمہ کا بیان آنے والا ہے، اس موقع پر نہایت اختصار کے ساتھ چند کلمات کا بیان ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں جا بجا تصریح ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تلقین کردی تھی کہ فرعون کے سمجھانے میں نرمی اور لطف و مہربانی کو پیش نظر رکھنا، غصہ یا سخت کلامی کا اظہار نہ کرنا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہدایتِ الٰہی کے مطابق نہایت لطف و شفقت اور نرمی کے ساتھ فرعون کو خطاب کر کے سمجھایا، اور اپنی نبوت کا اعلان کر کے اسے آگاہ فرمایا۔

فرعون نے اپنی مغرورانہ سرشت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیغمبرِ خدا ہونے کا استخفاف اور انکار کیا، اور مذاق و تحقیر کرتے ہوئے پوچھا: کون ہے ربّ العٰلمین، جس کے نبی ہونے کے تم مدّعی ہو؟ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت سے بحث شروع کردی، اپنے گھرانے اور اپنی پرورش کے احسان جتائے، اور ایک قبطی مصری کے قتل کا ذکر کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خوفزدہ کرنے کی سعی کی۔

مگر موسیٰ علیہ السلام نے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی، اور فرعون کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ربّ العٰلمین کا تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں، میرے حال اور منصبِ نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات بجز سچ و صداقت کے منسوب نہ کروں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے پاس جو پیغام (برحق) اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں سپرد ہوتا ہے وہ امانت ہوتا ہے، اس میں کسی خیانت یا کمی بیشی کا امکان نہیں ہوتا، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام ہر گناہ صغیرہ و کبیرہ سے معصوم اور پاک اور بری ہوتے ہیں، وہ احکامِ الٰہی کے پہنچانے میں ذرّہ بھر خیانت یا کمی بیشی نہیں کرتے ہیں، وہ اعلیٰ درجہ کے امانتدار اور امین ہوتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت، صداقت اور ہر طرح سچائی اور سچ کہنے کا فرعون اور اس کے اہلِ مجلس سرداروں کو یقین دہانی کرائی کہ میری سچائی تم سب کے سامنے ہے، اور میں نے کبھی اس سے پہلے جھوٹ نہیں بولا، اور نہ اب جھوٹ بول سکتا ہوں، اور میرے یہ معجزات روزِ روشن کی طرح میری حقانیت، نبوت اور صداقت پر واضح دلیل ہیں، لہٰذا ان سب چیزوں کا تقاضا ہے کہ آپ میری باتوں کو سنیں، اور تسلیم کریں، اور مانیں، اور میری قوم بنی اسرائیل کو پانچ سو سالہ مصنوعی غلامی سے آزاد کر کے میرے حوالہ کردیں تاکہ میں انہیں تمہاری غلامی سے نکال کر باہر لے جاؤں۔ فرعون نے اور کسی بات پر کوئی خاص توجہ تو نہ کی، البتہ معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا، اور کہا:

﴿اِنۡ كُنۡتَ جِئۡتَ بِاٰيَةٍ فَاۡتِ بِهَاۤ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ﴾ اگر تم واقعی کوئی معجزہ لائے ہو، تو پیش کرو، اگر تم سچ بولنے والوں میں سے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے مطالبہ کو مانتے ہوئے اپنی لاٹھی میدان پر ڈال دی، وہ اژدہا بن گئی۔

﴿فَاِذَا هِىَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ﴾ ثُعۡبَان بڑے اژدہا کو کہتے ہیں، اور اس کی صفت مُبِیۡن ذکر کر کے بتلا دیا کہ اس لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی ایسا واقعہ نہ تھا کہ کسی اندھیرے، یا گوشۂ پردہ میں واقع ہوا ہو، جس کو کوئی دیکھے اور کوئی نہ دیکھے، جیسے عموماً شعبدہ بازوں یا جادوگروں کا طرز و طریقہ ہوتا ہے، بلکہ یہ واقعہ بھرے دربار میں علیٰ رُؤسِ الخلائق سب محفل والوں کے سامنے پیش آیا۔

بعض تاریخی روایات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس اژدہا نے فرعون کی طرف منہ پھیلایا، تو اس نے گھبرا کر تخت شاہی سے کود کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پناہ لی، اور دربار کے بہت سارے لوگ خوف و دہشت سے مر گئے۔ [تفسیر کبیر وغیرہ]

لاٹھی کا سچ مچ سانپ بن جانا کوئی محال یا ناممکن چیز نہیں، ہاں! عام عادت کے خلاف ہونے کی وجہ سے حیرت انگیز اور قابل تعجب ضرور ہے، اور معجزہ و کرامت کا منشاء ہی یہ ہوتا ہے کہ جو کام عام آدمی نہ کر سکیں وہ کام انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے جاری کیا جاتا ہے، تاکہ لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہو کہ ان کے ساتھ کوئی مخفی خدائی طاقت کام کر رہی ہے۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا سانپ بن جانا کوئی قابلِ تعجب وانکار نہیں ہوسکتا، چنانچہ دیگر معجزات سب کا یہی حال ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِىَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ﴾ نَزَعَ کے معنی ہیں: ایک چیز کو دوسری چیز میں سے کسی قدر سختی کے ساتھ نکالنا، الگ کرنا۔ مراد یہ ہے کہ اپنے ہاتھ کو کھینچ کر نکالا۔ یہاں یہ مذکور نہیں کہ کس چیز میں سے ہاتھ کو نکالا۔ دوسری آیات میں دو چیزیں مذکور ہیں: ایک جگہ ﴿وَاَدۡخِلۡ يَدَكَ فِىۡ جَيۡبِكَ﴾ [النمل: ۱۲] آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ دوسری جگہ ﴿وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ﴾ [طٰهٰ: ۲۲] مذکور ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے دبالو۔ ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ ہاتھ کا نکالنا گریبان کے اندر سے یا بازو کے نیچے سے ہوتا تھا، مطلب دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی کبھی گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالنے سے، اور کبھی بازو کے نیچے دبا کر نکالنے سے یہ معجزہ ظاہر ہوتا تھا۔

﴿فَاِذَا هِیَ بَیۡضَآءُ لِلنّٰظِرِیۡنَ﴾ یعنی وہ ہاتھ چمکنے والا روشن ہوجاتا دیکھنے والوں کے لئے ۔بَیۡضَآء کے لفظی معنی سفید کے ہیں، اور ہاتھ کا سفید ہوجانا کبھی برص کی بیماری کے سبب بھی ہوتا ہے (سفید کاغذ کی طرح) ۔ یہاں یہ معنی مرادنہیں، اس لئے ایک دوسری آیت میں اس جگہ ﴿مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ﴾ [طٰہٰ: ۲۲] کا لفظ بھی مذکور ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہاتھ کی سفیدی کسی بیماری کے سبب نہ تھی، بلکہ یہ روشن بلب کی طرف چمکدار درخشندہ معلوم ہوتی تھی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی ہے کہ یہ سفیدی کوئی معمولی سفیدی نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ چمک اور روشنی ہوتی تھی، جس سے ساری فضاء روشن ہوجاتی تھی۔ [قرطبي، درمنثور]

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں: أيْ بَيْضَاءَ بَيَاضًا نُوْرَانِيًّا غَلَبَ شُعَاعُهُ شُعَاعَ الشَّمْسِ۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ اس وقت اتنا روشن چمکدار ہوگیا کہ اس کی شعاعیں سورج کی شعاعوں پر غالب آگئیں۔

....

قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیۡمٌ ۝۱۰۹ یُّرِیۡدُ اَنۡ یُّخۡرِجَكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ ۚ فَمَاذَا تَاۡمُرُوۡنَ ۝۱۱۰ قَالُوۡۤا اَرۡجِهۡ وَاَخَاهُ وَاَرۡسِلۡ فِی الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِیۡنَ ۝۱۱۱ یَاۡتُوۡكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیۡمٍ ۝۱۱۲ وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرۡعَوۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ لَنَا لَاَجۡرًا اِنۡ كُنَّا نَحۡنُ الۡغٰلِبِیۡنَ ۝۱۱۳ قَالَ نَعَمۡ وَاِنَّكُمۡ لَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ۝۱۱۴ قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ نَحۡنُ الۡمُلۡقِیۡنَ ۝۱۱۵ قَالَ اَلۡقُوۡا ۚ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا سَحَرُوۡۤا اَعۡیُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ وَجَآءُوۡ بِسِحۡرٍ عَظِیۡمٍ ۝۱۱۶ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَلۡقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِیَ تَلۡقَفُ مَا یَاۡفِكُوۡنَ ۝۱۱۷ فَوَقَعَ الۡحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۱۸ فَغُلِبُوۡا هُنَالِكَ وَانۡقَلَبُوۡا صٰغِرِیۡنَ ۝۱۱۹ وَاُلۡقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیۡنَ ۝۱۲۰ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝۱۲۱ رَبِّ مُوۡسٰی وَهٰرُوۡنَ ۝۱۲۲

ترجمہ: سرداروں نے کہا، جو فرعون کی قوم میں سے تھے کہ بلاشبہ یہ ایک جادوگر ہے، جو بڑا ماہر ہے ۝۱۰۹ یہ چاہتا ہے کہ تمہاری سرزمین سے تمہیں نکال دے، سو تم کیا مشورہ دیتے ہو؟ ۝۱۱۰ کہنے لگے کہ اس کو، اور اس کے بھائی کو ڈھیل دیدو، اور شہروں میں جمع کرنے والوں کو بھیج دو ۝۱۱۱ جو تیرے پاس ہر ماہر جادوگر کو لے آئیں ۝۱۱۲ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے، کہنے لگے کہ اگر ہم غالب ہوئے تو کیا ہم کو کوئی بڑا صلہ ملے گا؟ ۝۱۱۳ فرعون نے کہا: ہاں! اور بیشک تم

لوگ مقربین میں شامل ہو جاؤ گے ﴿۱۱۴﴾ ان جادوگروں نے کہا کہ اے موسیٰ! یا تو آپ ڈالیں، یا ہم ڈالنے والے ہو جائیں ﴿۱۱۵﴾ موسیٰ نے کہا کہ تم ہی ڈالو، سو جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، اور ان پر ہیبت غالب کردی، اور بڑا جادو لے کر آئے ﴿۱۱۶﴾ اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ تم اپنی لاٹھی ڈال دو، سو وہ اچانک ان کی بنائی ہوئی جھوٹی چیزوں کو نگلنے لگی ﴿۱۱۷﴾ پس حق ظاہر ہو گیا، اور وہ باطل ہو گیا جو انہوں نے بنایا تھا ﴿۱۱۸﴾ سو وہ اس جگہ مغلوب ہو گئے، اور ذلیل ہو کر لوٹے ﴿۱۱۹﴾ اور جادوگر سجدے میں ڈال دیئے گئے ﴿۱۲۰﴾ کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے ربّ العٰلمین پر ﴿۱۲۱﴾ جو موسیٰ کا اور ہارون کا ربّ ہے ﴿۱۲۲﴾

معارف ومنازل

''اَلْمَلَاءُ'' کا لفظ۔ مَلَأ کسی قوم کے بااثر سرداروں کے لئے بولا جاتا ہے، معنی یہ ہیں کہ قوم فرعون کے بااثر سردار یہ معجزات دیکھ کر اپنی قوم کو خطاب کر کے کہنے لگے کہ یہ شخص تو بڑا ماہر جادوگر ہے۔ انہوں نے معجزہ کو جادو سمجھا، کیونکہ ان بیچاروں، بیوقوفوں کو ربّ العزّت جلّ شانہ اور اس کی قدرتِ کاملہ کی کوئی خبر نہ تھی، جنہوں نے ساری عمر فرعون کو اپنا خدا، اور جادوگروں کو اپنا رہبر و پیشوا سمجھا، انہوں نے جادوگروں کے شعبدوں کے علاوہ نہ کچھ دیکھا تھا، اور نہ سنا تھا، وہ اس حیرت انگیز معجزہ کو دیکھ کر اس کے سوا کہہ ہی کیا سکتے تھے کہ یہ بھی بڑا جادو ہے۔ البتہ یہ جادو عام جادوؤں سے ایک حد تک ممتاز اور بڑا ہے۔

معجزہ اور جادو میں فرق:

اللہ تعالیٰ ہمیشہ انبیاء علیہم السّلام کے معجزات کو اسی انداز سے ظاہر فرماتے ہیں ہ کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں، اور ہٹ دھرمی وضد اختیار نہ کریں تو معجزہ اور جادو کا فرق بآسانی خود بخود سمجھ لیں۔ جادو کرنے والے عموماً ناپاکی اور گندگی میں رہتے ہیں، اور جتنی زیادہ گندگی اور ناپاکی میں ہوں گے اتنا ہی ان کا جادو زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

بخلاف انبیاء علیہم السّلام کے کہ طہارت ونظافت، تقویٰ وخلوص ان کی فطرت اور طبیعت ثانیہ ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کھلا ہوا فرق مِن جَانِبِ اللہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں۔

اور اہلِ بصیرت تو اصل حقیقت کو جانتے ہیں کہ جادو سے جو چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ سب دائرۂ اسبابِ طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے، بلکہ مخفی اسباب ہوتے ہیں،

اس لئے وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہوگیا۔

بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسبابِ طبعیہ کا مطلقاً کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ براہِ راست قدرتِ ایزدی کا فعل ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں اس کو حق تعالیٰ شانہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ [الأنفال:۱۷] (اور (اے پیغمبر!) جب تم نے ان پر (مٹی) پھینکی تھی تو وہ تم نے نہیں، بلکہ اللہ نے پھینکی تھی)۔

دوسری بات یہ ہے کہ سحر اور شعبدہ اور مسمریزم ایک فن ہے، جو سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہوسکتا ہے، اور معجزہ کوئی فن نہیں کہ جو تعلیم وتعلّم سے حاصل ہوسکے، حتی کہ معجزے میں نبی کا اختیار بھی نہیں ہوتا، اس پر قرآن حکیم خود گواہ ہے، سورۂ مؤمن میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [مؤمنون:۷۸] یعنی کسی رسول کے بس میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی معجزہ پیش کرسکے، چنانچہ بسا اوقات نبی کو پہلے سے اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔

جس طرح قلم جو بظاہر لکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقۃ یہ لکھنا قلم کا فعلِ اختیاری نہیں ہوتا، بلکہ یہ فعل کاتب کا ہے، اسی طرح معجزہ کا صدور بظاہر نبی کے ہاتھ سے ہے، مگر واقع میں یہ اللہ تعالیٰ کا فعل اور حکم پر جاری ہوتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فرمایا: ؎

نقش باشد پیش نقاش وقلم ☆ عاجز وبستہ چو کودک در شکم

نبی کے اختیار میں نہیں کہ جب چاہے اپنی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کردے، برخلاف فنونِ سحریہ کے کہ ساحر جس وقت چاہے قواعدِ مقررہ، اور اعمالِ مخصوصہ کے ذریعہ جادو کا اظہار کرے، مگر آج تک نہ معجزہ کے بارے میں نہ کوئی کتاب لکھی گئی ہے، اور نہ کوئی قاعدہ وضابطہ کی نشاندہی ہوچکی ہے، اور نہ اس کی تعلیم کے لئے کوئی درسگاہ، یا مخصوص کلمات والفاظ کی تعلیم موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جادو کے اصول تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں، جبکہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں یہ عنصر نہیں ہوتا، بلکہ ہر نبی کے معجزات اس کی شان کے مطابق، اور اس زمانے کے حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔

تیسری بات یہ بھی ہے کہ ساحر جب سوجاتا ہے، اور غفلت کی نیند میں ڈوب جاتا ہے، تو اس کا سحر اس کی حفاظت نہیں کرتا، اور اس کے سحر وجادو کے آلات بھی محفوظ نہیں ہوتے، پس اگر کوئی چور ساحر کا سامان چرائے، یا خود

ساحر کو قتل کردے، تو وہ ایسا کرسکتا ہے، نہ ساحر محفوظ رہا، اور نہ اس کے آلات۔ بخلاف معجزہ اور صاحبِ معجزہ کے، کیونکہ فرعونی جادوگروں میں سے دو بھائی بڑے سمجھدار اور زیرک و چالاک تھے، وہ اسی جستجو میں رہتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کو کسی طرح چرالیں۔ ایک موقع انہیں ایسا ہاتھ آیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی درخت کے نیچے آرام فرمارہے تھے، اوران کا عصاء رکھا ہوا تھا، اس پر ان دونوں بھائیوں نے چھاپہ مارا کہ عصاء موسوی کو اٹھا کر غائب کرلیں، جب وہ نزدیک آئے تو عصاء موسوی ببر شیر بن کر ان پر حملہ آور ہوا، اور وہ بھاگ گئے، اور انہوں نے ابھی سے فیصلہ کیا کہ یہ جادو نہیں، بلکہ صداقت کا معجزہ ہے۔ [مثنوی دفتر سوم]

حق و باطل کا معرکہ، اور حق کی فتح:

جب فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام کے دونوں معجزات عصاء اور یدِ بیضاء کو دیکھا، تو انہیں بجائے معجزہ کے جادو قرار دیا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا ہر زمانہ میں یہی طریق و عمل رہا ہے کہ وہ ان معجزات کو دیکھ کر ایمان لانے کی بجائے یہ کہہ کر بہتان باندھتے تھے کہ یہ جادو ہے۔ سورۃ الذاریات میں ارشاد ہے: ﴿كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ﴾ [الذاریات: ۵۲] (پہلے جو بھی کوئی رسول آیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ ہے)۔

فرعون اور اس کے سرداروں نے سمجھا کہ ابھی تو یہاں شاہی دربار میں یہ دونوں باتیں سامنے آئی ہیں کہ یکا یک ان کا ایک ہاتھ بہت زیادہ روشن اور چمکدار ہوگیا، اور ان کی لاٹھی اژدہا بن گئی، اگر انہوں نے اسی طرح کا کوئی مظاہرہ عوام کے سامنے کردیا، تو لوگ ان کے معتقد ہوجائیں گے، اور ہماری خدائی کا بیڑا غرق ہوجائے گا، اور ہماری حکومت جاتی رہے گی، اور اس سرزمین پر انہیں دونوں بھائیوں کا راج ہوجائے گا۔ فرعون کا دعویٰ خدائی کا بھی تھا، لیکن دنیاوی حکومت ہی کے باقی رہنے کے لالے پڑ گئے، خدائی تو بہت دور کی چیز ہے۔

لہٰذا اس سے پہلے کہ عوام پر ان کا کوئی اثر ہو، ان کا علاج اور تدارک ضروری ہے، تو مشورہ کرنے لگے کہ کیا اقدام کریں۔ (سبحان اللہ! نبوت اور معجزات کا ان پر ایسا رُعب پڑ گیا تھا کہ وہ یہی سوچتے رہتے کہ کیسے اور کس طرح ان کا مقابلہ کریں، اور انہیں کس طرح سے شکست دیدیں، حالانکہ وہ بآسانی ان دونوں بھائیوں پر ہاتھ ڈال سکتے تھے، اور انہیں کسی قید و بند میں ڈال کر ہمیشہ کے لئے ان سے نجات بھی حاصل کرسکتے تھے، مگر تقدیرِ ایزدی اور فیصلۂ خداوندی نے ان کی عقل پر ذلت اور بزدلی کا پردہ ڈال کر انہیں کسی نقصان کے سوچنے کا موقع نہ دیا)۔

پس فرعون کے لوگوں نے کہا کہ جادو کا کاٹ جادو سے ہوگا، یہ بڑا ماہر جادوگر ہے، اپنی حدودِ مملکت سے تمام ماہر، چیدہ چیدہ، اور نامور جادوگروں کو جمع کر کے اس کا مقابلہ کیا جائے۔

جب لوگوں نے یہ رائے دی تو فرعون کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ ہاں! یہ بڑا ماہر جادوگر ہے، اس کا مقابلہ پورے ملک کے جادوگروں سے کرا کر اس کو شکست دیدیں۔ سورۂ شعراء میں ہے: ﴿قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ﴾ [الشعراء: ۳۴] (فرعون نے اردگرد کے سرداروں سے کہا: یقیناً یہ کوئی ماہر جادوگر ہے)۔

درباریوں نے کہا کہ عجلت اور گرفت اچھی نہیں، ابھی اس شخص کو، اور اس کے بھائی کو کچھ مہلت دیدی جائے، اور پورے ملک کے تمام شہروں سے ماہر جادوگروں کے جمع کرنے کا انتظام کیا جائے۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام بھی وہاں موجود تھے، اور ان کو بھی نبوت دی گئی تھی اور فرعون کی طرف وہ بھی مبعوث تھے، جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ہے: ﴿اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ [طٰہٰ: ۴۳] (تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے) اسی لئے مشورہ میں ان کا نام بھی شامل کرلیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کو مہلت دو۔

چنانچہ پہلے تو مقابلہ کا وقت مقرر کیا گیا، جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعونیوں نے کہا: ﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى﴾ [طٰہٰ: ۵۸] (ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کرلو، جس کی خلاف ورزی نہ ہم کریں گے نہ تم کرنا) کوئی ہموار میدان مقرر کرلو۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى﴾ [طٰہٰ: ۵۹] (تمہارے لئے میلہ کا دن مقرر ہے، اور یہ بھی کہ چاشت کے وقت لوگ جمع کیے جائیں)۔

مقابلہ کے لئے دن اور وقت مقرر ہوگیا، اور فرعون کے درباریوں نے فرعون سے کہا کہ اپنے اہلکاروں کو مملکت کے دور دراز شہروں میں بھیج دیں، تاکہ بڑے بڑے جادوگروں کو لے کر آئیں۔ سورۂ شعراء میں ارشاد ہے: ﴿فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۳۸ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۝۳۹ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝۴۰﴾ [الشعراء:] (سو جمع کیے گئے جادوگر، مقررہ دن میں، جو معلوم تھا، اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم جمع ہوں گے تاکہ ہم جادوگروں کا اتباع کریں، اگر وہ غالب ہوجائیں)۔ چنانچہ ملک کے اطراف واکناف میں اہلکار بھیجے گئے، اور فرعون کی قلم رو سے جادوگر جمع کیے گئے۔

اب یہ معرکہ حق وباطل اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا، ایک طرف مادی دنیا کی زیب وزینت، اور نیرنگیوں کا وہ

حیران کن سلسلہ جاری رہا، جس میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، ایک بہت بڑی خلقت تماشا بین بن کر اپنے اسباب و وسائل کے ساتھ فاتحانہ انداز میں جمع ہوئی، اور کھانے پینے، رہائش اور مختلف لباسوں میں ملبوس شہر کے باہر، ایک وسیع و عریض میدان میں ہزاروں خیموں کے جھرمٹ میں رقص کرتے ہوئے چلتے رہے۔

دوسری جانب کیا ہے؟ دو ہی درویش صفت انسان ہیں، جو پشم کے لباس میں ملبوس، ایک درخت کے سایہ میں تمام دنیاوی اقدار سے مستغنی، اپنے عظیم ربّ کے حکمنامے کے اجراء کی خاطر تسبیح و تہلیل میں مصروف، اتنے پُراُمید اور مطمئن نظر آرہے ہیں کہ انہیں حق الیقین کے درجہ میں اطمینان حاصل ہے کہ جیت ہماری ہوگی، اور ہم ہی فتحمندی کے ساتھ ہمکنار ہوں گے۔

بھلا جس ہستی نے ابھی ابھی تازہ ربّ العرش العظیم کے ساتھ ہمکلامی کا اعزاز و شرف حاصل کیا ہو، اسے کسی فرعون اور اس کے کرّ وفرّ، اور فوج و حشم سے کیا خوف ہوگا؟ فَصَلٰوةُ اللهِ وَسَلَامُهٗ عَلٰى سَيِّدِنَا مُوْسٰى وَهَارُوْنَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ.

جب مقابلہ کا مرحلہ قریب آیا تو راویوں کے قول کے مطابق لاکھوں کی تعداد میں دور و نزدیک سے آئے ہوئے لوگوں کا بے پناہ مجمع تھا، ویسے بھی تو وہ دن مصریوں کا سرکاری اور قومی میلہ کا دن تھا۔ جسے وہ يَوْمُ الزِّيْنَةِ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میلوں پر پھیلا ہوا میدان کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا، اور چاروں طرف سے تماشائی نظارہ کرتے ہوئے اس تاریخی مقابلہ کے انتظار میں کھڑے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچوں بیچ درمیانی حصہ مقابلہ کیلئے خالی تھا، اسی کے ساتھ فرعون کا تخت سجایا ہوا تھا۔

جب ستر ہزار کے قریب جادوگر حاضر ہوئے تو پورے مجمع نے ان کا والہانہ استقبال کیا، اور وہ میدان کے اس حصے میں بٹھالیے گئے جہاں فرعون کا شاہی تخت رکھا ہوا تھا، اور اس پر فرعون براجمان تھا۔ جادوگروں کا سربراہ اور نمائندہ ترجمانی کرتے ہوئے فرعون کے پاس حاضر ہوا، اس کا نام "سابور" تھا، وہ آتے ہی عجیب انداز میں فرعون کا سجدہ کیا، پھر کھڑے ہوکر ہاتھ جوڑ کر فرعون سے مدد طلب کی، اور اس کی عزّت کی قسم کھائی، پھر عرض کیا کہ اگر ہم غالب آگئے، اور کامیاب ہوئے تو ہمیں کیا انعام اور کیا صلہ، اور کیسے اعزاز اور شرف سے نوازا جائے گا؟

فرعون نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں کا شمار آئندہ فرعونی دربار کے خصوصی اور ممتاز مقربین میں ہوگا۔ اتنے میں وہ مطمئن ہوکر لوٹے۔ اور سیدنا موسیٰ اور سیدنا ہارون علیہما السلام کے پاس آئے (جو پہلے سے

میدان میں موجود و حاضر تھے) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہم اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں، یا پہلے آپ ڈالیں گے؟ جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں ہے: ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى﴾ [طٰه:٦٥] (جادوگر بولے: موسیٰ! یا تو تم ڈال دو، یا پھر ہم ڈالنے میں پہل کریں؟)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿بَلْ اَلْقُوْا﴾ [طٰه:٦٦] (پہلے تم ہی ڈالو)۔ چنانچہ انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں، اور فرعون کی عزت کی قسم کھا کر کہنے لگے: ہم ضرور غالب رہیں گے۔ كَمَا فِي السُّوْرَةِ الشُّعَرَاءِ.

ان کی لاٹھیاں اور رسیاں لوگوں کی نظروں کے سامنے طرح طرح کے سانپ بن کر دوڑنے لگیں، انہوں نے لوگوں کی نظر بندی کی، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور تمام حاضرین کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ایک ایک میل تک میدان سانپوں سے بھر گیا ہے، اور سانپ دوڑ رہے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے: ﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى﴾ [طٰه:٦٧] (اس پر موسیٰ کو اپنے دل میں کچھ خوف محسوس ہوا)۔ امام مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کوئی خوف نہیں ہوا تھا، بلکہ آپ علیہ السلام کو یہ اندیشہ دامنگیر ہوا کہ لوگ دھوکہ کھا جائیں گے، اور میرے معجزے میں ان کو شک پڑ جائے گا، اور میرے معجزے کو اسی طرح جادو کا سانپ خیال کریں گے، جس سے حق واضح نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ گھبراؤ مت، تم بسم اللہ کر کے اپنی لاٹھی ڈالو، پھر دیکھو، جب انہوں نے لاٹھی ڈالی تو وہ بہت بڑا اژدہا بن گئی، اور ستر ہزار کے قریب جو سانپ دوڑ رہے تھے سب کو ایک لقمہ بنا کر اس طرح نگل گئی جیسا کوئی بھوکا شخص روٹی کا لقمہ نگل جائے۔ جادوگروں نے جو کارستانی کر کے پورے مجمع کو خوفزدہ و حیران کیا ہوا تھا، وہ سارا کھیل ختم ہو گیا، اور چشمِ زدن میں پورا تماشہ کالعدم ہوا۔ فرمایا:

﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ اس کے ساتھ فرعون اور اس کے ہمنوا، اور پورا مجمع اس قدر ذلیل و خوار اور شرمندہ و رسوا ہوا کہ پورا میدان جہاں پوری قوم خوشیاں منا کر ناچ رہی تھی، اور بڑے غرور و غلط فہمی کے مارے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑا رہے تھے، ایک نہ ختم ہونے والے ماتم میں اس طرح ڈوب گئے کہ ایک دوسرے پر لعن طعن کرنا شروع کیا، اور دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹتے رہے۔

آگے یہ ہوا کہ جادوگروں نے خوب سمجھ لیا کہ ہم نے جس شخص سے مقابلہ کیا، یہ ہرگز جادوگر نہیں ہے، اور اس کی لاٹھی کسی جادو کا شاہکار اور آلہ نہیں ہے، بلکہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کا برحق رسول ہے، اور ان کی لاٹھی پر آسمانی ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ پس وہ سارے بغیر کسی ترغیب، اور بغیر کسی مشورے کے فوراً سجدہ میں گر گئے۔

امام ابن جریر، امام ابن ابی حاتم، اور امام ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت قاسم ابن ابی بزہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی کہ فرعون کے ستر ہزار جادوگر تھے، انہوں نے ستر ہزار رسیاں، اور ستر ہزار لاٹھیاں زمین پر پھینکیں، یہاں تک کہ ان کے جادو سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ سارے سانپ دوڑ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ آپ اپنی لاٹھی ڈال دیں، جب انہوں نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ بڑا اژدہا بن گیا، اور جادوگروں کے تمام سانپوں کو یکبارگی نگل گیا، پس سارے جادوگر سجدہ میں گر گئے۔ انہوں نے اس وقت تک اپنے سروں کو سجدہ سے نہیں اٹھایا جب تک کہ انہوں نے جنت اور دوزخ کو، اور ان میں رہنے والوں کا انجام نہ دیکھا۔ [تفسیر در منثور]

جادوگروں نے جب باتفاق نہایت شوق ومحبت سے اپنے ایمان کا واضح اعلان فرمایا، تو فرعون اور اس کے ہمنوا سرداران قوم جو کہ اپنی شکست سے بے انتہا شرمندہ اور پریشان تھے، ان کے غم و پریشانی میں مزید اضافہ ہوا، کیونکہ جادوگروں کے اعلان میں اگرچہ اجمال ہے، کوئی تفصیل نہیں، مگر یہ اعلان فرعون اور اس کی قوم کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس کی تفصیل آنے والی ہے۔

فائدہ:

موسیٰ علیہ السلام کے عصاء کے بارے میں یہی مشہور ہے کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کا عصاء ہے، جو انہوں نے جنت سے لایا تھا، پھر حضرت شیث علیہ السلام کے ذریعہ دیگر انبیاء علیہم السلام کو باری باری سے منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاتھ میں رہا، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عنایت کیا۔ یہ زرد رنگ کا ہوتا تھا، اس کا نام "ماشا" تھا۔ واللہ اعلم [در منثور]

....

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ: فرعون نے کہا: کیا تم اس سے پہلے اس پر ایمان لے آئے کہ میں تمہیں اجازت دوں؟ بلاشبہ یہ

ایک بڑا مکر ہے، جو تم سب نے مل کر اس شہر میں کیا ہے، تا کہ تم اس کے ذریعہ شہر والوں کو نکال دو، سو عنقریب تم جان لو گے ﴿۱۲۳﴾ ضرور بالضرور میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ، اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا، پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا ﴿۱۲۴﴾ انہوں نے جواب میں کہا کہ بلا شبہ ہم اپنے ربّ کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۱۲۵﴾ اور تو جو ہم سے انتقام لے رہا ہے اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے ربّ کی نشانیوں پر ایمان لے آئے، جب وہ ہمارے پاس پہنچ گئیں، اے ہمارے ربّ! ہم پر صبر ڈال دے، اور ہمیں اس حال پر موت دے کہ ہم اسلام پر ہوں ﴿۱۲۶﴾

معارف ومنازل

فرعون نے کہا: تم میری اجازت سے پہلے ایمان لے آئے۔ ظالم بادشاہوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ عوام کے قلوب پر بھی حکمرانی کرنا چاہتے ہیں ا، اور پختہ وفاداری اسی کو سمجھتے ہیں کہ عوام اسی دین پر رہیں جو بادشاہ اور حکمران ان کے لئے تجویز کریں۔ اسی بنیاد پر فرعون جو اپنی شکست سے بڑا سوختہ تھا، اور اس شکست کا ذمہ دار وہ جادوگروں کو سمجھتا تھا، مزید برآن یہ کہ جادوگروں کے متفقہ ایمان نے اس کی حکمرانی اور بادشاہت کے ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا، اب وہ اپنے مستقبل کو تاریک سمجھ کر اپنی تباہی کا منتظر رہتا تھا، تب اس نے دھمکی آمیز لہجہ میں نومسلم ایمانداروں کو خطاب کر کے کہا کہ میری اجازت کے بغیر تم کیسے مسلمان ہو گئے؟

جب فرعون نے دیکھا کہ عوام کو اپنی خدائی اور حکومت کا وفادار رکھنے، اور موسیٰ علیہ السلام سے دور رکھنے کے لئے جادوگروں سے مقابلہ کا مظاہرہ کرایا تھا، اس کا نتیجہ برعکس نکلا، اور سارے جادوگر ہی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ پہلے ایک موسیٰ علیہ السلام تھے، اب ستر ہزار موسیٰ علیہ السلام تیار ہوئے، تو اب لینے کے دینے پڑ گئے، اور عوام کو اپنی طرف کرنے کے لئے اس نے جادوگروں کو خطاب کیا کہ تم میری اجازت سے پہلے کیوں مسلمان ہو گئے؟

﴿اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ﴾۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ﴾ [طٰہٰ: ۷۱] یعنی بلا شبہ یہ ایک خفیہ تدبیر اور مکر ہے جو تم سب نے مل کر اس شہر میں کیا ہے۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ یہی شخص ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا، یہ استاذ اور شاگردوں کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے۔

﴿لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا﴾ تا کہ تم اس شہر سے اس کے رہنے والوں کو نکال کر پورے ملک پر اپنا اقتدار جماؤ، اور ہر سیاہ وسفید پر قابض رہو۔

﴿فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ تم سب عنقریب جان لوگے۔ پھر فرعون نے جو سزا تجویز کی، اس کا یوں اعلان کیا:

﴿لَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ﴾ میں ہر حال میں تمہارے ایک طرف کا ہاتھ، اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ ڈالوں گا، پھر سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ ظالموں کا ہر زمانہ میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جب دلیل سے عاجز ہوتے ہیں، تو یہی رٹ لگاتے ہیں، ماروں گا، قتل کرلوں گا، سولی پر لٹکا دوں گا، وغیرہ۔

﴿قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ﴾ جادوگروں نے جواب دیا کہ بلاشبہ ہمیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں تمہاری دھمکی کی کوئی پرواہ نہیں، اور ہم موت سے ڈرنے والے بھی نہیں، تم قتل کرو، یا اور کچھ کرلو، ہم اپنے ربّ کے ہو گئے۔ اگر تو قتل کرے گا تو ہمارا کوئی نقصان نہ ہوگا، ہمارا ربّ ہمیں ایمان لانے پر جو انعامات عطاء فرمائے گا ان کے مقابلہ میں یہ دنیا کی ذرا سی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جب دلوں میں ایمان جگہ کرلیتا ہے تو دنیا کی ہر مصیبت ہیچ ہوجاتی ہے۔ ؎

زندہ کنی عطائے تو، ور بکشی فدائے تو ☆ دل شدہ مبتلائے تو، ہر چہ کنی رضائے تو

سورۂ طٰہٰ میں ان برگزیدہ نومسلموں کا ایک اور جواب بھی مذکور ہے: ﴿قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالَّذِىۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ‌ؕ اِنَّمَا تَقۡضِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ؕ۝۷۲ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَـغۡفِرَ لَـنَا خَطٰيٰنَا وَمَاۤ اَكۡرَهۡتَنَا عَلَيۡهِ مِنَ السِّحۡرِ‌ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى ۝۷۳﴾ [طٰہٰ] (وہ کہنے لگے کہ ہم ان کے دلائل کے مقابلہ میں جو ہمارے پاس پہنچ گئے، اور اس ذات کے مقابلہ میں جس نے ہمیں پیدا فرمایا، تجھے ہرگز ترجیح نہیں دیں گے، سو تو فیصلہ کردے جو بھی تجھے فیصلہ کرنا ہے، تو اسی دنیا والی زندگی ہی میں تو فیصلہ کرے گا، بلاشبہ ہم اپنے ربّ پر ایمان لائے، تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف فرمادے، اور جو کچھ تو نے جادو کروانے کے بارے میں ہم پر زبردستی کی، وہ بھی ہم پر معاف فرمادے، اور اللہ تعالیٰ بہت ہی بہتر ہے، اور باقی رہنے والا ہے)۔

برگزیدہ نومسلموں نے مزید فرعون سے کہا:

﴿وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا﴾ کہ یہ جو تو ہم سے ناراض ہورہا ہے اور ہم سے انتقام لینے کا اعلان کررہا ہے، اس کا سبب کچھ نہیں ہے، نہ ہم نے چوری کی، نہ ڈاکہ ڈالا، نہ کسی کو قتل کیا، بس یہی بات تو ہے کہ جب ہمارے پاس ہمارے ربّ کی دلیلیں آگئیں، تو ہم ایمان لے آئے، یہ بات نہ کوئی عیب کی ہے، نہ

جرم کی ہے، نہ اس پر ہم سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔اسی کے متعلق شاعر نے کہا:

خونے نکردہ ایم کسے رانہ کشتہ ایم ☆ جرم ہمیں کہ عاشق توحید گشتہ ایم

اس کے بعد فرعون سے اعراض کرتے ہوئے اپنے ربّ کی طرف متوجہ ہوئے، اور دعاء کی:

﴿رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ﴾ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر فیضانِ صبر عطاء فرمادے، پانی کی طرح ہم پر صبر ڈال دے کہ سر سے پیروں تک صبر میں نہا جائیں، اور ہمیں اس حال میں وفات دے کہ ہم مسلمان ہوں، یعنی خاتمہ بالخیر کی نعمت سے سرفراز فرمادے۔

کیا فرعون نے جادوگروں کو شہید کیا، یا نہیں؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کلبی اور سُدی رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے کہ فرعون نے ان برگزیدہ مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر ان کو سولی پر چڑھا دیا۔تفسیر درمنثور میں حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے کہ یہ جادوگر حضرات دن کے اوّل حصہ میں جادوگر تھے، اور آخر حصہ میں شہداء تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے ان کو شہید کردیا تھا۔بعض علماء کرام یہ کہتے ہیں کہ فرعون ان کو عذاب دینے پر قدرت نہ پاسکا، کیونکہ ربّ العزّت عزّوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ: ﴿فَلَا يَصِلُوۡنَ اِلَيۡكُمَا بِاٰيٰتِنَآ اَنۡتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ﴾ [القصص:۳۵] یعنی فرعون والے تم دونوں بھائیوں پر، اور تمہارے پیروکاروں پر دست درازی نہ کرسکیں گے۔ [روح المعاني]

فائدہ:

اس آیت میں ''اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا'' کی بجائے ﴿اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا﴾ کہاہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظِ اَفۡرِغۡ اَنۡزِلۡ کی بہ نسبت زیادہ بلیغ ہے، اور وہ اس لئے کہ اَنۡزِلۡ کے معنی اتارنے کے ہیں، اور اَفۡرِغۡ کے معنی برتن سے اس طرح پانی بہادینے کے ہیں کہ برتن میں کچھ نہ رہے، اور عَلٰی اِستعلاء اور احاطہ کے لئے ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ ہم پر صبر کامل کا ایسا پانی بہادے جو سر سے پیر تک ہمارے تمام بدن پر سے گزر جائے، اور کوئی حصہ بدن کا صبر کے پانی سے خشک نہ رہ جائے، اور ہم صبر کے پانی سے مکمل تر ہوجائیں۔[معارف القرآن]

ایمانی قوت کا کبھی کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا:

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ ہوا کہ ایمانی قوت تمام مادی قوتوں پر غالب ہے، اور جب یہ ایمانی قوت کسی

کے دل و باطن میں گھر کر لیتی ہے تو پھر صاحبِ ایمان ساری دنیا، اور اس کے ظاہری اور مادی وسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو آج صبح تک بدترین کفر میں مبتلا تھے کہ فرعون جیسے بیہودہ انسان کو خدا مانتے تھے، اور معبودِ حقیقی جلّ شانہ کی عظمت، اور عظیم الشان صفات سے بالکل نا آشنا تھے، ان میں یکبارگی مختصر وقت میں ایسا انقلاب کیسے آ گیا کہ اب پچھلے سب عقائد اور پوری زندگی کے اعمال اور خیالات سے یکسر تائب ہو کر، دینِ حق پر اتنے پختہ ہو گئے کہ اس کے لئے جان کی قربانی تک کے لئے تیار نظر آتے ہیں، اور دنیا سے رخصت ہونے کو بصد شوق و رغبت قبول کر کے اپنے ربّ کے پاس جانے پر اتنے خوش نظر آتے ہیں جیسے انہوں نے جنت کو دیکھا ہو اور نظارہ کیا ہو۔

اور صرف یہی نہیں کہ ایمان کی قوت اور جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت ان میں پیدا ہو گئی، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم و معرفت، جنہیں عام طور پر مسلمان بیسیوں سالوں میں بمشکل حاصل کر پاتے ہیں، ان حضرات پر ان کے دروازے لمحوں اور مختصر ساعتوں میں کھل گئے۔ ہمارے زمانہ کے ستر اسی سالہ مسلمان ایسا جوہر دکھانے سے عاجز نظر آتا ہے، جسے انہوں نے لمحوں میں حاصل کیا۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون جیسے ظالم و جابر کی دھمکیوں کا جواب انہوں نے پامردی اور بے مثال جرأت کے ساتھ دے کر ایک تاریخی اور مثالی بہادری و شجاعت رقم کر دی۔ جب ان کی جرأت و ایمان کا مظاہرہ مجمع عام میں ہو گیا تو چھ لاکھ کے قریب لوگوں نے ان کے نقشِ قدم پر چل کر ایمان قبول کیا۔

افسوس ہے کہ آج مسلمان اور مسلم حکومتیں اپنے آپ کو قوی اور طاقتور بنانے کے لئے ساری مادی تدبیریں اختیار کر رہی ہیں، مگر اصل قوتِ ایمانی والے گُر کو بھول بیٹھی ہیں، جو قوتِ ایمانی و وحدت کی روح ہے، جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا کر دنیا کی عظیم طاقتوں کو تہہ و بالا کر دیا۔ فرعونی جادوگروں نے بھی پہلے مرحلہ میں اس کو سمجھ لیا تھا، اور عمر بھر کے خدا نا شناس، منکر کافروں کو دم بھر میں نہ فقط مسلمان، بلکہ ایک عارف باللہ، ولی کامل، اور مجاہد و سرفروش بنا دینے کا یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصاء اور یدِ بیضاء سے کچھ کم نہ تھا۔ اَلحمدُللہِ وَ المِنۃ

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ

قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡیٖ نِسَآءَهُمۡ ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهِ
اسۡتَعِیۡنُوۡا بِاللّٰهِ وَاصۡبِرُوۡا ۚ اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ ۟ۙ یُوۡرِثُهَا مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ
لِلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوۡۤا اُوۡذِیۡنَا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَاۡتِیَنَا وَمِنۡۢ بَعۡدِ مَا جِئۡتَنَا ؕ قَالَ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ
یُّهۡلِكَ عَدُوَّکُمۡ وَیَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ: اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑے رہے گا تا کہ وہ زمین میں فساد کریں، اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رہیں؟ اس نے کہا کہ ابھی ہم ایسا کریں گے کہ ان کے بیٹوں کو مار ڈالیں گے، اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے، اور ہم کو ان پر پوری طرح غلبہ حاصل ہے ﴿۱۲۷﴾ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو، اور صبر کرو، بلاشبہ یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنادے، اور عاقبت متقیوں ہی کے لئے ہوتی ہے ﴿۱۲۸﴾ وہ کہنے لگے کہ ہم کو آپ کے آنے سے پہلے تکلیفیں دی جاتی رہی ہیں، اور آپ کے آنے کے بعد بھی، انہوں نے جواب میں کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے، اور تمہیں زمین میں خلیفہ بنادے، پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ﴿۱۲۹﴾

معارف ومنازل

قومِ فرعون کی شرارت اور اسلام دشمنی:

فرعون کی چالاکی اور سیاسی جھوٹ نے (کہ جادوگروں نے میدانِ مقابلہ میں آنے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساز و باز کیا تھا) اس کی جاہل قوم کی اس کے ساتھ قدیم گمراہی میں مبتلا رہنے کا کچھ سامان تو کردیا کہ انہوں نے دھمکیاں دے کر اپنے اقتدار بچانے کا کم و بیش لوگوں پر اثر ڈالا، مگر یہ بہت بڑا حادثہ اور مثالی اعجوبہ ان کے لئے بھی ناقابلِ فہم تھا کہ فرعون کے غصہ کا سارا زور جادوگروں پر ختم ہوگیا، موسیٰ علیہ السلام جو کہ اصل مخالف اور مدِمقابل تھے، ان کے بارے میں فرعون کی زبان سے کچھ نہ نکلا، لہٰذا ان کو یہ کہنا پڑا کہ: ﴿اَتَذَرُ مُوۡسٰی وَقَوۡمَهٗ لِیُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَیَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ﴾ الآیۃ۔

یعنی انہوں نے کہا: کیا آپ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو یوں ہی آزاد چھوڑ دیں گے، وہ آپ کو، اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر برا بھلا کہتے ہوئے ہمارے ملک میں فساد کرتے پھریں؟ اس پر بجبوری فرعون نے کہا:

﴿قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡيٖ نِسَآءَهُمۡ ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ﴾ یعنی ان سے ہمیں کسی قسم کا خطرہ نہیں، اوران کا معاملہ باعثِ پریشانی نہیں، ہم ان کے لئے یہ کام کریں گے کہ پہلے کی طرح ان کے لڑکوں کوقتل کردیں گے، اورلڑکیوں کوزندہ رہنے دیں گے، اس طرح ان کے مردوں کی آبادی کم رہے گی، اور ہمارے خلاف وہ کوئی محاذ نہیں کھول سکیں گے، اور ہمیشہ ہمارے زیرِ دست اورتابع رہیں گے، اورہم ان پراب اورآئندہ بھی غالب رہیں گے۔(انگریزوں نے اپنے باپ فرعون سے یہی سیکھا، اورآج اس پر مسلمانوں کے خلاف عمل کررہے ہیں، اور خاندانی منصوبہ بندی چلارہے ہیں)۔

علماءِ مفسرین فرماتے ہیں کہ فرعونی سرداروں کے کہنے اورمشورہ جاری کرنے پرفرعون نے بنی اسرائیل کے بارے میں تو یہ ضرورکہا کہ ان کے مردوں کوقتل کرتے رہیں گے، اورعورتوں کو باندیاں بناکراپنی خدمت کے لئے زندہ رہنے دیں گے، مگرحضرت موسیٰ اورحضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں اس مرحلہ پربھی کچھ نہیں کہا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس غیر معمولی واقعہ نے فرعون کے ہوش وحواس پراتنا اثر ڈالا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نام لینے سے بھی خوف وگھبراہٹ محسوس کرتا تھا، وہ نہایت حواس باختہ، اورخوفزدہ تھا اسے یقین ہوچکا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنے سے میری تباہی اور ہلاکت میرے مقدر میں ہوگی (چنانچہ ایسا ہی ہوا)۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فرعون کا یہ حال ہوگیا تھا کہ وہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا تو اس کا پیشاب خطا ہوجاتا تھا، اوریہ بالکل صحیح ہے، ہیبت حق کا یہی حال ہوتا ہے۔[مظهري، ابن كثير، معارف القرآن]

خلاصہ یہ ہے کہ فرعون نے جب جادوگروں کو دھمکی دی کہ تمہاری وجہ سے مجھے خفت ہوئی، اورمیری خدائی لوگوں میں شرمندہ اور بدنام ہوئی، جب اس کا علم اس کے درباریوں کو ہوگیا توانہوں نے بطورِ خوشامد اور چاپلوسی فرعون سے کہا: کیاتو موسیٰ (علیہ السلام) اوراس کی قوم کے (جواس کے ماننے والے ہیں، خواہ بنی اسرائیل میں سے ہوں، خواہ جادوگر ہوں، خواہ وہ لوگ ہوں جوقومِ فرعون میں سے مسلمان ہوگئے تھے) اسی طرح چھوڑے رکھے گا کہ وہ زمین میں بدامنی پھلائیں، اورفساد کرتے رہیں، اورتیری خدائی کا مذاق اڑائیں، تیرے معبودوں کو باطل اورناپاک کہتے رہیں؟

پہلے یہ شخص اکیلا تھا، اس کا مقابلہ آسان تھا، اوراب اس کے دین ومذہب کی جڑیں ایک حدتک مضبوط ہوچکیں، ہوسکتا ہے آئندہ اس کا مقابلہ ہمارے لئے مشکل ہو۔

تو فرعون نے انہیں تسلی دی کہ ان کی قوت پر ضرب لگائیں گے، ان کے لڑکوں کو حسبِ سابق مار ڈالیں گے، اور بچیوں کو اپنی قومی خدمت کے لئے زندہ رکھ چھوڑیں گے، یہاں تک کہ وہ مفلوج رہیں گے، اور کبھی بھی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ فرعون خود کو ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ [النازعات: ۲۴] (میں تمہارا اعلیٰ درجے کا پروردگار ہوں) تو کہتا تھا، لیکن اپنے لئے معبود تجویز کر رکھے تھے، جن کی وہ عبادت کیا کرتا تھا۔

بعض مفسرینؒ نے لکھا ہے کہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ ستارے عالمِ سفلی کے مربی ہیں، اور وہ خود عالمِ ارضی یعنی نوعِ انسانی وغیرہ کا ربّ ہے۔ بعض علماء کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کے لئے اپنے مجسمے بنا کر رکھے تھے کہ پورے ملک میں جہاں کہیں تم ہو میرے مجسمے کے ذریعہ میری پوجا کیا کرو۔

بنی اسرائیل اور نو مسلم لوگوں کو سخت پریشانی میں دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کامیابی کے وہ بہترین آسمانی نسخے بتائے کہ ان پر عمل کرنے سے تمام مصائب اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں، یعنی غمی وخوشی ہر حال میں اللہ تعالیٰ شانہ سے نصرت ومدد، اور استعانت طلب کرنا، اور مصائب وبلیات پر صبر کرکے ثابت قدم رہنا۔ یہ دونوں اعلیٰ درجے کے آسمانی نسخے ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ عزّ شانہ نے حضرات انبیاء علیہم السلام پر اتارا، اور انہیں عمل کرنے کا حکم عنایت فرمایا، اب بھی اگر کوئی ان پر عمل کرے تو کامیابی کو اپنے گھر کی دہلیز پر موجود پائے گا۔ ان شاء اللہ

بنی اسرائیل کی مصر میں آمد کی مختصر روئیداد

سورۂ بقرہ میں یہ واقعہ گزر چکا ہے، اور تفصیلاً سورۂ یوسف میں آنے والا ہے (ان شاء اللہ تعالیٰ) کہ جب حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام عزیز مصر کے منصب پر فائز تھے، اور بڑا مشہور تاریخی قحط پڑا، تو برادرانِ یوسف علیہ السلام کنعانِ فلسطین سے غلّہ اناج کے لئے مصر گئے تھے، ان کا یہ سفر تقریباً تین مرتبہ جاری رہا، پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو اپنی قمیص دے کر ہدایت کی کہ اس کو والد ماجد حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرے پر ڈال دو، وہ بینا ہو جائیں گے، پھر تم اپنے پورے خاندان کے ساتھ وہاں سے ہجرت کرکے یہاں میرے پاس مصر آجاؤ۔

چنانچہ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے پورے خاندان کے ساتھ مصر پہنچے، جہاں ان کی عزت واحترام کے ساتھ پذیرائی ہوئی۔ اس وقت ان کا پورا خاندان مرد، عورت، بچے، بڑے ستر افراد پر مشتمل تھا۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں شہری آبادی سے دُور کسی میدانی علاقہ میں جگہ دیدی تاکہ شہری بے اعتدالیوں اور بُرے اثرات سے محفوظ رہیں، اور حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مصری عوام بت پرست ہوتے ہوئے

نہایت بُرے بداخلاق بھی ہیں۔اس طرح مصریوں سے الگ رہنے سے بنی اسرائیل اپنی مذہبی زندگی پر قائم رہ سکیں گے،اورشہری بُرائیوں سے بچ جائیں گے۔

بہر حال! حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی زندگی کا طویل حصہ، بلکہ مکمل زندگی مصر میں گزاردی، اور بہت سے لوگ آپ علیہ السلام کی تبلیغ سے مسلمان بھی ہوئے، جب ان کی عمر ایک سودس سال کو پہنچی توان کی وفات ہوئی، اوردریائے نیل کے کنارے سے کچھ فاصلہ پر دفن ہوئے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے توحسبِ وصیت حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تابوت قبر سے نکال کر ساتھ لے گئے،اور فلسطین میں نابلس کے ساتھ دفنادیا۔اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ ستر ہزارتھی، جوموسیٰ علیہ السلام کے ساتھ روانہ ہوئے،اور پیچھے سے فرعون اپنے پورے حشم ولشکر جرار کے ساتھ بحر قلزم میں غرق ہوا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد فرعون کے غرق ہونے تک پورے ساڑھے چارسوسال بنی اسرائیل فرعونیوں کی غلامی میں رہے۔پوری تفصیل آئندہ سورۂ یوسف میں آنے والی ہے۔ان شاءاللہ تعالیٰ۔

جب حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام مبعوث ہوئے،توقومِ فرعون کی دشمنی بنی اسرائیل کے ساتھ اور بڑھ گئی، خصوصاً جب فرعون کے بُلائے ہوئے جادوگروں سے مقابلہ ہوا،اورجادوگرسارے مسلمان ہو گئے،تو فرعونیوں کی طرف سے ظلم وستم کا مظاہرہ اورزیادہ بڑھ چڑھ کر ہونے لگا۔

مؤرخین کے اندازے کے مطابق پورے ملک میں فرعونیوں کی تعداد، یعنی آبادی پونے دوکروڑتھی، جن میں ستر لاکھ وہ ہیں جوکہ فرعون کے ساتھ غرق ہوئے۔تفصیل سُورۂ بقرہ میں گزرچکی ہے، بحوالہ تفسیر مظہری ومعالم و بغوی۔

بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم تو مصیبت ہی مصیبت میں ہیں، آپ کی تشریف آوری سے پہلے بھی دکھ ہی دکھ میں مبتلا رہے، جبکہ ہمارے سامنے ایک لاکھ کے قریب ہمارے بچے ذبح ہوتے گئے، اورکچھ وقفہ کے بعد اب دوبارہ ہماری اولاد کے قتل کا سلسلہ آپ کی تشریف آوری کے بعد شروع ہوگیا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں مسلسل صبر وبرداشت کی تلقین فرماتے رہے، اوراللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے،اوردعا کی تعلیم فرماتے رہے،اور ارشادفرمایا کہ صبر کا پھل میٹھا اورخوشگوار ہے،اوراللہ تعالیٰ کے سوا ظالموں کے مظالم سے کوئی نجات اورخلاصی دینے والانہیں۔

"حرص" ہے۔ اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے، تو اس کا نام "زھد" ہے، اور اس کی ضد "اسراف، تبذیر، عیش پرستی" ہے۔

صبر دراصل انبیاء علیہم السّلام کی صفتِ مختصہ محمودہ ہے، ان کی وساطت سے اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو عطاء کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بنی اسرائیل کو یہی نسخۂ کیمیا بتلا کر انہیں دشمن کے مقابلہ کی تلقین فرمائی، مگر بنی اسرائیل نے جہاں دیگر احکامِ الٰہی کی مسلسل نافرمانی کی وہاں انہوں نے صبر جیسے خُلقِ حسن کا بھی بڑی بے رحمی اور ڈھٹائی کے ساتھ مذاق اڑایا، اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی جتنی کوششیں روز افزوں زیادہ ہوتی تھیں اسی طرح اس مغضوب وملعون قوم کی نافرمانیوں میں نئے نئے خطوط پیدا ہوتے رہتے تھے۔ اس قوم نے اپنے برگزیدہ انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ وہ وہ ناروا سلوک کئے جنہیں سن کر ایک مؤمن کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ
قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے فرعون والوں کو قحط سالی کے ذریعہ، اور پھلوں میں کمی کے ذریعہ پکڑ لیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۱۳۰﴾ پھر جب آجاتی ان کے پاس خوشحالی تو کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے لئے ہونی ہی چاہئے، اور اگر انہیں کوئی بدحالی پہنچ جاتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتاتے تھے، خبردار! ان کی نحوست اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، لیکن ان میں بہت سے لوگ نہیں جانتے ﴿۱۳۱﴾ اور وہ کہنے لگے کہ تو جب کبھی بھی کوئی نشانی ہمارے سامنے لائے گا تاکہ تو اس کے ذریعہ ہم پر جادو کرے، سو ہم تیری تصدیق کرنے والے نہیں ہیں ﴿۱۳۲﴾

معارف ومنازل

قومِ فرعون عیش وعشرت اور ہر قسم کی انسانی خوشحالیوں میں ممتاز تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا تھا، دریائے نیل جو کہ تمام دریاؤں سے بڑا بھی ہے، اور حدیث شریف کے مطابق بابرکت بھی ہے، یہ عظیم دریا مصر کی سرزمین پر بہتا ہے، جس سے پورا مصر آباد ہے، اور اسی دریا کے بل بوتے پر فرعون اُلوہیت کا دعویٰ

کر کے کہتا تھا کہ ﴿وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ﴾ [الزخرف: ۵۱] (اور یہ نہریں میرے نیچے بہہ رہی ہیں)۔
وہ یہی کہتا تھا کہ یہ دریا، اور یہ نہریں سب میرے حکم سے چلتے ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی فرعون اور اس کی قوم نے تکذیب کی، اور آپ علیہ السلام کے معجزات کو جادو کہا، اور جادوگروں کے ایمان پر خوب طعن وتشنیع کی، اور انہیں سخت سزا دلوائی، پھر بنی اسرائیل پر ظلم وستم کا مزید اضافہ ہوتا رہا، اور بنسبت پہلے کے ان پر سختی اور ظلم وزیادتی کا ناقابلِ برداشت سلسلہ شروع ہوا، تو تنبیہ وگوشمالی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذابوں کا ایک بڑا سلسلہ جاری فرمایا، جن کا بیان آنے والا ہے۔

ان عذابوں میں سے ایک قحط سالی ہے، جس میں دریائی پانی کے وافر ذخیرہ کے باوجود اشیاء خورد ونوش کی کمی کا یہ سلسلہ اتنا حیران کن اور تباہ کن رہا، جس کی مثال نہ ہو، اور گرانی کے علاوہ ہر چیز نایاب رہی۔ تفسیری روایات میں ہے کہ یہ قحط ان پر سات سال تک مسلسل رہا۔

آیت کریمہ میں لفظ "سِنِيْنَ اور نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ" کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ قحط اور خشک سالی کا عذاب تو گاؤں والوں کے لئے تھا، اور پھلوں کی کمی شہر والوں کے لئے، کیونکہ عموماً دیہات میں غلّہ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے، اور شہروں میں پھلوں کے باغات ہوتے ہیں۔ تو اشارہ اس طرف ہوا کہ نہ غلّہ کی پیداوار ہوئی، اور نہ پھلوں کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک قحط زدہ ہوگیا۔ اسی طرح کا قحط حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں بھی آیا تھا، چونکہ یہ قحط ایک قسم کا عذاب تھا، جس کا اصلی سبب حق ورسالت کی تکذیب کے سوا کچھ نہیں تھا، اس لئے یہ سات سال تک جاری رہا۔

اسی طرح کا قحط تکذیب رسالت کی پاداش میں مکہ کے مشرکین پر بھی آیا، جس میں وہ لوگ مردار جانوروں کے کھانے پر مجبور ہوئے تھے، جس کی تفصیل صحیح البخاری میں ہے۔

جب کسی نافرمان قوم پر اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کا نزول ہوتا ہے تو صحیح بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، اور عذابِ الٰہی سے عبرت پکڑنے، اور راہِ راست پر آنے کی استعداد بھی ان کے دل ودماغ سے سلب ہوجاتی ہے۔ قومِ فرعون بھی اسی قہر وغضب میں مبتلا تھی۔ عذاب کے اس ابتدائی جھٹکے سے بھی ان کو کوئی تنبیہ نہ ہوئی، اور نہ ہی انہوں نے کوئی سبق سیکھا، بلکہ اس قحط کو، اور اس کے علاوہ ہر آنے والی مصیبت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا، اور خود کو پاکیزہ سمجھنے لگے۔

﴿فَاِذَا جَآءَتۡهُمُ الۡحَسَنَةُ قَالُوۡا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوۡا بِمُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗ﴾ یعنی جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی اور راحت و آرام ملتا ہے تو کہتے ہیں: یہ ہمارا بنیادی حق ہے، ہمیں ملنا ہی چاہئے، اور جب کوئی مصیبت اور برائی پیش آئی تو کہتے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کی نحوست کا اثر ہے۔ وہ اپنے کفر و شرک کی نحوست بھول جاتے، اور نظر انداز کرتے، اس کی جگہ صالحین اور مؤمنین کے ایمان و اعمالِ صالحہ کو نحوست کا سبب قرار دیتے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

﴿اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ﴾ خبردار! ان کی نحوست کا سبب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ نحوست کفر و شرک اور معاصی کا ثمرہ ہوتا ہے، جو کہ وہ قوم فرعون کی وجہ سے ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے موحّد ساتھیوں کو کسی نحوست کے ساتھ کیا تعلق؟ وہ تو نحوستوں کو مٹانے آئے ہیں، اور رحمتوں کو عام کرنے کے لئے، ان کو نحوستوں کے ساتھ کوئی سروکار اور تعلق نہ ہے اور نہ ہوگا۔

طَائِر کے معنی ہیں: پرندے، چونکہ کفار و مشرکین بلّیوں، کتوں، پرندوں کی آمد و اڑان سے، نیز ان کے دائیں بائیں آمد و رفت سے اچھے اور بُرے فال لیتے تھے، اس لئے طَائِر کا اطلاق ہوا۔ یہ کلمہ قرآن مجید کے مختلف مقامات اور سورۂ یٰس میں بھی موجود ہے، بمعنی بدفالی کے۔ آج کل یہ بدفالی اور نیک فالی کا سلسلہ تعویذی کار و بار کرنے والے لوگوں کے ہاں بکثرت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ایمانوں پر رحم فرمائے۔ آمین

بالآخر قومِ فرعون نے نہ صرف یہ کہ آیات و معجزات کا انکار کیا، بلکہ کھلم کھلا تمام معجزات کو سحر و جادو کہتے ہوئے ان کی تکذیب اور انکار کا اعلان کرتے ہوئے ایمان قبول کرنے سے منحرف ہوئے، اور موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہتے رہے کہ ہم کبھی تمہاری تصدیق نہیں کریں گے۔

……❀……❀……❀……

فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَـرَادَ وَالۡقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا
وَكَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ وَلَـمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ الرِّجۡزُ قَالُوۡا يٰمُوۡسَى ادۡعُ لَـنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ ۚ
لَئِنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَـنُؤۡمِنَنَّ لَكَ وَلَـنُرۡسِلَنَّ مَعَكَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ
اِلٰٓى اَجَلٍ هُمۡ بٰلِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ ﴿۱۳۵﴾ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِى الۡيَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا

وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ۝۱۳۶ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ۝۱۳۷

ترجمہ: سو ہم نے ان پر طوفان بھیج دیا، اور ٹڈیاں، گھن کا کیڑا، اور مینڈک، اور خون، یہ نشانیاں تھیں کھلی ہوئی، سوانہوں نے کبر کیا، اور وہ مجرم لوگ تھے۝۱۳۳ اور ان پر جو عذاب واقع ہوتا تو کہتے تھے کہ اے موسیٰ! اپنے ربّ سے اس بات کی دعا کر جس کا اس نے تجھ سے عہد کر رکھا ہے، اگر تو نے ہم سے عذاب کو ہٹا دیا، تو ہم ضرور تیری تصدیق کریں گے، اور تیرے ساتھ ضرور بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۝۱۳۴ پھر جب ہم ان سے عذاب کو ایک مدّت تک ہٹا دیتے، جس مدت تک ان کو پہنچنا تھا، وہ اسی وقت عہد شکنی کر دیتے تھے۝۱۳۵ پھر ہم نے ان سے انتقام لے لیا، سوان کو اس سبب سے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا سمندر میں غرق کر دیا، اور وہ ان سے غافل تھے۝۱۳۶ اور ہم نے ان لوگوں کو زمین کے مشارق اور مغارب کا وارث بنا دیا، جو ضعیف شمار کئے جاتے تھے، اور آپ کے ربّ کی نیک بات بنی اسرائیل پر پوری ہوگئی، اس سبب سے کہ انہوں نے صبر کیا، اور ہم نے برباد کر دیا ان کارروائیوں کو جو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ کیا کرتے تھے، اور جو کچھ وہ اونچی عمارتیں بنایا کرتے تھے۝۱۳۷

معارف ومنازل

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ﴾ [الإسراء:۱۰۱] (اور یقیناً ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو نشانیاں دی تھیں) نو آیات معجزاتِ موسوی کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ یہ ہیں: (۱) عصاء (۲) ید بیضا (۳) سنین (۴) نقص ثمرات (۵) طوفان (۶) جراد (۷) قُمل (۸) ضفادع (۹) دم۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ مجاہد، عکرمہ، شعبی، اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔ اوّل چار کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوا، جبکہ باقی پانچوں کا تذکرہ اسی آیت کریمہ میں ہو رہا ہے۔ ان میں عصاء اور یدِ بیضاء آیاتِ کبریٰ ہیں، اور باقی سات آیات عذاب ہیں، جن سے فرعون اور اس کی قوم قبطیوں کی زندگی تنگ ہوئی اور وہ پریشان رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدتِ اقامت مصر بیس سال ہے:

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ نو معجزات، یعنی آیاتِ بینات نو سال میں تدریجاً یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئے، ہر سال ایک نشانی ظاہر ہوتی تھی۔ آیاتِ مذکورہ بالا میں پانچ عذاب مذکور ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ جادوگروں کے واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس مصر میں بیس سال رہے، اور برابر یہ عذاب باری باری سے پیش آتے رہتے تھے، جو قومِ فرعون کے لئے عذاب، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے معجزہ ہوتے تھے۔

اور روح المعانی، ابن کثیر، معالم اور دیگر تفسیروں میں لکھا ہے کہ مذکورہ بالا عذابوں میں سے جو بھی عذاب فرعونیوں پر آتا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتے تھے کہ تم اپنے ربّ سے دعا کر کے اسے ہٹادو، اگر تم نے ایسا کیا، اور عذاب ہٹادیا، تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے، آپ کی تصدیق کریں گے، اور بنی اسرائیل کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔ لیکن جب ایک عذاب ہٹ جاتا، اور وہ مطمئن ہوجاتے تو ایمان لانے پر تیار نہ ہوتے، اور ہر عذاب کو جادو ہی بتادیتے، اور اپنے وعدہ سے منحرف ہوتے۔ چنانچہ یہ سلسلہ ہر وقت اور ہر زمانہ کئی سالوں تک چلتا رہتا تھا۔

عذابوں کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح قرآن کریم نے بیان فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے جو عذاب آیا وہ سات سالہ قحط تھا، اس کے بعد دوسرا عذاب نقصِ ثمرات کا، تیسرا طوفان، چوتھا جراد یعنی ٹڈیوں والا، پانچواں قُمّل گھن کے کیڑوں کا، چھٹا ضفادع مینڈکوں کا، ساتواں دم خون کا۔

ابن منذر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ان میں سے ہر عذاب قومِ فرعون پر سات روز تک مسلّط رہتا تھا، ہفتہ کے دن شروع ہوکر دوسرے ہفتہ کے دن رفع ہوجاتا، اور پھر تین ہفتے کی مہلت ان کو دی جاتی تھی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ جب پہلی مرتبہ قومِ فرعون پر قحط کا عذاب مسلّط ہوا، اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے رفع ہوگیا، مگر یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! یہ ایسے سرکش لوگ ہیں کہ عذاب قحط سے بھی متاثر نہ ہوئے، اور معاہدہ کر کے پھر گئے، اب اس مرتبہ ان پر ایک ایسا عذاب مسلّط فرمادیجئے جو ان کے لئے دردناک ہو، اور ہماری قوم کے لئے سامانِ عبرت ہو، اور بعد میں آنے والوں کے لئے درسِ عبرت ہو، تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ان پر طوفان کا عذاب بھیج دیا۔

مشہور مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک طوفان سے مراد پانی کا طوفان ہے، قومِ فرعون کی سب زمینوں اور گھروں

کو پانی کے طوفان نے گھیر لیا، نہ کہیں بیٹھنے لیٹنے کی جگہ رہی، نہ زمین میں کچھ کاشت کرنے کی جگہ رہی، اور عجیب بات یہ تھی کہ قومِ فرعون کے مکانات اور زمینوں کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے مکانات اور زمینیں ہوتی تھیں، ابنی اسرائیلیوں کے مکانات اور زمینیں خشک تھیں، وہاں طوفان کے پانی کا نام ونشان تک نہ تھا، اور فرعونیوں پر طوفانی پانی کا عذاب مسلّط تھا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ طوفان دور ہوا، اور زمین خشک ہوئی، اور فرعونیوں کی کھیتیاں پہلے سے زیادہ ہری بھری ہوگئیں، تو اب وہ کہنے لگے کہ درحقیقت یہ طوفان ہمارے لئے کوئی عذاب نہ تھا، بلکہ یہ ہمارے فائدے کے لئے تھا، اس طوفان کے آنے میں موسیٰ علیہ السلام کا کوئی دخل نہیں، اور یہ کہہ کر سب عہد و پیمان نظر انداز کردیئے۔

اس طرح وہ ایک ماہ تک امن وعافیت سے رہے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں غور وفکر کی مہلت عطاء کی، مگر ان کی سرکشی اور زیادہ ہوگئی، تو اب دوسرا عذاب ٹڈیوں کا ان پر مسلّط کردیا گیا۔ ٹڈی دَل نے ان کی ساری کھیتوں اور باغوں کو کھالیا۔ بعض روایات میں ہے کہ لکڑی کے دروازوں، اور چھتوں کو، اور تمام گھریلو سامانوں کو ٹڈیاں کھاگئیں، اور اس عذاب کے وقت بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ سامنے تھا کہ یہ سارا ٹڈی دَل صرف قومِ فرعون قبطیوں کے باغوں، کھیتوں، اور گھروں پر مسلّط رہا، اور متصل ملے ہوئے بنی اسرائیلیوں کے مکانات، زمینیں، باغات، گھر بار وغیرہ سب محفوظ رہے۔

اس موقع پر سنگ دل قومِ فرعون نے چیخ چلا کر پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ اپنے ربّ سے دعا کریں تاکہ یہ عذاب ٹل جائے، ہم پختہ عہد کرتے ہیں کہ ہم آپ کی تصدیق کریں گے، اور ایمان لائیں گے، اور بنی اسرائیل کو آزاد کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، عذاب رفع ہوا، ٹڈی دَل کی گرفت ختم ہوگئی، مگر یہ سرکش، ازلی بدبخت، جہنمی لوگ منحرف ہوئے، نہ ایمان لائے، نہ بنی سرائیل کو آزادی دی۔

ابن ماجہ کی حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹڈی کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: أَكْثَرُ جُنُودِ اللهِ تَعَالٰى. اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں تعداد کے اعتبار سے بہت بڑا لشکر ہے۔ [ابن ماجة] واقعی ٹڈی بہت بڑا لشکر ہے، بظاہر یہ بہت چھوٹے نظر آتے ہیں، مگر جب کسی علاقہ پر ان کی یلغار ہوتی ہے تو پناہ بخدا، کئی میلوں تک یہ لشکر باغات اور کھیتوں کو صاف کردیتا ہے، اور کسی فوج اور لشکر کے قابو میں نہیں

آتا، بھگانے سے بھاگتا نہیں، اور ختم کرنے سے ختم ہوتا نہیں، سڑکوں اور گھروں میں پہنچ جائے، تو سب کے لئے آفتِ جان بن جاتا ہے، کھیتوں میں فصلات اور کھیتوں کا ایسا صفایا کرتا ہے کہ سبزہ کا نام ونشان نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ نے عذاب کے طور پر اپنے اس لشکر کے ذریعہ فرعونیوں کی سرکوبی فرمائی، اور انہیں ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا فرمایا۔ ایک مہینہ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دی، مگر وہ بدستور اپنی سرکشی اور کفر پر جمے رہے۔ اس مہلت کے بعد تیسرا عذاب قُمّل کا مسلّط ہوا۔ یہ لفظ عام طور پر جوؤں کے معنی میں مستعمل ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آیت کریمہ: ﴿فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًى مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡيَةٌ﴾ [البقرة: ۱۹۶] (پس تم میں سے جو بیمار ہو، یا اس کو سر کی تکلیف ہو، تو فدیہ ہے) میرے بارے میں نازل ہوئی، میرے بالوں میں اتنی بکثرت جوئیں پیدا ہوئیں کہ میرا سکون غارت ہوا۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: اَلْقُمَّلُ یَتَنَاثَرُ عَلٰی وَجْھِیْ. میرے سر کے بالوں سے جوئیں میرے چہرے پر قطار در قطار گر رہے تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر ارشاد فرمایا: أَیُؤْذِیْکَ ھَوَامُ رَأْسِکَ؟ قُلْتُ نَعَمْ. مطلب یہ ہے کہ عام معنی اس لفظ کا یہی معروف ہے، لیکن علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر روح المعانی میں مفسرین حضرات سے اس کے مصداق میں چند اقوال لکھے ہیں:

پہلا یہ کہ اس سے چھوٹی چھوٹی ٹڈی مراد ہے، جس کے ابھی پَر نہ آئے ہوں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ بعض مفسرینؒ نے فرمایا کہ اس سے وہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مراد ہیں جو اونٹ اور دیگر جانوروں کے جسم میں پیدا ہو جاتے ہیں، جن کو چچڑی کہتے ہیں، یہ کیڑے فرعونیوں کے جسموں میں ہو گئے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اس سے چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں مراد ہیں۔

اور حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے وہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مراد ہیں جو گیہوں کے اندر پیدا ہوتے ہیں، جن کو گھن کہا جاتا ہے، اور یہ کیڑا گندم اور غلّہ کے لئے اتنا خطرناک ہے کہ اُسے ناکارہ بناتا ہے، پھر وہ کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ بعض لغت والوں نے کہا کہ قُمَّل قاف کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ، چھوٹی مکھیوں کو کہتے ہیں، اور اَلقَمل قاف کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ جوؤں کو کہتے ہیں۔ [راغب]

جب ائمۂ لغت اور علماء کرام ومفسرین حضرات اس لفظ کا اطلاق مسطورہ بالا مختلف کیڑوں پر کرتے ہیں، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمل اپنے معنی میں ان تمام مصادیق کے لئے وسیع ہے، اس لئے ان تمام اطلاقات کی تطبیق

کے لئے یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر یہ عذاب نازل فرمایا کہ انسانوں پر جوئیں مسلط کردیں، ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں چھوٹی مکھیوں کو پھیلا دیا، ان کے جانوروں میں ہلاک کرنے والا کیڑا پیدا کردیا، اور ان کے اناج اور غلہ میں گھن لگا کر خراب کر دینے والی سُرسُری کی تباہی پھیلا دی، اور ان سب مہلک کیڑوں کو قرآن مجید کے اعجاز نے قمل کی وسیع تعبیر میں بیان فرمایا، گویا کہ قمل کے اندر یہ سارے معانی پوشیدہ ہیں۔ [قصص القرآن]

پھر ایک مہینہ کی مہلت ایسی آرام وراحت کے ساتھ ان کو دی گئی، مگر اس مہلت سے انہوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا، اور بدستور اپنی گمراہی پر جمے رہے، تو چوتھا عذاب مینڈکوں کا ان پر مسلّط کر دیا گیا، اور اس کثرت سے مینڈکوں کا ڈھیر لگ جاتا، سونے کے لئے لیٹتے تو سارا بدن ان سے دب جاتا، انہیں سونا اور بیٹھنا اور کروٹ لینا ناممکن ہو جاتا، پکی ہوئی دیگچیوں میں اور رکھے ہوئے کھانوں میں، پانی میں، گھر کے برتنوں میں، ہر چیز میں مینڈکوں کا راج ہوتا تھا۔ الغرض تمام میدان، سڑک، گھر، مجلس گاہ، کھیت، بازار، اور شہر مینڈکوں سے بھرے رہتے، روٹی کا لقمہ اٹھایا مینڈک اس میں شامل رہا۔

اس عذاب سے ذلیل ہو کر عاجز آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رو رو کر توبہ کرنے، اور آئندہ اصلاح، اور ایمان لانے، اور بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کا پختہ عہد کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے عذاب ٹل گیا، مصیبت دور ہو گئی ایک ماہ مہلت مل گئی، مگر ان ظالموں نے اپنا کوئی عہد و پیمان پورا نہیں کیا، اور مسلسل ہٹ دھرمی پر جم کر ہر قسم کی نافرمانیوں پر اُتر آئے، اور بجائے تسلیم وانقیاد کے کہنے لگے: اب تو معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑا جادوگر ہے۔ تو پانچواں عذاب خون کا مسلط کر دیا گیا، دریائے نیل خون سے بھرا ہوا دریا بن گیا، ان کے ہر کھانے کی چیز خون بن گئی، دریا سے، کنویں سے، حوض سے، جہاں کہیں سے پانی نکالے خون بن جائے، غرض یہ کہ ہر چیز خون میں لت پت۔ مگر ان سب عذابوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ نمایاں اور مسلسل رہا کہ ہر عذاب میں فرعونی مبتلا رہے، اور ان کی زندگی تلخ رہی، لیکن بنی اسرائیل ہر عذاب سے بالکل محفوظ و مامون رہے۔

خون کے عذاب کے وقت قومِ فرعون کے لوگوں نے بنی اسرائیل کے گھروں سے پانی مانگا، جب برتن ان کے ہاتھ میں پہنچا تو پانی خون بن گیا، کنویں سے فرعون والے پانی نکالتے تو خون بن جاتا، بنی اسرائیلی نکالتے تو پانی ہی ہوتا، جب ڈول پانی کا نکال کر فرعونی کو دیتے تو فوراً خون بن جاتا، جب اس کے ہاتھ سے واپس لے لیتے تو دوبارہ پانی بن جاتا، ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر جب کھانا کھاتے، یا پانی پیتے تو قبطی کے لئے سب کچھ خون ہوتا، اور

بنی اسرائیلی کے لئے کھانا، اور پانی ہی ہوتا۔

یہ عذاب بھی دیگر عذابوں کی طرح مسلسل ایک ہفتہ جاری رہا، آخر کار یہ بدکار، گندہ مزاج، ناپاک قوم پھر چلّا اٹھی، اور رونا شروع کیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضور ہاتھ جوڑ کر پہلے سے زیادہ پختہ عہد و پیمان پر اُتر آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی، اور عذاب بند ہو گیا، مگر یہ خبیث لوگ پھر حسبِ سابق اپنی گمراہی پر ڈٹے رہے، اور عہد شکنی پر پہلے کی طرح قائم رہے، جیسے ارشاد ہے:

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ﴾۔

اس کے بعد ایک چھٹے عذاب کا ذکر بعد کی آیت میں رِجز کے نام سے آیا ہے۔ یہ لفظ اکثر طاعون کے لئے بولا جاتا ہے، چیچک وغیرہ وبائی امراض کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تفسیری روایات میں ہے کہ ان لوگوں پر طاعون کی وبا مسلّط کر دی گئی، جس میں ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ [معارف القرآن باختصار]

فائدہ:

الرِّجزُ بمعنی عذاب کے ہے۔ حقیقت میں یہ کوئی چھٹے عذاب کا نام نہیں، بلکہ گزشتہ بیان شدہ پانچوں عذابوں کا مجموعی نام ہے، یعنی قحط، نقص ثمرات، طوفان، جراد، قُمّل، مینڈک اور خون میں سے ہر ایک پر رِجز کا اطلاق ہوتا ہے، پس اگر اس کو مستقل چھٹا عذاب قرار دیا گیا تو تِسع آیات کا خلاف ہوگا، اور آیات بجائے نو کے دس ہو جائیں گی، جو کہ نصِ قطعی (تِسْعَ آيَاتٍ) کے خلاف ہوگا۔

اور جن حضرات نے رِجز کو چھٹا عذاب قرار دیا انہوں نے "نقصِ ثمرات" کو "سنین" کا حصہ قرار دیا، اور مستقل عذاب شمار نہیں کیا۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں وہ مستقل ہے، اور رِجز کا ذکر نہیں فرمایا۔

﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ﴾ اور جب ان پر عذاب واقع ہو گیا (خواہ قحط ہو یا دیگر عذاب، مثلاً نقص ثمرات، طوفان، جراد، قُمّل، ضفادع، دم وغیرہ) تو کہنے لگے، یعنی ہر عذاب کے وقوع کے بعد کہ اے موسیٰ! اپنے ربّ سے اس بات کی دعا کر جس کا اس نے تجھ سے وعدہ کیا ہے، اور وہ یہ کہ جب آپ دعا کریں گے وہ اس کو قبول فرمائے گا، اور مصیبت کو دور فرمائے گا، (یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر پیغمبر کے ساتھ ہو چکا ہے)۔

﴿لَئِنۡ كَشَفۡتَ عَنَّا الرِّجۡزَ لَنُؤۡمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرۡسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ﴾ اگر تو نے ہم سے عذاب (قحط، نقص ثمرات، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، اور الدم) دور کر دیا، تو ہم تیری تصدیق کریں گے، اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ چنانچہ صاحب روح المعانی نے حضرت حسن، قتادہ، اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہم تینوں حضرات سے نقل کیا ہے کہ یہ رِجۡز کسی مستقل عذاب کا نام نہیں، بلکہ اس میں انہی عذابوں کا تذکرہ ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جیسا کہ ہم نے تصریح کر دی۔

﴿فَلَمَّا كَشَفۡنَا عَنۡهُمُ الرِّجۡزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمۡ بٰلِغُوۡهُ اِذَا هُمۡ يَنۡكُثُوۡنَ﴾ پھر جب ہم نے عذاب کو اس مدت تک ہٹا دیا جس مدت تک وہ پہنچنے والے تھے، تو اچانک وہ عہد کو توڑ رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: اِلٰٓى اَجَلٍ سے ان کے غرق کرنے کا وقت مراد ہے، جو اللہ تعالیٰ کے علم میں متعین تھا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے موت کا وقت مراد ہے۔ قوم فرعون نے کسی بھی عہد کو پورا نہ کیا، تو فرمایا:

﴿فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ فِي الۡيَمِّ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا﴾ پھر ہم نے ان سے انتقام لیا، سو ہم نے ان کو سمندر میں غرق کر دیا، اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا۔

﴿وَكَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ﴾ اور وہ لوگ ان سے غافل تھے، انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو اپنی گمراہی اور غفلت ولا پرواہی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ سورۂ بقرہ رکوع ۶ میں، سورۂ شعراء رکوع ۴ میں، سورۂ قصص اور سورۂ دخان وغیرہ میں تفصیل مذکور ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿وَاَوۡرَثۡنَا الۡقَوۡمَ الَّذِيۡنَ كَانُوۡا يُسۡتَضۡعَفُوۡنَ......﴾ آخر تک۔ اور جن لوگوں کے ساتھ ضعف اور کمزوری کا معاملہ کیا جاتا تھا، یعنی بنی اسرائیل، جنہیں قوم فرعون نے غلام بنا رکھا تھا، اور وہ اس قدر مقہور اور مجبور تھے کہ ان کے لڑکوں کو ان کے سامنے ذبح کیا جاتا تھا، ان کو اس سرزمین کے مشارق ومغارب کا وارث بنا دیا، جن میں ہم نے برکت دی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے شام کی سرزمین مراد ہے۔

فرعون کی گرفت سے نجات، اور غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے بعد، سمندر پار کرنے کے بعد بنی اسرائیل ملک شام آ گئے، جب یہ لوگ فرعون کی غلامی میں رہے اچھے اور شریف رہے، مگر آزادی حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ بہت ہی بُرے نافرمان ثابت ہوئے، انہی نافرمانیوں کی وجہ سے میدانِ تیہ میں چالیس سال تک حیران و سرگردان رہے، چالیس سال کا عرصہ کوئی مختصر زمانہ نہیں، یہ سب کچھ ان کی نافرمانیوں کی سزا تھی۔

چالیس سال میں ان کے بوڑھے جن کے ذہن اور خیالات غلامی کے دور کے پیداوار تھے تقریباً مر گئے، اور نوجوانوں کی نئی نسل جو غلامانہ خیالات سے کچھ دور اور بیزار تھی وہ سامنے آگئی، تب انہیں ملک شام پر تمکن اور اقتدار حاصل ہو گیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی اللہ تعالیٰ جلّ جلالہ نے جو وعدہ فرمایا تھا: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ [الأعراف:۱۲۹] (قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے، اور تمہیں زمین میں خلیفہ بنادے) وہ پورا فرمادیا۔

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى﴾ اور تیرے ربّ کی نیک اور پسندیدہ بات پوری ہوگئی۔ یعنی نصرت کا وعدہ پورا ہو گیا۔ سورۂ قصص میں اسی نصرت کا یوں تذکرہ ہے، فرمایا: ﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ﴾ [القصص:۵] (اور ہم یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں کو زمین میں دبا کر رکھا گیا ہے ان پر احسان کریں، ان کو پیشوا بنائیں، انہی کو (ملک و مال کا) وارث بنادیں)۔ مزید فرمایا:

﴿بِمَا صَبَرُوْا﴾ یعنی یہ سب کچھ جو انہیں عطاء ہوا یہ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے مصیبتوں پر صبر کیا، اور تکلیفوں کو برداشت کیا، اور یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور کرم ہے کہ صبر کرنے والوں کو وہ ہمیشہ نصرت اور خلاصی عطاء فرماتے ہیں، جبکہ بے صبر ہر کامیابی سے محروم ہوتے ہیں۔

﴿وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ﴾ اور ہم نے برباد و تباہ کیا ان کارروائیوں کو جو فرعون اور اس کی قوم کیا کرتے تھے، اور جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے۔ اس سے مختلف عمارات اور ہر قسم کے قصور مراد ہیں۔ اس فن میں مصریوں کو ہمیشہ ید طولیٰ اور اعلیٰ مہارت حاصل رہی ہے، جیسے اہرامِ مصر جو ابھی تک صحیح حالت میں موجود ہیں، جن کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہے۔

اگر ﴿مَا كَانَ يَصْنَعُ﴾ سے فرعونیوں کے کفر اور گمراہی مراد ہو، اور بنی اسرائیلیوں پر ظلم و ستم، اور ﴿يَعْرِشُوْنَ﴾ سے بلند و بالا عمارتیں مراد ہوں تو یہ عمدہ توجیہ ہوگی۔

فائدہ:

جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا تھا: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الأعراف:۱۲۹] (قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے، اور تمہیں زمین میں خلیفہ بنادے، پھر دیکھے گا کہ تم کیسا عمل کرو گے)۔ اسی وعدہ کے مطابق فرعون اپنی

فوج وحشم سمیت غرق ہوا، اور بنی اسرائیل چالیس سال بعد ملک شام کے مشرق ومغرب پر قابض ہوئے، اور کئی صدیوں کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں مصر پر بھی ان کا قبضہ ہوا۔

پس یاد رہے کہ محققین کا مذہب یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت فرعون کی قوم اور بنی سرائیل دونوں کے لئے ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح کی ہے، چنانچہ یہ ﴿تِسع آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ﴾ دونوں قوموں کے لئے ہیں، فرعونیوں کے لئے بحیثیتِ معجزہ اور عذاب کے، اور بنی اسرائیلیوں کے لئے بطورِ معجزہ وعبرت کے، کہ وہ ان معجزات کو دیکھ کر ایمان لائیں، اور ہر طرح کے شرک وکفر اور تکذیب حق سے اجتناب کریں، چنانچہ انہوں نے ان تمام آفتوں اور عذابوں کا بچشمِ خود اچھی طرح سے معائنہ کیا، اور دیکھا، مگر عبرت کبھی حاصل نہیں کی۔

دریائے قلزم کے بارہ راستوں کو، اور اپنی نجات کو، پھر لحات میں فرعون کے پورے لشکر کی تباہی کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے باوجود ان ناشکر اور نافرمان مغضوب وملعون قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ: ﴿اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ﴾ (ہمارے لئے معبود تجویز کردیجئے، جیسا کہ ان کے معبود ہیں)۔ آئندہ اس مبغوض قوم کی مسلسل شرارتوں کا تذکرہ ہوگا، تاکہ عقلمند عبرت سیکھیں۔

❀ ❀ ❀

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿١٤١﴾

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کردیا، سو وہ ایک ایسی قوم پر آئے جو اپنے بتوں پر دھرنا دیئے ہوئے تھے، کہنے لگے: اے موسیٰ! ہمارے لئے معبود تجویز کردیجئے، جیسا کہ ان کے معبود ہیں، انہوں نے فرمایا: بیشک تم ایسے لوگ ہو کہ جہالت کی باتیں کرتے ہو﴿١٣٨﴾ بلاشبہ یہ لوگ جس شغل میں ہیں وہ تباہ ہونے والا ہے، اور یہ لوگ جو کچھ کررہے ہیں وہ باطل ہے﴿١٣٩﴾ موسیٰ نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارے لئے کسی کو معبود تلاش کروں؟

حالانکہ اس نے تمہیں جہانوں پر فضیلت دی (۱۴۰) اور جب ہم نے تمہیں نجات دی آلِ فرعون سے، جو تمہیں بُری تکلیفیں دیتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے، اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے، اور اس میں تمہارے ربّ کی طرف سے بڑی آزمائش ہے (۱۴۱)

معارف ومنازل

بنی اسرائیل کی ناشکری اور احسان فراموشی صدیاں گزرنے کی بات نہیں، کوئی لمبا عرصہ ابھی نہیں گزرا، صرف ہفتوں کی بات ہے۔ جس قوم نے چالیس سال سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زیر سایہ پرورش پائی ہے، اور اپنی آنکھوں سے فرعونیوں پر آنے والے عذابوں کا بچشمِ خود معائنہ کیا ہے، پھر بحرِ قلزم کے بارہ راستوں سے عبور بھی مشاہدہ کیا ہوا ہے، پھر اپنے سب سے بڑے دشمن کی تباہی کا مشاہدہ بھی کیا ہوا ہے، انہیں چاہیے تھا کہ سالہا سال اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتے، اور ہر نشست و برخاست، اور ہر قدم پر توحیدِ الٰہی کی نغمہ سرائی کرتے، مگر یہ ملعون و مغضوب قوم نے ان تمام احسانات کو فراموش اور بالائے طاق رکھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ شروع کیا کہ اس قوم کی طرح آپ ہمارے لئے بھی کوئی گائے معبود بنائیں۔

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست

جب یہ لوگ سمندر سے پار ہو کر آگے بڑھے، یہ وہ لوگ تھے جو ایک ایسا عجیب وغریب اور تاریخی واقعہ مشاہدہ کر کے بڑھے تھے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی، یعنی ستر لاکھ فرعونی فوج اور عوام کا غرقاب ہونا، تو دیکھا کہ کچھ لوگ بتوں کی پرستش میں اعتکاف کرتے ہوئے مشغول ہیں، سامنے ایک گائے کا مجسمہ رکھا ہوا ہے، لوگ اس کی پرستش کر رہے ہیں، اور دھرنا دیئے ہوئے ہیں، انہیں دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا معبود مقرر کر دو، جو مجسمہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ تم لوگ جہالت میں ڈوبے ہوئے ہو، اور کفر و جہالت کی باتیں کرتے ہو۔

(وہ بھی لوگ تھے جنہوں نے زندگی بھر کے کفر و جادو سے تائب ہو کر جنتوں کی سیر کی، جنہوں نے مجھے صرف ایک لمحہ دیکھا، اور تم بھی جہالت میں ڈوبے ہوئے لوگ ہو، جو میری چالیس سالہ تبلیغ کو بیک لمحہ نظر انداز کر کے بت پرستی پر آمادہ ہو)۔ تم جن کو گائے کی عبادت پر دیکھ کر ان کی طرح بننا چاہتے ہو یہ سراسر تمہاری جہالت اور نادانی

ہے۔ یہ لوگ باطل پر ہیں، ان کا عمل بھی باطل، اوران کا یہ معبود بھی باطل ہے، جبکہ میں نے تمہیں اُس معبودِ حقیقی کا راستہ دکھایا، جس کی قدرتوں اور بے مثال نعمتوں کا تم لوگ بار بار مشاہدہ کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔تم شرک سے تائب ہوکر دوبارہ شرک کی دنیا کا حصہ نہ بنو۔

تم اللہ تعالیٰ شانہ کی توحید پر شوق ورغبت کے ساتھ جے رہو، تمہیں معبودِ برحق کی عبادت کی تلقین کر چکا ہوں، کیا اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارے لئے کوئی باطل معبود تجویز کردوں؟ جس نے تمہیں تمہارے زمانہ کے جہانوں پر فضیلت دی، اور جس ظالم دشمن نے تمہیں پانچ سو سال سے غلام بنا رکھا تھا، اور تمہاری نسل کشی کر رہا تھا، محض یہ نہیں کہ اس سے تمہیں نجات عطاء فرمائی، بلکہ تمہاری آنکھوں کے سامنے اُسے پورے لشکر کے ساتھ غرق فرما کر تمہاری اشک شوئی فرمائی، اور تمہارے زخموں پر مرہم پٹی لگا کر تمہاری فریاد رسی کی۔تم اپنے ربّ جلّ شانہ کی بے شمار اور بے مثال نعمتوں کی ناقدری کرتے ہوئے ہرگز اپنی دنیا اور اپنی آخرت تباہ نہ کرو، اور ربّ العٰلمین عزّوجلّ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کرو۔

آخر میں پھر دوبارہ اس عظیم نعمت کی یاددہانی فرمائی کہ جس فرعون نے تمہاری نسل کشی کی، تمہارے ربّ نے اس سے ایسا زبردست انتقام لیا، جسے قیامت تک لوگ یاد کریں گے۔مزید تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

فائدہ:

ہدایت اللہ تعالیٰ شانہ کی بہت بڑی نعمت ہے، جبکہ گمراہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کا عذاب ہے۔ان دونوں کی چابیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، البتہ جس بندے کو ان میں سے جس کسی کی طلب ہو اللہ تعالیٰ اسے وہی دے گا، اس کے علاوہ ہدایت اور ضلالت کے عالمِ اسباب میں بھی بہت سے چھوٹے بڑے اسباب ہیں، اکثر وبیشتر یہی اسباب ہدایت اور ضلالت کو پیدا کرتے رہتے ہیں، اور ذریعہ بنتے ہیں۔

بنی اسرائیل مصر میں بت پرستی اور گاؤ پرستی دیکھتے آئے تھے، اور ایک حد تک وہ اسی گاؤ پرستی سے متاثر بھی تھے۔جب دریا عبور کرکے ایک بت پرست اور گاؤ پرست قوم پر ان کا گزر ہوا تو انہیں مصریوں کا وہ ناپاک عقیدہ و مشغلہ یاد آیا، تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ شروع کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اگرچہ وقتی طور پر انہیں سمجھایا، اور قائل کردیا، مگر اندر اندر وہ اس مرض میں مبتلا رہے، اور گاؤ پرستی کا خیال ان کے باطن میں پیوست رہا، جوں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور تشریف لے گئے تو قوم

کے دلوں میں جولاوا پک رہا تھا وہ تقریباً تیار ہوا، تو قوم نے سامری کے کہنے اور ورغلانے پر بآسانی بصد شوق گاؤ پرستی شروع کی، جس کا واقعہ عنقریب آنے والا ہے۔ پوری تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

❀ ❀ ❀

وَوٰعَدۡنَا مُوۡسٰی ثَلٰثِیۡنَ لَیۡلَۃً وَّاَتۡمَمۡنٰهَا بِعَشۡرٍ فَتَمَّ مِیۡقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَةً ۚ وَ
قَالَ مُوۡسٰی لِاَخِیۡهِ هٰرُوۡنَ اخۡلُفۡنِیۡ فِیۡ قَوۡمِیۡ وَاَصۡلِحۡ وَلَا تَتَّبِعۡ سَبِیۡلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾

ترجمہ: ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، اور دس راتوں کے ذریعہ ان کی تکمیل کردی، اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ تم میرے بعد میری قوم میں میرے خلیفہ بن کر رہنا، اور اصلاح کرتے رہنا، اور مفسدین کی راہ کا اتباع نہ کرنا ﴿۱۴۲﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے وعدہ فرمایا تھا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ شانہ تمہارے دشمنوں کو ہلاک کردے گا، اور تمہیں ان کا جانشین اور وارث بنائے گا، اور اس وقت میں تم کو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب ہدایت مآب لاکر دوں گا، جو تمہارے لئے دستور العمل ہوگی، جس کے حکموں پر چل کر تم لوگ دونوں جہاں میں کامیاب رہوگے۔

چنانچہ فرعون کی ہلاکت کے بعد جب بنی اسرائیل آزاد ہوئے، تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس کتاب کی درخواست کی، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کتاب لینے کے لئے کوہِ طور تشریف لے گئے، اور انہیں تیس یوم کے روزہ رکھنے کا حکم ہوگیا، جس کے بعد انہیں ضرور کتاب عنایت ہوگی، لیکن تیس راتیں گزارنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مسواک کرلی، جس سے وہ خاص مہک جو روزہ دار کے منہ میں ہوتی ہے وہ جاتی رہی۔ یہ تیس راتیں ماہ ذوالقعدہ کی تھیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دس راتیں ماہ ذوالحجہ کی اس میں زیادتی فرماکر چالیس مکمل کرلی، تو پھر اللہ تعالیٰ نے توریت عطاء فرمائی۔

حجۃ الوداع کے اسی روز خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ مائدہ کی آیت: ﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا﴾ [المائدۃ:۳] (آج میں نے تمہارے

لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمہارے لیے بطورِ دین اسلام کو پسند کیا) نازل ہوئی۔ آسمانی ہدایات کی پہلی مستقل تشریعی کتاب توریت شریف کا نزول دسویں ذوالحجہ کو ہوا۔ اسی طرح آسمانی ہدایات کی آخری کتاب قرآن حکیم کی تکمیل بھی اسی روز ہوئی۔

توریت سے پہلے بہت سے صحیفے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل ہوئے، مگر مستقل کتاب صرف توریت ہے۔ اِدھر قرآن حکیم آخری کتاب ہے، جس کے بعد قیامت تک کوئی نبی اور کوئی کتاب نہیں ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر جانے کے لئے روانہ ہونے لگے، تو اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کی خبر گیری اور دیکھ بال کرنا، اور ان کی اصلاح کرتے رہنا، اور ان میں جو مفسد ہیں ان کی اتباع نہ کرنا، یعنی ان کی رائے پر مت چلنا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وزیر بھی تھے، اب ان کے خلیفہ بھی ہوئے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مدینہ منورہ پر اپنا خلیفہ بنا کر فرمایا: أَلَا تَرْضٰى أَنْ تَكُوْنَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى؟ إِلَّا أَنْ لَا نَبِيَّ بَعْدِي. [بخاري]

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی کجروی اور ان کی جہالت کو اچھی طرح جان چکے تھے، خاص کر چند دن پہلے جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمارے لئے کوئی معبود تجویز کرو، اس لئے انہوں نے قوم کی کجروی اور سوءِ مزاج کو دیکھتے ہوئے ان کو مزید تاکید فرمائی کہ مفسدین پر کڑی نظر رکھنا، اور کسی غلط کام کی ہرگز ہرگز کسی کو اجازت نہ دینا۔ چنانچہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطرہ لاحق تھا، پس نافرمان قوم کے ہاتھوں وہی کچھ ہوا جس کا خطرہ رہا۔ سامری نے گوسالہ بنا کر قوم کی اکثریت کو اس کی عبادت پر آمادہ کیا، اور ایک بے جان گوسالہ کے اردگرد انہیں خوب نچوایا، چند آیات بعد اس کا تذکرہ آنے والا ہے۔

……❁……❁……❁……

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کئے وقت پر آئے، اور ان کے ربّ نے ان سے کلام فرمایا تو انہوں

نے عرض کیا کہ: اے میرے ربّ! مجھے دکھا دیجئے کہ میں آپ کو دیکھ لوں، فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے، لیکن پہاڑ کی طرف دیکھو، سو اگر پہاڑ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم مجھے دیکھ سکو گے، پھر جب ان کے ربّ نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی، تو پہاڑ کو چورا کر دیا، اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب ان کو ہوش آیا تو کہنے لگے: آپ کی ذات پاک ہے، میں آپ کے حضور میں توبہ کرتا ہوں، اور میں ایمان لانے والوں میں پہلا شخص ہوں (یعنی میں پہلا شخص ہوں جو عقیدہ و ایمان رکھتا ہوں کہ آپ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا) ﴿۱۴۳﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیدارِ الٰہی کے لئے درخواست کرنا، اور پہاڑ کا چورا چورا ہونا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے کوہِ طور پر جانے کا جو وقت مقرر ہوا تھا، وہ اس کے مطابق وہاں پہنچے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ان راتوں کی ابتداء ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے تھی، پھر مزید دس راتیں ماہ ذی الحجہ کے شروع کی بڑھا دی گئیں، اور دس ذی الحجہ کو توریت شریف عطاء کی گئی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر پہنچے تو اللہ ربّ العزّت جلّ مجدہٗ سے ہم کلام ہوئے۔ یہ ربّ العزّت عزّ سلطانہ کے ساتھ ہم کلام ہونے کا دوسرا قیمتی موقع تھا، ہم کلامی کے ساتھ انہیں بیحد اشتیاق ہوا کہ اپنے ربّ عزّ مجدہٗ کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھوں، لہٰذا درخواست پیش کر دی کہ اے عزّت وقدرتوں کا مالک! مجھے اپنا دیدار کرا دیجئے۔

یہ سوال تَرَقّی مِنَ الْأَدْنٰی اِلَی الْأَعْلٰی کے لئے تھا، کیونکہ انہیں ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا، یہ مرتبہ و منقبت صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ [النساء: ۱۶۴] (اور موسیٰ سے اللہ براہِ راست ہم کلام ہوا) اسی لئے درخواست پیش کر دی کہ میں آپ کی ذات پر یقین بھی رکھتا ہوں، اور ہم کلامی کا شرف بھی پا چکا ہوں، بے پایاں لطف وکرم کا اُمیدوار بھی ہوں۔ اب یہ اشتیاق بھی رکھتا ہوں کہ دیدارِ جمال بھی کر لوں۔

اللہ تعالیٰ کو جنّت میں اہلِ جنّت دیکھیں گے، جن میں انبیاء کرام علیہم السلام ہوں گے، اور ان کی اُمتیں بھی ہوں گی، لیکن دنیا میں دنیاوی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ جنّت میں ایک نئی اور مخصوص قوت اور استعداد دی جائے گی۔ وہ دنیا دار الفناء والغرور میں نہیں دی گئی، اس لئے سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿لَا تُدْرِكُهُ

الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ [الأنعام:۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں، اور وہ تمام نگاہوں کو پالیتا ہے)۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن پانچ باتیں بیان کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، فرمایا:

(۱) بیشک اللہ تعالیٰ نہیں سوتے، اور اس کی شایان شان نہیں کہ وہ سوئے۔

(۲) وہ ترازو کو بلند کرتا ہے، اور پست کرتا ہے، یعنی اعمال کا وزن فرماتا ہے، جن کا وزن کمال اور نقص اخلاص کے اعتبار سے کم وبیش ہوتا ہے۔

(۳) اس کی طرف دن کے اعمال سے پہلے رات کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔

(۴) اور رات کے اعمال سے پہلے دن کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔

(۵) اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اس حجاب کو ہٹادے تو اس کی ذات عالی صفات کے انوار اس سب کو جلادے، جہاں تک مخلوق پر اس کی نظر پہنچتی ہے۔ یعنی ساری کائنات جل کر ختم ہوجائے۔ [مسلم]

مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے چھپنے چھپانے کے لئے مادی پردے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ایسا پردہ نہیں، اس کا پردہ عزت وعظمت اور جلال کا پردہ ہے، اگر اس کی ذات عالی کی تجلّی ہوجائے تو ساری مخلوق جل کر ختم ہوجائے۔ یہ بات عوام کے لئے متشابہات میں سے ہے، اہلِ علم میں صرف ایک خاص طبقہ اسے سمجھ سکتا ہے۔ وَاللهُ أَعْلَمُ بِصِفَاتِهِ وَأَنْوَارِ ذَاتِهِ وَعَظْمَةِ جَلَالِهِ وَكَمَالِهِ.

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کی درخواست کی تو اللہ عزّ شانہ نے فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، لیکن تم ایسا کرو کہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر پہاڑ اپنی جگہ ٹھہرا رہے تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ انہوں نے پہاڑ کی طرف دیکھا، جب پہاڑ پر اللہ تعالیٰ عزّ شانہ کی تجلّی ہوئی (جو اس کی شایان شان تھی) تو پہاڑ چورا چورا ہوگیا، اور موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہوکر گر پڑے۔ جب وہ ہوش میں آئے (بیہوشی میں کتنا وقت گزرا؟ وہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ تعالیٰ عزّ شانہ! تیری ذات پاک ہے، واقعی تو اس دنیا میں دیکھے جانے سے منزّہ اور برتر وبالا ہے، میں نے جو دیدار کی درخواست کی تھی اس سے توبہ کرتا ہوں، اور سب سے پہلے اس بات کا یقین کرنے والا ہوں کہ واقعی آپ کا دیدار نہیں ہوسکتا۔

سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ﴾

[الأنعام: ۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں، اور وہ تمام نگاہوں کو پالیتا ہے، اس کی ذات اتنی ہی لطیف ہے، اور وہ اتنا ہی باخبر ہے)۔ ربّ العزّت سبحانہ کی علوشان کا یہ حال ہے کہ نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں، اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے، وہ ذات پاک ہمارے ہر ادراک واحاطہ سے وراء الوراء ہے۔

بندوں کی آنکھوں میں یہ طاقت کہاں، اور حواس ظاہری اور باطنی میں یہ قوت کہاں کہ وہ اسے دیکھ سکیں، اور پاسکیں، اور ادراک کرسکیں۔ اور وہ سب آنکھوں، ارادوں، نیتوں پر احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور تمام کائنات پر اس کا علم احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ نہایت لطیف، باریک بین اور خبر والا ہے۔ انسان کیا اُسے مقرب درگاہ فرشتے آج تک نہ دیکھ سکے، اور اس کی ذات کا ادراک نہ کرسکے۔

جلیل القدر عظیم پیغمبر موسیٰ علیہ السلام شرفِ مکالمہ سے نوازے گئے، مگر رویت وزیارت تک نوبت نہیں آئی۔ کہنے لگے:

﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ﴾۔ جواب آیا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ وہ ان چیزوں کا بھی ادراک کرتا ہے جن کے ادراک سے تمام نگاہیں قاصر ہیں۔ باریک بین سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء کے اندرونی حالات اور کیفیات سے بخوبی واقف ہے، کوئی چیز خواہ کیسی ہی باریک اور دقیق کیوں نہ ہو وہ اس سے پوشیدہ نہیں۔

اس بیان سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ ﴿لَطِيْفُ﴾ کا تعلق ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ سے ہے، اور ﴿خَبِيْرُ﴾ کا تعلق ﴿وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ سے ہے۔ بلا تشبیہ اور بلا تمثیل کے ایسا سمجھو جیسے کہ روح ہے کہ نگاہیں اس کے ادراک سے بالکل قاصر ہیں، وہ کبھی نظر نہیں آتی، اور خود روح نگاہوں کا اور تمام تر چیزوں کا ادراک کرسکتی ہے۔

اس وجہ سے افعالِ انسانی کو روح کی طرف نسبت کیا جاتا ہے، کسی اور چیز کی طرف نسبت نہیں کی جاتی۔ اس سے کافروں کے اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے پوشیدہ کیوں ہے، اور وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟

جواب اس طرح ہو گیا کہ وہ معبودِ برحق لطیف وخبیر ہے، کمالِ لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتا، جیسے روح کمالِ لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی، اسی طرح وہ لطیف وخبیر بھی نظر نہیں آتا۔ اور اس عالم اجسام میں ہوا بھی ایک جسمِ لطیف ہے، اپنی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔

خلاصہ کلام یہ کہ معبودِ برحق وہ ہے کہ جو علیم وقدیر، لطیف وخبیر ہو، اور یہ صفت سوائے اللہ تعالیٰ جل شانہ کے کسی دوسرے کے لئے ثابت نہیں، پھر کیسے کوئی اس کا شریک اور سہیم ہوسکتا ہے؟

اس آیت ﴿لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں) سے معتزلہ، خوارج، شیعہ، مرجئہ اور اہلِ بدعت وغیرہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنّت میں حق تعالیٰ شانہ کا دیدار نہ ہوگا۔ معتزلہ نے اس آیت سے یہ سمجھا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کا دیدار ممکن نہیں ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا اعتقاد اور فیصلہ اس بارے میں یہ ہے کہ بہشت میں اللہ تعالیٰ شانہ کا دیدار جنتیوں کے لئے افضل ترین نعمت ہے، اور اگر سچ پوچھا جائے کہ اصل بہشت اس کے دیدار کی لذت و شرف ہی کا نام ہے۔ وہ بہشت ہی کیا ہو جس میں محبوبِ حقیقی کا دیدار نصیب نہ ہو۔ علاوہ ازیں بہشت میں دیدار معبود برحق، ورؤیت محبوب حقیقی آیاتِ قرآنیہ، اور احادیثِ متواترہ، اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے، جن کا انکار در پردہ شریعت مطہرہ کا انکار ہے۔

آیاتِ قرآنیہ:

(۱)...... ﴿وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ [القیامة] (اس دن بہت سے چہرے شاداب ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)۔

(۲)...... ﴿لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس: ۲۶] (جن لوگوں نے بہتر کام کیے ہیں، بہترین حالت انہی کے لیے ہے، اور اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی)۔

(۳)...... ﴿فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا﴾ [الکهف: ۱۱۰] (لہٰذا جس کسی کو اپنے مالک سے جا ملنے کی امید ہو اُسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے، اور اپنے مالک کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے)۔

(۴)...... ﴿وَاِذَا رَاَيۡتَ ثَمَّ رَاَيۡتَ نَعِيۡمًا وَّمُلۡكًا كَبِيۡرًا﴾ [الإنسان: ۲۰] (اور جب تم وہ جگہ دیکھو گے تو تمہیں نعمتوں کا ایک جہاں اور ایک بڑی سلطنت نظر آئے گی)۔

(۵)...... ﴿كَلَّاۤ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ﴾ [المطففین: ۱۵] (ہرگز نہیں! حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس دن اپنے پروردگار کے دیدار سے محروم ہوں گے)۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو عار دلائی ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے پروردگار سے محجوب ہوں گے، یعنی ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب اور پردہ ہوگا۔ اس سے صاف

معلوم ہوا کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کو بغیر حجاب کے دیکھیں گے، کیونکہ وہ بھی اگر کافروں کی طرح حجاب میں رہے، تو ان میں اور کافروں میں کوئی فرق نہیں رہا، اور محجوب ہونے میں کافروں کی تخصیص نہیں ہوئی۔

ان آیات کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں، جن سے رؤیتِ باری تعالیٰ پر صراحۃً، دلالۃً، اشارۃً، اقتضاءً اس مقصد پر واضح ثبوت موجود ہے۔

احادیث:

(۱)......حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں ان سے زائد کوئی اور نعمت چاہتے ہو کہ میں تمہیں عطاء کروں؟ تو وہ عرض کریں گے: کیا آپ نے ہمارے چہرے بارونق نہیں فرمائے؟ کیا آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں بخشی؟ اس سے زیادہ ہمیں کیا چاہئے؟ اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا، اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی، اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس: ۲۶] (وہ لوگ جنہوں نے نیک اعمال کئے ان کے لئے جنت ہے، اور اس سے زائد (اللہ تعالیٰ کی زیارت) ہے)۔ [مسلم، بدور سافرہ وغیرہ]

(۲)......حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چودہویں کے چاند کی طرف دیکھا، اور ارشاد فرمایا: سن لو، تم عنقریب (جنت میں) اپنے ربّ کی زیارت اسی طرح سے کروگے جیسے اس چودہویں کے چاند کو دیکھ رہے ہو، اور اس کے نظر آنے میں تم کوئی تکلیف اور دقت محسوس نہیں کرتے ہو، پس اگر تم ہمت کرو کہ تم نمازِ فجر اور نمازِ عصر کو نہ چھوٹنے دو تو اس کی پابندی کرو۔ [متفق علیہ]

(۳)......حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت والے کافور کے ٹیلوں پر بیٹھ کر ہر جمعہ اپنے ربّ جلّ شانہ کی زیارت کریں گے، ان میں سب سے زیادہ قریب (سے زیارت کرنے) والا وہ شخص ہوگا جو جمعہ کے دن جلدی (مسجد میں) جائے گا، اور صبح کو جلدی اٹھتا ہوگا۔ [ابن مبارک، البدور حادي الأرواح]

(۴)......حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب

سے کم درجہ کا جنتی وہ ہوگا جو اپنی جنتوں، بیویوں، نعمتوں، خدمتگاروں اور تختوں کو ایک ہزار سال کی مسافت تک دیکھتا ہوگا، اور ان میں سے زیادہ مرتبہ کا شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ شانہ کے چہرۂ اقدس کی صبح وشام زیارت کرے گا۔ پھر سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ [القيامة] (اس دن جنت میں بہت سے چہرے تروتازہ، ہشاش بشاش، چمکدار ہوں گے، اپنے ربّ جلّ شانہ کی طرف دیکھتے ہوں گے)۔ [ترمذي، حاكم، مسند أحمد، مجمع الزوائد، بدور السافرة]

(۵)...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جنت میں مؤمنین کی طرف مسکراتے ہوئے تجلّی فرمائیں گے۔ [ابن كثير، خطيب في التاريخ، اتحاف السادة المقين، مشكل الحديث وغيره]

اللہ تعالیٰ شانہ کے مسکرانے کے معنی علم عقائد کے مطابق یہ ہیں کہ ربّ العزّت سبحانہ اہل جنّت پر اپنے لطف، وکرم، وفضل، وعنایت، اظہار شرافت کا نزول فرمائیں گے۔ زہے سعادت!

اختصار کے ساتھ چند مختصر احادیث پر اکتفاء کیا، ورنہ اس سلسلے میں بڑی طویل احادیث اتنی بکثرت ہیں، جن کا احصاء باعثِ طوالت ہوگا۔ اگر کسی کو مزید احادیث کی ضرورت ہو تو علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی البدور السافرة، اور علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی حادي الأرواح، اور مولانا امداد اللہ انور کی ''جنّت کے حسین مناظر'' کا مطالعہ کیا جائے۔ حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تیس کے قریب راویوں کی روایات نقل کی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو ربّ العزّت سبحانہ کی زیارت نہیں ہوسکتی۔ حضرت عبادة بن صامت رضی اللہ عنہ جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا، پھر فرمایا: تم جان لو، تم اس وقت تک اپنے پروردگار کی زیارت نہیں کرسکتے جب تک کہ تم وفات نہ پاؤ۔ [مسند أحمد، البدور السافرة]

اور دار آخرت میں ربّ العزّت سبحانہ کی زیارت سے تمام جنتی محظوظ ہوں گے۔ اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں زیارت ہوئی، وہ بھی درحقیقت عالمِ آخرت ہی کی زیارت ہے، جیسا کہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہاں کا نام ہے، جو آسمانوں کے اندر محصور ہے، پس آسمانوں سے اوپر آخرت کا نام ہے، وہاں پہنچ کر جو زیارت ہوئی ہے اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جاسکتا۔

اب سوال یہ باقی ہے کہ آیت قرآنی: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] (نگاہیں اس کو نہیں

پاسکتیں) سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ سبحانہ کی زیارت ہو ہی نہیں سکتی، تو پھر بیان شدہ احادیث میں جنتیوں کے لئے جنّت میں زیارت کا کیا معنیٰ ہوگا؟

سو اس کا جواب واضح ہے کہ آیت کریمہ میں ادراک واحاطہ کی نفی ہے، اور وہ بھی دنیا میں، آخرت کی رؤیت کی نفی نہیں ہے، تب ہی تو صحیح احادیث نے بکثرت تواتر کے ساتھ آخرت کی زیارت کا اثبات فرمایا۔ لہٰذا مطلب واضح ہے کہ آیت نے جس ادراک واحاطہ کی نفی کی ہے، احادیث نے اس کا اثبات نہیں کیا، اور احادیث نے جس رؤیت کا اثبات کیا ہے، آیت کریمہ نے اس کی نفی نہیں فرمائی۔

مسئلہ بے غبار اور واضح ہے، البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آخرت کی زیارت میں احاطہ کی اسی طرح نفی ہوگی جس طرح عام اوقات میں، کیونکہ ربّ العزّت سبحانہ کی ذات وصفات غیر محدود ہیں، اور انسانی عقل وحواس ظاہری و باطنی سب محدود ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود ولا متناہی چیز کسی محدود اور متناہی چیز میں نہیں سما سکتی، اسی لئے تمام جہاں کے عقلاء، وفلاسفہ، اور مذہبی سطح پر صوفیاء کرام نے باری تعالیٰ کی ذات وصفات کی معرفت وکھوج لگانے میں پوری زندگیاں صرف کی ہیں، مگر ادراک کلّی بجائے خود، ایک جزوی نقطہ پر بھی نہیں پہنچ سکے ہیں، اور سب نے ہتھیار پھینک کر یہی کہا:

دور بینان بارگاہِ اَلَست ☆ غیر ازین پے نبردہ اند کہ ہست
چہ شب ہا نشستم دراین سیر گم ☆ کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم
اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ☆ واز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت بپایان رسید عمر ☆ ما ہمچنان در اوّل وصف تو ماندہ ایم

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر جہاں کے سارے انسان اور جنّات اور فرشتے اور شیاطین جب سے پیدا ہوئے، اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے، وہ سب کے سب مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں، تو سب مل کر بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کا اپنی نگاہوں میں احاطہ نہیں کر سکتے۔ [مظهري]

اور حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسہ ہے، جس سے صرف محسوس چیزوں کا علم ہو سکتا ہے، ربّ العزّت سبحانہ کی ذات پاک تو عقل، حواس، وہم اور خیال کے احاطہ سے بھی بالاتر ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ☆ بس جان گیا میں تیری پہنچان یہی ہے

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات اور ایجادات میں غور وفکر کرو، اور انہی چیزوں سے اس کی معرفت حاصل کیا کرو، اور پختہ یقین کرو، مگر اس کی ذات کے متعلق غور وفکر ہرگز نہ کرو۔ واللہ اعلم

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۴ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۴۵

ترجمہ: فرمایا: اے موسیٰ! بلاشبہ میں نے اپنی پیغمبری، اور اپنی ہم کلامی کے ساتھ لوگوں کے مقابلہ تمہیں چُن لیا، سو میں نے تمہیں جو کچھ دیا ہے، وہ لے لو، اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ ۝۱۴۴ اور ہم نے موسیٰ کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت، اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی، سو آپ قوت کے ساتھ اُسے پکڑیں، اور اپنی قوم کو حکم دیں کہ اس کے اچھے اچھے اعمال کو پکڑے رہیں، میں عنقریب تمہیں نافرمانوں کا گھر دکھادوں گا ۝۱۴۵

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشفقانہ خطاب ہو رہا ہے کہ اگر دیدار نہ ہو سکا تو نہ سہی، یہ شرف و امتیاز کیا تھوڑا ہے کہ ہم نے تجھے پیغمبر بنایا، اور تورات جیسی جامع اور بابرکت کتاب عطاء کی، اور بلا واسطہ کلام فرمایا، سو جس قدر بخشش ہماری طرف سے ہوئی، اس کی قدر کرو، اور خوب شکر گزار بندوں میں شامل ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس راتیں گزر جانے کے بعد توریت شریف عطاء ہوئی، جو کہ سات یا دس تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ یہ تختیاں یاقوت، زبرجد، موتی کی لکڑیوں کی تھیں، مختلف اقوال ہیں۔ اس میں احکامِ شرعیہ تفصیل سے لکھے ہوئے تھے، اور زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل درج تھے، نور و ہدایت کے تمام مواعظ حسنہ لکھے ہوئے تھے، اور حلال وحرام، طاعات وعبادات، پیشین گوئیاں اور مبدأ و معاد کے سارے مسائل درج تھے، کیوں نہیں، یہ ربّ العلمین عزّ سبحانہ کی ہدایت وبرکتوں کی کتاب تھی، جو کہ ایسے پیغمبر پر نازل ہوئی، جن کا مرتبہ وشرف جماعت انبیاء کرام علیہم السلام میں تیسرے نمبر پر ہے، اور ان کی اُمت تمام اُمتوں میں خاصی بڑی اُمتوں میں شمار ہے۔

الغرض یہ کتاب شریعتِ موسوی کا مکمل نظام اور دستور العمل کی جامع کتاب ہے، اسی کو فرمایا:
﴿وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ بہر حال دیدار نہ ہو سکنے سے جو شکستگی موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی اس کی تلافی اور جبرِ مافات کے طور پر الواح عطاء کی گئیں، اور تورات انہی تختیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

﴿فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ﴾ یعنی خود بھی ان الواح کو مضبوطی اور احتیاط سے پکڑے رہو، کہیں ہاتھ سے چھوٹ نہ جائیں، اور اپنی قوم کو سمجھاؤ کہ وہ ان الواح کی بہترین ہدایات پر پختگی سے عمل کرتے رہیں، اور یہ ساری ہدایات احسن اور پسندیدہ ہیں، ان کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

اَحْسَنِهَا کے یہی معنی ہیں کہ یہ سب چیزیں اَحسن اور بہتر ہیں۔

﴿سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ میں عنقریب تمہیں حکم نہ ماننے والے نافرمانوں کا گھر دکھادوں گا۔ نافرمانوں کے گھر سے مراد جہنم ہے، یا دنیا کی ذلت وخواری کا گھر ہے، جیسے کہ یَومُ السَّبت کی بے احترامی پر بنی اسرائیلیوں پر عذاب آیا، یا وہ زمانہ جب بنی اسرائیل نے مسلسل نافرمانی کی، تو ان پر بخت نصر مسلط ہوا، یا قبطیوں کے گھر، جنہوں نے نافرمانی کی، اور غرق ہوئے، ان کے گھر ویران ہوئے، یا عمالقہ قوم کی سرزمین، جس کو اللہ تعالیٰ نے یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں برباد فرمایا۔

سب سے بہتر پہلا معنی ہے، تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ توریت کے احکام پر عمل کرو، خلاف ورزی کی صورت میں جہنم کے عذاب میں مبتلا رہو گے۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ
لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ
الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

ترجمہ: میں عنقریب اپنی آیتوں سے ان لوگوں کو برگشتہ رکھوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، اور

اگر وہ ساری نشانیوں کو دیکھ لیں تو ان پر ایمان نہ لائیں، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں، اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں گے تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں گے، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور وہ ان سے غافل تھے ﴿۱۴۶﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو، اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا، ان کے اعمال اکارت ہوگئے، ان کو انہی اعمال کی سزا دی جائے گی جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۴۷﴾

معارف ومنازل

جب توریت شریف تختیوں میں لکھی ہوئی یکجا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مل گئی، تو اُن تختیوں کو لے کر اپنی قوم میں تشریف لے گئے۔ قوم کا مزاج عجیب تھا، وہ لوگ اتنے نافرمان سنگدل تھے کہ فرعونیوں سے بھی کسی معاملہ میں پیچھے یا کم نہ تھے۔ وہ چالیس سال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت میں رہے تھے، نو آیاتِ بینات کا صبح وشام مطالعہ کرتے رہے، پھر قلزم کا تاریخی معجزہ بھی دیکھا، فرعون اور اس کے پورے لشکر کی تباہی کا منظر بچشمِ خود مشاہدہ کرتے رہے، مگر ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ﴿اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا﴾ [الأعراف:۱۳۸] (ہمارے لیے معبود بنالیں) کا ناپاک نعرہ لگا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمیدوں پر پانی پھیر کر اہل مصر کے سلوک سے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کے دل ودماغ پر جو زخم آئے تھے، ان پر نمک پاشی کر کے اس جلیل القدر عظیم پیغمبر کو اتنا پریشان وغمگین بنایا کہ وہ توریت شریف کی خوشیوں اور لذتوں کو فراموش کر بیٹھے۔

جب تختیوں کے ساتھ قوم کے پاس تشریف لائے، تو قوم کو ایک گوسالہ کے اردگرد ناچتے اور طواف کرتے ہوئے دیکھ کر اتنے غمگین ہوئے کہ اگر نبوت اور ہم کلامی کا سہارا نہ ہوتا تو شاید دماغی توازن (معاذ اللہ) کھو بیٹھتے۔ یہ لوگ اطاعت وفرمانبرداری سے ہزاروں میل دور تھے، انہوں نے توریت شریف کا نہ شکر ادا کیا، اور نہ ہی کوہِ طور سے واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استقبال کیا، پوری تفصیل اور ان کی نافرمانیوں کے خدوخال کا بیان سورۂ بقرہ کے فوائد میں گزر چکا ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں اسی گمراہی اور ان کی لاپرواہی پر انہیں تنبیہ اور سرزنش کی جارہی ہے، اور انہیں حبطِ اعمال اور آخرت کی تباہی پر خبردار کیا جارہا ہے کہ تم جیسا کرو گے ویسا ہی بھرو گے، وغیرہ۔

تکبر وغرور، اور ہدایت کبھی جمع نہیں ہوسکتے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ﴾ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو

بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ ان کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے، اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لئے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، اور ان سے بے پرواہی کرتے رہے۔ ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا، اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا، اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور سزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں؟

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ ایسے لوگ کسی عبرت ناک چیز سے عبرت اور کسی سبق آموز چیز سے سبق حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ ایسے غرور و تکبر میں پھنسے ہوئے ہیں کہ ان کے دماغ ناکارہ اور ماؤف ہیں۔

"بڑا بننا، یا تکبر کرنا" قرآن مجید اس معنی میں استعمال کرتا ہے کہ بندہ اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی کچھ پرواہ نہ کرے، اور ایسا طرزِ عمل اختیار کرے کہ گویا وہ نہ خدا کا بندہ ہے، اور نہ خدا اس کا ربّ ہے۔ اس خودسری کی کوئی حقیقت ایک غلط پندار، اور بے بنیاد گمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے، کیونکہ خدا کی زمین میں رہتے ہوئے، اور خدائی نعمتوں سے مستفید ہوتے ہوئے، ایک بندے کو کسی طرح یہ حق پہنچتا ہی نہیں کہ غیر بندہ بن کر رہے، اور خدا کی بندگی سے دامن بچائے، اسی لئے فرمایا کہ:

"وہ بغیر کسی حق کے اللہ تعالیٰ کی زمین میں بڑے بنتے ہیں، اور فرعون کی طرح اپنے انجام سے بے خبر رہتے ہیں"۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ﴾ یعنی ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا، اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا، اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ یعنی بارآور نہ ہوئے، غیر مفید اور لاحاصل نکلے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسانی جدوجہد اور سعی و عمل کے بارآور ہونے کا بالکل انحصار دو اُمور پر ہے: ایک یہ کہ وہ سعی و عمل اللہ تعالیٰ کے قانونِ شرعی کی پابندی میں ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سعی و عمل میں دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابی پیش نظر ہو۔ یہ دو شرطیں جہاں پوری نہ ہوں گی وہاں لازماً حبطِ عمل واقع ہوگا۔

جس نے اللہ تعالیٰ سے ہدایت لئے بغیر، بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پر دنیا میں کام کیا، ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کسی اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حقدار نہیں ہو سکتا، اور جس نے سب کچھ دنیا ہی کے لئے کیا، اور

آخرت کے لئے کچھ نہ کیا تو کھلی بات ہے کہ آخرت میں اُسے کوئی ثمرہ پانے کی اُمید نہیں رکھنی چاہئے، اور کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ فرمایا:

اگر میری مملوکہ زمین میں کوئی شخص میری منشاء کے خلاف تصرّف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حقدار ہوسکتا ہے؟ اور اگر اس زمین پر اپنے غاصبانہ قبضہ کے زمانہ میں اس نے سارا کام خود ہی اس ارادہ کے ساتھ کیا ہو کہ آج تک اصل مالک اس کی بے جا جرأت سے چشم پوشی کررہا ہے، اسی وقت تک وہ اس سے فائدہ اٹھائے گا، اور مالک کے قبضہ میں زمین واپس چلے جانے کے بعد وہ خود بھی کسی فائدے کا متوقع یا طالب نہیں ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ میں اس غاصب سے اپنی زمین واپس لینے کے بعد زمین کی پیداوار میں سے کوئی حصہ خواہ مخواہ اُسے دوں؟

خلاصہ:

ان دونوں آیات کے سیاق وسباق کو دیکھ کر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کا مفہوم اور حکم ومطلب قیامت تک آنے والی پوری انسانیت کے لئے ہے۔ قرآنی آیات میں خصوصی سبب اور شانِ نزول کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ عمومِ کلمات کا ہی لحاظ ہوتا ہے، جس سے عمومی معانی ومطالب مراد لئے جاتے ہیں۔ حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مقام پر عموم کے قائل ہیں، اور دوسرے بہت سے مفسرین حضرات بھی عموم کا قول کرچکے ہیں، اور یہی راجح ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوۡمُ مُوۡسٰی مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ حُلِيِّهِمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّهٗ
لَا يُكَلِّمُهُمۡ وَلَا يَهۡدِيۡهِمۡ سَبِيۡلًا ۘ اِتَّخَذُوۡهُ وَكَانُوۡا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِیۡۤ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ
رَاَوۡا اَنَّهُمۡ قَدۡ ضَلُّوۡا ۙ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ يَرۡحَمۡنَا رَبُّنَا وَيَغۡفِرۡ لَنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾

ترجمہ: اور موسیٰ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کو معبود بنالیا، جو ایک ایسا جسم تھا کہ اس میں سے گائے کہ آواز آرہی تھی، کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا، اور نہ انہیں کوئی راستہ بتلاتا ہے؟ انہوں نے اس کو معبود بنالیا، اور وہ ظلم کرنے والے تھے﴿۱۴۸﴾ اور جب وہ پچھتائے، اور انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ

بلاشبہ گمراہ ہو گئے، تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا ربّ ہم پر رحم نہ فرمائے، اور ہمیں بخشش نہ دے، تو ہم تباہ کاروں میں سے ہوجائیں گے ﴿۱۴۹﴾

معارف ومنازل

بنی اسرائیل کے قلوب میں جوشرک چھپاہواتھاوہ کھل گیا:

بنی اسرائیل مصر میں بت پرستی اور گاؤ پرستی دیکھتے آئے تھے، اسی لئے جب سمندر عبور کر کے مصر کے علاوہ عمالقہ یا قبیلہ لخم کے علاقہ میں آئے، اور یہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ گاؤ پرستی میں دھرنا دے کر بیٹھے ہوئے ہیں، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمارے لئے بھی اسی طرح کا معبود بنا دیجئے، جو مجسم ہو، اور شکل وصورت ہمارے سامنے ہو۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے لئے کوہِ طور تشریف لے گئے تو ان کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے قلوب کا ارمان پورا کرتے ہوئے گوسالہ پرستی شروع کر دی، اور اپنے دلوں میں چھپے ہوئے شرک کا کھل کر اظہار واعلان کیا۔

گوسالہ کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کسی مذہبی اجتماعی تقریب کے بہانے پر مصر سے نکلنے والے تھے، اس وقت اصل حقیقت پر پردہ ڈالتے ہوئے ان کی عورتوں نے مصری (قبطی) عورتوں سے اس مذہبی تقریب میں جانے کی خاطر بہت سے زنانہ زیورات عاریۃً لیے تھے، یہ زیورات ابھی ان کے پاس تھے۔ بنی اسرائیل میں سامرہ خاندان کا ایک شخص سامری نامی موجود تھا، جو کہ منافق تھا، یہ شخص سنار کا کام کرتا تھا، اس منافق نے ان زیورات کو جمع کر کے پگھلایا، اور ان سے بچھڑے کی شکل بنالی، جو کہ اسرائیلیوں کا پسندیدہ محبوب، اور معبود ہوتا تھا، جس کا چند روز پہلے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ بھی کیا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اگر چہ ان کی جہالت پر انہیں تنبیہ کی تھی، مگر لوگ اندر اندر سے گوسالہ کی محبت میں بے قرار تھے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ﴿وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ [البقرۃ:۹۳] (ان کے دلوں میں بچھڑا بسا ہوا تھا)۔ اسی نکتہ کی بناء پر منافق سامری نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس جرمِ عظیم کا کھلم کھلا ارتکاب کر کے پوری قوم کو (اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ) گوسالہ پرستی پر آمادہ کر کے یہاں تک کہا کہ: ﴿هٰذَا اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى﴾ [طٰہٰ:۸۸] (یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا معبود)۔

سامری نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی دریائے قلزم سے پار ہوتے وقت کسی طرح شناخت کی تھی، اور ان کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر اسی طرح کے مقصد کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھی تھی۔

جب اس نے زیورات کو پگھلا کر ان سے بچھڑا بنالیا، تو اس کے پیٹ میں یہی مٹی ڈال دی، اسی طرح اس کے منہ میں بھی اسی مٹی کی چٹکی ڈال کر لوگوں کے سامنے میدان میں ایک کرسی پر رکھا۔ اس مٹی کے اثر سے وہ بچھڑا گائے کے بچے کی طرح متواتر آواز کرنے لگا۔

یہ لوگ پہلے سے مشرک مزاج تھے، اور گوسالہ پرستی سے بڑے مانوس تو تھے ہی، کہنے لگے: ﴿هٰذَآ اِلٰهُكُمۡ وَاِلٰهُ مُوۡسٰى فَنَسِیَ﴾ [طٰہٰ: ۸۸] یعنی یہ تمہارا معبود ہے، اور موسیٰ (علیہ السلام) کا بھی معبود ہے، سو وہ بھول گئے جو کوہِ طور پر معبود سے ہم کلام ہونے کے لئے گئے ہیں (معاذ اللہ) وہ اِلٰہ یہ ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اور جانشین تھے، انہوں نے ہر چند لوگوں کو سمجھایا، اور منع کیا، مگر وہ کہاں سنتے تھے؟

حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا کہ تم فتنہ میں پڑ چکے ہو، تمہارا ربّ رحمٰن جلّ شانہ ہے، تم میرا اتباع کرو، میرا حکم مانو۔ اس پر بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم برابر اس بچھڑے کے آگے پیچھے لگے رہیں گے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں۔ پوری تفصیل سورۂ طٰہٰ میں دیکھی جائے۔

﴿سُقِطَ فِیۡۤ اَیۡدِیۡهِمۡ﴾ کے معنی عربی محاورہ کے موافق نادم وشرمندہ ہونے کے ہیں۔ باقی ان کی توبہ اور استغفار اس کا ایک خاص طریقہ مقرر ہوا، یعنی: ﴿فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ [البقرۃ: ۵۴] (اپنے آپ کو قتل کرو) جس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھی جائے۔

....

وَلَمَّا رَجَعَ مُوۡسٰۤى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئۡسَمَا خَلَفۡتُمُوۡنِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ۚ اَعَجِلۡتُمۡ اَمۡرَ رَبِّكُمۡ ۚ وَاَلۡقَى الۡاَلۡوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاۡسِ اَخِیۡهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیۡهِ ؕ قَالَ ابۡنَ اُمَّ اِنَّ الۡقَوۡمَ اسۡتَضۡعَفُوۡنِیۡ وَكَادُوۡا یَقۡتُلُوۡنَنِیۡ ۖ فَلَا تُشۡمِتۡ بِیَ الۡاَعۡدَآءَ وَلَا تَجۡعَلۡنِیۡ مَعَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ۝۱۵۰ قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِاَخِیۡ وَاَدۡخِلۡنَا فِیۡ رَحۡمَتِكَ ۖ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ ۝۱۵۱

ترجمہ: اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف اس حال میں واپس ہوئے کہ وہ غصہ میں تھے، اور رنج میں تھے تو

انہوں نے کہا تھا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بُری نیابت کی، کیا اپنے ربّ کا حکم آنے سے پہلے تم نے جلدی کر لی؟ اور موسیٰ نے تختیوں کو ڈال دیا، اور بھائی کے سر کو پکڑ لیا، جسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے، انہوں نے کہا کہ اے میرے ماں جائے! بلا شبہ قوم نے مجھے کمزور سمجھا، اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں، لہٰذا مجھ پر دشمنوں کو مت ہنسواؤ، اور مجھے ظالموں میں شمار نہ کرو﴿۱۵۰﴾ موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے ربّ! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے، اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، اور آپ ارحم الرّاحمین ہیں﴿۱۵۱﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مطلع فرمایا تھا کہ تمہاری قوم تمہارے بعد گمراہی اور شرک میں مبتلا ہوگئی ہے، اور سامری نے ان کو گمراہ کیا ہوا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام توریت شریف کی تختیاں لے کر تشریف لائے، اور گوسالہ پرستی کا منظر دیکھا، تو بہت سخت غضبناک اور رنجیدہ ہوئے، فرمایا: ''اور جب آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصّے میں اور غمزدہ''۔

اگر اَسِفًا کو غَضْبَانَ کی صفت بنایا جائے، تو معنی ہوا شدید غصّے میں، اور سخت غمزدہ، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شدید غصہ دینِ الٰہی اور حق تعالیٰ شانہ کی خاطر تھا، اور یہ معیوب نہیں، کیونکہ اپنے نفس اور اپنے حقوق کی خاطر نہایت سخت غضبناک ہونا اگرچہ معیوب ہے، اور یہ ایک الگ بات ہے، مگر حقوق اللہ اور احکام شریعت کی بے احترامی اور پامالی پر غضب وغصہ منصبِ نبوّت کے ہرگز خلاف نہیں، بلکہ عین صواب اور پسندیدہ ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حقوقِ شرع کے خلاف اگر کوئی عمل ہو تو اس پر غضبناک ہونا بالکل جائز اور مباح ہے۔ [بخاري كتاب العلم]

﴿قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ﴾ فرمایا: ''میرے بعد تم نے میری نیابت بہت بُرے طریقے سے انجام دی''۔ ﴿اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ﴾ کیا اللہ تعالیٰ کے عذاب کو تم لوگ جلدی بلا لینا چاہتے تھے؟ اور اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی سے ہٹا کر مجھے جلدی بلانا چاہتے تھے؟ [ابن کثیر]

﴿وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توحیدِ باری تعالیٰ کے خلاف شرک کا منظر دیکھ کر غیرتِ دینی کے جوش میں توریت شریف کی تختیاں ایک طرف ڈال کر (رکھ کر) اپنے نائب حضرت

ہارون علیہ السلام کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچے، ان کو یہ گمان ہوا کہ میرے بھائی نے تبلیغی امور میں کوتاہی سے کام لیا ہے، اور قوم کی سختی کے ساتھ رہبری نہیں فرمائی ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی پکڑنے کا بھی ذکر ہے۔ یہ سب کچھ دینی غیرت اور شدتِ غضب کی وجہ سے پیش آیا۔ حضرت ہارون علیہ السلام سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی طرح جلالی نہیں تھے، ان کی طبیعت میں نہایت حلم و بردباری کا غلبہ تھا، انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں فرمایا کہ اے میرے ماں جائے! (میری ماں کے بیٹے!) آپ میرے سر اور داڑھی کے بالوں کو نہ پکڑیں، دراصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے مجھے کمزور سمجھا، اور میرے قتل کے منصوبے بنائے، قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں، میں اکیلا کچھ کرنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا، تبلیغ کے سلسلے میں میں نے کوئی سستی اور کمزوری نہیں دکھائی۔

گوسالہ پرستی کا یہ عالم تھا، جس طرح قرآن کریم نے واضح کیا: ﴿وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ﴾ [البقرة: ۹۳] (کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑا ایسا ہوا تھا) گوسالہ پرستی ان کے رگ و ریشہ اور دلوں میں پیوست ہو چکی تھی، لہٰذا آپ مجھے معذور سمجھ کر مجھ پر گرفت نہ کریں، اور مجھ پر سختی کر کے دشمنوں کو ہنسنے اور خوشی کا موقع نہ دیں، اور مجھے ظالموں کا حامی تصور نہ کریں، میں ان کے ساتھ نہیں ہوں، لہٰذا مجھے ظالموں میں شمار نہ کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ واقعی مجھ سے خطاء ہوئی، اور جوشِ غضب میں بھائی کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا، جو بہتر نہیں، لہٰذا بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ اے میرے ربّ! میری مغفرت فرما، اور میرے بھائی کی بھی (درجات بلند فرمائیں) اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرمادے، اور آپ اُرحم الرّاحمین ہیں۔

فائدہ:

﴿أَلْقَى الْأَلْوَاحَ﴾ کے معنی یہ نہیں کہ انہوں نے توریت شریف کی تختیوں کو پھینک دیا، بلکہ ''أَلْقَى'' کے معنی رکھنے کے ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ اپنے مشتقات کے ساتھ سو (۱۰۰) کے قریب مقامات میں مذکور ہے، مثلاً سورۂ یوسف میں ارشاد ہے: ﴿اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا﴾ [یوسف: ۹۳] (میری یہ قمیص لے جاؤ، اور اسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دینا، اس سے ان کی بینائی واپس آجائے گی)۔ اسی طرح: ﴿وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي﴾ [طٰہٰ: ۳۹] (اور میں نے اپنی طرف سے تم پر ایک محبوبیت نازل کر دی تھی)۔ اسی طرح: ﴿أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ [ق: ۳۷] (یا جو حاضر دماغ بن کر کان دھرے)۔ فرمایا: ﴿وَأَلْقَىٰ فِي

الْاَرْضِ رَوَاسِیَ﴾[النحل:۱۵] (اوراس نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیئے)۔ یہ سب رکھنے کے معنی میں مستعمل ہیں، لہٰذا یہ اعتراض لغو ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تختیوں کو کیوں پھینکا؟ یہ اعتراض سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَ اٰمَنُوْۤا ؗ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖۚ وَفِیْ نُسْخَتِهَا هُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ یَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

ترجمہ: بلاشبہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا، انہیں ان کے ربّ کی طرف سے ضرور غصہ پہنچے گا، اور ذلّت پہنچے گی، دنیا والی زندگی میں، اور اسی طرح ہم افتراء کرنے والوں کو سزا دیا کرتے ہیں ﴿۱۵۲﴾ اور جن لوگوں نے گناہ کئے، پھر ان کے بعد توبہ کرلی، اور ایمان لے آئے، تو بلا شبہ آپ کا ربّ اس توبہ کے بعد ضرور بخش دینے والا ہے، مہربان ہے ﴿۱۵۳﴾ اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا، تو انہوں نے ان تختیوں کو اٹھالیا، اور ان تختیوں میں جو لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت تھی، اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں ﴿۱۵۴﴾

معارف و منازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے انجامِ بد کے بارے میں ارشاد فرمایا جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی کہ انہیں عنقریب دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ کے غضب وغصے سے واسطہ پڑے گا، اور دنیا والی زندگی میں ذلّت پہنچے گی، اس غضب اور ذلّت کے بارے میں مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کے بہت سے اقوال ہیں۔ حضرت ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غضب سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ہے جس میں قبولیتِ توبہ کے لئے ان لوگوں کے قتل کرنے کا حکم ہوا، اور ذلّت سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ اقرار کرلینا کہ واقعی ہم نے گمراہی کا کام کیا، اور پھر اپنی جانوں کو قتل کے لئے پیش کرنا۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ذلّت سے مراد وہ حالت اور کیفیت ہے جو ان لوگوں کو اس وقت پیش آئی جبکہ اس

بچھڑے کو جلایا گیا، اور سمندر میں پھینک دیا گیا (اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں ہے) جس کی انہوں نے عبادت کی تھی۔
اور ایک قول یہ ہے کہ ذلّت سے وہ بھوک و مسکنت مراد ہے، جو انہیں اور ان کی اولاد کو دنیا میں پیش آتی رہی، جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی اس آیت میں گزرا ہے: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ﴾ [البقرة: ۶۱] (اور ان (یہودیوں) پر ذلّت اور بیکسی کا ٹھپہ لگا دیا گیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے) اور چالیس سال تک میدانِ تیہ میں دربدر گھومتے پھرے۔
حضرت عطیہ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جو یہودی تھے آیت کریمہ میں انہی کا ذکر ہے، جیسے کہ بنونضیر، بنوقریظہ، بنوقینقاع، اور خیبر کے یہود، سارے ذلیل وخوار ہوئے، اور جلاوطنی وقتل کے شکنجہ میں پھنستے رہے، اور ان پر جزیہ بھی مقرر رہا۔ عہدِ رسالت کے یہود چونکہ اپنے آباء واجداد کے اعمال پر راضی ہیں، اور ان کی گمراہیوں کی کبھی مذمت نہیں کی، اس لئے اپنے اسلاف کی ذلّت وخواری کے مستحق ٹھہرے۔
﴿وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ﴾ اور ہم اسی طرح اِفتراء کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ افتراء کرنے والے کون ہیں؟
اسلام دینِ الٰہی کے سوا سارے ادیان اور ان کے ماننے والے، خواہ یہود ہوں، یا نصاریٰ، یا مشرکینِ عرب، یا صابی ومجوس، یا ہندو ہنود، یا بدھ مت وغیرہ، آیت کریمہ کے عموم میں سب شامل ہیں، اور ان کے لئے سوائے غضبِ الٰہی اور ذلّت وخواری کے اور کچھ نہیں، کیونکہ اِفتراء علی اللہ کے معاملہ میں یہ سارے سامری جیسے مُفتری کے ساتھی اور ہمنوا ہیں، اور یہ الگ بات ہے کہ کچھ مجرموں کو دنیا وآخرت دونوں میں سزا ملتی ہے، اور کچھ کی سزا برزخ اور آخرت کے لئے ہوتی ہے، جبکہ دنیا میں استدراج کے طور پر وہ خوشحال اور آباد نظر آتے ہیں، انجامِ کار ان کا بھی سخت مؤاخذہ یقینی اور پختہ ہے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ سامری سے الگ تھلگ رہیں، اور سامری کو حکم دیا تھا کہ خبردار! کسی شخص سے تعلق اور اختلاط نہ رکھے، نہ تم کسی کو ہاتھ لگا سکتے ہو، اور نہ کوئی تجھے ہاتھ لگائے۔ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: ﴿قَالَ فَاذْهَبْ اِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ...﴾ [طٰہٰ: ۹۷] (موسیٰ نے کہا: جاؤ، زندگی بھر تیرا کام یہ ہوگا کہ تو لوگوں سے یہ کہا کرے گا کہ مجھے نہ چھونا)۔ اگر کوئی آخر سورۃ طٰہٰ تک کا مطالعہ کرے تو اسے قدرت کے عجائبات نظر آئیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

تفسیر قرطبی میں بروایتِ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس ملعون سامری پر یہ عذاب مسلّط فرمایا تھا کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے، یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا۔ [قرطبي]

اور یہ منقول ہے کہ وہ آبادی میں لوگوں کے درمیان نہیں ٹھہر سکتا تھا، سخت خارش کے مرض میں مبتلا ہو کر جنگل میں بھاگ گیا، اور کتے کی طرح آوازیں لگاتا رہا، اور اسی میں مر کر جہنم پہنچا۔ حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ دینِ الٰہی میں بدعت نکالتے ہیں وہ بھی اِفترا علی اللہ کے جرم میں شامل رہتے ہیں، اور دونوں جہان میں ذلیل ہوتے ہیں۔ [مظهري]

﴿وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا﴾ جن لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد اپنے اس جرم سے توبہ کرلی، اور توبہ کے لئے جو سخت شرط اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوئی تھی کہ یہ سب لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں، تو تب ان کی توبہ قبول ہوگی، پھر موسیٰ علیہ السلام نے انہیں جمع فرما کر اس قتل پر آمادہ کیا، چنانچہ انہوں نے اس پر عمل شروع کیا، فضاء میں اندھیرا سیاہ بادل چھا گیا، لوگوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ بغیر کسی شناخت کے ایک دوسرے کو تلواروں اور خنجروں سے قتل کرنا شروع کیا، میدان لاشوں سے بھر گیا، دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہا، تقریباً ستر ہزار کے قریب لوگ مارے گئے، تب اللہ شانہ کے حکم کے ساتھ یہ سلسلہ موقوف ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی کا نزول ہوا کہ مرے ہوئے سارے مقتولین شہادت پاچکے، اور جو زندہ بچے ان کی مغفرت ہوگئی، اور ان کا ایمان اور توبہ قبول ہوئے۔

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ [الحشر: ۲] (اے عقلمندو! عبرت سیکھو) اور اپنے پیغمبر خیر الخلائق صلی اللہ علیہ وسلم پر اربوں کھربوں درود پڑھا کرو، جن کی شفاعت نے تمہارے لئے توبہ کو نہایت آسان کیا۔

﴿وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ﴾ جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوگیا، یعنی جاتا رہا تو رکھی ہوئی تختیوں کی طرف متوجہ ہوئے، اور ان کو اٹھالیا تاکہ تبلیغ وہدایت کا کام شروع ہو جائے۔ اس بابرکت کتاب توریت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور رحمت کے بے شمار کرشمے موجزن تھے، ایسے لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں دیکھیں۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

ترجمہ: اور موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر (۷۰) مرد ہمارے وقت معین کے لئے چن لئے، پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑلیا، تو موسیٰ نے کہا: اے میرے ربّ! اگر آپ چاہتے تو اس سے پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک فرمادیتے، کیا آپ ہمارے چند بے وقوفوں کی حرکت کے سبب ہمیں ہلاک فرماتے ہیں؟ یہ محض آپ کی طرف سے آزمائش ہے، آپ اس کے ذریعہ جس کو چاہیں گمراہی میں ڈالیں، اور جس کو چاہیں ہدایت پر رکھیں، تو ہی ہمارا ولی ہے، لہٰذا ہماری مغفرت فرما، اور بخش دینے والوں میں تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے ﴿۱۵۵﴾ اور لکھ دیجئے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی، اور آخرت میں بھی، بیشک ہم نے تیری طرف رجوع کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عذاب ہے، میں اس کو پہنچاتا ہوں جیسے چاہوں، اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے، سو میں اس کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور ان لوگوں کے لئے جو ہماری آیات پر یقین رکھتے ہیں ﴿۱۵۶﴾

معارف ومنازل

اس واقعہ کا تفصیلی حصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے، یہاں دوبارہ اس کا تذکرہ یاددہانی کی خاطر ہورہا ہے۔

بنی اسرائیل کے ستر نمائندوں کا انتخاب، اوران کی ہلاکت:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب تورات شریف لاکر اپنی قوم بنی اسرائیل کے سامنے پیش کیا، تو نافرمان، حیلہ باز، مکار قوم نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور کہنے لگے کہ ہمیں یہ کیسے یقین آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی کتاب ہے؟ ممکن ہے کہ آپ اپنی طرف سے لکھ کرلائے ہوں، تو ان کو اطمینان دلانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعاء کی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ اس قوم کے منتخب ستر آدمیوں کو آپ کوہِ طور پر لائیں، تو ہم ان کو بھی اپنا کلام سنائیں گے، جس سے ان کو یقین آجائے۔

موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا، اور ان کو کوہِ طور پر لے گئے، حسب وعدہ انہوں نے اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سن لیا، مگر جب یہ حجت بھی پوری ہوگئی، تو کہنے لگے: ہمیں کیا معلوم کہ یہ آواز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، یا کسی اور کی ہے۔ ہم تو جب یقین کریں گے جب کھلم کھلا خود اللہ تعالیٰ کو دیکھ لیں، ﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [البقرۃ:۵۵] (ہم اس وقت تک ہرگز تمہارا یقین نہیں کریں گے جب تک اللہ کو ہم خود کھلی آنکھوں نہ دیکھ لیں)۔

ان کا یہ سوال چونکہ ہٹ دھرمی اور جہالت پر مبنی تھا، اس لئے ان پر غضبِ الٰہی متوجہ ہوا، ان کے نیچے سے زلزلہ آیا، اور اوپر سے بجلی کی کڑک آئی، جس سے یہ سارے بیہوش ہوکر گر گئے، اور بظاہر مردہ ہوگئے۔ سورۂ بقرہ میں الصّٰعِقَةُ کا لفظ آیا ہے، اور یہاں رَجْفَة کا لفظ ہے۔ الصّٰعِقَة بجلی کی کڑک، اور رَجْفَة زلزلہ کے معنی میں ہے۔ دراصل یہ دونوں جمع ہوگئے تھے۔

بہرحال! بظاہر لگتا تھا کہ یہ لوگ مرگئے، خواہ حقیقتاً مرگئے یا صرف بیہوش ہوگئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا، اوّل تو اس لئے کہ یہ لوگ اپنی قوم کے نامور منتخب لوگ تھے، دوسرے اس لئے کہ اب اپنی قوم میں جاکر کیا جواب دیں گے؟ وہ ضرور یہ تہمت لگائیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے نمائندوں کو کہیں لے جاکر قتل کروادیا ہے۔ اور اس تہمت کے بعد ظاہر ہے کہ یہ لوگ مجھے بھی قتل کرڈالیں گے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ شانہ سے نہایت عجز و نیاز کے ساتھ دعا کی کہ اے میرے پروردگار! میں جانتا ہوں کہ اس واقعہ سے آپ کا مقصود ان کو ہلاک کرنا نہیں، کیونکہ اگر یہ مقصود ہوتا تو اب سے پہلے بہت سے واقعات تھے جن میں یہ ہلاک کیے جاسکتے تھے۔

فرعون کے ساتھ غرق کیے جاتے، یا گوسالہ پرستی کے وقت سب کی موجودگی میں ہلاک کردیئے جاتے، اور آپ چاہتے تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہلاک کردیتے، مگر آپ نے یہ نہیں چاہا، تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی ان کو ہلاک کرنا مقصود نہیں، بلکہ سزا دینا اور تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ ہم سب کو چند بیوقوفوں کے عمل کی وجہ سے ہلاک کردیں؟

اس جگہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا اس لیے ذکر کیا کہ ان ستر آدمیوں کی اس طرح غائبانہ ہلاکت کا نتیجہ یہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ہاتھوں ہلاک کیے جائیں۔ پھر عرض کیا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ محض آپ کا امتحان ہے، جس کے ذریعہ آپ بعض لوگوں کو گمراہ کردیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شکایت اور ناشکری کرنے لگیں، اور بعض کو ہدایت پر قائم

رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ کر اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ میں بھی آپ کے فضل سے آپ کے حکیم ہونے کا علم ویقین رکھتا ہوں، لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں، اور آپ ہی تو ہماری خبر گیری کرنے والے ہیں، ہم پر مغفرت اور رحمتِ خاصہ فرمائے، اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ معافی دینے والے ہیں، اس لئے ان نادانوں کی گستاخی کو بھی معاف فرمایئے۔ چنانچہ وہ لوگ سب صحیح وسالم اٹھ کھڑے ہوئے، جیسے ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا كُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [البقرة:۵۶] (پھر ہم نے تمہیں تمہارے مرنے کے بعد دوسری زندگی دی تاکہ تم شکر گزار بنو)۔

اور بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ یہ ستر آدمی جن کا ذکر اس آیت میں ہے یہ وہ لوگ نہیں جنہوں نے ﴿اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ [النساء:۱۵۳] (ہمیں کھلی آنکھوں اللہ دکھاؤ) کی درخواست کی تھی، اور صٰعِقَة کے ذریعہ ہلاک کئے گئے تھے، بلکہ یہ وہ لوگ تھے جو خود تو گوسالہ پرستی میں شریک نہ تھے، مگر قوم کو اس بیہودہ عمل سے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی، اس کی سزا میں ان پر زلزلہ آیا، اور بیہوش ہو گئے۔ واللہ اعلم

﴿وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ اور ہمارے لئے اس دنیا میں نیک حالت پر ہونا لکھ دیجئے، اور آخرت میں بھی، بلاشبہ ہم آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

﴿قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا: میرا عذاب ہے جسے چاہوں پہنچادوں، اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔

﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ سوعنقریب میں اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اگرچہ ہر چیز کو شامل ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ سب پر رحمت فرما سکتے ہیں، لیکن سب سے بڑی رحمت جو آخرت کی نجات ہے، اور دائمی عذاب سے بچادینا ہے، وہ ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اور جو زکوٰۃ دیتے ہیں۔

تقویٰ کے معنی ہیں: کفر وشرک سے بچنا، اور تمام معاصی سے پرہیز کرنا، اور عبادات وطاعات کو اتباعِ سنت کے طریقوں پر بجالانا۔ اسی طرح اداءِ زکوٰۃ میں سارے عباداتِ مالیہ جملہ حقوق کے ساتھ داخل ہو گئے۔

مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلقہ واسعہ، جس کے متعلق حدیث میں

ارشاد ہے: اِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ. [بخاري] اللہ تعالیٰ شانہ کی صفتِ رحمٰن اسی کا مصداق ہے، جو مؤمن و کافر سب کے لئے ہے۔ دوسری رحمتِ خاصہ جو کہ متقی مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے، جس کا مصداق الرّحیم ہے، اس رحمتِ خاصہ میں کافروں کا حصہ نہیں۔ پس خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے یہودیوں اور نصاریٰ کا شمار کافروں میں ہے، تو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاصہ سے وہ محروم ہی رہیں گے۔ آیت کریمہ میں:

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ میں رحمتِ عامہ کی طرف اشارہ ہے، اور:

﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ﴾ میں رحمتِ خاصہ مراد ہے، جس کے حقدار اہلِ ایمان ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمت کے لئے اسی رحمتِ خاصہ کی دعاء کی جو کہ قوم کی ہٹ دھرمی اور تکذیب انبیاء کرام علیہم السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل کو عمومی طور پر یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، اور اس کے حقدار آخری اُمت قرار پائی، جن کی سعادت اور ابدی نجات کا بیان آنے والا ہے۔ البتہ بنی اسرائیل کے مؤمن و متقی لوگ اس سعادت میں آخری اُمت کے ساتھ شریک رہیں گے، جس کی تفصیل اِن شاء اللہ سورۃ الواقعہ میں آنے والی ہے۔

❁ ❁ ❁

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ
الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ
عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ

ترجمہ: جو لوگ رسول نبی اُمّی کا اتباع کرتے ہیں، جنہیں وہ اپنے پاس تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ انہیں اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں، اور ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں، اور خبیث چیزوں کو ان پر حرام قرار دیتے ہیں، اور وہ طوق ہٹاتے ہیں جو ان پر تھے،

معارف و منازل

گزشتہ آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء کے جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ یوں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر چیز اور ہر شخص کے لئے وسیع ہے، یعنی رحمتِ عامہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودہ اُمت کو بھی (یہ رحمتِ عامہ) حاصل ہے، مگر

مخصوص رحمت اور مکمل نعمت وہ مخصوص لوگوں کے لئے ہے، جو مخصوص اوصاف کے مالک ہوں۔ یعنی ایمان باللہ، تقویٰ اور اداءِ زکوٰۃ والے، یہ لوگ خصوصی رحمت کے حقدار ہیں۔

خاتم النبیین سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور اُن کی اُمت کے خصوصی اوصاف:

اس آیت میں ان لوگوں کا پتہ دیا گیا ہے کہ ان مذکورہ شرائط پر پورے اترنے والے کون لوگ ہوں گے؟ اور بتلایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو رسول اُمّی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا اتباع کریں، یعنی آپ ﷺ پر ایمان لائیں، تقویٰ اختیار کریں، اور زکوٰۃ اداء کریں، وغیرہ۔ اس ضمن میں سرورِ عالم ﷺ کے چند خصوصی فضائل وکمالات اور اوصاف وعلامات کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے، اور صرف آپ ﷺ پر ایمان لانے کا نہیں، بلکہ مکمل آپ ﷺ کا اتباع اور آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاحِ آخرت کے لئے ایمان کے ساتھ اتباعِ شریعت وسنّت نہایت اہم اور ضروری ہے۔ فرمایا:

﴿الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ﴾ اس مقام پر رسول اور نبی دونوں لقبوں کا تذکرہ ہے، یعنی سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول بھی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نبی بھی ہیں۔ علماء کرام نے فرمایا ہے کہ رسول وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل کتاب اور شریعت لے کر آیا ہو، اور نبی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبر پر ہوتا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ مستقل کتاب یا شریعت نہ ہو۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول وہ ہے جس کو مخالفین کے ساتھ جہاد بالسیف کا بھی حکم ہوتا ہے، جبکہ نبی کو جہاد بالسیف کا حکم نہیں ہوتا۔ جس نبی کے پاس مستقل کتاب اور مستقل شریعت نہ تھی وہ اپنے سے سابق رسول کی کتاب اور شریعت کی تبلیغ کرتے تھے۔ اور بعض انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں جو رسول اور نبی ساتھ فرمایا ہے، جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے: ﴿اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ [مریم: ۵۴] (بیشک اسماعیل (علیہ السلام) وعدے کے سچے تھے، اور رسول اور نبی تھے)۔ تو اس میں رسول کا اطلاق لغوی معنی کے اعتبار سے ہوگا۔

آیت کریمہ میں سید الانبیاء ﷺ کی تین صفاتِ حمیدہ عظیمہ کا ذکر ہے: رسول اور نبی کے معنی معلوم ہوئے۔ اَلْاُمِّیُّ: یہ آپ ﷺ کی تیسری مخصوص اور پسندیدہ صفت ہے۔ اُمّی کے لفظی معنی ناخواندہ، اَن پڑھ کے

ہیں۔ عرب کے محاورہ میں اَلْاُمِّیُّ اُسے کہتے ہیں جس نے کسی مخلوق سے لکھنا اور پڑھنا نہ سیکھا ہو۔

عام قومِ عرب کو قرآن کریم میں اُمِّیِّیْنَ اسی معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا، اور اُمّی ہونا کسی انسان کے لئے صفتِ مدح وتعریف نہیں، بلکہ یہ ایک قسم کا عیب اور نقصان تصور ہوتا ہے، مگر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علوم ومعارف، اور خصوصیات اور اوصاف وکمالات کے ساتھ اُمّی ہونا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بڑی ممتاز صفت کمال بن گئی ہے، کیونکہ اگر علمی، عملی، اخلاقی کمالات کسی لکھے پڑھے آدمی سے ظاہر ہوں تو وہ اس کی تعلیم کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور یہ اس کی بلندی وشرف کا نشان نہیں بن سکتے، لیکن ایک اُمّی محض سے (جسے کاغذ پر لکھے ہوئے اپنے نام تک کا پتہ نہ ہو کہ یہ میرا نام ہے) ایسے بیش بہا قیمتی علوم اور بے مثال علوم ومعارف اور عجیب وغریب امثال وحقائق کا صدور ان کا ایک نمایاں کھلا ہوا معجزہ ہے جس سے کوئی پرلے درجے کا معاند ومخالف بھی انکار نہیں کرسکتا۔

خصوصاً جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کے چالیس برس مکہ معظّمہ میں سب کے سامنے اس طرح گزرے کہ کسی سے نہ ایک حرف پڑھا، نہ سیکھا، ٹھیک چالیس سال کی عمر ہونے پر یکا یک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ حق بیان پر وہ بے مثال اور سنجیدہ کلام جاری ہوا، جس کے ایک نہایت چند کلمات کی سورۃ کی نظیر ومثال لانے سے ساری دنیا عرب وعجم کے فصحاء، بلغاء وشعراء عاجز ہوگئے، اور ہتھیار ڈال دیئے۔

تو ان حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُمّی ہونا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رَسُوْلٌ مِنْ جَانِبِ اللہ ہونے، اور قرآن حکیم کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایک بہت بڑی شہادت ہے۔ اس لئے اُمّی ہونا اگرچہ دوسروں کے لئے کوئی صفتِ مدح نہیں، مگر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بہت بڑی بے مثال صفتِ مدح وکمال ہے۔ جیسے مُتَکَبِّر کا لفظ عام لوگوں کے لئے صفتِ مدح نہیں، بلکہ عیب ہے، مگر ربّ العزّت عزّ شانہ کے لئے خصوصیت اور امتیاز کے ساتھ صفتِ مدح وکمال اور شرف وجمال ہی ہے۔

﴿یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ﴾ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چوتھی صفت ہوئی کہ وہ لوگ، یعنی اہلِ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تورات وانجیل میں لکھا ہوا پائیں گے۔

یہاں یہ بات قابلِ غور وفکر ہے کہ قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات وحالات کو لکھا ہوا پائیں گے، بلکہ یَجِدُوْنَهٗ کہہ کر فرمایا، جس کے معنی یہ ہیں کہ تورات وانجیل میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لکھا ہوا پائیں گے۔

اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تورات وانجیل میں سرورِ عالم ﷺ کی صفات ایسی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ہوں گی کہ ان کو دیکھنا ایسا ہوگا جیسے خود آنحضرت سرورِ عالم ﷺ کو دیکھ لیا۔ اور تورات وانجیل کی یہاں تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل انہی دونوں کتابوں کے قائل ہیں، ورنہ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ کے حالات و اوصاف کا ذکر زبور میں بھی موجود ہیں۔

کتبِ سابقہ کے بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے، جن کا نام اَحمد ہوگا، میں کبھی اُن پر ناراض نہیں ہوں گا، اور وہ کبھی میری ناراضگی نہ کریں گے، اور میں نے ان کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کردی ہیں۔ ان کی اُمت اُمتِ مرحومہ ہے، میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا کی تھیں، اور ان پر وہ فرائض عائد کیے ہیں جو پچھلے انبیاء علیہم السلام پر عائد کیے گئے تھے، یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کی مانند ہوگا۔ اے داؤد! میں نے محمد (ﷺ) اور ان کی اُمت کو تمام اُمتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطاء کی ہیں، جو دوسری اُمتوں کو نہیں دی گئیں ہیں:

اوّل یہ کہ خطاء ونسیان پر ان کو عذاب نہ ہوگا۔ جو گناہ ان سے بغیر قصور کے صادر ہو جائے، اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کردوں گا۔ اور جو مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں بطیبِ خاطر خرچ کریں گے، تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے بہت زیادہ دے دوں گا۔ اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہیں تو میں ان پر اس مصیبت کو صلوٰۃ ورحمت، اور جنت کی طرف ہدایت بنادوں گا۔ وہ جو دعاء کریں گے میں قبول کروں گا۔ کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہ دے دوں گا، اور کبھی اس طرح کہ اس دعاء کو ان کی آخرت کا سامان بنادوں گا۔ [روح المعاني] اس سلسلہ میں کتاب "اظہار الحق" کا مطالعہ ہر عالمِ دین پر لازم ہے۔

خلاصہ کلام فی صفات خیر الانام ﷺ واصحابہ الکرام رضی اللہ عنہم:

اس آیت کریمہ میں ربّ العزّت عزّوجلّ نے حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے اختصار کے ساتھ نو صفات بیان فرمائی ہیں، جن پر علماء کرام نے مستقل کتابیں لکھیں ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱)......وہ اللہ کے رسول ہیں۔ (۲)......وہ نبی ہوں گے۔ (۳)......وہ اُمّی ہوں گے، یعنی کسی بھی انسان

سے کچھ نہ سیکھا ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا سکھانے والا ہوگا۔(۴)......علماء یہود ونصاریٰ ان نبی اُمّی کو توریت اور انجیل میں عظیم صفات وکمالات اور مزایا کے ساتھ لکھا ہوا پائیں گے۔(۵)......آپ ﷺ داعی الی الخیرات ہیں، تمام لوگوں کو ساری نیک باتوں کا حکم دیں گے۔(۶)......آپ ﷺ سارے لوگوں کو تمام برائیوں اور منکرات سے منع فرمائیں گے۔(۷)......آپ ﷺ لوگوں کے لئے صاف ستھری اور پاکیزہ چیزوں کو جو انسانی فطرت کے مطابق ہوں حلال فرمائیں گے۔(۸)......غیر فطری، ناپاک اور مردار وخبیث چیزوں کو لوگوں پر حرام فرمائیں گے۔ (۹)......آپ ﷺ یہودیوں والے وہ بوجھ اور سخت سخت مسائل واحکام معاف کرائیں گے جو ان کے گلوں کے طوق بنے ہوئے تھے، اور وہ سخت احکام جو ان کی پیٹھوں پر بمنزلہ بھاری بوجھوں کے تھے، یہ سارے منسوخ کروا کر ان کی جگہ سہل اور آسان احکام نافذ کریں گے، یعنی آپ ﷺ کی شریعت سہل اور آسان ہوگی۔

یہودیوں کے سخت ومشکل احکام میں سے چند یہ ہیں:

(۱) ان کے گناہوں کا بیان ہو چکا کہ توبہ کا صرف ایک طریقہ تھا، یعنی قتلِ نفس، جبکہ ہماری شریعت میں صرف ندامت اور استغفار ہی ہے۔(۲) ناپاک کپڑوں کی پاکی کا صرف قینچی سے کٹوائی، یہ بہت ہی سخت ہے، جبکہ ہماری شریعت میں پانی سے ہر قسم کی نجاست دور ہو سکتی ہے۔(۳) ان پر قصاص فرض تھا، اور دیت لینا ناجائز، جبکہ ہماری شریعت میں قتل عمد میں بھی دیت جائز ہے، اگر مقتول کے ورثہ راضی ہوں، کتنا بڑا فرق ہے؟(۴) ہفتہ کے روز ہر کاروبار حرام تھا، حتی کہ کھانا نہیں پکا سکتے تھے۔ یہ بہت سخت حکم ہے، جبکہ ہماری شریعت میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ ہاں! صرف تجارت پر جمعہ کی اذان کے بعد پابندی ہے، وہ بھی مختصر وقت کے لئے۔(۵) ان پر زکوٰۃ جو فرض تھی وہ چوتھا حصہ مال کا دیدیتے، جبکہ ہماری شریعت میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔(۶) تیمم کی سہولت سے محروم تھے۔ (۷) مسجد، بیعہ، کنیسہ کے علاوہ کہیں بھی نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔(۸) اگر رات کی تاریکی میں کوئی گناہ کرتا تو صبح دیواروں پر لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے، اور اُن کی تکریم کی، اور اُن کی مدد کی، اور اس نور کا اتباع کیا جو

اُن کے ساتھ اُتارا گیا، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ﴿۱۵۷﴾

معارف ومنازل

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توقیر اور اتباع کرنے والے کامیاب ہیں:

پہلے تو نبی اُمّی کے اوصاف بیان فرمائے کہ وہ نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں، اور منکرات سے روکتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں، اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں، اور پہلے لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ فرمایا کہ جو لوگ نبی عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے، اور اُن کی تکریم کی، اور اُن کی مدد کی، اور اس نور کا اتباع کیا جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا، یہ لوگ پوری طرح فلاح پانے والے ہیں۔

جب شرائعِ سابقہ منسوخ ہوگئیں، اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ورسالت ختم کردی گئی، تو اب فلاح اور نجاح، اور ہر طرح کی کامیابی کا واسطہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذات گرامی ہے۔ کوئی شخص کیسا ہی عبادت گزار ہو، ریاضت کرتا ہو، تارکِ دنیا ہو، اللہ تعالیٰ کے ذکر میں لگا رہتا ہو، بارگاہِ الٰہی میں مقبول بندہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ حضرت خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔

اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن تھامے بغیر اللہ تعالیٰ کا مقرّب بندہ بن جائے، اور آخرت کی نعمتیں مل جائیں، تو اس کا یہ خیال باطل ہے۔ ایسا شخص دوزخی ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بُعِثْتُ اِلَی الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ۔ ”میں ہر گورے، اور ہر کالے کی طرف بھیجا گیا ہوں“۔ [مسند أحمد ج:۵ ص:۱۴۵] پس جب خالق کائنات جلّ مجدہٗ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنادیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کو نجات کی شرط قرار دے دیا، تو تمام انسانوں پر فرض ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں۔ جب کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا رسول مان لے، تو عقلاً ونقلاً اس کے ذمہ یہ بات فرض ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتکریم بھی کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد بھی کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب، یعنی قرآن مجید کا اتباع بھی کرے۔ جو شخص ان اوصاف سے متصف ہوگا وہ پوری طرح کامیاب ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم کے مظاہرے:

عقلی اور طبعی طور پر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھرپور محبت کرنا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسمِ گرامی ادب سے

لینا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو خوش دلی سے قبول کر کے عمل پیرا ہونا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بات کرنے میں ادب کے ساتھ پیش آنا، یہ سب تعریف وتوقیر اور تعظیم وتکریم میں داخل ہیں۔

بہت سے لوگ یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہمارے دل میں ہے، لیکن انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارک، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس سے عملاً نفرت ہے۔ نصرانیوں کی صورت اور ان کا لباس اختیار کرتے ہیں، اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور محبت کرنے والے ہیں، ان لوگوں کا دعویٰ سراسر غلط ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ. تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والد، اور اس کی اولاد، اور سب لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ. تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہ ہوگا جب تک کہ اس کی خواہش اس کی مطابق نہ ہو جائے جس کو میں لے کر آیا ہوں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف رکھتے تھے، اس وقت مجلس میں بیٹھنے، اور بات کرنے میں بھی حاضرین کو ادب اور تعظیم کا لحاظ رکھنا ضروری تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾. [الحجرات:۲] (یعنی اپنی آوازیں نبی کی آواز پر بلند نہ کرو)۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: ﴿وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ [الحجرات:۲] (اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنے میں اونچی آواز نہ نکالو، جیسا کہ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بلند آواز سے بات کرتے ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط ہو جائیں، اور تمہیں پتہ بھی نہ ہو)۔

اور سورۂ نور میں ارشاد فرمایا: ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ [النور: ۶۳] (تم اپنے درمیان رسول کا بلانا اس طرح نہ کرو جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو)۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت زیادہ اکرام کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اس طرح بیٹھتے تھے جیسے ان کے سروں پر پرندے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے نہیں بولتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ دریافت کرتے تو ادب کے ساتھ معلوم کرتے تھے، آپ وضو فرماتے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پانی نیچے نہیں گرنے دیتے تھے، جلدی سے جھپٹ کر اپنے اعضاء پر مَل لیتے تھے، اور بہت زیادہ ادب سے پیش آتے

تھے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب قریش نے عروہ بن مسعود کو بطور نمائندہ گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تو اس نے قریش کو واپس جا کر بتایا کہ دیکھو! میں شاہِ فارس کسریٰ کے پاس بھی گیا ہوں، اور شاہِ روم قیصر کے پاس بھی گیا ہوں، اور شاہِ حبشہ نجاشی کے پاس بھی گیا ہوں، قسم بخدا میں نے کسی بھی بادشاہ کو اپنے لوگوں میں ایسا معظّم و مکرّم نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے اصحاب میں معظّم و مکرّم دیکھا ہے۔ اگر جنگ کا موقع آ گیا تو یہ لوگ کبھی بھی انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ [البداية والنهاية لابن كثير رحمہ اللہ]

دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد:

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی تعظیم و تکریم کا برتاؤ واجب ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو ادب سے سُنے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کا اتباع کرے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسمِ گرامی ادب سے لے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر خود کرے یا دوسرے سے سنے تو درود پڑھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ بیت، اولاد، ازواج اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی عزّت کرے، ان کا نام ادب سے لے، اور انہیں رضي الله عنه کی دعا سے یاد کرے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو احکام دیئے ہیں ان پر رضا و رغبت کے ساتھ عمل پیرا ہو۔

﴿نَصَرُوْهُ﴾ کا مطلب:

آیت شریفہ میں ﴿وَعَزَّرُوْهُ﴾ کے بعد ﴿وَنَصَرُوْهُ﴾ فرمایا، جس میں اہلِ ایمان کی ایک یہ صفت بیان فرمائی کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرتے ہیں، جس کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو تقویت پہنچاتے ہیں، اور اپنی کوششوں سے ابقاء دین واحیاء دین میں لگے رہتے ہیں۔ یہ صفت بھی صفاتِ ایمانیہ میں سے ہے، جو بھی کوئی مؤمن ہو، جہاں کہیں بھی ہو، وہ دینِ اسلام کو بڑھانے اور پھیلانے اور زندہ رکھنے کے لئے فکرمند رہے، اور عملی طور پر اس کام میں لگے رہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو نُور نازل ہوا اُس کا اتباع کرنا لازم ہے:

پھر فرمایا: ﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾ اور اس نور کا اتباع کیا جو ان کے ساتھ اُتارا گیا۔ اس نُور سے قرآن مجید مراد ہے، جس کا نُور ہونا سب پر عیاں ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ

﴿مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ [النساء:۱۷۴] (اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے کھلی دلیل آچکی ہے، اور ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی روشنی بھیج دی ہے جو راستے کی پوری وضاحت کرنے والی ہے)۔

پہلے ﴿يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ﴾ فرمایا، پھر ﴿يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ﴾ تا آخر فرما کر آپ ﷺ کا مرتبہ ومنقبتِ عظیمہ بیان فرمایا۔ اسی کے ساتھ اہلِ ایمان کی وہ عظیم صفت بیان فرمائی جس میں اتباعِ نُور اور اتباعِ قرآن کا تذکرہ ہے۔ اس آیت کی مزید تشریح آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

حدیثِ نبوی حجتِ شرعیہ ہے:

آیت کریمہ کے پورے مضمون کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ دونوں کا اتباع لازم ہے، اور جس طرح قرآن کریم حجتِ شرعیہ ہے اسی طرح حدیثِ نبوی بھی حجتِ شرعیہ ہے۔ مستشرقین یہود ونصاریٰ سے متاثر ہو کر بعض پڑھے لکھے مادر پدر آزاد جاہل بھی یوں کہنے لگے ہیں کہ حدیث حجت نہیں ہے، یہ وہ گمراہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر زمانہ میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی تعلیمات کی تکذیب کی ہے۔

اگر حدیث کو نہ مانیں تو دینِ اسلام پر نہیں چل سکتے:

اگر حدیث نبوی کو حجت نہ مانیں تو نماز پڑھنے، اور وضوء وغسل کرنے کا طریقہ بھی معلوم نہ ہوگا۔ قرآن کریم میں نہ نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا ہے، نہ بالتصریح پنج وقتہ اوقاتِ نماز بتائے ہیں، نہ رکعات کی تعداد بتائی ہے، اور نہ یہ بتایا ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے، اور مقدارِ زکوٰۃ کیا ہے، نہ کسی حولانِ حول، اور کسی لازمی شرط کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح حج اور روزہ، ہزاروں بلکہ لاکھوں مسائل جن کا تعلق عقائد، عبادات اور معاملات کے ساتھ ہے قرآن حکیم نے صراحۃً بجائے خود ان کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا، بلکہ پورے اہتمام کے ساتھ فرمایا: ﴿وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر:۷] (رسول تمہارے پاس جو کچھ لے آئے اسے لے لو، اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہو)۔

یہ انکارِ حدیث دراصل انکارِ رسالت کی ایک چھپی ہوئی مخفی سازش ہے، جسے یہود ونصاریٰ نے ایجاد کیا، اور

ان پر کلمہ پڑھنے والے لوگوں نے نادانی سے اس کی تشہیر کی۔ علماء اُمت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ انکارِ حدیث کفر ہے، اور منکرین حدیث کافر و مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، جنہوں نے نہ قرآن کو سمجھا، اور نہ سارے پیغمبروں علیہم السلام کے آخری عظیم المرتبت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے عظیم مرتبہ کو پہنچا۔ ہاں! انہوں نے ضرور ابلیس کا اتباع کیا، اور اسے اپنا رہبر و پیشوا تسلیم کیا۔

سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کی فہرست بہت ہی لمبی ہے۔ علامہ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے خصائص کبریٰ میں تین ہزار کے قریب خصوصیات جمع کی ہیں، یہاں نمونہ کے طور پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف پانچ خصوصیات کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ آج مجھے پانچ چیزیں عطاء کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی رسول و نبی کو نہیں ملیں:

☆ ...... پہلی یہ کہ میری رسالت و نبوّت کو ساری دنیا کی کُل اقوام کے لئے عام کیا گیا ہے، اور مجھ سے پہلے جتنے انبیاء کرام علیہم السلام آئے ہیں ان کی بعثت و دعوت صرف اپنی اپنی اقوام کے ساتھ مخصوص ہوتی تھی۔

☆ ...... دوسری یہ کہ مجھے میرے دشمن کے مقابلہ میں ایسا رُعب عطاء کیا گیا ہے کہ وہ مجھ سے ایک مہینے کی مسافت پر خوفزدہ اور مرعوب ہو جاتا ہے۔

☆ ...... تیسرے یہ کہ میرے لئے کفار سے حاصل شدہ مالِ غنیمت حلال کر لیا گیا، حالانکہ پچھلی اُمتوں کے لئے حلال نہ تھا، وہ مالِ غنیمت کو جمع کر کے ایک پہاڑی پر رکھ چھوڑتے، آسمان سے ایک بجلی آ کر انہیں جلاتی اور خاکستر کر دیتی۔

☆ ...... چوتھی یہ کہ میرے لئے تمام زمین کو مسجد اور پاک کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے، جبکہ ان کی نماز بغیر مسجد کہیں بھی نہیں ہو سکتی تھی، اور ہماری نمازیں زمین کے ہر حصے میں ہو سکتی ہیں۔ نیز ان کے لئے تیمم کی سہولت نہ تھی، جبکہ ہمارے لئے اس کی سہولت مشروع ہے۔ اگر دس سال تک پانی دستیاب نہ ہو تو تیمم سے سب کچھ پورا ہو سکتا ہے۔ تیمم کے مسائل کتب فقہ میں دیکھیں۔

☆ ...... اور پانچویں چیز کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، وہ خود ہی اپنی نظیر ہے۔ اس سے مراد شفاعتِ کبریٰ ہے، جس کا مفصل بیان اپنے موقع پر آئے گا، اِن شاء اللہ۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اپنے ہر رسول کو ایک مخصوص دُعا

کی قبولیت ایسی عطاء فرمائی ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا، اور وہ ہر حال میں منظور اور مقبول ہوگی، اور ہر رسول و نبی نے اپنی اپنی دعا کو اپنے اپنے خاص مقصدوں کے لئے دنیا ہی میں استعمال کرلیا، وہ مقصد پورے ہوگئے، اور مسائل حل ہوگئے، مجھ سے یہی کہا گیا کہ آپ بھی اپنی دعا استعمال کریں، میں نے اپنی دعا کو آخرت کے لئے محفوظ کرلیا، وہ دعا تمہارے لئے اور قیامت تک جو شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی شہادت دینے والا ہوگا اس کے کام آئے گی۔ [بخاري]

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری بعثت کا سنے خواہ وہ میری اُمت میں ہو یا یہودی نصرانی ہو، اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو وہ جہنمی ہوگا (کافر شمار ہوگا)۔ [مسلم و أحمد] اب پورے عالم میں کوئی ایسا ذریعہ نہیں، کوئی راستہ ایسا نہیں جو اللہ تک پہنچاتا ہو، اور قیامت کے ہولناک دن میں ذریعہ نجات ہوسکتا ہو، سوائے اس ہدایت و پیغام کے جسے رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا والوں کے سامنے پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ باقی جہاں کو چھوڑ دیں، اگر بنی اسرائیل کے عظیم المرتبت پیغمبر حضرت موسیٰ کلیم اللہ (علیہ السلام) موجود ہوں تو میرے اتباع کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ [مشکوٰۃ]

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥٨﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے لوگو! بلا شبہ میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ شانہ کا رسول ہوں، جس کے لئے بادشاہت ہے آسمانوں کی، اور زمین کی، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ کرتا ہے، اور موت دیتا ہے، سو تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر، اور اس کے رسول پر، جو نبی اُمّی ہے، جو ایمان لاتا ہے اللہ تعالیٰ پر، اور اس کے کلمات پر، اور اس کا اتباع کرو، تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿١٥٨﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں اسلام کے اصولی اور اہم مسائل میں سے مسئلۂ رسالت کے ایک اہم بنیادی پہلو کا بیان ہے کہ ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عامہ کا تذکرہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات، ملائکہ، جن و بشر سب کے لئے، اور قیامت تک تمام مخلوقات کے لئے ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

حکم دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رسالتِ کاملہ اور بعثتِ عامہ کا اعلان عام کر کے ساری کائنات پر اپنی بابرکت و باکمال رسالت کا اظہار فرمائیں، اور انہیں بتلادیں کہ میں ساری کائنات کی طرف رسول بنا کر مبعوث ہوا ہوں۔

فرمایا: آپ اعلان کریں کہ میری بعثت ورسالت پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح کسی مخصوص قوم، یا مخصوص خطہ، زمین، یا خاص وقت کے لئے نہیں، بلکہ پوری کائنات کے انسانوں کے لئے ہے، دنیا کے ہر خطہ، ہر آبادی کے لئے ہے، اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے قیامت تک آنے والی مخلوقات کے لئے عام ہے، محض انسانوں کے لئے نہیں، بلکہ جنّات کے لئے بھی ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں، آپؐ کی نبوت قیامت تک آنے والی مخلوقات کیلئے ہے:

یہی اصلی راز ہے مسئلہ ختم نبوت کا، کیونکہ جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت قیامت تک آنے والی سب نسلوں کے لئے عام ہے تو پھر کسی دوسرے رسول اور نبی کے مبعوث ہونے کی نہ ضرورت ہے، اور نہ گنجائش، اور یہی راز ہے اُمت محمدیہ کی اس خصوصیت کا کہ اس میں ارشادِ نبوی کے مطابق ہمیشہ ایک ایسی جماعت دنیا میں قائم رہے گی جو دین میں پیدا ہونے والے سارے فتنوں کا مقابلہ کرے گی، اور دینی معاملات میں پیدا ہونے والے سارے رخنوں کا انسداد کرتی رہے گی۔ کتاب وسنت کی تعبیر وتفسیر میں دشمنانِ اسلام اور بے دین طبقات کی طرف سے جو غلطیاں اور ریشہ دوانیاں ہوں گی، یہ جماعتِ حقہ ان کو دور کرے گی، اور ہر قسم کی لفظی ومعنوی تحریفات کی نشاندہی کرے گی، اور حق تعالیٰ جلّ شانہ کی مخصوص حمایت اور امداد انہیں حاصل رہے گی۔

دراصل آخری مبارک آسمانی کتاب قرآن حکیم آج تک جو مکمل اور حیرت انگیز طریقہ پر محفوظ ہے، یہ یہی ربّ العزّت کی حفاظت اور جماعتِ حقّہ کی جدوجہد اور محنت کا ثمرہ ونتیجہ ہے، اور یہ ختمِ نبوت کے لئے بڑا واضح ثبوت، اور مسلّم دلیل ہے، جبکہ دیگر آسمانی کتابوں کو نہ یہ مقام حاصل ہے، اور نہ ان کی خبر گیری اور تحفظ کے لئے کوئی برحق جماعت موجود ہے۔

چونکہ انہیں قرآن حکیم کی آمد کے ساتھ منسوخ ہونا ہی تھا، تب تو ربّ العزّت نے ان کے ابدی تحفظ کا اور ہمیشہ کے لئے بقاء کا انتظام نہیں فرمایا۔ بخلاف قرآن حکیم کے کہ اُسے اللہ تعالیٰ نے ختمِ نبوت کی خاطر قیامت تک ہر اعتبار سے محفوظ رکھنا تھا، تو اس کی حفاظت کے لئے تکوینی طور پر رجالِ کار پیدا فرمائے، جس کی بدولت لاکھوں حفاظ قرآن، اور کروڑوں علماء تفسیر وحدیث وفقہ کے دنیا کے مختلف ملکوں، مختلف حصوں میں موجود ہیں۔ مجال نہیں کہ کوئی

دشمن اسلام قرآن وحدیث میں کوئی تحریف کر سکے۔

توراۃ جیسی بابرکت کتاب کے صرف چار حافظ دنیا میں دیکھے گئے، پانچواں ندارد، وہ یہ ہیں:

سیدنا موسیٰ، سیدنا ہارون، سیدنا عیسیٰ، سیدنا عزیر علیہم السلام، جبکہ خلیفہ راشد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ، اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا ہے کہ مجھے جلدی بتاؤ کہ تمہاری فوج میں کتنے حفاظ قرآن موجود ہیں؟ انہوں نے امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کو جواب لکھا کہ ہماری فوج میں دس ہزار حفاظ قرآن موجود ہیں۔ غور سے دیکھیں، یہ تمہاری فوج کا حال ہے، پس عوام الناس کا کیا حال ہوگا؟ یہ سب کچھ ختم نبوت ہی کی برکت ہے، اور قیامت تک کے انسانوں کے لئے رہنمائی کا انتظام ہے۔

دراصل یہی جماعت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائضِ رسالت ادا کرنے میں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کے تحفظ وبقاء کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قائم مقام ہوگی۔ ڈھائی ہزار سال میں کسی محقق اَحبار وُرہبان کو توریت شریف کی کوئی مختصر تفسیر لکھنے کی توفیق نہ ہوئی، جبکہ ڈیڑھ ہزار سال کے مختصر عرصہ میں وارثانِ ختمِ نبوت تین لاکھ کی تعداد میں قرآن کریم کی تفاسیر لکھ چکے۔ تفسیر نیشاپوری ایک ہزار جلدوں میں ہے، اور ہر جلد ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اسی طرح محدّث ومفسر ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر جو کہ ہزار جلدوں پر مشتمل ہے۔ [تاریخ بغداد، یتیمة البیان، مقالات افغانی علیہ الرحمۃ]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت: ﴿كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [التوبة:۱۱۹] (سچوں کے ساتھ رہیں) کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اس اُمت میں صادقین کی ایک جماعت ضرور باقی رہے گی، ورنہ دنیا کو صادقین کی معیت وصحبت کا حکم ہی نہ ہوتا۔ اور اسی سے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر دور میں اجماع اُمت کا حجتِ شرعیہ ہونا ثابت کیا ہے، کیونکہ صادقین کی جماعت کے موجود ہوتے ہوئے کسی غلط بات یا گمراہی پر سب کا اجماع واتفاق نہیں ہوسکتا۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین اور آخری پیغمبر ہونے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ورسالت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے اور پورے عالم کے لئے عام ہوئی، تو اب کسی دوسرے جدید نبی ورسول کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اسی لئے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو وہ بھی اپنی جگہ اپنی نبوت پر برقرار ہونے کے باوجود شریعتِ محمدی پر عمل کریں گے، جیسا کہ صحیح احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثتِ عامہ کا دیگر مقامات پر بھی قرآن مجید میں تذکرہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ﴾ [سبأ:۲۸]

(اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سارے ہی انسانوں کے لیے ایسا رسول بنا کر بھیجا ہے جو خوشخبری بھی سنائے، اور خبردار بھی کرے، لیکن اکثر لوگ سمجھ نہیں رہے ہیں)۔

اسی طرح: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰـكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ [الأحزاب: ۴۰] (محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں، اور تمام نبیوں میں سب سے آخری نبی ہیں)۔

اسی طرح: ﴿وَاُوۡحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ﴾ [الأنعام: ۱۹] (اور مجھ پر یہ قرآن وحی کے طور پر اس لیے نازل کیا گیا ہے تا کہ اس کے ذریعے میں تمہیں ڈراؤں، اور ان سب کو بھی جنہیں یہ قرآن پہنچے) یعنی قیامت تک آنے والوں کو جو یہ قرآن پہنچے۔

توریت شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات:

حضرت عطا بن یسار تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی، تو میں نے کہا کہ توریت میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت بیان کی گئی ہے، وہ مجھے بتائیے، اُنہوں نے فرمایا کہ قرآن مجید میں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض صفات توریت شریف میں بھی ہیں۔

یعنی یہ کہ اے نبی! ہم نے آپ کو گواہ بنا کر، اور خوشخبری دینے والا، اور ڈرانے والا، اور اُمّیین (یعنی عرب) کی حفاظت کرنے والا بنا کر بھیجا، تو میرا بندہ ہے، میں نے تیرا نام متوکّل رکھا، جو درشت خو اور سخت مزاج نہیں ہے، اور بازاروں میں شور مچانے والا نہیں، اور جو بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتا، لیکن معاف کرتا ہے، اور بخش دیتا ہے، اور اللہ اُسے نہیں اٹھائے گا جب تک کہ اس کے ذریعے کجی والی ملّت کو سیدھی نہ کر دے، اس طرح سے کہ وہ لوگ لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہیں گے، اور اس کے ذریعے ان کی اندھی آنکھوں کو کھول دے گا، اور بہرے کانوں کو، اور غلاف چڑھے قلوب کھول دے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا یہ بیان صحیح بخاری سے مشکوٰۃ المصابیح ص: ۵۱۲ میں نقل کیا ہے۔ سنن دارمی ج:۱ ص: ۱۴ میں بھی یہ مضمون ہے، اس میں یوں ہے کہ حضرت عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن سلام

رضی اللہ عنہ سے مذکورہ بالا مضمون کی روایت کی۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی حق شناسی:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پہلے یہودی تھے، اوران کے علماء میں سے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہی انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ چہرہ جھوٹا نہیں ہوسکتا، اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت کی وہ علامات دیکھ کر جوانہیں پہلے سے معلوم تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچان لیا، اوراسلام قبول کرلیا۔ ان کے علاوہ عموماً یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچان کر، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت کو حق جان کر ہٹ دھرمی پر کمر باندھ لی، اور چند افراد کے علاوہ، وہ لوگ مسلمان نہ ہوئے۔ ان کی جہالت وضلالت نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا۔

یہ جوفرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ کجی والی مِلّت کو سیدھا فرمائے گا، اس سے مِلّتِ ابراہیمی مراد ہے، جسے مشرکینِ عرب نے بگاڑ دیا تھا۔

یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے کئی سو سال پہلے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، وہ کہتے تھے کہ نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لائیں گے، اورہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں گے، اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل کر مشرکین سے جنگ کریں گے، لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے، اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچان بھی لیا کہ واقعی یہ وہی نبی ہیں جن کے انتظار میں ہم تھے، تو اس کے باوجود مُنکر ہوگئے۔ اسی کوفرمایا: ﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾.[البقرة: ۸۹] (توجب ان کے پاس وہ چیز آگئی جس کو پہچانتے تھے تو اس کا انکار کیا، تو اللہ کی پھٹکار ہو انکار کرنے والوں پر)۔

نصاریٰ بھی انجیل شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علامات پڑھتے چلے آرہے تھے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لیا، لیکن عام طور سے وہ بھی منکر ہوگئے۔ نصاریٰ نجران کے ساتھ جو مکالمہ ہوا، اورآپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جوانہیں مباہلہ کی دعوت دی، اوروہ مباہلہ سے منحرف ہوئے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے نبی ہیں، ایمان نہ لائے۔

قیصرِ روم کا اقرار:

ہرقل (قیصرِ روم) نے بھی یہ مان لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ اس کا ذکر صحیح بخاری ج:۱

ص: ۴ باب بدء الوحی میں موجود ہے۔ جانتے پہچانتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار یہود ونصاریٰ دونوں قوموں نے کیا۔ دورِ حاضر کے نصاریٰ کی ڈھٹائی دیکھو کہ موجودہ بائبل میں (جو پہلے سے بھی محرّف ہے) جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں پیشین گوئی پائی تو اس کی تحریف پر اُتر آئے۔

توریت شریف کی پیشینگوئی، اوراس میں بائبل شائع کرنے والوں کی تحریف:

کتاب استثناء باب ۳۳ میں اس طرح پیشین گوئی موجود ہے: "خداوند سیناء سے آیا، اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا، وہ کوہِ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لئے آتشیں شریعت تھی، وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے، اور اس کے سارے مقدّس تیرے ہاتھ میں ہیں، اور وہ تیری باتوں کو مانیں گے"۔

چونکہ اس پیشین گوئی میں لفظِ فاران موجود ہے، جو مکہ مکرمہ کے پہاڑ کا نام ہے، اور دس ہزار قدسیوں کے ساتھ فاران پر جلوہ گر ہونے کا تذکرہ ہے، اور یہ دس ہزار وہ صحابہ رضی اللہ عنہم تھے جو حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ سے فتح مکہ کے موقع پر گئے تھے، لہٰذا تحریف کے مجرمین کو یہ دونوں باتیں بھاری پڑیں، اس لئے انہوں نے سابقہ تحریفات میں اضافہ کردیا (جب تحریف پر ہی دین اور دیانت کی بنیاد رکھ لی، تو اب آگے تحریف کرنے میں خوفِ خدا لاحق نہ ہوا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے)۔

اوّل تو فاران کا مصداق بدلنے کی کوشش کی، اور یہ کہہ دیا کہ یہ بیت المقدس کا نام ہے، حالانکہ قدیم وجدید جغرافیہ نویسوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ بیت المقدس کا نام فاران ہے۔ خود توریت سامری کے عربی ترجمہ میں لفظِ فاران کے سامنے بریکٹ میں لفظ "الحجاز" موجود ہے۔ (یہ ترجمہ آرکوئیٹن نے ۱۸۵۱ء میں کیا تھا)۔

دوسری تحریف ان مجرموں نے یہ کی کہ دس ہزار کی جگہ کسی ترجمہ میں ہزاروں لکھ دیا، اور کسی میں لاکھوں لکھ دیا، اور بعض ترجموں میں پورا جملہ ہی ختم کردیا۔ بائبل کا انگریزی ترجمہ جو کنگ جیمس ورجن نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا، اس میں بھی دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آنے کا ذکر ہے، لیکن بعد میں تحریف کے دلیروں نے اس کو بدل کر رکھ دیا۔ تفصیلات کے لئے اظہار الحق عربی، اور اس کے تراجم، اور سیرت النبی از سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ کیا جائے۔

یہود ونصاریٰ کا عجیب طرزِ فکر ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ تحریف کر کے جو لفظ اور معنیٰ ہم اپنی طرف سے مقرر کر دیں گے، وہی روزِ قیامت ہمارے لئے حجت بن جائے گا، اور نبی آخر الزمان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت ورسالت کا انکار کرنے کے لئے جو تدبیریں سوچی جائیں گی وہ بارگاہِ خداوندی میں کام دیں گی، اور دوزخ سے بچادیں گی۔ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ مسئلہ مسلمانوں کو جواب دینے کا نہیں ہے، آخرت میں نجات پانے کا ہے۔ یہود نے یقین کرلیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

توریت شریف میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا تذکرہ پڑھتے تھے، آپس میں اس کا ذکر بھی کرتے تھے، اور جب ان میں سے کوئی شخص مسلمانوں کے سامنے اقراری ہوجاتا تو اسے بُرا کہتے، اور یوں کہتے تھے: ﴿أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ [البقرة: ۷۶] (کیا تم ان سے وہ باتیں بیان کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھول دیں، تاکہ یہ لوگ تمہارے ربّ کے پاس تم پر حجت قائم کرلیں؟)۔

ایک یہودی کا اپنے لڑکے کو اسلام قبول کرنے کا مشورہ دینا:

صحیح بخاری ج:۱ ص:۱۸۱ میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار ہوگیا، تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور اس کے سر کے پاس تشریف فرما ہوئے، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُسے اسلام کی دعوت دی، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا (جو وہیں موجود تھا، اس کا مقصد مشورہ لینا تھا) اس کے باپ نے کہا کہ ابوالقاسم کی بات مان لو، لہٰذا اس نے اسلام قبول کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم یوں فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَنْقَذَهٗ مِنَ النَّارِ. سب تعریف اللہ کے لئے ہے، جس نے اُسے آتشِ دوزخ سے بچالیا۔

جو یہودی عہدِ نبوت میں مسلمان ہوگئے تھے، اور صحابیت کے شرف سے مشرف ہوئے وہ توتوریت شریف سے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی علامات اور صفات بیان کیا ہی کرتے تھے، ان کے بعد علماء یہود میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے ان کو تابعیت کا شرف نصیب ہوا، وہ بھی توریت سے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی علامات اور صفات بیان کیا کرتے تھے۔

کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کا بیان:

کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ پہلے یہودی تھے، پھر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اسلام قبول کیا، وہ بیان کرتے

تھے کہ ہم توریت میں یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، میرے برگزیدہ بندے ہیں، نہ درشت خو ہیں، نہ سخت مزاج ہیں، وہ بازاروں میں شور مچانے والے نہیں ہیں، بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتے لیکن معاف کرتے ہیں، اور بخش دیتے ہیں، ان کی پیدائش مکہ میں ہوگی، اور ان کی ہجرت کی جگہ طیبہ (مدینہ منورہ) ہے، اور ان کا ملک شام میں ہوگا (ملک شام اوّلین وہ سرزمین ہوگی جہاں ان کے اصحاب کی حکومت ہوگی) اور ان کی اُمت کے لوگ خوب زیادہ حمد بیان کرنے والے ہوں گے، یہ لوگ اللہ کی حمد بیان کریں گے خوشحالی میں بھی، اور سختی میں بھی، وہ ہر منزل میں اللہ کی تعریف کریں گے، اور ہر بلندی پر اللہ کی بڑائی بیان کریں گے، یہ لوگ آفتاب کی نگرانی کریں گے، جب نماز کا وقت ہو جائے گا نماز ادا کریں گے، آدھی پنڈلیوں پر تہبند باندھیں گے، وہ وضو میں اپنے اطراف یعنی ہاتھ پاؤں دھوئیں گے۔

ان کا مؤذن فضاء آسمانی میں آذان دے گا، اور ان کی ایک صف قتال میں اور ایک صف نماز میں ہوگی، دونوں صفیں (اخلاص اور عزیمت میں) برابر ہوں گی، رات کو ان (کے ذکر) کی آواز ایسی ہوگی جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔

صاحبِ مشکوٰۃ نے یہ روایت [ص:۱۷۰] بحوالہ مصابیح السنہ نقل کی ہے، پھر لکھا ہے کہ دارمی نے [سننِ دارمی: ج ۱، ۱۵] بھی تھوڑی سی تغییر کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس کے بعد صاحبِ مصابیح نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ توریت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام کی صفت بیان کی ہے (اس میں یہ بھی ہے) کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا یہ بیان سنن ترمذی میں بھی ہے۔

بعض یہود کا اقرار کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں، لیکن قتل کے ڈر سے اسلام نہیں لاتے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہودی حاضر ہوتے رہتے تھے، اور بہت سی باتیں پوچھا کرتے تھے (جن کے بارے میں جانتے تھے کہ یہ نبی کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا) اس میں اپنے سوالوں کا صحیح جواب پاتے، اور بار بار ان کے یقین میں پختگی آتی جاتی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر جواب ان کو چیلنج کرتا تھا، لیکن حق جانتے ہوئے مانتے نہیں تھے، اور قبول نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ دو یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے "آیات بینات" کے بارے

میں سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دے دیا، تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پاؤں چومے، اور کہنے لگے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں میرا اتباع کرنے سے کیا چیز روکتی ہے؟ کہنے لگے کہ ہمیں خوف ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرلیں تو ہمیں یہودی قتل کردیں گے۔ [مشکوۃ المصابیح: ۱۷] (یہ جان اور مال کا خوف انہیں اسلام قبول کرنے سے باز رکھتا تھا) جن یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آزمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیوں کو دیکھا، اور دنیوی مفاد کو ٹھوکر ماری، انہوں نے اسلام قبول کرلیا، لیکن یہ معدودِ چند ہی تھے۔

ایک یہودی کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آزمانا، اور پھر مسلمان ہونا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی عالم کے چند دینار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرض تھے، وہ تقاضے کے لئے آیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے یہودی! میرے پاس اس وقت انتظام نہیں ہے کہ تیرا قرض ادا کروں۔ اس پر اس یہودی نے کہا کہ اے محمد! میں آپ سے جُدا نہ ہوں گا جب تک آپ میرا قرضہ ادا نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو میں بھی تیرے ساتھ بیٹھا رہوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ساتھ بیٹھے رہے، اور اسی دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر سے لے کر سب نمازیں ادا کرلیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم اسے دھمکی دیتے تھے، اور ڈراتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو محسوس فرمالیا، اور استفہامِ انکاری کے طریقہ پر فرمایا کہ تم کیا کرتے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایک یہودی نے آپ کو روک رکھا ہے (جو ہم سے نہیں دیکھا جاتا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے ربّ نے مجھے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی معاہد (ذمی یا مستامن) پر ظلم کروں۔

دوسرے دن جب دن چڑھ گیا تو اس یہودی نے کہا: أَشْهَدُ أَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّکَ رَسُولُ اللهِ﴾ اور ساتھ یہ بھی کہا کہ میں اپنا آدھا مال اللہ کی راہ میں دیتا ہوں، اور میں نے یہ جو کچھ کیا اسی لئے کیا کہ میں آپ کو ان اوصاف کے موافق دیکھ لوں جو توریت میں بیان کئے گئے ہیں۔

توریت میں ہے کہ محمد بن عبداللہ کی پیدائش مکہ میں ہوگی، اور ان کی ہجرت کی جگہ طیبہ ہے، اور ان کا ملک شام میں ہوگا۔ وہ درشت خُو اور سخت مزاج نہیں ہوں گے، اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے ہوں گے، وہ فحش کلامی کو اختیار نہ کریں گے، اور بُرے الفاظ سے بھی بچیں گے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں، یہ میرا مال ہے، آپ اس میں جس طرح چاہیں حکم فرمائیں۔ [رواه البيهقي في دلائل النبوة كمافي المشكوٰة: ۵۲۰]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا عجیب واقعہ:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی جانچ پڑتال کے بعد مسلمان ہوئے، یہ فارس کے رہنے والے تھے، ان کا گھرانہ مشرک تھا، ان کا باپ انہیں کھیت کیاری دیکھنے کے لئے بھیجا کرتا تھا۔ مشغلہ کاشت کاری اور زمینداری تھا، مذہباً آتش پرست تھا، اس کا نام بودخشان بن مورسلان تھا، اور اپنے گاؤں کا چودھری تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اس کو سب سے زیادہ پیارے تھے، حتیٰ کہ ان کو لڑکیوں کی طرح گھر میں رکھتا تھا، اور قدم باہر نہ نکالنے دیتا تھا۔

جب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی پیدائش ہوئی تو اس کا نام مابہ رکھا، اور ہوش سنبھالنے پر ان کو بھی آتش پرستی میں لگا دیا، یہاں تک کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ آتش کدہ کی خدمت میں اس انہماک سے لگے کہ ہر وقت آگ روشن رکھتے تھے، اور آتش کدہ کے پُجاری اور مندر کے نگران بن گئے تھے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اپنے مسلمان ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کرتے تھے کہ ایک روز میرا باپ مکان بنوانے میں مشغول ہو گیا، اور فرصت نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کاشت کی خیر خبر لینے کے لئے بھیج دیا، اور ساتھ ہی جلد آنے کی بھی وصیت کر دی، اور یہ بھی کہا کہ اگر تو نے واپس ہونے میں دیر کی تو تیری جدائی کی فکر میرے لئے ساری فکروں سے بڑھ جائے گی۔

والد کے کہنے پر میں گھر سے نکلا، راستہ میں عیسائیوں کے گرجا پر میرا گزر ہوا، اور اس کے دیکھنے کے لئے اندر چلا گیا، وہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے، مجھے ان کی نماز پسند آ گئی، اور دل میں کہا کہ ان کا دین ہمارے دین سے بہتر ہے۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارے دین کا مرکز کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ملک شام میں ہے، میں شام تک وہیں رہا، اور سورج چھپنے پر گھر واپس آیا، تو باپ نے سوال کیا: اب تک کہاں تھا؟ میں نے باپ کو اپنا پورا حال سنا دیا، اور یہ بتا دیا کہ مجھے نصاریٰ کا دین پسند ہے، اور ان کا دین ہمارے دین سے بہتر ہے۔ باپ نے کہا: بیٹا! یہ تم نے غلط سمجھا، ان کا دین ٹھیک نہیں ہے، سچا دین وہی ہے جو تیرا اور تیرے باپ دادوں کا دین ہے۔ میں نے کہا: خُدا کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، بِلاشبہ ان کا دین ہمارے دین سے بہتر ہے۔

جب باپ نے میری گفتگو سنی تو اسے کھٹکا ہوا، اور اس ڈر سے کہ کہیں میں ان سے نہ جا ملوں مجھے گھر میں بند کر دیا، اور پاؤں میں بیڑی ڈال دی۔ میں نے اس قید و بند کی حالت میں عیسائیوں کو خبر بھیج دی کہ جب شام سے سوداگر آئیں تو مجھے خبر کر دینا، میں ان کے ساتھ تمہارے دین کے مرکز میں پہنچ جاؤں گا، چنانچہ کچھ دن کے بعد کچھ

شامی تاجر آگئے، انہوں نے مجھے خبر کردی، جب تاجر واپس جانے لگے تو میں نے بیڑیاں کاٹ ڈالیں، اور ان کے ساتھ ہو گیا، جب میں ان کے ساتھ شام پہنچ گیا تو وہاں کے لوگوں سے کہا کہ بتاؤ تمہارے یہاں عیسائیوں میں سب سے افضل کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ گرجا میں جاؤ، وہاں کا جو پاپائے اعظم ہے وہ سب سے افضل ہے۔ میں گرجا میں پہنچا، اور اس سے کہا کہ میں تمہارے دین کو پسند کر چکا ہوں، اور چاہتا ہوں کہ تمہاری خدمت میں رہوں، اور تعلیم حاصل کروں۔ اس نے کہا: بہتر ہے، رہنے لگو۔

میں اس کے ساتھ رہنے لگا، اور رہتے رہتے اس کے کچھے چٹھے سے خوب واقف ہو گیا۔ یوں تو بڑا بزرگ بنا ہوا تھا، مگر تھا بڑا خراب آدمی، لوگوں کو صدقہ خیرات کا حکم دیتا، اور جب اس کے کہنے سے لوگ صدقات وخیرات لے کر آتے، تو ان سب کو اپنے پاس جمع کر لیتا، اور مسکینوں کو کچھ بھی نہ دیتا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے معتقد دفن کرنے کے لئے جمع ہوئے، میں نے ان سے کہا کہ (اسے دفن نہ کرو) یہ تو بڑا خراب آدمی تھا، تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیتا تھا، اور جب تم اس کے پاس صدقات وخیرات کی رقم جمع کر دیتے تھے، تو نہ کسی فقیر کو دیتا تھا، نہ کسی مسکین کو، بلکہ اپنے ہی خزانے میں بھر دیتا تھا۔ لوگوں نے کہا تمہیں کیا پتہ؟ میں نے کہا: آؤ، تمہیں اس کا خزانہ بتادوں، یہ سن کر وہ میرے ساتھ ہو لئے، میں نے ان کو اس کا خزانہ دِکھایا، تو انہوں نے سونے اور چاندی سے بھرے ہوئے سات مٹکے رکھے ہوئے دیکھے۔

مٹکے دیکھ کر ان کو میری بات کا یقین آ گیا، تو بڑے برہم ہوئے، اور ان کے دلوں میں اس پادری کی ذرہ بھی وقعت نہ رہی، اور کہنے لگے کہ خدا کی قسم، ہم اُسے ہرگز دفن نہ کریں گے، چنانچہ ان لوگوں نے اس کی نعش کو سولی پر چڑھا کر پتھر مارتے مارتے چورا بنا دیا۔

اس کے بعد وہ لوگ اس کی جگہ دوسرے شخص کو لائے، جسے انہوں نے گرجا کا پادری بنا دیا۔ یہ دوسرا شخص اس پہلے شخص سے بہت افضل تھا، اور دنیا سے بہت بے رغبت تھا، مجھے اس سے محبت ہو گئی، اور ایک عرصہ تک اس کے ساتھ گرجا میں رہا۔ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا، تو میں نے اس سے کہا کہ اب آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ اور کس کے پاس جانے کی وصیت کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میرے علم میں اب کوئی شخص اصل دین مسیحی پر نہیں ہے، سوائے فلاں صاحب کے، جو شہر موصل میں رہتے ہیں، تم ان ہی کے پاس چلے جاؤ، چنانچہ میں موصل پہنچا، اور اس شخص کو تلاش کیا جس کا نام اور پتہ مجھے بتایا گیا تھا، جب اس سے ملاقات ہوگئی تو میں نے اس کو اپنا قصہ سنایا،

اور ساتھ رکھ لینے کی درخواست کی، اس نے درخواست منظور کر لی، اور میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔

یہ بھی اچھا آدمی تھا، جب اس کی موت آپہنچی تو میں نے کہا کہ آپ کا میرے متعلق کیا ارشاد ہے؟ بتائیے، اب کس کے پاس جاؤں؟ اس نے کہا کہ شہر نصیبین میں فلاں شخص کے پاس چلے جاؤ، میں نے نصیبین کا سفر کیا، اور اس شخص کو ڈھونڈ لیا جس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کو میں نے اپنا قصہ سنایا، اور ساتھ رکھ لینے کی درخواست کی، اس نے مجھے ساتھ رکھ لیا۔ یہ بھی اچھا آدمی تھا، مگر دنیا والی زندگی ہمیشہ کے لئے کسی کو بھی نہیں ملی۔ یہ شخص بھی مرنے لگا، تو میں نے کہا: اب میرے لئے کیا ارشاد ہے؟ بتائیے، اب کہاں جاؤں؟

اس نے جواب دیا کہ اب تم عموریا میں فلاں شخص کے پاس چلے جاؤ، چنانچہ میں اس کے پاس پہنچا، اور ساتھ رہنے کی درخواست کی، اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا، یہ بھی اچھا شخص تھا۔ عموریا کے دورانِ قیام میں نے کمانے کا دھندہ کر لیا، اور میرے پاس گائے اور بکریاں بھی جمع ہو گئیں۔ جب اس عموریا والے پادری کو موت نے آگھیرا تو میں نے اس سے کہا کہ بتائیے میں اب کہاں جاؤں؟

اس پر اس نے جواب دیا کہ اے بیٹا! اللہ کی قسم، اب تو میرے علم میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہمارے دین پر پوری طرح پابند ہو، اب تمہیں کس کے پاس بھیجوں؟ بس اب تو تم نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انتظار کرو، ان کے تشریف لانے کا زمانہ قریب ہے، وہ دین ابراہیم علیہ السلام لے کر آئیں گے، عرب سے ظاہر ہوں گے، وہ ایسے شہر کو ہجرت کریں گے جس کے دونوں طرف کنکریلی زمین ہوگی، اور جہاں کھجوروں کے باغ ہوں گے۔ ان کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہدیہ کھائیں گے، اور صدقہ نہ کھائیں گے، اور یہ نشانی بھی ہے کہ ان کے دونوں مونڈھوں کے درمیان مُہرِ نبوّت ہوگی۔ اب اگر تم سے ہو سکے تو عرب چلے جاؤ۔ یہ کہہ کر یہ پادری بھی دنیا سے سدھارا۔

میں عرب پہنچنے کی تدبیر سوچنے میں لگا رہا، حتی کہ قبیلہ بنی کلب کے کچھ لوگ عموریا پہنچ گئے، جو عرب سے تجارت کے لئے آئے تھے، ان سے میں نے کہا: کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ مجھے اپنے ساتھ عرب لے چلو؟ اور اس احسان کے بدلہ میں میری بکریاں اور گائیں لے لو؟ اس بات کو انہوں نے منظور کی، اور مجھے ساتھ لے کر چل دیئے۔ میں نے اپنی بکریاں اور گائیں ان کو دے دیں، وہ مجھے وادی القریٰ لے گئے (جو عرب ہی کا علاقہ ہے) مگر انہوں نے میرے ساتھ غدّاری کی، اور مجھے اپنا غلام ظاہر کر کے فروخت کر دیا۔ جس شخص کے ہاتھ مجھے بیچا تھا اس نے مجھے مدینہ کے ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا، جو قبیلہ بنی قریظہ میں سے تھا۔ وہ مجھے مدینہ لے گیا، مدینہ کو دیکھتے ہی

میں نے سمجھ لیا کہ بس یہی وہ شہر ہے جہاں میری مراد حاصل ہوگی، کیونکہ یہاں کھجوروں کے باغ بھی ہیں، اور شہر کے دونوں طرف کنکریلی زمین بھی ہے۔

میں مدینہ میں اپنے آقا کے کام میں لگا رہا، اور اسی اثناء میں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے۔ ایک روز میں ایک درخت پر اپنے آقا کے باغ میں کام کر رہا تھا کہ اس کا چچازاد بھائی آیا، اور کہنے لگا کہ خدا بنی قیلہ کو غارت کرے (بنی قیلہ سے انصار مراد ہیں) ابھی ابھی میں ان کے پاس سے گزرا، تو دیکھا کہ ایک شخص کے اِرد گرد جمع ہیں، جو مکہ سے آیا ہے، اور اپنے کو نبی بتاتا ہے۔ یہ سنتے ہی مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی، اور بیہوشی کا سا عالم ہوگیا، حتی کہ میں درخت سے گرنے کے قریب ہوگیا، بڑی عجلت کے ساتھ میں درخت سے اتر کر اپنے آقا کے پاس جا کھڑا ہوا، اور اس سے پوچھا کیا معاملہ ہے؟

اس نے میرے مُنہ پر ایک طمانچہ مارا، اور کہنے لگا: چل، تو اپنا کام کر، تمہارا ان باتوں سے کیا غرض؟ چنانچہ میں واپس ہوا، اور اپنے کام میں لگ گیا۔ میرے دل میں بے چینی اور بے قراری تھی، جس نے مجھے مجبور کر دیا کہ صبح جو بات سنی تھی اس کی حقیقت معلوم کروں، اور جس شخص کو میرے آقا کے چچازاد بھائی نے مدعی نبوت بتایا ہے اس کو چل کر دیکھوں، اور اس کی بنوت کو ان نشانیوں کے ذریعہ جانچوں جو عموریا والے پادری نے بتائی تھیں، چنانچہ جب شام ہوگئی، اور مجھے کام سے فرصت ملی، تو میں ایک خوان میں تازہ کھجوریں لے کر سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبا میں تشریف رکھتے تھے۔

میں نے عرض کیا: یہ صدقہ ہے، جو آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لئے لایا ہوں۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے سامنے سے اٹھالو، کیونکہ ہم (یعنی انبیاء کرام علیہم السلام) صدقہ نہیں کھاتے۔ یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: (جن کے لئے صدقہ حلال تھا) کہ تم کھالو، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کھالیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہاتھ روکے ہوئے بیٹھے رہے۔

یہ ماجرا دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ ایک نشانی تو میں نے دیکھ لی۔ اس کے بعد میں چلا گیا، اور پھر موقع پاکر کچھ کھجوریں جمع کر کے لایا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبا سے روانہ ہوکر مدینہ شہر میں تشریف لے جاچکے تھے۔ میں نے عرض کیا: یہ ہدیہ ہے، جو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس میں سے کھالیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ دوسری نشانی ہے۔

اب میں نے خاتم النبوّۃ کے دیکھنے کا ارادہ کیا، تو تیسری بار پھر حاضر خدمت ہوا، اس وقت آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم بقیع میں تشریف رکھتے تھے، اور آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے، میں نے آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کو سلام کیا، اور خاتم النبوّۃ دیکھنے کے لئے گھوم کر آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کے پیچھے پہنچ گیا، جب آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا ہوا دیکھا تو میرا مقصد سمجھ لیا، اور خود بخود اپنی مبارک چادر اٹھا کر مجھے خاتم النبوّۃ دکھلا دی، میں اس پر جُھک گیا، اور اسے چُومنا شروع کردیا، اور (چونکہ تینوں نشانیاں دیکھ کر آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوّت کا یقین ہوگیا، اور اپنی مراد پالی تو فرطِ خوشی میں) رونے لگا۔ آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: سامنے آؤ، میں سامنے آیا، اور اپنا پورا قصہ سنایا، تو آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کو ایسا عجیب معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی سنوایا۔

اس کے بعد میں غلامی کے مشغلوں میں پھنسا رہا، حتی کہ جنگ بدر میں بھی شریک نہ ہوسکا (اس دوران میں بارگاہِ رسالت میں آتا جاتا رہا) ایک روز آنحضرت صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے آقا سے کتابت کرلو (یعنی اس سے اپنی جان کو خریدلو) چنانچہ میں نے اس کی کوشش شروع کردی، اور اپنے آقا سے یہ معاملہ کرلیا کہ جب میں کھجور کے ۳۰۰ درخت لگادوں، اور ان کی پرورش کردوں، حتی کہ ان میں کھجوریں آجائیں، جو کھانے کے قابل ہوجائیں، اور اس کے ساتھ چالیس اوقیہ نقد سونا بھی ادا کردوں تو میں آزاد ہوجاؤں گا۔ (ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا تھا)۔ معاملہ کرکے سید عالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ۳۰۰ پودے چندہ کرکے میرے لئے جمع کردیئے۔

جب پودے جمع ہوگئے، تو سید عالم صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے درخت ہم لگادیں گے، تم ایک پودا بھی مت لگانا، لہٰذا میں نے ۳۰۰ کیاریاں بنادیں، اور آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم میرے ساتھ اس یہودی کے باغ میں تشریف لے گئے، اور ان کیاریوں میں وہ پودے لگادیئے۔ ہم آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کو پودے دیتے جاتے تھے، اور آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم اپنے دست مبارک سے کیاریوں میں رکھ رکھ کر مٹی بھرتے جاتے تھے۔

آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے جتنے بھی درخت لگائے تھے (جو کہ ۲۹۹ تھے) ان میں سے ایک بھی خراب نہ ہوا، اور مزید برآں آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ معجزہ دیکھنے میں آیا کہ اسی سال سب درخت پھل لے آئے، مگر ایک درخت نہ پھلا، جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لگادیا تھا، آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے اکھاڑ کر دوبارہ اپنے دست مبارک سے لگادیا۔ آپ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہٖ وسلم کا دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ وہ درخت بھی اسی سال پھل لے آیا۔

یہ تو درختوں کا معاملہ ہوا، اس کے بعد سونے کی ادائیگی کی مشکل اس طرح حل ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک کان میں سے تھوڑا سا سونا لایا گیا، جو مرغی کے انڈے کے برابر تھا، اسے لے کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ فارسی غلام کہاں ہے، جس نے اپنے آقا سے کتابت کی ہے؟ بلاؤ اُسے، چنانچہ میں بُلایا گیا، جب میں حاضر خدمت ہوا، تو آپ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! جتنا سونا مجھ پر واجب ہے اس کے سامنے اس ڈلی کی کیا حقیقت ہے؟ اس میں اتنا وزن کہاں ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: یقین رکھو، اللہ اسی سے تمہیں سبکدوش کر دے گا، چنانچہ میں اسے لے کر اپنے آقا کے پاس پہنچا، اور اس ڈلی کو تُلوا دیا، تو اسی سے چالیس اوقیہ سونا ادا ہو گیا، اور مجھے آزادی مل گئی، اب میں آزاد ہو گیا تو اسلام کے کاموں میں حصہ لینے لگا، اور آزادی کے بعد سب سے پہلا جو معرکہ پیش آیا، یعنی غزوۂ خندق اس میں شریک ہوا، اور اس کے بعد رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ برابر ہر غزوہ میں شریک رہا۔ غزوۂ خندق بھی اُن کے مشورہ سے کھودی گئی تھی۔ [جمع الفوائد، شمائل الترمذي، طبقات ابن سعد]

اللہ ربّ العزّت جس کو ہدایت سے نوازتے ہیں تو ہر حال اور فضا میں نواز دیتے ہیں۔ خدا کی شان حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ایک وقت میں تو آگ کے پُجاری تھے، اور یہ وقت بھی آگیا کہ آپ رضی اللہ عنہ پکّے موحّد اور نبی آخر الزمان ﷺ کے اُونچے درجے کے صحابی بن گئے۔

آزمائشیں تو بہت برداشت کیں، مگر اللہ کے پیارے بن گئے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کو ممتاز درجہ نصیب ہوا۔ آج تک ان کو اُمت کی طرف سے کروڑوں مرتبہ کی دُعائیں پہنچ چکی ہیں، اور خدا ہی جانے کہ قیامت تک اور کتنی پہنچیں گی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ غلامی کے زمانہ میں دس سے کچھ اوپر آقاؤں کے مملوک بن کر رہے، اور ہدایت کی طلب اور تلاش میں یہ سب مصیبت اور تکلیف برداشت کرتے رہے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان ﷺ کی ظلِ عاطفت میں پہنچا ہی دیا۔ مجموعی طور پر ان سب واقعات وحالات سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ دونوں قومیں نبی آخر الزمان ﷺ کی آمد کی منتظر تھیں، اور آپ ﷺ کی علامات اور نشانیاں ان لوگوں میں معروف ومشہور تھیں۔

☆☆☆

موجودہ انجیل میں آنحضرت ﷺ کے متعلق پیشنگوئی

بہت سی تحریفات وتغیّرات کے باوجود اب بھی انجیل یوحنا میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں بعض بشارتیں موجود ہیں۔ باب ۱۴ میں ہے کہ: "میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں، لیکن وہ مددگار، یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا، اور جو کچھ میں نے تم سے کہا وہ سب تمہیں یاد دلائے گا"۔

پھر باب ۱۶ میں ہے: "لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا"۔

پھر چند سطر کے بعد ہے: "لیکن جب وہ (یعنی روح حق) آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا، اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا"۔

پھر چند سطر کے بعد ان کے رَفعِ اِلَی السَّمَاء کی پیشین گوئی ہے، اور اس میں یہ الفاظ ہیں: "اور پھر تھوڑی دیر میں مجھے دیکھ لوگے، اور یہ اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں" یہ ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللهُ اِلَيْهِ﴾ [النساء: ۱۵۸] (بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف آسمان میں اٹھالیا) کی طرف اشارہ ہے۔

پھر چند سطر کے بعد دنیا میں تشریف لانے کا ذکر ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "میں نے تم سے یہ باتیں اس لیے کہیں کہ تم مجھ میں اطمینان پاؤ، دنیا میں مصیبتیں اٹھاتے ہو، لیکن خاطر جمع رکھو، میں دنیا پر غالب آیا ہوں"۔

چونکہ عہدِ قدیم اور عہدِ جدید سب انہیں لوگوں کے مرتّب کیے ہوئے ہیں، اس لیے تحریف کرتے رہتے ہیں، اور ترجموں میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے، اور اصل کتاب پاس نہیں جس سے موازنہ کیا جائے، اس لیے تحریف کرنے میں آزاد ہیں۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جو یہ منسوب کیا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنا باپ کہہ کر پکارا، اور اسی عنوان سے ذکر کیا، یہ سب باتیں ان کی اپنے تراشیدہ عقیدۂ تثلیث اور تکفیر کا نتیجہ ہیں۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں، تم مجھے دوسرا معبود مانو (العیاذ باللہ) انہوں نے تو یہ فرمایا تھا: ﴿اِنَّ اللهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ [آل عمران: ۵۱] (بلاشبہ اللہ میرا ربّ ہے، اور تمہارا ربّ ہے، سوتم اسی کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے)۔

ہم نے بائبل سے عبارتیں نقل کی ہیں، ان پر حجت قائم کرنے کے لیے لکھ دی ہیں، کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ ہم نے ان کی تحریف کردہ کتاب کی تصدیق کردی۔ ہاں! ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے پاس جو کتاب ہے تحریفات سے پُر ہے۔[أنوار البیان]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے ہیں:

نبی اُمّی کی دوسری صفت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ وہ اچھائیوں کا حکم دیتے ہیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فریضہ کو بھی پوری طرح انجام دیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء، علماء، صلحاء، مبلغ وداعی حضرات نے تحریر وتقریر سے، اور بڑی بڑی محنتیں کرکے اسفار کی مشقتیں اٹھا کر اس فریضہ کی ادائیگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کی ذمہ داری کو پورا کیا۔ احادیث شریفہ کا مطالعہ کیا جائے تو معروف اور منکر کی تفصیلات پوری طرح معلوم ہوجائیں گی۔ معروفات پر عمل کرنے کے فضائل اور اجر وثواب، اور منکرات کی وعیدیں، اور بُرے کاموں کی سزاؤں کی تفصیل معلوم ہوجائے گی۔ منکرات کی تفصیل کسی قدر ہم نے آیت کریمہ ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ [النساء: ۳۱] کے ذیل میں لکھ دی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محلِّل طیّبات، اور مُحرِّم خبائث ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تیسری صفت یوں بیان فرمائی:

﴿وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ کہ نبی اُمّی ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں، اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اس میں اجمالی طور پر حلال وحرام چیزوں کو بیان فرمادیا، پاکیزہ چیزیں شریعت محمدیہ (عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالتَّحِیَّةُ) میں حلال ہیں، اور خبیث وگندی چیزیں حرام۔ ان کی تفصیلات بہت ہیں، جس شخص کا ذوق صحیح ہو وہ طبعی طور پر ان چیزوں کو پاکیزہ سمجھتا ہے جو حلال قرار دی گئی ہیں، اور ان چیزوں کو گندی اور خبیث سمجھتا ہے جو شریعتِ اسلامیہ میں حرام قرار دی گئی ہیں۔

لَهُمْ کی ضمیر بھی بنی اسرائیل کی طرف راجع ہے۔ اس میں یہ بتایا کہ بعض پاکیزہ چیزیں جو ان کی شریعت میں حرام تھیں ـــــ (جن کا بیان سورۂ نساء کی آیت: ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ﴾

[النساء: ۱۶۰] (یہودیوں کی سنگین زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کردیں) اور سورۂ انعام کی آیت: ﴿عَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ﴾ [الأنعام: ۱۴۶] (اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والے جانور کو حرام کردیا تھا) میں فرمادیا ہے) ـــ ان کے لیے حلال ہوجائیں گی، اسلام قبول کرلیں گے تو شریعت محمدیہ عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلَاةُ وَالتَّحِيَّة اختیار کرنے کی وجہ سے ان پاکیزہ چیزوں کو بھی استعمال کرلیں گے جو ان کی شریعت میں حرام قرار دے دی گئی تھیں۔

نبی اُمّی کا اتباع کرنے سے جہاں راہِ ہدایت پر آنا نصیب ہوگا وہاں پاکیزہ چیزوں کے استعمال سے بھی بہرہ ور ہوں گے۔ شریعتِ اسلامیہ میں جن جانوروں کا کھانا حلال بتلایا ہے، سب جانتے ہیں کہ وہ پاکیزہ چیزیں ہیں، پھر ان میں بھی یہ شرط لگادی ہے کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کیے گئے ہوں، خون نکل گیا ہو، جانور اپنی موت نہ مَرا ہو، یہ سب شرطیں اسی لئے لگائی گئی ہیں کہ پاکیزہ چیز کھائیں، خنزیر، مُردہ جانور، خون، شراب اور ان جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے جو غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیے گئے ہوں، کیوں کہ یہ سب خبیث اور ناپاک ہیں۔

نیز وہ جانور جو درندے ہیں، ان کے کھانے سے بھی منع فرمایا، جیسے شیر، چیتا، کتا، بلّی، شکرہ، بھیڑیا، کیونکہ ان کے کھانے سے انسانوں میں درندگی کی صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔

یاد رہے کہ یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں جن کی طبیعتیں اصل انسانی فطری طبائع کو چھوڑ چکی ہیں، اور وہ اَلا بَلا ہر چیز کھاتے ہیں، اور کوئی بھی چیز ان کے نزدیک خبیث نہیں ہے، جیسے چائنا کے لوگ کہ وہ کسی بھی چیز کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

منکرینِ حدیث کی تردید:

دورِ حاضر میں انکارِ حدیث کا فتنہ بھی اٹھا ہوا ہے۔ یہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حیثیت ماننے کو تیار نہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی ہے۔ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حلال قرار دینے والا، اور حرام قرار دینے والا بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ عہدہ دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے جس چیز کی حلّت کا اعلان ہوگیا وہ حلال ہے، اور جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام فرمایا وہ حرام ہے۔ لیکن منکرینِ حدیث کو یہ گوارا نہیں، ان کو خداوند قدوس پر یہ اعتراض ہے کہ رسول کو صرف چھٹی رساں (ڈاکیہ) کا عہدہ کیوں نہیں دیا؟ اس سے بڑھ کر اس کی حیثیت کیوں بڑھائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ قرآن کی تفہیم وتشریح کیوں کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحریم وتحلیل کا اختیار

کیوں دیا گیا؟ یہ ہیں اپنے خیال میں قرآن کے ماننے اور جاننے والے۔ اللہ تعالیٰ ان ملحدوں کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ فرمائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین میں وہ احکام نہیں جو بوجھ ہوں:

سیدنا محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چوتھی صفت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ کہ وہ ان سے، یعنی اہل کتاب سے وہ احکام ہٹاتے ہیں، جو ان کے لئے بوجھ تھے، اور طوق بنے ہوئے تھے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخر الانبیاء علیہم السلام ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس لیے سابقہ تمام شریعتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے پر منسوخ ہوگئیں، جو بھی کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو قبول کرے گا وہ ان سب سہولتوں اور آسانیوں سے منتفع ہوگا، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری شریعت میں اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ آخر الاُمم کے لیے بھیجی ہیں، اور اس اُمت کو تلقین فرمائی ہے کہ یوں دعا کریں: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ﴾ [البقرۃ: ۲۸۶] (اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے ہم نے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیے جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو)۔ اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول فرمائی، اور آسان شریعت عطا فرما دی۔

یہودیوں کے لیے جو سخت احکام مقرر فرمائے گئے تھے وہ اس شریعت میں نہیں ہیں، اور نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کرلی تھی، جنگلوں میں رہتے تھے، اپنے نفسوں کو تکلیف دیتے تھے، کھانے پینے میں عمدہ چیزوں سے بچتے تھے، وہ سب ہماری شریعت میں نہیں ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے نفسوں پر سختی نہ کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر سختی فرمائے گا، کیونکہ کچھ لوگوں نے اپنے نفسوں پر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی فرمائی۔ یہ ان لوگوں کی باقیات ہیں جو نصاریٰ کے گرجا گھروں میں اور یہودیوں کے عبادت خانوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ [مشکوٰۃ ص: ۳۱ از أبو داؤد]

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں یہودیت اور نصرانیت

دے کر نہیں بھیجا گیا ہوں، لیکن میں ایسا دین لے کر بھیجا گیا ہوں جو گمراہی سے ہٹا ہوا ہے، اور اس پر عمل کرنا آسان ہے۔ [مشکوۃ ص: ۳۳۴ از بخاري]

اور ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ اَلدِّیۡنُ یُسۡرٌ. دین آسان ہے، اس کے احکام پر ہر شخص عمل کرسکتا ہے، اس میں معذوروں کی رعایت رکھی گئی، اور کوئی حکم ایسا نہیں جو طاقت سے باہر ہو، اسی آسانی کی وجہ سے عبادت میں مشقت اٹھانا جو برداشت نہ ہو، مثلاً راتوں رات عبادت کرنا، یا روزانہ روزہ رکھنا، اس سے منع فرمایا۔

تین صحابیوں کا ایک واقعہ:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تین شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے پاس حاضر ہوئے، یہ لوگ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا خانگی حال دریافت کر رہے تھے، جب انہیں بتا دیا گیا تو انہوں نے اُسے کم سمجھا، اور کہنے لگے کہ ہم کہاں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو اللہ نے سب کچھ بخش دیا (ہمیں تو زیادہ محنت کی ضرورت ہے) لہٰذا ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو ہمیشہ راتوں رات نماز پڑھوں گا، اور دوسرے نے کہا کہ میں روزانہ روزہ رکھوں گا، اور تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی بھی نکاح نہیں کروں گا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ ہو جنہوں نے ایسا ایسا کہا؟ خبردار! اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، اور سب سے بڑھ کر پرہیزگار ہوں، لیکن میں (نفلی) روزے رکھتا ہوں، اور بے روزہ بھی رہتا ہوں، اور (رات کو) نماز پڑھتا ہوں، اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، سو جس شخص نے میرے طریقہ سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔ [بخاري]

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں خصّی ہونے کی اجازت دے دیجئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں ہے جو کسی کو خصّی کرے، یا خود خصّی ہو۔ میری اُمت کا خصّی ہونا (یعنی نکاح نہ کرسکنے کی مجبوری میں شہوت کو دبانا) یہ ہے کہ روزے رکھے جائیں۔

عرض کیا: ہمیں سیر وسیاحت کی اجازت دیجئے، فرمایا: میری اُمت کی سیاحت فی سبیل اللہ جہاد کرنا ہے، عرض کیا: ہمیں رہبانیت اختیار کرنے کی اجازت دیجئے، فرمایا: میری اُمت کی رہبانیت یہ ہے کہ نماز کے انتظار میں مسجد میں بیٹھے رہیں۔ [مشکوۃ المصابیح: ۶۹]

﴿فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَکَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوۡهُ﴾ یعنی جب سارے

جہاں کے لئے، جن وانس کے لئے، تابقیامت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول و نبی ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کے علاوہ نہ نجات ہے، اور نہ ہی ہدایت، سارے راستے مسدود ہو گئے، سوائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے کے، جو صراطِ مستقیم ہے۔

بمصطفیٰ برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست ☆ وگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰىٓ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ
وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا
عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ
وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ
اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ
سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓــٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ
الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ: اور موسیٰ کی قوم میں ایک ایسی جماعت ہے جو حق کی ہدایت دیتی ہے، اور اسی کے موافق انصاف
کرتی ہے ﴿۱۵۹﴾ اور ہم نے ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر کے الگ الگ جماعتیں بنا دیا، اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی
بھیجی، جب ان کی قوم نے پانی مانگا، کہ اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو، سو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر قبیلہ نے
اپنے پانی پینے کی جگہ جان لی، اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا، اور ان پر مَن اور سلویٰ اُتارا، کھاؤ پاکیزہ چیزیں، اس
رزق میں سے جو ہم نے تمہیں دیا، اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، لیکن اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۰﴾ اور جب ان
سے کہا گیا کہ سکونت کرو اس بستی میں، اور کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو، اور کہو کہ ہمارے گناہ معاف ہوں، اور
بستی کے دروازہ میں جھکے ہوئے داخل ہو جاؤ، ہم بخش دیں گے تمہاری خطاؤں کو، ہم عنقریب اچھے کام کرنے والوں کو
اور زیادہ دیں گے ﴿۱۶۱﴾ اور ان میں سے جنہوں نے ظلم کیا اس قول کو بدل دیا، اس قول کے علاوہ جو ان سے کہا گیا، سو ہم
نے ان پر عذاب بھیج دیا، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے تھے ﴿۱۶۲﴾

معارف ومنازل

بنی اسرائیل میں کچھ اچھے لوگ بھی موجود تھے:

پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے کچھ اچھے اور ہدایت یافتہ لوگوں کی تعریف فرمائی، جنہوں نے اس زمانے میں توریت اور انجیل پر عمل کیا، جب ان کتابوں پر عمل کرنے کا حکم تھا، اور منسوخ نہیں کی گئی تھیں۔ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انہوں نے توریت وانجیل میں بیان فرمودہ علامت وصفت سے پہچان لیا، تو بغیر کسی تامل کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے، اور عامل بالقرآن ہو گئے۔ پھر دوسروں کو بھی دعوت دیتے رہے، اور اسی کے موافق فیصلے کرتے رہے۔ وہ لوگ کج فہمی، ضد وعناد کو چھوڑ کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شیدائی بنے، اور خوب جان نثاری پر ڈٹے رہے۔

انہی لوگوں کے بارے میں سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے: ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۱۳] (سارے اہل کتاب ایک جیسے نہیں، ان میں سے ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر، وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو رات کے وقت پڑھتے ہیں، اور سجدہ کرتے ہیں)۔ اسی طرح سورۂ قصص میں ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ﴾ [القصص: ۵۳] (اور جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے بلاشبہ یہ حق ہے ہمارے ربّ کا بھیجا ہوا، ہم اس کے پہلے حکم بردار ہیں)۔

روح پرور حکایت:

علامہ بغوی، علامہ ابن جریر طبری، اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ نے اس جگہ ایک عجیب حکایت نقل کی ہے کہ اس جماعت سے وہ جماعت مراد ہے جو بنی اسرائیل کی گمراہی اور بداعمالی، قتل انبیاء علیہم السلام وغیرہ جرائم سے تنگ آکر ان سے الگ ہو گئی تھی۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا، جس نے اپنی قوم کی بداعمالیوں اور گناہوں سے تنگ آکر یہ دعا کی کہ اے اللہ! ہمیں ان لوگوں سے دور کہیں اور بسا دیجئے، تاکہ ہم اپنے دین پر پختگی سے عمل کرتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کو ڈیڑھ سال کی مسافت پر مشرقِ بعید کی کسی زمین پر پہنچا دیا، جہاں

وہ خالص عبادت میں مشغول رہے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد بھی نیرنگِ قدرت سے ان کے مسلمان ہونے کا یہ سامان ہوا کہ شبِ معراج میں حضرت جبرئیل امین علیہ السلام سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرف ان کے پاس لے گئے، وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو قرآن کریم کی کچھ سورتیں پڑھائیں، اور ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے پاس ناپ وتول کا کوئی انتظام ہے؟ اور تم لوگوں کے معاش کا کیا سامان ہے؟

انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں گندم غلّہ کاشت کرتے ہیں، جب تیار ہو جاتا ہے تو کاٹ کر وہیں ڈھیر لگا دیتے ہیں، ہر شخص کو جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں سے لے آتا ہے، ناپنے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کیا تم میں کوئی شخص کبھی جھوٹ بھی بولتا ہے؟ عرض کیا کہ نہیں، کیونکہ اگر کوئی ایسا کرے تو فوراً اوپر سے ایک آگ آ کر اسے جلا دیتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم سب کے مکانات بالکل یکساں کیوں ہیں؟ عرض کیا، اس لئے کہ کسی کو کسی پر بڑائی جتلانے کا موقع نہ ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر دریافت فرمایا کہ تم نے اپنے مکانات کے سامنے اپنی قبریں کیوں بنا رکھی ہیں؟ عرض کیا کہ تاکہ ہمیشہ موت مستحضر رہے، اور گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ پھر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب معراج سے واپس مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہ آیت بالا نازل ہوئی:

﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ ......﴾ [الآیہ]

تفسیر قرطبی نے اسی روایت کو اصل قرار دیا ہے، اور دوسرے احتمالات بھی لکھے ہیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو حکایتِ عجیبہ تو فرمایا، مگر رد نہیں کیا (حالانکہ وہ اس معاملہ میں بڑے متشدد ہیں، اور بے بنیاد اسرائیلیات کے دشمن ہیں)۔ بہر حال! اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ایک پاکباز جماعت ایسی ہے جو ہمیشہ حق پر قائم رہی ہے، خواہ وہ لوگ ہوں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی خبر پا کر مشرف باسلام ہو گئے، یا وہ بنی اسرائیل کا بارہواں قبیلہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ شانہ نے زمین کے کسی خاص حصہ میں رکھا ہوا ہے، جہاں دوسروں کی رسائی نہیں، جیسے سد ذوالقرنین۔

میرے خیال میں ﴿اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ سے مراد چند افراد متعین کرنا، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دو تین دیگر حضرات جن کی تعداد دس افراد سے بھی کم ہے، یہ قرینِ قیاس نہ ہوگا۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ لوگ بکثرت ہوں، جن میں بنی اسرائیل کا بارہواں قبیلہ مکمل شامل ہو تو بہتر ہوگا۔ واللہ اعلم

﴿وَقَطَّعۡنٰهُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَةَ اَسۡبَاطًا ...﴾ اس میں بنی اسرائیل کے قبیلوں کی تعداد کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کے بارہ خاندانوں کے الگ الگ قبیلے بنا دیئے تھے۔ اَسۡبَاط سبط کی جمع ہے، سبط لڑکے کو کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے، ہر ہر لڑکے کی اولاد ایک ایک قبیلہ کہلائی، اس طرح یہ بارہ قبیلے بنے۔

اس کے بعد ان انعامات ونوازشات کا تذکرہ فرمایا جو بنی اسرائیل پر چالیس سال کے عرصے میں میدانِ تیہ میں برسائے گئے تھے، جب یہ لوگ مصر سے نکلے، اور سمندر پار کیا تو انہیں اپنے وطن فلسطین پہنچنا تھا، لیکن اپنی شرارتوں، نافرمانیوں اور احکامِ الٰہی کی خلاف ورزیوں کی وجہ سے چالیس سال تک میدانِ تیہ میں ہی ٹھوکریں کھاتے ہوئے گھومتے رہے۔ فرمایا: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیۡهِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَةً یَتِیۡهُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ﴾ [المائدة:۲۶] (وہ سرزمین ان پر چالیس سال تک حرام کردی گئی ہے، یہ زمین میں بھٹکتے پھریں گے)۔

اس صحرائی زندگی اور گردش کی وجہ سے بہت پریشان رہے، جب کوئی تکلیف آتی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتے تھے کہ اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ اسی میدان میں پانی کی ضرورت انہیں پیش آئی، تو موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں آئے، اور پانی کا مطالبہ پیش کیا، پس اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کا حکم ہوا کہ اے موسیٰ! پتھر پر اپنی لاٹھی مارو، انہوں نے پتھر پر لاٹھی ماری تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ ہر ہر قبیلہ نے اپنے پینے کی جگہ کو پہچان لیا، اور پانی لے لیا، ضرورتیں پوری کرلیں۔

مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے لکھا ہے کہ یہ ایک خاص قسم کا پتھر تھا، جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے پاس تھیلے میں رکھتے تھے، جب پانی کی ضرورت ہوتی تھی، اس پر لاٹھی مارتے تھے، جس میں سے پانی نکلنے لگتا تھا۔ انہیں انعامات میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک انعام یہ عطاء فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نے گرمی سے محفوظ ہونے کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل بھیج دیئے۔ اسی کو فرمایا:

﴿وَظَلَّلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡغَمَامَ﴾ اور ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا۔

اور تیسرا انعام یہ ہوا کہ ان کے کھانے کے لئے مَن اور سَلویٰ، بٹیروں جیسے پرندے بڑی تعداد میں بھیج دیئے۔ یہ لوگ بڑی فراخی اور آرام سے دن رات یہ کھاتے رہتے تھے۔ اسی کو فرمایا:

﴿وَاَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهِمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی﴾ اور ان پر مَن اور سَلویٰ اُتارا۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے پاکیزہ اور عمدہ چیزیں کھاؤ،

اور حکمِ عدولی اور ذخیرہ کرنے سے بچو، مگر انہوں نے حکمِ عدولی اور نعمتوں کی ناشکری کی، انہیں جو حکم ہوا کہ آئندہ وقت کے لئے ذخیرہ نہ کرو، لیکن وہ نہ مانے، اور خلاف ورزی کی، اور ناشکری یوں کی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ایک ہی قسم کے کھانے پر ہم سے صبر نہیں ہوتا۔ فرمایا: ﴿لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ﴾ [البقرة: ۶۱] (ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے)۔

انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمیں سبزیاں، ککڑی، کھیرے، پیاز، لہسن اور مسور چاہئے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور یوں فرمایا کہ: کیا تم اچھی چیزوں کو چھوڑ کر گھٹیا چیزیں لینا چاہتے ہو؟ تفصیل سورۂ بقرہ رکوع ۶ میں، اور ۷ میں دیکھیں۔

ان ناشکرے، ناقدرے لوگوں نے جو جو حرکتیں کیں، ان کی سزا پائی، اسی کو فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمُوۡنَا﴾ انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا، لیکن انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ﴿ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ۶۱] یعنی ڈالی گئی ان پر ذلّت وخواری اور محتاجی، اور پھرے اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر۔

ع نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

بستی میں داخل ہونے کا حکم، اور بنی اسرائیل کی نافرمانی:

﴿وَاِذۡ قِيۡلَ لَهُمُ اسۡكُنُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ﴾ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں حکم ہوا کہ اس بستی میں خشوع وعاجزی کے ساتھ، جھکے ہوئے، اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔ ان ظالموں نے قولاً و عملاً استہزاء کرتے ہوئے نافرمانی کی، اور اس بات کو بدل دیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔

عملاً تو یہ کیا کہ بجائے جھکے ہوئے داخل ہونے کے بچوں کی طرح گھسٹتے ہوئے سرین کے بل داخل ہوئے، جس میں ایک طرح کا استہزاء ہے۔ اور معافی مانگنے کا جو حکم ہوا تھا اس کی خلاف ورزی یوں کی کہ حِطَّةٌ کی جگہ حَبَّةٌ فِي شَعِيرَةٍ کہتے ہوئے داخل ہوئے۔

بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ اس بستی سے بیت المقدس مراد ہے۔ اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس سے "اریحا" کی بستی مراد ہے۔ مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ پہلا قول ہی صحیح ہے، کیونکہ یہ لوگ مصر سے آکر اپنے علاقہ ارض مقدس میں جا رہے تھے، اور اریحا ان کے راستہ میں نہیں پڑتا۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ واقعہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا نہیں ہے، بلکہ چالیس سال میدانِ تیہ میں حیران وسرگردان پھرنے کے بعد جب حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس جانا نصیب ہوا، اس وقت کی بات ہے۔ جب بنی اسرائیلوں نے حکم کی خلاف ورزی کی، تو اللہ نے ان پر عذاب بھیج دیا، جسے ﴿رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ سے تعبیر فرمایا۔ سورۂ بقرہ میں ﴿بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ﴾ [البقرة: ۵۹] (بسبب اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے) فرمایا، اور یہاں سورۂ اعراف میں ﴿بِمَا كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ﴾ (بسبب اس کے کہ وہ ظلم کرتے تھے) فرمایا۔

یعنی یہ عذاب ان کی نافرمانیوں، اور ان کے ظلم کی وجہ سے بھیجا گیا، اللہ تعالیٰ جل شانہ کے احکام کی خلاف ورزی نتیجہ کے اعتبار سے اپنی جانوں پر ظلم ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے گرفت ہوجاتی ہے۔

حضرات مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں پر جو عذاب بھیجا گیا تھا وہ طاعون تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے، فرمایا: اَلطَّاعُون رِجۡز عَذَاب عُذِّبَ بِهِ مَنۡ كَانَ قَبۡلَكُمۡ.
یعنی طاعون رِجز ہے، جو عذاب ہے، اس کے ذریعہ تم سے پہلی اُمتوں کو عذاب دیا گیا۔

فائدہ:

مَن وسَلویٰ اترنے، اور پتھر سے چشمے پھوٹنے، اور بادلوں سے سایہ کا، بلکہ راتوں کو ایک مینارۂ نور کے ذریعہ روشنی کا، اور بستی میں جھکے ہوئے داخل ہونے کا، اور معافی مانگنے کا حکم، پھر اس ظالم قوم کی سرکشی، اور قولاً وفعلاً استہزاء اور نافرمانوں کی تفصیل سورۂ بقرہ میں لکھ چکے ہیں، اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ‌ۘ اِذۡ يَعۡدُوۡنَ فِى السَّبۡتِ اِذۡ تَاۡتِيۡهِمۡ حِيۡتَانُهُمۡ يَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا وَّيَوۡمَ لَا يَسۡبِتُوۡنَ‌ۙ لَا تَاۡتِيۡهِمۡ‌ ۛۚ كَذٰلِكَ‌ ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾ وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّةٌ مِّنۡهُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰهُ مُهۡلِكُهُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا‌ ؕ قَالُوۡا مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾ فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُكِّرُوۡا بِهٖۤ اَنۡجَيۡنَا الَّذِيۡنَ يَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ وَاَخَذۡنَا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۢ بَـئِيۡسٍۢ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوۡا عَنۡ مَّا نُهُوۡا عَنۡهُ قُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـئِيۡنَ ﴿۱۶۶﴾

ترجمہ: اور آپ اس بستی کے بارے میں ان سے پوچھ لیں جو دریا کے قریب آباد تھی، جبکہ وہ لوگ ہفتہ

کے دن میں زیادتی کرتے تھے، جبکہ ان کے پاس ان کی مچھلیاں ہفتہ کے دن اوپر کو ظاہر ہو کر آتی تھیں، اور جس دن ہفتہ کا دن نہ ہوتا، اس دن ان کے پاس نہ آتی تھیں، اسی طرح ہم انہیں آزماتے تھے، اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۱۶۳﴾ اور جب ان میں سے ایک جماعت نے کہا کہ ایسی قوم کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک فرمانے والا ہے، یا انہیں عذاب دینے والا ہے، سخت عذاب؟ انہوں نے کہا کہ تمہارے ربّ کے حضور معذرت پیش کرنے کے لئے، اور اس لئے کہ شاید یہ لوگ گناہ سے بچ جائیں ﴿۱۶۴﴾ سو جب وہ لوگ بھول گئے اس بات کو جس کے ذریعہ ان کو نصیحت کی گئی تھی، تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو برائی سے روکتے تھے، اور ہم نے سخت عذاب کے ذریعہ ان لوگوں کو پکڑ لیا جنہوں نے ظلم کیا، اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۱۶۵﴾ پھر جب اس کام کے بارے میں وہ حد سے نکل گئے جس سے منع کئے گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ تم ہو جاؤ بندر ذلیل ﴿۱۶۶﴾

معارف ومنازل

مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن مقدّس ہے، جس کے بڑے فضائل اور کرامات کا بیان اپنے موقع پر آئے گا، اِن شاءاللہ تعالیٰ۔ اسی طرح یہود کے لئے ہفتہ، اور نصاریٰ کے لئے اتوار کا دن مقدّس ہے۔ بنی اسرائیل کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کا دن آرام اور عبادت کے لئے مخصوص رکھیں، اس میں دکانداری، تجارت، زراعت اور ہر قسم کے دنیوی کاروبار سے اجتناب کریں، حتی کہ کھانا پکانا بھی خود نہ کریں، بلکہ خادموں سے کرائیں، اگر کوئی اس فرمانِ الٰہی کے خلاف کرے تو وہ واجب القتل ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی حیات میں کم وبیش اس پر عمل ہوتا رہا، اگر کہیں خلاف ورزی ہوئی جیسے کہ دیگر احکام کی بھی خلاف ورزی ہوتی رہی، مگر کوئی سخت عذاب نہیں آیا۔ جب بنی اسرائیل پر انحطاط کا دور آیا، تو وہ قصدًا علی الِاعلان اس حکم کو بھی پامال کرنے لگے، اور ہفتہ کے روز کھلم کھلا سب کچھ کرنے لگے، زراعت، تجارت وغیرہ کرتے رہتے تھے، بغیر کسی روک ٹوک کے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے سیکڑوں سال بعد حضرت داؤد علیہ السّلام کے زمانہ میں سمندر کے کنارے ملک شام کی ایک بستی ایلہ میں مچھلی کے شکار کے لئے یہ حیلہ کیا گیا کہ ہفتہ کے روز حوضوں تالابوں میں آنے والے نالوں کے منہ کھول دیتے تھے، جب سمندر کی مچھلیاں ان میں آجاتیں، تو ان کی سمندر میں واپسی کا راستہ بند کرتے تھے، اور

اتوار کے روز ان کا شکار کرتے، اور پکڑ لیتے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم سنا کر سختی سے منع فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگ اپنی بُری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے، تو اللہ کی گرفت میں آجاؤ گے، چنانچہ آپ علیہ السلام کی تبلیغ سے بہت سے لوگ اس عمل سے تائب ہوئے، اور دوسروں کو بھی روکنا شروع کیا۔ دوسرا گروہ فاسقین کا تھا، جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور بُرائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا، مگر دوسروں کو روکتا بھی نہ تھا، یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عامل نہ تھا، قرآن حکیم نے سورۃ الأعراف میں تینوں گروہوں کا تذکرہ اور انجام بیان فرمایا ہے، کہ جب عذاب آیا تو صرف پہلا (صالحین) گروہ نجات پا گیا، باقی دونوں گروہ عذاب کے لپیٹ میں آ گئے۔ مجرم گروہ نافرمانی کی وجہ سے، اور دوسرا گروہ نہی عن المنکر کے فریضہ کے ترک کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہوگیا۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أَهْلَ الْعِلْمِ وَيَا أَهْلَ الْقُرْآن.

مختصر واقعہ یہ کہ پہلے صالحین کے گروہ نے سوچا کہ ہم ان نافرمانوں کے ساتھ کب تک ایک محلہ میں گزارہ کریں گے، کیوں نہ ہم ان سے الگ ہوجائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے، اور ہم بھی اس میں تباہ ہوجائیں، چنانچہ انہوں نے باقی دونوں گروہوں کا بائیکاٹ کردیا، اور قریب ہی اپنے علیحدہ علاقے میں منتقل ہوگئے، ان دونوں علاقوں کے درمیان کوئی بڑی دیوار حائل تھی، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے، البتہ ایک دوسرے کی آوازیں صبح وشام سنتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ صالحین کے گروہ نے دوسرے گروہ کے کسی آدمی کی آواز نہ سنی، اور نہ ہی ان کی کوئی حرکت وغیرہ محسوس کی، کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انہوں نے دیوار سے جھانک کر دیکھا، تو اللہ تعالیٰ کا حکم آچکا تھا، ﴿قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ﴾ پس ہم نے کہا کہ تم سب ذلیل ہو کر بندر بن جاؤ۔ چنانچہ صالحین نے دیکھا کہ اس گروہ کے بڑے بوڑھے مرد وعورت خنزیروں کی شکل میں، اور نوجوان طبقہ (مرد وعورت) بندروں کی صورت میں مسخ ہوچکے ہیں۔ شکلیں تبدیل ہوچکی ہیں، مگر شعور باقی ہے۔ اپنے عمل پر نادم اور پشیمان ہیں، اور زار وقطار رو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارے فلاں رشتہ دار ہیں، فلاں بھائی، یہ فلاں رشتہ دار ہے۔

اس مقام پر صرف بندروں کا ذکر ہے، دوسرے مقام پر خنزیروں کا تذکرہ ہے: ﴿فَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ﴾ [المائدۃ: ۶۰] (ان میں سے لوگوں کو بندر اور سور بنادیا)۔

پس یہ لوگ اس شکل وصورت میں صرف تین روز زندہ رہے، اس کے بعد سارے ہلاک ہوگئے، تقریباً ستر

ہزار کے لگ بھگ تھے۔ اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے: نافرماں اور فرمانبردار، نافرمانوں کے لئے تو اس کو نَکَال، اور فرمانبرداروں کے لئے مَوْعِظَة فرمایا گیا ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

ترجمہ: اور آپ کے ربّ نے یہ بات بتادی کہ وہ قیامت کے دن تک ضرور ان پر ایسے اشخاص کو بھیجتا رہے گا جو انہیں بُرا عذاب چکھائیں گے، بیشک تیرا ربّ جلد سزا دینے والا ہے، اور بیشک وہ بخشنے والا، مہربان ہے ﴿۱۶۷﴾

معارف ومنازل

بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کے شکنجہ میں:

فرمایا: وہ وقت یاد کرو جب آپ کے ربّ نے بتادیا تھا کہ وہ ان یہودیوں پر آج سے قیامت کے قریب تک ایسے لوگوں کو مسلّط کرتا رہے گا جو ان کو ﴿سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ یعنی سخت سے سخت عذاب پہنچائیں گے، یعنی وہ قید، قتل جزیہ، وغیرہ مصیبتوں میں مبتلا رہیں گے۔ چنانچہ ان کی نافرمانیوں، اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے انحراف اور بغاوت کے سبب وہ مقہور ومحکوم رہے، اور قیامت تک رہیں گے۔

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو مسلّط فرمایا، پھر جابر اور ظالم بخت نصر کو ان پر مسلّط فرمایا۔ بخت نصر نے ان کی بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ان کے جوانوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کیا، عورتوں اور بچوں کو باندی اور غلام بنایا، جو باقی رہے ان پر بھاری جرمانہ اور ٹیکس مقرر کیا۔ چنانچہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تک وہ مجوسیوں کے غلام اور ماتحت رہے، اور انہیں جزیہ دیتے رہے۔ اسی طرح سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کو قتل کرایا، اور ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا، اور بنی نضیر و بنی قینقاع کو مدینہ سے جلاوطن کیا۔ یہ سب کچھ حق تعالیٰ شانہ کے حکم سے ہوا۔

پھر امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خیبر اور فدک سے بھی ان کو نکال باہر کیا، پھر وہ مسلمان حکمرانوں کے

باج گزار و تابع رہے، یہاں تک کہ نازیوں نے ان کا قتل عام کیا، اب قیامت تک وہ دوسروں کے محتاج، ذلیل اور دست نگر رہیں گے۔ آئندہ آیت کے ضمن میں مزید تفصیل آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

ترجمہ: اور ہم نے زمین میں ان کی متفرق جماعتیں کر دیں، ان میں نیک لوگ تھے، اور ان میں دوسری طرح کے بھی تھے، اور ہم نے ان کو خوشحالیوں اور بدحالیوں سے آزمایا، تا کہ باز آجائیں ﴿۱۶۸﴾

معارف و منازل

اس آیت کریمہ میں یہودیوں پر ایک اور عذاب کا ذکر ہے، جو اسی دنیا میں ان کو دیا گیا، وہ یہ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر اور متفرق ہو گئی، انہیں ایک جگہ رہنے اور بسنے کی نعمت نصیب نہیں ہوئی، اور کسی جگہ ایک ملک میں ان کا اجتماع نہ رہا۔ ﴿وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا﴾ کا یہی مطلب ہے۔ یہ تَقْطِيع سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں: ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہود کی قوم کے ٹکڑے ٹکڑے زمین کے مختلف حصوں میں متفرق اور منتشر کر دیئے۔

کسی قوم کا منتشر ہونا ایک گونہ عذابِ الٰہی ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اور اکثریت خداوند قدوس کا انعام اور احسان ہے، اور اس کا مختلف جگہوں میں منتشر و متفرق ہو جانا ایک طرح کا عذابِ الٰہی ہے۔ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ انعام ہمیشہ رہا ہے، اور ان شاء اللہ تا قیامت رہے گا کہ وہ جس جگہ رہیں ان کی ایک زبردست اجتماعی قوت وہاں پیدا ہو گئی۔ مدینہ طیبہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا، اور مشرق و مغرب میں اسی کیفیت کے ساتھ حیرت انگیز طریقہ پر پھیلا۔ مشرقِ بعید میں پاکستان، بنگلہ دیش اور افغانستان، ملائیشیاء، انڈونیشیا وغیرہ مستقل اسلامی حکومتیں اسی کے نتیجہ میں بنیں۔

اس کے بالمقابل یہودیوں کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ وہ مختلف ملکوں میں منتشر رہے، مالدار کتنے بھی ہوں مگر اقتدار و اختیار سے محروم رہے۔ چند سال پہلے فلسطین کے ایک حصہ میں ان کے اجتماع اور مصنوعی اقتدار سے دھوکہ نہ

کھایا جائے، اجتماع تو ان کا اس جگہ میں آخری زمانہ میں ہونا ہی چاہئے تھا، کیونکہ صادق ومصدوق سرورِ عالم ﷺ کی احادیثِ صحیحہ میں قربِ قیامت کے لئے یہ خبر دی گئی ہے کہ آخری زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، نصاریٰ سب مسلمان ہو جائیں گے، اور یہودیوں سے جہاد کر کے انہیں قتل کردیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا مجرم وارنٹ اور پولیس کے ذریعہ پکڑ کر نہیں بلایا جاتا، بلکہ وہ تکوینی اسباب ایسے جمع کر دیتے ہیں کہ مجرم اپنے پاؤں چل کر، ہزاروں کوششیں کر کے اپنی قتل گاہ پر پہنچتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں سے نزول ملک شام اور دمشق میں ہونے والا ہے، یہودیوں کے ساتھ معرکہ بھی یہیں ہوگا تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کا قلع قمع کرنا آسان ہو۔ قدرت نے دنیا کی پوری عمر میں تو یہودیوں کو مختلف ملکوں میں منتشر رکھ کر محکومیت اور ذلّت کا عذاب چکھایا، اور آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سہولت کے لئے ان کو ایک مقتل میں جمع فرمایا، اس لئے یہودیوں کا یہ اجتماع ان کے انتشار والے عذاب کے منافی نہیں۔

اسرائیل کی حکومت مستقل یہودیوں کی مملکت نہیں:

یہودیوں کی موجودہ حکومت مصنوعی اقتدار کا ایک ناتمام شوشہ ہے، بلکہ یہ ایک مصنوعی دھوکہ ہے، جس پر آج کی مہذب دنیا نے اگرچہ بہت خوبصورت ملمع سازی کا پردہ چڑھایا ہوا ہے، لیکن کوئی دنیا کی سیاست سے باخبر انسان ایک منٹ کے لئے بھی اس سے دھوکہ نہیں کھا سکتا، کیونکہ آج جس خطہ کو اسرائیلی مملکت کا نام دیا جا رہا ہے وہ درحقیت عالمِ اسلام کے خلاف روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی ایک مشترکہ چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، وہ محض ان حکومتوں کی امداد سے زندہ ہے، اور ان کے تابعِ فرمان رہنے ہی میں اس کے وجود کا راز مضمر ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حقیقی غلامی کو مجازی حکومت کا نام دینے سے اس قوم کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں تاقیامت رسوائی اور خواری کے جس عذاب کا ذکر کیا ہے، وہ آج بھی بدستور موجود ہے، جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ...﴾ یعنی جب آپ کے ربّ نے پختہ ارادہ کرلیا کہ ان یہودیوں پر کسی ایسی طاقت کو قیامت تک مسلّط کردے گا، جو ان کو بُرا عذاب چکھائے، جیسا کہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے، پھر بخت نصر کے ذریعہ وغیرہ۔

﴿مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ یعنی ان لوگوں میں کچھ لوگ نیک ہیں، اور کچھ دوسری طرح

کے، یعنی بدکار و فجار لوگ ہیں۔ نیک لوگ وہی ہیں جنہوں نے تورات پر عمل کیا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، اور پھر نزولِ قرآن کے بعد قرآن کے تابع ہو گئے، اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ اسی طرح وہ دوہرے اجر و ثواب کے حقدار ہو گئے۔ اور ان کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ تورات پر عمل کیا، اور نہ انجیل پر، اور نہ ہی قرآن کریم پر، اس کے علاوہ وہ تورات میں بھی تحریف کر چھوڑے۔

﴿وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ اور ہم نے ان کی آزمائش کی، انہیں خوشحالیوں میں بھی رکھا، اور بدحالیوں میں بھی رکھا۔ انسان کی فرمانبرداری یا سرکشی کا امتحان لینے کے دو ہی طریقے ہیں، ان پر دونوں استعمال کر لئے گئے، مگر قوم یہود دونوں امتحانوں میں فیل ہو گئی، کیونکہ انہوں نے نعمتوں کے شکر تو کیا الٹا ناشکری اور تکذیب کی، اور تکالیف و مصائب پر بجائے صبر کرنے کے ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ [آل عمران: ۱۸۱] (اللہ فقیر ہے (العیاذ باللہ) اور ہم مالدار ہیں)۔ اور اسی طرح ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ [المائدۃ: ۶۴] (اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) جیسے کفری کلمات کہتے رہے، اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، اور ان کے قتل کے مرتکب ہوئے، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوئے۔

اسی بنیاد پر وہ مبغوض و ملعون قرار پائے، اور دنیا کے مختلف ملکوں میں منتشر ہوئے، انہیں اجتماعیت کی نعمت نصیب نہیں ہوئی، اور ذلت و خواری میں مسکنت و محتاجی میں ڈالے گئے، اور مستقل اقتدار سے محروم ہوئے۔

...... ❁ ...... ❁ ...... ❁ ......

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ
يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ
دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ
وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آ گئے، جو کتاب کے وارث بنے، جو اس گھٹیا چیز کے سامان کو لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عنقریب ہماری مغفرت کر دی جائے گی، اور اگر ان کے پاس اسی جیسا اور سامان آ جائے تو اسے

لے لیتے ہیں، کیا ان سے کتاب کا یہ عہد نہیں لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف حق کے سوا کسی بات کی نسبت نہ کرو؟ اور انہوں نے اس کو پڑھ لیا جو کتاب میں ہے، اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو ڈرتے ہیں، تم سمجھ نہیں رکھتے؟ ﴿۱۶۹﴾ اور جو لوگ مضبوطی سے کتاب کو پکڑتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، بیشک اصلاح کرنے والوں کا ثواب اللہ تعالیٰ شانہ ضائع نہیں فرماتا ﴿۱۷۰﴾ اور جب ہم نے ان پر اکھاڑ دیا پہاڑ، گویا کہ وہ سائبان ہے، اور انہوں نے یقین کرلیا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے، جو ہم نے تمہیں دیا اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، اور اس میں جو کچھ ہے یاد کرو تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو ﴿۱۷۱﴾

معارف ومنازل

ہمارے پیشوا، سید کائنات، فخر موجودات، رحمۃ للعلمین، محمد ﷺ جب اس فانی جہاں سے عالمِ بقاء کی طرف تشریف لے گئے تو اُمت کی سیادت وقیادت آپ ﷺ کے عظیم وبرحق خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں میں آئی۔ سیدنا صدیق اکبر، سیدنا فاروق اعظم، سیدنا عثمان غنی، سیدنا علی مرتضیٰ رِضوَانُ اللهِ عَلَيهِم نے کتاب وسنت کی روشنی میں اُمت کی وہ بے مثال اور تاریخی رہنمائی اور نگرانی فرمائی جس کی نظیر اقوامِ عالم (گزشتہ اور آئندہ) میں ملنی مشکل ہے۔

ایک مختصر عرصہ میں آدھے عالم پر اسلام کا پرچم لہرا کر پورے عالم کو عدل وانصاف، تقویٰ ودیانت، صدق وامانت سے بھر دیا، جس کے اثرات اور فیوض وبرکات چودہ سو سال گزرنے کے بعد آج بھی کائنات کے اکناف واطراف میں روزِ روشن کی طرح درخشاں اور تاباں نظر آرہے ہیں۔ اسی بناء پر آپ ﷺ کے جانشینوں کو خلفاء راشدین اور ائمہ ربانیین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

دنیا اپنی شان وشوکت، مال وثروت کے ساتھ ان کے قدموں پر سجدہ ریز ہوئی، مگر فیض یافتگانِ نبوت نے اس کی طرف توجہ والتفات تک گوارا نہ کیا۔ خلافت کی چوکھٹ پر قدم رکھتے وقت یہ حضرات مالدار وسرمایہ دار تھے، اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت فقراء ونادار تھے۔ رَضِيَ اللهُ عَنهُم

آیت بالا میں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کے نالائق، دنیا پرست، مذہب فروش اُحبار ورُہبان کی تصویر وخلافت کی ایک جھلک کا ذکر ہے، جنہوں نے مذہب اور تورات شریف کے احکام کو حُطامِ دنیا کے عوض فروخت

کیا، اور احکامِ الٰہی میں مَن مانی تحریف کی۔ فرمایا:

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ﴾ پھر ان کے بعد بُرے جانشین آئے، جو توریت شریف کے وارث ہوئے۔ یعنی توریت کے عالم کہلائے، لیکن حالت یہ ہوئی کہ علمِ دین اور دینی اقدار کو فرخت کرنے لگے۔

﴿يَأۡخُذُونَ عَرَضَ هَٰذَا ٱلۡأَدۡنَىٰ﴾ کہ اس حقیر اور خسیس دنیا کا مال ومتاع حاصل کرتے ہیں۔ یعنی لوگوں سے رشوت لے کر ان کی خاطر احکامِ الٰہی میں تبدیلی اور خود ساختہ آسانی کرتے ہیں۔ اس سے زمانۂ رسالت کے علماءِ یہود مراد ہیں، جنہوں نے تورات میں آپ ﷺ کی صفات کمالات کو دیکھنے کے باوجود چھپایا، اور انکار کیا، ﴿يَعۡرِفُونَهُۥ كَمَا يَعۡرِفُونَ أَبۡنَآءَهُمۡ وَإِنَّ فَرِيقٗا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُونَ ٱلۡحَقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ﴾[البقرة:١٤٦] (آپ ﷺ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور ان میں ایک گروہ حق کو چھپاتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں)۔

پھر ان کی دلیری اور ہٹ دھرمی کا یہ حال ہے:

﴿وَيَقُولُونَ سَيُغۡفَرُ لَنَا﴾ کہتے ہیں کہ عنقریب ہماری مغفرت ہو جائے گی، اور ہمارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ ان کا گمان فاسد یہی رہا کہ ہم لوگ ﴿أَبۡنَٰٓؤُاْ ٱللَّهِ وَأَحِبَّٰٓؤُهُۥ﴾[المائدة:١٨] (اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب) کے منصب پر فائز ہیں۔

﴿وَإِن يَأۡتِهِمۡ عَرَضٞ مِّثۡلُهُۥ يَأۡخُذُوهُ﴾ رشوت کو حرام جانتے ہوئے پھر ان کا حال یہ تھا کہ اگر ان کے پاس پھر اسی قسم کا حرام مال آجائے تو اس کو بھی بے دھڑک لے لیں گے۔ مطلب یہ کہ وہ گناہ پر بڑے دلیر ہیں، اور کبھی حرام کے چھوڑنے پر تیار نہیں۔

﴿أَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِم مِّيثَٰقُ ٱلۡكِتَٰبِ﴾ کیا ان رشوت لینے والوں سے کتاب (تورات) میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سوائے حق کے کوئی بات منسوب نہ کریں، اور یہ لوگ رات دن اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں، اور منگھڑت اور خود ساختہ باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے نہیں شرماتے، اور اللہ تعالیٰ پر ہر قسم کے بہتان باندھتے ہیں۔

﴿وَدَرَسُواْ مَا فِيهِ﴾ حالانکہ ان لوگوں نے اس مضمون کو پڑھا بھی ہے جو تورات میں لکھا ہوا ہے، اور وہ خوب جانتے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کمی بیشی اور تحریف صریح کفر ہے۔ اور جانتے ہوئے گناہ کرنا، اور گناہ کو

حقیر سمجھنا، اور اس جرم کو پیشہ کے طور پر اختیار کرنا، اور اس کی مغفرت کا حوالہ دینا، یہ سارے کفریہ اعمال ہیں، اور گناہ کبیرہ بھی۔ یہ سب کچھ دنیا کی خاطر کر رہے تھے، حالانکہ:

﴿وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ دار آخرت کا ثواب وصلہ ان لوگوں کے لئے جو حرام سے بچتے ہیں، اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، دنیائے فانی کے مال ومتاع سے کہیں بہتر ہے، کیا تم لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ دنیا چار روزہ ہے، اور آخرت دائمی وابدی ہے؟ بڑا نادان وناعاقبت اندیش وہ ہے کہ گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتا ہے، مغفرت کی اُمید پر۔

وانگہے پندار دان تاریک رائے ☆ خواہد آمرزیدنش آخر خدائے

﴿وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ جو لوگ کتاب توریت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں، یعنی اس میں تحریف نہیں کرتے، اور توریت کے حکم کے مطابق نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لاتے ہیں، اور نماز کو پابندی کے ساتھ قائم رکھتے ہیں، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ، تو ہم نیکوکاروں کا ثواب ضائع نہ کریں گے، بلکہ ان کو مزید انعام دیں گے۔

آگے اس عہد ومیثاق کا شد ومد کے ساتھ بیان ہے، اور اس کی کیفیت کا ذکر ہے کہ ان کے سروں پر پہاڑ کو مثلِ سائباں کے اٹھالیا گیا، اور وہ یہ سمجھے کہ پہاڑ ہم پر گرنے والا ہے، اس حال میں ان سے عہد ومیثاق لیا گیا، مگر سابقہ میثاقوں کی طرح انہوں نے اس عہد کا بھی وہی حشر کر دیا۔

﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ﴾ سے تا ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ اس وقت ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر ایسا معلق کر دیا گویا وہ ایک سائباں تھا، اور انہوں نے گمان کیا کہ اگر انہوں نے توریت کے حکم کو تسلیم کر کے نہ مانا تو وہ پہاڑ ان کے سروں پر گر پڑے گا۔ اس وقت ہم نے ان سے کہا کہ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اپنے ہاتھوں میں عمل کے لئے تھامے رکھو، تاکہ تم متقی بن جاؤ، اور نافرمانوں کی فہرست سے اپنا نام خارج کرو۔ سورۂ بقرہ میں پوری تفصیل گزر چکی ہے، وہاں دیکھیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ پہاڑ کو اٹھانا کوئی حیرت انگیز واقعہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ایک پہاڑ تو کیا سارے جہاں کے پہاڑوں کا اٹھانا کوئی مشکل نہیں۔ یہ بلند وبالا آسمانوں اور کھربوں ستاروں کو ذرا دیکھو، یہ بغیر کسی کھمبے اور ستون کے کیسے کھڑے ہیں؟ اور کب سے کھڑے ہیں؟ سُبْحٰنَ اللّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا
غٰفِلِیْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ
اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

ترجمہ: اور جب آپ کے ربّ نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا، اور انہیں ان کی جانوں پر گواہ بنایا، کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں! آپ ہمارے ربّ ہیں، ہم نے اقرار کرلیا، کبھی تم قیامت کے دن کہنے لگو کہ بیشک ہم اس سے غافل تھے ﴿۱۷۲﴾ یا یوں کہو کہ پہلے سے ہمارے باپ دادوں نے شرک کیا، اور ہم ان کے بعد میں آنے والی اولاد تھے، کیا آپ ہم کو باطل عمل والوں کے فعل کی وجہ سے ہلاک کرتے ہیں ﴿۱۷۳﴾ اور ہم ایسے ہی واضح طور پر آیات کو بیان کرتے ہیں تاکہ وہ لوگ رجوع ہوجائیں ﴿۱۷۴﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں ان معاہدات ومواثیق کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے احکامِ تورات کی پابندی کے سلسلے میں لئے گئے تھے۔ مذکورۃ الصدر آیات میں اس عظیم الشان عالمگیر معاہدہ کا بیان ہے جو تمام اولادِ آدم سے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد وادی نعمان عرفات میں اس عالم دنیا میں آنے سے بھی پہلے (عالم ارواح) ازل میں لیا گیا، جو کہ عام زبانوں پر "عہدِ اَلَست" کے نام سے معروف ومشہور ہے۔

قرآنی عہد ومواثیق کا مختصر تذکرہ:

قرآن کریم کی متعدد آیات میں بہت سے معاہدات ومواثیق کا ذکر کیا گیا ہے، جو مختلف جماعتوں سے مختلف اوقات وحالات میں لئے گئے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام سے عہد لیا گیا کہ جو کچھ ان کو اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے پیغامِ رسالت ملے وہ اپنی اپنی اُمتوں کو ضرور پہنچائیں۔ اس میں ان کے لئے کسی کا خوف اور لوگوں کی ملامت، توہین وتکذیب کا کوئی اندیشہ حائل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی اس مقدس جماعت نے اپنے اس معاہدے کا پورا حق ادا کردیا۔ پیغامِ رسالت کے پہنچانے میں اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ عَلَیْهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام

اسی طرح ہر رسول ونبی کی اُمت سے اس کا عہد ومیثاق لیا گیا کہ وہ اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کا پیغام

سنیں گے، اور قبول کر کے اس کا اتباع کریں گے۔ پھر خاص خاص اہم معاملات میں خصوصیت کے ساتھ اس کے پورا کرنے میں اپنی پوری توانائی اور استعداد صرف کرنے کا عہد لیا گیا۔ بعضوں نے اسے پورا کیا، اور بعضوں نے (بنی اسرائیل وغیرہ) پورا نہیں کیا۔ اور کفار نے بھی پورا نہ کیا۔ انہی معاہدات میں سے ایک اہم معاہدہ وہ ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام سے ہمارے پیشوا سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں لیا گیا کہ سب انبیاء کرام علیہم السلام نبی اُمّی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کریں گے، اور توثیق کریں گے، اور جب موقع پائیں گے تو ان کی مدد کریں گے، جس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ﴾ [آل عمران: ۸۱] (اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ: اگر میں تم کو کتاب اور حکمت عطا کروں۔۔۔۔) یہ تمام عہود و مواثیق ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کے مظاہر ہیں، اور مقصد ان کا یہ ہے کہ انسان جو کثیر النسیان ہے اکثر اپنے فرائض کو فراموش کر کے بھول جاتا ہے، اس کو بار بار ان معاہدات کے ذریعہ ہوشیار و بیدار کیا گیا، تاکہ وہ ہر قسم کی خلاف ورزی کی تباہی ونقصانات سے بچا رہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی معاہدات ہیں، جن کی تفصیل کتابُ الاحکام میں دیکھیں۔

بیعت بھی ایک قسم کا معاہدہ ہے:

انبیاء علیہم السلام اور ان کے نائب علماء کرام ومشائخ عظام میں بھی جو بیعت لینے کا دستور رہا ہے، وہ بھی اسی معاہدہ کے ذریعہ سنتِ الٰہیہ کا اتباع ہے، ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے معاملات میں کبھی اجتماعی اور کبھی انفرادی طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بیعت لی ہے، جن میں سے بیعتِ رضوان کا تذکرہ قرآن کریم نے بڑے پیارے انداز میں یوں بیان فرمایا: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ [الفتح: ۱۸] (یقیناً اللہ بڑا خوش ہوا مومنوں سے جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے)۔ اسی طرح یہ منقبت بھی سنئے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾ [الفتح: ۱۰] (جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں در حقیقت وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے)۔

یہ ہے وہ عظیم بیعت جس کا تذکرہ قرآن کریم کی سورۃ الفتح میں نہایت دلکش اور روح پرور انداز میں ہے۔

کاش شیطان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے دشمنانِ اسلام روافض اس سے سبق وعبرت سیکھتے۔

ہجرت سے پہلے انصارِ مدینہ کی بیعت عقبہ اُولیٰ اور ثانیہ بھی اسی قسم کے معاہدات میں شامل ہے۔ اسی طرح

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایمان، نماز، خیر خواہی، جہاد اور دیگر اعمالِ صالحہ کی بجا آوری اور پابندی پر بیعت لی، حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک جم غفیر سے اس بات پر بیعت لی کہ کسی بھی انسان سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کریں گے۔ سُبحَانَ اللهِ وَبِحَمدِهٖ. ان لوگوں نے اس پر اتنی پابندی سے عمل کیا کہ زندگی بھر کسی سے پانی تک نہیں مانگا۔ رَضِیَ اللهُ تَعَالٰی عَنهُم أَجمَعِینَ.

صوفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اور چاروں طریقوں کے علماء و مشائخ میں جو بیعت مروج ہے وہ بھی ایمان، عملِ صالح، اتباعِ سنّت، ترکِ شرک و بدعت، اَکلِ حلال، صدقِ مقال، دنیا سے بے رغبتی، اِقبال علی الآخرۃ، حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ جب مریدِ صادق اپنے متبعِ سنّت پیر کے ہاتھ پر ان چیزوں کی ادائیگی اور تمام منہیات کے ترک و بیزاری کا عہد کرتا ہے، اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اللہ تعالیٰ کا مخلص بندہ ہونے کا معاہدہ کرتا ہے، تو ایک مختصر مدت میں کُندن بنتا ہے، اور اس پر اسم ذات "اللہ" کے اسرار کھل جاتے ہیں، اور نیکیوں پر توفیق کے بے پناہ ہجوم کے ساتھ تمام گناہوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔

بیعت کی حقیقت معلوم ہونے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پہلی شرط یہ ہے کہ بیعت انہی لوگوں سے ہو جو تارکِ دنیا، متبعِ شریعت لوگ ہوں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ست ☆ پس بہر دستے نباید داد دست

جو گدی نشین بیچارے رسمی پدری میراثی پیر و فقیر بیٹھے بیعت لیتے ہیں، ان غریب دکانداروں، تعویذ فروشوں سے دور رہنا چاہئے، نہیں تو بچے کھچے ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ آج کل ناواقف دنیادار، جاہل، مشرک، بدعتی لوگوں میں بیعت کا جو رواج ہے، یہ دین و ایمان کے لئے نہایت خطرناک ہے، اور یہ لوگ بھی عیسائیوں سے کفارہ کا مسئلہ سیکھ کر یہی سمجھتے ہیں کہ مرشد (خواہ وہ کچھ بھی ہو) کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے دین و دنیا، اور آخرت کی کامیابی سب کچھ مل جاتا ہے۔ واقعی ابلیس نے بہت محنت کی، اور لوگوں کا ستیاناس کیا۔ یاد رکھو! بیعت ایک دینی، شرعی معاہدہ ہے، اس کا فائدہ اور اس کی برکت جب ہی حاصل ہوتی ہے جب اس معاہدہ پر اتباعِ شریعت کے ساتھ پورا عمل ہو، ورنہ وبال کا خطرہ ہے۔ اب آیت کریمہ کی مختصر تشریح یہ ہے:

عہدِ اَلست کا مختصر تذکرہ:

اس سلسلے میں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مثلاً حضرت فاروق اعظم، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو

ہریرہ، حضرت اُبی بن کعب، حضرت ابوالدرداء رضوان اللہ علیہم وغیرہ سے مختلف الفاظ ومعانی کے ساتھ حدیثی روایات مروی ہیں، ان سب کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ شانہ نے وادی نعمان میں (جو کہ عرفات کے ساتھ ہے) حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی، پھر ان کی پُشت سے ان کی اولاد کو نکالا، جو چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی صورتوں میں تھی، اور پُشت در پُشت ان کی نسل سے جو بھی مخلوق قیامت تک پیدا ہونے والی تھی، سب کو پیدا فرمایا، اور ان کی وہی صورتیں بنا دیں جو بعد میں عالمِ ظہور میں پیدا ہونے والی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں بولنے کی قوت دی، اس کے بعد ان سے عہد لیا، اور انہیں ان کے نفسوں پر گواہ بنایا، ان سے فرمایا: اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ ان سب نے کہا: بَلٰى ہم گواہی دیتے ہیں کہ واقعی آپ ہمارے ربّ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سے یہ عہد اس لئے لیا گیا کہ قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس توحید سے بے خبر تھے، یا یوں کہنے لگو کہ اصل شرک تو ہمارے باپ دادوں نے کیا تھا، اور ہم ان کے بعد ان کی نسل میں تھے، ان کے تابع ہو کر ہم نے بھی ان کے اعمال اختیار کئے، سو کیا ان گمراہوں کے فعل پر آپ ہمیں ہلاکت میں ڈالتے ہیں؟

چونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اس بات کا اقرار لے لیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ ہی ہمارا ربّ ہے، انہوں نے اقرار کر لیا، اور اپنی جانوں پر گواہ بن گئے، اس لئے قیامت کے دن کسی کے لئے کوئی عذر نہیں رہے گا، اور اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ کوئی شخص توحید سے منہ موڑ کر، اور شرک کے اعمال اختیار کر کے یوں کہنے لگے کہ مجھے تو کوئی پتہ نہ تھا۔

مسند احمد میں ہے کہ جب سب نے بَلٰى کہہ کر اقرار کر لیا تو اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ میں تمہارے اوپر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو گواہ بناتا ہوں، اور تمہارے باپ آدم (علیہ السلام) کو گواہ بناتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن تم یوں کہنے لگو کہ ہمیں اس کا علم نہ تھا۔ تم جان لو کہ بیشک میرے سوا کوئی معبود نہیں، اور میرے سوا کوئی ربّ نہیں، اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، میں تمہاری طرف رسولوں کو بھیجوں گا، جو تمہیں میرا عہد اور میثاق یاد دلائیں گے، اور تمہارے اوپر کتابیں نازل کروں گا۔

اس پر سب نے کہا کہ بیشک ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ربّ ہیں، اور ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا نہ کوئی ربّ ہے، اور نہ ہی کوئی معبود ہے۔ اس موقع پر حضرات انبیاء علیہم السلام سے بھی عہد لیا گیا، جو

سورۂ احزاب کی آیت میں مذکور ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ...﴾ [الأحزاب:۷] (اور جب ہم نے نبیوں سے ان کا عہد لیا، اور آپ سے، اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے)۔ [مشکوٰۃ]

البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں اتنا اور اضافہ ہے کہ پہلی مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے وہ لوگ نکلے جو جنتی تھے، اور خوبصورت سفید رنگ میں تھے، اور دوسری مرتبہ سیاہ رنگ کے تھے، جو دوزخی تھے۔

قرآن کریم کی آیت میں جو ﴿مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ کے الفاظ ہیں، اُن کا مطلب یہ ہے کہ ﴿مِنْ اٰدَمَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ﴾ پہلا جملہ محذوف ہے، دوسرا جملہ اس پر دلیل ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ آدم علیہ السلام کی بلا واسطہ اولاد، اور اولادوں کی اولاد (بالواسطہ) ازل میں سب کا اجتماع ہوا، اور قیامت کا اجتماع بعینہٖ اسی اجتماع کا نمونہ ہوگا۔ البتہ جب سفید وسیاہ رنگ کے الفاظ اور چیونٹیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے جسّوں کے الفاظ کا تقاضا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اجتماع خالص روحانی نہ تھا، بلکہ اجسام کے ساتھ ارواح کا تعلق بھی رہا۔ یعنی اجسام و ارواح دونوں کا اجتماع تھا، کیونکہ مذکورہ اوصاف اجسام کے ساتھ مخصوص ہیں، ارواح کو سیاہ وسفید نہیں کہا جا سکتا۔ واللہ اعلم

خلاصہ:

جب سے انسان دنیا میں آیا ہے سلسلۂ نبوّت بھی اسی وقت سے جاری ہے۔ سب سے پہلے انسان بھی، اور سب سے پہلے نبی بھی حضرت آدم علیہ السلام ہیں، ان کے بعد ہر زمانہ، ہر خطہ اور ہر قوم میں مسلسل پیغمبر آتے رہے ہیں، آخر میں سردار دو جہاں سید کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سارے انسانوں کے لئے، سارے زمانوں کے لئے، اور سارے جہانوں کے لئے ہے۔ پوری دنیا میں، ملکوں میں، شہروں، قصبوں، دیہاتوں، جنگلوں میں ایسا کوئی خطہ نہیں، بلکہ پہاڑوں کے غاروں میں ایسا کوئی غار نہیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا وجود اور پہنچ نہ ہو۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام ترقیوں کا دروازہ کھول دیا، اور پورے جہاں کی چابیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں دیدیا۔ اب روئے زمین پر لاکھوں چیزوں کا وجود، اور پوری دنیا کی ترقی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

مرہونِ منت ہے۔کائنات میں کوئی ایک ایسا آدمی نہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام اور کام سے ناواقف اور بے خبر ہو۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سارے جہاں کے سارے انسانوں پر کرم فرمایا، اور ان سب پر اتمامِ حجت فرما کر قیامت کے روز ہر قسم کے عذر و معذرت سے ان کا منہ بند کر کے، ان پر اتمامِ حجت قائم فرمایا۔

ایک طرف سے اسلام اور توحید انسانوں کے لئے فطرت قرار پائی، دوسری طرف ہر انسان میں اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم اور ذہنی صلاحیتوں کی نہریں جاری فرمائیں، جس کی بدولت آج انسان ستاروں پر کمند ڈال کر وہاں جانے اور رہنے کا سوچ رہا ہے۔

اسی کے ساتھ نبوت و رسالت کا پیغام اس اُمت کے علماء، مشائخ، مبلغین اور مصلحین کے ذریعہ گھر گھر پہنچ رہا ہے، تو کیا پھر بھی قیامت کے دن کسی انسان کے لئے انکار یا معذرت کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ عذر و معذرت کے سارے دروازے بند ہو گئے، اور کافر و مشرک انسان جس کا کفر محض ہٹ دھرمی اور بغض و عناد پر مبنی تھا، اس نے ہمیشہ کے لئے عظیم ربّ العلمین کی عظیم تر ابدی نعمتوں سے سوائے محرومی کے کچھ نہیں پایا۔

فائدہ:

انسانوں کو ترتیب وار ان کے باپوں کی پُشتوں سے نکال کر چیونٹیوں کے جثّہ میں جو ظاہر فرمایا تھا، آج کل جدید آلات اور ایٹمی توانائی کی جو چیزیں ذرّات کی صورت میں بن رہی ہیں، اور کمپیوٹر میں بڑی ہو کر سامنے آ رہی ہیں، انہوں نے واضح کیا ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کو چھوٹے نقطہ کی شکل دی جا سکتی ہے، یعنی پہاڑ کو چیونٹی کی شکل میں، اور چیونٹی کو ہاتھی کی شکل بتایا جاتا ہے۔

فائدہ:

رہا یہ مسئلہ کہ عہدِ اَلست کا وعدہ ہمیں یاد نہیں، تو اس کے بارے میں پہلی بات یہ ہے کہ دنیا میں بچپن کی زندگی میں ہم ہزاروں کام کرتے ہیں، پھر جوانی کی زندگی میں وہ ہمیں یاد نہیں رہتے، اسی طرح جوانی کے کام بڑھاپے میں بھول جاتے ہیں۔ عہدِ اَلست بھی ہمارے ذہنوں سے خارج ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس عہد کا تعلق روحانی قوت کے ساتھ وابستہ ہے، سارے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے، انہیں یہ پورا واقعہ یاد رہا۔ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑیئے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت حسن بصری، حضرت رابعہ بصریہ، حضرت جنید بغدادی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت شیخ اکبر، حضرت جلال الدین رومی

وغیرہ مشائخ رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے کہ عہدِ الست ہمیں ایسا یاد ہے گویا ہم ابھی اس سے فارغ ہو چکے ہیں، اور اس کی پوری کیفیت ہمارے سامنے ہے۔

کار پاکان را قیاس از خود مگیر ☆ گرچہ در ظاہر نوشتن شیر و شیر

[مثنوی]

تیسری بات یہ ہے کہ عہدِ الست کا یہ اثر ضرور ہے کہ ہر انسان یہ ضرور سمجھتا ہے کہ جس خالق و مالک عزّ سلطانہ نے مجھے پیدا کیا ہے، اس نے مجھے بے مقصد پیدا نہیں کیا، مجھے ضرور اس کا حکم ماننا چاہئے، اور اس کی عبادت ضرور کرنی چاہئے۔ اسی وجہ سے فطری طور پر انسان عبادت کے لئے کسی ایسی ذات کو تلاش کرتا ہے جس کی وہ عبادت کرے، وہ بغیر کسی عبادت کے ہرگز قناعت نہیں کرتا۔ پھر وہ شیطان کے ورغلانے پر اپنے معبود کے انتخاب میں غلطی کرتا ہے، بجائے حقیقی معبود کے کسی بت، کسی قبر، کسی شجر و حجر کا انتخاب کرتا ہے، اور ساتھ ساتھ وہ ہرگز یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ یہی بت میرا خالق و مالک ہے، بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ میرے خالق و مالک کا ناز پروردہ ہے، اور یہ مجھے میرے حقیقی اور اصلی مالک تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔

یہ جواب وہ اس لئے دیتا ہے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میرے ہاتھوں کا بنایا ہوا پتھر میرا خالق ہرگز نہیں ہوسکتا، وہ بر ملا کہتا رہتا ہے: ﴿مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی﴾ [الزمر: ۳] (ہم ان بتوں کی عبادت صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قرب تک پہنچانے والے ہیں)۔

یہی حال ہمارے زمانہ کے پیر پرست، قبر پرست مشرکوں کا بھی ہے کہ وہ پیروں، سیدوں، گدی نشینوں، مزاروں، قبروں میں سے کسی کو اپنا معبود نہیں سمجھتے۔ معبود کے متعلق ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر یہ پیر، یہ عرس و چراغاں، یہ نذر و نیاز اس ہستی کے لئے ہیں، جب یہ ہم سے راضی رہے گا تو ہماری رسائی حق تعالیٰ کے ساتھ کروا کر ہمارا نمبر بڑھائے گا، اور شیطان کے ورغلانے پر، اور کچھ شیطان نما اور مذہب فروش لوگوں کے کہنے پر یہ کہتے ہیں کہ جب نیچے کے آفیسر یا سیکرٹری کو راضی نہ رکھا جائے، اور اسے نہ منوایا جائے تو بڑے صاحب، یا صدر و زیر تک پہنچا نہیں جاسکتا۔

دیکھیں! ابلیس نے کیسی پیاری دلیل، اور کیسا کارآمد ہتھیار ان کو سمجھایا، اور ان کے حوالہ کیا۔ یہ وہی ہتھیار ہے جسے ابو جہل وابو لہب نے بھی استعمال کیا، اور پھر ان کے حوالہ کر دیا۔ یہ بے وقوف اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اللہ تعالیٰ

تک پہنچنے کا ذریعہ صرف اس کی توحید ہے، پھر وہ کسی صاحب کی طرح نہیں کہ اس کو تمہارا حال معلوم نہ ہو، وہ تو تمہارے قلبی اور دماغی خیالات سے بھی باخبر ہے۔ وہ تمہاری پوری حاجتوں سے، اور سارے مقاصد سے آگاہ ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے حضور میں یوں درخواست پیش کرتے ہیں: اَللّٰهم اِنَّکَ تعلم سِرِّی وَعلانِیَتِی فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِی وَتعلمُ حَاجَتِی فَأَعْطِنِی سُؤَالِی وَتَعْلَمُ مَا فِی نَفْسِی فَاغْفِرلِی ذُنُوبِی. اَللّٰهمَ عِلْمُکَ بِحَالِی تَغْنِینِی عَنْ سُؤَالِی. اے اللہ پاک! میرا ظاہر و باطن سب آپ کے علم میں ہے، اور تو سب کو جانتا ہے، میری معذرت قبول فرما، اور آپ میری حاجتوں سے باخبر ہیں، انہیں پورا فرما، اور میرے دل کے ارادوں کو جانتے ہوئے میری خطاؤں کو معاف فرما۔ اے اللہ! جب میرا سب کچھ آپ کو معلوم ہے تو مجھے کسی حاجت کے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

کیا یہ صفات کسی بادشاہ، یا حاکم، یا وزیر کی ہوسکتی ہیں؟ وہ بے چارہ خود حاجتمند ہے، کیا کوئی محتاج و حاجتمند کسی کی مشکل کشائی اور حاجت روائی (مَافوقَ الاَسباب میں) کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہاں انسان کسی انسان کے لئے مَاتَحتَ الاَسباب سب کچھ کرسکتا ہے، اور یہ شرک نہیں، کیونکہ لوگ صبح سے شام تک اسباب کے ذریعہ ایک دوسرے کے لئے ہزاروں کام کرتے رہتے ہیں، اور ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں، جو کہ جائز ہیں۔ خوب فرق سمجھو۔ ہدایت و گمراہی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ۝۱۷۵ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۝۱۷۶ سَآءَ مَثَلَا ِ الْقَوْمُ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ۝۱۷۷

ترجمہ: اور آپ ان کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیں جسے ہم نے اپنی آیات دیں، پھر وہ ان سے نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، تو وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۝۱۷۵ اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اس کو بلند کردیتے لیکن وہ بالکل زمین ہی کی طرف مائل ہوگیا، اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، سو اس کی ایسی حالت ہے جیسے

کتے کی حالت ہوتی ہے، اگر تو اس پر بوجھ لاد دے تو بھی ہانپے، اور اگر اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے، یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا، سو آپ قصوں کو بیان کیجئے تاکہ وہ لوگ غور وفکر کریں ﴿۱۷۶﴾ بُری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، اور وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۷۷﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں عہدِ اَلست کے ازلی میثاق کا تذکرہ تھا، موجودہ آیات میں ازلی میثاق توڑنے والوں کے ضمن میں عبرت کی خاطر ایک بہت بڑے عالم کا بیان ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرکے ابدی شقاوت خرید لی، اور ایمان کی دولت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا، آئندہ جو کوئی اس کے نقش قدم پر چلے گا وہ بھی اسی کی طرح ابدی سعادتوں سے محروم ہی ہوگا۔

بنی اسرائیل کے ایک بڑے مقتدا عالم کا عبرتناک قصہ، اور انجام کا بیان:

ان آیات میں بنی اسرائیل کا ایک عبرتناک قصہ مذکورہ ہے، جس میں بنی اسرائیل کے ایک بہت بڑے مُستَجابُ الدَّعَوات، اور مشہور مقتدا کا علم ومعرفت کے اعلیٰ معیار پر ہونے کے بعد دفعۃً گمراہ ومردود ہوجانے کا واقعہ مع اس کے اسباب کے بیان کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حکم دیا جارہا ہے کہ آپ اپنی قوم کے سامنے یہ واقعہ پڑھ کر سنائیں، جس میں بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم وعارف، اور مشہور مُستجابُ الدَّعَوات پیشوا کا علم ومعرفت کے باوجود گمراہ ومردود ہونے، اور اغراضِ نفسانی کا شکار ہوکر ذلیل ورسوا ہونے کا تذکرہ ہے، تاکہ لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہو۔

قرآن کریم میں اس شخص کا نام اور کوئی تشخص مذکور نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ تفسیر اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم سے اس کے بارے میں مختلف روایتیں مذکور ہیں (دیکھیں درمنثور) جن میں زیادہ مشہور اور جمہور علماء کے نزدیک قابلِ اعتماد روایت وہ ہے جو حضرت مردویہ اور دیگر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ اس شخص کا نام "بَلعَمْ بن باعورا" ہے۔ یہ ملک شام میں بیت المقدس کے قریب کنعان کا رہنے والا تھا، اور ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ عمالقہ میں سے تھا۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب توریت کا اُسے علم حاصل تھا، اور اسم اعظم اُسے معلوم تھا۔ قرآن کریم نے اس کے

بارے میں فرمایا:

﴿الَّذِیْۤ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا﴾ (جسے ہم نے اپنی آیات دیں) یہ تقریباً اس طرح کی بات ہے جیسے کہ سورۂ نمل میں آصف بن برخیا کے بارے میں فرمایا: ﴿قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ [النمل: ۴۰] (اس شخص نے کہا جس کے پاس کتاب کا علم تھا)۔ یہ الفاظ اس شخص کے عالم ہونے کے لئے واضح ثبوت ہیں۔

فرعون کے غرق ہونے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قوم جبارین سے جہاد کرنے کا حکم ملا (دیکھیں سورۂ مائدہ) اور جبارین نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کا لشکر جرار لے کر ہمارے ساتھ جنگ کے لئے پہنچنے والے ہیں، انہیں قوم فرعون کے غرق وتباہ ہونے کا بھی علم تھا، اور وہ جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ شانہ کے برحق پیغمبر ہیں، ان کا مقابلہ ہمارے بس میں نہیں، تو جبارین والے بڑے پریشان ہوئے، اور سارے جمع ہوکر بَلعَم بِن باعُورا کے پاس آگئے، اور کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سخت جلالی پیغمبر ہیں، اور ان کے پاس بہت بڑا لشکر ہے، وہ اس لئے آئے ہیں کہ ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کریں۔

آپ مُستَجابُ الدَّعَوات ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ ان کو ہمارے مقابلہ سے واپس کردیں، آپ اسم اعظم کے ساتھ جب دعاء کریں گے تو آپ کی دعاء قبول ہوجائے گی، اور موسیٰ علیہ السلام وہاں سے واپس ہوجائیں گے۔ اس طرح ہم اس کی یلغار سے بچ جائیں گے۔

بَلعَم بِن باعُورا نے کہا کہ افسوس ہے کہ تم لوگ کیسی غلط باتیں کہتے ہو، موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برحق نبی ہیں، ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے ہیں، میں ان کے خلاف بددعاء کیسے کرسکتا ہوں؟ حالانکہ ان کا مقام جو اللہ کے نزدیک ہے وہ بھی میں جانتا ہوں، اگر میں ایسا کروں گا تو میرا دین و دنیا دونوں تباہ ہوجائیں گے۔ ان لوگوں نے بے حد اصرار کیا، تو اس پر بَلعَم نے کہا کہ اچھا میں اپنے ربّ سے اس معاملہ میں معلوم کرلوں کہ ایسی دعاء کی مجھے اجازت ہے یا نہیں۔

اس نے اپنے معمول کے مطابق معلوم کرنے کے لئے استخارہ کیا، یا کوئی عمل کیا، خواب میں اس کو بتلایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے، تو اس نے قوم کو بتلادیا کہ مجھے بددعا کرنے سے منع کردیا گیا ہے۔ اس وقت قوم جبارین نے بَلعَم کو کوئی ہدیہ پیش کیا، جو درحقیقت رشوت تھی، اس نے ہدیہ قبول کیا، تو پھر اس قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے کہ آپ ضرور یہ کام کردو، اور الحاح وزاری کی حد نہ رہی۔

بعض روایات میں ہے کہ اس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ یہ رشوت قبول کرلیں، اوران کا کام کرلیں۔ اس وقت بیوی کی رضا جوئی، اور مال کی محبت نے اس کو اندھا اور بے وقوف بنایا تھا، اس نے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوکر بددعا شروع کی۔ اس وقت اس کے پاس ہزاروں کا مجمع کھڑا ہوا موجود تھا۔

اس مرحلے میں قدرتِ الٰہیہ کا عجیب کرشمہ ظاہر ہوا کہ وہ جو کلمات بددعا کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لئے کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے وہ الفاظِ بددعا خود اس کی قوم جبارین کے لئے نکلتے تھے۔ انہوں نے چلا کر کہا کہ تم کیا کہتے ہو؟ تم تو ہمارے لئے بددعا کر رہے ہو۔ بَلعَم نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے، میری زبان اس کے خلاف پر قادر نہیں، میں غضبِ الٰہی میں ڈوب گیا ہوں، میرا ایمان سلب ہو چکا ہے، میری دعائیں ضائع ہوچکی ہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھی تباہی نازل ہوگئی، اور بَلعَم کو یہ سزا ملی کہ اس کی زبان اس کے سینے پر لٹک گئی۔ اب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میری تو دنیا وآخرت تباہ ہوگئی، اب دعا تو میری چلتی نہیں، لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں، جس کے ذریعہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آسکتے ہو، وہ اس طرح کہ ان پر ان کے ربّ کا ہاتھ ہے، اور وہ ایمان وتقویٰ کی بدولت اللہ تعالیٰ کی نصرت کے سزاوار ولائق ہیں۔ جب کسی گناہ کی وجہ سے وہ نصرتِ الٰہی سے محروم رہیں گے تو تم ان پر غلبہ پاؤ گے، اور اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ مغلوب ہوجائیں گے۔

وہ تدبیر یہ ہے کہ تم اپنی حسین وخوبصورت لڑکیوں کو سنگھار کرا کے بنی اسرائیل کے لشکر کے راستوں پر پہنچاؤ، اور انہیں بتادو کہ وہ لوگ تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کریں انہیں کرنے دو۔ بس خداوند تعالیٰ کی نصرت اور امداد ان سے بسبب گناہ کے بند ہوجائے گی۔ چونکہ بنی سرائیل کئی مدّت ہوئی اپنے گھروں سے نکلے ہوئے تھے، ساتھ ساتھ ان میں دیانت وتقویٰ وعفت کی کمزوری تھی، جب انہوں نے میدان میں یہ سب کچھ دیکھا تو بے قابو ہوگئے۔ مگر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھایا، اور اس چال سے انہیں آگاہ کیا، اور فرمایا: اے میری قوم! یہ زنا کا عمل نہایت مبغوض اور حرام ہے، جس قوم میں یہ عمل پیدا ہوگیا تو ضرور اس پر اللہ تعالیٰ کا قہر وغضب نازل ہوگا۔

پس لوگ بَلعَم کی شیطانی چال سے واقف ہوئے، اور ضبط وصبر سے سرشار رہے، صرف ایک بڑا سردار اس گناہ میں مبتلا رہا، ہرچند اُسے سمجھایا، وہ خبیث باز نہ آیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر کسی تاخیر کے طاعون کا مرض فوراً پھیل گیا، اور پوری قوم بنی اسرائیل اس کی لپیٹ میں آگئی، جس سے ایک روز میں تقریباً ستر ہزار آدمی مرگئے، یہاں تک

کہ جس شخص نے یہ بُرا کام کیا تھا اس جوڑے کو لوگوں نے قتل کر کے منظر عام پر ٹانگ دیا کہ سب لوگوں کو عبرت ہو، اور پوری قوم نے خلوص کے ساتھ توبہ کی، تب طاعون تھم گیا، اور رفع ہوا۔

﴿اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا﴾ آیات سے مراد علم و معرفت ہے، وہ بد بخت ہو کر ان سے باہر نکل گیا، جیسے کسی کو اچھا لباس پہناؤ، وہ اس سے نکل جائے، اور اپنے بدن سے اتار دے، جدا کر دے۔ اِنسِلاخ چمڑے اُتارنے کا نام ہے، جیسے قصاب بکرا ذبح کرے، اور اس کا چرم اتار دے، یہ عادت سانپ میں بھی موجود ہے کہ ہفتہ عشرہ بعد اپنی کھینچلی سے باہر آتا ہے۔ کہتے ہیں ایمان، تقویٰ، علم و معرفت، یہ سب لباس کی طرح زینت اور شرف ہیں، جب کوئی انہیں چھوڑ دے، خیر باد کرے، تو کہتے ہیں: اِنسَلَخَ مِنهَا، کہ فلاں شخص ان روحانی لباسوں سے علیحدہ ہو گیا، نکل گیا، محروم ہو گیا، وغیرہ۔

﴿فَكَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ﴾ پھر ہو گیا وہ گمراہوں میں سے۔ جب شیطان کسی کے پیچھے لگ جائے تو اس کا نتیجہ سوائے گمراہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ﴾ ہدایت و گمراہی دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، چاہے کسی کو ہدایت دے کر بلند و بالا مرتبہ پر فائز فرما دے، اور چاہے کسی کو گمراہ کر کے اُسے زمین پر دنیا کے ساتھ لگا دے، جیسے بلعم کو دنیا کی لالچ و حرص نے زمین کے ساتھ لگا کر بے قدر و بے ایمان بنا دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتضائے علم پر عمل نہ کرنے سے، اور علم کے مقابلہ میں دنیا اور مال کی رغبت کرنے سے علم کی برکت اور فیض سلب ہو جاتا ہے۔ آیت کریمہ میں الْاَرْضِ سے مراد دنیوی خواہشات ہیں، جو کہ سفلی ہیں۔

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ یَلْهَثْ﴾ اس کی مثال کتے جیسی ہے کہ اگر اس کو ڈانٹ پلا دو، یا اس پر کوئی چیز رکھو، یا اسے بھگا دو، یا اس پر حملہ کر دو، یا چھوڑ دو، وہ ہانپتا رہتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کتا ہمیشہ ہانپتا رہتا ہے، خواہ اسے کوئی تکلیف پہنچے یا نہ پہنچے۔ مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے لکھا ہے کہ جب بلعم باعورا نے بیوی کے کہنے پر (کیونکہ لوگوں نے اس کی بیوی کو بڑا مال دیا تھا) اور رشوت قبول کرنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم پر بد دعا کی تو اس کی زبان کتے کی زبان کی طرح باہر نکل کر سینے پر آ گئی، اور اس کا حال ایسا ہو گیا جیسے کتے کا حال ہے، کتے پر حملہ کرو تب بھی وہ زبان نکال کر ہلاتا اور ہانپتا ہے، اگر اسے چھوڑ دو، کچھ نہ کہو تب بھی وہ اپنی زبان کو باہر نکالتا اور ہانپتا ہے۔ یہ بلعم بھی اسی طرح کے عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اس تشبیہ میں ذلت وخواری اور حرام خوری کی طرف بھی اشارہ ہے، جو عورت کی اتباع اور طلبِ دنیا کی وجہ سے پیش آیا۔ اسی وجہ سے حکم ہوا کہ آپ یہ قصہ لوگوں کو سنائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا خصوصاً علم والوں کے لئے کتنا بُرا نتیجہ ہوتا ہے۔

اگر عوام الناس اس واقعہ سے عبرت سیکھنا چاہیں تو بلاشبہ عبرت سیکھیں، مگر اہلِ علم پر فرض ہے کہ وہ ضرور اس سے عبرت حاصل کریں، اور اپنے علم کو حطامِ دنیا اور چند پیسوں پر ہرگز فروخت نہ کریں، کیونکہ بے عمل عالم کا عذاب بنسبت عوام الناس کے ستر گنا زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اگر اس مقام پر بلعم کے لئے کتے کے ساتھ تشبیہ بہت ہی سخت معلوم ہو رہی ہو، تو دوسرے مقام پر: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعة:۵] (گدھے کی طرح، جو کتابیں لادے ہوئے ہو) میں بے عمل علماء کو گدھے کے ساتھ تشبیہ دینا واضح ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ یہی حال اور مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے دیدہ ودانستہ ازراہِ تکبر وعناد ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا۔ یعنی یہ کچھ علماء کی خصوصیت نہیں، بلکہ یہ مثال تمام کفار ومشرکین ومکذبین پر صادق آتی ہے، جو حق واضح ہو جانے کے بعد کتے کی طرح دنیا کی حرص اور لالچ میں پڑے رہے، اور ہوا پرستی میں تباہ ہوئے۔ آپ ان کو یہ قصے سنائیں، شاید وہ کچھ غور وفکر کریں، اور بُرے انجام سے ڈریں۔

﴿سَآءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ﴾ بُری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے دیدہ ودانستہ ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ یہ لوگ تکذیب کر کے اپنے ہی نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔ ہوا پرستی کی بناء پر دنیا میں کتوں کے مشابہ بنے، اور آخرت میں کتوں جیسا ان کے ساتھ معاملہ ہوگا۔

ایسے موقع پر یہ دعاء پڑھنی چاہئے: اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دُعَاءٍ لَا یُسْمَعُ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ هٰؤُلَاءِ الْأَرْبَعِ. کسی عارف سے منقول ہے کہ تقدیر کی مثال ہوا کی ہے کہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کدھر سے چلتی ہے، اور کیا تماشا دکھاتی ہے۔ فرعون کی بیوی آسیہ سعیدہ رضی اللہ عنہا کو جنت کا راستہ دکھاتی ہے، اور حضرت نوح ولوط علیہما السلام کی بیویوں کو دوزخ پہنچاتی ہے، اور بنی اسرائیل کے عالم وعارف، عابد وزاہد بلعم کو کتوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔

آنزا بری از صومعہ در دیر گبران افگنی ☆ این را کشی از بتکدہ سر حلقہ رندان کنی

چون و چرا با کارتو عقل زبون را کے رسد ☆ ہم قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

فکر انگیز نصائح:

اس تمثیلی واقعہ میں بہت سی فکر انگیز نصائح ہیں۔ مثلاً:

(۱) کسی کو اپنے عمل و ہنر اور فضل و کمال، زہد و تقویٰ اور عبادت پر نازاں نہیں ہونا چاہئے۔

(۲) حالات بدلتے بگڑتے دیر نہیں لگتی، ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعاء کرنی چاہئے۔

(۳) شکر نعمت اور صبر کو زندگی کا مقصد سمجھنا چاہئے۔

(۴) اہل و عیال، مال و منال کی محبت کو دین کا تابع بنانا چاہئے۔

(۵) حرص، طمع، لالچ اور کثرت مال کو ترک کرنا چاہئے۔

(۶) کبر، غرور، سرکشی وغیرہ سے مکمل پرہیز کرنا چاہئے۔

(۷) بُرے لوگوں کی صحبت اور رفاقت سے بچنا چاہئے۔

(۸) بے حیائی اور تمام گناہوں سے بچنا چاہئے۔

(۹) رشوت، حرام خوری مسلمان کے لئے تباہ کن ہیں۔

(۱۰) عورتوں کی غلط فرمائش، اور بُرے مشورہ سے احتیاط ضروری ہے۔

(۱۱) اہل علم کے لئے ضروری ہے کہ اپنی اصلاح کرلیں محض علم کے مناقب و فضائل پر قناعت نہ کریں۔

(۱۲) اللہ والے لوگوں سے محبت نہایت ضروری ہے۔

یہ ساری باتیں قیمتی نصائح ہیں، جو کہ اسی واقعہ کے ساتھ متعلق ہیں اللہ تبارک و تعالیٰ استقامت نصیب فرمائے۔ آمین

......❁......❁......❁......

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ
كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ
وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

ترجمہ: جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے، اور وہ جسے گمراہ کرے تو یہ لوگ ہیں نقصان میں پڑنے والے ۱۷۸ اور تحقیق ہم نے پیدا کیا جہنم کے لئے بہت سے جنات کو، اور بہت سے انسانون کو، ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپایوں (جانوروں) کی طرح ہیں، بلکہ یہ ان سے بڑھ کر بے راہ ہیں، ایسے لوگ غفلت والے ہی ہیں ۱۷۹

معارف ومنازل

انسانوں اور جنات میں ایسے لوگ ہیں جو جانوروں سے زیادہ گمراہ ہیں۔ آیات قرآنیہ، انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی تعلیمات اگرچہ ہدایت کے اسباب ہیں، اور واحد ذریعہ بھی ہیں، مگر جب توفیقِ یزدانی اور عنایتِ ربانی شامل حال نہ ہوتو کوئی چیز دستگیری نہیں کرسکتی۔

جب بَلعَم آیاتِ ربانی پاس ہوتے ہوئے عنایتِ رحمانی نہ ہونے کی وجہ سے ابدی جہنمی ہوا، اس لئے ارشاد ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دیدے تو وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے، اور جس کو اپنی توفیق سے محروم کردے تو ایسے لوگ ابدی خسارہ میں پڑ جاتے ہیں، اور علم وہنر، فیض وکمال کے ہوتے ہوئے گمراہ ہوجاتے ہیں، کیونکہ:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ﴾ ...... تا ...... ﴿غٰفِلُوْنَ﴾ (تحقیق ہم نے دوزخ کے لئے بہت سے جن اور انسان پیدا کئے ہیں، یہ سارے جہنم کا ایندھن بنیں گے، جس طرح ایک بڑی خلقت کی پیدائش جنت کے لئے بھی ہے)۔ تمام مخلوقات کی اصل تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ [الذاریات: ۵۶] (نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو مگر اپنی عبادت کے لئے)۔ یہ ہے اصل تخلیق کا مقصد، مگر اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، اور تمام مَاكَانَ وَمَايَكُوْنُ اس کے علم میں ہے۔ پس اسے معلوم ہے کہ ان میں سے کتنے جنتی ہیں، اور وہ جنتی اعمال کو اختیار کرنے والے ہیں، تو ان کی تخلیق گویا جنت کے لئے شمار ہوگی، اور کتنے جہنمی ہیں جو اپنے اختیار اور مرضی سے جنتی اعمال کو چھوڑ کر دوزخی اعمال اور کفر اختیار کریں گے، گویا ان کی تخلیق دوزخ کے لئے ہوگئی، جس میں ان کے اختیار وانتخاب کا بڑا دخل ہے۔

کیونکہ ہدایت وضلالت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اس کا اپنے لئے انتخاب ہر شخص کے اختیار و

پسند پر موقوف ہے۔جیسے ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾[الکھف: ۲۹] (پس جس کی مرضی ایمان لائے، اور جس کی مرضی کفر اختیار کرے)۔

تو مطلب واضح ہے کہ جن وانس کی تخلیق تو اللہ تعالیٰ کی پہچان اور عبادت کے لئے ہی ہے، مگر جب لوگ اپنے مرکزِ تخلیق سے ہٹ جاتے ہیں، اور مقصدِ تخلیق کو نظر انداز کرتے ہیں، تو پھر اس کا نتیجہ جہنم ہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے، تو یہ تخلیق جہنم کے لئے نہیں، مگر نتیجہ ان کے اپنے کفر اور سرکشی کی وجہ سے جہنم ہی ثابت ہوا۔اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا﴾

آیت کریمہ میں تین چیزوں کا بیان ہے، یہ تینوں چیزیں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ چیزیں اگرچہ انسان اور حیوانات وغیرہ میں قدر مشترک کے طور پر موجود ہیں، مگر حیوانات کے لئے صرف ظاہری مادی مقاصد کے لئے ہیں، جبکہ انسان کے لئے ظاہری اور باطنی تمام تر مقاصد کے لئے ہیں۔

انسانی بدن کے لئے ان تینوں اعضاء کی حیثیت اس لئے اہم ہے کہ سعادت کے تمام اسباب کا دارومدار انہی تینوں چیزوں پر ہے، ایک مسلمان اپنے انہی اعضاء کو حق تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکام کی بجا آوری پر لگاتا ہے، تو اسے صدق وکذب، اور حق وباطل، جائز وناجائز ہر چیز معلوم ہوجاتی ہے، پس وہ بغیر کسی توقف کے ہدایت کو قبول کرتا ہے، اور ابدی سعادت کا حقدار وسزاوار ہوجاتا ہے، جبکہ منکرِ توحید اور منکرِ حق اپنے ان تینوں اعضاء جسمانی کو شیطان کے تسلط میں دیدیتا ہے، تو اس پر حق کے سارے دروازے بند ہوجاتے ہیں، تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے دل و دماغ، آنکھیں اور کان ظاہری چیزوں کو پہچانتے اور شناخت تو کرتے ہیں، مگر باطنی امور تک اس کی رسائی نہیں ہوتی، اس کے دل ودماغ اور سمع وبصر پر اس کی ہٹ دھرمی اور گمراہی کی وجہ سے مہر لگ جاتی ہے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾[البقرۃ: ۷] (اللہ نے مہر لگا دیا ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے)۔

سورۂ بقرہ میں اصل سبب کا ذکر ہوا، اور یہاں سورۂ اعراف میں آخری نتیجہ کا ذکر ہوا۔مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب سمجھنے سے اور آنکھیں دیکھنے سے، اور ان کے کان سننے سے قاصر ہیں، یہ کیوں ایسا ہوا؟ بقرہ میں جواب ارشاد فرما کر اصل سبب کو واضح فرمایا کہ ان کے اعضاء پر مہر لگ چکی ہے، سورۂ اعراف مکی ہے، اور سورۂ بقرہ مدنی ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ یہ لوگ جانوروں کی طرح، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر بے راہ ہیں، یہ لوگ غفلت والے ہی ہیں۔ یہ لوگ اپنی بصیرت وبصارت اور فہم وادراک سے کام نہیں لیتے، ہدایت کو قبول نہیں کرتے ہلَعَم باعورا کی طرح جانتے ہوئے حق کو چھوڑ کر گمراہی پر ڈٹے رہتے ہیں، کیونکہ ان پر شیطان مسلط ہو چکا ہے، جانوروں سے بدتر بے راہ ہیں، جانور اپنے مالک کو شناخت کرتا ہے، بعض اوقات میدانوں میں چرتا ہے، شام کو سیدھا اپنے مالک کے پاس آجاتا ہے، جانوروں میں جنت ودوزخ کی کوئی فکر نہیں، اور وہ اس بات پر ملامت اور مکلف بھی نہیں، جبکہ ان غافلوں کے لئے جنت ودوزخ دونوں ہیں، پس اگر جنت کے لئے کوشش نہ ہو، اور جہنم سے نجات کی فکر نہ ہو تو واضح ہوا کہ یہ جانوروں سے بدتر بھی ہیں، اور غافل بھی۔

سورۂ روم میں ارشاد فرمایا: ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [الروم: ۷] (وہ دنیا کی زندگی میں سے ظاہری طور پر کچھ جانتے ہیں، اور وہ آخرت غافل ہیں)۔ دنیا اور دنیاوی مفادات کو تو خوب جانتے ہیں، اس کے بارے میں بڑے سنجیدہ ہوشیار ہیں، مگر آخرت سے بے خبر اور غافل ہیں۔ یہ ہیں کافروں کے اوصاف، مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج مسلمانوں کا، اور خدا وسول اور یوم آخرت پر ایمان لانے والوں کا بھی یہی طور وطریقہ ہے، کہ حق اور صداقت سے نہایت دور اور اعراض کرنے والے ہیں۔ باطل، کدورات، شرک ومعاصی پر جھکے ہوئے ہیں۔ وَاللهُ الهَادِي.

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے لئے اچھے نام ہیں، سو تم اسے ان ناموں سے پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں کجروی اختیار کرتے ہیں، عنقریب ان کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۸۰﴾

معارف ومنازل

ہر کجا پستی ست وآب آنجا رود ☆ ہر کجا دردیست دوا آنجا رود

گزشتہ آیات میں ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ گونگے، بہرے، اندھے لوگوں اور ان کی بیماریوں کا تذکرہ تھا، اب اس آیت کریمہ میں بیماریوں کے روحانی علاج کا تذکرہ ہے، یعنی رجوع إلی اللہ اور ذکر اللہ تعالیٰ، جس سے تمام

امراض کا بآسانی خاتمہ ہوسکتا ہے۔فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ اللہ تعالیٰ کے لئے اسماء حسنیٰ ہیں۔یہ مضمون قرآن کریم میں چار مقامات پر مذکور ہے: ایک یہی آیت، دوم سورۃ الأسراء کے ختم پر، سوم سورۃ طٰہٰ کے شروع میں، چہارم سورۃ حشر کے ختم پر۔یعنی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں اچھے نام، توتم پکارو اس کو انہی ناموں سے۔اچھے نام سے مراد وہ نام ہیں جو صفاتِ کمال کے اعلیٰ درجہ پر دلالت کرنے والے ہیں۔یہ بات واضح ہے کہ کسی کمال کا اعلیٰ اور بلند ترین درجہ جس سے اوپر کوئی درجہ ممکن نہ ہو، وہ صرف حق تعالیٰ شانہ، خالق کائنات عزّ مجدہٗ ہی کو حاصل ہے، جس کا اعلان پانچ وقت کی اذانوں میں اللہ اکبر سے ہوتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ عزّوجلّ کے سوا کسی مخلوق کو یہ مقام و بلند درجہ حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ عزّ مجدہٗ کی تمام صفات ذاتی ہیں، اور مخلوقات کی تمام صفات کی نسبت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے، اور وہ سب عطائی اور وہبی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مخلوقات کی ذوات اور صفات سب عطائی ہیں، اسی لئے آیت کریمہ میں ارشاد ہے یہ اسماء حسنیٰ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں، دوسروں کو حاصل نہیں ہیں۔

﴿فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ اس کا ایک ترجمہ یہ ہے کہ انہی اسماء حسنیٰ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارو، دعاء کرو، بلاؤ۔بعض حضرات نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان ناموں سے موسوم کرو۔دونوں ترجمہ صحیح بھی ہیں اور مطلوب و مراد بھی ہیں، اور درست بھی۔پھر لفظ دعاء قرآن کریم میں دو معنیٰ کے لئے مستعمل ہے: ایک اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی حمد وثنا، تسبیح و تمجید و تکبیر و تہلیل کے ساتھ۔دوسرے حاجات اور مشکلات، مصائب کے وقت اللہ تعالیٰ شانہ سے اپنی حاجت طلب کرنا، اور مصائب و آفات سے نجات اور مشکلات کی آسانی کی درخواست کرنا۔کلمہ ﴿فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ میں دونوں معانی مراد ہیں۔

تو آیت کے معنیٰ یہ ہوئے کہ حمد وثنا اور تسبیح کے لائق بھی صرف اسی کی ذات پاک ہے، اور مصائب و مشکلات سے نجات اور حاجت روائی و مقصد برآری بھی صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، اس لئے حمد وثنا کرو تو اسی کی کرو، اور حاجت روائی، مشکل کشائی کے لئے پکارو تو صرف اسی کو پکارو، اور پکارنے کا طریقہ بھی خود ارشاد فرما کر بتادیا کہ انہی اسماء حسنیٰ کے توسل سے التجاء کرو۔

مسند احمد میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو کبھی کوئی غم و تکلیف پہنچے تو وہ یہ دعاء

پڑھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ وَابْنُ عَبْدِکَ وَابْنُ اَمَتِکَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُکَ أَسْأَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ هُوَ لَکَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَکَ أَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ أَحَداً مِنْ خَلْقِکَ أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَآءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ۔ لوگوں نے دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا ہم یاد نہ کرلیں؟ فرمایا جو بھی اسے سنے یاد کرلے۔ [ابن کثیر]

بعض علماء نے فرمایا کہ ذَهَابَ هَمِّیْ کے بعد یہ کلمات اضافہ کرلے تو بہتر ہے: ذَهَابَ هَمِّیْ وَغَمِّیْ وَفَقْرِیْ وَفَاقَتِیْ وَذِلَّتِیْ وَمَرَضِیْ وَوَحْشَتِیْ وَجَهْلِیْ وَخَوْفِیْ۔ یہ چند کلمات حدیث میں نہیں ہیں، بلکہ علماء نے اضافہ کیا ہے، اور بہت بہتر ہیں۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ ماثورہ دعاؤں کے درمیانی حصے میں ایسے کلمات کا اضافہ اچھا نہیں ہوتا، اور جہاں دعاء ختم ہو پھر چند ایک کلمات کا اضافہ برا نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

فائدہ:

اسماء حسنیٰ کے بحرِ بیکراں کے لئے سفینہ چاہئے، سفینہ بھی وہ جسے حضرت نوح علیہ السلام نے بنایا ہو۔ علماء کرام نے اسماء حسنیٰ کی شرح وفضائل پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور خوب بسط وتفصیل سے ان مبارک ناموں کے فضائل، فوائد، برکات اور خصوصیات ومراتب بیان کئے ہیں۔ یہ سارے اسماء مبارکہ توقیفی ہیں۔

اس بڑی فہرست میں اللہ اسم ذات ہے، باقی اسمائے صفات ہیں۔ قرآن حکیم میں یہ اسم ذات ''اللہ'' دو ہزار چھ سو اٹھانوے جگہ آیا ہے۔ اس کی صفات میں سب سے زیادہ اَلرَّبُّ کا مقام ہے، جو کہ قرآن کریم میں نوسو مرتبہ جلوہ افروز رہا ہے۔ یہ سارے مبارک اسماء مادہ اور صورت یعنی ہیولیٰ اور صورت جسمیہ سے منزہ اور پاک ہیں۔

ہاں! اتنا معلوم ہے کہ کائنات علوی ہوں، یا سفلی ہوں، یا فضائی ہوں، جواہر ہوں، یا اعراض ہوں، اسماء حسنیٰ کا نور و پرتو اور رنگ وکشش ان میں ضرور موجود ہوگا، کوئی ذرہ کائنات کا ایسا نہیں کہ جس میں یہ نور ورنگ نہ ہو۔ البتہ کیفیت وکمیت کے اعتبار سے فرق ضرور ہوگا، مگر کائنات کی روح یہی اسماء حسنیٰ ہیں، جنہیں قرآن وحدیث نے بیان فرمایا، اور ان کے رنگوں اور کیفیتوں پر ایک حد تک سربستہ رازوں سے عبرت کے لئے پردہ اٹھایا۔

☆☆☆

اسماء حسنیٰ کی حقیقت اور فوائد وبرکات:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک ہزار اسماء الحسنیٰ تورات میں، ایک ہزار انجیل میں، ایک ہزار زبور، اور ایک ہزار قرآن وسنت میں، یہ چار ہزار اسماء الحسنیٰ ہوئے۔ اور جو قرآن وسنت میں ہیں، وہ سب عربی میں ہیں، اور گزشتہ آسمانی کتابوں میں جو تھے وہ انہی زبانوں اور لغات میں تھے۔

ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی کوئی ایسی آیت نہیں جس میں اسماء حسنیٰ میں سے کسی ایک کی خوشبو اور جھلک نہ ہو، ہر آیت میں ان پاکیزہ اسماء کا رنگ واثر ضرور موجود ہے، جو شخص ہر آیت میں ادنیٰ غور اور توجہ مبذول کرے گا، وہ اس مقصد کو ایسا پائے گا جیسے کوئی کسی شیشہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی شکل وصورت دیکھے۔

اسی طرح تمام کائنات کی مخلوقات میں خواہ جمادات ہوں، یا از قسمِ نباتات، اسی طرح خشکی اور دریائی حیوانات، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں میں بھی اسماء حسنیٰ کا رنگ وجھلک نہایت واضح نظر آئے گا۔ کوئی ایسی مخلوق نہیں کہ جس میں یہ رنگ وجھلک واضح طور پر موجود نہ ہو۔

اور اگر کوئی اشرف المخلوقات انسان میں یہ دیکھنا چاہے تو سب سے زیادہ واضح ربوبیت کی تصویر نمایاں ہے۔ آپ دیکھیں! شکم مادر میں ایک حساس طاقتور عضو ہے، جو اس کی نگہداشت اور تربیت کرتا ہے، اور ان پانی کے قطروں کی حفاظت کرتا ہے، انہیں خون پلاتا رہتا ہے، اور ایک خاص مدت تک اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے، اور پھر تکمیل کے بعد اسے باہر پھینک دیتا ہے، اور وہ عضو نہ تو خود مختار ہے، نہ خود تخلیق کا کام انجام دے سکتا ہے، اور نہ مادر وپدر کو یہ پتہ چلتا ہے کہ حمل ٹھہر گیا ہے، اور نہ انہیں اس کے اندرونی انقلاب اور تبدیلی کا حال معلوم ہوتا ہے، نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ بچہ کب اور کس وقت کس نوعیت کے ساتھ پیدا ہو جائے گا۔

دہد نطفہ را صورتے چوں پری ☆ کہ کرداست برآب صورت گری

(سعدیؒ)

اور جب پیدا ہوتا ہے تو اپنا رزق ساتھ لاتا ہے، جس میں مناسب شکر ونمک، وٹامن وذائقہ اور قوت شاملِ حال رہتا ہے، اور ماں کو پتا نہیں چلتا کہ وہ دودھ جو پلا رہی ہے کب اور کیسے بنا؟ اور کتنی مقدار میں بنا؟ اس کے خون سرخ نے سفید وبراق دودھ کی شکل کیسے اختیار کی؟ اس میں مٹھاس کہاں سے آئی؟ پھر بغیر علم وکوشش اور سعی کے اس خشک سینے سے دو فوارے جوش مارتے ہوئے کیسے پیدا ہوئے؟ پھر اس بچے کے اعضاء بغیر اس کی اور اس کے والدین کی کوشش واختیار کے دن رات کیسے تناسب کے ساتھ بڑھتے رہے؟ کہ ہر عضو کو اس کی مناسب غذا پہنچتی

رہی۔ کسی کو خون، کسی کو پانی، کسی کو بلغم، کسی کو سوداء، کسی کو صفراء، اور ہر غدود کو اس کی مناسب مقدار میں غذا پہنچی۔ اور ہر رگ وریشہ کو مناسب رزق ملا۔

بچے کو صرف ایک غذا (دودھ) پلائی گئی، اس دودھ نے اندر جا کر کتنی شکل وصورت پیدا کر لی، اور یہ غذا ہضم ہو کر دونوں فضلات کیسے خارج ہوئے، اور اس دودھ سے آنکھوں کی روشنی کے لئے بیٹری کیسے تیار ہوئی، قوتِ سماعت کیسے پیدا ہوئی؟ رگوں میں خون اور بدن کو گوشت کیسے مہیا ہوئے؟ وغیرہ۔

اگر کوئی مغرب زدہ یورپ کا پجاری یہ کہے کہ یہ سارا کام دل اور جگر، گردے اور تلی نے انجام دیئے، تو وہ بتائے! کہ ان اعضاء رئیسہ نے یہ کام کہاں سے سیکھا؟ اور خود کس کی پیداوار اور مخلوق ہیں؟ وہ کوئی اور کام کیوں انجام نہیں دیتے؟ انہیں اس کام کی انجام دہی کی قوت واستعداد کس نے مہیا کی؟ سفید دودھ میں سرخی کہاں سے آئی؟ خشک روٹی میں خون بننے کی استعداد کس نے پیدا کی؟

تم ایک تیار لوہے کو جس طرح چاہو، جیسے چاہو ہزاروں مختلف شکل وصورت میں تبدیل کر کے اوزار، پرزے اسلحہ بناؤ، پھر اپنی عقل ودانش اور کاریگری پر ناز کرو بجا ہے، مگر ذرا یہ بتاؤ کہ یہ عقل تم کہاں سے لائے؟ کس نے دی؟ اور حیوانات کو چھوڑ کر یہ تمہیں کیوں عطاء ہوئی؟ مگر یہ بتاؤ تم لوہے کو محنت کر کے سونے میں تبدیل کر سکتے ہو؟ یا ایک دھات سے دوسری دھات بنا سکتے ہو؟ لوہے پر محنت کر کے اس کو خون، بلغم وصفراء میں تبدیل کر سکتے ہو؟ مٹی پر محنت کر کے اس کو منی یا ہڈی یا جگر یا دل یا گردہ بنا سکتے ہو؟ ان بے شمار مصنوعات میں جان اور روح ڈال سکتے ہو؟ اپنے بدن اور وجود سے موت کو ٹال سکتے ہو؟

ان سب کا جواب نفی میں ہوگا، تو ماننا پڑے گا کہ اوپر سے ایک ماوراء مخفی قوت موجود ہے، جس کے حکم و چاہت سے یہ سارا نظام اور دستورُ العمل چل رہا ہے، اسی کا نام ہے ربّ العلمین، جس نے مٹی سے منی بنائی، منی کے قطروں سے خون بنایا، خون سے گوشت، پوست، ہڈی، رگ وریشہ، دل، جگر، دماغ وسوچ، آنکھیں، سماعت اور بے شمار متضاد اعضاء۔ ترتیب دیئے جس سے عالم صغیر انسان بنا۔ پھر اس کے بدن واعظاء اور بناوٹ وترتیب کا مطالعہ کر کے تم نے اپنے لئے ایک لامحدود مشینری اوزار مصنوعات کا جال بچھایا، یہ سب ربّ العلمین کی ربوبیت وکاریگری کی مرہونِ منت ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل:۸] (اور اللہ وہ کچھ پیدا فرمائے گا جسے تم نہیں جانتے)۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ایک مچھر اور مکھی، یا ان سے بھی کمتر کوئی اگر سارا جہاں مل کر پیدا کرنا چاہے تو ہرگز

پیدانہیں کر سکتے۔

اگر کوئی ظاہر بین، مناظرِ قدرت سے خالی دامن نابینا یہ کہے کہ ان چیزوں میں پہلے سے سرخ ذرات موجود تھے، تو ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں، کہ وہ سرخ ذرات ازخود پیدا ہوئے یا کسی نے پیدا کئے؟ اگر اسباب کا سہارا لیتے چلے جاؤ گے، تو تھک کر خود ہی لاجواب ہو جاؤ گے، اور ضرور ایک مسبّبُ الاسباب کو مان کر ہی گلوخلاصی ہوگی۔

یہ دنیا عالمِ کبیر اتنا وسیع وعریض جہان ہے، اور یہ بیچارہ انسان عالمِ صغیر اس کی وسعتوں کا کیا احاطہ کرسکتا ہے؟ اس کے اندر سمندر، دریا، پہاڑ، راہیں، آبشاریں، لاسلکی تار، بجلی، ٹیلیفون، ٹیلیویژن، راڈار، کمپیوٹر، پرنٹنگ پریس، کیمرہ، انجن، کارخانے، فیکٹری، مشین، غرض سب کچھ ہے۔ دیکھ لو، خوب غور سے دیکھو، اور حقیقی کاریگر ومصوّر کو بھی دیکھو، اور یاد کرو کہ یہ سب کچھ کس کے ہیں؟ اور کس کے عطا کردہ ہیں؟ ؎

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں ☆ یا معدن وکوہ ودشت ودریا دیکھوں

ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے ☆ حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

دہریت اور کیمونزم بالشکوک پارٹی کا بانی لینن جس نے کہا تھا کہ سویت یونین سے ہم نے خدا کا تصوّر ہمیشہ کے لئے ختم کیا، اس کی بیٹی نے جو باپ سے بھی دو قدم آگے تھی، اپنے باپ کو مرتے وقت نہایت نزدیکی سے دیکھا کہ جس کے مرنے کا منظر نہایت حیران کن عجیب تھا، باپ کے مرنے کے بعد پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ: "میں دنیا سے دل برداشتہ ہوئی، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کائنات میں کوئی طاقت ضرور موجود ہے، جس تک ہماری رسائی ممکن نہیں، جو ہماری تدبیروں کو ناکارہ بنانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے"۔

کاش یہ ظلوم وجہول انسان بغاوت وسرکشی چھوڑ کر اپنے ربّ جلّ شانہٗ کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتا، اور انبیاء کرام علیہم السّلام کے مقدس فرامین وتعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی ذات کی دشمنی سے بچ جاتا، اور عذابِ الٰہی سے نجات حاصل کر کے سعادتِ دارین کا مستحق بن جاتا، اور ہمیشہ کے لئے نجات پالیتا۔

اسماءِ حسنیٰ:

- ان مبارک پاکیزہ ناموں کی کثرت مسمّٰی کی عظمت وجلال، اور بے پناہ بزرگی کی نشانی ہے۔ سارے عالم میں ظاہر یا پوشیدہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کا ربط وتعلق کسی اسم مبارک کے ساتھ نہ ہو۔ یہ پورا نظام، اور اس کی نشوونما، تروتازگی، حیات وبقاء انہیں مبارک ناموں کی مرہونِ منّت ہے، اور ہر مخلوق خواہ وہ کوئی بھی ہوانہیں پاکیزہ ناموں کا

وردا ور وظیفہ جاری رکھ کر حیات وزندگی حاصل کر رہی ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درخت کی شاخ اس وقت خشک ہو جاتی ہے، جب اس تک پانی نہیں پہنچتا، اسی طرح حمد وثناء باری تعالیٰ جہاں منقطع ہوگی وہاں مخلوقات پر بربادی وتباہی آجاتی ہے۔ ہر شجر وحجر، ہر پرندہ وہر سبزہ اسی حمد وثناء کی برکت سے بقاء وحیات حاصل کر رہا ہے۔ ہر مخلوق کے ساتھ الگ الگ اسماء حسنیٰ کا تعلق قائم ہے۔ انسان کا شمار اُفضل الذاکرین میں ہے، اس کو چاہیئے کہ اپنے مطالبات، اور بے شمار حاجات دنیا وآخرت کے لئے انہی مبارک ناموں کا انتخاب کر کے اس کا ورد جاری رکھے۔ غنا حاصل کرنے کیلئے یَامُغْنِي، بیماری سے شفاء پانے کے لئے یَاشَافِي، علم کے لئے یَاعَلِیمُ، روشنی کے لئے یَانُوْرُ، حفاظت کے لئے یَاحَفِیظُ کا ورد جاری رکھیں، علیٰ ہٰذ القیاس ہر مطلب وہر مقصد کے لئے اسی کی مناسبت کا خیال رکھے۔

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان اسماء کے وسیلہ سے دعاء کرتے ہیں۔ ارشاد گرامی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا...﴾ اللہ ہی کے لئے ہیں مبارک نام، انہی کے وسیلہ دعاء مانگا کرو۔

ربّ العزّت سبحانہ کے سارے نام توقیفی مسموعی وماثور ہیں، قیاس وظن اور ہر قسم کی تخمینوں سے بالاتر ہیں۔

جس طرح ذات باری تعالیٰ سبحانہ ہر عظمت وبلندی کا مالک ہے، یہی شان اسماء حسنیٰ کی بھی ہے۔ عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰی تِسْعَةً وَّتِسْعِیْنَ اِسْماً مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ [متفق علیہ]

حدیث پاک میں ننانوے ناموں کے تذکرے سے حصر مقصود نہیں، کیونکہ قرآن وحدیث میں مفرد ومرکب بہت سے دیگر اسماء کا بھی ذکر ہے۔ امام ترمذیؒ نے اسماء حسنیٰ کو تفصیلاً روایت کیا ہے، مگر بہت سارے اسماء وہاں بھی مذکور نہیں مثلاً:

اَلرَّبّ	اَلْعَالِمْ	اَلْعَلَّامْ	اَلْخَلَّاق	اَلْوِتْر	اَلْمُیَسِّرْ	اَلسَّامِعْ	اَلْقَاهِرْ
اَلْمُرِیْد	اَلرَّفِیْع	اَلْمُنْعِمْ	اَلْوَسِیْع	اَلْحَافِظْ	اَلْمُعْطِیْ	اَلسَّتَّار	اَلْوَحِیْد
اَلْجَمِیْل	اَلْقَدِیْر	اَلْمُقْتَدِر	اَلْوَلِیْ	اَلشَّافِیْ	اَلْجَابِرْ	اَلسُّبُّوْح	اَلْوَهَّاب
اَلْحَاکِمْ	اَلْحَکَمْ	اَلْمُفِیْد	اَلْمَلِکْ	اَلْمُحِیْط	اَلْحَنَّانْ	اَلْمَنَّانْ	اَلدَّیَّانْ
اَلتَّائِبْ	اَلصَّادِقْ	اَلْقَدِیْم	اَلصَّانِعْ	اَلشَّاکِر	اَلْمَوْلٰی	اَلْمُسَیِّر	اَلْحَبِّیْ

اَلْكَاشِف	اَلطَّيِّب	اَلْمُحِيط	اَلْفَعَّال	اَلْمُدَبِّر	اَلْفَاطِر	اَلْكَفِيل	اَلْوَفِیْ
اَلْوَافِی	اَلْمُغِيث	اَلْمُرَفِّق	اَلْجَوَّاد	اَلرَّفِيق	اَلْكَافِی	اَلْقَاضِی	اَلْعَادِل
اَلرَّازِق	اَلنَّاجِی	اَلْمُنْجِی	اَلْبَارّ	اَلرَّاشِد	اَلْاَمَان	اَلْاَكْبَر	اَلْاَقْرَب
اَلْمُحْسِن	اَلْمُجْمِل	اَلْمُفَضِّل	اَلْمُنِير	اَلْغَلِب	اَلصَّاحِب	اَلطَّاهِر	اَلشَّاهِد
اَلنَّاظِر	اَلْمَحْمُود	اَلسَّرِيع	اَلشَّدِيد	اَلْمُنَزِّل	اَلْمُتَرَقِّب	اَلْمَظْهَر	اَلْوَاضِع
اَلشَّارِع	اَلْعِمَاد	اَلسَّنَد	الذخر	المنقذ	اَلْحِرْز	اَلْفَرْد	اَلْكَنْز

اس کے علاوہ اور بھی اسماء ہیں، جو کہ تتبع وتلاش کے بعد معلوم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح چند مرکب اسماء جو کہ اکثر دعاؤں اور مناجاتوں میں مذکور ہیں مثلاً:

اَرْحَمُ اَلرَّاحِمِينَ، مُسَهِّلُ اَلْمُشْكِلَاتِ، خَيْرُ الرَّازِقِينَ، خَيْرُ الرَّاحِمِينَ، مُفَتِّحُ الْأَبْوَابِ، قَاضِی الْحَاجَاتِ، دَافِعُ الْبَلِيَّاتِ، جَامِعُ النَّاسِ، ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيمِ، ذُو انْتِقَامٍ، ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِينِ، رَاحِمُ الْمَسَاكِينَ، اَوَّلُ الْاَوَّلِينَ، آخِرُ الْاٰخِرِينَ، شَدِيْدُالعِقَابِ، سَرِيْعُ الْحِسَابِ، بَاسِطُ الْيَدَيْنِ بِالرَّحْمَةِ، عَظِيمُ الْعَفْوِ، حَسَنُ التَّجَاوُزِ، مُفَرِّجُ الْمَكْرُوْبِيْنَ، مُرَوِّحُ الْمَكْرُوْبِيْنَ، مُصَرِّفُ الْقُلُوْبِ، مُقَلِّبُ الْقُلُوْبِ، فَالِقُ الْإِصْبَاحِ، مُثَبِّتُ الْقُلُوْبِ، رَبُّ الْعِزَّتِ، رَبُّ الْعَالَمِيْنَ، فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، غَافِرُ الذَّنْبِ، قَابِلُ التَّوْبِ، شَدِيْدُ الْعِقَابِ، ذُوالطَّوْلِ، ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ، مُجِيبُ الدَّعْوَاتِ، فَعَّالٌ لِّمَايُرِيْدُ، غِيَاثُ الْمُسْتَغِيْثِيْنَ، اَمَانُ الْخَائِفِيْنَ، رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ، ذُوالْمَجْدِوالْكَرَمِ، اَكْرَمُ الْاَكْرَمِيْنَ، اَجْوَدُالْاَجْوَدِيْنَ، عالِمُ الْغَيْبِ، عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، سَتَّارُ الْعُيُوْبِ، غَفَّارُ الذُّنُوْبِ، كَاشِفُ الْغَمِّ، فَارِجُ الْهَمِّ، رَحْمٰنُ الدُّنْيَاوَ الْاٰخِرَةِ، رَحِيمُ الْاٰخِرَةِ، كَنْزُ الْفُقَرَاءِ، عَظِيمُ الرَّجَاءِ، منقذ الهلكى، رَافِعُ الدَّرَجَاتِ، بَارِئُ الْمَسْمُوْكَاتِ، وَلِیُّ الْإِحْسَانِ، حِرْزُ الضُّعَفَاءِ، رَافِعُ السَّمَاوٰتِ، خَيْرُ النَّاصِرِيْنَ، اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ، خَيْرُ الْمُعْطِيْنَ، بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، سَامِعُ الدُّعَاءِ، مُنْتَهَى الْعَائِذِيْنَ، صَرِيْخُ الْمُسْتَصْرِخِيْنَ، وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ۔

ان کے علاوہ اور بہت سے مبارک اور مرکب اسماء ہیں۔ رَزَقَنَا الْاِسْتِغَاثَةَ بِاَسْمَائِهِ الْحُسْنٰى آمین۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جو فہرست بیان کی ہے، یہ اسماء مبارکہ اس میں شامل نہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ تینوں عالم، دنیا، برزخ اور عالمِ آخرت کے ساتھ اسماءِ حسنیٰ کا ربط و تعلق حقیقی ہے، کیونکہ ربّ العزّت سبحانہ قدیم واجب الوجود صفات سے بالذات علی الدوام موصوف ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں، جن کا انفکاک عن الموصوف جائز نہیں۔ بقول حضرت شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کہ ان مبارک ناموں کے معانی اور تقاضوں کے ساتھ عالم کا قیام و بقاء بطورِ لزوم ہے، جب تک یہ تمام تقاضے اور سارے مطالب پورے نہیں ہوں گے ،اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، اور جب تقاضے سارے پورے ہو جائیں گے تو اتمامِ حجت بھی مکمل ہوگا، جو کہ قیامت کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

چونکہ سورۃ الفاتحہ خلاصۃ القرآن الکریم ہے، اور قرآن حکیم خلاصۃُ الکتبِ السماویۃ کے ساتھ خلاصۂ لوحِ محفوظ بھی ہے، اور جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خلاصۃ الفاتحۃ قرار پائی، جس میں تینوں مبارک اسماء مذکور ہوئے۔ اوّل ایجاد، دوسرے اِبقاء، تیسرے الرحیم سے انتاجِ عالم پر دلالت ہوئی، تو تینوں عالم اس میں شامل ہو گئے۔ ان میں الرحمٰن صفت کا تعلق دنیا اور برزخ دونوں کے ساتھ مضبوط ہے، کیونکہ دنیا میں دعاء، استغفار، تلاوت قرآن، طاعات، صدقات اور صدقاتِ جاریہ وغیرہ کا ثواب مسلسل اموات کو برزخ میں پہنچتا رہے گا، باِذنِ اللہ۔ اسی طرح بداعمالیوں کی سزا بھی گناہگاروں کو برزخ میں پہنچتی رہے گی۔ اور جب تسمیہ میں اسمِ ذات آ گیا تو ایسا سمجھو کہ تمام صفاتِ باری تعالیٰ کا لحاظ ہو گیا، کیونکہ موصوف کے اندر بدونِ ذکرِ صفات خود ساری صفات ملحوظ رہتی ہیں۔

پس اگر کوئی شخص دعاء میں یا اللہ کہے گا تو معنی یہ ہوگا کہ اے وہ ذات! جو تمام صفاتِ کمالیہ سے موصوف و متصف ہے۔ تو یا اللہ کہنے والے نے گویا کہ اللہ تعالیٰ کو جمیع صفات کے ساتھ پکارا، مزید صفات ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

ہاں! توضیح و تعیین کی خاطر اگر کوئی صفت ذکر ہو تو بہتر ہے، جیسے تسمیہ میں اسمِ ذات کے ساتھ دونوں صفت الرَّحْمٰنُ اور الرَّحِیْمُ مذکور ہوئیں، تکثیرًا لِلْفَائِدَةِ و تَتْمِیْمًا لِلدَّلَالَةِ، کیونکہ جب مخلوقات کی صفات عارضی ہوتی ہیں، پھر بھی موصوف اپنی صفات کے ساتھ ملحوظ رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ واجب الوجود کی ذاتی صفات کا کیا کہنا، وہ تو ذات سے ہرگز الگ نہیں ہو سکتے۔

مگر اسماء حسنیٰ سارے ایک جیسے نہیں، ہر ایک کے الفاظ، کلمات، معانی، اغراض، تقاضے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں، یہی تعدد و کثرت کی نشانی ہے، جیسے اکثر عام صیغوں اور کلمات کا حال ہے۔ پس جو معنی علیم کا ہے وہ حکیم کا نہیں، علیٰ ہٰذ القیاس۔ اور یہی اصلی بنیادی مسئلہ ہے کہ اسّی ہزار عالم مختلف الحقائق واحوال، مختلف منافع و اغراض، مختلف الوجود وبقاء پر مشتمل کائنات کی خلقت، انتظام تربیت، اصلاح وترقی، نتائج وعواقب وغیرہ۔ ان مختلف اسماء وصفات باری تعالیٰ کی نگہداشت وحفاظت اور حمایت میں موجود اور باقی رہتے ہیں۔ اور آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صفتِ تخلیق ورزق وصفت ابقاء ونتیجہ جس کا تعلق انسانوں کے ساتھ الگ اندازے کے ساتھ ہے، حیوانات ودیگر مخلوقات کے ساتھ دوسرے اندازے کے ساتھ ہوگا، یہ ہر چیز میں بدیہی اور واضح ہے، اور حدیث میں ارشاد ہے: لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَھَا۔ الحدیث

جب یہ تقاضے سارے پورے ہوں گے، اور صفت الرَّحمٰن عزّ شانہ اس پر محیط ہوگی، تو اتمام حجت ہوجائے گا، اور بس اسی طرح موجودہ زمانہ کی حیران کن ایجادات جو آئے دن بڑھتی جارہی ہیں اور انسانی مصنوعات کا دائرہ وسیع تر ہوتا بڑھ رہا ہے، مشرق ومغرب آپس میں مل کر ایک آواز میں منسلک ہوگئے، بلکہ مشرق کا فوٹو وعکس مغرب میں نظر آرہا ہے۔ مختصر مدّت میں انسان بذریعۂ جنگی طیارہ ہزار میل کی مسافت طے کرکے کہاں سے کہاں تک پہنچ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آنے والے دنوں میں مزید ترقی کے کیا کیا مدارج طے ہوں گے؟ یہ سارے ربّ العزّت سبحانہ کے صفاتی تقاضے ہیں، جو کہ کسی نہ کسی حدیث میں زبانِ نبوّت سے ان کی اطلاع اور خبر دیدی گئی تھی۔

ماضی کے مسلمانوں نے حسنِ ظن اور صداقت کی بنیاد پر ان چیزوں پر ایمان لایا، اور کیفیتِ مشاہدہ ووجود اشیاء سے مستغنی رہے، جبکہ موجودہ وقت کے لوگ ان ایمانی صداقتوں سے ناواقف ہیں، لہٰذا انہیں بالمشاہدہ عیاناً دکھانا پڑا، اور یہ سلسلہ چل رہا ہے، اور اتمامِ حجت کا مقصد پورا ہو رہا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ [الکھف: ۴۹] یعنی جو کچھ دنیا میں کیا تھا، وہ سامنے پائیں گے، دیکھیں گے۔ یہ مسئلہ موجودہ کمپیوٹر، ویڈیو، اور ٹی وی نے حل کیا، جو پہلے ایمان بالغیب کے درجہ میں تھا، اب مشاہدہ میں آگیا۔

اسی طرح حدیث پاک میں ہے کہ ایک وقت تمہارے ہاتھ کی چھڑی (چابک) بات کرے گی۔ ماضی کے مسلمانوں نے ایمان بالغیب کہہ کر اس کی تصدیق کی، اب ہمارے زمانے میں مشاہدہ ہو رہا ہے، ٹیپ ریکارڈ، یا

موبائل ہاتھ کی چھڑی وغیرہ بات کرر ہے ہیں۔غرض یہ کہ یہ ساری پیشین گوئیاں مشاہدے میں آکر اتمامِ حجت کا راستہ صاف کررہی ہیں۔

فائدہ:

حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مطلب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کیا کہ مَنْ اَحْصَاهَا أي حَفِظَهَا۔یعنی جو کوئی ان ننانوے اسماء حسنیٰ کو زبانی یاد کرے گا، اس کو دخولِ جنت نصیب ہوگا۔بڑی خوش قسمتی ہوگی کہ ہر مسلمان ان کو یاد کر کے حرزِ جان بنائے، اور ہر نماز کے بعد پابندی کے ساتھ ایک مرتبہ آیت الکرسی پڑھ کر بعد میں ان مبارک اسماء کی ایک مرتبہ تلاوت کرے۔اس پر صرف دو تین منٹ صرف ہوں گے، اور کروڑوں کا ثواب ملے گا۔

کیوں نہیں یہ اس ذات پاک کے نام ہیں جس کے احسانات کا کوئی اندازہ نہیں۔ماں باپ اور سارے جہاں سے زیادہ مہربان ہے۔لطف یہ ہے کہ ثواب کے علاوہ اس ناکارہ بندہ کے ساتھ اس کا تعلق پختہ ومضبوط رہے گا۔اس کے علاوہ دینی ودنیوی بے شمار مقاصد وحاجات بھی پورے ہوجائیں گے۔بدقسمتی ہوگی کہ ہم نے ہزاروں بازاری چیزوں کے نام تو یاد کئے ہیں، اور اپنے ربّ بلکہ کائنات کے ربّ کے نام یاد نہیں کئے، روزِ قیامت کتنی ندامت ہوگی؟ یہ اس کا لطف وذرہ نوازی ہے کہ ہم جیسے ناکاروں کو اپنے پاکیزہ ناموں کے پڑھنے کا اہل بنایا۔ ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب ☆ ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

دوئم یہ کہ اس کے پسندیدہ پاکیزہ ناموں کا معنیٰ واثر کیفیت ورنگ اپنے اندر پیدا کیا جائے، یہی مطلب ہے: تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللهِ کا۔اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا مطلب شفقت ورحمت اپنے اندر پیدا کرنا۔اَلْقُدُّوْسُ پاک، اپنے ظاہر وباطن قلب ولسان کو صاف ستھرا رکھنا۔اَلسَّلَامُ سلامتی دینے والا، اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔الحدیث کیا خوش قسمتی ہوگی کہ یہ مبارک اسماء حسنیٰ زبانی یاد بھی ہوں، اور عملی بھی۔اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا وَجَمِيْعَ عِبَادِكَ مِنْ اِخْوَانِنَا وَاغْفِرْ لِاُمَّةِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ۔

﴿وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

ترجمہ: اور ان لوگوں کو چھوڑ دو، جو اس کے ناموں میں کجروی اختیار کرتے ہیں، وہ ان کاموں کا بدلہ پالیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔

☆☆☆

اسمائے حسنیٰ میں کجروی اختیار کرنے کا مطلب کیا ہے؟

اس بارے میں تفسیر قرطبی اور تفسیر دُرّ منثور میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، کہ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے ناموں سے مشتق کر کے اپنے بتوں کے نام رکھ دیئے تھے، مثلاً: اللہ سے اَللَّاتُ کا، اور اَلْعَزِیْزُ سے عُزّٰی کا، اور اَلْمَنَّانُ سے مَنَات کا، اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں سے اپنے ناپاک بتوں کا نام نکالا کرتے تھے۔ اور تفسیر درّ منثور میں حضرت سلیمان بن مہران اعمش رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تفسیر یوں نقل کی ہے کہ یُدْخِلُوْنَ فِیْهَا مَا لَیْسَ مِنْهَا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ناموں میں ان ناموں کا اضافہ کر دیتے ہیں، جو اس کے نام نہیں ہیں، یعنی اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے لئے نام مقرر کرتے ہیں۔

علماء اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ توقیفی ہیں، لہٰذا قرآن وحدیث میں جو اسماء وارد ہوئے ہیں (خواہ کسی نوعیت سے ہوں، یا کسی ماثورہ دعاء میں مذکور ہوں، جیسے کہ تفصیل گزر چکی) ان کے علاوہ دوسرے ناموں سے (اگرچہ ان کے معنی بہتر ہوں) اللہ تعالیٰ شانہ کو موصوف نہ کیا جائے، بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کے نام مخلوق کے لئے استعمال کر لیتے ہیں، وہ اس طریقے پر کہ لفظ عبد کو چھوڑ کر مسمّٰی کا نام لیتے ہیں، اور کہتے ہیں، قدوس خان، رحمٰن خان، غفور صاحب، شکور خان، غفار خان وغیرہ۔ یہ سب ناجائز اور مکروہ، اور بے احترامی ہے۔ چاہئے کہ ان سب کے شروع میں لفظ ''عبد'' بول کر پکارا جائے۔ یہاں تک کہ بعض جاہل اپنے بچوں کا نام ''اللہ محمد'' اور ''محمد رسول اللہ'' رکھتے ہیں۔ انہیں سختی سے منع کیا جائے، اور ایسے ناموں کو تبدیل کیا جائے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو آتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نام پوچھتے، اور غیر شرعی نام فوراً تبدیل کرتے۔ علماء کرام کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ ناموں کی اصلاح کریں۔ آج کل اکثر لوگ انگریزوں اور کافروں کے نام رکھنے پر فخر کرتے ہیں، اور اسلامی ناموں کو پسند نہیں کرتے، وہ بڑے مجرم ہوتے ہیں، چاہئے کہ لوگ اس طرف متوجہ ہو کر اپنی اصلاح کریں۔ البتہ اگر اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں میں سے کسی ایک اسمِ مقدس کا کسی عجمی زبان میں ترجمہ استعمال ہو، تو علماء نے اس کی بامرِ مجبوری اجازت دیدی ہے، جیسے ''خدا'' یہ ''اللہ'' کا ترجمہ ہے، جو کہ چند زبانوں میں اس قدر بکثرت مستعمل ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر جاری ہے، عَلٰی هٰذَا الْقِیَاس۔

چند دوسرے اسماء جو مختلف عجمی لوگوں کے ہاں بکثرت رائج اور مستعمل ہیں۔ حدیث شریف میں روایت ہے کہ ماں باپ پر اولاد کے تین حقوق ہیں:

(۱)...... پیدائش پر ان کا شرعی نام رکھیں۔

(۲)...... ان کی تربیت اور دینی تعلیم کا اہتمام کریں۔

(۳)...... دیندار شریف خاندان میں ان کا نکاح کرائیں۔ پس ان تینوں حقوق میں خیانت ناجائز اور گناہ ہی ہوگی۔ واللہ الھادي۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ
حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ
جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ
مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾
مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

ترجمہ: اور جن کو ہم نے پیدا کیا، ان میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی ہے، اور اسی کے موافق انصاف کرتی ہے ﴿۱۸۱﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، ہم ان کو اس طرح ڈھیل دیں گے، کہ ان کو خبر بھی نہ ہو ﴿۱۸۲﴾ اور میں انہیں ڈھیل دوں گا، بیشک میری تدبیر مضبوط ہے ﴿۱۸۳﴾ کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے صاحب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کوئی جنون نہیں ہے، وہ تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہے ﴿۱۸۴﴾ کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں، اور دوسری چیزوں میں غور نہیں کیا، جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں، اور اس بات میں کہ ان کی اجل قریب آ پہنچی ہو، سو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے ﴿۱۸۵﴾ اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کرے، سو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور وہ انہیں گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے ﴿۱۸۶﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ کا استدراج تباہ کن ہے، اور ہدایت اور ضلالت کا وہی مالک ہے:

پہلے بھی بیان ہوا کہ سارے لوگ ایک جیسے بُرے نہیں ہوتے، مکذّبین کی موجودگی اور انہی کی صفوں میں

مصدّقین بھی ہوتے ہیں، اسی کو بتایا، یعنی ان آیات میں اوّل تو یہ فرمایا کہ ہم نے جن لوگوں کو پیدا فرمایا ہے، ان میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کی ہدایت دینے والی ہے، یہ لوگ خود حق پر گامزن ہیں، اور حق کی تبلیغ کرتے ہیں، اور حق کی راہ بتاتے ہیں، اور حق کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔

الفاظ کا عموم جنّوں اور انسانوں سب کو شامل ہے۔ ان میں بہت سے لوگ وہ ہیں جنہیں دوزخ کے لئے پیدا فرمایا، ان کا ذکر قریب ہی گزر چکا ہے، اور یہاں صراحت کے ساتھ واضح فرمایا کہ ان میں حق کی راہ بتانے والے، اور حق کے موافق انصاف کرنے والے لوگ بھی ہیں۔ یہ جہاں کبھی نیک لوگوں سے خالی نہیں رہا، اور ایسے لوگ اگرچہ قلت میں رہے، مگر ہر زمانے میں موجود رہے، اور رہیں گے۔

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے، کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ اُمت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، میری اُمت ہے، جو اپنے سب جھگڑوں کے فیصلے حق و انصاف یعنی قانونِ الٰہی کے مطابق کریں گے، اور لینے دینے کے تمام معاملات میں حق وانصاف پر چلیں گے۔

دراصل یہ آیت اس گزشتہ آیت کی نظیر ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کے اچھے لوگوں کے بارے میں ہے: ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰٓ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ﴾ [الأعراف: ۱۵۹] جس کی تفسیر پچھلی آیات میں گزر چکی ہے، اور مزید تشریح آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔

امام عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کر کے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے حق میں آئی ہے، اور تم سے پہلے بھی ایک اُمّت کو یہ صفات عطا ہو چکی ہیں (یعنی قوم موسیٰ علیہ السلام) پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰٓ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ﴾ جو ابھی گزری۔

مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمّت میں بھی ایک جماعت ان صفات کی حامل تھی کہ لوگوں کی رہنمائی میں، اور باہمی جھگڑوں کے تصفیہ میں شریعتِ الٰہیہ کا مکمل اتباع کرتی تھی، اور **خيرُ الأمَم أمّة محمدية**، تو ان عظیم خدمات اور اعلیٰ اقدار کی بطریق اولیٰ خصوصی امتیاز کی حقدار ہے۔

قرون مشہود لہا بالخیر کو ڈیڑھ ہزار سال گزرے، مگر ان خصوصی صفات اور برکات وکمالات کی محمل جماعت آج بھی بکثرت موجود ہے، الحمد للہ۔ اور اُمت محمدیہ علیٰ نبیہا الصلوٰۃ والسلام کی دوسری تمام امّتوں پر فضیلت اور فوقیت کا راز، اور اس کا طغرائے امتیاز ہی حق پرستی اور حق وانصاف کی سرپرستی ہے، جو کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

والی صفت کے ساتھ موصوف ہے۔اس اُمت کی اہلِ حق جماعت جس کی زندگی بعینہٖ کتاب وسنت کے اتباع کے لیے وقف ہے،اور تمام شریعت پر اس کا ایسا عمل جاری ومبنی ہے جس میں ذرہ برابر خلاف ورزی کا نام ونشان نہیں ہے۔

یہ چند کلمات جو ہم نے تحریر کئے، یہ اس جماعتِ خاصہ قلیلہ کے متعلق تھے،رہی مجموعی اُمت وہ اس وقت تو یہود ونصارٰی کی غلامی کا شکار ہے۔ساٹھ کے قریب مسلمان ممالک کرۂ ارض پر موجود ہیں،سرمایہ اور دولت سے سرشار خوب آباد ہیں، ان ممالک اسلامیہ میں کوئی ایک ملک ایسا نہیں کہ جس کے سربراہ اور اربابِ حل وعقد کو اللہ تعالیٰ شانہٗ اور اس کے عظیم فرستادہ رسول حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی کتاب قرآن حکیم، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے ساتھ کوئی رشتہ اور تعلق ہو۔تمام ممالک اسلامیہ کے بڑے اور ان کے زیر سایہ پھلتے پھولتے وزراء، ارکانِ اسمبلی، دیگر سرمایہ دار، کارخانہ دار، سیاستدان اور قبائلی سردار ونواب اسلام سے اتنے دور اور بیگانہ ہیں کہ انہیں کلمہ طیبہ اور سورۂ اخلاص پڑھنے کی سعادت تک نصیب نہیں۔

وہ سارے سب کے سب یورپ اور مغرب کے اُمّتی نظر آتے ہیں۔وہ آئے دن اسی تاڑ اور انتظار میں رہتے ہیں کہ بچا کھچا اسلام جو لوگوں میں ہے کسی طرح اس کا بھی دنیا سے اگر خاتمہ ہو تو انہیں شاید چین نصیب ہو۔وہ جب اسلام اور قرآن وسنت کا نام سنتے ہیں تو ان کی پیشانی پر بل پڑتے ہیں،اور ان کا بلڈ پریشر ہائی ہوجاتا ہے،اور فالج زدہ کی طرح ان کے چہرے دیکھنے کے قابل نہیں رہتے۔

اگلی آیت میں ایسے لوگوں کے بارے میں تنبیہ ہے کہ جب لوگ خواہ غیر مسلم ہوں یا نام کے مسلمان، وہ کیوں دنیا میں پھلتے پھولتے آباد اور خوشحال ہیں؟ حق تو یہ تھا کہ وہ نہایت مصائب وبلیات اور پریشانیوں میں ڈوبے ہوئے غرق نظر آتے۔

جواب ارشاد فرمایا کہ یہ قدرت کی طرف سے استدراج اور ڈھیل ہے۔یہ اسباب وفراوانی اور خوشحالی جو انہیں یہاں نصیب ہیں، یہ ان کی آزمائش اور تباہی کے اسباب ہیں، تاکہ ان پر گرفت مضبوط ہو، جیسے چوہوں کے پکڑنے کا بازار میں ایک آلہ ہوتا ہے،لوگ اس پر بسکٹ رکھ کر چوہے کے راستہ پر رکھ دیتے ہیں، ان کا مقصد تو چوہوں کی دعوت نہیں ہوتا، بلکہ ان کے پکڑنے، گرفتار کرنے کا حیلہ ہی ہوتا ہے کہ وہ بسکٹ کھانے آجائے اور پھنس جائے۔دوسری بات یہ ہے کہ دنیا اور اس کی ساری نعمتیں اور خوشحالیاں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر نہیں، ورنہ منکرِ خدا کو ایک گھونٹ پانی بھی نصیب نہ ہوتا۔[مشکوۃ]

چونکہ دنیا ربّ العزّت کے نزدیک جب مچھر کے پَر سے بھی حقیر و بے قیمت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ اسے حقیر و بے قیمت لوگوں کو دیدیتا ہے، اور اپنے خاص بندوں کو دنیا سے اسی طرح بچاتا ہے، جیسے تم اپنے مریض کو مضر اشیاء سے بچاتے اور پرہیز کراتے ہو۔ [مشکوٰۃ] تو فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ یہ لوگ ہر قسم کی خرمستیوں میں مشغول ہیں، مگر ان کی پکڑ نہیں ہوتی، اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہیں، اور مسلمان بھی ان کا ظاہری حال دیکھ کر ان پر رشک نہ کریں۔ دنیا میں آباد ہونا، اور ہر قسم کی خوشحالیوں میں رہنا یہ کسی مقبولیت کی نشانی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عزّ سجانہ کا ایک تکوینی قانون استدراج بھی ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنے کفر اور بداعمالی میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ شانہ اس کو ڈھیل دیتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ فرعون ونمرود، شدّاد وغیرہ کی طرح بے قابو ہو کر خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے، اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اور کیا ہوگا، یہ ڈھیل مزید اس کے لئے سرکشی کا باعث بنتی ہے، یہاں تک کہ اچانک اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

تو مشو مغرور بر حلم خدا ☆ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

اسی کو فرمایا:

﴿وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾ اور میں انہیں ڈھیل دوں گا، بے شک میری تدبیر مضبوط ہے۔ جب میری پکڑ آجاتی ہے تو پھر کسی مجرم کی خلاصی نہیں ہوسکتی۔ فرعون ستر لاکھ فوجیوں کے ساتھ غرق ہوا، ابرہہ اشرم کے ستر ہزار لشکر کو پرندوں نے چاٹ کھایا، اور مارا۔ نمرود بن کنعان کی پوری فوج کو مچھروں نے تباہ کیا، شدّاد پوری فوج اور مصنوعی جنت کے ساتھ فرشتہ کی چیخ کے ساتھ زمین میں دھنس گیا، مسخ ہو کر وغیرہ۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تو یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس کے گناہوں اور بداعمالیوں کے باوجود دنیا میں سے اس کی محبوب چیزیں وافر مقدار میں دے رہا ہے، تو وہ استدراج ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ انعام کی آیت کریمہ: ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾ [الأنعام: ۴۴] کی تلاوت فرمائی۔ [مشکوٰۃ] یعنی جب یہ لوگ اس چیز کو بھلا بیٹھے جو ان کو یاد دلائی گئی تھی، تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ یہ اپنی ملی ہوئی نعمت و دولت پر اکڑ گئے، مغرور ہو گئے، تو ہم نے اچانک ان کو

عذاب میں پکڑلیا، تو وہ نجات وخلاصی سے نا اُمید ہو کر رہ گئے۔

یہ استدراج جس طرح کفار ومشرکین کے ساتھ ہوتا ہے، اسی طرح فاسق وفاجر گناہگار مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خیر القرون کے نیک لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے اوپر جب دیکھتے تھے تو خوفزدہ ہو کر روتے تھے، اور صدقات کرتے تھے، اور استدراج سے اللہ تعالیٰ شانہ کی پناہ مانگتے تھے۔

﴿اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا ٚ مَا بِصَاحِبِہِمۡ مِّنۡ جِنَّۃٍ ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ﴾ کیا ان مکذبین نے غور و فکر نہیں کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جنون نہیں، ان کی دانشمندی اور عقل وحکمت کے سامنے تو ساری دنیا کے عقلاء وحکماء ودانشور حیران ہیں، کوئی افلاطون جیسے لاکھوں حکیم اس کے پاؤں کے گرد وغبار کے ساتھ بھی برابر نہیں، تو ان کے بارے میں جنون کا گمان کرنا خود جنون اور پاگل پن ہے۔ یہ عظیم مرشد ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والے اعلیٰ درجہ کے عقلمند تو کیا، بلکہ پورے جہاں کے عقلمندوں کے رہنما اور برگزیدہ ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

کل تک تم سب معترف تھے کہ وہ سب سے زیادہ عقلمند انسان ہیں۔ کل تک تم ان کی عقلمندی اور صائب رائے ہونے پر متفق نظر آتے تھے، بلکہ اس پر فخر کرتے تھے، کہ ہماری قوم قریش میں ایسے بے مثال امین ودیانتدار متقی ہستی موجود ہے، مگر جب اسی عقلمند نے اللہ تعالیٰ کی توحید ووحدانیت کا اعلان فرمایا، تو تمہاری رائے بدل گئی، اور تمہارے خیالات اُلٹے ہو گئے، یہی تو تمہارے جنون اور نا عاقبت اندیشی کی دلیل ہے۔ وہ نہیں بدلے، تم بدل گئے، اور تبدیلی پاگلوں کی نشانی ہوتی ہے کہ

برعکس نہند نام زنگی کافور۔ خوب غور کرو۔

﴿اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾......تا......﴿بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ﴾ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں غور نہیں کیا؟ اور آسمان وزمین کے اندر اور ان کے نیچے اور درمیانی بے شمار مخلوقات ومصنوعات، علویات اور سفلیات اور طرح طرح کی مخلوقات میں غور وفکر نہیں کیا؟ اس میں خود انسان بھی شامل ہے۔ ﴿وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾ [الذاریات: ۲۱] (اور تمہارے اپنے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟)۔

تم اپنی تخلیق اور بدنی ساخت، اور اپنے اعضاء ظاہری وحواس باطنی میں غور کرو، اور اس بات پر بھی کہ تم پر باری باری موت آتی ہے، تمہارے اندر آج تک ایسا کوئی شخص موجود نہیں جو موت سے منکر ہو، پھر یہ موت ایک

حیثیت سے اٹل اور یقینی ہے، اسی کے ساتھ قیامت کی طرح اس کا وقت معلوم نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ موت اچانک آ کر سارا نظامِ زندگی درہم برہم ہو، جس کے نتیجے میں ابدی دوزخ ہو، تو پھر کچھ بھی کام نہیں آئے گا۔

حق تو یہ ہے کہ ان تمام امورِ یقینیہ مقررہ پر ایمان لاؤ، اپنی اصلاح کرو، ابدی عذاب سے بچو، اگر ان تمام چیزوں اور عجائباتِ قدرت میں غور نہ کرو گے، اور ایمان قبول نہ کرو گے، تو آگے تمہیں کس چیز کا انتظار ہے؟ کہ اسے دیکھ کر ایمان لاؤ گے۔ اس عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی اور قرآن کریم کے بعد کوئی کتاب نہیں، اگر ان پر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر کس کتاب پر ایمان لاؤ گے؟ اس کے بعد کوئی ایسی چیز نہیں جس پر یہ لوگ ایمان لائیں۔ اگر تمہارے اندر ذرہ برابر فہم و دانش ہوتی، تو تم کب کے مسلمان ہو چکے ہوتے، مزید کسی چیز کا انتظار ہی نہ کرتے۔ معلوم ہوا کہ جس طرح پہلے کہا تھا کہ یہ لوگ اندھے، گونگے، بہرے ہیں، پس وہی تو تم ہو وجہ یہ ہے:

﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرے سو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں (پس وہ تدبر و تفکر سے سراسر محروم رہے گا) اور اللہ تعالیٰ نے انہیں چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں گے۔ اور انہیں حق قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ واللہ الھادي

...... ❁ ...... ❁ ...... ❁ ......

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا
لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ
كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ: وہ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا واقع ہونا کب ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم صرف میرے رب ہی کے پاس ہے، اسے اس کے وقت پر وہی ظاہر فرمائے گا، وہ آسمانوں میں اور زمین میں بھاری پڑ جائے گی، تمہارے پاس اچانک ہی آ جائے گی، وہ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ گویا آپ اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر چکے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے ﴿۱۸۷﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

کفار مکہ، مشرکین عرب یہ نہیں کہ صرف توحید کے منکر تھے، بلکہ تمام دینی عقائد کے یا مکمل منکر تھے، یا ان میں اپنی من مانی اور خواہشات کو دخیل سمجھتے تھے۔ وہ توحید، رسالت، آسمانی کتاب اور بعث بعد الموت، یعنی قیامت کی سختی سے انکار کرتے تھے، اور حیات بعد الموت کو تقریباً محال اور غیر ممکن تصور کرتے تھے۔

قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے: چونکہ سرور عالم ﷺ توحید کی دعوت کے ساتھ قیامت کے بارے میں بھی خبر دیتے تھے، اور قیامت کے احوال اور اس کی سختی و ہولناکی بھی بیان کرتے تھے، اس لئے مشرکین قیامت کے بارے میں بھی طرح طرح کے شکوک وشبہات پیش کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ جب انسانی بدن مٹی میں گھل سڑ کر ریزہ ریزہ مٹی کی طرح ہو جائے گا، تو ان ذرات کو دوبارہ جمع کرنا، اور جوڑنا، اور پھر اسے ترتیب دے کر زندہ کرنا بالکل ناممکن ہے۔ آج تک ہم نے نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے کہ کوئی مردہ زندہ ہو گیا، اور وہ یہ بھی کہتے تھے: ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ [یونس:۴۸] (قیامت آنے کا جو وعدہ ہے وہ کب پورا ہوگا)۔

ان کا مطلب وقت کا پوچھنا نہ تھا، بلکہ وقوعِ قیامت کا انکار کرنا تھا، اور اسے ناممکن سمجھ کر استہزاءً پوچھتے رہتے تھے کہ جس قیامت سے ہمیں ڈراتے ہو اس کو لاتے کیوں نہیں ہو؟ قیامت کے نہ آنے سے، اور امتدادِ اجل سے وہ عدمِ وقوع اور عدمِ امکان پر استدلال کرتے تھے۔

یہ بات قرآن حکیم میں دوسو سے زائد مقامات پر مذکور ہے، خاص کر مکی سورتوں میں۔ انہیں بار بار جواب دیا گیا ہے کہ قیامت اپنے وقت پر آئے گی، وہ کسی کے کہنے اور مطالبے سے نہیں آئے گی، وہ اٹل اور یقینی ہے، اسے کوئی طاقت منسوخ نہیں کر سکتی، اور نہ ہی کوئی اس کو آگے پیچھے کر سکتی ہے، یہ تمہارا مطالبہ تمہاری حماقت پر مبنی ہے، کیا یہ کسی پیغمبر کے ہاتھ میں ہے؟ یا تمہارے مطالبہ کا پابند ہے؟ جس طرح تمہاری موت یقینی ہے، جس کا تم بھی اقرار کرتے ہو، مگر موت کا صحیح وقت کسی کو معلوم نہیں اسی طرح، قیامت بھی یقینی ہے، مگر اس کی گھڑی کا سوائے ربّ العزّت سبحانہ کے کسی کو معلوم نہیں۔

اور یہ پیغمبروں کے فرائض میں شامل بھی نہیں، اور نہ ہی ان کو معلوم ہے۔ وہ صرف بشیر ونذیر ہیں، اور احکامِ الٰہی کی تبلیغ پر مامور ہیں۔ قیامت کا وقت تکوینی امر ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا﴾ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا واقع ہونا کب ہے؟ السَّاعَةِ سے مراد قیامت ہے، ویسے السَّاعَةِ بمعنی گھڑی ہے، اور مختصر وقت کو بھی سَاعَةِ کہتے ہیں، قیامت کا دن اگرچہ بہت لمبا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے لئے نہایت مختصر ہی ہے، جیسے گھڑی کا گھنٹہ۔ علامہ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے البدور السافرۃ میں قیامت کے اسّی (۸۰) نام لکھے ہیں۔ ہم نے سورۃ الحاقّہ میں بیان کیا ہے، وہاں دیکھیں۔

﴿مُرْسٰهَا﴾ اِرسَاء کہتے ہیں قائم ہونے، کھڑے ہونے، اور واقع ہونے کو، جیسے ارشاد ہے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [هود: ۴۱] (اس کا چلنا اللہ ہی کے نام سے ہے، اور لنگر ڈالنا بھی، یقیناً میرا پروردگار بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے)۔ دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا﴾ [النازعات: ۳۲] (اور پہاڑوں کو گاڑ دیا)۔

فرمایا قیامت کا علم صرف میرے ربّ کے پاس ہے، بندوں سے اسے مخفی رکھا ہے، اور اس اخفاء میں وہی حکمت کارفرما ہے، جیسے کہ ساعتِ جمعۃ، شبِ قدر اور اسمِ اعظم کے پوشیدہ رکھنے میں ہے۔

ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل وصورت میں تشریف لائے، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سے سوالات پوچھے، جن میں سے ایک سوال یہ تھا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مَاالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ۔ قیامت کے وقت کے جاننے میں سائل اور مسئول عنہا دونوں برابر یعنی بے خبر ہیں۔ [متفق علیه]

﴿ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ قیامت کا واقعہ آسمانوں اور زمین پر، یعنی علویات وسفلیات پر بھاری اور بوجھل ہے، کیونکہ سارا جہاں درہم برہم ہو کر ختم ہو جائے گا، اسی کو بھاری فرمایا۔

﴿لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے اچانک صور پھونکنے پر پورے عالم میں۔ ﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ [الحج: ۱] (قیامت کا بھونچال بڑی زبردست چیز ہے) کا ورود ہوگا، جس سے پورا جہاں تباہ ہوگا۔ قیامت کی اچانک آمد کے متعلق بہت سی روایات ملتی ہیں، مثلاً بخاری ومسلم کی روایت میں ہے کہ بازار میں دو آدمی کپڑا پھیلائیں گے، اور قیمت ابھی نہیں طے کر پائیں گے کہ قیامت برپا ہو جائے گی۔ کوئی شخص اپنی اونٹنی کا دودھ دوہ کر اٹھائے گا تو اس کے پینے سے پہلے قیامت برپا ہو جائے گی۔ ایک شخص روٹی کا لقمہ اٹھائے گا، کھانے سے

پہلے قیامت آجائے گی۔ ایک شخص اپنا حوض لیپ رہا ہوگا کہ قیامت آجائے گی، اور جانور پانی نہ پی سکیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ سارے لوگ اپنے اپنے کاروبار اور روزمرہ زندگی کے معاملات اور معمولات میں مصروف ہوں گے کہ اچانک قیامت آجائے گی۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ میں اپنی جان کے لئے کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں، مگر اتنا ہی جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا، اور اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو بہت سے منافع حاصل کر لیتا، اور مجھے کوئی ناگوار چیز نہ پہنچتی، میں تو ان لوگوں کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں، جو ایمان رکھتے ہیں ﴿۱۸۸﴾

معارف ومنازل

نہ میں مختارِ کُل ہوں، اور نہ غیب جانتا ہوں:

ہر مسلمان موحّد کا پختہ یقین یہ ہونا چاہئے، بلکہ یہ بات ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے کہ نافع اور ضارّ صرف اللہ تعالیٰ ہے مافَوقَ الأسباب، اور غائبانہ طور پر وہی ربّ نفع پہنچاتا ہے، اور وہی ضرر پہنچاتا ہے۔ اَلنَّافِعُ اور اَلضَّارُّ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہیں، اور مشکل کشا، حاجت روا، صرف وہی ذات پاک ہے۔ چنانچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرما کر یہ ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو بتادیں کہ میں اپنے لئے ذرا بھی کسی نفع یا کسی ضرر کا مالک نہیں ہوں، اللہ تعالیٰ کی مشیّت، اور اس کی قضا وقدر کے موافق ہی مجھے نفع وضرر پہنچتا ہے، مجھے اپنے نفع اور ضرر کے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ اعلان کرادیا، تاکہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا بندہ سمجھیں، جیسا کہ کلمہ شہادت کا مطلب ہے: وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اور لوگ یہ بھی پختہ یقین کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو نفع ونقصان پہنچتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت سے پہنچتا ہے، نفع ونقصان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

بندوں کو اللہ تعالیٰ نے جو علم وفہم، تدبیر، محنت اور کوشش کا اختیار دیا ہے، جس کے ذریعہ کچھ فائدہ ہوجاتا ہے،

یا کسی نقصان سے بچ جاتے ہیں، اس طرح کا اختیار سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی تھا۔ ان تدابیر اور اسباب کے اختیار کرنے، اور اعضاء وجوارح کو حرکت دینے سے جو کچھ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے، یا بعض حالات میں کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے، تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم کے تابع ہے، خود مختاری نہیں ہے۔

لفظ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کی تفسیر اس صورت میں ہے جب استثناء متصل ہو، اور اگر استثناء منقطع کیا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہے، بس وہی ہوگا، میرا اختیار کچھ بھی نہیں۔ [روح المعاني]

﴿وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ...﴾ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی فرما دیں کہ اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو میں بہت سی خیر جمع کر لیتا، اور مجھے کوئی ناگوار چیز پیش نہ آتی۔ نفع یا ضرر پہنچنے سے پہلے ہی اگر علم ہو جائے کہ ان میں سے کوئی امر پیش آنے والا ہے تو پہلے ہی سے ایسی تدبیر اختیار کر لی جائے کہ نفع زیادہ سے زیادہ ہو، اور ضرر ونقصان کے آنے والے راستے مسدود اور بند ہوں، لیکن حال یہ تھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک نہیں بہت سی تکلیفیں مختلف اوقات میں پہنچیں، جن کا پہلے سے علم نہیں ہوتا تھا، جن کے متعدد واقعات کتبِ حدیث و سیرت کے اوراق میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ جس طرح ذات کے اعتبار سے واحد لاشریک ہے، اسی طرح صفات میں بھی، پس اس کی صفات میں کوئی اس کا ساجی اور برابر نہیں ہو سکتا۔

پہلی آیت میں مشرکین اور عوام الناس کے اس غلط عقیدہ کی باقاعدہ تردید ہے جو ان لوگوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں قائم کر رکھا تھا کہ وہ غیب داں ہوتے ہیں، ان کا علم اللہ تعالیٰ کی طرح کائنات کے ذرہ ذرہ پر حاوی ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ نفع اور نقصان کے مالک ہوتے ہیں، جس طرح چاہیں، اور جس کے لئے چاہیں، اور جو چاہیں وہ مختارِ کُل ہو کر نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

یہ وہ کچا اور مشرکانہ عقیدہ ہے جو کہ یہود ونصاریٰ کے عقائد سے ماخوذ ہے، یہود نے عزیر علیہ السلام کو، نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو، اور ان بدعتی مشرکوں نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، اور اسی طرح صابیوں نے اور ہندوؤں نے اپنے معبودوں اور دیوتاؤں کو ربّ العزّت کے ساتھ برابر اور شریک ٹھہرا کر بڑا ظلم کیا، حالانکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے بندے، اور اس کی مخلوق ہیں۔

دیکھیں! اللہ تعالیٰ شانہ ازلی، ابدی، حیّ قیوم ہے، ہر قسم کی مخلوقات کی صفات سے منزہ اور پاک ہے۔ ابھی

بھی زندہ ہے، اور ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا، جبکہ یہ سارے اُولوالعزم موت اور فناء کا جام پی کر دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اور ساری زندگی حق تعالیٰ شانہ کی عبادت، سجدہ ریزی، فرمانبرداری واطاعت میں گزار کر داعی اجل کو لبیک کہہ چکے ہیں، جن کی تبلیغ وہدایات اسی نہج پر اب بھی موجود ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں، اور اس کے دین کے داعی اور خدمتگار ہیں۔

خبردار! اس کے علاوہ ہماری کوئی حیثیت نہیں۔قرآن وسنت کی ساری تعلیمات کا یہی خلاصہ ہے، جو کوئی اس حقیقت سے انحراف کرے گا، وہ شریعتِ اسلامیہ کی تعلیمات کی رُو سے مشرک سمجھا جائے گا، اور قیامت کی نجات سے محروم رہے گا۔اس آیت کریمہ نے اس مشرکانہ عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے بتلادیا کہ علم غیب اور تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا علمِ کلّی صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتی مخصوص صفت ہے، اس میں کسی بھی مخلوق کو شریک کرنا خواہ وہ فرشتہ ہو، یا نبی و رسول ہو شرک اور ظلمِ عظیم ہے، اور پوری شریعت کی نفی اور انکار ہے۔اسی طرح ہر نفع اور نقصان کا مالک ہونا صرف اللہ تعالیٰ ہی کی صفتِ مخصوصہ ہے، اس میں کسی نبی ورسول یا فرشتہ کو شریک ٹھہرانا بھی شرک ہے، انہی بے سروپا اور گندے عقائد کے مٹانے کے لئے قرآن کریم نازل ہوا، اور سید الانبیاء امام الہدیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔

قرآن کریم نے بے شمار آیات میں بار بار اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ علم غیب اور علم محیط کلّی جس سے کائنات کا کوئی ذرہ چھپا اور مخفی نہ رہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ سبحانہ کی صفتِ خاص ہے، اسی طرح قدرتِ مطلقہ کہ ہر نفع و نقصان قبضہ میں ہو، یہ بھی صفتِ خاص ہے۔ یہ کتنی جسارت اور خباثت وبے ادبی اور ناقدرشناسی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ کو اس کی مخلوقات پر تقسیم کیا جائے؟ بلکہ اگر ایک اعتبار سے یہ خداوند تعالیٰ کی ناقدری ہوگی، اسی طرح یہ انبیاء علیہم السلام کی بھی ناقدری اور توہین کہلائی جائے گی۔

اس آیت میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا اعلان کردیں کہ میں اپنے نفس کے لئے بھی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں، دوسروں کے نفع ونقصان کا ذکر ہی کیا، اسی طرح یہ بھی اعلان فرمائیں کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے منصب کے لئے ضروری ہو۔اگر مجھے علم غیب حاصل ہوتا تو میں نے ہر نفع کی چیز کو اپنے واسطے حاصل کرلیا ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اور کوئی نفع کی چیز میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتی، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی رہتا، اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ

لَكُمْ اِنِّي مَلَكٌ﴾ [الأنعام: ۵۰]

(آپ فرما دیجئے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میرے پاس ہیں، اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں، اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں)۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام مخلوقات سے زیادہ علومِ غیبیہ عطا فرمائے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پوری کائنات سے زیادہ علم عطا فرمایا، مگر یہ غیب نہیں ہوا، کیونکہ یہ دعویٰ کرنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام غیبوں کو جانتے تھے، اور قیامت کب آئے گی، اس کا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم تھا، یہ دعویٰ باطل ہے، اور قران پاک کا انکار ہے، جو کہ صریح کفر ہے، اور قرآن وحدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔

قرآن وحدیث کی تصریحات اس پر گواہ ہیں کہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حاصل کرنا چاہا، یا ان چیزوں سے یعنی نقصانات سے بچنا اور محفوظ رہنا چاہا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ دونوں مقصد پورے نہیں ہوئے۔ ایسے واقعات بہت ہی زیادہ اور بے شمار ہیں، مگر نمونہ کے لئے چند ایک کا تذکرہ ضروری ہے، اور وہ یہ ہیں:

(۱) غزوۂ اُحد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت زخمی ہوئے، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بیہوشی طاری ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے بہتر (۷۲) اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم نے جام شہادت نوش فرمایا، جن میں سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا بھی شامل رہے۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غمخوار مشفق اور مہربان چچا ابو طالب کفر پر مرے، جن کی خدمات بے شمار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو اسلام میں داخل نہ کر سکے، باوجود ہزار ہا کوششوں کے۔

(۳) غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کر کے سفر شروع فرمایا، مکہ معظمہ کے حدود تک پہنچ گئے، مگر کفار قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ادائیگی عمرہ سے منع کر کے واپس کیا۔

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کا سفر شروع کیا، وہاں تشریف لے گئے، اس سفر میں اہل طائف نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وہ جانگداز، بے رحمانہ سلوک کیا تھا، جسے سن کر اور پڑھ کر کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ الجن کے فوائد میں آجائے گی، اِن شاء اللہ تعالیٰ، وہاں دیکھیں۔

(٦) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پچاس نمازوں کا تحفہ عطا ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بخوشی یہ تحفہ قبول کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوئے، جب چھٹے آسمان پر وارد ہوئے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشورہ دیا کہ واپس جا کر تخفیف کی درخواست کریں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار جاتے گئے اور تخفیف کی درخواست کرتے رہے، یہاں تک کہ پانچ نمازوں پر فیصلہ ہوا۔ الحمد للہ

(۷) جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اذان کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا، حالانکہ شب معراج کے موقع پر مسجد اقصیٰ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت فرمائی، اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اذان دی، اور اقامت کی۔ [سہیلی]

(۸) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ کے سیکڑوں منافقین کے ساتھ رہتے ہوئے منافقین کی شناخت نہیں کر سکتے تھے، یہاں تک یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبة:۱۰۱] (اور تمہارے اردگرد جو دیہاتی ہیں ان میں بھی منافق لوگ موجود ہیں، اور مدینہ کے باشندوں میں بھی۔ یہ لوگ منافقت میں ماہر ہو گئے ہیں، تم انہیں نہیں جانتے، انہیں ہم جانتے ہیں) تب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک ایک کر کے منافقین کے نام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بتادئے۔

(۹) غزوہ خیبر کے موقع پر یہودی عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانے میں زہر ملا کر پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک لقمہ تناول فرمایا، اور جبرئیل امین علیہ السلام نے مزید کھانے سے منع فرمایا، اور ایک صحابی کی شہادت واقع ہوئی۔

(۱۰) ایک غزوہ میں اُمّ المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا، لوگوں نے ہر چند تلاش کیا، نہیں ملا، وہ ہار سواری کے اونٹ کے زانو کے نیچے دبا ہوا تھا، جب اونٹ کو اٹھایا تو ہار مل گیا۔ [بخاري]

(۱۱) حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتان کا قصہ بہت ہی مشہور ہے، ایک ماہ تک وحی کا نزول موقوف رہا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیصلہ نہ کر سکے، اور لوگوں سے مشورہ لیتے رہے، وغیرہ۔

(۱۲) بِئرِ مَعُونَة والا واقعہ: جہاں دشمن نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چیدہ چیدہ حفاظ وقراء کا مطالبہ کیا کہ ہمیں قرآن سکھانے کے لئے آدمی دیدیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ستر (۷۰) حفاظ وقاری ان کے سپرد کئے، انہوں نے وہاں لے جا کر سب کو شہید کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھنے کا اہتمام کیا۔ [بخاري]

(۱۳) حضرت حارث بن ہشام ودیگر دوتین آدمیوں کے لئے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بددعا فرمائی، تو یہ آیت کریمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کے خلاف نازل ہوئی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴾ [آل عمران:۱۲۸] (تمہیں اس فیصلے کا کوئی اختیار نہیں کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے، یا ان کو عذاب دے، کیونکہ یہ ظالم لوگ ہیں)۔

اسی طرح بدر کے قیدیوں کا معاملہ دربارۂ فدیہ، اور عبداللہ بن اُبی بن سلول منافق کے جنازہ، اور تحریم شہد، اور تابیرِ نخل کا واقعہ وغیرہ، میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے مبارک کے صواب نہ ہونے کا بیّن ثبوت دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہو چکا ہے، جن سے نہایت واضح ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم الغیب نہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں واضح واقعات کتبِ حدیث اور سیرت میں موجود ہیں، جن کی تفصیل طوالت سے خالی نہیں، اس لئے ان چند واقعات پر اکتفاء کیا گیا۔ وَاللّٰهُ الْهَادِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

کچھ ہٹ دھرم قسم کے جاہلوں کی تاویلِ باطل:

بعض جہال یوں کہہ دیتے ہیں کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر چیز کا علم نہیں دیا گیا تھا، لیکن وفات سے تھوڑی دیر پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر چیز کا علم دے دیا گیا تھا۔

پس معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا یہ دعویٰ نہ صرف یہ کہ بے دلیل ہے، بلکہ قرآن وسنّت کی تصریحات کے سراسر خلاف ہے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں پانی پلانے کے لئے پہلے سے حوضِ کوثر پر پہنچا ہوا ہوں گا، جو کوئی میرے پاس سے گزرے گا وہ پانی پی لے گا، اور جو پی لے گا پھر کبھی پیاسا نہیں ہوگا۔ اور کچھ لوگ (اہلِ شرک وبدعت) میرے پاس آئیں گے، جن کو میں شناخت کروں گا، اور وہ بھی مجھے پہچانتے ہوں گے، پھر میرے اور ان کے درمیان آڑ لگا دی جائے گی۔ میں فرشتوں سے کہوں گا کہ یہ میرے لوگ ہیں، جواب میں کہا جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کیا نئی نئی باتیں نکالی تھیں، اور دین میں طرح طرح کی بیہودہ تبدیلیاں کی تھیں، تو میں کہوں گا کہ دور ہوں، دور ہوں، جنہوں نے میرے بعد ادل بدل کر دیا۔ [متفق علیہ]

اس ادل بدل کرنے میں یہ بھی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کو اللہ تعالیٰ کے علم کے برابر کر دیا جائے۔ نیز شفاعت کے بیان میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں سجدہ میں پڑ جاؤں گا، اور اپنے ربّ کے وہ محامد وثنا بیان

کروں گا، جو اللہ تعالیٰ مجھے وہاں سکھائے گا، جنہیں اس وقت میں نہیں جانتا۔ [متفق علیہ]

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جو اس دنیا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں نہیں لائی گئیں، وہ وہاں آخرت میں ظاہر ہوں گی۔ اہلِ بدعت پر تعجب ہے کہ وہ عقیدت کے غلوّ میں آیات واحادیث کو نہیں مانتے، اور نصوص میں تحریف کر کے ان کے مطالب اپنی خواہشات کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ یہ تحریفات انہیں یہود ونصاریٰ سے ورثہ میں ملی ہیں، بلکہ سب کچھ جانتے ہوئے اہلِ حق کی ضد وعناد کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ هَدَاهُمُ اللهُ تعالٰی

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نہ قادر مطلق ہوتے ہیں، نہ عالم الغیب، بلکہ ان کو علم وقدرت کا اتنا ہی حصہ حاصل ہوتا ہے جو ان کی شایان شان ہے، وہی حصہ انہیں مِنْ جَانِبِ اللهِ ان کے منصب نبوت کے موافق دیا جاتا ہے، جن سے ان کے فرائض کا مقصد پورا ہو۔ اور ساری کائنات کے ذرہ ذرہ کا علم وپہچان کے ساتھ ان کا نہ تعلق ہوتا ہے، اور نہ ہی یہ چیزیں نبوت کے لوازمات میں شمار ہوتی ہیں۔ نبوت کے لوازمات کو بیشتر تکوینیات کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا، جیسے خضر اور موسیٰ علیہما السلام کے واقعات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے، جن کی تفصیل اپنے موقع پر آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

ہاں! اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جو حصہ علم کا ان کو عطاء ہوتا ہے، تو وہ ساری مخلوقات کے علم سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ خصوصاً ہمارے رسول حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اوّلین وآخرین کا علم عطاء فرمایا گیا تھا، یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کو جتنا علم دیا گیا تھا، وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطاء کیا گیا تھا، اور اسی عطاء شدہ علم کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں، جن کی سچائی کا ہر خاص وعام نے مشاہدہ کیا۔

اس کی وجہ سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لاکھوں غیب کی چیزوں کا علم عطاء کیا گیا تھا، مگر اصطلاحِ قرآن کریم میں اس کو علم غیب نہیں کہا جاتا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ صفت بلاشرکتِ غیر صرف حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ وَاللهُ الهَادِي.

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا
حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَىِٕنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَاۤ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

ترجمہ: وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس ٹھکانہ پکڑے، پھر جب اس نے جوڑے کو ڈھانکا، تو عورت کو ہلکا سا حمل رہ گیا، پھر وہ اس کو لئے ہوئے چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہوگئی تو دونوں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگے، جوان کا ربّ ہے کہ اگر آپ جلّ جلالہ نے ہمیں صحیح سالم بچہ عطاء فرمادیا تو ہم شکر کرنے والوں میں سے ہوں گے ﴿۱۸۹﴾ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو صحیح سالم بچہ عطاء فرمادیا تو جو چیز ان کو عطاء فرمائی اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے شریک قرار دینے لگے، سو اللہ تعالیٰ برتر ہے ان کے شریک بنانے سے ﴿۱۹۰﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اوّل تو اللہ تعالیٰ شانہ نے اولادِ آدم کی تخلیق کا ذکر فرمایا، پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر جب انہوں نے تنہائی محسوس کی، اور طبعی طور پر انس والفت کی ضرورت محسوس کرنے لگے، تو ان کی بائیں پسلی سے حضرت حواء رضی اللہ عنہا ان کا جوڑا پیدا فرمایا، جیسے ارشاد ہے:

﴿لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا﴾ تاکہ اس کے ساتھ انہیں سکون وآرام حاصل ہوجائے۔ اسی کے ساتھ اولادِ آدم علیہ السلام کی ناشکری اور بے وفائی پر تنبیہ ہے۔ یعنی اولادِ آدم نے اپنی ناشکری اور غفلت سے اس معاملہ میں عمل یہ کیا کہ جب مرد وعورت کے باہمی اختلاط سے حمل قرار پایا تو شروع شروع میں جب تک حمل کا کوئی بوجھ نہ تھا، عورت آزادی کے ساتھ چلتی پھرتی رہی، پھر جب خالق جلّ شانہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے تین اندھیریوں میں اس حمل کی تربیت نگہداشت کا سلسلہ جاری فرمایا، اور اس کا بوجھ بڑھتا گیا، تو اب ماں باپ فکر میں پڑ گئے، اور یہ خطرہ محسوس کرنے لگے کہ اس حمل سے کیسی اولاد پیدا ہوگی، کیونکہ بسا اوقات انسان ہی کے پیٹ سے عجیب عجیب طرح کی مخلوق بھی پیدا ہوجاتی ہے، اور بعض اوقات ناقص الخلقت بچہ پیدا ہوجاتا ہے، کبھی ناتمام، یا اندھا، یا بہرا، یا گونگا، یا ہاتھ پیر سے معذور۔

ان خطرات کی وجہ سے ماں باپ یہ دعائیں کرنے شروع کرتے ہیں، اور کبھی صدقہ بھی کرتے ہیں کہ یا اللہ،

یاربّ العٰلمین! ہمیں صحیح سالم نیک بچہ عنایت فرما، اگر ایسا ہوا تو ہم شکر کریں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں قبول فرمانے کے بعد انہیں صحیح سالم اولاد عنایت فرمائی، تو شکر گزاری کے بجائے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور یہ بچہ ان کے شرک میں مبتلا ہونے کا سبب بن جاتا ہے، جس کی مختلف صورتیں ہو جاتی ہیں۔

کبھی کہتے ہیں کہ فلاں پیر نے مہربانی کی، ہمیں بچہ دیا، کبھی کسی بزرگ کی طرف نسبت کرنے لگتے ہیں، اور بچہ کو مزارات پر لے جا کر اس کے بال وہاں کٹواتے ہیں، کبھی بچے کے ساتھ بکرا صدقہ کر کے بزرگوں کے مزارات پر ذبح کرتے ہیں، اور نام بھی پیروں والا رکھتے ہیں، مثلاً قلندر بخش، غوث بخش، پیر بخش، علی بخش، اور اسی قسم کے دوسرے نام رکھتے ہیں۔ یہ سب ناجائز، اور شرک ہے۔

آیت کریمہ کی اس تفسیر سے واضح ہو گیا کہ اس آیت کے پہلے جملہ میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء رضی اللہ عنہا کا ذکر کر کے اولادِ آدم کو ان کے اتباع اور شکر گزاری کی تعلیم دی گئی ہے، اور آخری جملوں میں بعد کی آنے والی اولادِ آدم کی گمراہی، کجروی اور شرک کا بیان کیا گیا ہے کہ وہ بجائے شکر کے شرک کرنے لگے۔

بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے یہ کہا ہے کہ جیسے شروع آیت میں حضرت آدم وحواء علیہما السلام کا ذکر ہے، اس طرح: ﴿فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا﴾ سے لے کر ﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ تک بھی حضرت آدم وحضرت حواء علیہما السلام کا ذکر ہے، اور وہ یہ کہ شیطان کے بتانے سے حضرت حواء رضی اللہ عنہا نے اپنے ایک بچہ کا نام عبدالحارث رکھا تھا، اس سے پہلے بچے زندہ نہیں رہتے تھے، پس ابلیس نے حضرت حواء رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اب جو بچہ پیدا ہو اس کا نام عبدالحارث رکھنا، اس طرح وہ زندہ رہے گا، اور حارث شیطان کا نام ہے۔ (اس کی تردید آنے والی ہے، اور یہ بات بے بنیاد ہے)۔

ضرورت ووضاحت:

علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اوّل تو اس روایت کو مرفوعاً ذکر کیا ہے، پھر مفسر ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس کو حدیث موقوف بتایا ہے، اور موقوف ہونے کے بعض شواہد بھی پیش کئے ہیں، پھر لکھا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے، صحابی سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ کا قول ہے، اور صحابی سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے ممکن ہے کہ بعض اہلِ کتاب سے یہ بات حاصل کی ہو، جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، جیسے کعب احبار اور وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہما۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی کچھ اس طرح منقول ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام نے اپنے بچہ کا نام عبدالحارث رکھ دیا تھا۔

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سب اہل کتاب کے آثار سے لیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی بات

درست ہے، کیونکہ آیت میں تثنیہ کا صیغہ ہے، جس میں میاں بیوی دونوں کا ذکر ہے، اس میں عام میاں بیوی مراد ہیں، نہ کہ حضرت آدم وحواء علیہما السلام۔ یہ روایت صرف حضرت حواء رضی اللہ عنہا کے متعلق ہے، اس میں حضرت آدم علیہ السلام کی شمولیت نہیں ہے۔

اوّل اس لئے کہ یہ دونوں حضرات علیہما السلام شرک سے پاک اور بری ہیں۔

دوئم اس لئے کہ حضرت آدم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں، اور انبیاء کرام علیہم السلام سے شرک جلی ہو یا خفی اس کا صدور نہیں ہوسکتا۔

سوئم یہ کہ کسی صحیح روایت میں نہیں کہ ان کے بچے بچپن میں مرے ہوں، بلکہ پہلا آدمی ان کی اولاد میں مرنے والا حضرت ہابیل ہیں۔ ان سے پہلے کوئی مرا نہیں، اسی وجہ سے قابیل کو اپنے مقتول بھائی کی تدفین میں پریشانی پیش آئی۔

چہارم یہ کہ جنّت سے نکلنے کے بعد ان کا مکمل عقیدہ یہ ہوا کہ آئندہ شیطان کی کسی بھی بات پر وہ یقین نہیں کریں گے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ آیت کا مطلب معلوم نہ ہوگا، کہ یہ کن لوگوں کا بیان ہے؟ اس کی وضاحت ہم نے لکھ دی ہے۔ اور اس کے علاوہ حضرت حسن بصری اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما سے منقول ہے کہ اس سے یہود ونصاریٰ مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد عطا فرمائی، مگر انہوں نے انہیں یہودی اور نصرانی بنا دیا، جیسا کہ بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے: "کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ"۔ مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ سب سے اچھی تفسیر ہے، اور آیت کریمہ کو اس پر محمول کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ [ابن کثیر]

اور تفسیر درّ منثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ منقول ہے کہ شرک کرنے والی بات حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شرک نہیں کیا، ان کے بارے میں آیت کا پہلا حصہ ہے کہ جس میں شکر کا بیان ہے، اور بعد کے حصہ میں ان لوگوں کا حال بیان فرمایا جو ان کے بعد آئے، اور انہوں نے شرک اختیار کیا، یہی حقیقی بات ہے۔

فائدہ:

آیت کریمہ میں ﴿لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا﴾ فرمایا، اسی طرح سورۂ روم میں فرمایا: ﴿لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً﴾ [الروم: ۲۱] (تاکہ تم ان کے پاس جا کر سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور

رحمت کے جذبات رکھ دیئے)۔تو دونوں آیتوں میں ربّ العزّت سبحانہ نے انسان کی ازدواجی زندگی کا مقصدِ اصلی واضح فرمایا کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے مانوس ہوں، اوران کی زندگی کے لمحات خوشگوار ماحول میں بڑے آرام، محبت ورحمت کے ساتھ گزرجائیں۔

نیک اور فرمانبردار بیوی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں شمار ہے۔اسی طرح مشفق ومہربان شوہر عورت کے لئے نعمتِ عظیمہ شمار ہوتا ہے۔پھران کی زندگی دوسروں کے لئے قابلِ رشک شمار ہوتی ہے،اوران کے آپس کے تعلقات دونوں خاندانوں کے لئے بھی مثالی اورنمونہ بن جاتے ہیں۔پس چاہیئے کہ شریکِ حیات کے انتخاب میں چشم پوشی اور کسی عجلت کا شکار نہ ہوں، بڑی سنجیدگی اور احتیاط وہوشیاری کا مظاہرہ کریں، کیونکہ بہت سے لوگ محض خانہ پری کے طور پر، بغیر کسی سنجیدگی کے جب شادی کا معاملہ طے کرلیتے ہیں،تو پھر شفقت ورحمت اور ہر قسم کی خوشحالی سے محروم ہوجاتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے گھر کا ماحول دوزخ کا منظر پیش کرتا ہے، اور ہر لحہ جھگڑہ ونا چاقی پوری زندگی کو غارت کرکے رکھ دیتا ہے۔محض عورت کا مال اور جمال پر فریفتہ ہوکرنکاح نہیں ہونا چاہیئے۔علم، ادب، خاندانی شرافت اوردین وتقویٰ کا بہرکیف لحاظ رکھنا چاہیئے۔خاص کر ہمارے اس زمانے میں، جبکہ دینداری اورتقویٰ عنقا بنے ہوئے ہیں،عورتوں میں غیر شرعی اور بے جا آزادی نے جہاں یورپ کوتباہ کیا ہوا ہے، وہاں ہمارے ہاں بھی یورپی بے حیائی اورآزادی کے بُرے اثرات سے پورے معاشرے کوتہہ وبالا کرکے رکھ دیا ہے۔آئے دن طلاق اورخلع کی بھرمار ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو چار چیزیں دے دی گئیں، اسے دنیاوآخرت کی بھلائی دی گئی:

(۱)......شکر گزار دل۔(۲)...... ذکر کرنے والی زبان۔(۳)...... صبر کرنے والا بدن۔(۴)...... فرمانبردار بیوی، جو ہر قسم کی خیانت سے پاک ہو۔[رواه البيهقي في شعب الإيمان]

....

اَيُشۡرِكُوۡنَ مَا لَا يَخۡلُقُ شَيۡـًٔا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ لَهُمۡ نَصۡرًا وَّلَاۤ اَنۡفُسَهُمۡ يَنۡصُرُوۡنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى لَا يَتَّبِعُوۡكُمۡ‌ؕ سَوَآءٌ عَلَيۡكُمۡ اَدَعَوۡتُمُوۡهُمۡ اَمۡ اَنۡتُمۡ صَامِتُوۡنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ

الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ

اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِيِّ ۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ

الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ

يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

ترجمہ: کیا وہ لوگ ان کو شریک بناتے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، اور وہ پیدا کئے جاتے ہیں ﴿۱۹۱﴾ اور ان کی مدد پر قدرت نہیں رکھتے، اور نہ وہ اپنی جانوں کی مدد کر سکتے ہیں ﴿۱۹۲﴾ اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں گے، برابر ہے تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو ﴿۱۹۳﴾ بے شک تم جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے جیسے بندے ہیں، سو تم ان کو پکارو، پھر وہ تمہاری پکار کو قبول کر لیں، اگر تم سچے ہو؟ ﴿۱۹۴﴾ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں؟ آپ فرما دیجئے کہ اپنے شریکوں کو بلاؤ، پھر میرے بارے میں ضرر پہنچانے کی جو تدبیر کر سکتے ہو کر لو، اور پھر مجھے مہلت نہ دو ﴿۱۹۵﴾ بے شک میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے، جس نے کتاب نازل فرمائی، اور وہ نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے ﴿۱۹۶﴾ اور جن لوگوں کو اس کے سوا تم پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے، اور نہ وہ اپنی جانوں کی مدد کر سکتے ہیں ﴿۱۹۷﴾ اور اے مخاطب! اگر تو ان کو ہدایت کی طرف پکارے تو وہ نہ سنیں گے، اور تو سمجھے گا کہ وہ تجھے دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ نہیں دیکھ رہے ہیں ﴿۱۹۸﴾

معارف و منازل

معبودانِ باطلہ اندھے، بہرے اور گونگے، بے جان، عاجز و درماندہ ہیں:

اوپر کی آیت میں اولاد کے سلسلہ میں شرک اختیار کرنے کا ذکر تھا۔ ان آیات میں بھی مشرکین کو تنبیہ فرمائی ہے، اور شرک اختیار کرنے میں جو انہوں نے حماقت کی ہے اسے نئے انداز میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ مشرکین کے معبودانِ باطلہ کے گیارہ (۱۱) عیوب بیان فرما کر ان کی حماقت اور گمراہی کو دلائل کے ساتھ واضح فرمایا ہے کہ تمہارے معبودانِ باطلہ کا یہ حال، اور یہ عیوب ہیں:

① اوّل یہ کہ وہ تمہاری طرح کے بندے ہیں۔ ② دوئم یہ کہ وہ تمہاری طرح مخلوق ہیں۔ ③ سوئم یہ کہ وہ کسی چیز کی تخلیق سے عاجز ہیں۔ ④ چہارم یہ کہ وہ اپنی مدد سے جب عاجز ہیں تو تمہاری مدد کیا کر سکتے ہیں۔ ⑤ پنجم یہ کہ اگر تم انہیں پکارو تو سننے پر قدرت نہیں رکھتے۔ ⑥ ششم یہ کہ انہیں پکارنا، نہ پکارنا برابر ہے۔ ⑦ ہفتم یہ کہ وہ دیکھتے نہیں، اندھے ہیں۔ ⑧ ہشتم یہ کہ انہیں کسی چیز کے پکڑنے پر قدرت نہیں۔ ⑨ نہم یہ کہ انہیں چلنے پر ہمت نہیں۔ ⑩ دہم یہ کہ وہ بے حس و بے جان ہیں، نہ جانتے ہیں، نہ سوچنے پر قادر ہیں۔ ⑪ یازدہم یہ کہ وہ کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں، وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ تمہارا، اور سارے جہاں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اسی نے سب کچھ پیدا فرمایا، جس نے سب کچھ پیدا فرمایا وہی عبادت کے لائق ہیں، اور جو کوئی کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے وہ اپنے خالق جل شانہ کی مخلوق ہیں، وہ کیونکر اور کیسے عبادت کے مستحق ہو گئے؟

مشرکین کا یہ طریقہ ہے کہ جب غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ یہ مصیبت میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ یہ ان کی سب سے بڑی حماقت کی نشانی ہے، تمہاری مدد کرنا تو درکنار وہ تو اپنی ہی مدد کرنے سے عاجز ہیں۔ اگر کوئی شخص انہیں توڑ دے، پھوڑ دے، ریزہ ریزہ کر دے، تو وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، نہ ہی اپنا دفاع کر سکتے ہیں۔ تم نے جو مورتیاں بنا رکھی ہیں، وہ بے جان صورتیں ہیں، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتے ہیں، نہ اپنے ہاتھوں سے پکڑ سکتے ہیں، نہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، اور نہ اپنے کانوں سے سن سکتے ہیں۔ ان بے جان مردوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا، اور ان سے مدد کی اُمید رکھنا سراسر بے عقلی اور حماقت ہے۔

ان کو پکارو تو بات نہ سنیں، اور ہدایت کا راستہ بتاؤ تو اُسے اختیار کر نہ سکیں، اور حال ان کا یہ ہے کہ وہ بظاہر اپنی مصنوعی آنکھوں سے تو دیکھ رہے ہیں، اور حقیقت میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا، کیونکہ ان کی آنکھیں اصلی نہیں ہیں، جن سے وہ دیکھیں، اور کان اصلی نہیں ہیں، جن سے وہ سنیں، ان بتوں کو تو خود ہی تراشتے، اور خود ہی اٹھاتے، اور خود ہی رکھتے ہو، اور انہیں پوجتے ہو، یہ بڑی حماقت اور شقاوت ہے۔ شعر ؎

کھڑے ہیں، کھڑے ہیں، پڑے ہیں، پڑے ہیں ☆ جو ناپوتو بندے خدا سے بڑے ہیں

اللہ تعالیٰ نے ان کے معبودوں کا عجز ظاہر فرمایا، اور ساتھ ہی اپنے نبی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمایا کہ ان سے فرما دیجئے کہ تم اپنے معبودوں کو بلاؤ، اور تم سب مل کر مجھے نقصان پہنچانے کی جو بھی تدبیر

کر سکتے ہو کرلو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ معبودانِ باطلہ، اور ان کی پرستش کرنے والے مجھ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ،لیکن چونکہ اپنے معبودوں کے شر اور ضرر سے ڈراتے تھے، جیسے سورۂ زمر میں ارشاد ہے: ﴿وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِن دُونِهِ﴾ [الزمر:۳۶] (اور یہ لوگ تمہیں اللہ کے سوا دوسروں سے ڈراتے ہیں)۔اس لئے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو چیلنج کر دیا کہ تم اور تمہارے معبود جو کچھ کر سکتے ہو کر لیں۔

ان لوگوں کا عجز ظاہر فرما کر ساتھ معبودِ حقیقی جلّ شانہ کا مددگار و ناصر ہونے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میرا ولی ہے، جس نے کتاب نازل فرمائی، اور وہ اپنے نیک اور صالح بندوں کی مدد فرماتا ہے، اور ان کی حمایت وحفاظت فرماتا ہے، جو اس کا ہو گیا وہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب ہو جاتا ہے، اور ابدی سعادت سے مالا مال ہو جاتا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ [البقرة:۲۵۷] (اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے)۔اور جو کوئی بدبخت اللہ تعالیٰ سے کٹ جاتا ہے، وہ ابدی شقاوت میں غرق ہو جاتا ہے، فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ [البقرة:۲۵۷] (اور جنہوں نے کفر کیا ان کے دوست شیطان ہیں، وہ ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، وہ آگ والے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)۔

حکایت:

عقبہ ثانیہ کے شرکاء جب مدینہ منورہ پہنچے تو انہوں نے زوردار کوششوں سے لوگوں میں تبلیغ شروع کی، انہی میں سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت عمرو بن جموح اور بن زید بن حرام رضی اللہ عنہما خاندانِ بنی سلمہ کے شرفاء میں شمار ہوتے تھے، انہوں نے اپنے گھر میں مناۃ نامی لکڑی کا بت تراش کر بڑے اعزاز کے ساتھ رکھا تھا، اور اس کی پوجا کرتا تھا۔حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے اس بت کو رات کے وقت اٹھا کر کسی غلاظت والے گڑھے میں اوندھا پھینک دیا۔عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے صبح اپنے بت کو تلاش کر کے وہاں سے نکالا، اور بڑے غصے میں کہا کہ آج رات ہمارے معبود پر کسی نے ظلم کیا، اور اسے غلاظت میں پھینکا، انہوں نے بت کو وہاں سے لا کر خوب دھویا، اور صاف کیا، عطر و خوشبو لگا کر رکھ دیا۔

یہ سلسلہ متواتر ایک ہفتہ اسی طرح جاری رہا، جب تنگ آ گیا تو ایک تلوار بت کے گلے میں لٹکائی، اور کہا کہ اب اس سے اپنا دفاع کرو، جو بھی آپ کی بے احترامی کرے اس کا سر قلم کرو۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ معمول کے مطابق آئے، اور بت کی گردن سے تلوار اتار کر ایک مردار کتے کی لاش سے اسے باندھ کر بنی سلمہ کے ویران کنویں میں پھینک دیا۔ صبح کو جب عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنے معبود کو نہیں پایا، تو اس کی تلاش میں نکلے، اور اس کو ایک غلاظت سے بھرپور ویران کنویں میں مردار کتے کے ساتھ بندھا ہوا منہ کے بل گرا ہوا پایا، تو کہنے لگا: اے ذلیل! تمہاری گردن میں تلوار لٹکا کر کہا تھا کہ اپنا دفاع کرو، مگر جب تم اس پر بھی قادر نہیں تو میرے لئے تم کیا کر سکتے ہو؟ جاؤ، گم ہو جاؤ، میں اس قادر و توانا خدا پر ایمان لاتا ہوں، جس پر ہمارے قبیلہ کے لوگ ایمان لا چکے ہیں۔ پس اس کا مردہ ضمیر بیدار ہوا، اور کلمہ پڑھا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

کسی ذات کے معبود ہونے کے لئے اس میں چند صفات کا ہونا لازمی ہے، مثلاً یہ کہ:

☆ وہ ذات واجب الوجود ہو، یعنی اس کا وجود خود بخود ہو، نہ کہ کسی دوسری ذات کا عطاء کردہ، یہ اُلوہیت کی سب سے پہلی صفت ہے، تو ظاہر ہے کہ واجب الوجود صرف ذات خداوندی ہے، اس کے علاوہ ہر ذات کا وجود اللہ تعالیٰ کا عطاء کردہ ہے۔

☆ اسی طرح اُلوہیت کی دوسری صفت خالقیت ہے، تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں۔

☆ اُلوہیت کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ علیم کُل ہو۔ یہ صفت بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی میں نہیں۔

☆ اسی طرح اُلوہیت کی چوتھی صفت یہ ہے، کہ وہ قادر مطلق ہو یعنی ﴿عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ہو۔ یہ صفت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

☆ اُلوہیت کی پانچویں صفت یہ ہے کہ وہ تمام کائنات پر مدبّر ہو، متصرف ہو، پورا نظام کلّی و جزئی طور پر اس کے قبضۂ قدرت میں ہو۔ علیٰ ہٰذا القیاس تمام صفاتِ کمال سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی ذات میں متحقق جب نہیں، تو اس کے سوا کوئی کسی بھی قسم کی عبادت اور بندگی کا لائق نہیں، سارا جہاں عاجز و ناتوان ہے، ساری مخلوقات اپنی اپنی حاجتوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ادنیٰ غور و فکر سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کوئی حاجت مند ہرگز اُلوہیت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ الوہیت اسی ذاتِ عالی صفات کے لئے موزون ہے جو سارے جہانوں کی حاجتوں کی برآری پر مطلقاً قادر ہو، سارا عالم اس کا محتاج و دست نگر ہو، وہ کسی چیز کا محتاج ہونا تو بجائے خود، بلکہ احتیاج کے تصور سے بھی

پاک اور منزہ ہو۔

کتنا ظالم و جاہل ہے وہ انسان جو بے جان و بے حس عاجز و مردہ مخلوقات کو خداوند ذوالجلال کا شریک ٹھہرائے؟ اور اپنے سے بھی کمتر عاجز بتوں کی پرستش پر آمادہ ہو جائے؟ [خلاصہ از حجۃ اللہ البالغہ]

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾

ترجمہ: معاف کرنے کو اختیار کیجئے، اور نیک کاموں کا حکم دیجئے، اور جاہلوں سے کنارہ کیجئے ﴿۱۹۹﴾ اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے، تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیجئے، بلاشبہ وہ سننے والا، جاننے والا ہے ﴿۲۰۰﴾

معارف ومنازل

پچھلی آیتوں میں دشمنانِ اسلام کی کجروی، ہٹ دھرمی، اور بداخلاقیوں کا ذکر کرنے کے بعد ان آیات میں ان کے بالمقابل سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خصائلِ فاضلہ، اخلاقِ حسنہ کی ہدایت دی گئی ہے۔ اوّل آیت کریمہ کے تین جملے ہیں، جن میں تین باتوں کا حکم ہے: اوّل یہ کہ لوگوں کو معاف کیا کیجئے۔ دوسرا یہ کہ بھلائی کا حکم کیا کیجئے۔ تیسرا یہ کہ جاہلوں سے اعراض کیا کیجئے۔

یہ تینوں باتیں اتنی اہم اور بابرکت ہیں کہ پورے اسلامی معاشرہ پر حاوی ہیں، اور جو شخص انہیں اپنائے، اور اپنے اندر انہیں جذب کر لے، وہ محض یہ نہیں کہ مرجع خلائق ہوگا، بلکہ اسے اپنی زندگی میں خوشحالی نصیب ہوگی۔ اور ہر قسم کی دشواریوں اور پریشانیوں سے محفوظ رہے گا۔ دراصل یہ تینوں اوصاف پیغمبروں علیہم السلام کے ہیں۔

قرآنی جامع ہدایات:

''عفو'' کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ جمہور مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے جس کو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ عفو کہا جاتا ہے ہر ایسے کام کو جو آسانی کے ساتھ، بغیر کسی تکلیف اور مشقت کے ہو سکے، جس کا آسان ترجمہ ہے: ''چشم پوشی، اور درگزر کرنا''۔ تو معنی یہ ہوئے کہ جو کام لوگ آسانی سے کر سکیں، آپ قبول کر لیا کریں۔ یعنی فرائض، واجبات شرعیہ، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وعمرہ، جہاد، عمومی اخلاقیات اور اعمالِ صالحہ وغیرہ جتنے اور جیسے انداز میں لوگ انجام دیں، اور

آسانی سے عمل کر سکیں، آپ قبول فرمایا کریں، اوران سے راضی رہیں، اوران سے اعلیٰ معیاراور بلند اوراونچے اعمال کا مطالبہ نہ کریں، کیونکہ اعلیٰ معیار کے اعمال خواص ہی پورا کر سکتے ہیں، عوام کے بس میں نہیں کہ وہ اعلیٰ اقدار کو پورا کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ جن طاعات کو آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے مخصوص اصحاب رضی اللہ عنہم بجالاتے ہیں، عوام انہیں کہاں ادا کر سکتے ہیں؟ لہٰذا آپ انہیں عفو ودرگزر سے راضی رکھیں، کیونکہ عوام الناس چاہے آپ ﷺ کا مبارک زمانہ ہو، یا آئندہ قیامت تک اس اعلیٰ معیار کو نہ پا سکتے ہیں، اور نہ اس پر چل سکتے ہیں۔

تو آیت کریمہ نے معلمِ انسانیت خاتم المرسلین ﷺ کو یہ تعلیم دی کہ آپ ان لوگوں سے اعلیٰ معیار کا مطالبہ ہی نہ کریں، بلکہ جس درجہ کو وہ آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں وہی قبول فرمالیں۔

صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ خود سرورِ عالم ﷺ سے آیت کریمہ کے یہی معنی نقل کئے گئے ہیں۔ اورایک روایت میں ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے اس آیت کے نازل ہونے پر ارشاد فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے اعمال واخلاق میں سرسری اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ میں نے عزم کرلیا ہے کہ جب تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں، ایسا ہی عمل کروں گا۔ [ابن کثیر]

ائمہ تفسیر کی ایک بڑی جماعت حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم وغیرہ نے اس جملہ کے یہی معنی قرار دئے ہیں۔

علماء تفسیر کی دوسری جماعت نے اس جملہ کے یہ معنی قرار دئے ہیں کہ آپ گناہگاروں، خطاکاروں کے گناہ وقصور کو معاف کیا کریں۔ امام تفسیر ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سید الانبیاء ﷺ نے جبرئیل امین علیہ السلام سے آیت کا مطلب پوچھا؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے ربّ العزّت سبحانہ سے دریافت کرنے کے بعد یہ مطلب بتایا کہ اس آیت میں آپ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو شخص آپ پر ظلم کرے، آپ اس کو معاف کردیں، اور جو آپ کو کچھ نہ دے آپ اس پر بخشش کریں، اور جو آپ سے قطع تعلق کرے آپ اس سے بھی ملا کریں۔

اس جگہ حضرت ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب سرورِ عالم ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا، اوران کی لاش کی سخت بے حرمتی کی گئی، تو سید الانبیاء ﷺ نے ان کی لاش کی بے حرمتی دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے سید الشہداء رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا معاملہ

کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کروں گا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں، آپ کے شایان شان یہ ہے کہ آپ رحمۃ للعٰلمین کے منصب پر ہیں، آپ عفو ودرگزر کرلیں۔

اس مضمون کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ ان کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو مکارمِ اخلاق کی تعلیم دی، وہ یہ تھی کہ جو شخص تم پر ظلم کرے، اس کو معاف کردو، جو تم سے قطع تعلق کرے، تم اس کے ساتھ وصل کردو، اور جو تمہیں محروم کردے یعنی کچھ نہ دے تم اس پر بخشش کردو۔[أحمد، مشکوۃ]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو اوّلین وآخرین کے اخلاق سے بہتر اخلاق کی تعلیم دیتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ جو شخص تم کو محروم کردے تم اس پر بخشش کرو، اور جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کرو، اور جو شخص تم سے قطع تعلق کرے تم اس سے بھی ملا کرو۔[بیهقي، مشکوۃ] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے ربّ! آپ کے بندوں میں آپ کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز کون ہے؟ اللہ تعالیٰ شانہ نے جواب دیا کہ جو شخص قدرت رکھتے ہوئے معاف کرے۔[بیهقي في شعب الإیمان]

لفظ عَفو کے دونوں معنوں کا مطلب ومراد ایک ہی ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے کہ میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کردوں، اور دنیا والوں کو عفو ودرگزر جیسے اخلاق سکھادوں۔اس کا مظاہرہ اس وقت عَلٰی وَجْہِ الْاَتَم ہوا، اور جسے دنیا کے تمام لوگوں نے دیکھا، اور دوست ودشمن سب نے مشاہدہ کیا کہ فتح مکہ مکرمہ کے روز جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانی دشمن، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دشمن، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملّت و شریعت کے دشمن، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ربّ سبحانہ وتعالیٰ کے دشمن، ہزاروں کی تعداد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں آگئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کی دھار کی زد میں آگئے، اور سب پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبضہ وتسلط مستحکم ہوا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تو دنیا کے حکمرانوں والا سلوک روا رکھتے تو پوری آبادی کو منظم طور پر تہ تیغ کر کے ہمیشہ کے لئے تباہ وفنا کر کے موت کی نیند سلا سکتے تھے۔مگر ایسا نہیں ہوا۔سبحان اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعٰلمین تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سید المرسلین تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کے لئے پیغامِ ہدایت تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے لئے نجات وخلاصی اور ہدایت کا

پیغام لے کر تشریف لائے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بجائے سروں کو کٹوانے کے سروں کا تحفظ فرمایا۔ خون کے پیاسوں کی بخشش فرمادی، شفاعتِ کبریٰ کی ایک جھلک دنیا والوں کو دکھادی، اور "اِذْھَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ" کا اعلان فرما کر ثابت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم واقعی رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہیں، اور رہیں گے۔

دنیا کے حکمرانوں کو چیلنج ہے کہ ہے ایسا کوئی دریا دل، مشفق ومہربان، جو نہ صرف معاف کردے، بلکہ یہ بھی اعلان کردے کہ پچھلے گناہوں پر تمہیں ملامت بھی نہیں کریں گے، اور تمہارے ساتھ سلوک برابر کا ہوگا۔ کھربوں صلوٰۃ وسلام اس ذاتِ عالی صفات پر، جس نے سارے جہاں پر اپنی رحمت عام کردی۔

اس ہدایت نامہ کا دوسرا جزیہ ہے:

﴿وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ عُرف بمعنی مَعرُوف، ہر اچھے پسندیدہ اور مستحسن کام کو مَعرُوف کہتے ہیں، یعنی نیکی اور بھلائی۔ پس بھلائیوں کے حکم دینے میں برائیوں سے منع کرنا بھی خود بخود آجاتا ہے، کیونکہ یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں، اور دونوں کا التزام مکارمِ اخلاق کا حصہ ہے۔ مسلمانوں کی خصوصی صفت یہی ہے کہ صبح وشام اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، اہل وعیال، پڑوسیوں، دوستوں، ساتھیوں، ہمسفروں کے ساتھ فضائلِ اعمال، محاسنِ افعال کی تبلیغ کا سلسلہ پابندی کے ساتھ جاری رکھے۔ دینِ اسلام میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بہت بڑی فضیلت ہے، اور یہ کام مسلمانوں کے فرائض میں شمار ہے۔

جب سے مسلمانوں نے اس فریضہ کو ترک کیا ہے، اسی وقت سے ان کا عروج وترقی ختم ہوکر تنزل وانحطاط شروع ہوا ہے، جس سے پورا معاشرہ برباد اور تباہ ہوا ہے، اور اشرار الناس (برے لوگ) کا اُمت پر تسلّط اور گرفت قائم ہوئی ہے۔ ہر قسم کے فتنے سر اٹھا کر دیمک کی طرح اخلاقیات اور اسلامی اقدار کو چاٹ رہے ہیں، اور دعائیں قبول نہیں ہورہی ہیں۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ کے تحت گزر چکی ہے۔

جاہلوں سے اعراض کرنا:

تیسری نصیحت یہ فرمائی:

﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ﴾ (اور جاہلوں سے اعراض کرو) یہ بھی بہت اہم نصیحت ہے، اور اس پر عمل کرنے سے مسلمان اپنے نفس کے شر سے، اور جاہلوں کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔ آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ ظلم کا

انتقام چھوڑ کر آپ ﷺ جاہلوں کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا، اور نیز کنارہ کشی کا معاملہ کریں، اور نرمی کے ساتھ ان کو حق بات بتلائیں۔ سورۂ فرقان میں "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کی صفات بتلاتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ [الفرقان: ۶۳] یعنی جب جاہل ان کے ساتھ بے مقصد بات کرتے ہیں تو وہ ان سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں، کیونکہ بہت سے جاہل ایسے بھی ہوتے ہیں جو شریفانہ معاملہ سے متاثر نہیں ہوتے، آپ ہر چند سلیقہ اور شریفانہ انداز میں بات کریں، ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

پھول کی پتی سے کٹ جاتا ہے ہیرے کا جگر ☆ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

(اقبالؒ)

پس جاہلوں کے ساتھ آپ کا معاملہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے دلخراش، اور جاہلانہ کلام سے متاثر ہو کر ان جیسی سخت گفتگو ہرگز نہ کریں، بلکہ ان کے ساتھ بحث و مباحثہ ترک کر کے کنارہ کش ہو جائیں۔ اگر ان سے کوئی زیادتی ہو تو برداشت کر کے درگزر فرمائیں، کیونکہ جاہلوں کو منہ لگانے میں اپنی آبرو اور دین و دنیا سب کا نقصان ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کنارہ کشی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بداخلاقی کا جواب بداخلاقی سے نہ دیں۔ یہ ہرگز نہ کریں کہ ان کی ہدایت چھوڑ دیں کہ یہ وظیفہ رسالت و نبوت کے شایانِ شاں نہیں۔

شیطان کے وسوسوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا چاہئے:

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اگر شیطان کی طرف سے آپ ﷺ کو کوئی وسوسہ آنے لگے، تو اللہ تعالیٰ شانہ کی پناہ مانگ لیجئے، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

درمنثور میں بحوالہ ابن جریر طبری نقل کیا ہے کہ جب آیت کریمہ: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ نازل ہوئی تو سرورِ عالم ﷺ نے عرض کیا کہ اے ربّ ذوالجلال! غصہ کی حالت میں کیا کیا جائے؟ غصہ انتقام پر ابھارتا ہے، اور معاف کرنے سے روکتا ہے۔ اس پر: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ﴾ کا نزول ہوا۔

لفظ نَزْغ اُبھارنے، برانگیختہ اور وسوسہ ڈالنے، اور کسی کام پر آمادہ کرنے کے لئے آتا ہے۔ ابلیس شب و روز انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے، غصہ اور انتقام پر اُبھارتا رہتا ہے، اور ایسے وسوسے دل میں ڈالتا رہتا ہے کہ انسان معاف کرنے یا درگزر کرنے پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ آیت میں شیطان کا شر اور وسوسہ دفع کرنے کا یہ علاج بتلایا کہ

شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی جائے، اس سے شیطان ناکام وذلیل ہوگا، اور وسوسہ ڈالنے سے پیچھے ہٹے گا۔

سورۂ مؤمنون میں فرمایا: ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ﴾ [المؤمنون:۹۷] (اور آپ یوں کہیے کہ اے ربّ! میں آپ کی پناہ لیتا ہوں شیطان کے وسوسوں سے، اور اے ربّ! اس بات سے بھی کہ شیطان میرے پاس حاضر ہوں)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے پاس شیطان آئے گا، سو وہ کہے گا کہ یہ کس نے پیدا کیا؟ یہ کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ یوں کہے گا: تمہارے ربّ کو کس نے پیدا کیا؟ سو جب وہ اس سوال پر پہنچ جائے تو تم یوں کہو: ﴿اَللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [الإخلاص:۴] (اللہ ایک ہے، اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں، نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں) پھر بائیں جانب تین بار تھوک دے، اور شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ [أبو داؤد، مشکوۃ]

غصہ کا علاج:

حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے، وہاں دو آدمیوں نے آپس میں گالی گلوچ شروع کردی، ایک شخص غصہ میں بے قابو ہو رہا تھا، اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں، اگر یہ غصہ والا شخص وہ کلمہ کہہ دے تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے، وہ کلمہ یہ ہے: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات اس شخص سے کہہ دی، تو اس نے کہا: بے شک میں دیوانہ یا پاگل ہوں۔ [بخاري]

فائدہ:

علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر ایک عجیب نکتہ لکھا ہے کہ پورے قرآن مجید میں تین آیتیں اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم وتلقین کے متعلق وارد ہوچکی ہیں، اور تینوں کے آخر میں شیطان سے پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ ایک تو یہی سورۂ اعراف کی آیت ہے۔

دوسری سورۂ مؤمنون کی یہ آیت ہے: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ﴾ [المؤمنون:۹۸] یعنی دفع کر دو برائی کو

بھلائی سے، ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہا کرتے ہیں، اور آپ ﷺ یوں دعا کیجئے کہ اے میرے پروردگار! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان کے دباؤ سے، اور اے میرے پروردگار! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس حاضر ہوں۔

تیسری آیت سورۂ حٰم سجدہ کی ہے: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۔ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ۔ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾[حٰم السجدة: ۳۶] یعنی نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتیں، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیا کریں، پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے۔ اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہیں، اور یہ بات اسی شخص کو نصیب ہوتی ہے جو بڑا صاحبِ نصیب ہے۔ اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کچھ وسوسہ آنے لگے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا، اور خوب جاننے والا ہے۔

ان تینوں آیتوں میں غصہ دلانے والوں سے عفو ودرگزر، اور بُرائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ شیطان سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو انسانی جھگڑوں سے خاص دلچسپی ہے، جہاں جھگڑے کا کوئی موقع پیش آتا ہے، شیاطین اس کو بڑھا چڑھا کر اپنی شکارگاہ بنالیتے ہیں، اور لوگوں کو معمولی ادنیٰ چیزوں میں اُلجھا کر ان کے امن وامان کو غارت کرتے ہیں۔

آئے دن محلوں، گلیوں، بستیوں میں چپقلش اور فتنہ وفساد اور جھگڑوں کا بازار گرم رہتا ہے۔ میاں بیوی کے جھگڑے، باپ بیٹوں کا اختلاف، بھائیوں میں، اور پڑوسیوں میں ایسے ایسے جھگڑے چل رہے ہوتے ہیں کہ پناہ بخدا، یہ سارے جھگڑوں کا عروج، اور قدم قدم پر جنگ وجدال، قتل وقتال، فتنہ وفساد شیطانی حربے ہیں، پھر ان کی بنیاد جہالت اور نادانی پر ہے۔ نعوذ باللہ

آیت کریمہ نے علاج یہی بتادیا کہ صبر وتحمل اور عفو ودرگزر کے اصولوں پر پابندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا چاہئے، اور استفادہ کرنا چاہئے، اور ایسے موقعوں پر صبر واستقامت وتقویٰ کو شعار بنانا چاہئے۔

حکایت:

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جامع مسجد دہلی میں وعظ فرمارہے تھے، ہزاروں کی تعداد میں معتقدین وعظ

سماعت کررہے تھے، اس اثناء میں ایک کٹر مخالف بدعتی نے کھڑے ہوکر کہا کہ آپ حرام زادہ (ولدالزنا) ہیں، لوگ بھڑک اٹھے، اس کو مارنے کے لئے، مگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں منع فرمایا، اور روکا، پھر اپنے وعظ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا، بھائی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، شیطان نے ورغلایا ہے، میرے والدین بڑے متقی پرہیزگار تھے، شریعت کے اصولوں پر باقاعدہ عمل کرتے تھے، اور مسلمانوں کے مجمع میں ان کا نکاح ہوگیا ہے، گواہوں کی موجودگی میں، اگر آپ نے میری والدہ پر تہمت لگائی، یہ کوئی نئی بات نہیں، تم جیسے لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بھی معاف نہیں کیا۔ اچھا ہوا کہ ان کی سنت میری والدہ کے توسط سے ادا ہوگئی۔ یہ ہے ﴿ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ﴾ کا کرشمہ، یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے قرآن پڑھا، اور اس پر سچائی کے ساتھ عمل کیا۔ رحمۃ اللہ علیہم

إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں، جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی خطرہ پہنچ جاتا ہے تو وہ ذکر میں لگ جاتے ہیں، سو اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ﴿۲۰۱﴾ اور جو لوگ شیاطین کے بھائی ہیں، شیاطین ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں، سو وہ کمی نہیں کرتے ﴿۲۰۲﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں یہ حکم تھا کہ جب شیطان کی طرف سے وسوسہ آجائے، تو اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا۔ مذکورہ پہلی آیت میں شیطان سے بچنے والوں، اور دوسری آیت میں شیطان سے دوستی کرنے والوں کا تذکرہ ہے۔ پہلا گروہ عِبادُ الرَّحمٰن. أصحاب المَيمَنة کا ہے، جن کا ربط وتعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور جنگ وجدال شیاطین کے ساتھ ہے، وہ تمام وقت ذکر اللہ اور یادِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، اور شیاطین کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کا شعار تقویٰ اور ذکرِ الٰہی ہے، کیونکہ ذکرِ الٰہی شیطان سے بچنے، اور اسے بھگانے کے لئے اکسیرِ اعظم، اور بہت بڑا ہتھیار ہے۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح مکھی مٹھائی پر بیٹھ کر اسے چوستی ہے، بعینہٖ اسی طرح

شیطان لوگوں کے دلوں پر بیٹھ کر اپنا وسوسہ قلوب بنی آدم میں انجکشن کی طرح داخل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر شروع کرتا ہے، تو شیطان وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔

سورۂ ناس میں ارشاد ہے: ﴿مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ الَّذِیۡ یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ﴾ [الناس: ٦] (اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے کو چھپ جاتا ہے)۔ الۡخَنَّاس کا یہی ترجمہ ہے، پیچھے ہٹنے والا، پس یادِ الٰہی کے ساتھ وہ جم کر وسوسہ نہیں ڈال سکتا، اور یادِ الٰہی میں مصروف آدمی پر اپنا تسلّط قائم نہیں کر سکتا۔ اس طرح یادِ الٰہی میں ہر وقت مصروف آدمی شیطان کے مکر وفریب سے بحمدہ تعالیٰ محفوظ رہتا ہے، اور عِبادُالرَّحمٰن کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔

دوسرا گروہ شیطان کے بندوں، یعنی شیطان کے بھائیوں کا ہے، جنہیں أصحاب الۡمَشۡئَمَة اور عِبادُ الشّيطَان کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کٹے ہوئے، دور ہوتے ہیں، اور شیاطین سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہی کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿اِسۡتَحۡوَذَ عَلَیۡهِمُ الشَّیۡطٰنُ فَاَنۡسٰهُمۡ ذِكۡرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ الشَّیۡطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزۡبَ الشَّیۡطٰنِ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ﴾۔ [المجادلة:١٩] یعنی قابو کر لیا ہے ان پر شیطان نے، پھر بھلا دی ان کو اللہ تعالیٰ کی یاد، وہ لوگ ہیں گروہ شیطان کا۔ خبردار! شیطان کا گروہ ہی نقصان اٹھانے والا ہے۔

یعنی شیطان جس پر مکمل قابو کر لے اس کا دل و دماغ اسی طرح مسخ ہو جاتا ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ خدا تعالیٰ بھی کوئی چیز ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی سے سراسر محروم اور غافل رہتا ہے، اور ہلاکت کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ﴾ بے شک جو لوگ خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، جب انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال اور وسوسہ پہنچتا ہے تو یاد کرتے ہیں، یعنی ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوتے رہتے ہیں، اور خبردار ہو جاتے ہیں، یعنی فوراً اصحابِ بصیرت ہو جاتے ہیں، اور ان کے قلوب بیدار ہو کر آنکھیں کھل جاتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ وہ جب رات کو سوتے ہیں تو بڑی ہوشیاری کے ساتھ سوتے ہیں۔ آدھی رات اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور وضو و نماز میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ شیطان کے تینوں عقدوں کو کھول کر ساری رات ذکر و تسبیح اور استغفار کرتے ہیں، اس طرح شیطان کو بھگا دیتے ہیں، جیسے کسی چور کو بھگایا جاتا ہے۔

﴿وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ﴾ یہاں سے دوسرے گروہ کا بیان ہے، یعنی شیاطین کے بھائی ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ (جنات اور انسانوں میں سے) لوگوں کو گمراہی کی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔

شیاطین کے بھائی سے مراد کافر، مشرک، منافق، فجار وفساق، بدعقیدہ اور بے عمل لوگ ہیں، کیونکہ ہر فاسق و فاجر اور غیر شرعی عمل کرنے والا شیطان کا بھائی ہوتا ہے۔ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ﴾ [الاسراء:۲۷] (فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں)۔ پھر وہ اخوان الشیاطین گناہوں میں کوئی کمی نہیں کرتے ہیں، بلکہ ہر گناہ اور غیر شرعی اعمال میں پیش پیش رہتے ہیں، اور عمر بھر معاصی کے شکنجے میں رہتے ہیں، اور قیامت کے دن کفِ افسوس ملتے ہوئے اپنے پیارے بھائی شیطان سے کہتے رہیں گے: ﴿يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ﴾ [الزخرف:۳۸] (کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا فاصلہ ہوتا، تو بہت برا ساتھی ہے) بہت برا بھائی۔ پوری تفصیل سورۂ ابراہیم میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ اِبْلِیْسَ وَ جُنُوْدِہٖ۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ
مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

ترجمہ: اور جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہ لائیں، تو کہتے ہیں کہ آپ نے یہ معجزہ کیوں اختیار نہ کیا؟ آپ فرمادیجئے کہ میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میرے ربّ کی طرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے، یہ تمہارے ربّ کی طرف سے بصیرت کی باتیں ہیں، اور ہدایت ہیں، اور رحمت ہیں، ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۲۰۳﴾

معارف ومنازل

فرمائشی معجزے طلب کرنے والوں کو جواب:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات اتنے بکثرت ہیں کہ علماء کرام نے مستقل کتابیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات پر لکھی ہیں۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی خصائص الکبریٰ اس بارے میں نہایت عمدہ اور جامع کتاب ہے۔ اسی طرح علامہ

یوسف النبہانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "رحمۃ للعلمین فی معجزات سید المرسلین" بے نظیر اور جامع کتاب ہے۔اسی طرح دوسرے علماء کرام کی متفرق چھوٹی بڑی کتابوں کی ایک معتد بہ ذخیرہ موجود ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات دس ہزار سے زائد ہو سکتے ہیں، اس کی تفصیل "منازل العرفان" کی سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا اور روح پرور معجزہ قرآن حکیم ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکینِ عرب کے سامنے شق القمر کا معجزہ بھی دکھایا، مگر نتیجہ مطلب خیز نہ ہوا، کیونکہ وہ لوگ اسلام نہ لائے، اور معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اپنے کفر پر جمے رہے۔اسی طرح مکی زندگی میں معراج کا معجزہ ظاہر ہوا، جو کہ بڑا عمدہ اور دلچسپ رہا۔ صبح لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسجد اقصیٰ شریف کے متعلق بہت سے سوالات پوچھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پورے مسجد اقصیٰ کا نقشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا، لوگ پوچھتے رہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ہر چیز کو انہیں بتاتے رہے، آخر وہ سارے اپنے ضمیر میں قائل ہو گئے، اور باور کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد اقصیٰ دیکھی، اور معراج پر گئے ہیں، مگر ﴿وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ﴾ [القمر: ۲] (اور اگر وہ نشانی دیکھ لیں تو اعراض کریں گے، اور کہیں گے کہ چلتا ہوا جادو ہے)۔

قرآن کریم نے جابجا آگاہ فرمایا کہ ان معاندین نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ وہ کسی بھی معجزہ یا دلائلِ قدرت کے واضح ہونے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔البتہ خواہ مخواہ بطورِ استہزاء آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزات کی طلب کریں گے، اور ان کا مقصد ایمان لانا نہیں ہوتا، وہ بار بار فرمائشی معجزات مانگ کر ان کا مقصد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنگ کرنے اور پریشان کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ بات واضح ہے کہ معجزہ کا اظہار پیغمبروں علیہم السلام کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہیں لوگوں کے مطالبہ پر معجزہ صادر فرمائیں۔معجزہ صادر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار، اور اس کی مرضی پر معلق ہے، یہی حال کرامت اولیاء کا بھی ہے۔اتنے کثیر معجزات کے صدور پر جب معاندین قائل نہیں ہوئے، تو انہوں نے یہ بہانہ شروع کیا کہ جو معجزہ ہم چاہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا معجزہ ظاہر فرمائیں، چونکہ یہ چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائرۂ اختیار میں نہ تھی، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فرمائشی اور غیر فرمائشی معجزے صادر فرماتے، یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے، نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے۔

اب مسئلہ واضح ہے کہ معجزہ کے ظہور سے وہ ہٹ دھرمی چھوڑ کر ایمان لانے پر جب تیار نہ تھے، بلکہ محض عناد کی بنیاد پر معجزات طلب کرتے تھے، تو جواب دیا:

﴿وَاِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا﴾ میں معاندین کا شر پسندانہ، معاندانہ اعتراض نقل فرمایا کہ آپ ﷺ نبوت ورسالت کے دعویدار ہیں، آپ ﷺ اپنے پاس سے کوئی معجزہ کیوں ظاہر نہ کیا؟ یا یہ مطلب تھا کہ اللہ تعالیٰ سے کیوں یہ بات منظور نہ کرائی تا کہ وہ ہمارا فرمائشی معجزہ ظاہر کر دیتا؟

اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ﴾ آپ ﷺ فرما دیجئے کہ میں تو صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے ربّ کی طرف سے میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا کام تو بس یہ ہے کہ وحی کا اتباع کروں، میرے اختیار میں معجزہ کا ظاہر کرنا نہیں ہے، اور فرمائشی معجزہ ظاہر ہونے پر ایمان قبول کرنے کو موقوف رکھنا تمہاری حماقت ہے، اور ضد وعناد ہے۔ میرے بہت سے معجزات ظاہر ہو چکے ہیں، لیکن تم لوگوں نے انہیں سحر وجادو کہہ کر ایمان نہیں لایا، اور محروم رہے، اور سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے، جو تمہارے سامنے ہے، جس کی فصاحت وبلاغت اور بے مثال نظم وعبارت تم نے دیکھا، اور اس کی چھوٹی سی مختصر سورت کی نظیر لانے اور پیش کرنے سے باوجود اہلِ لسان ہونے کے عاجز وناتواں رہے، جس میں بصیرت وہدایت اور رحمت کے خزانے تمہارے سامنے موجزن ہیں۔

اگر تمہارا مطلب ایمان لانا ہوتا تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور معجزے کے مطالبہ سے تم دستبردار ہوتے، اور اسی صحیفۂ ہدایت ورحمت کو قبول کرتے، اور ایمان لاتے۔ مگر چونکہ تم ضد وعناد کے سوا کچھ بھی نہیں جانتے، اس لئے محروم وبے بہرہ ہو چکے ہو، اور جو طالبِ حق ہوگا قرآن مجید کے ہوتے ہوئے کسی اور معجزہ کا خواہاں نہیں ہوتا۔

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ یہ تمہارے ربّ کی طرف سے بصیرت اور قلبی راحت وسکون کی باتیں ہیں، اور یہ قرآن ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ [البقرة: ۲] (ہدایت کا ذریعہ ہے پرہیزگاروں کے لیے) کیونکہ اہلِ ایمان وتقویٰ نے اسے قبول کیا، اور اس سے دنیاوی واخروی فائدہ اٹھایا۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔ آمین

.... ❁ .... ❁ .... ❁ ....

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

ترجمہ: اور جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو، اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۲۰۴﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا آخری بابرکت صحیفۂ رحمت، اور کتابِ ہدایت ہے۔ اس کے فضائل ومناقب نہایت عجیب وغریب اور بے شمار ہیں، انہی فضائل ومزایا کے طفیل اس کے قاری اور حاملین کو پوری اُمت پر شرف وبرتری حاصل ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: اَشْرَافُ اُمَّتِیْ حَمَلَةُ الْقُرْاٰنِ وَاَصْحَابُ اللَّیْلِ۔ [مشکوۃ] میری اُمت کے اشراف قرآن کے حاملین، اور تہجد گزار لوگ ہیں۔ اس آیت میں قرآن کریم کے آداب وفضائل پر واضح تنبیہ ہے، اوراس کے سننے اوراس کی تلاوت کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے۔

پہلے تو یہ فرمایا کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اُسے دھیان اور غور سے سنو، اور خاموش رہو۔ اوّل تو قرآن پڑھنے والے قاری کو چاہئے کہ قرآن پڑھنے میں اس بات کا خیال رکھے کہ جن کانوں تک آواز پہنچ رہی ہے، وہ لوگ کام کاج، نینداور کسی ضروری کام میں تو مشغول نہیں ہیں۔ اگر لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں، یا سورہے ہوں، تو اونچی آواز سے تلاوت نہ کرے، کیونکہ کام میں لگے ہوئے لوگ قرآن حکیم کی طرف توجہ نہیں کرسکتے۔ پڑھنے والے پر لازم ہے کہ ایسی صورت حال پیدا نہ کرے کہ حاضرین کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز آرہی ہو، اور کام کاج میں مشغولیت کی وجہ سے قرآن مجید سننے کی طرف توجہ نہ کرسکیں۔

قاری جب یہ دیکھے کہ توجہ سے سننے والے موجود ہیں، تو زور کی آواز سے تلاوت کرے، جو لوگ مشغول نہیں ہیں ان پر لازم ہے کہ خاموش رہیں، جیسے عام مذہبی جلسوں میں ہوتا ہے کہ لوگ اسی خاطر جمع ہوتے ہیں کہ قرآن سنیں، اور وعظ کی سماعت کریں۔ پس اگر قرآن مجید پڑھا جارہا ہو، اور لوگ باتیں کررہے ہوں، تو یہ ناقدری اور سخت بے ادبی شمار ہوگا۔ یہ حکم کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو، یہ حکم نماز اور خارج نماز دونوں کو شامل ہے، جو لوگ امام کے پیچھے نماز میں کھڑے ہوں، ان کے لئے تو غافل ہونے کا موقع ہی نہیں ہے، کاروبار اور دکان چھوڑ کر آتے ہیں، اور مسجد میں موجود ہیں، اور جب تک نماز میں ہیں، دنیا کا کوئی کام نہیں کرسکتے، پھر بھی امام کی قرأت کی طرف متوجہ نہ ہوں، تو یہ سخت محرومی کی بات ہوگی۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب، اور امام کے پیچھے خاموش رہنے کا حکم:

امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ یا کوئی سورت پڑھنا

ممنوع ہے۔آیت بالا میں قرآن مجید کی تلاوت کے سننے اور تلاوت کے وقت خاموش رہنے کا جوحکم فرمایا ہے، یہ حکم نماز کی مشغولیت کے وقت کو، اور خارجِ نماز کو عام ہے۔اور یہ حکم قطعی ہے جوکہ قرآنی آیت ہے۔نیز صحیح مسلم میں ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وَاِذَاقَرَأَفَأَنْصِتُوا۔ جب امام رکوع کرے،تم رکوع کرو، اور جب سجدہ کرے تم سجدہ کرو، اور جب قرأت پڑھے تو خاموش رہو۔امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اس حدیث کی تخریج کی، بلکہ بالتصریح یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، اس کے الفاظ بھی عام ہیں، جہری اور سرّی دونوں نمازوں کو شامل ہیں۔

ترک القرأۃ خلف الامام کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ارشادات:

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار واقوال سے بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے حضرت عطاء بن یسار تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام کے ساتھ قرأت پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا؟ توانہوں نے فرمایا: لاَقِرَأَةَمَعَ الْإِمَامِ فِیْ شَیْءٍ۔ [صحیح مسلم] یعنی امام کے ساتھ نماز میں کوئی بھی قرأت نہیں ہے۔حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَنْ صَلیٰ رَکْعَةً لَمْ یَقْرَأْ فِیهَا بِأُمِّ الْقُرْاٰنِ فَلَمْ یُصَلِّ اِلَّااَنْ یَکُوْنَ وَرَاءَ الْإِمَامِ۔ [سنن ترمذي باب ماجآء في ترك القرأة خلف الإمام إذا جهر بالقرأة]

مزید تفصیل کتبِ حدیث وفقہ میں دیکھیں۔

تلاوت قرآن کے متعلق چند ضروری مسائل:

قرآن حکیم ایک عجیب کتاب ہے،جس کا پڑھنا، اور پڑھانا، تعلیم دینا، اشاعت کرنا، لکھنا، ترجمہ کرنا، درس دینا، اور کسی بھی طرح اس کی خدمت کرنا، اس کی تلاوت سننا، خاموش رہنا، اس میں غور وفکر کرنا، سب کارِثواب اور عبادت شمار ہیں۔اسی لئے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: سرورعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ۔ [بخاري] تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں، جوقرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔یہ بات اہلِ قرآن کے لئے باعثِ فخر ومباہات ہے کہ ان کے خیر ہونے کا فیصلہ زبانِ نبوت سے صادر ہوا۔

پس اہلِ قرآن کو چاہئے کہ وہ مساجد ومدارس میں پابندی کے ساتھ اس نعمتِ عظیمہ کی خدمت کا تندہی کے ساتھ اہتمام کریں م تاکہ روزِ قیامت انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ساری خلقت پر فوقیت وبرتری حاصل کریں۔

اور یہ بات قابلِ غور ہے کہ اگر قرآن کی خدمت تمام سعادتوں کا سرچشمہ ہے، اسی طرح اس کی بے احترامی و

بے ادبی سارے گناہوں سے بڑھ کر بھی تو ہے۔ نماز کے اندر قرآن کو غور وتدبر سے سننا، اور خاموش رہنا لازم ہے، یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی برابر اس جرم میں شریک ہیں، کہ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ امام کہاں سے، اور کس سورت سے قرأت کر رہا ہے۔ اسی طرح جمعہ اور عیدین کے خطبوں کا حکم ہے کہ خاموشی کے ساتھ سننا فرض اور ضروری ہے۔ اگر کسی بولنے والے کو خاموش کرنا مقصود ہو تو اشارہ سے کام لے، زبان سے کچھ نہ کہے۔

البتہ نماز اور خطبہ کے علاوہ عام حالات میں کوئی شخص بطورِ خود تلاوت کر رہا ہو، تو دوسروں کو خاموش رہ کر اس پر کان لگانا واجب ہے یا نہیں؟ اس میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں: بعض حضرات کے نزدیک سننا اور خاموش رہنا لازم ہے، لیکن بعض دوسرے فقہاء نے یہ تفصیل فرمائی ہے کہ کان لگانا اور سننا صرف ان مقامات میں واجب ہے جہاں قرآن کریم کو سنانے کے لئے ہی پڑھا جا رہا ہو، جیسے نماز وخطبہ وغیرہ میں۔

اور اگر کوئی شخص خود ہی تلاوت کر رہا ہو، یا چند آدمی کسی مکان یا مسجد میں اپنی اپنی تلاوت کر رہے ہوں، تو دوسرے کی آواز پر کان لگانا اور خاموش رہنا واجب نہیں ہے، کیونکہ احادیثِ صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کی نماز میں جہراً تلاوت فرماتے تھے، اور ازواج مطہرات اس وقت نیند میں ہوتی تھیں۔ بعض اوقات حجرۂ مبارکہ سے باہر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سنی جاتی تھی۔ یہی راجح ہے۔

اور اس قسم کی روایات سے فقہاء نے خارجِ نماز کی تلاوت کے معاملہ میں کچھ گنجائش دی ہے۔ لیکن اولیٰ اور بہتر سب کے نزدیک یہی ہے کہ خارجِ نماز بھی جب کہیں سے تلاوتِ قرآن کی آواز آئے تو اس پر کان لگائے، اور خاموش رہے، اور اسی لئے ایسے مواقع میں جہاں لوگ سونے میں، اور کام کاج میں، کھانے میں، یا نماز میں، یا تعلیم میں مشغول ہوں بآوازِ بلند تلاوت کرنا بہتر نہیں، بلکہ جہالت ہے، اور نہ سننے اور کان نہ لگانے کا گناہ قاری کی گردن پر ہوگا۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح طور پر معلوم ہوگئی جو تلاوتِ قرآن کے وقت ریڈیو وغیرہ کھول دیتے ہیں، یا کیسٹ لگاتے ہیں، یا رمضان المبارک کے مہینہ میں شبینوں میں لاؤڈ سپیکر لگا کر محلوں میں، بازاروں میں قرآن کریم کی آواز پہنچاتے ہیں، جہاں لوگ سننے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اور لوگوں کی نیند میں خلل پیدا ہوتا ہے، بیماروں میں بے چینی پیدا ہوتی ہے، یہ سراسر جہالت اور غیر دانشمندی اور بے ادبی ہے۔ چاہئے کہ اس غیر شائستہ عمل کو ترک کیا جائے، اور لوگوں کو بے ادبی اور گناہ سے بچایا جائے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جس وقت امام نماز میں، یا خطیب خطبہ میں کوئی مضمون جنت و دوزخ کے متعلق پڑھ رہا ہو، تو اس وقت جنت کی دعاء یا دوزخ سے پناہ مانگنا بھی جائز نہیں۔ یعنی زبان سے، کیونکہ اس آیت کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وعدہ اس شخص کے لئے ہے جو تلاوتِ قرآن کے وقت خاموش رہے، اور جو خاموش نہ رہے وہ اس وعدہ میں شامل نہیں۔ البتہ نفل نمازوں میں ایسی آیات کی تلاوت کے بعد آہستہ دعا مانگنا سنت سے ثابت ہے، اور موجب ثواب ہے۔ [مظهري]

﴿لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ قرآن مجید کے آداب بجالائیں گے، وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے حقدار اور مستحق ہوں گے۔ اس سے بات کا دوسرا رخ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ قرآن مجید کی بے حرمتی اور بے احترامی کریں گے، وہ قہر و غضب کے مستحق ہوں گے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝٢٠٥ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۝٢٠٦ ۩

ترجمہ: اور اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے، اور ڈرتے ہوئے، اور ایسی آواز سے اپنے ربّ کو یاد کیجئے جو زور کی بات سے کچھ کم ہو، صبح کے وقت اور شام کے اوقات میں، اور غفلت والوں میں سے مت ہو جانا ۝٢٠٥ بے شک جو لوگ آپ کے ربّ کے نزدیک ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور اس کو سجدہ کرتے ہیں ۝٢٠٦

معارف ومنازل

ان سے پہلی آیات میں قرآن مجید سننے کا ذکر تھا، اور قرآن مجید کو بصائر اور ہدایت و رحمت بتایا، اور اس کے آداب کو بتایا ان دو آیتوں میں جمہور علماء کے نزدیک مطلق ذکر اللہ تعالیٰ کا حکم، اور اس کے آداب کا بیان ہے، جس میں تلاوتِ قرآن بھی شامل ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس میں بھی ذکر سے مراد قرآن مجید ہی ہے، اور جو آداب اس میں بیان ہوئے ہیں وہ بھی تلاوتِ قرآن ہی سے متعلق ہیں۔

لیکن یہ کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ علاوہ قرآن مجید کے دوسرے اذکار کا بھی سب کے نزدیک یہی حکم اور

یہی آداب ہیں۔سورۃ کی ابتداء ذکر اللہ سے ہوئی،اور اختتام بھی ذکر اللہ سے۔

ذکر اللہ کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے،اسی کی وجہ سے ساری دنیا آباد اور قائم ہے۔سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت قائم نہ ہوگی،جب تک زمین پر اللہ اللہ کیا جاتا رہے گا۔[مسلم] نماز بھی اللہ تعالیٰ شانہ کے ذکر کے لئے ہے،جیسا کہ ارشاد ہے:﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی﴾[طٰہٰ:۱۴]

سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہے:﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾(اور اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے)۔

سورۃ بقرہ میں فرمایا:﴿فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ﴾[البقرۃ:۱۵۲](سو تم مجھے یاد کیا کرو،میں تمہیں یاد کروں گا،اور میرا شکر کرو،اور میری ناشکری نہ کرو)۔

سورۂ احزاب میں فرمایا:﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا وَّسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا﴾[الأحزاب:۴۲](اے ایماندارو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کو،بہت کثرت کے ساتھ،اس کی پاکی بیان کرو صبح اور شام کو)۔

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾[آل عمران:۱۹۱](عقلمند لوگ وہ ہیں جو یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے،بیٹھے ہوئے،اور لیٹ کر) یعنی ہر حال و ہر کیفیت کے ساتھ۔قرآن کریم میں سو سے زائد مقامات پر ذکر اللہ کا بیان اور ترغیب ہے۔

ذکر اللہ ایسا درخت ہے جس کی شاخیں جنت میں ہیں:

دنیا میں سانس لینے کے ساتھ انسانوں کی زندگی اور حیات وابستہ ہے،موت نام ہے سانس کی بندش کا۔مرنے کے ساتھ سانس بند ہو جاتا ہے،انسان سانس لینے میں کوئی تکلیف اور دقت محسوس نہیں کرتا۔ہر شخص سہولت کے ساتھ رات دن چوبیس گھنٹے میں چوبیس ہزار مرتبہ کم از کم،اور ستائیس ہزار مرتبہ سے زیادہ سانس لیتا ہے جنتی زندگی میں تمام طاعات نماز،روزہ،زکوٰۃ،حج،عمرہ،تعلیم و تعلم،تبلیغ وصدقات سارے موقوف اور منقطع ہو جائیں گے،مگر ذکر اللہ سانس کی طرح بلا تکلف بغیر محنت کے ابدی جاری رہے گا،اور یہی ذکر اللہ بلا تکلف تمام جنتیوں کی زندگی کا نام ہوگا،جس سے وہ ہمیشہ محظوظ رہیں گے۔[نووي شرح مسلم]

حدیث قدسی میں ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری معیت (قرب) ان لوگوں کے ساتھ ہے جن کے

ہونٹ ہر وقت میرے نام کے ساتھ حرکت کررہے ہوں۔یعنی ہر وقت قلب وزبان سے مجھے یاد کررہے ہوں۔ [بخاري] یہ کتنی بڑی سعادت ہوگی کہ مسلمان شب وروز، خوشی غمی میں ہر لمحہ ذکر اللہ میں مشغول ہو، یہ بے مثال خزانہ اور بلند وبالا عظیم درخت طوبیٰ ہے، جس کی شاخیں پوری جنت میں پھیلی ہوئی ہیں۔اے ہمارے پروردگار! اپنی مہربانی اور نظرِ رحمت کے ساتھ ہمیں یہ خزانہ نصیب فرما۔آمین

صحیحین کی روایت میں ہے: كَانَ النَّبِيُّ يَذْكُرُ اللهَ عَلٰى كُلِّ اَحْيَانِهٖ. یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وقت، ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیا کرتے تھے، یعنی ذکر اللہ میں مشغول رہتے تھے۔

یک چشمِ زدن غافل ازاں شاہ نباشی ☆ شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

افسوس کا مقام ہے کہ جس ہستی کا کوئی گناہ نہیں، اور آٹھوں جنتوں کی چابیاں اس کے ہاتھ میں ہوں، اور ساری خلقت کے لئے جنت کا دروازہ وہی کھولتا ہو، سارے انبیاء علیہم السلام قطار در قطار ان کے منتظر ہوں کہ ہمارے لئے جنت کا دروازہ وہ کب کھولے گا، اور ہمیں جنت کا داخلہ اس کے طفیل نصیب ہوگا، اس کا حال یہ ہے کہ پوری زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی ذکر اللہ کے بغیر نہیں گزرتا، وہ ہر لمحہ ذکر اللہ کے ساتھ رطبُ اللسان نظر آتا ہے، وہ پوری دنیا سے کنارہ کش ہے۔کھربوں اور بے شمار صلوٰۃ وسلام ہوں، ان کی ذات گرامی پر۔

ہمارا حال یہ ہے کہ اس کا کلمہ پڑھ کر نہ اس سے وفا کی، نہ اس کے ربّ اور اپنے خالق ومالک کے ساتھ وفا کی۔رات دن دنیا کے لئے محنت ومزدوری کرتے ہیں، بوجھ اٹھاتے ہیں، مگر تھکاوٹ محسوس نہیں کرتے، ذکر اللہ کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں۔ یاد رکھیں! تمہاری قبروں کی یہی روشنی ہے، ورنہ کفِ افسوس ملتے ہوئے پچھتاؤ گے۔ اٹھو، جاگو، رات دن اپنے عظیم ربّ کے دروازہ پر جھکو۔حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا سے امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ آپ نکاح کیوں نہیں کرتیں؟ کہنے لگیں: اسلام میں بیک وقت دوشوہروں سے نکاح حرام ہے، میں نے ذکرِ الٰہی کے ساتھ نکاح کیا ہوا ہے، اور بس ختم۔

حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا صرف تین گھنٹے سوتی تھیں، اکیس گھنٹہ ذکر اللہ میں مشغول رہتی تھیں، اس کے باوجود اتنی کثرت سے روتی تھیں کہ رخساروں پر آنسوؤں نے دوسیاہ لکیریں پیدا کی تھیں، اور کہتی تھیں کہ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا (فرعون کی بیوی) کی زندگی میں، اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں مجھے سکون ملتا ہے، میری زندگی صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے ہے، جنت ودوزخ کو میں نہیں جانتی۔خوب غور کرو۔

جہری ذکر کی فضیلت وطریقہ:

مؤمن بندے دل کو بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے آباد رکھیں، اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہر وقت مشغول رہیں۔ تسبیح وتحمید، تکبیر وتہلیل یہ سب اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے، ان کی فضیلتیں بے شمار صحیح احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ اگر زندگی کے مختلف اوقات میں متعلقہ مسنون وماثور دعائیں پڑھیں، اوران دعاؤں کا پابندی کے ساتھ اہتمام کریں، توزندگی کے عام حالات میں، اور مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی رہے گی۔ سوتے، جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، ہر وقت، گھر سے نکل کر، اور گھر میں داخل ہو کر، اور کپڑے پہنتے وقت، سواری پر سوار ہوتے وقت، اور بیماریوں ومصائب میں ابتلاء کے وقت، سفر کے لئے روانہ ہوتے وقت، کسی منزل پر اترتے وقت، بازار جاتے وقت، خرید وفروخت کے وقت، اور کسی مجلس میں جاتے وقت، اور وہاں سے رخصت ہوتے وقت، کسی خوشی اور فائدہ کے حصول کے وقت، اذان سنتے وقت، مسجد جاتے وقت، تعلیم اور تعلّم کے وقت، غرض یہ کہ ہر کام، اور ہر مشغلہ، اور ہر نشیب وفراز میں ماثورہ مسنونہ دعاؤں کا التزام وادائیگی، اور اتباعِ سنتِ نبوی بڑا کارنامہ ہوگا، اور قربِ الٰہی کا ذریعہ اور سببِ نجات ثابت ہوگا۔

علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ نے "حصن حصین" میں مختلف احوال واوقات کی دعائیں، احادیث کی روشنی میں مرتب کی ہیں۔ نیز دوسرے علماء کرام نے بھی مختلف رسالوں میں دعائیں لکھ دی ہیں۔ تلاوتِ کلام پاک سب سے افضل ذکر ہے، اسی طرح درود شریف کے اتنے فضائل ہیں جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ درود شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفعِ درجات ومراتبِ عالیہ، وشفاعتِ کبریٰ کے لئے اللہ تعالیٰ شانہ سے سوال کیا جاتا ہے، جو کہ ذکر کا ایک معتد بہ حصہ ہے۔ اسی طرح توبہ واستغفار بھی ذکر اللہ کا قابلِ قدر حصہ ہے، بلکہ یہ التزام ہونا چاہئے کہ ہر ذکر کے شروع اور آخر میں درود شریف اور استغفار کی پابندی ہو۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ التَّوْفِیْق

ذکرِ خفی کی فضیلت:

پہلے جس ذکر کا بیان ہوا وہ ذکرِ جلی کے نام سے مشہور تھا، وہ عوام وخواص دونوں طبقوں کا وظیفہ ہے، اور نہایت سہل بھی ہے۔ اب ذکرِ خفی کا تذکرہ ہوگا، جو کہ خواص اور اخصّ الخواص کے ساتھ مخصوص ہے، اور عوام الناس بے چارے آہستہ، یعنی قلبی ذکر سے اکثر بے خبر رہتے ہیں۔

حدیث شریف میں وارد ہے: خَیرُ الذِّکرِ الخَفِي۔ [رواہ أحمد] یہاں خفی سے مراد قلبی ذکر ہے، وہ صرف دل دل میں ہوتا ہے، بلا حرکتِ زبان، اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات کا دھیان کرنا، اور دل کے تصور سے اس طرح خیال جمانا کہ میرے دل پر سونے جوہرات سے "اللہ" کا نام لکھا ہوا ہے، اس طرح دل ہی دل میں اللہ، اللہ کہنا، جیسا کہ بعض اوقات میں لوگ دل میں کسی چیز کا صحیح حساب لگاتے ہیں۔ یہ ذکر خفی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہوتا ہے، اس کی ابتداء (٦٦) عدد سے شروع ہو کر مبتدی لوگوں کے لئے چوبیس ہزار تک، متوسط حضرات کے لئے چھیاسٹھ ہزار تک، اور واصلین کاملین کے لئے ایک لاکھ تک ہے۔

اس میں زبان تالو کے ساتھ لگائی جاتی ہے، اور اسے قطعاً حرکت کرنے سے بند کرنا ہوتا ہے۔ یہ ذکر گرمیوں میں سانس جاری رکھنے کے ساتھ مراقبہ، اور تصورِ محبوب ومطلوب کے ساتھ، اور سردیوں میں سانس بھی بند کرنے کے ساتھ ہی ہوتا ہے، چند یوم کی مشقت کے بعد سینہ کھل جاتا ہے، اور قبض و بندش رفع ہو کر شرحِ صدر کی نعمت حاصل ہوجاتی ہے۔ زہے سعادت! یہ طریقہ نقشبندی حضرات کے سلسلہ میں ہے، اسی کے بارے میں شاعر نے کہا:

محبت جن کی سچی ہو وہ کب فریاد کرتے ہیں ☆ لبوں پر مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں

یہ ذکر پوشیدہ ہے، فرشتے کراماً کاتبین سے بھی مخفی ہے۔ قیامت کے دن جب اعمال کے ترازو میں لکھے ہوئے حسنات وزن ہوتے ہیں، تو ذکرِ خفی وزن میں نہیں آتا، تو حق سبحانہ وعزّ سلطانہ فرمائیں گے: میرے بندے کا ایک قیمتی عمل ایسا ہے جو میرے سوا کسی کو معلوم نہیں، آج میں اسے کھول دوں گا، جس سے سارا میزان جھک جائے گا، اور مغفرت کا پیغام ذاکرین تک پہنچ جائے گا۔ اللہ ربّ العزّت ہمیں اس کا اہل بنادے۔ آمین

زور زور سے ذکر کرنا بھی جائز ہے، مگر اس میں کبھی ریاکاری کا خطرہ ہوتا ہے، پس سارا سرمایہ ضائع ہوجاتا ہے، بخلاف ذکرِ قلبی کے، اس میں یہ خطرہ نہیں ہوتا۔ ذکرِ جہری میں یہ نہ ہونا چاہئے کہ چیخنے کے ساتھ ہو، اور بلند آواز سے ہو، بلکہ بہتر اور مستحسن یہ ہے کہ ہلکی آواز کے ساتھ ہو، جس سے دوسروں کا ذکر وتلاوت اور نیند متاثر نہ ہو، اسی کو فرمایا: ﴿وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾۔ (جو زور کی بات سے کچھ کم ہو)۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ ایک مرتبہ سفر میں ہم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگوں نے زور زور سے اللہ اکبر کہنا شروع کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! اپنی جانوں پر رحم کھاؤ، خود کو مت تھکاؤ، تم ایسے معبود کو پکار رہے ہو جو سمیع وبصیر ہے، اور تمہارے ساتھ ہے، تم ایسے معبود کو نہیں پکار رہے ہو جو بہرا ہو، اور

غائب ہو، اللہ تعالیٰ تمہارا سب کچھ دلوں کے بھید اور ارادہ تک سنتا بھی ہے، اور دیکھتا بھی ہے۔ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحدید:۴] (تم جہاں اور جس حال میں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس سے پوشیدہ نہیں۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب پیچھے چل رہا تھا، اور آہستہ آہستہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ پڑھ رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبداللہ بن قیس! (یہ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کا نام ہے) کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتادوں؟ پھر فرمایا کہ وہ خزانہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ ہے۔ [بخاري ومسلم]

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: نَحْنُ فِيْ لَذَّةٍ لَوْ عَلِمَهَا الْمُلُوْكُ لَجَادَلُوْنَا بِالسُّيُوْفِ۔ دنیا کے بادشاہوں کی عادت ہے کہ اگر کسی کے پاس بہت نایاب قیمتی چیز دیکھتے ہیں تو زبردستی اس سے اپنے لئے چھین لیتے ہیں، اس لئے حضرت نے فرمایا: اگر ہمارے قیمتی سرمایہ "ذِكْرُ الله" کا بادشاہوں کو پتہ نہیں ہے، اگر ان کو اس سرمایہ کی لذّت کا علم ہوجاتا تو وہ تلوار کے زور سے یہ نعمت ہم سے چھین لیتے۔ ظاہر ہے کہ تعلق مع اللہ سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ہے، پس کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے پاس یہ سرمایہ ہے؟

حکایت:

ملک سنجر سلجوقی بڑا دیندار بادشاہ گزرا ہے، اسے خیال پیدا ہوا کہ اپنی مملکت کے ایک صوبہ نیمروز کی پیداوار اور آمدنی حضرت قطب الاقطاب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے لئے وقف کردوں، انہوں نے وقف نامہ لکھ کر اپنے وزیر کے ہاتھ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تحفہ مسترد فرماتے ہوئے بادشاہ کو دو شعروں کا خط لکھا، جو یہ ہیں:

چون چتر سنجری رخ بختم سیاباد ☆ در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
وانگہ کہ شد مرا خبر از ملک نیم شب ☆ من ملک نیمروز بدانگے نمے خرم

میری قسمت کا چہرہ ملک سنجر کی چتری کی طرح سیاہ ہوا، اگر میرے دل میں ہوس ہو ملک سنجر کی بخشش کی، جب سے مجھے آہ نیم شبی کی بخشش ہوئی، میں ملکِ نیمروز جیسے تحفہ کو ایک پیسہ کے بدلہ خریدنے کا شوق نہیں رکھتا۔

یہ ہے استغناء اور تعلق مع اللہ کا کرشمہ، اور اعتماد علی اللہ کا نمونہ۔ آج کل ہمارے ذاکرین اور گدی نشین جس

سے سراسر محروم اور بے بہرہ ہیں۔

تو آیت کریمہ میں اوّل یہ فرمایا کہ اپنے ربّ کو عاجزی کے ساتھ اپنے دل میں یاد کرو، ڈرتے ہوئے۔ پھر یہ فرمایا کہ ایسی آواز سے یاد کرو جو زور کی آواز کی بہ نسبت کم آواز ہو۔

مطلب واضح ہے کہ احکام وآداب کی رعایت کے ساتھ بہر صورت مقصود رضاء الٰہی ہو۔ اخفاء ہو یا جہر، لسانی ہو یا قلبی، کسی ریاکاری کا، یا اپنی شیخی جمانے کا، یا لوگوں کو معتقد بنانے کا کوئی قصد وارادہ نہ ہو، اور شہرت بھی مقصد نہ ہو، ورنہ بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوگا، اور سخت مؤاخذہ کا سامنا ہوگا، اور ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ کسی جہری ذکر سے نمازیوں کو تشویش نہ ہو۔ تلاوت اور ذکر کرنے والوں کی دل آزاری نہ ہو، سوئے ہوئے لوگوں کے آرام میں خلل پیدا نہ ہو، ورنہ ثواب کے بجائے عذاب ہوگا۔

ذکر واذکار کو صبح وشام جاری رکھنے کا اہتمام کرو:

فرمایا: ﴿بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ کہ صبح وشام اپنے ربّ کو یاد کیا کرو۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ صبح و شام کا خصوصی ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ فراغت کے اوقات ہیں، ان اوقات میں دل کی توجہ ذکر کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان اوقات میں فرشتوں کا آنا جانا ہوتا ہے، ایک جماعت اوپر سے آتی ہے، دوسری اوپر جاتی ہے، اس لئے ان اوقات کو خاص طور سے ذکر فرمایا۔ اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے دوام اور ہمیشگی مراد ہے کہ ہر وقت ذکر کا سلسلہ جاری رکھو۔ تینوں معانی کا مطلب ایک ہی ہے، توجیہات متفرق ہیں۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ غفلت والوں میں سے نہ بنو، ہمیشہ پروردگار عزّ شانہ کی یاد میں لگے رہنا۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ﴾ اس میں ملاءِ أعلٰی کے فرشتوں قدسیوں کی تسبیح اور عبادت کا ذکر ہے۔ تو فرمایا کہ فرشتے بلاشبہ جو تیرے ربّ کے مقرب بندے ہیں، وہ اپنے ربّ کی عبادت سے استکبار نہیں کرتے، یعنی وہ اپنی ذات کو بڑا نہیں سمجھتے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روگردانی کریں۔ وہ نفس اور نفسانی خواہشات سے منزہ اور پاک ہیں، وہ ہمہ وقت بندگی کے آداب کو بجالاتے ہیں، اور خود کو بندگی پر قربان کرتے ہیں، اور اپنے آپ کو صرف بندگی پر محصور جانتے ہیں، اور اپنی عاجزی اور مملوکیت کو خوب جانتے ہیں۔

وہ ہمیشہ تسبیح وتہلیل میں، اور ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں، اور کبھی ذکر وعبادت سے تھکتے نہیں ہیں، اور نہ

ہی سستی کرتے ہیں۔اس بات سے انسانوں کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ فرشتے بے گناہ ہونے کے باوجود ہمیشہ عبادت میں مشغول رہتے ہیں، پس تمہیں چاہئے کہ رات دن عبادت واذکار میں مصروف رہو، کیونکہ تمہارے اوپر گناہوں کا بڑا بوجھ رکھا ہوا ہے، تاکہ طاعات وعبادات کے طفیل تمہارے گناہ معاف ہوجائیں۔اس مضموں کی تفصیل سورۂ بقرہ، اور سورۂ نساء میں دیکھ لیں۔ وَبِاللهِ التَّوْفِيْقُ وَبِهٖ نَسْتَعِيْنُ۔

﴿وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ﴾ اور اس پاک ذات کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں، پس جس طرح فرشتے بے گناہ ہوتے ہوئے ہر وقت سجدہ ریز ہوتے ہیں، لہٰذا تمہیں بھی چاہئے کہ کثرتِ صلوٰۃ وکثرتِ سجدہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایسا قرب حاصل کرو جیسا کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا ہوا ہے۔

سجدۂ تلاوت کا بیان:

اس جملہ پر سورۂ اعراف ختم ہورہی ہے، اور یہ پہلی جگہ ہے جہاں قرآن کریم میں سجدۂ تلاوت آیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کے لئے سجدۂ تلاوت مشروع فرمایا ہے، تاکہ وہ بھی ملأ أعلى کے رہنے والے فرشتوں کی موافقت میں سجدہ ریز ہوجائیں۔یہ سجدۂ تلاوت شیطان کے لئے توپ کا گولہ ہے۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھتا ہے، پھر سجدہ کرتا ہے، تو شیطان روتا ہوا وہاں سے ہٹ جاتا ہے، اور کہتا ہے: ہائے میری بربادی! ابن آدم کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کرلیا، لہٰذا اس کے لئے جنت ہے، اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا، اور میں نے انکار کیا، لہٰذا میرے لئے دوزخ ہے۔ [مسلم]

حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں رات کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضو کا پانی اور دوسری ضروریات فراہم کرتا تھا، ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی رفاقت جنت میں چاہتا ہوں، فرمایا: اس کے علاوہ کوئی سوال کرو، میں نے عرض کیا کہ میرا سوال تو یہی ہے۔فرمایا: تو سجدہ کی کثرت سے اپنے لئے میری مدد کرو۔یعنی سجود کی کثرت کرو تاکہ جنت میں تجھ کو اپنے ساتھ رکھ سکوں۔[مسلم]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ اپنے ربّ کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہو، اس لئے تم سجدہ کی حالت میں خوب دعا کیا کرو کہ اس کی

قبولیت کی بڑی اُمید ہے۔[مسلم]

یاد رہے کہ تنہا ایک سجدہ کر کے دعاء کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، بہتر سجدہ دعاء کے لئے نماز والا سجدہ ہے، وہ بھی نوافل میں، اور دعاء بھی عربی میں ہو، فقط۔

سجدۂ تلاوت کے احکام اور دعاء:

قرآن کریم میں کُل سجدے چودہ ہیں، سورۂ حج کے آخری سجدہ کے ساتھ رکوع کا ذکر ہے، اس سے سجدۂ نماز مراد ہے، سجدۂ تلاوت نہیں۔ سجدۂ تلاوت میں تکبیر تحریمہ کی طرح ہاتھ اٹھانا نہیں، بلکہ اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں چلا جائے، تین تسبیح کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے اٹھ جائے، نہ رکوع، نہ قیام، نہ قرأت، نہ التحیات اور نہ سلام۔ سجدۂ تلاوت میں تین تسبیح کے بعد یہ دعاء ماثورہ پڑھ لے تو بہتر ہے: سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ۔[أبو داؤد، ترمذي، نسائي]

فائدہ:

آیت بالا کی رُو سے واضح ہوا، کہ ذکرِ جلی ہو یا خفی، قلبی ہو یا لسانی، اسی طرح تلاوت قرآن کریم ہو یا نماز، سجدۂ تلاوت ہو یا سجدۂ نماز ان سب طاعات کی روح استحضار اور حضورِ قلب ہے۔ دل بیدار ہو عظمت و کبریاء حق سبحانہ وتعالیٰ دل اور آنکھوں کے اندر موجزن ہو، تب نتیجہ ظاہر ہوگا، اور عبادت میں جان آئے گی، اور دلوں کے اندر اندر قلب میں انوار و برکات کا نور پیدا ہونا شروع ہوگا، اور کیفیت بدل جائے گی، ایک ایسا شرح صدر پیدا ہوگا جس کے اثرات دل و دماغ سے نکل کر ظاہری اعضاء تک پھیل جائیں گے، ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد: ۲۸] (خبردار! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمنان ہوتا ہے) کی کیفیت حاصل رہے گی۔

اور اگر استحضار و حضور قلب نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی دل میں جلوہ گر نہ ہو، تو بے جان نماز و سجدہ، ذکر و اذکار اور تلاوت قرآن کا نہ اثر ہوگا، اور نہ انوار و برکات، کیونکہ مردہ اور بے جان روح عبادت و ذکر سے مردہ دل بیدار نہیں ہوتا۔ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔ مولانا رومیؒ نے فرمایا: ؎

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر ☆ این چنین تسبیح کے دارد اثر

جب عابد میں عبادت کا رنگ نہ ہو، ذاکر میں اذکار کا رنگ نہ ہو، قرآن کی تلاوت کرنے والے میں تلاوت کا رنگ نہ ہو، اور عالم و مبلغ میں علم اور تبلیغ کا رنگ مفقود ہو، تو شاید محنت کا تھوڑا سا ثواب ملنے کی اُمید ہو، مگر اصل سرمایہ جو

کہ قرب ایزدی ہے، وہ شاید حاصل نہ ہو، اور دل کی نجاست دور نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت اور توفیق مانگئے، اور بقصد و بیداری مشق جاری رکھئے۔ مَنْ جَدَّ وَجَدَ کو ذہن میں رکھئے۔ اسی کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [العنکبوت:۶۹] (اور جن لوگوں نے ہماری خاطر کوشش کی ہے، ہم انہیں ضرور بالضرور اپنے راستوں پر پہنچائیں گے، اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ اس سلسلہ میں اصحابِ باطن کی خدمات سے مستفید ہوں۔

قال را بگذار و بنگر سوئے حال ☆ بر اشہد خندہ زند اسہد بلال

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی ☆ رہ گئی رسمِ اذان روحِ بلالی نہ رہی

وہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں ☆ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہ بازی

اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت و استقامت اور خاتمہ بالخیر نصیب فرمائیں۔ آمین!



سُورَۃُ الْاَنْفَالِ

مدنیۃٌ آیاتہا ۷۵ رکوعاتہا ۱۰

سورۂ اَنفال مدنی ہے، اس میں پچھتر (۷۵) آیتیں، اور دس (۱۰) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام اور کوائف:

سورۂ انفال مدنی ہے، اور اس کی پہلی آیت میں اَنْفَال کا لفظ موجود ہے، یہ نام اسی سے مأخوذ ہے۔ اور ترتیبِ تلاوت میں یہ قرآن حکیم کی آٹھویں سورت ہے، اور ترتیبِ نزول میں -۸۸- ویں نمبر پر ہے۔ اس کا نزول سورۂ بقرہ کے بعد ہے۔ یہ سورت ۷۵ آیات، دس رکوع، ۱۲۵۳ کلمات، اور ۵۵۲۲ حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ما قبل کے ساتھ:

(۱) سورۂ اعراف میں مشرکین اور اہلِ کتاب کے جہل وعناد اور کفر وفساد کا بیان تھا، سورۂ انفال میں ان کے کفر کے انجامِ بد کا بیان ہے۔

(۲) سورۂ اعراف کے آخر میں فرائضِ مؤمنین کا بیان تھا، سورۂ انفال کی ابتداء میں بھی فرائضِ مؤمنین کا بیان ہے۔

(۳) سورۂ اعراف کی ابتداء میں فرائضِ مؤمنین کا ذکر تھا، اس سورت کی ابتدا میں بھی فرائضِ مؤمنین کا تذکرہ ہے۔

(۴) سورۂ اعراف کے آخر میں اوصاف ونتائج مؤمنین کا ذکر تھا، اس سورت کے ابتداء وآخر میں بھی اوصاف ونتائج مؤمنین کا ذکر ہے۔

مختصر موضوع:

قوانینِ جہاد کا بیان، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے، مؤمنین کے لئے احکامِ ضروریہ نصرتِ خداوندی کا بیان، مالِ غنیمت کی تقسیم کا بیان، صبر واستقامت کا بیان، اور اس کی تعلیم وفضائل، غزوۂ بدر کے واضح اور ظاہر برکات وفوائد، قیدیوں کے متعلّق ہدایات، مسلمانوں کی حوصلہ افزائی، اور اہلِ شرک کی ناکامی اور ان کی حوصلہ شکنی، قوانینِ جنگ کا بیان جو کہ بارہ دفعات ہیں، اپنے اپنے موقع پر ان شاء اللہ ان کی نشاندہی ہوتی رہے گی، تذکیر بأیّامِ اللہ، تذکیر بآلاءِ اللہ، تذکیر بِمَا بَعْدَالْمَوت کا بیان، انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب، الرِّضا بِالْقَضَاء، جہاد و ہجرت کی ترغیب، مشرکین اور منافقین کے خبائث اور نتائج کا بیان، منکرین کے شکوک وشبہات کے جوابات، اور یہ تعلیم وتربیت کہ مسلمان قوم اپنے عقائد واعمال کی مسلسل نگرانی کرے، اور ایسے کارنامہ انجام دے کہ آئندہ مسلمانوں اور ان کی نسلوں کے لیے ان کے اعمالِ ہدایت اور مشعلِ راہ ثابت ہوں، وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

ترجمہ: لوگ آپ سے انفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ انفال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لئے ہیں، سو تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور آپس میں تعلقات کو درست کرو، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان والے ہو ①

معارف ومنازل

انفال، یعنی مالِ غنیمت:

اَنْفَال نَفَل کی جمع ہے، نفل لغت میں شئ زائد کو کہتے ہیں، اسی لئے فرائض نماز کے علاوہ جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں، یا فرض روزہ کے علاوہ جو روزے رکھے جاتے ہیں ان سب کو نفل کہا جاتا ہے، کیونکہ نوافل کا اصلی لازمی فرض

سے زائد عمل پر اطلاق ہوتا ہے۔ جہاد کے موقع پر دشمنوں کے اموال ساز و سامان ہاتھ آ جائیں انہیں مالِ غنیمت کہا جاتا ہے، یہاں اموالِ غنیمت ہی پر اَنفال کا اطلاق ہوا، اور اگر امیرِ لشکر کسی غازی کے لئے اس کے مقررہ حصّہ سے زائد دینے کا اعلان کر دے، اس کو بھی نفل کہتے ہیں۔

مسلمان کی جنگ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے ہوتی ہے، وہ مال کے لئے نہیں لڑتا، اور نہ ہی مال اس کا مقصود ہے، پس اللہ تعالیٰ کی رضاء کے ساتھ جو مالِ غنیمت میں حصّہ مل جائے وہ چونکہ اصل مقصد یعنی رضاءِ الٰہی سے زائد چیز ہے، اور ایک انعام ہے، اس لیے اس کو اَنفال کہا جاتا ہے۔

گزشتہ اُمتوں پر مالِ غنیمت حرام ہوتا تھا:

پہلی امتوں میں جب کافروں سے جنگ ہوتی تھی، اور ان کے اموال ہاتھ آتے تھے، تو انہیں آپس میں بانٹنے اور استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان اموال کو کسی میدان میں جمع کر کے رکھ دیتے تھے، اور آسمان سے ایک آگ نمودار ہو کر آتی تھی، اور انہیں جلا دیتی تھی، اور یہ اس بات کی دلیل ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مجاہدین کا جہاد قبول ہو گیا۔

اگر مال غنیمت جمع کر کے رکھ دیا جاتا، اور آگ نازل نہ ہوتی تو سمجھا جاتا کہ اس مال میں سے کسی شخص نے کچھ غلول (چوری) کیا ہے، اس لیے اس کی قبولیت موقوف ہو گئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر علیہ السلام نے جہاد فرمایا، اور فتح کے بعد اموالِ غنیمت جمع کیے گئے، اس کے بعد آگ آئی تاکہ ان کو جلائے، مگر آگ نے اس کو نہ کھایا، یعنی نہیں جلایا، پیغمبر علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم میں سے کسی شخص نے خیانت کی ہے، کوئی چیز چھپائی ہے، لہٰذا ہر قبیلہ کا ایک آدمی مجھ سے بیعت کرے، بیعت کرتے کرتے ایک شخص کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چپک کر رہ گیا، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم ہی لوگوں میں سے کوئی شخص خیانت کرنے والا ہے، اس کے بعد اس قبیلہ کے لوگ بیل کے سر کے برابر سونا لے کر آئے جو انہوں نے چھپا کر اٹھایا تھا، چنانچہ اس کو مال غنیمت میں ملا کر رکھ دیا تو آگ آئی اور اس نے تمام مال غنیمت کو جلا دیا۔ [بخاري]

بعض روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ نبی حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے، واللہ اعلم

اموالِ غنیمت کا اُمتِ محمدیہ کے لیے حلال ہونا:

گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی اُمتوں کے اکثر احکام سخت ہوتے تھے، جیسا کہ اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی

آیت: ﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ [الأعراف:۱۵۷] (اوران کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتے ہیں، اورناپاک چیزیں ان پرحرام کرتے ہیں) کے تحت گزرچکی۔ اس اُمّت مرحومہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام احکامِ شرعیہ آسان اور نرم فرمائے۔ سید عالم ﷺ نے ارشادفرمایا: اَلدِّيْنُ يُسْرٌ۔ دین اسلام کے احکام سہل اور آسان ہیں۔ [بخاري]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورعالم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ مجھے انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی:

(۱) ایک یہ کہ مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے، (جو الفاظ مختصر ہوں اور بہت سے معانی پر دلالت کرتے ہوں انہیں جوامعُ الکلم کہا جاتا ہے، پورا قرآن حکیم اوراحادیثِ مرویہ (الفاظِ نبوّت کے ساتھ) اس کی مثال اورنمونہ ہیں (جہاں دریا جتنے معانی ہیں مختصر کوزہ جتنے الفاظ میں بند ہیں)۔

(۲) دوسرا رُعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی کہ دور دور تک دشمن کے دلوں میں میرا رُعب اور دہشت طاری رہے گی، ایک ماہ کی مسافت تک دشمن مجھ سے خوفزدہ رہے گا۔ آج ہمارے زمانہ میں بھی اس کی واضح مثال موجود ہے کہ دنیوی وسائل اور محیّر العقول اسلحہ سے پچاس ملکوں کی متحد نیٹو فوج چند نہتے بے سروسامان بھوکے پیاسے غیر مسلح طالبان کا نام سن کر بے ہوش ہوجاتے ہیں، اور فرعون کی طرح ان کا پیشاب خطا ہوجاتا ہے۔ شروع میں یہ کہتے تھے کہ صرف دس دن کے لیے آئے ہیں، علاقہ فتح کر کے دوسرے ہفتے میں واپس جائیں گے، مگر تمام طاقتوں کا مالک ربّ العزّت سبحانہ کے حکم سے اتنے ذلیل وخوار اور شرمندہ ہوئے کہ دنیا کی تاریخ میں ان کی ذلّت ورسوائی ثابت ہوگئی، اگر ان میں تھوڑی حیا اور شرم ہوتی تو آئندہ مسلمان قوم کا نام تک نہ لیتے، مگر کافر میں شرم وحیا کہاں؟ ان میں حیاء چونکہ نہیں ہوتی اس لیے دُم دبا کر خاموشی کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔

(۳) تیسرے اموالِ غنیمت میرے لیے حلال کیے گئے، جو دوسری امتوں کے لیے حلال نہ تھے۔

(۴) چوتھے یہ کہ پوری زمین میرے لیے سجدہ گاہ بنادی گئی، اور طہارت کی جگہ بنادی گئی، جہاں کہیں وقت ہوجائے نماز پڑھ لیں، مسجد کی کوئی قید نہیں، اور اگر پانی نہ ملے یا قدرت نہ ہو تو تیمم کرلیں۔

(۵) پانچویں یہ کہ میں ساری مخلوق اور تمام کائنات کے جن وانس کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، مجھ سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قوموں کے لیے اور خاص علاقوں کے لیے مبعوث ہوتے تھے۔

(۶) چھٹے میری آمد پر نبیوں کی آمد ختم کردی گئی، میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔[مسلم]

شانِ نزول:

یہ آیت کریمہ غزوۂ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر جو اسلام و کفر کا سب سے بڑا پہلا معرکہ تھا، اس میں جب مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، اور کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آیا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اس کی تقسیم کے متعلق ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جو اخلاص و اتفاق کے اس مقام کے شایان شان نہ تھا جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگی ڈھلی ہوئی، اور وقف تھی، اس لیے سب سے پہلی آیت میں اس کا فیصلہ فرما دیا گیا، تا کہ اس مقدس گروہ کے قلوب میں صدق و اخلاص اور اتفاق و ایثار کے سوا کچھ نہ رہے، اور ہر قسم کی اجتہادی غلطیوں کا قلع قمع ہو جائے۔

اس واقعہ کی تفصیل غزوۂ بدر کے شریک حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی زبانی مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم وغیرہ میں اس طرح منقول ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے کسی نے آیتِ مذکورہ میں لفظ اَنفال کا مطلب پوچھا، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ آیت تو ہمارے یعنی اصحابِ بدر ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جس کا واقعہ یہ تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہمارے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جس نے ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈالا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ اموالِ غنیمت کو ہمارے ہاتھوں سے لے کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد فرمایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب حاضرینِ بدر میں اس کو مساوی طور پر تقسیم فرما دیا۔

صورت یہ پیش آئی تھی کہ ہم سب غزوۂ بدر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلنے، اور دونوں فریق میں گھمسان جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی، تو اب ہمارے لشکر کے تین حصّے ہو گئے: کچھ لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تا کہ وہ پھر واپس نہ آ سکے، کچھ لوگ کفار کے چھوڑے ہوئے اموالِ غنیمت کے جمع کرنے میں لگ گئے، اور کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد اس طرح جمع رہے کہ کسی طرف سے چھپا ہوا دشمن آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ نہ کر دے۔

جب جنگ ختم ہو گئی، اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا، تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے، اس لیے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصّہ نہیں، اور جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے

تھے انہوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو، کیونکہ ہم نے ہی دشمن کو پسپا کیا، اور انہیں مار بھگایا، اور تمہارے لیے یہ موقع فراہم کیا کہ تم بے فکر ہو کر مالِ غنیمت جمع کر لو، اور جو لوگ آنحضرت ﷺ کی حفاظت کے لیے آپ ﷺ کے گرد جمع رہے انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں تمہارے ساتھ شریک ہوتے، لیکن آنحضرت سرورِ کونین ﷺ کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم ضروری کام تھا ہم اس میں مشغول رہے، اس لیے ہم بھی اس کے مستحق ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ گفتگو جب سید کائنات ﷺ تک پہنچی اس پر سورۂ انفال کی پہلی آیت کا نزول ہوا، جس نے واضح کر دیا کہ مالِ غنیمت صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، اللہ تعالیٰ ہی جو مصرف مقرّر فرمائے گا یہ اسی بنیاد پر تقسیم ہوگا، اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو اس کی تقسیم کا جو بھی حکم دے گا وہ اسی کے مطابق فیصلہ فرمائے گا، چنانچہ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاداتِ ربانی کے مطابق اس مالِ غنیمت کو سب شرکاءِ جہاد میں مساوی طور پر تقسیم فرما کر پورے شرکاءِ جہاد کو مطمئن فرما دیا، جس سے ساری چہ میگوئیاں ختم ہو گئیں، اور لوگ بطیبِ خاطر راضی ہو گئے۔ [ابن کثیر]

فائدہ:

غنیمت عموماً اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ و جہاد کے ذریعہ مخالف فریق (کفار) سے حاصل کیا گیا ہو، اور فئ اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ و قتال کے کفار سے ہاتھ آیا ہو، خواہ وہ رضامندی سے دینا قبول کریں، یا وہ اس مال کو چھوڑ کر بھاگ جائیں، اور نفل کا لفظ اکثر اس انعام کے لیے بولا جاتا ہے، جو امیرِ جہاد کسی خاص مجاہد کو اس کی نمایاں کارکردگی کے صلہ میں علاوہ حصۂ غنیمت کے بطورِ انعام عطا کرے۔ یہ معانی تفسیر ابن جریر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں۔ [ابن کثیر]

اور کبھی مطلقاً مالِ غنیمت کو نفل اور انفال کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ اس آیت میں اکثر مفسرین حضرات نے یہی عام معنی مراد لیے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ عام اور خاص دونوں معنی کے لیے بولا جاتا ہے، اس لیے کوئی اختلاف نہیں۔

ازالۂ شبہ:

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ سرورِ عالم ﷺ کی عظمت شان کا خیال رکھا، اور نہ اپنے مرتبہ و

مقام کا، جوں ہی انہیں تھوڑا سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا بلا سوچے سمجھے اس کی تقسیم میں اختلاف کرنے لگے، وغیرہ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ان کی زندگی کا پہلا معرکہ تھا، اس سے پہلے انہوں نے کبھی دشمن کے ساتھ ایسی جنگ نہیں لڑی تھی۔

دوئم یہ کہ ایسا کثیر مالِ غنیمت انہوں نے نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی جمع کیا تھا۔

سوئم یہ کہ مالِ غنیمت کے استحقاق اور تقسیم کے متعلق کوئی ہدایات کا ابھی تک حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے اس سلسلے میں وہ لاعلم اور بے خبر تھے، انہوں نے یہ سمجھا کہ جس گروہ نے کسی مال پر قبضہ کیا ہو تو وہ مال صرف اسی کا ہوگا۔

چہارم یہ کہ ان کا یہ اختلاف صرف اظہارِ رائے تک محدود تھا، انہوں نے اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا تھا۔

پنجم یہ کہ وہ بھی سمجھتے اور جانتے تھے کہ ہمارا یہ زبانی اختلاف حتمی اور آخری نہیں، جب ہمارے درمیان حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بنفس نفیس موجود ہیں، پس وہی جو فیصلہ فرمائیں گے، وہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہوگا، اور ہمارے ایمان کا جزو ہوگا، یہی وجہ ہے کہ نزولِ آیت اور حکمِ الٰہی کے سامنے انہوں نے بغیر چون وچرا کے سرِ تسلیم خم کیا، اور اپنی باتوں سے تائب ہوئے، اور ایک دوسرے سے معافی مانگنے لگے۔

خلاصۂ مضمون:

آیت کریمہ میں حکم دیا گیا کہ مالِ غنیمت اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو، اور خوب تقویٰ اختیار کرو، اور آپس میں اختلاف نہ کرو، اور آپس کے معاملات اور تعلقات کو درست رکھو، یہ سب کچھ آسان تو نہیں ہے، آخر انسان کو روزی کی ضرورت رہتی ہے، اسی طرح تقویٰ بھی آسان نہیں کہ اسے ہر شخص بآسانی اپنے طور پر نبھائے۔ اسی طرح اتحاد و اتفاق بھی اسان نہیں۔

ان تمام چیزوں کے جواب میں فرمایا گیا کہ اپنی رائے، اپنی عقل، اپنے جذبات اور خیالات کو ایک طرف رکھ دو، اور خود کو ربّ العزّت جل شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے حوالے کردو، وہ جس کام کے کرنے کا کہیں اس کو کرلو، جس کام کو چھوڑنے کا فرمائیں اس کو چھوڑ دو، وہ جس چیز کو اچھا کہیں اس کو اچھا سمجھو، اور وہ جس کو برا بتائیں اسے بُرا سمجھو، تب مال سے توجہ ہٹانا آسان، روزی کا مسئلہ بھی آسان، اخلاص کا پیدا ہونا بھی آسان، تقویٰ اختیار کرنا بھی آسان، اور اتفاق و اتحاد برقرار رکھنا بھی آسان۔ یعنی اپنے اندر اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ اس طرح بھرلو کہ وہ

تمہارا عقیدہ بن جائے، تب تمہارے لیے سب کچھ آسان ہو جائے گا۔

فوج میں بھرتی ہونے والے افراد اپنے افسر کی فرمانبرداری کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، تب ہی تو وہ بے عقل و بے جان مشین کی طرح ہر حکم کو مانتے ہیں، اور سخت سے سخت ناگوار کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح اطاعت ہی ایمان کا معیار ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اصالۃ ہے کہ وہ حاکمِ مطلق ہے، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابتاً ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کا لانے والا مبلغ ہے، اسی طرح ان کے نائبین علماء کرام کی اطاعت بھی اسی طرح ضروری ہے، پس تم طالبِ آخرت بنو، دنیا اور مالِ غنیمت کے حصّے کرنے سے بچو، تمہارا مقام بہت بلند و عظیم ہے، کیونکہ مجاہدین و شرکاءِ بدر کا مقام تمام امّت سے اونچا ہے، اور ان کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ [بخاري ج ۲ باب فضائل أهل بدر]

ضروری وضاحت:

سورۃ الانفال جہاد کی بنیادی سورت ہے، اس میں قیامت تک کے لیے قوانینِ جنگ کا بھی بیان ہے، اور جہاد کے بیس (۲۰) فوائد کا مفصل تذکرہ ہے۔ اسی طرح مجاہدین کے پچیس اوصاف کا بھی اس سورتِ مبارکہ میں واضح بیان ہے، جبکہ اس میں پندرہ قوانینِ جہاد کا بھی بیان ہے، اسی طرح مالِ غنیمت کی تقسیم کا بھی تذکرہ ہے۔ فرمایا:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ﴾ لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں۔

﴿قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ آپ فرما دیجئے کہ مالِ غنیمت نہ کسی بوڑھے کا حق ہے، نہ کسی نوجوان کا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت نازل نہ ہوتی تو مسلمانوں کو کیونکر باوجود قلت اور بے سروسامانی کے غلبہ حاصل ہو سکتا تھا؟ اس کی تفصیل آگے آنے والی ہے، لہٰذا اس مال کا مالک یقیناً اللہ تعالیٰ ہے، اور پھر اس کے بعد نیابتاً اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جو حکمِ الٰہی کے تحت اس مال کو مجاہدین پر تقسیم کریں گے۔

اس سلسلے میں مسلمانوں کا فرض یہ ہونا چاہئے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور تقویٰ اختیار کرو، اور اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مسند احمد میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میرے بھائی حضرت عُمیر رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے، میں نے ان کے بالمقابل مشرکین میں سے سعید بن العاص کو قتل کیا، اور اس کی تلوار لے کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میں چاہتا تھا کہ یہ تلوار مجھے مل جائے، مگر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ اس کو مالِ غنیمت میں جمع کر دو، میں حکم ماننے پر مجبور تھا، مگر میرا دل اس کا سخت صدمہ محسوس کر رہا تھا کہ میرا بھائی شہید ہوا، اور میں نے

اس کے بالمقابل ایک دشمن کو مار کر اس کی تلوار حاصل کی، وہ بھی مجھ سے لے لی گئی، مگر باین ہمہ تعمیلِ ارشاد کے لیے مالِ غنیمت میں جمع کرنے کے لیے آگے بڑھا، تو ابھی دور نہیں گیا تھا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورۂ انفال کی یہ آیت نازل ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بلوا کر یہ تلوار مجھے عنایت فرمادی، اور ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے تقسیمِ غنیمت کا فیصلہ فرمادیا۔

جب مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے، رسول اس کے نائب ہیں، لہٰذا میں نے اب یہ تلوار تمہیں دینے کا فیصلہ کر لیا، تمہارے ذمہ یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرتے ہوئے:

﴿وَاَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَيۡنِكُمۡ﴾ آپس میں حالات کی اصلاح کرو، اور آپس میں تنازعات کو صلح جوئی سے طے کرلیا کرو، اور انتشار سے بچو، اور اتفاق کی وجہ سے ضعف و بزدلی اور تفریق سے جب بچو گے تو تمہارے اندر قوت پیدا ہوجائے گی، اور دشمن کے دلوں میں تمہارا رُعب جم جائے گا، جیسے آگے ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَ تَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ﴾ [الأنفال: ۴۶] (اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم بزدل ہوجاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی)۔

﴿وَاَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان والے ہو۔ یہ قاعدۂ کلیہ کا بیان ہے کہ جہاد اور مالِ غنیمت ہو یا زندگی کے دوسرے امور و معاملات، تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ ہر قدم پر اجتماعی اور انفرادی طور اطاعتِ الٰہی و رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنا شعار بنالو۔

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۝٢ الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ۝٣ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا ؕ لَهُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَمَغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ۝٤

ترجمہ: ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو زیادہ کردیتی ہیں، اور وہ اپنے ربّ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں ۝٢ جو نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۝٣ یہ وہ لوگ ہیں جو سچے ایمان والے ہیں، ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس درجات ہیں، اور مغفرت ہے، اور رزق کریم ہے ۝٤

معارف ومنازل

سابقہ آیات میں ایمان واخلاص اتفاق واتحاد اور اطاعت اللہ تعالیٰ واطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب ہے، جب مسلمان اُن اعمال کو بصدقِ دل قبول کرے گا تو وہ کامل الایمان کہلائے گا، ان آیات میں انہی کامل الایمان مسلمانوں کے پانچ خصوصی اوصاف کا بیان وتذکرہ ہے۔

اوّل یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوفزدہ ہوجاتے ہیں، ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت ایسی چھائی ہوئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو ہیبت اور خوف کی وجہ سے ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔

یہاں تین چیزیں قابل ذکر ہیں: ایک ایمانِ کامل، دوسری چیز اللہ تعالیٰ کی عظمت وبزرگی، تیسری چیز اللہ تعالیٰ کا خوف اور ہیبت۔ پس جس کسی انسان میں یہ تینوں صفات موجود ہوں اس کی زندگی قابلِ رشک ہوگی، اور دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ بھی، اور ایسا آدمی دائماً فرمانبردار اور تقویٰ شعار رہے گا، جو کبھی خلافِ شرع کاموں کا ارتکاب نہیں کرے گا۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں یعنی ان کو سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، یعنی نورِ ایمان میں ترقی ہوجاتی ہے، اور اعمالِ صالحہ کی طرف توجہ ورغبت پیدا ہوجاتی ہے، اور سخت سے سخت اعمال سہل ہوجاتے ہیں، اور معاصی سے نفرت ہوجاتی ہے، اور ہر معمولی صغیرہ گناہ بڑا اور مشکل معلوم ہوجاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں ایمان ویقین کی بدولت میسر آجاتی ہیں۔

تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنے ربّ پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں، توکّل ایک عمدہ فضیلت اور اعلیٰ درجہ کی ایمانی صفت ہے، اس میں اہلِ ایمان کے لیے فلاح وسعادت کے ساتھ بڑی منقبت بھی ہے۔ توکّل کے معنی ہیں کہ اپنے تمام دینی ودنیاوی امور میں ظاہری اور ضروری اسباب کو بجالاتے ہوئے نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہوئے اس پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کرنا، اور مطمئن رہنا، اور پھر اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی رہنا۔ یہ اہلِ ایمان کی عظیم صفت ہے، اور قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ بھی ہے، اور اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ پر توکّل کرنے کا حکم بھی ہے، اور توکّل کرنے والوں کی فضیلت بیان فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۵۹] (بلاشبہ اللہ تعالیٰ توکّل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)۔

سورۂ طلاق میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ [الطلاق: ۳] (اور جو شخص اللہ تعالیٰ

پر بھروسہ کرے سو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہے)۔اسی طرح فرمایا: ﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۲۲] (اور اللہ ہی پر مؤمن لوگ توکّل کریں)۔پس چاہئے کہ مؤمن اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کریں،اور توکل کو اپناشعار بنائیں۔

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں،اوقات کی پابندی اور دیگر شرائط وارکان اور آداب کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

اور پانچویں صفت یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ انہیں ہم نے دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں، بدنی عبادات میں سب سے بڑی عبادت نماز ہے،قرآن کریم نے بدنی عبادت نماز کے ساتھ مالی عبادت زکوٰۃ کا بار بار تذکرہ فرمایا ہے،سورۂ بقرہ کے شروع میں بدنی اور مالی عبادتوں پر مکمل ومفصل کلام گزر چکا ہے۔

جن لوگوں نے یہ پانچوں صفات اپنائیں وہ پکے مؤمن شمار ہوں گے:

﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ یہ لوگ سچے مؤمن ہیں،ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس درجات ہیں،اور مغفرت ہے،اور رزق کریم ہے۔

اس میں اول تو یہ فرمایا کہ جن حضرات کا اوپر ذکر ہوا یہ سچے مؤمن ہیں، پھر ان کے لیے درجات اور مغفرت اور رزق کریم کی بشارت دی۔بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اوصافِ مذکورہ پانچ بیان ہوئے، اور ان کے لیے انعامات تین بیان ہوئے۔اول ودوئم وسوئم اوصاف کا تعلّق قلب کے ساتھ ہے،ان کے لیے پہلا انعام مقرر ہوا،یعنی ﴿دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾۔چوتھی صفت نماز کا تعلق بدن کے ساتھ ہے،اس کے لیے انعام دوئم یعنی مغفرت کا تقرر و ثبوت ہوا۔پانچویں صفت کا تعلق مال کے ساتھ ہے،اس کے لیے انعام آخری مقرر ہوا یعنی رزق کریم۔

صاحب روح المعانی نے اسی بارے میں فرمایا: ”وَرُبَمَا يُقَالُ فِيْ وَجْهِ ذِكْرِ هٰذِهِ الْأَشْيَاءِ الثَّلَاثَةِ عَلٰى هٰذَا الْوَجْهِ اِنَّ الدَّرَجَاتِ فِيْ مُقَابِلَةِ الْأَوْصَافِ الثَّلَاثَةِ اَعْنِيْ الْوَجْلَ وَالْإِخْلَاصَ وَالتَّوَكُّلَ وَيَسْتَأْنِسُ لَهُ بِالْجَمْعِ وَالْمَغْفِرَةِ فِيْ مُقَابِلَةِ اِقَامَةِ الصَّلٰوةِ وَيَسْتَأْنِسُ لَهُ بِمَا وَرَدَ فِيْ غَيْرِ مَا خَبَرٍ اِنَّ الصَّلٰوَاتِ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهَا مِنَ الْخَطَايَا وَاِنَّهَا تَنَقَّى الشَّخْصَ مِنَ الذُّنُوْبِ كَمَا يَنَقَّى الْمَاءُ مِنَ الدَّنَسِ وَالرِّزْقُ الْكَرِيْمُ بِمُقَابِلَةِ الْإِنْفَاقِ“۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تین انعامِ مذکورہ بالا تین قسم کے پانچ اوصاف کے مقابل ہیں،ایمان باللہ تعالیٰ اور اللہ

تعالیٰ کے ذکر کے وقت ہیبت سے سہم جانا، اوراس کی آیت سن کر ایمان کا بڑھ جانا، اوراس کی ذات پر بھروسہ کرنا، یہ امور قلب یعنی دل سے متعلق ہیں، اس کا انعام درجاتِ رفیعہ عالیہ کی صورت میں ملے گا، اور اِقَامَةِ الصَّلٰوة میں تمام بدنی عبادات آگئیں، ان کے مقابلہ میں مغفرت کا انعام ہے، عموماً عبادات بدنیہ کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے، اوروجوہِ خیر میں مال خرچ کرنے کے مقابلہ میں رزق کریم کا وعدہ فرمایا۔ [روح المعاني تحت هذه الآية]

درجاتِ جنّات کی وسعت:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سو (۱۰۰) درجے ہیں، اوران درجات کے درمیان آپس میں اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان وزمین کے درمیان ہے، ان میں فردوس سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اسی سے جنت کی چاروں نہریں جاری ہیں، اوراس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے، سو جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کروتو جنت فردوس کا سوال کرو۔ [ترمذي ومشكوة]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا: جنت میں سو (۱۰۰) درجات ہیں، اگر سارے جہاں اُن میں سے ایک درجہ میں جمع ہوجائیں تو اس ایک درجہ میں سب سماجائیں۔ [مشکوۃ ۴۹۷]

فائدہ:

دنیا میں ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جن کی شناخت ان کی علامات سے ہوتی ہے، اسی طرح دینی امور کی شناخت بھی ان کی علامات سے ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ نے مؤمنِ کامل کی علامات واضح کرکے ہمیں رہنمائی فرمائی ہے کہ تم اپنے ایمان کواسی آیت کے شیشہ میں دیکھ کر فیصلہ کرلو، اگر تمہارے اندر یہ اوصافِ خمسہ موجود ہوں تواللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ، اوراپنے آپ کوکامل مسلمان یقین کرو، اگرنہیں تواپنے اندران صفات کے پیدا کرنے میں ذرادیر نہ لگاؤ، بلکہ اولین فرصت میں کامل مؤمن متقی بننے کی کوشش کرو، تاکہ تینوں انعامات کے حقدار بنو، اور رضائے الٰہی کے حصول میں کامیاب رہو۔ وَبِاللهِ التَّوْفِيْقُ وَهُوَ الْمُسْتَعَان

فائدہ:

اللہ تعالیٰ کا خوف اکسیرِ اعظم ہے، اور یہی تقویٰ کی بنیاد ہے، یہ خوفِ الٰہی قلوب میں اس وقت پیدا ہوگا جب دل میں اللہ تعالیٰ کی ہیبت وجلال اورعظمت وبزرگی جلوہ گرہو، ورنہ نہیں توسب کچھ ناکامی۔ واللہ اعلم

كَمَآ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ بِالۡحَـقِّ ۖ وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ ۙ﴿۵﴾

يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَـقِّ بَعۡدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوۡنَ اِلَى الۡمَوۡتِ وَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ ؕ﴿۶﴾

ترجمہ: جیسا کہ آپ کے ربّ نے آپ کے گھر سے حق کے ساتھ آپ کو نکالا، اور بلا شبہ مؤمنین کی ایک جماعت کو گراں گزر رہا تھا﴿۵﴾ وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑ رہے تھے، اس کے بعد کہ ظہور ہو چکا تھا گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں﴿۶﴾

معارف ومنازل

﴿كَمَآ اَخۡرَجَكَ﴾ بعض مفسرین کے نزدیک یہاں لفظ "كَمَا" تشبیہ کے لیے نہیں، بلکہ بیانِ سبب کے لیے استعمال ہوا ہے، اور یہاں لفظ "نَصَرَكَ" محذوف ہے، اور آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آپ کی نصرت ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ جہاد میں آپ نے جو کچھ کیا یہ کسی اپنی خواہش اور رائے سے نہیں، بلکہ خالص حکم ربی کے تابع ہو کر کیا، اُسی کے حکم پر آپ اپنے گھر سے نکلے، بلکہ اسی محسنِ اعظم نے آپ کو آپ کے گھر سے نکالا، تا کہ کفر کی کمر اور اس کی شان وشوکت ہمیشہ کے لیے توڑ دے، اور آپ کو غلبہ عطا فرمائے۔

لفظ "اَخۡرَجَكَ" سے اسی مقصد کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کو نکالا۔ بعض مفسرین نے "كَمَا" کو تشبیہ کے لیے بتایا ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ جن برحق مؤمنوں (جن میں گزشتہ پانچ اوصاف تھے) کے لیے آخرت میں تین قسم کے انعامات مقرر ہیں، یعنی (۱) درجات، (۲) مغفرت (۳) اور رزق کریم، اسی طرح دنیا میں بھی انہیں فتح ونصرت سے نوازا جائے گا، جیسے غزوۂ بدر میں یہ وعدہ پورا ہوا کہ اس فتح ونصرت کی خاطر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار میں ہونا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ سب پر مساوی تقسیم ہونا، اور جہادی جوانوں پر اس مساوی تقسیم کا گراں گزرنا، ایسا ہی ہے جیسے تم کو تمہارے ربّ نے مدینہ طیبہ سے نکالا تھا، اور تم بدر کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اور بعض لوگوں کو بدر کی جنگ کے لیے جانا گراں گزرتا تھا جیسا کہ تقسیمِ مال میں بھی مکمل راضی نہ تھے۔

روح المعانی میں اور بہت سی توجیہات ہیں، وہاں دیکھا جائے، اول معنی سب سے اولیٰ ہے کہ "كَمَا" تشبیہ کے لیے نہیں، بلکہ بیانِ سبب کے لیے ہے۔

☆☆☆

مختصر معلومات متعلقہ غزوۂ بدر:

۞۱۞ سترہ (۱۷) رمضان، بروز جمعہ ۲ ؁ھ میں غزوۂ بدر ہوا۔

۞۲۞ مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی، جن میں مہاجرین کی تعداد ۷۶ تھی، اور باقی ۲۳۷ انصار میں سے تھے، اوس میں سے بھی اور خزرج میں سے بھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے۔ [البدایۃ والنھایۃ]

۞۳۞ قریشِ مکہ نوسو سے لے کر ایک ہزار تھے، جن میں سے ستر قتل ہوئے، اور ستر افراد قید کر لیے گئے، مقتولین ابو جہل سمیت بڑے بڑے سردار تھے، پھر ان مقتولین کی نعشوں کو وہیں ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ البتہ اُمَیَّہ بن خلف کی لاش پھول گئی تھی، لہٰذا اسے وہیں چھوڑ دیا گیا، اور اوپر مٹی ڈال دی گئی۔

۞۴۞ جنگ شروع ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتا دیا تھا کہ مشرکین میں سے فلاں شخص یہاں قتل ہوگا، فلاں یہاں قتل ہوگا، پھر ایسا ہی ہوا۔

۞۵۞ ابو جہل کو معاذ و معوذ رضی اللہ عنہما عفراء کے بیٹوں نے قتل کیا تھا، پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا سر کاٹ کر لایا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الحمد للہ فرمایا۔

۞۶۞ مسلمانوں کے پاس چالیس اونٹ، دو گھوڑے، آٹھ تلواریں اور کچھ نیزے تھے، جبکہ مشرکین کے پاس آٹھ سو اونٹ، دو سو گھوڑے اور نو سو تلواریں اور چار یا چھ سو کے قریب زرہیں اور دیگر اسباب وسامان حرب تھے۔

۞۷۞ بدر کے دن ۱۴ مسلمان شہید ہوئے، ان میں ۶ مہاجر اور ۸ انصار تھے، ان میں سے ۱۳ کو بدر میں دفنایا گیا۔ البتہ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کو وادی صفراء میں دفنایا گیا، وہ اس لیے کہ اول مبازرہ میں ان کا پاؤں کٹ گیا تھا، اور آواز بند ہوگئی تھی جو مسلسل بند رہی، یہاں تک کہ جنگ کے پانچویں روز جب مسلمان مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے وادی صفراء پہنچے تو ان کا انتقال ہوا، وہیں دفنا دیے گئے۔

۞۸۞ غزوۂ بدر میں قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ حلقے سے نکل کر رخسار پر آپڑی، لوگوں نے چاہا کہ اسے کاٹ دیں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاٹنے سے منع فرمایا، پھر اپنے ہاتھ مبارک سے آنکھ کو حلقے میں رکھ کر دبا دیا، وہ صحیح ہوگئی۔ اسی طرح عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کو ایک لکڑی عنایت فرمائی، وہ لکڑی نہایت تیز چمکدار تلوار بن گئی، خلافت صدیقی تک وہ اسی تلوار سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ جنگ یمامہ میں شہید ہوگئے۔ دیگر تفصیلات کتبِ سیرت میں دیکھیں۔

☆☆☆

غزوۂ بدر:

ابن عقبہ اور ابن عابد نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک قافلہ جس میں ہزار اونٹوں پر بڑا قیمتی تجارتی سامان لدا ہوا ہے ابوسفیان بن حرب کی نگرانی میں شام سے آ رہا ہے، اور کوئی قریشی مرد یا عورت ایسا نہیں بچا ہے جس کے پاس ایک مثقال بھی ہو اور اس نے اس تجارت میں حصہ نہ لیا ہو، کہا جاتا ہے کہ اس قافلہ میں پچاس ہزار دینار ہیں، اور ستر آدمی ساتھ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور محمد بن اسحاق اور سدی رحمۃ اللہ علیہما کا بیان ہے کہ ابوسفیان چالیس سواروں کے ساتھ شام سے واپس آ رہا تھا، یہ چالیس سوار قریش کے بڑے لوگ تھے، جن میں عمرو بن عاص اور مخرمہ بن نوفل زہری بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو باہر نکل چلنے کی دعوت دی، اور فرمایا: قریش کا یہ قافلہ ہے جس میں قریش کا بہت مال ہے، چلو نکل چلیں! شاید اللہ تم کو ان کا مالِ غنیمت عطا فرمادے۔

لوگوں نے دعوت قبول کی، کچھ لوگ ہلکے (یعنی بغیر ساز و سامان اور اسلحہ کے) تھے، اور کچھ بھاری (ساز و سامان اور اسلحہ کے ساتھ)، بہت سے لوگ ساتھ نہیں بھی گئے، مگر ان کو قابلِ ملامت نہیں قرار دیا گیا، کیونکہ ان کو خیال بھی نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی لڑائی پیش آئے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کی، اور فرمایا: جس کے پاس سواری موجود ہو وہ ہمارے ساتھ سوار ہو کر چلے، کچھ لوگوں نے اجازت طلب کی کہ ہماری سواریاں بالائی مدینہ میں ہیں، ہم جا کر لے آئیں، حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: نہیں، صرف وہ شخص جائیں جن کی سواریاں اس وقت موجود ہوں۔

مدینہ سے روانہ ہونے سے دس روز پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلحہ بن عبیداللہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہما کو شام کے راستہ کی طرف قافلہ کی ٹوہ لگانے کے لئے بھیج دیا تھا، یہ دونوں حضرات سرزمین خوار میں پہونچ کر کشد بن مالک جہنی کے پاس مقیم ہوئے، کشد نے دونوں کو اپنی ذمہ داری میں اپنے پاس چھپا کر رکھ لیا، جب قافلہ گزر گیا تو دونوں حضرات کشد کے گھر سے باہر آ گئے، اور کشد ان کو مقام ذوالمروہ تک پہنچا گیا۔ دونوں بزرگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قافلہ کی اطلاع دینے پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے نکل رہے تھے، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قبضہ ینبوع پر ہو گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کشد کو ینبوع جاگیر میں کاٹ دیا تھا، کشد نے عرض کیا تھا: یا رسول اللہ! میں تو بوڑھا ہوں

(آج مرا کل دوسرا دن) میرے بھتیجے کے نام یہ جاگیر کر دیجئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشد کے بھتیجے کے نام ینبوع کی جاگیر کردی، پھر اس سے عبدالرحمٰن بن سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے خرید لی۔ [رواہ ابن شیبۃ]

ادھر بنی حذام کے ایک آدمی نے مقامِ زرقاء میں پہونچ کر ابوسفیان کو اطلاع دی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قافلہ کی واپسی کی راہ دیکھ رہے ہیں، ابوسفیان ساتھیوں کو لے کے ڈرتے ڈرتے تاک گھات کے لئے نکلا، حجاز کے قریب پہنچا تو تجسسِ احوال کرنے لگا، جو سوار ملتا اس سے خبر دریافت کرتا، آخر ایک سوار سے اس کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قافلہ کے لیے نکل چکے ہیں، ابوسفیان کو اندیشہ پیدا ہو گیا، اور اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو بیس دینار مزدوری دے کر مکہ کو بھیجا، اور اس سے کہہ دیا کہ مکہ میں پہنچنے کے وقت اونٹ کے کان کاٹ کر کجاوا الٹا باندھ لینا، اور آگے پیچھے سے اپنا کرتہ پھاڑ لینا (فریاد کرنا) اور قریش سے جا کر کہنا کہ اپنے مال کی حفاظت کے لیے باہر آجائیں، اور ان کو یہ بھی بتا دینا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھیوں سمیت قافلہ کو لوٹنے کے درپے ہیں۔ ضمضم فوراً مکہ کو چل دیا، اور جیسا ابوسفیان نے حکم دیا تھا ویسا ہی کیا۔

عاتکہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب کا خواب:

ابن اسحاق نے براویت عروہ اور بیہقی نے بروایت شہاب اور ابنِ اسحاق اور حاکم اور بیہقی نے بالاتفاق عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان نقل کیا ہے، اور موسیٰ بن عقبہ کا بھی یہی بیان ہے کہ ضمضم کے پہنچنے سے تین رات پہلے عاتکہ رضی اللہ عنہا بنت عبدالمطلب نے ایک خواب دیکھا، صبح کو اس خواب سے ان کو بڑی فکر ہوگئی، انہوں نے اپنے بھائی عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کو بلوایا، اور کہا: بھائی میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے، قریش پر کوئی مصیبت اور آفت آنے والی معلوم ہوتی ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے خواب پوچھا، تو عاتکہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں اس شرط پر تم سے بیان کرسکتی ہوں کہ تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا، کیونکہ لوگ اگر اس کو سن لیں گے تو ہم کو دکھ پہنچائیں گے، اور ناگوار باتیں سنائیں گے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ظاہر نہ کرنے کا وعدہ کرلیا، عاتکہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اونٹ پر سوار آیا، اور وادی کے اوپر پہنچ کر بہت زیادہ چیخ کر تین مرتبہ کہا: اے غدارو! اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دن کے اندر نکلو، لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے، وہاں سے وہ مسجد میں آیا، لوگ پیچھے پیچھے آئے، اور مسجد میں پہنچ کر اس کا اونٹ سیدھا کھڑا ہو گیا، اور کعبہ کے اوپر پہنچ کر اس نے تین چیخیں ماریں، اور کہا: اے غدارو! تین دن کے اندر اپنی

قتل گاہوں کی طرف نکلو، پھر (وہاں سے چل دیا، اور کوہ ابوقبیس پر پہنچ کر اس نے وہی کہا کہ اے غدارو! اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دن کے اندر نکلو، اس کے بعد اس نے ایک بہت بڑا پتھر اکھاڑ کر نیچے کو لڑھکایا، پتھر لڑھکتا ہوا آیا، جس کی گڑگڑاہٹ شدید تھی، نیچے پہنچ کر پارہ پارہ ہوگیا، اور آپ کی قوم کے ہر گھر میں اس کا ٹکڑا (اڑکر) جا پہنچا ، آپ کی قوم کا کوئی گھر اور کوئی کوٹھڑی ایسی نہیں بچی کہ اس میں پتھر کا ٹکڑا نہ پہنچا ہو۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ یہ خواب ہی ہے (تخیل نہیں ہے) اس کو پوشیدہ رکھنا، اگر قریش کو اس کی اطلاع پہنچ گئی تو وہ ہم کو دکھ دیں گے۔ اس کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ عاتکہ کے پاس سے چلے آئے ، اور ولید بن عتبہ بن ربیعہ بن عبدالشمس سے ملاقات کی، اور چونکہ ولید عباس رضی اللہ عنہ کا دوست تھا، اس لئے عباس رضی اللہ عنہ نے اس سے اس خواب کا ذکر کردیا، لیکن چھپائے رکھنے کی تاکید کردی۔ ولید نے اپنے باپ عتبہ سے اس کا ذکر کردیا، اور عتبہ نے اس کا چرچا کردیا، اس طرح بات مکہ میں پھیل گئی، اور قریش آپس میں اس کا چرچا کرنے لگے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: صبح کو میں کعبہ کا طواف کررہا تھا کہ ابوجہل بن ہشام قریش کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا وہاں عاتکہ کے خواب کا تذکرہ کررہا تھا، مجھے دیکھ کر کہنے لگا: ابوالفضل طواف سے فارغ ہو کر ہماری طرف آجانا، میں فارغ ہو کر وہاں پہنچ کر ان لوگوں کے پاس بیٹھ گیا، ابوجہل بولا: اے اولاد عبدالمطلب! یہ نبیہ تم میں کب سے پیدا ہوگئی؟ میں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا: عاتکہ کا خواب، میں نے کہا: عاتکہ کا خواب کیا ہے؟ ابوجہل بولا: اے اولاد مطلب! تم کو اسی پر بس نہیں ہوا کہ تمہارے مرد نبی بن گئے، اب تمہاری عورتیں بھی نبیہ ہونے لگیں۔

ابن عقبہ کی روایت میں ابوجہل کے یہ الفاظ آئے ہیں: اے بنی ہاشم! تم فقط اپنے مردوں کے جھوٹ بولنے سے خوش نہ تھے کہ اب تم عورتوں کی دروغ بانی بھی پیش کرنے لگے، ہم اور تمہارے اسلاف ریس کے دو گھوڑوں کی طرح تھے (مقابلہ پر دوڑ رہے تھے) جو کوشش کرنے والا تھا آگے نکل رہا تھا، جب دونوں فریق ایک جیسے رہے تو اب تم نے کہا: ہم میں ایک نبی ہے، اور اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ اب تم کہنے لگے: ہم میں سے ایک نبیہ بھی ہے۔ قریش کے اندر کوئی گھرانا مجھے ایسا معلوم نہیں نہ مرد نہ عورت کہ تم سے زیادہ جھوٹا ہو۔

ابوجہل نے اس طرح عباس رضی اللہ عنہ کو سخت دکھ پہنچایا، اور بولا: عاتکہ کہتی ہے کہ میں نے خواب میں ایک شخص کو یہ کہتے سنا کہ تین دن کے اندر نکلو، ہم بھی تین دن کا انتظار کرتے ہیں، اگر عاتکہ کا قول صحیح ہے تو ایسا ہو جائے گا،

اور اگر تین دن گزر گئے، اور ایسی کوئی بات نہ ہوئی تو ہم لکھ کر لگا دیں گے کہ تمہارا خاندان عرب میں سب سے بڑھ کر جھوٹا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس کو جواب دینے کے لئے میرے پاس بہت کچھ تھا، مگر میں نے کچھ نہیں کہا، اور عاتکہ کے خواب دیکھنے کا انکار کر دیا۔

ابن عقبہ کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کو یہ جواب دیا تھا: کیا اب تو باز رہے گا (یا نہیں) جھوٹ تیرے اور تیرے خاندان والوں کے اندر ہے۔ حاضرین نے کہا: ابوالفضل! تم تو جاہل اور ایسے بے وقوف و احمق نہ تھے۔

ابن عابد کی روایت بھی اسی طرح ہے، بلکہ اس میں ایک گالی کا ذکر مزید آیا ہے۔ عباس رضی اللہ عنہ کو اس خبر کے افشا کرنے سے بڑا دکھ پہنچا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: شام ہوئی تو خاندان عبدالمطلب کی کوئی عورت ایسی نہ بچی جس نے مجھ سے آکر یہ نہ کہا ہو کہ آپ نے خود موقع دیا کہ اس خبیث فاسق نے پہلے آپ کے مُردوں کی بوٹیاں نوچیں، پھر آپ لوگوں کی عورتوں پر بھی نکتہ چینی کی، تم سنتے رہے، تمہارے پاس اس کی بات سے بڑھ کر کوئی چیز جواب دینے کے لیے ہی نہیں تھی۔

میں نے کہا: خدا کی قسم! مجھ سے یہ حرکت تو ہوگئی جو الفاظ میں نے اس سے سنے اس سے بڑھ کر میری طرف سے اس کے لئے کچھ نہیں تھا، لیکن اب میں اس کے درپے رہوں گا، اگر دوبارہ اس نے کچھ کیا تو میں تمہاری طرف سے اس سے بھگتنے کے لئے کافی ہوں۔ اس کے بعد میں مسجد میں آیا، اور اس کو وہاں دیکھا، اور خدا کی قسم قصداً اس کی طرف جانے لگا، تاکہ جو کچھ وہ کہہ چکا ہے دوبارہ کہے، اور میں اس سے لپٹ جاؤں۔

ابو جہل تھا بڑا چالاک چست قوی تیز زبان تیز نظر (مجھے دیکھ کر) فوراً دوڑتا ہوا مسجد کے دروازہ سے نکل گیا، میں نے اپنے دل میں کہا: اس پر اللہ کی لعنت، یہ حرکت اس نے اس ڈر سے کی کہ میں بھی اس کو گالیاں دوں گا، بات واقع میں یہ ہوئی کہ مجھے تو سنائی دی، مگر اس نے ضمضم بن عمرو کی آواز سن لی، ضمضم اپنے اونٹ پر کھڑا وادی کے اندر چیخ رہا تھا، اس نے اونٹ کے کان کاٹ دیئے تھے، کجاوہ کا رخ الٹ کر رکھ دیا تھا، اپنا کرتہ چاک کر دیا تھا، اور کہہ رہا تھا: اے گروہِ قریش! اے خاندانِ لوی بن غالب! اپنے لدے ہوئے اونٹوں کی خبر لو، تمہارے مال ابوسفیان کے ساتھ ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی ان کو لوٹنے کے درپے ہیں، میرا خیال ہے کہ تم ان کو پا نہیں سکتے، دہائی ہے دہائی، خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ تم ان کو نہ پہنچ پاؤ گے۔

یہ سن کر قریش خوف زدہ ہو گئے، اور عاتکہ کے خواب سے ڈر گئے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: اس آواز نے ابو جہل کے لئے میری طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں چھوڑا، اور میں اس کی طرف سے رک گیا، اس پر عاتکہ نے یہ شعر کہے: کیا خواب سچا نہ تھا اس کی تصدیق لے کر تو تمہارے پاس ایک بھاگا ہوا شکست خوردہ آدمی آ گیا، میں نے جھوٹ نہیں کہا، تو نے مجھے جھوٹا کہا، جو خود جھوٹا ہے وہ میری اس سچی بات کو جھوٹ کہتا ہے۔

لوگوں نے جلد جلد تیاری کی، اور کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ ابن حضرمی کے قافلہ کی طرح ہوگا، ایسا ہرگز نہیں ہوگا، خدا کی قسم! ان کو کچھ اور ہی نتیجہ معلوم ہوگا۔ غرض لوگ یا تو خود جانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے، یا اپنی جگہ کسی کو بھیج دیا، اور دو یا تین دن میں تیاری کر لی، جو طاقتور تھے انہوں نے کمزوروں کی مدد کی، اگر کسی کا مسلمان ہو جانا قریش کو معلوم تھا، یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ساتھیوں کے دوست ہونے کا کسی پر شبہ تھا، یا خاندان بنی ہاشم کا کوئی فرد تھا، ایسے سب لوگوں کو انہوں نے ساتھ لیا، چنانچہ عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب، نوفل رضی اللہ عنہ بن حارث، طالب رضی اللہ عنہ بن ابی طالب، عقیل رضی اللہ عنہ بن ابی طالب اور ان کے ساتھ دوسرے لوگ روانہ ہو گئے۔

ابولہب صرف ایسا شخص تھا جو نہ خود گیا، نہ اپنی جگہ کسی کو بھیجا، ورنہ ہر قریشی کو یا خود جانا پڑا، یا اپنی جگہ دوسرے کو بھیجنا پڑا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابولہب نے بھی اپنی جگہ عاص رضی اللہ عنہ بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا تھا۔ عاص رضی اللہ عنہ آخر میں مسلمان ہو گئے تھے۔ عاص رضی اللہ عنہ پر ابولہب کا چار ہزار درہم کا سودی قرض تھا، اس رقم کو مزدوری میں منہا کرنے کی شرط پر ابولہب نے اپنی جگہ اس کو بھیج دیا، اور اس کے مصارف کی کفالت کی۔ ابولہب کے نہ جانے کی وجہ صرف عاتکہ کا خواب تھا، وہ کہتا تھا: عاتکہ کے خواب نے ہاتھ باندھ دیئے۔

امیہ بن خلف، عتبہ بن شیبہ، زمعہ بن اسود، عمیر بن وہب اور حکیم بن حزام وغیرہ نے ہبل بت کے پاس جا کر تیروں سے فال نکالی، فال میں ممانعت کا تیر نکلا، جس وجہ سے ان لوگوں نے نہ جانے کا پختہ ارادہ کر لیا، مگر ابو جہل نے مجبور کر کے ان کی رائے بدل دی۔

امیہ بن خلف بہت بھاری بدن کا موٹا بوڑھا آدمی تھا، جب اس نے نہ جانے کا ارادہ کر لیا تو عتبہ بن ابی معیط کے پاس گیا، عتبہ اپنی قوم کے حلقہ میں مسجد کے اندر بیٹھا ہوا تھا، انگیٹھی سب کے سامنے سلگ رہی تھی، انگیٹھی لا کر

امیہ کے سامنے رکھ دی گئی، پھر عتبہ نے امیہ سے کہا: ابو علی! تم تو عورت ہو (بھاری بھر کم بدن ہے، جس کی وجہ سے جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے) امیہ نے کہا: اللہ تعالیٰ تیرا برا کرے، تو نے بری بات کہی، اس کے بعد یہ بھی تیاری کر کے لوگوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ابن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے: جب لوگ تیاری کر چکے، اور روانگی کا ارادہ کر لیا، اور جو اچھی بُری سواریاں تھیں، ان پر سوار ہو گئے، اور گانے والی باندیوں کو اور ان کے تنبلوں کو بھی ساتھ لے لیا، تو اس وقت سوچا کہ ہمارے اور بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے درمیان تو خون ریز جنگ ہے، طرفین سے باہم قصاص کے مطالبات ہیں، اندیشہ ہے کہ اگر ہم گئے تو ہمارے پیچھے (ہمارے گھروں پر) وہ حملہ نہ کر دیں، قریب تھا کہ یہ خیال کر کے وہ جانا ملتوی کر دیں، مگر ابلیس مردود سراقہ بن مالک کنانی کی شکل میں ان کے سامنے آ گیا۔ سراقہ بنی کنانہ کے سرداروں میں سے تھا، اور کہنے لگا: میں تمہارا ذمہ دار ہوں، بنی کنانہ کی طرف سے تمہارے پیچھے کوئی ناگوار حرکت سرزد نہ ہو گی، اس ضمانت کے بعد نو سو پچاس سپاہیوں کی جماعت روانگی کے لئے نکل کھڑی ہوئی۔

بعض روایات میں ہزار کی تعداد آئی ہے، ان کے ساتھ دو سو گھوڑے اور چھ سو زرہیں تھیں۔ قریش کا ہر خاندان روانہ ہو گیا، صرف بنی عدی کے خاندان میں سے کوئی شخص شریک نہیں ہوا، اور کوئی نہیں گیا۔

ابن عقبہ اور ابن عابد کا بیان ہے کہ ابلیس بھی مشرکوں کے ساتھ نکلا، اور وعدہ دلاتا رہا کہ تمہارے پیچھے بنی کنانہ بھی تمہاری مدد کے لئے آنے والے ہیں، اور میں ضامن ہوں کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔

تمام لوگ روانہ ہو کر مقام الظہر ان میں فروکش ہوئے، ابو جہل نے دس اونٹ ذبح کئے، اور لشکر گاہ میں کوئی ڈیرہ خیمہ ایسا نہ بچا کہ وہاں تک اونٹوں کا خون نہ پہنچا ہو۔ ضمضم بن عمرو کو دکھائی دیا کہ وادی مکہ میں اوپر سے نیچے تک خون ہی خون بہ رہا ہے، عسیف میں پہنچ کر امیہ بن خلف نے نو اونٹ ذبح کئے، قدید میں پہنچے تو سہیل رضی اللہ عنہ بن عمرو نے دس اونٹ ذبح کئے۔

پھر صبح کو ابواء میں پہنچے، تو حجاج کے دونوں بیٹوں نبیہ اور منبہ نے دس دس اونٹ ذبح کئے، اس کے بعد لوگوں نے اپنا اپنا کھانا خود کھانا شروع کیا (اور مہمانی کا کھانا ختم کر دیا گیا)۔ جحفہ میں عشاء کو پہنچے، اور وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ بیہقی نے ابن شہاب اور ابن عقبہ اور عروہ بن زبیر کی روایت سے لکھا ہے کہ جب سب لوگ جحفہ میں فروکش ہوئے، تو ان کے ساتھ بنی مطلب بن مناۃ کے خاندان کا ایک شخص بھی تھا، جس کا نام جہیم بن صلت بن مخرمہ تھا۔ یہ شخص

آخر میں حنین کی جنگ کے وقت مسلمان ہو گیا تھا، یہ شخص کچھ نیم خوابی کی حالت میں سر رکھے ہوئے تھا، یعنی کچھ کچھ غافل تھا کہ اچانک اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: کیا تم نے اس سوار کو دیکھا جو ابھی ابھی میرے پاس کھڑا تھا؟ لوگوں نے کہا: تو پاگل ہے، کوئی بھی نہیں تھا، جہیم نے کہا: ابھی ایک سوار کھڑا تھا، اور کہہ رہا تھا: ابو جہل اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ اور زمعہ اور ابو البختری اور امیہ بن خلف مارے گئے۔ جہیم نے کچھ اور سردارانِ قریش کے بھی نام لئے تھے، جو بدر میں مارے گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے اونٹ کے سینہ پر تلوار ماری، اور زخمی کر کے لشکر میں چھوڑ دیا، اور لشکر گاہ میں کوئی ڈیرہ ایسا نہیں بچا کہ اس اونٹ کا خون وہاں نہ پہنچا ہو۔

جہیم کے ساتھی بولے: تو شیطان کا بازیچہ بن گیا۔ یہ بات ابو جہل تک بھی پہنچا دی گئی، ابو جہل بولا: پہلے تو بنی ہاشم کے جھوٹ سے تمہارا واسطہ پڑا تھا، اب بنی مطلب کے جھوٹ میں بھی مبتلا ہو گئے۔

دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جگہ نماز کے لئے ابن ام مکتوم کو قائم کیا، اور مدینہ سے روانہ ہو گئے، پھر مقامِ روحاء سے ابولبابہ کو واپس کر دیا، اور مدینہ پر اپنا نائب ان کو بنا دیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۲ / رمضان المبارک کو ہفتہ کے دن مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ ابن ہشام نے ۸ / رمضان بیان کیا ہے۔ مدینہ سے ایک میل نکل کر چاہ ابو عتبہ پر پہنچ کر لشکر قائم کیا، اور جو لوگ کم عمر تھے ان کو واپس کر دیا، واپس ہونے والوں میں عبد اللہ بن عمر، اسامہ بن زید، رافع بن خدیج، براء بن عازب، اسید بن حضیر، زید بن ارقم، زید بن ثابت اور عمیر بن ابی وقاص تھے رضی اللہ عنہم۔

عمیر رضی اللہ عنہ رونے لگے، آخر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو شریک رہنے کی اجازت دیدی، اور بدر کی لڑائی میں سولہ سال کی عمر میں آپ شہید ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ چاہ سقیا کا پانی پئیں، اور خود بھی اس کنویں کا پانی پیا، اور سقیا کے گھروں کے پاس نماز پڑھی، اور سقیا سے روانگی کے وقت قیس بن ابی صعصعہ رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کی گنتی کرنے کا حکم، دیا قیس رضی اللہ عنہ نے سب لوگوں کو ابو عتبہ کے کنویں کے پاس کھڑا کر کے گنتی کی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کر دیا: یہ سب ۳۱۳ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سن کر خوش ہوئے، اور فرمایا: طالوت کے ساتھیوں کی بھی یہی شمار تھی۔

اس روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے لئے دعا کی تھی: میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں، میں مدینہ والوں کے لئے تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ تو ان کے صاع (چار سیر کا ایک ناپ) اور ان کے مد (ایک سیر کے برابر

ناپ) اور ان کے پھلوں میں برکت عطا فرما (یعنی ان کی کھیتی باڑی اور باغوں کی پیداوار میں برکت عطا کر) اے اللہ! تو مدینہ کی محبت ہم کو عطا کر، اور مدینہ کے آب و ہوا کی خرابی (بخار ملیریا وغیرہ) کو خم میں منتقل کر دے۔ جس طرح تیرے خلیل ابراہیم (علیہ السلام) نے مکہ کو حرام قرار دیا تھا، میں بھی مدینہ کی دونوں سوختہ پتھریلی زمینوں کے درمیانی علاقہ کو حرام قرار دیتا ہوں (مدینہ کے دونوں جانب پتھریلی گرم تپتی ہوئی زمین ہے، مدینہ دونوں کے درمیان واقع ہے)۔

حبیب بن اساف اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، مگر مالِ غنیمت کی لالچ میں اپنے قبیلہ خزرج کی مدد کے لئے چلے آئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہمارے ساتھ وہی جائے جو مسلمان ہو، کوئی غیر مسلم نہ جائے۔ یہ سن کر حضرت حبیب رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے، اور کسوٹی پر بہت اچھے اترے۔ آپ نے اچھے کارنامے انجام دیئے۔

سقیا کی آبادی سے اتوار کی رات کو روانہ ہوئے، اور روانی کے وقت دعا کی: اے اللہ! یہ برہنہ پا ہیں، ان کو سواری عطا کر، یہ برہنہ بدن ہیں، ان کو لباس عنایت کر، یہ بھوکے ہیں ان کو پیٹ بھر کھانا مرحمت کر، یہ نادار ہیں ان کو اپنی مہربانی سے مالدار بنا دے۔ کُل ستر اُونٹ ساتھ تھے، باری باری سے لوگ انہی پر سوار ہوتے رہے۔

امام احمد اور ابن سعد نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے: ہم بدر کے زمانہ میں تین آدمی ایک ایک اونٹ پر تھے، ابولبابہ اور علی رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم سواری تھے، دونوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ سوار ہو جائیں، ہم پیدل چلیں گے۔ فرمایا: تم پیدل چلنے پر مجھ سے زیادہ قوت نہیں رکھتے، اور میں ثواب کا امیدوار تم سے کم نہیں ہوں۔

صاحب البدایہ والعیون کا بیان ہے کہ ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب ہونے کا واقعہ اس وقت کا تھا جب روحاء سے مدینہ کو ان کو واپس نہیں بھیجا گیا تھا، روحاء سے روانگی کے بعد تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم سواری علی اور زید رضی اللہ عنہما تھے۔ اس لشکر کے ساتھ صرف دو گھوڑے تھے، تیسرا گھوڑا مرثد رضی اللہ عنہ بن ابی مرثد غنوی کا تھا۔

مقام تربان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص سے فرمایا: ہرن کو دیکھو، سعد نے تیر چلہ پر چڑھایا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیچھے سے کھڑے ہو کر اپنی ٹھوڑی سعد کے مونڈھے اور کان کے درمیان رکھی، اور فرمایا: تیر چلا، اے اللہ اس کے تیر کو نشانہ پر صحیح بٹھا دے، چنانچہ تیر ہرن کے سینہ پر لگ گیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مسکرادیئے، سعد رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے گئے، اور ہرن کو پکڑلیا، کچھ جان باقی تھی، سعد رضی اللہ عنہ ذبح کر کے اس کو اٹھا کر لے آئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساتھیوں کو بانٹ دینے کا حکم دیا، چنانچہ وہ گوشت سب کو تقسیم کر دیا گیا، پھر چلتے چلتے مقام ذوسنجسج پر جا کر اترے، یہ مقام بھی روحاء کے درمیان ہی واقع تھا، پھر یہاں سے کوچ کر کے موڑ پر پہنچ کر مکہ کا راستہ بائیں کو چھوڑ دیا، اور دائیں ہاتھ کو نازیہ پر بدر کے ارادہ سے چل دیئے، نازیہ کے کنارے کنارے چل کر وادی زحفان کو طے کیا، وادی زحفان نازیہ اور مقام السفراء کے درمیان تھی، پھر مضیق السفراء پر پہونچے، اور وہاں سے نشیب میں چل دیئے، جب صفرا کے قریب پہونچے تو ابوسفیان کی خبر معلوم کرنے کے لئے بسیس رضی اللہ عنہ بن عمر جہنی کو اور عدی رضی اللہ عنہ بن زغباء کو بدر کی طرف روانہ کیا، بسیس رضی اللہ عنہ بنی ساعدہ کے معاہد تھے، اور عدی بنی نجار کے حلیف تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صفراء سے بائیں ہاتھ کو چل کر وادی ذفران کے دائیں جانب چلتے رہے، اور وادی کے اندر کچھ حصہ طے کر کے پڑاؤ ڈالا، تو اطلاع ملی کہ قریش اپنے قافلہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے مشورہ لیا (کہ اب کیا کیا جائے؟) مہاجرین نے بطورِ مشورہ کچھ اچھا کلام کیا، اول ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اچھا بولے، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کھڑے ہو کر اچھی گفتگو کی، پھر مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ نے آپ کو جو حکم دیا ہے آپ اس پر چلئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، خدا کی قسم ہم وہ بات نہیں کہیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ تم اور تمہارا ربّ جا کر لڑیں، ہم تو یہیں بیٹھ گئے (آگے نہیں بڑھیں گے) آپ اور آپ کا ربّ چل کر لڑیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہو کر دشمنوں سے لڑیں گے، قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حقانیت کے ساتھ بھیجا ہے، اگر آپ ہم کو برک الغماد کو لے جائیں تو آپ کی ہمراہی میں ہم وہاں بھی تلواروں سے اس وقت تک لڑیں گے جب تک وہاں پہنچ نہ جائیں۔

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ مبارک شگفتہ ہو گیا، پھر مقداد رضی اللہ عنہ کے حق میں کچھ کلماتِ خیر فرمائے، اور دعا کی۔ اس کے بعد تیسری بار لوگوں سے مشورہ لیا، اب انصار سمجھے کہ روئے خطاب ہماری طرف ہے، کیونکہ انہی کی تعداد زیادہ تھی، اس پر سعد رضی اللہ عنہ بن معاذ کھڑے ہو گئے، اور عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطاب ہم سے ہے، فرمایا: ہاں! سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم آپ پر ایمان لا چکے، آپ کو سچا مان چکے، ہم نے اقرار کر لیا کہ جو کچھ آپ لائے ہیں وہ حق ہے، ہم نے آپ سے مضبوط وعدہ کر لیا

اور عہد و پیمان دے دیا کہ جو کچھ آپ حکم دیں گے ہم سنیں گے، اور بجالائیں گے، اب جو کچھ آپ چاہیں وہ کریں، یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شاید آپ کو یہ اندیشہ ہو کہ انصار صرف اپنی بستیوں میں ہی آپ کی مدد کریں گے (باہر نکل کر نہیں کریں گے) تو میں انصار کی طرف سے عرض کرتا ہوں، اور جواب دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں سفر کریں، ہم آپ کے ساتھ ہیں، جس سے جوڑ کرنا چاہیں جوڑ کریں، جس سے توڑ کرنا چاہیں تعلق توڑیں، ہمارے مالوں میں سے جتنا چاہیں لے لیں، اور جتنا چاہیں ہم کو دے دیں، آپ جو مال ہمارے پاس چھوڑ دیں گے وہ ہماری نظر میں لئے ہوئے مال سے زیادہ محبوب نہ ہوگا، آپ جو حکم دینا چاہیں دیں، ہم آپ کے حکم پر چلیں گے، خدا کی قسم اگر آپ ہم کو لے کر برک غمدان یا برک انعماد پہنچانا چاہیں گے، تو ہم آپ کے ساتھ چلیں گے، اور اگر سمندر ہمارے سامنے ہوگا تو آپ کے ساتھ اس میں بھی گھس جائیں گے، اور ہم میں سے کوئی شخص پیچھے نہیں رہے گا۔ اگر کل دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو ہم کو ناگوار نہ ہوگا، ہم لڑائی میں تجربہ کار ہیں، امید ہے کہ ہماری (جنگی) کارگزاریوں سے اللہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ایک کام کے لئے نکلے ہوں، اور اللہ دوسری بات پیدا کردے، بس اللہ کا نام لے کے ہم کو لے کر چلئے، ہم آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے رہیں گے، اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح نہ ہوں گے، جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا ربّ جائیں اور جا کر لڑیں، ہم تو یہاں سے آگے بڑھنے والے نہیں، بلکہ آپ اور آپ کا ربّ چلیں دشمن سے لڑیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں، ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

سعد رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ چمکنے لگا، اور فرمایا: اللہ کے نام پر چلو اور خوش رہو، اللہ نے مجھ سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے، خدا کی قسم میں اس وقت بھی گویا ان لوگوں کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا ہوں (کہ اُن میں سے کون کس جگہ مارا جائے گا)۔ بعض مسلمانوں کو دشمن سے مڈبھیڑ پسند نہ تھی۔ اسی کو فرمایا:

﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ﴾ اور بلاشبہ مسلمانوں کا ایک گروہ ناپسند کرتا تھا۔ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: واؤ حالیہ ہے، اور پورا جملہ اَخْرَجَكَ کے "کاف" سے حال ہے، یعنی جس حالت میں کہ مسلمانوں کے ایک فریق کو ناپسند تھا اللہ نے تم کو مدینہ سے نکالا۔

میں کہتا ہوں: واؤ کا استیناف کے لئے اور کلام کا استینافیہ ہونا ظاہر ہے (واؤ حالیہ نہیں ہے، کیونکہ ذوالحال اور حال کا زمانہ ایک ہونا چاہئے (حالانکہ مسلمانوں کو مدینہ سے نکلنا ناگوار اور ناپسند نہیں تھا، بلکہ بنی نضیر کے ساتھ جب لڑائی پڑ گئی تو اس وقت مسلمانوں کو مدینہ سے نکلنا ناپسند ہوا تھا (پہلی جنگ میں بکثرت زخمی اور شہید ہو گئے، اور سب

تھک کر چور چور ہو گئے تھے)۔ قافلہ کی جستجو میں مدینہ سے نکلنے کی توان کو رغبت تھی کہ بغیر لڑے مال ہاتھ لگ جائے۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب ہم ایک دو دن چلتے رہے (اور قافلہ کا پتہ نہ چلا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان لوگوں سے (یعنی قریش سے جنگ کرنے کے متعلق آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ (آگے بڑھ کر قریش سے جنگ کریں، یا واپس مدینہ کو لوٹ جائیں؟) ان لوگوں کو تمہارے نکلنے کی اطلاع پہنچ گئی، ہم نے عرض کیا: بخدا ہم میں ان لوگوں سے لڑنے کی جان نہیں ہے، ہمارا ارادہ تو قافلہ کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا: تم لوگوں کی رائے جنگ کے متعلق کیا ہے؟ ہم نے وہی پہلا جواب دے دیا۔

﴿يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ﴾ یعنی آپ جہاد کو ترجیح دے رہے تھے، اور حق بات ظاہر کر رہے تھے، اور وہ قافلہ پر جا پڑنے کو پسند کر رہے تھے، اور جھگڑا کر رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ ہم کو ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں، ہمارا ارادہ تو قافلہ کا ہے، اور یہ جھگڑا اس کے باوجود تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو فتحیاب ہونے کی اطلاع دے دی تھی، کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روحاء میں تھے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نازل ہو کر اطلاع دی تھی کہ اللہ نے تم لوگوں سے دونوں گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے، یا قافلہ یا قریش (پر فتحیاب ہونا)۔

﴿كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ﴾ اس جملہ کا تعلق كَارِهُوْنَ سے ہے، یعنی ان کو جنگ و جہاد کی طرف جانا ایسا ناگوار تھا جیسے اس شخص کو موت کی طرف لے جایا جانا ناگوار ہوتا ہے جس کی آنکھوں کے سامنے موت کے اسباب گھوم رہے ہوں، اور وہ سمجھ رہا ہو کہ اس طرف جانے میں میری موت یقینی ہے۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ تعداد کم تھی، اور تیاری مفقود تھی۔

ابن زیدؒ نے کہا کہ يُجَادِلُوْنَ کی ضمیر مشرکون کی طرف راجع ہے، مشرک حق کے معاملہ میں آپ سے جھگڑا کرتے ہیں، حق کی طرف آنا ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے موت۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٧ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝٨

ترجمہ: اور جب اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک جماعت تمہارے لیے ہے،

اورتم خواہش کررہے تھے کہ جو جماعت شوکت والی نہیں ہے وہ تمہارے لیے ہوجائے، اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کا حق ہونا ثابت فرمادے، اور کافروں کی جڑ کاٹ دے ⑦ تاکہ حق کو سچا کردے، اور باطل کا باطل ہونا ثابت کردے، اگرچہ مجرموں کو ناگوار ہو ⑧

معارف ومنازل

انسانوں کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، اگرچہ وہ بہت بڑی ہستیاں کیوں نہ ہوں، ہوتا وہی کچھ ہے جو ربّ العزّت عزّوجلّ چاہتا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان ہمیشہ ظاہری منفعت کا طالب رہتا ہے، اُسے باطن کا علم نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ ہے کہ انسان جزوی فوائد کا خواہاں رہتا ہے، اُسے کلیات اور اصول کا پتہ نہیں ہوتا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ انسان اکثر وبیشتر اُن فوائد کا متمنّی رہتا ہے جو سَهْلُ الْوُصول ہوں، وہ مشکلات اور پریشان کن فوائد سے اکثر ناآشنا رہتا ہے، اور اُسے پھولوں سے محبت ہوتی ہے، کانٹوں سے نفرت، اس لیے وہ اپنے مقصد کے حصول میں اکثر ناکام رہتا ہے۔

اللہ جَلّ شانُہٗ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وعدہ فرمایا تھا کہ دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت پر تمہیں غلبہ دیدیا جائے گا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تو ان میں سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ مشورہ دیا کہ ابوسفیان کے قافلے کا ہی پیچھا کیا جائے، کیونکہ وہ لوگ تجارت سے واپس ہورہے ہیں، جنگ کرنے کے لیے نہیں نکلے، ان میں لڑنے کی قوت اور ہمت نہیں ہے، اور ہماری بنسبت وہ تھوڑے بھی ہیں، ان پر غلبہ پانا آسان ہے، اور قریش کا جو لشکر مکہ مکرمہ سے چلا ہے وہ لوگ تو لڑنے ہی کے لیے چلے ہیں، اور تیاری کرکے نکلے ہیں، اور ہماری بنسبت بہت زیادہ بھی ہیں، اور مسلّح بھی، لہٰذا ان سے مقابلہ مشکل ہوگا۔ ان حضرات کے اس مشورہ کو ان الفاظ میں ذکر فرمایا:

﴿وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ﴾ اورتم چاہتے تھے کہ وہ جماعت تمہارے قابو میں آجائے جو قوت وطاقت والی نہیں تھی، جس پر قابو پانا بغیر کسی سخت معرکہ کے تمہارے لیے آسان تھا، اور تمہیں بہت کچھ مالِ غنیمت بھی ہاتھ آسکتا تھا، گویا تم پھولوں سے محظوظ ہونا چاہتے تھے، نہ کہ کانٹوں سے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور دیگر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصًا مہاجرین

کا بحکمِ الٰہی یہ ارادہ ہوا کہ مسلح فوج کے ساتھ مقابلہ ہو، اور کفر کی شوکت وقوت ہمیشہ کے لیے ختم ہو۔ یہ کام اگر چہ مشکل اور پریشان کن ضرور ہے، مگر اس کے فوائد وثمرات اتنے ہمہ گیر اور زیادہ ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جبکہ جہاد کا مقصد بھی یہی ہے کہ اِعْلَاءِ کَلِمَةُ اللهِ ہو، اور کفر وشرک کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو، اور کفّار کے لشکر کے ساتھ ایسا زبردست تاریخی معرکہ ہو کہ جس سے کفر کی کمر ٹوٹ جائے، اور غرور خاک میں مل جائے۔

اور اس سلسلے میں وعدۂ ربّانی جو ہماری فتح اور غلبہ کا پختہ یقینی سہارا ہے اسے ہر حال حاصل کرنا ہمارا مطلب ہو، اور اس سے کم کسی چیز پر ہم راضی نہ ہوں، اور مالِ غنیمت یعنی قافلہ ہمارے اور ہمارے اصلی مقصد کے درمیان حائل نہ ہو، چنانچہ اسی پر فیصلہ ہوگیا، اور تیاری کا اہتمام شروع ہوا، جس کا بیان اگلی آیتوں میں آنے والا ہے، تو فرمایا:

﴿وَيُرِيْدُ اللهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے کلمات کے ذریعہ حق کو ثابت فرمادے۔

﴿وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور کافروں کی بنیاد کو کاٹ دے۔ یہ چیز اگر چہ ظاہری اسباب کے تحت جبکہ مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہو، اور وہ بھوکے پیاسے نہتے بھی ہوں، اس کے ساتھ وہ غیر مسلح بھی ہوں، جن کے پاس صرف دو گھوڑے اور آٹھ تلواریں تھیں، جبکہ کفار کا لشکر ہزار کے قریب تھا، ان کے پاس دوسو گھوڑے سات سو زرہیں اور نوسو تلواریں تھیں، مگر ظاہری اسباب کامیابی کے اسباب نہیں ہوتے، یہ سب کچھ مُسَبِّبُ الْاَسْبَاب حق تعالیٰ کے اختیار میں ہوتے ہیں، وہ اگر چاہے تو ابرہہ اشرم کے ستر ہزار جرّار مسلّح لشکر کو اپنی کمزور مخلوق پرندوں سے تہس نہس کر کے صفحۂ ہستی سے مٹادے، تو وہ قادر وتوانا اس پر پورا پورا قادر ہے، اور یہ اس کے لیے بڑا آسان ہے۔

بخکمش دونیم ست دریائے نیل ☆ بمرغان کشد فیل واصحاب فیل

(نظامیؒ)

﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ اگر چہ مجرموں کو ناگوار ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، مشرکین کے بڑے بڑے صنادید ستر کے قریب مارے گئے، ان کے سربراہ ابوجہل بن ہشام کی حفاظت پر دس (۱۰) نوجوان مقرر تھے، مگر اس کے باوجود دو یتیم نابالغ بچوں معاذ اور معوذ رضی اللہ عنہما عفراء کے بیٹوں نے عَلٰى رُؤُسِ الْاَشْهَاد اُسے جہنم رسید کیا، اور ستر آدمی بشمولِ عقبہ بن ابی معیط قیدی بنالیے گئے، اور کئی دوسرے لوگ زخمی ہوگئے۔

اسی افرتفری اور بیخودی میں ان کے باقی لوگ اپنے ساز وسامان میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے، رات دن

چلتے اُفتاں وخیزاں جب مکہ معظّمہ پہنچے تو شہر سے باہر دوسو عورتوں نے گالی گلوچ اور لعن وطعن کے ساتھ ان کا بُرا استقبال کیا، اور ان پر کیچڑ اور مٹی پھینک کر انہیں گالیاں دیں، ملامت کیا۔ لشکرِ اسلام میں صرف چودہ مجاہدوں نے جامِ شہادت نوش کیا، اور خلدِ بریں کے بالا خانوں میں پہنچ گئے رضی اللہ عنہم، جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(۱) عُبَیدَہ بن الحارث بن مُطّلب مہاجری قرشی رضی اللہ عنہ۔ (۲) عُمَیر بن اَبی وَقّاص رضی اللہ عنہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے چھوٹے بھائی ہیں۔ (۳) ذُوالشمالین بن عبد عمرو مہاجری رضی اللہ عنہ۔ (۴) عاقل بن بکیر مہاجری رضی اللہ عنہ (۵) مھجع بن صالح مہاجری مولی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سب سے پہلے شہید ہیں (بدریوں میں) (۶) صفوان بن بیضاء مہاجری رضی اللہ عنہ (۷) سعد بن خیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ (۸) مبشر بن عبد المنذر انصاری رضی اللہ عنہ (۹) یزید بن الحارث انصاری رضی اللہ عنہ (۱۰) عمیر بن الحمام انصاری رضی اللہ عنہ (۱۱) رافع بن معلّی انصاری رضی اللہ عنہ (۱۲) حارثہ بن سراقہ انصاری رضی اللہ عنہ شہید بن شہید (۱۳) عوف بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ (۱۴) مُعَوِّذ بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ والدہ کا نام عفراء ہے، جس نے ابوجہل کو مارا۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝٩ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝١٠

ترجمہ: جب تم اپنے ربّ سے فریاد کررہے تھے سو اس نے تمہاری دعاء قبول فرمائی کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے ذریعہ تمہاری مدد کروں گا، جو مسلسل آتے رہیں گے ۝٩ اور اللہ تعالیٰ نے اس امداد کو نہیں بنایا مگر بشارت اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل، اور مدد صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، بیشک اللہ تعالیٰ غلبہ والا، حکمت والا ہے ۝١٠

معارف ومنازل

قریشِ مکہ اپنے ساز وسامان اور پورے لشکر کے ساتھ جس میں عیش وطرب شراب وکباب اور گانے والی عورتوں کے ساتھ بڑے گھمنڈ وغرور کے ساتھ بدر پہنچ گئے، راستے میں بھی اور یہاں پہنچ کر بھی ابوجہل نے اپنی قوم سے خطاب کرکے کہا کہ آج ہمارے تین سو ساٹھ معبودوں کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خدا کے ساتھ مقابلہ ہوگا، اور ہم انہیں

سبق سکھائیں گے، پھر کہا: ؎

چلو میدان میں جرأت دکھاؤ، دیکھتے کیا ہو؟ قریشی نسل کی شوکت دکھاؤ، دیکھتے کیا ہو

ہمارے تین سو اور ساٹھ ہیں تنہا خدا ان کا ☆ بھلا اتنے خداؤں سے لڑے گا کیا خدا ان کا

اٹھواے لات وعزّیٰ اور ہُبل کے پوجنے والو ☆ عرب سے ایک خدا کے نام کا دھبّہ مٹا ڈالو

تو لشکر میں ہمارے عیش و عشرت کی کمی کیا ہے ☆ یہاں ہر چیز ہے موجود اور ہر نعمت مہیّا ہے

شرابیں ناچ گانا کھانا پینا ساتھ لائے ہیں ☆ بھلا لگتا ہے جن چیزوں سے جینا ساتھ لائے ہیں

بہت سی گانے والی عورتیں ہمراہ لشکر ہیں ☆ انہی کے حسن سے معمور یہ خرگاہ لشکر ہیں

تفنگ و نیزہ و خنجر شراب و نغمہ و ساقی ☆ مسلمان چیز ہی کیا ہیں کریں اتنی جو سر دردی

مٹانے کے لیے ان کے یہ جنگی فوج ہے کافی ☆ خس و خاشاک کی خاطر یہی اک موج ہے کافی

چڑھائی ہو چکی اب پلٹ کر چلنا ہے ناممکن ☆ مسلمانوں کے سر سے موت کا ٹلنا ہے ناممکن

قریش کے کچھ لوگوں نے ابوجہل کو مشورہ دیا تھا کہ جب ہمارا قافلہ صحیح سلامت مکہ مکرمہ پہنچ چکا ہے، اور ہم کو اپنے قافلے کی مدد کے لیے ہی بلایا گیا تھا تو ہمیں مسلمانوں کے ساتھ لڑنے اور انہیں تباہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس پر ابوجہل نے گھمنڈ اور غرور کے ساتھ کہا کہ نہیں ہمیں صرف ایک خدا کا راج ختم کرنا، اور پورے عالم پر تین سو ساٹھ خداؤں کی خدائی بحال کرنا مقصود ہے، وغیرہ۔

ادھر سیّد کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے جان نثاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ اور ان کے خیالات معلوم کرنے کے لیے میٹنگ بلائی تو نتیجہ یہ معلوم ہوا: ؎

ابوبکر و عمرؓ نے عرض کی اے ہادیِ دوراں! ☆ ہمارے مال و جان اولاد سب کچھ آپ پر قربان

غلامانِ محمد جان دینے سے نہیں ڈرتے ☆ یہ سر کٹ جائے یا رہ جائے کچھ پرواہ نہیں کرتے

اٹھے مقدادؓ اُٹھ کر عرض کی اے سرورِ عالم ☆ نہیں ہیں قوم موسیٰ کی طرح کہہ دینے والے ہم

ہمارا فخر یہ ہے ہم غلامانِ محمد ہیں ☆ ہمیں باطل کا ڈر کیا زیرِ دامانِ محمد ہیں

مسلمان کو ڈرا سکتے ہیں کب یہ نیزہ و خنجر؟ ☆ لڑیں گے سامنے ہو کر عقب پر دائیں بائیں پر

صفِ انصارؓ کی جانب اُٹھیں آنکھیں نبوت کی ☆ تو سعد بن معاذؓ اُٹھے دکھائی شان جرأت کی

ادب سے عرض کی انصار ہیں ہم یا رسول اللہ! ☆ غلامِ سیّد ابرار ہیں ہم یا رسول اللہ!
گدائی آپ کے در کی ہماری پادشاہی ہے ☆ ہمیں تو آپ کا ارشاد ہے وحی الٰہی ہے
ہمارا مرنا جینا آپ کے احکام پر ہوگا ☆ کسی میدان میں ہو خاتمہ ایمان پر ہوگا
اگر ارشاد ہو بحرِ فنا میں کود جائیں ہم ☆ ہلاکت خیز گرداب بلا میں کود جائیں ہم
نبی کا حکم ہو تو پھاند جائیں ہم سمندر میں ☆ جہاں کو محو کردیں نعرۂ اللہ اکبر میں
قریش مکہ تو کیا چیز ہیں دیوؤں سے لڑ جائیں ☆ سنانِ نیزہ بن کر سینۂ باطل میں گڑ جائیں
نظارہ دیکھ کر انصارؓ کے جوشِ اطاعت کا ☆ اٹھا عرش معلّٰی کی طرف چہرہ نبوت کا
دعا کے بعد لوگوں کو نوید فتح و نصرت دی ☆ برائے جنگ یثرب سے نکلنے کی اجازت دی
کہا دونوں میں تم کو اک جماعت ہاتھ آئے گی ☆ خدا نے وعدہ فرمایا ہے نصرت ہاتھ آئے گی
رہے گا بول بالا قدرتِ حق سے صداقت کا ☆ گرے گا جڑ سے کٹ کر نخل کفر و ظلم و بدعت کا
فلک پر تھوکنے والے زمین پر سرنگوں ہوں گے ☆ یقین رکھو کہ خود سر حملہ آور سرنگوں ہوں گے

صاحب روح المعانی نے بحوالہ مسلم و ابوداود و ترمذی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ بدر کے دن سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم پر نظر ڈالی تو یہ حضرات تین سو دس سے کچھ زیادہ تھے (شرکاء بدر کی مشہور تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) ہے) جیسا کہ صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث و سیرت میں مذکور ہے، اور مشرکین پر نظر ڈالی تو وہ ایک ہزار سے کچھ زیادہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف رُخ کیا، اور ہاتھ پھیلا کر اپنے پروردگار سے خوب زور دار دعاء کرتے رہے، دعاء کے الفاظ یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اَنْجِزْنِیْ مَاوَعَدْتَنِیْ اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعَصَابَۃَ مِنْ اَھْلِ الْاِسْلَامِ لَا تُعْبَدُ فِی الْاَرْضِ۔

اے اللہ پاک! آپ نے جو مجھ سے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا فرمایئے، اے اللہ پاک! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں آپ کی عبادت نہ کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اہلِ اسلام کی مختصر سی جماعت ہے، اگر یہ ہلاک ہوگئے تو جو ان کے پیچھے مدینہ میں رہ گئے ہیں ان میں بھی کمزوری آجائے گی، اور ایمان و اسلام کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، پھر آپ عزوجل تعالیٰ کی عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناز کے انداز میں بارگاہِ الٰہی میں یہ بات عرض کردی، ورنہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اگر کوئی

بھی نہ کرے، اور کبھی بھی نہ کرے تو اس بے نیاز وَحْدَہٗ لَاشَرِیک کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، کیونکہ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رُخ ہاتھ پھیلائے ہوئے برابر دیر تک اس دعاء میں مشغول رہے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک آپ کے کندھوں سے زمین پر گر گئی۔ راز دانِ نبوت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر لے کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھوں پر ڈال دی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چمٹ گئے، اور عرض کیا: یا نبی اللہ! بس کیجئے، آپ نے جو اپنے ربّ سے بہت الحاح وزاری کے ساتھ زوردار دعا کی ہے یہ کافی ہوگئی، اور آپ کی دعا سُنی گئی، منظور ومقبول ہوگئی، بیشک آپ کا ربّ اپنا وعدہ پورا فرمائے گا، اس پر یہ آیت:

﴿فَاسْتَجَابَ لَكُمْ﴾ نازل ہوئی، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا قبول فرمائی، اور ایک ہزار فرشتوں کے ذریعے مدد کرنے کا وعدہ فرمایا، جو پے در پے آتے رہیں گے۔ یا معنی یہ ہوں گے کہ ہر فرشتے کے پیچھے ایک ایک فرشتہ ہوگا، بمعنی ردیف کے۔

فرشتوں کا نازل ہونا، اور مؤمنوں کے قلوب کو اطمینان ہونا:

صاحب روح المعانی نے بحوالہ ابن جریر طبری حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نقل کیا ہے کہ جبریل علیہ السلام ہزار فرشتوں کو لے کر نازل ہوئے، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف تھے، اور اسی جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے، اور میکائیل علیہ السلام ہزار فرشتوں کو لے کر نازل ہوئے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں طرف تھے، اور میں بھی اسی جانب تھا۔ [روح المعاني]

سورۂ آل عمران میں تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کا ذکر ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اولاً ایک ہزار فرشتوں کا نزول ہوا، پھر تین ہزار فرشتے آئے، پھر اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار کی تعداد پوری فرمادی، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ﴾ فرشتوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو مدد فرمائی وہ محض اس لئے ہے کہ تم لوگوں کو بشارت ہو، اور تمہارے دلوں کو اطمینان وسکون ہو۔ فرشتوں کی آمد کی پیشگی خبر ایک بہت بڑی خوشخبری تھی، جس سے کمزور وضعیف نہتے مسلمانوں کو سکون ہوگیا، طبعی طور پر انسان کو اسباب کے ذریعہ ہی تسلّی ہو جاتی ہے، خصوصاً ایسے اسباب کہ جن کے متعلق کوئی اشتباہ ہی نہ ہو، جیسے فرشتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا انتظام فرمایا، اور قیامت تک آنے والے مسلمان مجاہدین کے لیے ایک مضبوط روایت قائم فرمائی۔

فضاء بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو ☆ اتر سکتے ہیں آسمان سے قطار اندر قطار اب بھی
(علامہ اقبالؒ)

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اور مدد صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، وہ جس کی چاہے مدد و نصرت فرمائے، اور جیسے اور جس طرح چاہے مدد فرمائے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ غلبہ والا ہے، اور حکمت والا ہے، اس کی مدد کسی خاص سبب کے ساتھ مربوط نہیں، وہ اگر چاہے تو فرشتوں کے بغیر بھی مدد دے سکتا ہے، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ بدر کے موقع پر فرشتوں کو بھیجا جائے۔ کسی قوم کی فتح و نصرت اور غلبہ دینے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی سبب کی ضرورت نہیں، لیکن وہ اپنی حکمت کے مطابق اسباب بھی فرما دیتا ہے، اور پھر اسباب کے ذریعہ جو نفع پہنچانا مقصود ہو وہ نفع پہنچا دیتا ہے۔

جو فرشتے آئے تھے وہ قتال کے لیے نہیں آئے تھے، وہ اہلِ ایمان کو خوش کرنے اطمینان دلانے کے لیے آئے تھے، تا کہ مسلمان لوگ مضبوط اور ثابت قدم رہیں جیسے ارشاد ہے: ﴿فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [اگلی آیت نمبر ۱۲] میں اس کا بیان آرہا ہے، چنانچہ اس سے یہ اشکال بھی رفع ہو گیا کہ ہزار کافروں کے لیے ایک فرشتہ بھی کافی تھا، ہزاروں فرشتوں کی کیا ضرورت تھی؟

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ
وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ⑪

ترجمہ: جب چین (سکون) دینے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تم پر اونگھ طاری فرما رہا تھا، اور تم پر آسمان سے پانی نازل فرما رہا تھا، تا کہ تمہیں پاک کر دے، اور تم سے شیطان کے وسوسے کو دور فرما دے، اور تا کہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے، اور اس کے ذریعہ قدموں کو جما دے ⑪

معارف ومنازل

بدر میں مسلمانوں پر اونگھ کا طاری ہونا:

اللہ تعالیٰ جل شانہ کی نصرت مختلف رنگوں میں نازل ہوتی رہی، ایک یہ کہ سکون وراحت کی خاطر ان پر اونگھ

کی کیفیت ڈالی گئی، دوسرے یہ کہ ان پر زوردار بارشِ رحمت کا نزول ہوا، جس سے ان کی تمام پریشانیاں دور ہوگئیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

بدر کا معرکہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لیے بہت ہی سخت آزمائش اور عظیم امتحان کا موقع تھا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے، غیر مسلح اور بے سروسامان تھے، ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے زندگی میں کبھی کسی لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، اور نہ ہی وہ جنگ کرنا جانتے تھے، وہ نہایت بے تجربہ تھے، اور مدینہ سے کسی فوجی مقابلے کی خاطر نہیں نکلے تھے، مقابلہ میں ان سے تگنی تعداد بلکہ اس سے بھی زیادہ لشکر پورے سازوسامان سے کبر وغرور کے نشہ میں مست وسرشار ہوکر میدان میں اُترا تھا، ایسا لگتا تھا کہ مُرغوں کے ساتھ مست ہاتھیوں کا مقابلہ ہے، یہ لوگ اتنے بے چین اور پریشان تھے کہ اُونگھ (نیند) کے لیے ترستے تھے۔

ہاں! اتنی بات تو ہے کہ کائنات کے خالق ومالک کی رضاء کی خاطر میدان میں اترے تھے، تب ہی تو ان کی پریشانی دور کرنے کے لئے ان پر اُونگھ بھیج دی گئی، یہ عجیب اُونگھ ہے کہ دورانِ جنگ راحت ورحمت میں شمار ہے، اور دورانِ نماز اور دورانِ تلاوت شیطانی شرارت میں شمار ہے۔ یہاں بھی اُونگھ اور ایک سال بعد غزوۂ اُحد کے موقع پر بھی اُونگھ، یہ قدرت کی عنایت ہے، اس اُونگھ کا فائدہ یہ ہوا کہ جو تکلیف محسوس کررہے تھے اس کا احساس ختم ہوگیا، کیونکہ نیند ہر چیز سے غافل کردیتی ہے، غم وخوشی دونوں سے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم سب پر نیند کا غلبہ ہوگیا تھا، مگر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح تک برابر نماز میں مشغول رہے۔ [درمنثور]

نیز اللہ تعالیٰ نے بارش بھی نازل فرمائی، بارش کے کئی فائدے ہوئے: ایک تو نہانے دھونے وضو اور پینے کا فائدہ ہوا، دوسرے شیطان نے قلوب میں جو ناپاک وسوسے ڈال دیئے تھے کہ اگر واقعی تم خدا کے مقبول بندے ہوتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوتی، اور تمہیں اتنی دشواری پیش نہ آتی، جو کہ اب تمہیں پیش آئی ہے، اس بارش نے ان کے تمام وسوسوں کو ختم کیا۔ اور یہ بھی فائدہ ہوا کہ مسلمان جس جگہ قیام پذیر تھے وہ ریت کا پہاڑ تھا، جس پر آسانی کے ساتھ چلنا پھرنا ممکن نہ تھا، اور ان کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے تھے جس نے انہیں پریشان کیا ہوا تھا، بارش سے وہ اتنا سخت ہوگیا کہ انہیں چلنے پھرنے میں بڑی عجیب سہولت ہوئی۔ ادھر مشرکین کے جائے قیام میں اتنا کیچڑ ہوگیا کہ انہیں سخت پریشانی ہوئی۔

سبحان اللہ! یہ سب کچھ قتال شروع ہونے سے پہلے ہوا، جو کہ فتح ونصرت کا ایک پیشگی پیغام تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے جنگ شروع ہونے سے پہلے اطمینان وسکون کے لیے ظاہر فرمایا، اب مسلمانوں کے قلوب وباطن بھی مضبوط اور قدم بھی جم گئے۔ الحمد للہ

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ﴿۱۲﴾

ترجمہ: جب کہ آپ کا ربّ فرشتوں کو حکم دے رہا تھا: بلاشبہ میں تمہارے ساتھ ہوں، سو تم ایمان والوں کو جماؤ، میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رُعب ڈال دوں گا، سو تم گردنوں پر مارو، اور ان کے ہر پورے (بند بند) پر مارو﴿۱۲﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُونگھ اور بارش جیسی نعمت کا تذکرہ فرمایا۔ صاحب مظہری نے لکھا ہے بحوالہ ابن کثیر کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس رات میں جبکہ اپنے سائباں میں نماز تہجد میں مشغول تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کسی قدر اُونگھ آ گئی، مگر فوراً بیدار ہو کر ہنستے ہوئے باہر آ گئے، فرمایا: اے ابوبکر! خوشخبری سنو، یہ جبریل علیہ السلام ٹیلہ کے قریب کھڑے ہیں، یہ کہہ کر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ [القمر: ۴۵] (یعنی عنقریب دشمن کی جماعت ہار جائے گی، اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے گی)۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باہر آ کر مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ابوجہل کی قتل گاہ ہے، اور یہ فلاں کی، یہ فلاں کی، پھر ٹھیک اسی طرح واقعات پیش آئے۔ [مظهري]

اس آیت میں پانچویں انعام کا ذکر ہے، جو غزوۂ بدر کے کارزار میں مسلمانوں پر مبذول ہوا، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرشتے مسلمانوں کی امداد کے لیے آسمان سے بھیجے تھے ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مسلمانوں کی ہمت بڑھاؤ، میں ابھی کفار کے دلوں میں رُعب ڈالے دیتا ہوں، سو تم کفار کی گردنوں پر حربہ مارو، اور ان کے بند بند پر مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ چنانچہ یہ وعدۂ خداوندی پورا ہوا، مسلمانوں نے کفار کو مار مار کر

انہیں تاریخی ذلّت آمیز شکست دی، ان کے بڑے بڑے نامور ستر سرداروں کو جہنم رسید کیا، اور ستر افراد کو قیدی بنایا، وہ نہ بھاگ سکتے تھے نہ مقابلہ کر سکتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال کر انہیں بے حوصلہ فرمایا تھا۔

﴿فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ مارو گردنوں پر۔ یہ حکم فرشتوں کو بھی ہے اور مسلمانوں کو بھی، کئی کافروں کو فرشتوں نے مارا، اور کئی کافر مسلمانوں کے ہاتھوں سے جہنم رسید ہوئے۔

فرشتوں نے بھی جزوی طور پر لڑائی میں حصّہ لیا:

غزوۂ بدر میں فرشتوں کے قتال کرنے کے بارے میں متعدد روایات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بدر کے دن فرشتوں کی نشانی یہ تھی کہ انہوں نے سفید عمامے باندھے ہوئے تھے، جن کے شملے اپنی کمروں پر ڈال رکھے تھے۔ البتہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا عمامہ زرد رنگ کا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا کہ بدر کے علاوہ کسی دوسرے موقع پر فرشتوں نے قتال نہیں کیا۔ [البدایة والنهایة جلد ۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے غزوۂ بدر کا ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا کہ ایک مسلمان ایک مشرک کے پیچھے دوڑ رہا تھا، اس نے اپنے سامنے کوڑے لگنے کی آواز سنی، اور گھوڑے کی رفتار بھی، وہ شخص اپنے گھوڑے کو یوں کہہ رہا تھا اَقْدِمْ حَيْزُومْ! اے حیزوم آگے بڑھو (حیزوم اس فرشتہ کے گھوڑے کا نام تھا)، اچانک وہ مسلمان یہ دیکھتا ہے کہ وہ مشرک اس کے سامنے مردہ پڑا ہوا ہے، جب دیکھا تو اس کی ناک پر ضرب کا نشان ہے، اور اس کا چہرہ کوڑے کی ضرب سے چیرا ہوا ہے، جب یہ بات سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے سچ کہا، یہ ان فرشتوں کا کام ہے جو تیسرے آسمان سے ہماری مدد کے لیے آئے ہیں۔ [مسلم]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان فرمایا کہ فرشتوں نے مقتولین کی گردنوں پر مارا تھا، اور ان کی انگلیوں کے پوروں پر ایسا نشان تھا جیسے آگ نے جلایا ہو۔ [البدایة والنهایة]

حضرت ابو برد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں بدر کے دن کٹے ہوئے تین سر لے کے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا، وہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے رکھ دیئے، اور عرض کیا کہ ان میں سے دو شخصوں کو تو ہم نے قتل کیا ہے، اور تیسرے شخص کو ایک دراز قد وقامت آدمی نے قتل کیا ہے، میں اس مقتول کا سر بھی لایا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ دراز قد فلاں فرشتہ تھا۔ سائب بن ابی حبیش نے بیان کیا (جو بدر کے دن قید کئے گئے تھے بعد

میں مسلمان ہوئے) کہ مجھے خوب زیادہ بالوں والے ایک دراز قد آدمی نے پکڑ کر باندھ دیا، جو سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مجھے باندھا ہوا دیکھا تو مجھے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے کس نے قید کیا؟ میں نے کہا: میں نہیں جانتا، یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ میں اصل صورت حال نہیں بتانا چاہتا تھا کہ ایسے شخص نے مجھے قید کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تجھے ایک فرشتہ نے قید کیا ہے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ہم مشرکین کے سر کی طرف تلوار سے اشارہ کرتے تھے تو اس کا سر تلوار پہنچنے سے پہلے ہی جدا ہو کر گر جاتا تھا۔ [البداية والنهاية: ج ۲]

﴿فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ اور ﴿كُلَّ بَنَانٍ﴾ سے مراد کل بدن ہے۔ قاله ابن عباس رضی اللہ عنہ۔ [روح المعاني]

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: یہ اس وجہ سے کہ بلاشبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی، اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے سو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ﴿۱۳﴾ سو یہ سزا تم چکھو، اور بلاشبہ کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ﴿۱۴﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کا انجام بد:

ذٰلِكَ کا مشار الیہ ضرب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کو مارنے کا یہ حکم اس لیے ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کی، اللہ تعالیٰ کی سرزمین میں فسق وفساد پھیلا کر نمک حرامی کی، انہیں اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے پیدا فرمایا انہوں نے اس مقصد کے ساتھ بغاوت اور غداری کی، سو یہ فیصلہ برحق اور حق بجانب ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بغاوت کرے گا وہ دنیا وآخرت دونوں میں ذلیل وخوار ہی ہوگا، اور یہی قتل دنیا میں اور عذابِ جہنم عقبیٰ میں اس کے لیے لازمی ہوگا اور یہ سب کچھ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہی ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ
اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پشت مت پھیرو ﴿۱۵﴾ اور اس دن بجز اس شخص کے جو لڑائی کے لیے رخ بدلنے والا ہو یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے والا ہو جو شخص پشت پھیرے گا سو وہ اللہ تعالیٰ کے غصہ کو لے لوٹا، اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے ﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

جنگ کا صحیح اور تربیتی نقشہ:

مجاہدین سے محبت کرنے والی ذات نے انہیں جہاد کی ترغیب کے ساتھ ساتھ تربیتی نظام بھی سمجھایا کہ بے خوف وخطر پہاڑوں کی طرح جم کر لڑو، اور میدان چھوڑ کر ہرگز بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ سورۂ صف میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ [الصف: ۴] (اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں صف باندھ کر، گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی)۔

پس یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ایسی قلبی ذہنی اور جسمانی تربیت کی جائے کہ جہاد میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ کر پوری قوت کے ساتھ لڑ سکیں، اور اپنی صفوں میں پہاڑ کی طرح جم جائیں، دشمن کو پشت دکھانا اور میدانِ جنگ سے منہ موڑنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اپنی جان بچانا ہی مقصود ہے، اور یہ قطعاً حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔ ایک شخص کے بھاگنے اور میدان چھوڑنے سے باقی لشکر کے قدم بھی ڈگمگائیں گے، جس سے صرف دشمن ہی کو فائدہ ہوگا، اور مسلمان مغلوب ہو جائیں گے، پھر دشمن کے غلام بن جائیں گے، اور قتل وغارت کا شکار بھی ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اسے بدترین جرائم میں شمار کیا، اور اس کے ارتکاب پر غضب الٰہی کے نزول سے ڈرایا، اور ایسا کرنے والوں کو جہنم کی وعید سنائی۔ ایک شخص کے بھاگنے سے پورا جہادی نظام تباہ ہوگا، چنانچہ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سات مہلک چیزوں سے بچو، لوگوں نے پوچھا: وہ کونسی چیزیں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

(۱) شرک باللہ (۲) سحر، جادو (۳) نفسِ انسانی کا بلاوجہ قتل (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) لڑائی

کے دن میدانِ جنگ سے بھاگنا (۷) شریف پاکدامن مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا۔

زبردست جنگی تدبیر:

آیت کریمہ میں ایک طرف تو مسلمانوں کو مقابلے میں پیٹھ پھیرنے سے سخت ممانعت کی گئی ہے، تاکہ وہ پوری قوت اور استقامت سے ڈٹ کر مقابلہ کریں، دوسری طرف انہیں جنگ کے دو (۲) اہم اصول سکھائے گئے ہیں، یعنی "تحرّف" اور "تحیّز"۔ تحرف کے معنی ہیں: خوب تدبیر، چالبازی اور پینترے بدل بدل کر حملہ کرنا، اور نئی حکمت عملی سے دشمن کو نقصان پہنچانا۔ تحیّز یہ ہے کہ مجاہدین کی کمر مضبوط رکھنا، میدانِ جنگ کے پیچھے ایسا نظام قائم کرنا کہ مجاہدین وہاں پہنچ کر مضبوط ہو سکیں، اور نئی تازہ مدد اور کمک حاصل کر کے دشمن پر دوبارہ کسی دوسرے محاذ سے حملہ کر سکیں۔ سرور عالم ﷺ نے اپنی ذات اقدس اور پورے مدینہ منورہ کو "فِئَة" کا درجہ مجاہدین کے لیے قرار دیا تھا، اسی طرح عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بھی اسی نظام کو اپنایا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ سے بھاگنے والے غضبِ الٰہی اور جہنم کے عذاب کے حقدار ہوں گے۔ البتہ دو صورتیں مستثنیٰ اور جائز ہیں: ایک یہ کہ مقصود بھاگنا نہ ہو، بلکہ اسے بطورِ ایک چال اور تدبیر کے اختیار کر رہا ہو، اور کسی تدبیر کے ساتھ دوسرے انداز سے واپس آ کر حملہ کرنے کا ارادہ ہو اس کو ﴿مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ﴾ سے تعبیر فرمایا۔

دوسرے یہ کہ کوئی جنگ کرنے والا مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کی کسی جماعت کے پاس چلا جائے، تاکہ ان کو ساتھ ملا لے، یا پھر ان سے مالی یا سلاح یا اور کوئی چیز حاصل کر کے، تازہ دم ہو کر دوبارہ دشمن پر قوت وطاقت کے ساتھ حملہ کرے، اسی کو ﴿مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ﴾ سے تعبیر فرمایا۔ یہ دونوں صورتیں جائز اس لیے ہیں کہ یہ بھاگنے کا حصہ نہیں، بلکہ ایک جنگی تدبیر اور جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کی تدبیر کا حصہ ہیں۔

بارہ ہزار کا لشکر کبھی مغلوب نہ ہوگا:

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ یہ میدان چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کرنے کی حرمت اس صورت میں ہے جبکہ کافروں کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے کم ہو، یا برابر یا دوگنی ہو، یا زائد تو ہو لیکن دوگنی سے کم ہو۔ اگر کافروں کی تعداد دوگنی سے زیادہ ہو تو راہِ فرار اختیار کرنا جائز ہے۔ ان حضرات کا استدلال آیت کریمہ: ﴿فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ﴾ [الأنفال: ۶۶] (پس اگر تم میں سے صبر کرنے والے سو ہوں، تو دو سو پر غالب آئیں گے) سے

ہے۔ اور صاحب روح المعانی نے حضرت امام محمد بن الحسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ مسلمانوں کا لشکر بارہ ہزار ہو تو میدان چھوڑ کر بھاگنا جائز نہیں ہے، کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ: لَنْ يُغْلَبَ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا مِنْ قِلَّةٍ۔ یعنی بارہ ہزار کا لشکر قلت کی وجہ سے ہرگز مغلوب نہ ہوگا۔ [ترمذي]

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے تو بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر ہونے کی صورت میں میدان چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت نہیں ہے، خواہ دشمنوں کا لشکر کتنا بھی زیادہ ہو، اور یہ بات بارہا آزمائی جا چکی ہے کہ بارہ ہزار کا لشکر قلّت کی وجہ سے مغلوب نہ ہوگا، اگر اخلاص نہ ہونے یا اعجابِ نفس کی وجہ سے مغلوبیت ہو جائے یہ دوسری بات ہے، جیسے غزوۂ حُنین میں ہوا: ﴿وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ. اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا﴾ [التوبة: ٢٥] (اور حنین کے دن جب تمہاری تعداد کی کثرت نے تمہیں مگن کر دیا تھا، مگر وہ کثرتِ تعداد تمہارے کچھ کام نہ آئی)۔

غزوۂ بدر میں کافروں کی تعداد تین گنا زیادہ تھی، پھر بھی فرار کی اجازت نہ تھی، کیونکہ اس وقت تک آیت کریمہ: ﴿اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ﴾ [الأنفال: ٦٦] (ابھی اللہ نے تم پر سے آسانی کر دی) نازل نہیں ہوئی تھی۔

فائدہ:

بارہ ہزار کی تعداد میں جو حکمت ہے اس کا واضح ثبوت اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران جیسے بڑے ملک کی فتح کے لیے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بارہ ہزار کا لشکر تیار کر کے روانہ فرمایا، جب اس قدسیوں کے لشکر نے مدائن کا رخ کیا تو ان کے راستے میں دریائے دجلہ حائل ہو گیا، کشتیوں کا انتظام نہیں تھا، اور لشکر کو بہر صورت دار الحکومت پہنچنا ہی تھا، اور بحکمِ الٰہی اسے فتح کرنا تھا، جب لشکر دریائے دجلہ کے کنارہ پہنچا جس میں اساطینِ اسلام بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے، قائدِ لشکر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا، اور دریا کو مخاطب کر کے کہا کہ تم بھی مخلوق ہو اور ہم بھی، مگر ہمارا پروگرام یہ ہے کہ پورے جہاں میں توحیدِ الٰہی کا علَم لہرائیں، اور اس خطے کو مجوس قوم کے تسلّط سے پاک کریں، اب ہم گھوڑوں سمیت تیری موجوں میں گھس کر تجھے پار کر کے رہیں گے، خبردار! ہماری حکم عدولی نہ کرنا۔

یہ کہتے ہوئے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر سب سے پہلے دریا میں اپنے گھوڑے کو ڈال دیا، آپ رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر پورے لشکر نے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دریا میں گھوڑے دوڑائے، قدرت نے دریا کو ایسا مسخر فرمایا کہ

پورا لشکر بخیر وعافیت دریا پار کر کے خشکی پر پہنچا، سامنے مجوسی یہ منظر دیکھ کر سخت گھبرائے، اور کہنے لگے: دیو آمدند، دیو آمدند، یہ انسان تو نہیں، یہ دیو اور جن ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تصویر کشی یوں کی ہے:

دشت تو دشت ہے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے ☆ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے ہم نے

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو ☆ ہے آج تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اسی طرح حضرت طارق بن زیاد نے بارہ ہزار کا لشکر لے کر اندلس کو فتح کیا تھا، جہاں آٹھ سو سال حکمرانی کا پورا پورا حق مسلمانوں نے ادا کیا تھا، اور جب حکمرانوں نے عیاشی شروع کی، اور فریضۂ جہاد متروک ہوا، تو پورا اندلس عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو بھی قوم جہاد چھوڑ دے گی اللہ تعالیٰ شانہ ان پر عذاب بھیج دے گا۔ [مجمع الزوائد: ج ۵ عن الطبراني في الأوسط]

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ
مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: سو تم نے انہیں قتل نہیں کیا اور لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کیا، اور جب آپ نے پھینکا تو آپ نے نہیں پھینکا، لیکن اللہ تعالیٰ شانہ نے پھینکا، اور تا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھا انعام دے، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۱۷﴾ یہ بات ہے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کافروں کی تدبیر کو کمزور کرنے والا ہے ﴿۱۸﴾

معارف و منازل

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہوا کہ بدر کی فتح کے بعد اور مشرکین کی مغلوبیت اور بھاگ کھڑے ہونے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض اپنی بہادری اور بعض اپنی جرأت اور چند لوگ اپنی کارکردگی سراہتے ہوئے فخر کرنے لگے، اس پر یہ آیت اتری کہ تم لوگوں نے بظاہر اگرچہ دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ سے دشمن تباہ ہوا، مگر حقیقی فتح و نصرت اور تمہاری کامیابی اور دشمن کی شکست سب کا سہارا حق تعالیٰ شانہ قادرِ مطلق کی ذرہ نوازی ہے، اور سب کچھ اس کا کرم اور احسان ہے، ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ

یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [التکویر: ۲۹] (اور تم چاہو گے نہیں، اِلّا یہ کہ خود اللہ چاہے، جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے)۔

ذرا یہ دیکھو، تمہیں جرأت کس نے عطا کی؟ فرشتے کس کے حکم سے آئے؟ مُٹھی بھر مٹی کے ذرات ایک ہزار آدمیوں کی آنکھوں اور نتھنوں میں کس نے پہنچائی؟ اور خونخوار وجرار مسلح لشکر کو کس نے بھگایا؟ ستر کے قریب سردارانِ قریش کو کس نے خاک وخون میں تڑپایا؟ اور ان کے ستر لوگوں کو کس نے باندھ کر تمہارے حوالہ کیا؟ بارش کس نے برسائی؟ تم تو مارے غم کے سونے کے لیے تڑپتے تھے، تم پر اونگھ کس نے مسلّط کی؟ تمہارے پاس صرف آٹھ تلواریں تھیں، تم نے آٹھ تلواروں سے کیسے اور کس کے حکم سے ایک ہزار تلواروں کا مقابلہ کیا؟ ان سب باتوں کا جواب یہ ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ لہٰذا عُجب وانانیت کو چھوڑ کر صرف یہ تسلیم کرو کہ یہ سب کچھ ہمارے مہربان ربّ العزّت کی طرف سے اور اسی کے حکم سے ہوا، اور مؤثرِ حقیقی اور فاعلِ مختار وہی ذات عالی صفات ہی ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ مُٹھی بھر مٹی لے کر دشمنوں کی طرف ہوا میں پھینک دیجیے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا، اس کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شَاهَتِ الْوُجُوه کی بددعا پڑھ لی، اور وہ مٹی مشرکین میں سے ہر شخص کی آنکھوں میں اور ناک کے نتھنوں میں اور منہ میں پہنچ گئی، جس کی وجہ سے وہ لوگ بیتاب ہو کر پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے، گویا یہ مٹی ان کے لیے عذاب ثابت ہوئی، وہ بے حوصلہ اور خوفزدہ ہو گئے، بلکہ بے خود ہو گئے، اپنے سامان میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے، ادھر سے تم نے ان کا تعاقب کیا۔﴿تَقْتُلُوْنَ وَتَأْسِرُوْنَ﴾ [الأحزاب: ۲۶] یعنی تم نے انہیں بھاگنے کی حالت میں قتل کیا، اور قیدی بناتے رہے۔

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا، اسی کو فرمایا کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کیا، اور یہ مٹی آپ نے نہیں پھینکی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی، اور ان تک پہنچائی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ معجزہ کا صدور وظہور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے، پیغمبر کو اتنا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہیں معجزہ کا اصدار کریں۔ مٹی پھینکنے کا واقعہ غزوۂ حنین میں بھی ہوا۔

﴿وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا﴾ اور تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو اپنی طرف سے اچھا انعام دے۔

لفظِ "بَلَاء" انعام کے معنی میں بھی آتا ہے، اور آزمائش کے معنی میں بھی۔ مفسرین نے یہاں انعام کے معنی میں لیا ہے، اور مطلب یہ بتایا ہے کہ تاکہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو ایسا اچھا انعام عطا فرمائے جس میں تکلیفیں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے جو کافروں کو قتل کیا، اور مٹھی بھر مٹی ان کی آنکھوں کو پہنچائی، اور ان کو شکست دی، جس کی وجہ سے اہلِ ایمان فتح یاب ہوگئے، اور کامیاب ہوگئے، یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے۔

بعض مفسرین نے اس کا دوسرا ترجمہ بھی کیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو جنگ میں اچھی طرح سے آزمائے۔ [روح المعاني]

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جس نے مسلمانوں کی دعا سنی، اور فریادرسی فرمائی، اور خوب ان کی نصرت فرمائی، اور وہ جاننے والا بھی ہے، سب کی نیتوں اور ظاہر و باطن کو بھی جانتا ہے۔

﴿ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ذٰلِكُمْ کا مشارالیہ وہی انعام ہے جو مذکور ہوا، اور بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کی تدبیر کو کمزور کرنے والا ہے۔ یہ دوسرا انعام ہے، کیونکہ کافر بڑے زور و شور اور قوت سے حملہ کرنے آئے کہ مسلمانوں کو شکست فاش دے کر ہمیشہ کے لیے انہیں ختم کردیں، مگر انہیں لینے کی بجائے دینا پڑا، ان کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے، اور ان کا اپنا خانہ خراب ہوا کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے انہیں ایسی شکست فاش سے دوچار کیا کہ پورے عالم میں سر اٹھانے کے قابل نہ رہے، اور ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار ہوئے۔

سنّت اللہ تعالیٰ اسی دن سے جاری رہی کہ آئندہ ہر محاذ پر مسلمان فاتح رہے، اور کفر مغلوب ہوا، یہ سلسلہ اسی غزوۂ بدر سے ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا، جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران:١٣٩] (سستی نہ کرو، اور غم نہ کرو، تم ہی سربلند رہو گے اگر مؤمن ہو)۔ اکثر مقامات میں اور یہاں بھی جملہ اسمیہ اختیار فرمانے میں یہی مقصد ہے کہ یہ سلسلہ دائمی اور استمراری طور پر جاری رہے گا، شرط یہ ہے کہ مسلمان اطاعتِ الٰہی سے باہر قدم نہ رکھیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا رابطہ مستحکم ہو۔ ؎

تا نگرید کودک حلوا فروش ☆ رحمت حق در نمے آید بجوش

(مثنوی)

مسلمان کا فرض ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حضور سرِ نیاز خم کرے، اور آنسو بہائے، پھر دیکھیں کہ کیا کچھ نہیں

ہوگا۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ التَّوْفِیْقِ

❀ ❀ ❀

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا
نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑲

ترجمہ: اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو فیصلہ تمہارے سامنے آچکا ہے، اور اگر باز آجاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر تم پھر وہی کام کرو گے تو ہم بھی وہی کام کریں گے، اور تمہاری جماعت ہرگز تمہارے کچھ کام نہ آئے گی، اگر چہ کثیر تعداد میں ہو، اور بلا شبہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے ⑲

معارف ومنازل

فرعون هٰذِهِ الْاُمَّة ابوجہل بن ہشام سے کہا جارہا ہے کہ: ؎

اتنا نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت ☆ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

مفسرین اور اصحاب سیرت نے لکھا ہے کہ ابوجہل نے بدر کے دن لڑائی شروع ہونے سے پہلے یوں دعا کی تھی (یہ دعا تصنع اور ضد پر مبنی تھی): اے اللہ! یہ جو دو جماعتیں ہیں (ایک مؤمنین دوسرے مشرکین) اِن میں سے جو بھی قطع رحمی میں بڑھ کر ہو، اور جو ایسی چیز لے آیا ہو جسے ہم نہیں جانتے، آج کی صبح اسے شکست دے دینا۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ: جب مشرکین بدر کے لیے روانہ ہونے لگے تو کعبہ شریف کے پردے پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی، اور یوں کہا کہ: اے اللہ! دونوں لشکروں میں سے جو لشکر آپ عزوجل تعالیٰ کے نزدیک اعلیٰ، اکرم اور بہتر ہو اس کی مدد فرمایئے۔ [ابن کثیر]

ابوجہل، بے عقلوں کا باپ یہ سمجھ رہا تھا کہ بمقابلہ مسلمانوں کے ہم ہی اعلیٰ وافضل اور زیادہ ہدایت پر ہیں، اس لیے یہ دعا ہمارے حق میں ہے، اور اس دعاء کے ذریعہ وہ یہ چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و باطل کا فیصلہ ہوجائے، اور ہم چونکہ حق پر ہیں تو فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا، اور مسلمان مغلوب ہوجائیں گے، کیونکہ وہ حق پر نہیں، مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ اس دعاء میں درحقیقت وہ بیوقوف اپنے لیے بددعاء اور مسلمانوں کے لیے نیک دعاء کر رہا ہے، چنانچہ انجامِ جنگ سامنے آنے کے بعد قرآن کریم نے ان کو بتلایا:

﴿اِنۡ تَسۡتَفۡتِحُوۡا فَقَدۡ جَآءَكُمُ الۡفَتۡحُ﴾ اگر تم خدائی فیصلہ چاہتے ہو تو سامنے آچکا کہ حق کو فتح اور باطل کو شکست ہوگئی، اور تم ایک عرصہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے رہتے تھے: ﴿وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡفَتۡحُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴾ [السجدة:۲۸] (کہ تمہارا اور ہمارا فیصلہ کب ہوگا؟ لاؤ وہ فیصلہ، اگر تم سچے ہو)۔ آج وہ سچائی والا فیصلہ آپہنچا، اور ہمارے ربّ نے تمہارے سارے گھمنڈ و غرور کو خاک میں ملا کر تمہیں شرمندہ و رسوائے جہاں بنایا۔ ایک قلیل بے سروسامان لشکر کے ہاتھوں تمہاری ہلاکت کا فیصلہ صادر فرمایا۔ مزید تفصیل عنقریب آیت ۴۳ کے تحت آنے والی ہے۔ لہٰذا تمہیں کہا جا رہا ہے:

﴿وَاِنۡ تَنۡتَهُوۡا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ﴾ اور اگر تم اب بھی اپنے کفر و غرور سے باز آگئے اور نصیحت حاصل کرلی، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا، اور شاید مزید رسوائی سے بچ جاؤ گے، لیکن اگر تم نے اس شرمساری سے سبق اور عبرت نہیں سیکھی، تو غور سے سنو:

﴿وَاِنۡ تَعُوۡدُوۡا نَعُدۡ﴾ یعنی اگر تم پھر اپنی شرارت اور جنگ کی طرف لوٹے تو ہم بھی مسلمانوں کی فتح و نصرت کی طرف لوٹیں گے، اور اگلے محاذ پر اس سے زیادہ تمہاری تباہی کا فیصلہ صادر فرمائیں گے، کیونکہ ہمارا فیصلہ ہمیشہ حق کی حمایت میں ہوتا رہے گا، اگر تمہیں مزید نوحہ خوانی کا شوق ہے تو آؤ میدان میں، ہم بھی میدان میں موجود رہیں گے۔ البتہ اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ اس دفعہ ہم مزید بکثرت فوج و سپاہ کے ساتھ آکر فتح حاصل کریں گے تو سنو:

﴿وَلَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡكُمۡ فِئَتُكُمۡ شَيۡـئًا وَّلَوۡ كَثُرَتۡ﴾ یہ تمہاری جماعت اور جتھے کتنا ہی زیادہ ہو قادرِ مطلق جل قدرہ کی نصرت و امداد کے مقابلے میں تمہیں کچھ بھی کام نہ دیں گے، تم فرعون کے لشکر سے ہزاروں گنا کمزور ہو، جسے اللہ تعالیٰ نے ستر لاکھ فوجیوں کے ساتھ دریا میں غرق فرمایا، تم اس کے عُشرِ عشیر تک نہیں ہو، کیونکہ کائنات کے خالق و مالک کا فیصلہ یہ ہے کہ:

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت مؤمنوں کے ساتھ ہے۔ کوئی جماعت اور بڑی فوج تمہیں کیا کام دے سکتی ہے؟ جب کہ خالق و مالک حق تعالیٰ سبحانہ مسلمانوں کے ساتھ ہے، نظامی نے کہا:

بحکمش دونیم ست دریائے نیل ☆ بمرغان کشد فیل و اصحاب فیل

اے مشرکینِ عرب! اصحابِ فیل کی تباہی کا نقشہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، جن کے ستر ہزار کے جرار لشکر کو چھوٹے پرندوں نے ایسا تباہ کیا جیسے ﴿فَجَعَلَهُمۡ كَعَصۡفٍ مَّاۡكُوۡلٍ﴾ [الفیل:۵] (انہیں ایسا کر ڈالا جیسے کھایا

ہوا بھوسا) جیسے اونٹوں کے سامنے رکھی ہوئی گھاس اور چارہ جنہیں کھا کر فنا کیا گیا ہو۔

❁ ❁ ❁

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝
وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو، حالانکہ تم سنتے ہو ۝ اور ان لوگوں میں سے مت ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا، اور حال یہ ہے کہ وہ نہیں سنتے ۝ بیشک زمین پر چلنے پھرنے والوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے برے وہ لوگ ہیں جو گونگے ہیں، بہرے ہیں، جو سمجھ نہیں رکھتے ۝ اور اگر اللہ تعالیٰ جانتا کہ ان میں کوئی بھلائی ہے تو ان کو ضرور سنا دیتا، اور اگر ان کو سنا دے تو وہ ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے ۝

معارف ومنازل

گزشتہ آیت میں یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے ساتھ ہے، اب ان آیات میں اہل ایمان کو فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی نصرت وحمایت اور معیّت کا دارومدار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر ہے، اگر تم اللہ تعالیٰ کی معیّت کے طلبگار رہو تو اس کی دو شرطیں ہیں:

اوّل اطاعت ومکمل فرمانبرداری، صدق واخلاص کے ساتھ۔ دوئم یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور کتابِ الٰہی کے دشمنوں یعنی کفار اور منافقین کی مشابہت سے مکمل اجتناب ہو، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ [مشکوۃ] جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا، کیونکہ خدا اور رسول کی محبت کے ساتھ ان کے دشمنوں کی مماثلت ومشابہت اضداد میں سے ہیں، جو کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی ہیں، اس لیے ان آیات میں اولاً اطاعتِ کاملہ کا حکم دیدیا، اور ثانیاً کفار ومنافقین کے تشبہ سے ممانعت فرمائی کہ:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا﴾ اور کفار کو شَرَّ الدَّوَاب قرار دے کر ان سے دور رہنے کا حکم صادر فرمایا، اور واضح فرمایا کہ جب تم بات سن رہے ہو قرآن کا حکم تمہارے سامنے ہے، سرور عالم ﷺ بنفس نفیس

تمہیں حکم دے رہے ہیں، اور تمہارے ساتھ ہیں، تو عمل نہ کرنے اور بات نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں، اور تمہارے پاس کوئی عذر بھی نہیں جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا﴾ کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا، حالانکہ وہ نہیں سنتے، اس سے مراد کفار اور منافقین ہیں، ان کے کانوں میں بات تو جاتی ہے، لیکن چونکہ دل کے کانوں سے نہیں سنتے (قبول نہیں کرتے) اور پہلے ہی سے یہ طے کر رکھا ہے کہ یہود کی طرح ہمیں ماننا اور سمجھنا نہیں ہے، جیسے فرمایا: ﴿سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا﴾ [النساء: ۴۶] (ہم نے سن لیا، اور نافرمانی کی) جو کہتے تھے اس لیے کانوں کا سننا نہ سننے کے برابر ہو جاتا ہے، اور ایسے سننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اس لیے فرمایا:

﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ﴾ یعنی بیشک زمین پر چلنے پھرنے والوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بُرے لوگ وہ ہیں جو گونگے اور بہرے ہیں، سمجھ نہیں رکھتے۔

دَوَاب جمع ہے دَابَة کی، عربی لغت کے اعتبار سے ہر اس چیز کو دَابَة کہا جاتا ہے جو زمین پر چلتی پھرتی ہو، اور عرف میں چوپایوں کو دَابَة کہا جاتا ہے۔ اگر لغوی معنی کے اعتبار سے دَابَة سے مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ زمین پر چلنے والی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ بُرے وہ لوگ ہیں جو نہ تو حق کو سنتے ہیں، اور نہ حق بولتے ہیں، اور ان کی انتہائی بُری حالت یہ ہے کہ سمجھتے بھی نہیں۔

بہرا شخص بعض مرتبہ کچھ اشارہ سمجھ تو لیتا ہے، لیکن جس میں عقل ہی نہ ہو وہ تو کسی طرح سمجھتا ہی نہیں، یہ جانوروں سے بھی بدتر ہے، یہ کافروں کی مثال و بدحالی ہے۔ اور اگر دَابَة سے چوپایہ مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ کفار چوپایوں کی طرح سے ہیں، نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں۔ سورۂ فرقان میں فرمایا: ﴿إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا﴾ [الفرقان: ۴۴] (یہ محض چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں)۔ پھر ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا کہ ان میں کوئی خیر ہے یعنی حق کی طلب ہے، تو انہیں سنا دیتا، یعنی ایسے سننے کی توفیق دیتا جو سننا اعتقاد کے ساتھ ہو، اور یہ سننا ان کے لیے فائدہ مند بن جاتا، اور چونکہ ان میں طلبِ حق نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ ان کو سنائے تو روگردانی کریں گے، اور دوسری طرف رُخ کر کے چل دیں گے۔ بات یہ ہے کہ جب طلب نہیں ہوتی تو کانوں میں

پڑنے والی بات اثر نہیں کرتی، اور ساری سنی ان سنی کے برابر ہوجاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم حکم مانو اللہ تعالیٰ کا اور رسول کا، جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائے جو تمہیں زندہ کرتی ہے، اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ حائل ہوجاتا ہے آدمی کے اور اس کے دل کے درمیان، اور بیشک تم اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جمع کئے جاؤ گے ﴿۲۴﴾

معارف ومنازل

تفسیر روح البیان میں ہے کہ انسان اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے سب جانوروں سے افضل واعلیٰ ہے، اسی وجہ سے وہ اَشْرَفُ الْمَخْلُوْقَات کے لقب سے ممتاز ہے، اور فرشتوں سے درجہ میں کم ہے، لیکن جب وہ اپنی سعی وعمل اور اطاعتِ الٰہی واتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں متواتر جدوجہد کرتا ہے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ واشرف ہوجاتا ہے، اور اگر اس نے اِطاعتِ حق واتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوتاہی کی، اور حق سے روگردانی کی، خواہشات کا بندہ بن گیا، تو پھر وہ اَسفل سافلین کی نذر ہوجاتا ہے، اور بدترین جانوروں سے بھی زیادہ بدتر ہوجاتا ہے، پس وہ مُردوں میں شمار ہوگا، اور ابدی زندگی سے محروم رہے گا۔

اس آیت کریمہ میں اسے حکم ہے کہ وہ اطاعتِ حق کرکے ابدی زندگی حاصل کرے، اور خوب روحانی ترقی کرے، تو فرمایا: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو بجالاؤ، جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندہ کرتی ہے (یہ قید اتفاقی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم تمہاری حیات کا سبب اور علّت ہے)۔ فرمایا کہ وہ تمہیں ہر ایک ایسی چیز کی طرف بلاتے ہیں جس میں تمہاری حیات اور زندگی ہے، اس سے حقیقی زندگی مراد ہے، اور وہ ایمان واعمالِ صالحہ والی زندگی ہے، جس سے دنیوی زندگی بھی زندگی بن جاتی ہے، اور آخرت کی ابدی زندگی سعادتوں والی بن جاتی ہے۔

کفر کے ساتھ زندگی دراصل کوئی زندگی نہیں، زندگی اپنے خالق ومالک وآقا کی وفاداری واطاعت کا نام

ہے، اور جو اپنے ربّ سے غافل و بیگانہ ہے وہ زندہ نہیں ہے۔ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ رَبَّہٗ وَالَّذِیْ لَایَذْکُرُ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ۔ [مشکوۃ ص: ۱۹۶ عن البخاري]

مثال اس شخص کی جو اپنے ربّ کو یاد کرتا ہے، اور جو اپنے ربّ کو یاد نہیں کرتا مُردہ اور زندہ کی سی ہے، جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے وہ زندہ ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہے وہ مُردہ ہے، حیاتِ ابدی کے لیے ایمان شرط ہے، اور اعمالِ صالحہ سے ایمان میں نورانیت پیدا ہوتی ہے، اور اس میں ترقی آجاتی ہے، اور اعمالِ صالحہ رفعِ درجات کے حقیقی اسباب ہی تو ہیں۔ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ﴾ [العنکبوت: ۶۴] (بیشک دارِ آخرت ہی اصلی اور ابدی زندگی ہے)۔ اور کافروں کے متعلق فرمایا: ﴿ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی﴾ [الأعلیٰ: ۱۳] (کافر اس میں نہ زندہ رہے گا، اور نہ مرے گا)۔

امام ترمذی اور نسائی نے بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ایک دن حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کو بلایا، اُس وقت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز میں تھے، نماز جلدی پوری کر کے حاضرِ خدمت ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پکارنے پر کیوں آنے میں دیر لگائی؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نماز میں تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے رَبّ العزّت سبحانہ کا یہ ارشادِ گرامی نہیں سنا: ﴿اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ﴾؟ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آئندہ اس کی اطاعت کروں گا، اگر آپ بحالتِ نماز مجھے بلائیں گے میں حاضر ہوجاؤں گا۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کتاب التفسیر کے شروع میں ابو سعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

فقہاءِ کرام نے اس سے یہی مسئلہ اخذ کیا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ کے بلانے پر نماز چھوڑ کر آپ ﷺ کے حکم پر لبیک کہنا چاہئے، بلکہ انہوں نے والدین کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر والدین اپنی اولاد کو بلائیں، اور وہ نمازِ نفل میں ہو، تو چاہئے کہ نماز قطع کر کے حاضر ہوں، اور یہی حکم عورت (زوجہ) کے لیے بھی ہے، اگر اسے شوہر بلائے۔ تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھیں۔

پھر فرمایا: بندہ اور اس کے قلب کے درمیان، اس جملہ کے تین معنی ہو سکتے ہیں، اور تینوں میں عظیم حکمت و موعظت پائی جاتی ہے، جو کارآمد اور واجب الاتباع ہیں: اوّل یہ کہ جب کسی نیک کام کے کرنے یا کسی گناہ سے بچنے کا موقع آجائے تو وہ کام فوراً کرلو، کسی آئندہ زمانہ کے لیے مت چھوڑو، کیونکہ انسان کا قلبی ارادہ اس کے اختیار میں

نہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ ارادہ آئندہ بدل جائے، اور قضاءِ الٰہی درمیان میں آ کر تمہارے ارادے کو بدل دے، اور وہ کام تم سے رہ جائے، یا کوئی بیماری یا موت یا اور کوئی مشغلہ پیش آجائے کہ اس کام کے لیے فرصت نہ ملے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ سے نہایت قریب ہے، اتنا کہ اس کے دل سے بھی قریب ہے، اور اس کے دل اور ارادہ کے درمیان حائل ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر وقت دنیا اور اس کی راحتوں اور لذتوں میں محو ہو کر ربّ العزّت سے اور اس کے حکموں سے دور ہوجاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کے قلبی خیالات کو تبدیل کر کے اسے راہِ راست پر ڈال دیتا ہے، بشرطیکہ غفلت کے اندر اندر اسے ہدایت کی طلب ہو۔ وَاللہُ أعلمُ

مطلب سب کا یہی ایک بات ہے کہ فرصت کو غنیمت سمجھ کر نیکیوں میں دیر نہ لگاؤ، اور اوّلین فرصت میں اعمالِ صالحہ کی تعمیل کرو، ہوسکتا ہے آئندہ یہ جذبہ باقی نہ رہے، کیونکہ قلوبِ بنی آدم رحمٰن جل شانہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں مختلف حالتوں میں پھیر دیتا ہے۔ [مشکوۃ، ترمذي]

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۵

ترجمہ: اور تم ایسے فتنہ سے بچو جو خاص کر انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے گناہوں کے مرتکب ہوئے، اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ جل شانہ ہر قسم کے ظلم اور بے رحمی سے منزّہ اور پاک ہے، ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النساء: ۴۰] (بیشک اللہ تعالیٰ شانہ ذرّہ بھر ظلم وبے انصافی بھی نہیں کرتا)۔ جب اس کے بندے آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں، یا اس کے احکام وفرامین کی خلاف ورزی کرتے ہیں، تو ایک حد تک وہ درگزر فرماتے ہیں، اور انہیں سُدھرنے اور توبہ کا موقع دیدیتے ہیں، لیکن جب معاصی حد سے بڑھ جاتے ہیں تو ان پر عذاب کا فیصلہ فرماتے ہیں، یہ عذاب بندوں کے اعمالِ بد کا نتیجہ ہوتا ہے، جو کبھی انفرادی شکل میں، کبھی اجتماعی صورت میں، کبھی خصوصی اور کبھی عمومی شکل میں نازل ہوتا ہے۔

فرمایا: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ﴾ [الشوریٰ:۳۰] (یعنی جو پڑے تم پر مصیبت اور سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا تمہارے ہاتھوں نے، اور اللہ تعالیٰ معاف کرتا ہے بہت سے گناہ) جن کی سزا نہیں دیتا۔

اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا کہ گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جو فتنہ یعنی عذاب اور وبال آتا ہے وہ صرف انہی لوگوں پر نہیں آتا اور ان تک محدود نہیں رہتا جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا، بلکہ دوسرے لوگ بھی اس میں مبتلا ہوجاتے ہیں، جنہوں نے گناہ نہیں کیا، عذاب جنگل کی آگ کی طرح تر وخشک سب کو فنا کرتا ہے۔

وہ گناہ کونسا ہے؟ اس میں علماءِ تفسیر کے متعدد اقوال ہیں، اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ گناہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دینا ہے، جب گناہگاروں پر عذاب آتا ہے تو وہ لوگ بھی اس میں مبتلا ہوجاتے ہیں جو ان گناہوں کے مرتکب نہیں، جن کی وجہ سے عذاب آیا، چونکہ ان بے گناہ لوگوں نے اَمرِ بِالْمَعْرُوف وَنَهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ کا فریضہ ترک کیا، اور اپنی نیکیوں میں لگے رہے، اور گناہگاروں کو گناہ سے نہیں روکا، اس لیے وہ عذاب میں اسی طرح مبتلا ہوئے جیسے اصلی مجرم مبتلا رہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس کا حکم دیا ہے کہ کسی جرم وگناہ کو اپنے ماحول میں قائم نہ رہنے دیں، کیونکہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا، یعنی جرم وگناہ دیکھتے ہوئے باوجودِ قدرت کے اس سے منع نہ کیا تو یہ بھی مجرم ٹھہرے، تو اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام کردیں گے، جس سے نہ گناہگار بچیں گے، نہ بے گناہ، اور بے گناہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اصل گناہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں، مگر اَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ کے ترک کردینے کے گناہگار وہ بھی ہوجائیں گے۔

اس لیے یہاں یہ شبہ نہیں ہوگا کہ ایک طبقہ کے گناہ کا عذاب دوسروں پر ڈالنا بے انصافی ہے، اور قرآنی فیصلہ: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [الإسراء:۱۵] (اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) کے خلاف ہے، کیونکہ یہاں گناہگار اپنے اصل گناہ کے وبال میں اور بے گناہ امر بالمعروف کے ترک کے گناہ میں پکڑے گئے، کسی کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالا گیا، صرف نوعیتِ گناہ میں فرق رہا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم التنزیل میں اس روایت کو دیگر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی نقل کیا ہے، مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود وغیرہ رضی اللہ عنہم سے۔ اور ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ

منقول ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ میں نے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں، اور ظلم سے اس کا ہاتھ نہ روکیں، تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنا عذاب عام کردیں۔

اور صحیح بخاری میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود توڑنے والے گناہگار ہیں، اور جو لوگ انہیں دیکھ کر مداہنت کرنے والے ہیں اور باوجود قدرت رکھنے کے انہیں منع نہیں کرتے، نہیں روکتے، ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں اور نیچے کے طبقہ والے اوپر جاکر اپنی ضرورت کے لیے پانی لیتے ہوں، جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں، نیچے والے یہ دیکھ کر یہ صورت اختیار کریں کہ جہاز کے نچلے حصّہ میں سوراخ کرکے اس سے اپنے لیے پانی حاصل کریں، اور اوپر کے لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھیں اور انہیں منع نہ کریں، تو ظاہر ہے کہ نیچے سے دریا کا پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا، اور جب نیچے والے غرق ہوجائیں گے تو اوپر والے بھی ساتھ ڈوب جائیں گے۔ [بخاري]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ربّ العزّت سبحانہ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ فلاں شہر کو اس کے رہنے والوں سمیت الٹ دو، تباہ کردو، جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے ربّ! بلاشبہ ان لوگوں میں آپ کا ایک ایسا نیک بندہ ہے جس نے کبھی پل جھپکنے کے برابر بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی، کیا اس کو بھی عذاب میں شامل کیا جائے؟ اللہ تعالیٰ سبحانہ کا فرمان ہوا کہ اس شہر کو اس شخص پر اور بستی والوں پر الٹ دو، کیونکہ میرے بارے میں اس کے چہرہ میں کبھی تغیّر اور پریشانی نہیں آئی۔ [مشکوۃ:۴۳۸ ج ۲]

یعنی یہ شخص زبان سے اور ہاتھ سے تو لوگوں کو گناہوں سے کیا روکتا، اس کے چہرے پر گناہوں کو دیکھ کر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا، تو سب کے ساتھ اس کی ہلاکت کا فیصلہ کرلو۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ عنقریب اللہ تعالیٰ تم پر اپنے پاس سے عذاب بھیج دے گا، پھر اس سے دعا مانگو گے (تم اور تمہارے اچھے دیندار لوگ) اور وہ قبول نہیں فرمائے گا۔ [ترمذي]

بعض حضرات نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس میں اس فتنہ کا ذکر ہے، جو ترکِ جہاد کی وجہ سے عوام وخواص سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دین اور شعائرِ دین کی حفاظت اور عامۃ

المسلمین کی حفاظت جہاد قائم رکھنے میں ہے، مسلمانوں پر فرضِ کفایہ ہے کہ وہ ہر لمحہ جہاد ہی کرتے رہیں، اگر چہ کافر حملہ آور نہ ہوں، اور اگر وہ حملہ آور ہوں تو پھر کوئی گنجائش کسی کو جہاد سے پیچھے ہٹنے کی ہے ہی نہیں۔ جہاد کا سلسلہ جاری نہ رکھنے کی ہی وجہ سے دشمن کو آگے بڑھنے کی جرأت ہوتی ہے، اور جب دشمن چڑھ آتے ہیں تو بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں کی حفاظت کے لیے فکرمند ہونا پڑتا ہے۔

سقوطِ اندلس، غرناطہ، سقوطِ دہلی، سقوطِ بغداد اور سقوطِ ثمر قند، تاشقند و بخارا، اور سقوطِ کابل سب کا سانحہ ہمارے سامنے ہے، اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مسلمان جہاد جیسے فریضہ کو ترک کر کے تن آسانی اور عیاشی میں غرق ہو گئے، جس کا نتیجہ ہماری نظروں کے سامنے نہایت خوفناک اور ہولناک صورت میں ظاہر ہوا۔ اگر جہاد کا عمل جاری ہوتا تو مختلف محاذوں پر ہمیں یہ روزِ بد دیکھنے کی زحمت نہ ہوتی۔

عیسائیت و یہودیت شیطان کے ساتھ اتحاد و مصالحت سے نہیں شرماتے، بلکہ ابلیس کے ساتھ انہوں نے صلح کر بھی لی ہے، مگر مسلمانوں کے ساتھ اور اسلام کے ساتھ کسی قیمت پر صلح کرنے کیلئے تیار نہیں، جہادِ مقدس کو دہشت گردی کا نام دے کر پورے عالم میں واویلا کر رہے ہیں، دراصل انہیں اسلام کے ہر حکمِ شرعی سے چڑ ہے، مگر سب سے زیادہ جہاد سے، وہ جب جہاد کا نام سنتے ہیں تو بڑے بے قرار ہوتے ہیں، اور ان کے محلات میں آگ لگ جاتی ہے۔

ستم ظریفی یہ کہ پورا اسلامی بلاک اور مسلمان حکمران بھی ان کی تقلید میں بھی جہاد کو دہشت گردی کا نام دے کر مجاہدینِ اسلام کے دشمن بنے ہوئے ہیں، مگر ربّ العزّت نے تکوینی طور پر انہیں اتنا بزدل اور خوفزدہ بنایا ہوا ہے کہ ہاتھی کی طاقت رکھنے کے باوجود چیونٹی نے انہیں ایسا سبق سکھایا ہے کہ ان کی نیند اڑ گئی ہے۔ اگر مسلمان حکمران اپنے دینِ سماوی پر کاربند اور پختہ ایمان رکھے ہوئے ہوتے آج دنیا کا یہ موجودہ نقشہ سراسر تبدیل ہو جاتا، اور ہر محاذ پر اسلام کی حکمرانی نظر آتی، مگر بدقسمتی سے ہمارے اپنے لوگ ان کے آلہ کار ایجنٹ بنے ہوئے ہیں۔

کچھ بدقسمت حکمران اور کچھ علماءِ سوء ان کی دنیا بنانے پر اپنا ایمان بیچ کر یورپ کی گیت گانے میں مصروف ہیں، چاہیئے تھا کہ ہم ربّ العزّت سبحانہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور غلامی کا دم بھر کر سچی اور حقیقی مسلمانی کا ثبوت پیش کرتے تو بہتر ہوتا۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے، یہ تمہیں وارننگ

ہے کہ ہوش کے ناخن لے لو، آخر بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی، ایک دن اچانک قصاب کی چُھری کے نیچے ضرور آئے گی، تمہارا ربّ گھات میں ہے، وہ تم سے ہرگز غافل نہیں رہ سکتا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب تم تھوڑے تھے زمین میں کمزور شمار کئے جاتے تھے، تم اس بات سے ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اُچک لیں، سو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ٹھکانہ دیا، اور اپنی مدد سے تم کو قوت دی، اور تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا کیں، تاکہ تم شکر گزار رہو ﴿۲۶﴾

معارف ومنازل

تذکیر باٰلآءِ اللہ کے سلسلہ میں تین عظیم نعمتوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو ان کی پچھلی خستہ حالی اور ضعف وکمزوری اور بے بسی کی یاددہانی کے ضمن میں ربّ العزّت سبحانہ اپنی عظیم ذرہ نوازیوں اور فضل وکرم کا احسان جتاتے ہوئے انہیں مزید فرمانبرداری واطاعت کی ترغیب دے رہے ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا کہ تم اپنا وہ وقت یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، ضعیف وکمزور بھی تھے، اور مکہ مکرمہ کی سرزمین میں تمہاری کچھ بھی حیثیت نہیں تھی، تمہیں ہر وقت اس بات کا ڈر لگا رہتا تھا کہ لوگ تمہیں اچک لیں گے، اور کفارِ مکہ تمہیں ختم کردیں گے، تمہاری جان ومال، عزّت وناموس سب کچھ غیر محفوظ تھی، تو اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اپنا فضل فرمایا، تمہاری دستگیری فرمائی کہ تمہیں مدینہ منورہ میں ٹھکانہ دیا، جہاں تمہیں پناہ اور جگہ بھی مل گئی، امن واطمینان بھی حاصل ہوا، دشمنوں سے حفاظت بھی مل گئی، اور مقامِ بدر میں جب دشمنوں سے تمہارا مقابلہ ہوا تو تم نے بے سروسامانی اور قلّت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نُصرت ومدد کے ساتھ اپنے سے تین گنا بڑے لشکر کو باوجود ان کی کثرت اور مسلح ہونے کے شکست دے کر ہمیشہ کے لیے انہیں مرعوب ورسوا کردیا، اور تمہیں پاکیزہ حلال چیزیں بھی، یعنی مالِ غنیمت اور دیگر طرح طرح کی نعمتوں سے مالامال فرمایا، تاکہ تم شکر گزار بنو۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۲۷﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ تعالیٰ کی اور رسول کی، اور نہ خیانت کرو اپنی آپس کی امانتوں میں، حالانکہ تم جانتے ہو۝۲۷

معارف ومنازل

خیانت بہت بڑا گناہ ہے:

قرآن کریم نے خیانت کی حُرمت اور اس کی مذمت کو مختلف مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، سورۂ نساء کی آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا﴾ [النساء:۵۸] (بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو) کے تحت تفصیل سے اس پر کلام ہو چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ابوسفیان کی مکہ سے روانگی ہوئی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتا دیا کہ ابوسفیان فلاں فلاں جگہ پر ہے، لہٰذا آپ اس کی طرف نکل کھڑے ہوں، اور اس بات کو پوشیدہ رکھیں، لیکن بعض منافقین نے ابوسفیان کو بذریعۂ خط اطلاع دی کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے قافلے پر حملہ آور ہونے کے لیے ارادہ کر رہے ہیں، لہٰذا تم اپنی حفاظت کے لیے انتظام کرو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [تفسیر درمنثور]

ایک اور روایت میں یوں ہے جو حضرت ابن شہاب زُہری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ بنو قریظہ جو یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا، انہوں نے جب معاہدہ کی خلاف ورزی کی، تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا محاصرہ فرمایا، یہ محاصرہ تقریباً بیس دن تک جاری رہا، یہودیوں نے کہا کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جو فیصلہ کریں ہمیں منظور ہے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ دیا کہ ان میں جو بالغ مرد ہیں اُن کو قتل کر دیا جائے، اور عورتوں بچوں کو قیدی بنا لیا جائے۔ ان کے اس فیصلہ کا علم حضرت ابولبابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہو گیا، جو یہودیوں کے حلیف تھے، انہوں نے جا کر یہودیوں کو اپنے گلے پر ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتا دیا کہ تمہارے بارے میں قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس پر آیت بالا کا نزول ہو گیا۔

ادھر حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو جب اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو سمجھ گئے کہ میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خیانت کی ہے، لہٰذا انہوں نے مسجد نبوی کے ایک ستون سے اپنے آپ کو باندھ دیا (وہ ستون ابھی بھی ہے جس پر لکھا ہوا ہے "أسطوانة أبو لبابة" اور کہنے لگے کہ میں نہ کچھ کھاؤں گا اور نہ کچھ پیوں گا، حتیٰ کہ

مرجاؤں، یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے۔ جب آنحضرت ﷺ کو اس کا علم ہوا تو فرمایا: اگر میرے پاس آجاتا تو میں اس کے لیے استغفار کر دیتا، اب جو اس نے خود ایسا کر لیا ہے تو میں اسی وقت چھوڑ سکتا ہوں جب اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے۔ سات دن تک انہوں نے نہ کھایا نہ پیا، یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر گر گئے، اس دوران ان کی بیوی اور لڑکی نگہداشت کرتی تھیں، انسانی حاجت کے وقت اور نماز کے وقت کھول دیتیں، اور فارغ ہونے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی تو لوگوں نے انہیں کھولنا چاہا، مگر انہوں نے کہا کہ جب تک آنحضرت ﷺ اپنے دستِ مبارک سے مجھے نہ کھولیں گے میں کھلنا پسند نہیں کروں گا، چنانچہ سرور عالم ﷺ نے انہیں اپنے دست مبارک سے کھول دیا۔ [روح المعاني مظهري وغيره]

بہر حال! آیت کریمہ کا سببِ نزول جو بھی ہو اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خیانت کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، اور اس کا عموم ہر قسم کی خیانت کو شامل ہے، اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ فرائض کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی خیانت نہ کرو، اور سنتوں کو چھوڑ کر رسول اکرم ﷺ کی خیانت نہ کرو۔ [در منثور، جلد دوم]

﴿ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ ﴾ ماقبل کی نہی پر عطف ہے، یعنی آپس میں اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو۔ پہلے حقوق اللہ میں خیانت سے روکا، ابھی حقوق العباد میں بھی حسبِ سابق خیانت سے منع فرمایا، پہلے گزر چکا ہے کہ خیانت منافق کا شیوہ اور علامت ہے، اس سے مؤمنینِ مخلصین کو بچنا ضروری ہے، اور خیانت میں حق تلفی کے علاوہ اسلامی معاشرے کے لیے بڑا نقصان ہے۔ اگر اس کی پوری تفصیل دیکھنی ہو تو سورۃ النساء کا مطالعہ کیا جائے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

ترجمہ: اور تم جان لو کہ بیشک تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ کے پاس بڑا اجر ہے ﴿۲۸﴾

معارف ومنازل

فتنہ کے معنی امتحان کے بھی آتے ہیں، اور عذاب کے بھی، اور ایسی چیزوں کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے جو کسی عذاب

کا سبب بنیں۔قرآن کریم کی مختلف آیتوں میں ان تینوں معانی کے لیے لفظِ فتنہ استعمال ہوا ہے، یہاں بھی تینوں معانی کی گنجائش ہے۔

بعض اوقات مال واولاد خود بھی انسان کے لیے دنیا میں وبالِ جان بن جاتے ہیں، اور ان کے سبب غفلت و معصیت میں مبتلا ہونے سے ان کا سببِ عذاب بن جانا تو بالکل ظاہر ہے۔اول معنی یہ ہے کہ مال واولاد کے ذریعہ تمہارا امتحان لینا مقصود ہے، کہ یہ چیزیں ہمارے انعامات ہیں، تم انعام لے کر شکر گزار اور اطاعت شعار بنتے ہو یا نافرماں وناشکرے۔

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مال اور اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا تو یہی مال واولاد تمہارے لیے عذاب بن جائیں گے۔بعض اوقات تو دنیا ہی میں یہ چیزیں انسان کو سخت مصیبتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں، اور دنیا ہی میں مال واولاد کو وہ عذاب محسوس کرنے لگتے ہیں ورنہ یہ تو لازمی ہے کہ دنیا میں جو مال اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کمایا گیا یا خرچ کیا گیا وہ مال ہی آخرت میں اس کے لیے سانپ بچھو اور آگ میں داغ دینے کا ذریعہ بن جائے گا، جیسا کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں اور بے شمار روایاتِ حدیث میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔

اور تیسرے معنی یہ کہ یہ چیزیں سببِ عذاب بن جائیں، یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جب یہ چیزیں اللہ تعالیٰ سے غفلت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کا سبب بنیں تو عذاب کا سبب بن گئیں، اور یہ بات بھی مسلّم ہے کہ اکثر سببِ کبر وغرور یہی دونوں چیزیں ہیں، جیسے اکثر وبیشتر مشاہدہ اس پر دلیل ہے۔

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ یعنی یہ بھی سمجھ لو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل میں مال واولاد کی محبت سے مغلوب نہ ہو اس کے لیے اللہ تعالیٰ شانہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے، کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ اجرِ عظیم ان لوگوں کے لیے ہے جو اس مال واولاد والے امتحان میں کامیاب ہیں۔وَبِاللّٰهِ التَّوفِیقُ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ
عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں فیصلہ والی چیز دے گا، اور

تمہارے گناہوں کا کفارہ فرمادے گا، اور تمہاری بخشش فرمادے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ﴿۲۹﴾

معارف ومنازل

فرقان سے مراد وہ چیز ہے جو حق وباطل میں فرق کرے۔ اس کے متعلق مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں: بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس سے نور اور بصیرتِ قلبی مراد ہے، جس سے تم حق وباطل میں تمیز کروگے، فراستِ مؤمن کا جو لفظ حدیث میں آیا ہے اس سے یہی قلبی بصیرت مراد ہے، جو کہ تمام نعمتوں کے لیے بمنزلہ سرچشمہ ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کی فراست سے ڈرو (آگاہ رہو) وہ اللہ تعالیٰ کے نور یعنی خداداد نورِ بصیرت سے دیکھتا ہے۔ [رواه البخاري في التاريخ، والترمذي عن أبي سعيد الخدري، والطبراني عن أبي أمامة، وابن عدي أيضًا عنه، وابن جرير الطبري عن ابن عمر]

دوسری حدیث ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خواہ مفتی تجھے فتویٰ دے چکے ہوں (مگر تو پھر بھی) اپنے دل سے فتویٰ طلب کر۔ [رواه البخاري في التاريخ عن وابصة بسندٍ حسنٍ] یہ قلبی فتویٰ ہر کس وناکس کو نہیں ہوتا، یہ اسی وقت ہوتا ہے جب قلب کا شیشہ صاف وشفاف ہو، جس میں کسی قسم کا گرد وغبار نہ ہو، اور نفس تمام بُری باتوں سے پاک ہوگیا ہو، اور قلب کی نفسانیت مکمل فناء ہوچکی ہو۔ صوفیا کرام کی اصطلاح میں اس کا نام کشفِ باطنی ہے، اور یہ مقام نفس مطمئنة کا ہے، یہ بہت اونچا مقام ہے، جس کی بنیاد زُہد وریاضت وغیرہ پر ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ فرقان سے مراد نُصرتِ الٰہی ہے، جس سے اہلِ حق اور باطل پرستوں میں فرق ہوجاتا ہے۔ اہلِ ایمان کو باعزّت اور اہلِ کفر کو ذلیل کردیا جاتا ہے، جیسے غزوۂ بدر میں اس کا ظہور ہوگیا، اور غزوۂ بدر کو يَوْمُ الْفُرْقَان کا نام دیا گیا، یہ بات پہلے گزرچکی ہے۔

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یعنی اللہ تعالیٰ دونوں جہاں میں متقیوں کے لیے تمام خطرات اور ہولناکیوں سے بچاؤ کا راستہ بنادے گا۔ مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ دین میں شکوک وشبہات واقع ہونے سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتادے گا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول اول الذکر تفسیر کے قریب ہے، جس میں فرقان سے بصیرتِ قلبی مراد لی گئی ہے۔ [مظهري]

اور بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسا غلبہ وقوّت عطا فرمائے گا جس سے تمہارے دین کی

چار دانگ عالم میں شہرت ہوگی، اور پوری دنیا میں تمہاری کامیابی کے تذکرے ہوں گے۔ [روح المعاني]

﴿وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا، اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔ امام بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت لکھی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کے تین رجسٹر (اعمال نامہ) سامنے لائے جائیں گے: ایک رجسٹر نیک اعمال کا، دوسرا رجسٹر گناہوں کا، اور تیسرے رجسٹر میں اللہ تعالیٰ جل شانہ کی نعمتوں کا اندراج ہوگا، جو اللہ تعالیٰ نے اس بندہ کو عنایت کی ہیں۔

پھر انعامات کے رجسٹر میں سے کسی حقیر ترین نعمت کو حکم ہوگا کہ تو اپنے مقابل کسی عملِ صالح کو وصول کرلے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس حقیر نعمت کا مقابلہ بندہ کے نیک عمل سے کیا جائے گا، تو اس نعمت کے مقابل تمام نیک اعمال بھی پورے نہ اتریں گے، نعمت کہے گی: تیری عزّت کی قسم میں نے تو پورے اعمال کو بھی اپنے مقابل نہیں پایا، نیک اعمال سب ختم ہوگئے، مگر تمام گناہ باقی ہیں، اور دوسری نعمتیں بھی موجود ہیں، اب اگر اللہ تعالیٰ کو کسی بندہ پر رحم کرنا مقصود ہوگا تو فرمائے گا: میرے بندے میں نے تیری نیکیاں دو چند کردیں، اور تیری بداعمالیاں معاف کردیں، اور تجھے اپنے انعام وبخشش سے سرفراز کیا، گویا نیک اعمال نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے انعام وکرم سے اور اس کی بے پناہ رحمت سے بندہ کی بخشش ہوجائے گی۔ [مظهري]

ظاہر ہے کہ بندہ کے نیک اعمال اگر چہ اس کی عمر پانچ سو سال ہو، اور پوری عمر اس نے نیکیاں ہی نیکیاں بجالائی ہوں، پھر بھی اس کی نیکیاں محدود ہوں گی، جبکہ اس پر اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کی جو بارش کی ہے یہ غیر محدود اور بے شمار ہوں گی، جن کا حساب وشمار اور احاطہ نہیں ہوسکتا، پس کوئی بھی شخص یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی اپنی نیکیوں سے جنت میں نہیں جائیں گے۔ ہاں! اس کے کرم ورحمت ہی سے سارے جنتی جنت میں جائیں گے۔ یہی خلاصہ ہے صحیح احادیثِ نبوی کا۔ [متفق عليه]

بخاری ومسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ راستی اختیار کرو، اگر پوری راستی ممکن نہ ہو تو راستی کے قریب آجاؤ، اور بشارت پاؤ، کیونکہ تم میں سے کسی کے اعمال اس کو جنت میں لے جانے والے نہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں نہیں جائیں گے؟ فرمایا: ہاں! میں بھی بغیر اس کے کہ اللہ تعالیٰ شانہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔

[متفق علیہ]

آیت کریمہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال کے اجر کا جو وعدہ کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہارا تقویٰ موجبِ اجر ہے، بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم ہے کہ اس نے نیک اعمال کو نجات کا ذریعہ بنا دیا ہے، ورنہ تمام نیک اعمال تو اس قابل بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دنیوی احسانات کا بدلہ ہوسکیں، جیسے کوئی آقا صاحب کسی کام پر اپنے غلام کے لیے انعام مقرر کرے، یہ تو محض اس کی مہربانی ہے، ورنہ خدمت کی انجام دہی بغیر انعام کے اس غلام کا فریضہ ہے، اور اس پر ہر حال لازم ہے۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک عابد نے پانچ سو سال دریا کے کنارہ عبادت میں گزارے، ساری رات نماز پڑھتا رہا، اور پوری زندگی روزہ رکھا۔ وہاں ایک انار کا درخت تھا، روزانہ ایک انار تیار ہوتا تھا، جسے وہ تناول کر کے افطار کرتا تھا، جب اس کی وفات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے فضل وکرم سے جنت میں جاؤ، یہ بات اس پر گراں گزری کہ جنت مجھے فضل سے مل رہی ہے، میری پانچ سو سالہ ریاضتوں کی کوئی قیمت ہی نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کا منہ جہنم کی طرف پھیر دو، پس کیا ہوا کہ اس پر نا قابلِ برداشت پیاس کا حملہ ہوا، جس سے وہ نہایت بے قرار ہوکر تڑپنے لگا، فرشتہ کو حکم ہوا کہ ایک گلاس پانی کا اس کے سامنے ہاتھ میں لے کر اسے دکھاؤ، جب اس نے پانی دیکھا کہنے لگا: یہ مجھے پلاؤ، مَلَک نے کہا: اس کی قیمت ادا کرو تب یہ آپ کو ملے گا، وہ کہنے لگا: اس کی قیمت کیا ہے؟ فرشتہ نے کہا: پانچ سو سالوں کی عبادت، کہنے لگا: مجھے منظور ہے، میں نے دیدیئے، تب اسے پانی دلا کر پلایا۔ ایک ہی نعمت کے عوض پورا سرمایہ ہاتھ سے نکل گیا، اب سمجھ گئے، اور عرض کرنے لگے کہ: اے میرے پروردگار! مجھے خاص اپنے فضل سے جنت عطا کر۔ [در منثور]

اندازہ لگائیں! اللہ تعالیٰ کی ایک حقیر نعمت انسانوں کے پانچ سو سالہ نیکیوں کی قیمت سے بڑھ کر ہے، اور ایک نعمت پورا سرمایہ عمل کو کھا کر ختم کر سکتی ہے۔

وَاِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ ؕ وَیَمۡکُرُوۡنَ وَیَمۡکُرُ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اور جب کافر لوگ آپ کے بارے میں تدبیریں سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں، یا آپ کو قتل

کردیں، یا آپ کو جلا وطن کردیں، اور وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ بھی تدبیر فرما رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۞

معارف ومنازل

"مَکر" کے لغوی معنیٰ ہیں: کسی تدبیر سے دوسرے کو اس کے مقصد سے پھیر دینا۔ مکر کی دو قسمیں ہیں: اچھا اور برا۔ اگر اچھا فعل مقصود ہو تو اچھا مکر ہے، اگر بُرا فعل مقصود ہو تو بُرا مکر ہے، گویا مکر وتدبیر کی اچھائی اور بُرائی مقصد کی اچھائی اور برائی کے تابع ہے۔

اس کی نسبت اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف مجازی ہے، یا مجانست کے طور پر ہے، جیسے: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ:۴۰] (اور برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے) میں ہے۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے لوگ بُری سازشیں کر رہے تھے کہ سید کائنات محمد ﷺ کی دعوت ختم ہو جائے، اور دینِ الٰہی کا نور بجھ جائے، ﴿يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ﴾ [الصف:۸] (وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں)، اور اللہ تعالیٰ شانہ تدبیر فرما رہے تھے کہ کفار کے عزائم ناکارہ ہوں، اور دینِ الٰہی پورے عالَم میں اپنے انوار وبرکات کے ساتھ پھیل جائے، اور کفار مقہور ومغلوب ہو کر ناکام ونامراد وذلیل ہوں۔

کفار کے مکر کے تین پہلوؤں کا بیان، اور ان کی ناکامی

پہلا پہلو ﴿لِيُثْبِتُوْكَ﴾ تاکہ تم کو گرفتار کر کے قید وبند میں رکھیں۔

دوسرا پہلو ﴿اَوْ يَقْتُلُوْكَ﴾ یا تم کو سارے مل کر قتل وشہید کردیں۔

تیسرا پہلو ﴿اَوْ يُخْرِجُوْكَ﴾ یا تم کو وطنِ اصلی مکہ سے جلا وطن کردیں۔

پہلی رائے ابو البختری بن ہشام کی ہے، دوسری رائے ابو جہل بن ہشام نے پیش کی تھی، تیسری رائے ابو الاسود ہشام بن عمرو کی طرف سے منسوب ہے۔ شیخ نجدی ابلیس نے پہلی اور تیسری رائے کو مسترد کرتے ہوئے دوسری رائے کو سراہا اور منظور کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول ہے: عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ۔ میں نے اپنے ربّ کو اس علامت سے پہچانا کہ وہ انسانی عزائم وارادوں اور ان کی تدبیروں کو فسخ کر کے ناکارہ بنا دیتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عقبۂ اُولیٰ اور ثانیہ کے بعد جب مدینہ منورہ میں حضرات انصار رضی اللہ عنہم نے بڑی تعداد میں شوق ورغبت کے ساتھ اسلام قبول کیا، تو قریشِ مکہ خائف ہوگئے، اوران کی نینداڑ گئی، اور ان کا سکون تاراج ہوا، وہ مشورے کے لیے دار النّدوۃ (پنچائیت گھر) میں جمع ہوگئے، تا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں غور کریں کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو مزید ترقی و اشاعت سے کیسے اور کس طرح عام ہونے سے روکا جائے؟

اس موقع پر ابلیسِ لعین بھی ایک بوڑھے بڑے میاں کی صورت میں ظاہر ہوگیا، ان لوگوں نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ کہنے لگا کہ: میں علاقہ نجد کا شیخ اور نمائندہ ہوں، مجھے آپ لوگوں کے اس اجتماعی مشورہ کا پتہ چلا، تو میں نے چاہا کہ تمہارے پاس حاضر ہوجاؤں، اور اپنی خیر خواہانہ رائے سے تمہاری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کروں۔

لوگوں نے اس کو اپنے مشورے میں شریک کرلیا، مکہ والوں میں سے جو نامور بڑے بڑے لوگ حاضر تھے ان میں سے ایک شخص ابوالبختری بن ہشام نے رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کسی گھر میں محبوس اور قید کر کے دروازہ بند کردو، صرف چھوٹا روشندان کھلا رکھو، جس میں سے روزانہ دانہ پانی ڈالتے رہو، اور اس کی موت کا انتظار کرو، جیسے اس سے پہلے دوسرے شعراء ہلاک ہوگئے یہ بھی ہلاک ہوجائے گا۔

یہ سنتے ہی شیخ نجدی یعنی ابلیس چیخ اٹھا کہ یہ تدبیر سراسر غلط ہے، اور یہ بُری رائے ہے، اگر اس پر عمل کروگے تو اس کے ماننے والے میدان میں آجائیں گے، اور تم سے جنگ کر کے تمہارے ہاتھوں سے چھڑالیں گے۔ یہ سن کر سب کہنے لگے: شیخ نجدی نے صحیح کہا، یہ رائے مصلحت کے خلاف ہے۔

اس کے بعد ہشام بن عمرو نے رائے دی، اور کہا: میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ اس شخص کو کسی اونٹ پر بٹھا کر اپنے درمیان سے نکال دو، آگے کہاں جائے، کیا بنے تمہیں کوئی نقصان نہ ہوگا، جب تمہارے یہاں سے چلا گیا تمہیں تو آرام مل ہی جائے گا۔ یہ سن کر شیخ نجدی ملعون بولا کہ یہ رائے بھی صحیح نہیں، تم اس شخص کو جانتے ہو، تمہیں پتہ ہے کہ اس شخص کی گفتگو کتنی شیریں ہے، اور زبان میں کتنی مٹھاس ہے، اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس کی باتیں سن کر لوگ گرویدہ ہوجاتے ہیں، اللہ کی قسم اگر تم نے اس رائے پر عمل کیا تو باہر جا کر بہت سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے ایک فوج تیار کرے گا، اور تمہارے اوپر حملہ کر کے تمہیں وطن سے نکال باہر کرے گا۔ یہ سن کر سب نے کہا کہ شیخ نجدی نے صحیح کہا۔

ابوجہل کا مشورہ اور ابلیس لعین کی تائید:

اس کے بعد ابوجہل بولا اور کہنے لگا: اللہ کی قسم میں تمہیں ایک ایسی رائے دوں گا کہ اس کے علاوہ کوئی رائے ہے ہی نہیں، میری سمجھ میں تو یوں آتا ہے کہ قریش کے جتنے قبیلے ہیں ہر قبیلے میں سے ایک ایک طاقتور نوجوان لیا جائے، اور ہر ایک کو تلوار دیدی جائے، پھر یہ نوجوانوں کی جماعت یکبارگی مل کر اس کو قتل کر دیں، ایسا کرنے سے تمام قبیلوں پر اس کے خون کی ذمہ داری آجائے گی، اور میرے خیال میں بنی ہاشم قصاص لینے کے لیے کوئی مقابلہ نہ کر سکیں گے، اور تمام قبیلوں سے لڑ بھی نہیں سکیں گے، لہٰذا مجبور ہو کر دیت قبول کر لیں گے، اور سارے قریش مل کر اس کی دیت ادا کر دیں گے۔

یہ سن کر ابلیس لعین نے کہا: اس جوان آدمی نے بہت صحیح رائے دی ہے، اور یہ شخص تم میں سب سے اچھی رائے رکھنے والا ہے، اس نے جو رائے دی ہے میرے خیال میں بھی اس کے علاوہ کوئی دوسری رائے درست نہیں، سب نے اسی پر اتفاق کر لیا، اور مجلس سے سب اٹھ کر چلے گئے، اور اس اتفاقی رائے پر عملی اقدام اور انتظام میں مصروف ہوئے۔

اس مشورہ میں جتنے لوگ شریک تھے سوائے تین آدمیوں کے دیگر تمام کے تمام جنگ بدر میں مارے گئے، اور جہنم رسید ہو گئے۔ البتہ ان میں سے جو تین آدمی زندہ بچ گئے تھے فتح مکہ کے دن وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، یہ ہیں: ابوسفیان بن حرب، جبیر بن مطعم، حکیم بن حزام رضی اللہ عنہم۔

حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر ہجرت پر روانگی:

ادھر تو یہ لوگ متفرق ہوئے، اور اُدھر حضرت جبریل علیہ السلام حاضرِ خدمت ہو گئے، اور سید کائنات عَلَیْهِ وعَلیٰ آلہ واصحابہ اَلْفُ اَلْفِ تَحِیَّةٍ وَّسَلَام کو کفارِ قریش کے عزائم اور مشورہ سے باخبر کر دیا، اور عرض کیا کہ آپ جس گھر میں رات گزارا کرتے ہیں اس رات کو وہاں قیام نہ کریں، ساتھ ہی انہوں نے مشرکین کے مشورہ اور ارادوں سے باخبر کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ رات گزارنے کا حکم دیا، اور یہ فرمایا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

اس کے بعد رات کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر ہجرت کے لیے روانہ ہو گئے، اور رفیقِ غار و رفیقِ مزار رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ سے غار ثور کی چوٹی پر جلوہ افروز ہو گئے، روانہ ہوتے وقت وہاں موجود قریشی نوجوانوں پر جو کہ سو کے قریب تھے

اور مسلح بھی تھے مٹھی بھر مٹی پھینک دی، جوان کے سروں پر پڑ گئی، اور آپ ﷺ سورت یٰس پڑھتے ہوئے ان کی صفوں کے اندر سے بخیر و عافیت آگے نکل گئے، اور راتوں رات غار ثور کی چوٹی پر پہنچ گئے۔

آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ چھوڑ دیا تھا، تا کہ وہ لوگوں کی امانتیں ان کو ادا کریں، جو آپ ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں، ہزاروں مخالفتوں کے باوجود لوگ دھڑا دھڑ اپنے اموال اور قیمتی اشیاء آپ ﷺ کے پاس بطورِ امانت رکھا کرتے تھے، دشمن بلکہ ہر قسم کے بدخواہ لوگوں کے دلوں میں آپ ﷺ کی امانتداری کا چرچا رہتا تھا۔

مشرکین کی ناکامی:

جب آپ ﷺ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ سے جبلِ ثور کی طرف روانہ ہوئے تو عالمِ اسباب کے قوانین کے تحت پوری طرح اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے یہود قوم کی گرفت سے بچانا تھا تو جبریل امین علیہ السلام کے کندھے پر بٹھا کر اوپر آسمان پر اٹھالیا، تو کیا آپ ﷺ کو جبریل علیہ السلام کے کندھوں پر اٹھا کر اشاروں میں مدینہ طیبہ نہیں پہنچا سکتا تھا؟ کیوں نہیں، یہ بہت ہی آسان تھا، یا یوں کہو کہ آصف بن برخیا جو ایک اُمتی ہے، پیغمبر نہیں، اسم اعظم پڑھ کر ملکۂ سبا کے بھاری بھرکم تخت کو آنکھوں کے اشاروں میں دو ہزار میل سے اٹھا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں لاسکتا ہے، تو کیا سید المرسلین ﷺ اسم اعظم کے ذریعہ اپنے رفیق کے ہمراہ اشاروں میں مدینہ طیبہ نہیں پہنچ سکتے تھے؟

مگر ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس لئے کہ دنیا دار الاسباب ہے، اس میں حق تعالیٰ شانہ کی ہزاروں مخفی حکمتیں مُضمر ہیں، اگر وہ چاہتا ہے تو اسی ہستی کو مختصر وقت میں معراج کرا سکتا ہے، تو اسے بُراق پر بٹھا کر ہجرت بھی کرا سکتا تھا، لیکن اس کی حکمتیں اس طرح عجیب و غریب ہیں کہ ایسا نہیں کیا۔

جب آپ ﷺ غار میں پہنچ کر استراحت فرماتے ہیں تو ضعیف ترین مخلوق کبوتروں کو حکم ہوتا ہے کہ غار کے دروازے پر انڈے جمع کرو، اور مکڑی کو حکم ہوتا ہے کہ جلدی غار پر خوبصورت جال بچھا دو، یہاں سے دنیا والوں کو سبق پڑھانا ہی تھا کہ دین کا تحفظ بڑی اور طاقتور مخلوق سے نہیں ہوتا، بلکہ کمزور و ناتواں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

آج بھی یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے ہے کہ اسلام اور کتاب و سنت کے تحفظ کا کام بادشاہ، صدور، وزراء اور سرمایہ داروں سے نہیں ہوا، بلکہ مسجدوں، مدارس، خانقاہوں کے مفلوک الحال بے سہارا علماء و مشائخ اور

غریب طلباء کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ فَطُوْبیٰ لِلْغُرَبَاء

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستان سلامت گر تو خنجر آزمائی

جب دشمن غار پر پہنچ گئے تو دیکھا کہ غار کے منہ پر مکڑی نے ایک خوبصورت جالا بُن رکھا ہے، اور کبوتر نے انڈے دیئے ہیں، یہ دیکھ کر حیران رہ گئے، اور کہنے لگے کہ اگر اس کے اندر گئے ہوتے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہوتا، اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا، لہٰذا یہاں نہیں آئے۔ پوری تفصیل کتبِ سیرت میں دیکھیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۱﴾
وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ
اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: اور جب اُن پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اس جیسا کلام کہہ سکتے ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہے، مگر وہ باتیں ہیں جو اگلے وقتوں کے لوگوں سے نقل ہوتی چلی آ رہی ہیں ﴿۳۱﴾ اور جب ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ آپ کی طرف سے واقعی حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دیجئے، یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دیجئے ﴿۳۲﴾ اور اللہ تعالیٰ انہیں اس حالت میں عذاب نہیں دے گا جب کہ آپ ان میں موجود ہوں، اور اللہ تعالیٰ انہیں اس حال میں عذاب نہیں دے گا کہ وہ استغفار کرتے ہوں ﴿۳۳﴾

معارف ومنازل

قبیلہ بنی عبد الدار میں سے ایک نہایت شقی بد بخت نضر بن الحارث تھا، یہ شخص سرور عالم ﷺ کا کثرت سے مذاق اڑاتا تھا، اور شدید مخالفین میں شمار ہوتا تھا۔ مشرکین مکہ قرآن مجید سنتے تھے، اور اس کے مقابلہ میں کوئی ایک آیت لانے سے بھی عاجز تھے، قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت نے انہیں اتنا شرمندہ کیا ہوا تھا کہ وہ قرآنی چیلنج کا نام سن کر کانپ جاتے تھے، کسی مختصر سورت (سورت کوثر) کی نظیر لانے سے عاجز رہ گئے تھے، لیکن نضر بن الحارث زبانی دعویٰ کا سہارا لے کر پاگلوں کی طرح مجلسوں میں بیٹھ کر لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرتا تھا کہ میں بھی قرآن کریم جیسا کلام بنا سکتا ہوں۔

﴿لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا﴾ اگر ہم چاہیں تو ایسا کلام بنا کر پیش کر دیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہم قرآن کی نظیر لانے سے عاجز اور بے بس نہیں، مگر کہتے نہیں، کیونکہ ہمیں کوئی مجبوری نہیں کہ ہم خواہ مخواہ مقابلہ کریں، اور وہ مزید یہ بھی کہا کرتا تھا:

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ کہ یہ جو حضرت محمد ﷺ سناتے ہیں یہ پہلے لوگوں کی باتیں اور ان کی کہانیاں اور قصے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کلام نہیں ہیں کہ ہمارے اوپر ایمان لانا ضروری ہو۔ نضر بن الحارث کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اسی قسم کی باتیں کہا کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾[الأنعام: ٢٥] (یہاں تک کہ جب تمہارے پاس جھگڑا کرنے کے لیے آتے ہیں تو یہ کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) پچھلی نسلوں کی داستانوں کے سوا کچھ نہیں)۔

یہ جو کچھ کہا کرتے تھے محض شرارت اور عناد کی وجہ سے، درحقیقت وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ اُمی (ناخواندہ) ہیں، انہوں نے نہ کسی سے کچھ سیکھا ہے، نہ کسی استاذ یا کتاب تک ان کی رسائی ہوئی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کاغذ پر ان کا نام لکھا ہوا ہو وہ اتنا نہیں جانتے کہ یہ میرا نام ہے، مگر عناد و بغض کی بنیاد پر وہ یہی کہتے تھے کہ پہلے لوگوں کے قصوں کو پڑھ کر ہمیں سناتے ہیں، ان جیسے قصے ہم بھی جمع کر کے لوگوں کو سنا سکتے ہیں۔

نضر بن الحارث کا عذاب کے لیے دعا کرنا:

نضر بن الحارث نے جب یہ کہا کہ یہ پہلے لوگوں کے تاریخی واقعات اور قصے بیان کرتے ہیں، تو حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ تو اللہ تعالیٰ سے ڈر! حضرت محمد ﷺ حق فرماتے ہیں، اس پر اس نے کہا کہ میں بھی حق کہتا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ محمد ﷺ تو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں، وہ کہنے لگا کہ میں بھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہوں، لیکن یہ بُت اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (العیاذ باللہ)۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ہم بھی مانتے ہیں، اور یہ بت اسی کے پیدا کردہ اور اس کی بیٹیاں یعنی مخلوق ہیں، ہم انہیں مستقل خدا نہیں مانتے ہیں، ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾[الزمر: ٣] (ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں)۔

پھر اس ملعون نے بارگاہِ خداوندی میں یوں دعا کی: اے اللہ! اگر یہ دین جس کی دعوت محمد (ﷺ) دیتے

ہیں حق ہے، اور تیری طرف سے ہے، تو اسے قبول نہ کرنے کی سزا میں ہم پر یعنی قریش پر آسمان سے قومِ لوط کی طرح پتھر برسا دے، یا اور کوئی دردناک عذاب بھیج دے۔ اپنے خیال میں اس نے یہ بات ظاہر کرنے کے لیے کہی تھی کہ اگر دین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حق ہوتا تو ہم پر پتھر برس جاتے، اور عذاب نازل ہو جاتا، جب یہ بات نہیں ہے تو ہم ہی حق پر ہیں۔

اس طرح کی بات یہود نے بھی کہی تھی، سورۂ مجادلہ میں ان کا قول نقل فرمایا ہے: ﴿لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ﴾ [المجادلة:٨] (جو باتیں ہم کرتے ہیں ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟)۔ چنانچہ ہمارے موجودہ زمانہ میں بھی بعض بازیگر فتنہ پرداز لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں، اور اہلِ حق کے مقابلہ میں آجاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر ہم جھوٹے ہیں تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آجاتا؟ یاد رہے! یہ عذاب آنا نہ آنا حق اور ناحق واضح ہونے کی دلیل نہیں ہے، دلائلِ قرآنیہ اور دلائلِ عقلیہ سے حق واضح ہو جاتا ہے، اور تدبیر و تفکر کے ساتھ، بشرطیکہ ہٹ دھرمی اور ضد و عناد نہ ہو، تب بھی سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کسی کا پابند نہیں کہ کوئی عذاب کا مطالبہ کرے تو عذاب فوراً بھیج دے، اور کوئی قیامت برپا کرنے کا مطالبہ کرے تو قیامت فوراً برپا کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ عذاب مشرکین کے لیے اٹل ہے، اور اسی طرح قیامت بھی، مگر ہر چیز کا وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں جو مقرر ہے، وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ممکن نہیں۔ کبھی عذاب مانگنے والوں کی کسی حکمت کے تحت دعا قبول نہیں ہوتی، اور کبھی دعاء تو قبول ہو جاتی ہے مگر نوعیتِ عذاب اور وقتِ عذاب اللہ تعالیٰ کے منشاء اور مرضی کے مطابق اس کا دیر سے یا جلدی میں جیسی حکمت ہو ویسا ہی فیصلہ ہو جائے گا۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝١ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۝٢﴾ [المعارج] (ایک مانگنے والے نے وہ عذاب مانگا ہے جو کافروں پر آنے والا ہے، کوئی نہیں ہے جو اسے روک سکے) نضر بن الحارث کے سوال پر نازل ہوئی۔ حضرت عطا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نضر بن الحارث کی دعا قبول فرمائی، اور غزوۂ بدر میں اس کے اور طعیمہ بن عدی اور عقبہ بن ابی معیط تینوں کے سر قلم ہو گئے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آیت بالا ﴿اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ﴾ میں جو عذاب آنے کا مطالبہ ہے یہ سوال ابو جہل نے کیا تھا، چونکہ یہ سوال عمومی عذاب کا تھا، اسی لیے عمومی عذاب نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اگلی آیت نازل فرمائی جو یہ ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا، کیونکہ تکوینی قانون ہے کہ جس بستی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغمبر ہو اس پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں فرماتا جب تک مجرموں کے درمیان سے اپنے نبی کو نہ نکال لے۔ حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قوموں پر جب ہی عذاب آیا جب یہ حضرات بستیوں سے باہر جا چکے تھے۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ تھے، آپ کسی بستی میں موجود ہوں، اور آپ کی موجودگی میں عذاب آجائے یہ ناممکن ہے، اور کبھی نہیں ہو سکتا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں ہوں، اور وہاں عذاب آجائے یہ مشکل ہے۔ ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب وہاں سے نکلے، اور مدینہ طیبہ تشریف لائے، تو قریش کے سرداروں پر عذاب آگیا، جو میدانِ بدر میں جہنم رسید ہو گئے، اور یہ عذاب بھی جزوی رہا، عمومی اور استیصالی نہیں تھا، اور وہ بھی سرزمینِ مکہ سے باہر تھا۔

اکثر علماء کی تفسیر کا مدار اِس پر ہے کہ مانعِ عذاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکہ مکرمہ میں ہونا قرار دیا جائے، جبکہ بعض حضرات نے فرمایا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا میں وجود مانعِ عذاب ہے، جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف فرما ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر عمومی آسمانی عذاب نہیں آسکتا، اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح نہیں ہے کہ وہ خاص خاص مقامات اور مخصوص قبائل کی طرف مبعوث ہوتے تھے، جب وہاں سے نکل کر کسی دوسرے خطہ میں پہنچ گئے تو ان کی قوم پر عذاب آجاتا تھا۔

بخلاف سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہ آپ کی نبوت و رسالت سارے عالم (تمام روئے زمین) کے لیے ہے، اور قیامت تک کے لیے عمومی ہی ہے، پوری دنیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقامِ بعثت اور دائرۂ رسالت ہے، اس لیے جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے کسی بھی حصہ میں موجود ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم پر خواہ امتِ اِجابت ہو خواہ امتِ دعوت عمومی عذاب نہیں آسکتا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتِ اِجابت اور امتِ دعوت دونوں پر عذاب نہیں آسکتا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ عمومی عذاب جس سے پوری قوم تباہ ہو جائے ایسا عذاب نہیں آئے گا، اور مراد اس سے یہ ہے کہ جیسے قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، قومِ شعیب وغیرہ پر تباہ کن عذاب آیا کہ ان کا نام ونشان ہی مٹ گیا، حالانکہ ان کا سب سے بڑا گناہ شرک ہی تھا، اور شرک کے علاوہ دو تین بڑے گناہ ان میں ہوتے تھے، جبکہ آج اگر

بغور دیکھا جائے تو دنیا میں نفس اور شیطان کے ورغلانے سے جتنے بھی بلکہ سیکڑوں جرائم ایسے تباہ کن موجود ہیں کہ گزشتہ ہلاک شدہ اقوام نہ انہیں جانتے تھے، اور نہ ہی ان کا تصور کرتے تھے۔ اس وقت پورا عالم نیکیوں سے یکسر خالی اور بھیانک سے بھیانک گناہوں سے بھرا ہوا ہے، مگر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل کوئی عذاب عمومی نہیں آسکتا۔

ہاں! اگر افراد و آحاد پر کوئی جزوی عذاب آجائے تو وہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں خسف اور مسخ کا عذاب آئے گا، خسف کے معنی ہیں: زمین میں اتر جانا، ڈوب جانا، اور مسخ سے مراد شکل وصورت میں بگاڑ اور تبدیلی آنا، یہ قربِ قیامت کے ساتھ ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بھی اپنے روضۂ مقدس میں زندہ ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پورے جہاں کے لیے ہے، اور قیامِ قیامت تک کے لیے ہے، اور پورے عالم میں مسلمان وکافر سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی شمار ہیں، اور عمومی وتباہ کن آسمانی عذاب سے سبھی محفوظ ہیں، بمصداقِ آیت کریمہ:

﴿وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾ عذاب نہ آنے کی پہلی وجہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک امت کے نبی نے مایوس ہوکر بددعا نہیں کی تو عذاب نہیں آیا۔ سو نزولِ عذاب کیلئے نبی کی بددعا لازمی شرط ہے، جبکہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی بددعا سے اجتناب فرمایا، اسی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت واجابت پر قیامت تک عمومی آسمانی عذاب نہیں آئے گا۔

عذاب کا نزول نہیں ہونا:

شرک اور دیگر افعال کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان پر قومِ لوط کی طرح پتھروں کی بارش ہو، مگر دو چیزیں اس عذاب سے مانع ہوئیں: ایک سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف فرما ہونا، دوسرے اہلِ مکہ کا استغفار کرنا، کیونکہ یہ لوگ مشرک وکافر ہونے کے باوجود اپنے طواف بیت اللہ اور دیگر حالت میں بھی غُفْرَانَکَ غُفْرَانَکَ کہا کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتے تھے، ان کا یہ استغفار شرک کی وجہ سے گو کہ آخرت میں کارآمد نہیں، مگر اس کا نفع انہیں دنیا میں یہ مل گیا کہ نزولِ عذاب سے بچ گئے۔

اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا، کفار اگر دنیا میں کوئی کام اچھا انجام دیں تو اس کا بدلہ ان کو اسی دنیا میں دیا جاتا ہے، اس کے بعد انہیں تنبیہ ہے کہ وہ مطمئن نہ ہوں کہ جب دنیا کے عذاب سے محفوظ رہے شاید یہ ہمارے حق پر ہونے کی نشانی ہے، یا یہ کہ جب دنیا کے عذاب سے بچ گئے تو اسی طرح آخرت کے عذاب سے بھی شاید بچ

جائیں۔ آنے والی آیت میں ان دونوں باتوں کی تردید ہے، اور قیامت کے عذاب کا زور وشور سے اثبات فرما رہے ہیں، چنانچہ فرمایا:

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ
اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ
الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: اور ان کا کیا استحقاق ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہ دے؟ حالانکہ وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں، وہ اس کے اولیاء نہیں ہیں، اس کے اولیاء صرف متقی لوگ ہیں، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ﴿۳۴﴾ اور بیت اللہ کے نزدیک ان کی نماز بس یہی تھی کہ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے تھے سو عذاب چکھو اس وجہ سے کہ تم کفر کرتے تھے ﴿۳۵﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیتوں میں یہ بتلایا گیا تھا کہ مشرکینِ مکہ اپنے کفر وانکار کی وجہ سے اگرچہ اس کے مستحق ہیں کہ ان پر آسمانی عذاب آجائے، لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مسعود عام عذاب کے آنے سے مانع ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مکہ میں ضعفاء مسلمین کی وجہ سے ایسا عذاب نہیں آتا جو مکہ میں رہ کر اللہ تعالیٰ سبحانہ سے استغفار کرتے رہتے ہیں اور ہجرت پر قدرت نہیں رکھتے ہیں۔

اب مذکورہ آیات میں یہ بیان ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم یا ضعفاء مسلمین کی رعایت سے اگر دنیا میں مشرکین کا عذاب ٹل ہی گیا، تو ان لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ عذاب کے مستحق نہیں، بلکہ ان کا استحقاقِ عذاب بدستور کھلا ہوا ہے، اور علاوہ کفر وانکار کے اور بھی ان کے ایسے جرائم ونافرمانیاں ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ عذاب کے مستحق ہیں، اور چاہئے کہ ان پر عذاب کا نزول ہو، ان دونوں آیتوں میں ان کے تین جرم کا واضح بیان ہوا ہے۔

اول یہ کہ یہ لوگ خود تو مسجدِ حرام میں عبادت گزاری کے قابل ہی نہیں تھے، اور جو مسلمان وہاں عبادت نماز اور طواف وغیرہ ادا کرنا چاہتے ہیں یہ انہیں منع کر کے مسجد حرام میں آنے نہیں دیتے ہیں، اور بہت تنگ کرتے ہیں۔ اس میں واقعہ حُدیبیہ کی طرف اشارہ ہے۔ جب ۶ ھ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ ۱۵ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے تھے، اور مشرکینِ مکہ نے حدیبیہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روکا

تھا، اور بغیر ادائیگی عمرہ واپس جانے پر مجبور کیا تھا، اور آئندہ سال عمرۃ القضاء کے موقع پر صرف تین دن مکہ میں رہنے کے بعد وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔

دوسرا جرم ان کا یہ تھا کہ انہوں نے کعبہ شریف میں تین سو ساٹھ بت رکھ کر کعبۃ اللہ کی بے احترامی کی تھی، اور خود کو کعبۃ اللہ شریف کا متولی کہتے ہوئے اس کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم جس کو چاہیں مسجد حرام میں آنے دیں، اور جس کو چاہیں روک دیں، ہمیں ہر قسم کا اختیار حاصل ہے۔

ان کا یہ خیال دو غلط فہمیوں کا نتیجہ تھا: اول یہ کہ وہ مسجد حرام کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، دوئم یہ کہ اپنے آپ کو مسجد حرام کا متولی کہتے تھے، جبکہ ان کے یہ دونوں خیال غلط تھے، کیونکہ مسجد حرام سارے جہاں کے لوگوں کے لیے ہے، اور کفار کسی صورت میں اس کا متولی نہیں بن سکتے۔

تیسرا جرم ان کا یہ تھا کہ وہ جن غلط رویہ اور بُرے افعال اقوال کو عبادت کا نام دیتے تھے وہ نہایت قبیح اور گمراہی پر مبنی تھے، وہ مسجد حرام میں منہ سے سیٹیاں بجا کر اور ہاتھوں سے تالیاں پیٹ کر ناچتے تھے، اور اسے عبادت شمار کرتے ہوئے اسے نماز کا نام دیتے تھے، اور اس پر فخر بھی کرتے تھے۔ پس ان کافرانہ حرکتوں کی وجہ سے یہ لوگ واقعی عذاب کے مستحق تو ہیں، مگر عمومی عذاب جب نازل نہیں ہوگا تو جزوی عذاب سے یہ نہیں بچ سکیں گے، اور اُخروی عذاب تو بہر صورت ان کے لیے مقرر ہے، جسے کوئی نہ ٹال سکتا ہے، نہ منسوخ کر سکتا ہے۔ جزوی عذاب بدر کے روز انہیں دیا گیا۔

بعض علماء نے یہی کہا کہ جزوی عذاب جہاد بالسّیف کے ذریعہ انہیں تمام مواطن میں ملتا رہے گا۔ بعض علماء کے نزدیک پہلی آیت میں دنیوی عذاب کا ذکر ہے، اور دوسری آیت میں آخرت کے عذاب کا ذکر ہے۔ ﴿فَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾ سے یہی اُخروی عذاب ہی مراد ہوگا۔ پھر فرمایا:

﴿وَمَا كَانُوٓا اَوْلِيَآءَهٗ﴾ یہ لوگ ناپاک اور نجس ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ گھر کے متولی نہیں ہو سکتے، کعبہ شریف خالص توحید اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا گھر ہے، یہ لوگ کسی صورت میں اس کے متولی نہیں ہو سکتے، البتہ:

﴿اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ﴾ کہ مسجد حرام کے متولی وہی لوگ ہیں جو اہل تقویٰ ہیں، جو کفر و شرک سے بچتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فتح مکہ کے روز اہل تقویٰ نے مسجد حرام کو مشرکین کے تسلّط سے آزاد کر کے قیامت تک

اس کے متولی بن گئے، اور کفارِ مکہ کی ناجائز اور غیر اسلامی اور غیر اخلاقی سیٹیوں اور تالیوں اور ننگے ہو کر طوافوں اور بت و اوثان واصنام پرستیوں کا بِحَمْدِهٖ تَعَالٰی ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا، اور ﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ [الإسراء: ۸۱] (کہہ دیں کہ حق آ گیا، اور باطل مٹ گیا، بیشک باطل مٹنے والا ہی ہے) کا دور دورہ ہو گیا۔

فائدہ:

سید کائنات رحمۃ للعلمین ﷺ کے وجود مسعود اور آپ کی شفاعت اور دعاءِ مستجاب کی برکت سے اس امت پر کوئی عمومی آسمانی عذاب تو نہیں آئے گا، مگر زمینی عذاب اور جزوی عذاب لوگوں کے اعمالِ بد اور گناہوں کی وجہ سے ضرور آتے رہیں گے۔

ہمارے موجودہ زمانہ میں غیر شرعی معاشرہ اور بے دینی کے سبب جو عذاب آیا ہوا ہے یہ نہایت پریشان کن ہے، مثلاً یہ کہ پورے خطے میں بدامنی، قتل وغارت، چوری ڈاکے، بے انصافی، ظلم وزیادتی، حق تلفی، عصمت دری، بے حیائی، ہوشربا ناقابلِ برداشت مہنگائی، قحط سالی، غرض یہ کہ عام انسان اتنا مجبور اور غمزدہ پریشان ہے کہ اپنی زندگی سے بیزار اور تنگ ہے، یہ سارے زمینی اور ایک حد تک عمومی عذاب ہیں، پوری معیشت تباہ وبرباد ہے، پس توبہ و کثرتِ استغفار سے اگر آسمانی عذاب ٹل سکتا ہے تو زمینی عذاب بطریقِ اَولیٰ ٹل جاتا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ مشرکین نے کثرتِ استغفار سے آسمانی عذاب کو تو ٹال دیا، مگر آج کے غافل مسلمان کو کون استغفار پر آمادہ کرے؟ جو کبھی کسی قیمت پر استغفار کے لیے تیار نہیں، حالانکہ یہ استغفار اس کی تمام بیماریوں کا علاج ہے، اور پریشانیوں کا حل بھی ہے، پس چاہئے کہ اپنے اوپر رحم کرتے ہوئے ہم استغفار کو اپنا پیشہ بنائیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾

ترجمہ: بیشک جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکیں، سو یہ لوگ ابھی اپنے

مالوں کو خرچ کریں گے، پھر یہ مال ان کے حق میں حسرت کا سبب بن جائیں گے، پھر یہ لوگ مغلوب ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے ﴿۳۶﴾ تاکہ ناپاک کو اللہ تعالیٰ پاک سے جدا کردے، اور ناپاک کے بعض کو بعض کے ساتھ ملا دے، پھر اس کو اکٹھا ڈھیر بنا دے، پھر اس کو دوزخ میں داخل فرمادے، یہ لوگ تباہ کار ہیں ﴿۳۷﴾

معارف ومنازل

دینِ اسلام کے خلاف جو مال خرچ ہوگا وہ موجبِ حسرت ہوگا:

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر کے شکست خوردہ غمزدہ کفار جب واپس مکہ مکرمہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس معرکہ میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے لڑی گئی، جس کے نتیجے میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات ہوئے، پوری قوم کی گردن ندامت اور ذلت سے جھک گئی، اتنے بڑے دلخراش نقصانات قومِ قریش کی تاریخ میں نہیں دیکھے گئے تھے، اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے، تاکہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں۔

ابوسفیان نے ان کا مطالبہ منظور کردیا، اور انہیں بہت بھاری رقم دیدی، جسے انہوں نے آئندہ غزوۂ اُحد میں خرچ کیا، لیکن انجامِ کار اس میں بھی وہ مغلوب ہوئے، اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت میں ڈوب گئے۔

قرآن کریم نے اس آیت میں یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے ہی سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے انجام کی خبر دیدی، ارشاد فرمایا: وہ لوگ جو کافر ہیں، اپنے مالوں کو اس کام کے لیے خرچ کرنا چاہتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے روک دیں، سو اس کا انجام یہ ہوگا کہ یہ اپنا مال بھی خرچ کر ڈالیں گے، اور پھر ان کو مال خرچ کرنے پر حسرت ہوگی، اور انجامِ کار مغلوب ہوجائیں گے، چنانچہ ایک سال بعد غزوۂ اُحد میں ٹھیک یہی صورت پیش آئی کہ جمع شدہ مال بھی خرچ کر ڈالا، اور پھر مغلوب ہوئے تو شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع ہونے پر الگ ندامت وحسرت ہوئی۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بعض مفسرین نے اس آیت کے مضمون کو خود غزوۂ بدر کے اخراجات پر محمول فرمایا

ہے، کہ غزوۂ بدر میں ایک ہزار جوانوں کا جو لشکر مسلمانوں کے مقابلہ پر گیا تھا، ان کے کھانے پینے وغیرہ کے کل اخراجات مکہ کے بارہ سرداروں نے اپنے ذمہ لیے تھے، جن میں ابو جہل، عتبہ شیبہ، نضر، اُمیہ وغیرہ شامل تھے۔

ظاہر ہے کہ ایک ہزار آدمیوں کے آنے جانے، کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات پر بڑی رقم خرچ ہوئی، تقریباً یہ سفر ایک ماہ سے کچھ کم عرصہ جاری رہا، اور روزانہ دس اونٹ ذبح کر کے کھاتے رہے، تو ان لوگوں کو اپنی شکست وندامت اور شرمندگی کے ساتھ اپنے اموال ضائع ہونے پر بھی شدید حسرت وندامت پیش آئی۔ [مظهري]

آیت کے آخر میں:

﴿اِلٰی جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ﴾ فرما کر واضح کیا کہ ان کفار کا آخری انجام جہنم ہی ہوگا، جہاں یہ سارے جمع ہو کر عذاب میں جلتے رہیں گے۔

فائدہ:

مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ آیت کا سببِ نزول اگر چہ خاص ہے، مگر مضمون عام ہے، چنانچہ ہر زمانہ کے کفار کو یہ شامل ہے، اس میں آج کے کفار یہود ونصاریٰ اور دیگر تمام کافر اقوام داخل ہیں، جو لوگوں کو اسلام سے روکنے اور اپنے باطل دین کی طرف دعوت دینے پر کروڑوں روپیہ شفاخانوں، تعلیم گاہوں اور سڑکوں کی تعمیر، کھانے پینے کی اشیاء این.جی اُوز کے ذریعہ مالی امداد صدقہ وخیرات کے عنوان سے خرچ کرتے ہیں۔

اسی طرح وہ گمراہ لوگ بھی اس میں داخل ہیں جو اسلام کے مسلّم اجماعی عقائد میں شبہات وشکوک واَوہام پیدا کر کے ان کے خلاف لوگوں کو دعوت دینے کے لیے اپنے بہت سے مال خرچ کرتے ہیں، لیکن حق تعالیٰ اپنے دینِ اسلام کی حفاظت خود فرماتے ہیں، اور بہت سے مواقع میں مشاہدہ بھی ہوجاتا ہے کہ یہ لوگ اکثر اپنے مقصد میں ناکام ہوجاتے ہیں، اور ان کے بے شمار اموال رائیگاں اور ضائع ہوجاتے ہیں۔ اور وہ جن مقاصد میں مال خرچ کرتے ہیں ان کا وہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔

﴿لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ گندی ناپاک چیز اور پاک صاف چیز میں فرق ظاہر کر دیں۔ لفظ خبیث اور طیب دو متقابل لفظ ہیں۔ لفظِ خبیث ناپاک، گندے، اور حرام کے لیے بولا جاتا ہے، اور طیّب اس کے بالمقابل پاک، صاف ستھرے اور حلال کے لیے بولا جاتا ہے۔

اس جگہ ان دونوں لفظوں سے کفار کے اموالِ خبیثہ اور مسلمانوں کے اموالِ طیّبہ بھی مراد ہوسکتے ہیں، اس

صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کفار نے جو مالِ کثیر خرچ کیا وہ مال خبیث اور ناپاک تھا، ان کا بُرا نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ مال بھی گیا اور جانیں بھی گئیں۔

اس کے بالمقابل مسلمانوں نے بہت تھوڑا مال خرچ کیا، مگر وہ مال پاک اور حلال تھا، ان کے خرچ کرنے والے کامیاب ہوئے، اور مزید مالِ غنیمت بھی انہیں ہاتھ آئے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جمع کر دیتا ہے ایک خبیث کو دوسرے خبیث کے ساتھ، پھر ان سب کو جہنم میں جمع کر دے گا، یہی لوگ خسارے میں پڑنے والے ہیں ﴿٣٧﴾

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، اور کہربا گھاس کو کھینچتا ہے، اور موجودہ سائنس کے تجربات میں ساری دنیا کا نظام ہی باہمی کشش پر قائم ہے، اسی طرح اعمال واخلاق میں بھی کشش ہے، ایک بُرا عمل دوسرے بُرے عمل کو، اور ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کو کھینچتا ہے، اور مالِ خبیث دوسرے مالِ خبیث کو کھینچتا ہے، اور پھر یہ اموالِ خبیثہ آثارِ خبیثہ پیدا کرتے ہیں، اور نیک اعمال کی جو رغبت ہے اسے ختم کرتے ہیں۔

حرام رزق کھانے سے دیانت وتقویٰ کا مادہ دل سے اتر جاتا ہے، اور گناہوں اور معاصی کا شوق پیدا ہوتا ہے، پس یہ ساری بُرائیاں اپنے مُرتکب ہونے والوں کو ان کے ساتھ ملا کر جہنم میں پھینک دی جاتی ہیں، اسی کو حدیث شریف نے کہا: لَايَدْخُلَ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِيَ بِالْحَرَامِ۔ [مشکوۃ] جس بدن کی پرورش حرام کے ساتھ ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ فَالنَّارُ أَوْلَىٰ بِهِ۔ وہ جہنم کا حقدار ہوگا۔

بعض مفسرین کرام نے کہا ہے کہ پاک وطیب سے مراد مؤمن ہے، اور ناپاک وخبیث سے مراد کافر ہے، اور جنت پاکیزہ لوگوں کا ٹھکانا ہے، جبکہ جہنم ناپاک وخبیث لوگوں کا ٹھکانا ہوگا۔ مؤمن جنت میں جمع ہوں گے، اور کافر دوزخ میں۔

....

قُلْ لِّلَّذِينَ كَفَرُوٓا۟ إِن يَنتَهُوا۟ يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ وَإِن يَعُودُوا۟ فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣٨﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر کیا آپ ان سے فرما دیجئے: اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ گزر چکا وہ ان کے لیے معاف کر دیا جائے گا، اور وہ اگر پھر بھی وہی کریں جو کرتے رہے ہیں تو پہلے لوگوں کا طریقہ گزر چکا ہے ﴿٣٨﴾

معارف ومنازل

توبہ کا دروازہ کھلا ہے، اگر توبہ واستغفار اور گزشتہ اعمال پر ندامت ہو، اور ساتھ ان کا ترک بھی ہو، اور آئندہ نہ کرنے کا عزم ہو، تو بڑے سے بڑے مجرموں کے لیے معافی کی گنجائش ہے، اس لیے اس آیت میں ترغیب اور ترہیب ذکر فرما کر واضح فرمایا، اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ کافروں سے فرمادیں کہ اب تک جو تم کفر پر جمے رہے، اور اسلام کی دعوت کو روکنے کے لیے تدبیریں کرتے رہے، اور مسلمانوں سے جنگ بھی کرتے رہے، اگر ان سب بُرائیوں سے تائب ہو جاؤ، یعنی اسلام قبول کرلو تو وہ گزشتہ سب کچھ معاف کر دیا جائے گا جو اب تک کر چکے ہو۔

مشہور صحابی فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہونے سے پہلے اسلام کے بڑے دشمنوں میں سے تھے، انہوں نے حبشہ تک مہاجرین کا تعاقب کیا تھا، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں اس شرط پر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوتا ہوں کہ میرے پرانے تمام گناہوں کی مغفرت ہو جائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام ان سب گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اس سے پہلے تھے؟ اور بلاشبہ ہجرت بھی ان سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو اس سے پہلے تھے، اور حج ان گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اس سے پہلے تھے۔ [مسلم]

حدیث کے شارحین نے لکھا ہے کہ ہجرت اور حج سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں، اور کبیرہ گناہ اور حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، یہ بات دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ لطف وکرم ہے کہ کوئی شخص کیسا ہی دشمنِ اسلام ہو جب وہ اسلام قبول کرے اور شرعی خطوط پر سر رکھے، اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ کردی باز آ ☆ گر کافر وگبر وبت پرستی باز آ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست ☆ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

﴿وَإِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ﴾ اور اگر کافر اپنے کفر پر جمے رہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ پہلے لوگوں کو کفر وسرکشی کی وجہ سے جو جو سزائیں ملی ہیں وہ مقتول ومغلوب ہوئے ہیں، یا دیگر عذابوں میں تباہ ہوئے ہیں وہی سزائیں ان کو بھی ملیں گی، اور آخرت کا دائمی عذاب وہ تو ہر کافر کے لیے مقرر ہی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی قانون چلا آرہا ہے کہ اپنے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء ومتبعین کی مدد فرماتے رہیں گے، اور دشمنوں کو ہلاک فرماتے رہیں گے، اگر تم کفر سے باز نہ آئے تو اسی تکوینی قانون کے

مطابق تمہارا انجام بھی گزشتہ اقوام سے مختلف نہ ہوگا۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ ﴿٣٩﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٤٠﴾

ترجمہ: اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے، اور سارا دین اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے، سو اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کاموں کو دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں ﴿٣٩﴾ اور اگر وہ روگردانی کریں تو یقین جانو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارا مولیٰ ہے وہ اچھا مولیٰ ہے، اور اچھا مددگار ہے ﴿٤٠﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں چھ بنیادی اور اہم باتوں کا بیان ہے، جو کہ مسلّمات میں سے ہیں۔

☆ پہلی بات یہ ہے کہ کائنات کا خالق ومالک اور واحد حکمران صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

☆ دوسری بات یہ کہ جہاد کسی خونریزی کا نام نہیں، بلکہ ایک اصلاحی عمل ہے۔

☆ تیسری یہ کہ اسلام یعنی توحیدِ باری تعالیٰ مخلوقات کے لیے بمنزلہ صحت وتندرستی ہے۔

☆ چوتھی یہ کہ توحید کے علاوہ جو بھی نظریہ ہو وہ مخلوقات کے لیے بمنزلہ مرض و بیماری ہے۔

☆ پانچویں یہ کہ مرض کے علاج پر عقل ونقل دونوں کا اتفاق ہے کہ یہ ضروری اور لازمی ہے۔

☆ چھٹی یہ کہ مرض کا علاج وہی کرے گا جو مرض اور علاج سے مکمل باخبر و ماہر ہو۔

ان مقدماتِ ستہ کی تشریح اور واضح بیان:

ان مقدماتِ ستہ کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ پہلے ان کی مختصر تشریح ہو۔ اول یہ کہ دنیا کے حکمرانوں میں سے یہ کوئی نہیں چاہتا کہ میرے اقتدار کے قلمرو میں کوئی بغاوت یا قانون شکنی ہو، اگر اسے معلوم ہو کہ کسی قوم یا جماعت یا کسی فرد نے جان بوجھ قانون شکنی یا بغاوت کا ارتکاب کیا تو وہ اپنی مملکت کی صحت مند معاشرہ اور ماحول کے لیے اسے نقصان دہ اور ضرر رساں سمجھ کر پوری قوت کے ساتھ اسے کچلنے اور تہس نہس کرنے کی کوشش کرے گا، اور اس کے نزدیک اس مرض کے علاج کا ضروری اور واقعی علاج سوائے فوج کشی کے اور کچھ نہ ہوگا، اور وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ میرا

یہ اقدام ظالمانہ اور خونریزی نہیں، بلکہ اس کا واحد مقصد فتنہ وفساد کو ختم کرنا اور اصلاحی ماحول پیدا کرنا ہے۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اگر فسادی طبقہ اپنے فساد سے تائب ہو، اور سرکشی چھوڑ کر اصلاح پر آمادہ ہو، یا بصورتِ دیگر ان کا مکمل خاتمہ ہو، تو یہ فوج کشی کا عمل مسدود ہو کر بند ہوگا، کیونکہ مقصد مکمل حاصل ہوا۔

آیات بالا کا مطلب اسی وضاحتی تشریح کے ضمن میں سمجھنا چاہیے کہ کفر وشرک اور ان کی شاخیں، یعنی معاصی یہ سراسر فتنہ وفساد کی جڑ ہیں، اور ربّ العزّت سبحانہ سے بغاوت اور اس کی مملکت میں قانون شکنی کے مترادف ہیں، اور صحت مند معاشرہ کے لیے ضرر رساں اور نقصان دہ ہیں۔ اسی فتنہ وفساد کے دبانے اور قلع قمع کرنے کا نام جہاد ہے، جب جہاد کے ذریعہ یہ فتنہ دب جائے گا، اور بالکلیہ ختم ہو جائے گا، اور سارے جہاں میں اسلام اور امن وامان نافذ ہوگا، اور تمام تر بیماریاں ختم ہو جائیں گی، اور تندرست وصحت مند ماحول پیدا ہوگا، اسی بارے میں سید کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، فرمایا: اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ فَاِذَا قَالُوْهَا عَصِمُوْا مِنِّىْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ۔ [بخاري]

یعنی میں مامور ہوں کہ لوگوں کے ساتھ قتال وجہاد جاری رکھوں، یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کریں، اگر انہوں نے کلمہ کا اقرار کیا تو سمجھو کہ انہوں نے میری تلوار سے اپنے اہل وعیال اور اموال کی حفاظت کی۔ البتہ ان کے باطن اور قلبی احوال کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد رہے گا۔ [متفق عليه]

تو خلاصہ یہ ہے کہ اسلام دنیا میں خون بہانے اور انسانوں کو ذبح کرنے کے لیے یا ان کی آزادی سلب کرنے اور انہیں غلام بنانے کے لیے نہیں آیا، اسلام کا اصلی مقصد قانونِ الٰہی کی نشر واشاعت اور امن وسلامتی کا قیام ہے، تو اس لیے جس وقت بھی کفار اسلام کی مخالفت ترک کر دیں، صحیح صحت مند تعلیم دنیا میں رائج ہو جائے، اور قرآن کو اللہ تعالیٰ کا قانون تسلیم کیا جائے، اور توحیدِ الٰہی کو عام کیا جائے، ارکانِ اسلام کے ساتھ بغاوت ختم کی جائے، تو پھر تلوار کو نیام میں کر لیا جائے گا، اور فوج کشی کو موقوف رکھا جائے گا۔ تو فرمایا:

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ اگر کافر لوگ اپنے کفر سے باز آجائیں، اور اسلام قبول کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کاموں کو دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں، تمہیں شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے انہوں نے دھوکہ دینے کے لیے اسلام قبول کیا ہو، پھر بھی قتل کرتے چلے جاؤ، ایسا نہ کرنا، تم ظاہر کے مکلف ہو، قلوب کا حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اگر وہ دھوکہ دینے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے تمہاری حفاظت

فرمائے گا۔

صاحب مظہری فرماتے ہیں یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ اگر یہ کفار جنگ سے باز آجائیں خواہ مسلمان ہوکر یا ذمی بن کر، تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کی جزاء وسزا دے گا اللہ تعالیٰ خود ان کے اسلام وکفر اور اچھے برے اعمال کی جزا و سزا دے گا۔ یعقوب قراءت میں یَعْمَلُوْنَ کی جگہ تَعْمَلُوْنَ آیا ہے، اس صورت میں خطاب مسلمانوں کو ہوگا، یعنی اے مسلمانو! جیسا سلوک تم مسلمانوں سے کرتے ہو ویسا ہی برتاؤ تم ان سے کرو ان پر ظلم نہ کرو، بلاشبہ تمہارے اعمال کے موافق تم کو بدلہ ملے گا۔

حضرت صفوان بن سُلیم رحمۃ اللہ علیہ نے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے بیان کیا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خوب سن لو، جو کسی معاہد (ذمّی) پر ظلم کرے گا، یا اس کے حق میں کمی کرے گا، یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا، یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کچھ لے گا، تو قیامت کے روز اس کی طرف سے میں جھگڑا کرنے والا ہوں گا۔ [أبو داؤد] یہ مطلب دونوں صورتوں میں ہوسکتا ہے، باز رہنے سے مراد کفر سے باز رہنا ہو، یا جنگ سے باز رہنا، جنگ سے باز رہنا مسلمان ہونے کا اظہار کرکے ہو، یا ذمی بن کر جزیہ دینے کی صورت ہو۔ [مظھري]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنی جہینہ کی طرف ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا تھا، جنگ کے موقع پر جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کافروں میں سے ایک آدمی کو قتل کرنے لگے تو اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ دیا، اس کے باوجود اسامہ رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کردیا، جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو واقعہ عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو نے اس کے باوجود اسے قتل کردیا کہ اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ دیا؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اس نے جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا کہ وہ مسلمان نہ تھا صرف جان بچانے کی خاطر کلمہ پڑھتا رہا؟ تم قیامت کے روز لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کو کیا جواب دوگے؟ [مسلم]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطلب یہ تھا کہ جب کسی نے اسلام کا کلمہ پڑھا، تو اسے مسلمان مان لو، اور مسلمانوں والا سلوک اختیار کرو، باطن کا حال اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو، کیونکہ دلوں کو تم چیر کر کچھ بھی نہیں جانتے ہو، تمہیں ظاہر پر عمل کرنا چاہیے۔

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰـىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ کہ اگر کافر روگردانی کریں،

اور اسلام قبول نہ کریں، اور تمہاری مخالفت اور محاربت پر کمر بستہ وتیار رہیں، تو ان سے لڑتے رہو، اور بزدل نہ بنو، تمہاری پشت پر اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت کا پیغام ہے، وہ تمہارا مولا ومددگار ہے، وہ اچھا مولا واچھا مددگار ہے، جب اس کی نصرت ومدد شامل حال ہوگی تو تمہارے لیے بزدل بننے اور جہاد چھوڑ کر گھروں میں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر جہاد جاری رکھو۔

فائدہ:

کسی بھی مشکل یا پریشانی یا مصیبت کے وقت ﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ چارسو پچاس مرتبہ، اول وآخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھا کریں، اِن شاء اللہ ہر مشکل اور مصیبت دور ہوجائے گی۔

﴿اَلْجُزْءُ الْعَاشِرُ﴾

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا
عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: اور تم جان لو کہ جو کوئی چیز تمہیں مالِ غنیمت سے ملے سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا پانچواں حصہ ہے، اور رسول کے لیے، اور قرابت والوں کے لیے، اور یتیموں کے لیے، اور مسکینوں کے لیے، اور مسافروں کے لیے، اگر تم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر، اور اس چیز پر جو ہم نے نازل کی اپنے بندے پر فیصلہ کے دن، جس روز بھڑ گئی تھیں دونوں جماعتیں، اور اللہ تعالیٰ سبحانہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۴۱﴾

معارف ومنازل

غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو دشمن سے حاصل کیا جائے، شریعت کی اصطلاح میں غیر مسلموں سے جو مال جنگ وقتال اور قہر وغلبہ کے ذریعہ حاصل ہو اس کو غنیمت کہتے ہیں، اور غیر مسلموں سے جو مال صلح ورضامندی سے حاصل ہو اس کو فيء کہتے ہیں۔

ہر چیز کا اصلی حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے:

اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کا تصرّف اور ملکیت اپنے لیے خاص رکھی ہے، کسی بھی مخلوق کو اپنی ذات پر تصرف وملکیت حاصل نہیں، تو دوسروں پر بطریقِ اولیٰ۔ پھر بطورِ ابتلاء وامتحان انسانوں کو عاریۃً چند چیزوں پر تصرف وعارضی ملکیت کا حق دیدیا، اور انہیں انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعہ ہر فائدہ ونقصان اور اپنی بندگی کا حکم دیدیا، لیکن اس کے باوجود اس کے بندوں نے قانون شکنی اور بغاوت کا بازار گرم کر رکھا، حتیٰ کہ وہ اپنے خالق ومالک کے ساتھ برسرِ پیکار ہوگئے، ہزاروں سمجھانے کے باوجود وہ راہِ راست پر نہیں آئے، اب اتمامِ حجت کے بعد یا تو وہ آسمانی عذاب کے ذریعہ ہلاک ہوگئے، یا اہلِ حق کو ان کی سرکوبی کی خاطر ان کے ساتھ جہاد کا حکم ہوا۔

اس جہاد کا مقصد صرف یہ ہے کہ انہیں ہدایت کا اصلی راستہ دکھایا جائے، چنانچہ تلوار چلانے سے پہلے اسلام

کی دعوت دی جاتی ہے، اگر ان باغیوں نے قبول کیا تو جہاد موقوف ہوگا، بصورت دیگر مالکِ حقیقی جل شانہ کا فیصلہ ہے کہ ان کا خون حلال ہوگا، انہیں خوب مارو اور قتل کردو، اور ان کے ہر قسم کے اموال بھی حلال ان کو قبضہ کرکے جمع کرو، اور مجاہدین پر حسبِ ہدایت تقسیم کرو، یہاں تک کہ ان کی بیوی بچوں پر قبضہ کرکے انہیں لونڈی اور غلام بناؤ۔ یہ ہے مختصر مطلب مالِ غنیمت کا، اور دشمنانِ دینِ الٰہی کی سرزنش وعذاب دینے کا۔

سابقہ امتوں کے مسلمان جب مالِ غنیمت پر قبضہ کرتے تھے تو وہ اسے کھا نہیں سکتے تھے، کیونکہ ان پر وہ حرام ہوتا تھا، چنانچہ انہیں جمع کرکے کسی میدان میں رکھتے تھے، آسمان سے ایک آگ نمودار ہوکر انہیں جلا کر ختم کردیتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پر کرم فرمایا، اور رحم فرمایا کہ انہیں اموالِ غنیمت آپس میں تقسیم کرنے اور کھانے کی اجازت فرمائی۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ہمارے ضعف وکمزوری کی بناء پر مالِ غنیمت ہمارے لیے حلال فرمایا۔ [مسلم]

کافروں کا جو مال جنگ وقتال کے ذریعہ حاصل کیا جائے اس کی تقسیم کے بارے میں جو احکام ہیں ان میں سے ایک حکم اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے، اور وہ یہ کہ کُل مالِ غنیمت میں سے اولاً پانچواں حصہ علٰحدہ کرلیا جائے، اور اس کے بعد باقی چار حصے مجاہدوں میں تقسیم کردیئے جائیں۔ پانچواں حصہ کن پر خرچ ہوگا؟ اس کے متعلق فرمایا:

﴿ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ﴾ مفسرین حضرات کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر تبرّ کا ہے۔ اس خُمس کے مستحقین وہ لوگ ہیں جو متصل بعد میں ذکر کیے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کسی چیز کا محتاج نہیں، لیکن چونکہ اس کے قانون کے مطابق تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے:

﴿ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ﴾ سے شروع فرمایا، اس کے بعد اس پانچویں حصہ کے مستحقین بیان فرمائے: اول حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی، دوئم ذوی القربیٰ، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی رشتہ دار، سوئم یتیم لوگ، چہارم مساکین وفقراء، پنجم مسافر وغیرہ۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط ہوگیا، اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رشتہ داری کے عنوان سے ان حضرات کا حصہ مستقل نہیں رہا، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رشتہ داری کے عنوان سے ان حضرات کو کچھ نہیں ملے گا۔ البتہ بعد میں جو تین مَصرَف ذکر کیے گئے ہیں، یعنی یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل ان کے ذیل میں ان حضرات کو بھی مل جائے گا، بلکہ ان کو دوسرے یتامیٰ اور

مساکین پر ترجیح دی جائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اب مالِ غنیمت سے جو خُمس نکالا جائے گا وہ امیر المؤمنین اپنی صوابدید کے مطابق یتامیٰ، مساکین اور مسافرین پر خرچ کرے گا، اغنیاء ذوی القربیٰ کو نہیں دے گا، ان میں جو فقراء یا یتامیٰ یا مساکین یا ابن السبیل ہوں گے ان پر بھی خرچ کیا جائے گا۔

مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر ہر یتیم اور ہر ہر مسکین اور ہر ہر مسافر کو میراث کی طرح حصہ پہنچایا جائے، بلکہ امیر المؤمنین اپنی صوابدید سے ان مصارف میں خرچ کرے۔ ذِوِی القربیٰ کے بارے میں یہاں جو مسئلہ لکھا گیا یہ فقہاء حنفیہ کی تحقیق کے مطابق ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ﴾ یعنی اگر تمہارا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے، اور اس پر بھی ایمان ہے کہ فیصلہ کے دن جو تمہاری جیت ہوئی وہ ہماری امدادِ غیبی کی وجہ سے ہوئی، تو بلا تردد اور بلا تأمل مالِ غنیمت کے پانچویں حصہ کا نکالنا ناگوار نہ ہونا چاہئے، یہ ساری غنیمت اللہ تعالیٰ کی امدادِ غیبی سے حاصل ہوئی، لہٰذا خوشدلی سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو، یہ خمس نکالنا نفسوں پر شاق نہ ہونا چاہئے۔

يَوْمَ الْفُرْقَانِ سے مراد غزوۂ بدر ہے:

یومِ بدر کو یوم الفرقان، یعنی فیصلہ کا دن فرمایا، اور یہ اس لیے کہ بدر میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کا مقابلہ ہوا، تو مؤمنوں کی تعداد کافروں کے مقابلے میں بہت کم ہونے اور غیر مسلح اور پیدل ہونے کے باوجود کافروں کو شکست فاش ہوئی، اور کھل کر یہ بات سامنے آ گئی کہ دینِ اسلام برحق ہے، اور کفر باطل و بے بنیاد ہے، اور یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کی امداد و نصرت ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

بہت سے عرب قبائل غزوۂ بدر سے پہلے اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا تھے، اور یہ مشورہ کیا کرتے تھے کہ دیکھو! مکہ والوں کے ساتھ اہلِ اسلام کا کیا معاملہ ہوتا ہے، اور انجامِ کار کیا ہوگا؟ اہلِ اسلام کا غلبہ ہوتا ہے یا مشرکینِ مکہ ہی غالب رہتے ہیں۔ غزوۂ بدر کی کامیابی دیکھ کر ایسے لوگوں کی بھی آنکھیں کھل گئیں، اور انہیں یقین ہو گیا کہ اسلام پورے عرب میں کامیابی کے ساتھ پھیل جائے گا، اور اس کا مقابلہ نہیں ہو سکے گا، کیونکہ وہ برحق اور اللہ تعالیٰ کا دین ہے، اور اسے اللہ تعالیٰ کی امداد و نصرت حاصل ہے، اور لات، عُزّیٰ، منات، ھبل وغیرہ کی عبادت باطل اور بے بنیاد ہے۔

اتنے سمجھنے کے بعد سارے قبائل انتظار کرنے لگے، اور کہنے لگے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر اپنی قوم قریش پر غلبہ پایا تو پھر ہم بھی کوئی فیصلہ کریں گے، چنانچہ وہ اس انتظار میں رہنے کے بعد فتح مکہ مکرمہ کے بعد بلا چوں و چرا اسلام قبول کرنے پر راضی ہو گئے، جیسا کہ سورۂ نصر میں اس کا بیان ہے: ﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا﴾[النصر: ٢] (اور تم لوگوں کو دیکھ لو کہ وہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں)۔ اس طرح الحمد للہ اسلام کا پورے جزیرۂ عرب پر غلبہ ہو گیا، اور شیاطین کی کمر ٹوٹ گئی، اور انہیں مکمل شکست کے ساتھ نا امیدی ہو گئی۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ جس میں واضح طور پر بتایا کہ تمہیں جو کچھ فتح حاصل ہوئی، اور مالِ غنیمت حاصل ہوا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوا، اگر تمہیں کچھ بھی نہ دیا جاتا تب بھی تمہیں راضی رہنا ضروری تھا، اب جبکہ تمہیں بہت کچھ دے دیا، یعنی چار حصے تمہیں مل گئے، اور پانچواں حصہ دوسروں کو ملا، تب تمہیں بطریق اولیٰ خوش اور راضی ہونا چاہئے۔ پھر یہ مصارف کون ہیں؟ یہ کوئی غیر لوگ نہیں، بلکہ یہ ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، مسافرین تمہاری اپنی جماعت کے لوگ ہیں، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر فرمان پر راضی رہو، تمہاری منزل آخرت ہی تو ہے، دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی مسافر تھوڑی دیر کے لیے کسی درخت کے سایہ میں رہے۔

فائدہ:

ذَوِی الْقُرْبٰی کی تعیین خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمادی کہ بنی ہاشم تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا قبیلہ ہی تھا، بنو المطلب کو بھی ان کے ساتھ اس لیے شامل فرمالیا تھا کہ یہ لوگ بھی جاہلیت و اسلام میں بنو ہاشم سے الگ نہیں ہوئے، یہاں تک کہ قریش مکہ نے جب غذائی مقاطعہ بنو ہاشم کا کیا، اور ان کو شعب اَبی طالب میں محصور و بند رکھا، تو بنو المطلب کو اگرچہ قریش نے مقاطعہ میں شامل نہیں کیا تھا، مگر یہ لوگ اپنی رضامندی سے مقاطعہ میں شامل ہو گئے، اور شعب اَبی طالب میں رہے۔ [مظهري]

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ

فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: جب کہ تم قریب والے کنارے پر تھے اور وہ لوگ دور والے کنارے پر، اور قافلے والے تم سے نیچے کی طرف تھے، اور اگر تم آپس میں وعدہ کر لیتے تو تم میعاد کے بارے میں اختلاف کر لیتے، اور لیکن تا کہ اللہ تعالیٰ اس امر کا فیصلہ فرمائے جو ہو جانے والا تھا، تا کہ جو شخص ہلاک ہو حجت قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو، اور جو شخص زندہ رہے وہ حجت قائم ہونے کے بعد زندہ رہے، اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے ﴿۴۲﴾ جبکہ اللہ تعالیٰ ان کو آپ کے خواب میں کم دکھا رہا تھا، اور اگر وہ تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھا تا تو تم ہمت ہار جاتے، اور اس امر میں باہمی تم میں نزاع ہو جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بچا لیا، بیشک وہ دلوں کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے ﴿۴۳﴾ اور جب کہ تم باہم مقابل ہوئے وہ ان کو تمہاری آنکھوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا، اور تمہیں ان کی آنکھوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا، تا کہ اس بات کا فیصلہ ہو جائے جس کا وجود میں آنا مقرر ہو چکا تھا، اور تمام امور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

معارف ومنازل

بدر میں محاذِ جنگ کا نقشہ، اور مددِ الٰہی:

ان آیات میں اول تو غزوۂ بدر کے محاذِ جنگ کا نقشہ بتایا ہے، پھر اپنے انعامات کا تذکرہ کیا ہے جو غزوۂ بدر کے دن حیرت انگیز طور پر مسلمانوں کے فتح یاب ہونے کا ذریعہ بنے، جہاں چیونٹیوں کی طرح بے سہارا لشکر نے ہاتھیوں کے مسلح لشکر کو چکنا چور کر کے رکھ دیا۔

مفسرین کرام اور سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے مقامِ بدر میں پہنچ کر ایسی جگہ پر قیام کیا تھا جو مدینہ سے دور ہے، اور وہ لوگ ایسی جگہ لے چکے تھے جو بظاہر محاذِ جنگ کے لیے زیادہ مناسب تھی، جب مسلمان وہاں پہنچے تو ان کو نیچے والی پستی میں جگہ ملی، یہ جگہ ریتیلی اور نرم، نیز ناہموار بھی تھی، اور مدینہ منورہ سے قریب تھی، اور تیسری جماعت ابو سفیان کا تجارتی قافلہ وہ اس جگہ سے نیچے کی طرف نشیبی علاقہ پر تھا، جو مقامِ بدر سے تین میل دور تھا، اور نہ

اس کا کوئی پروگرام تھا، اور نہ کوئی وقت مقرر تھا۔

مسلمان ابوسفیان کے قافلے کا پیچھا کرنے کے لیے نکلے تھے، اور رفتہ رفتہ غیر ارادی طور پر مقامِ بدر پہنچے، کسی قسم کی جنگ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی، انہیں کیا پتہ کہ قافلے کی حفاظت کے لیے مکہ سے ایک لشکرِ جرار روانہ ہو چکا تھا جس کے ساتھ ہمیں مقابلہ کرنا پڑے گا، اگر انہیں کوئی اس قسم کے معرکہ کا خیال وارادہ ہوتا تو وہ مکمل تیاری اور انتظام کے ساتھ آتے، ان کے پاس صرف دو ہی گھوڑے، اور آٹھ تلواریں تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا پہلے سے فیصلہ تھا کہ غیر ارادی طور پر زبردست جنگ ہو، جس میں اہل ایمان غیبی مدد کے ساتھ فتح یاب اور سر بلند ہوں، اور کفار و مشرکین نہایت ذلّت وخواری کے ساتھ شکست خوردہ اور تباہ و برباد ہوں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر فرمائی کہ دونوں جماعتیں پیشگی بات چیت کئے بغیر ایک ہی محاذ پر آمنے سامنے جمع ہو گئیں، جو ایک دوسرے کو آسانی کے ساتھ دیکھ کر ملاحظہ کرتے رہے، اور شناخت بھی کرتے رہے۔

اور ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب دیکھا کہ مشرکین کی تعداد کم ہے، جب یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلوم ہوئی تو ان کا حوصلہ بلند ہو گیا، اور دل سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اگر ان مشرکین کی تعداد زیادہ دکھائی جاتی تو مسلمانوں میں بُزدلی آجاتی، اور آپس میں اختلاف کرتے، کچھ جنگ کے لیے آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتے، اور کچھ پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیتے، پھر افراتفری کا خطرہ پیدا ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کو جب منظور تھا کہ کفر کی شوکت پارہ پارہ ہو، اور ہر حال میں جنگ ہی ہو، اس لیے کفار کی تعداد کم دکھا کر مسلمانوں کی حوصلہ افزائی فرمائی، اور انہیں بزدلی اور اختلاف سے سلامت رکھا، اور کم ہمتی سے بچا لیا، اور باہم اختلاف سے محفوظ رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حضرات شیروں کی طرح تکبیر کہتے ہوئے کافروں کی صفوں کو چیرتے ہوئے انہیں مارتے ہوئے اور قید کرتے ہوئے ایسے پکڑے جیسے حملہ آور شیر کسی بکری پر حملہ کرے، اور اسے پٹخ کر زمین پر مارے۔

اس مرحلے میں ابوجہل ملعون دس مسلح نوجوانوں کی حفاظت میں ہونے کے باوجود دونابالغ بھائیوں کی یلغار سے جہنم رسید ہوا، اس معرکہ میں اس کے پہرہ داروں کو پتہ بھی نہ چلا کہ جس کی حفاظت پر ہم مامور ہیں وہ بچوں کے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکا ہے، اسی کو فرمایا:

﴿وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب کے دلوں کا حال معلوم ہے، کس کو اللہ ورسول سے محبت ہے، کس

کا رخ کتنا اور کس مقدار میں آخرت کی طرف ہے، اور کون دنیا کا طالب ہے، کون بہادر ہے، اور کون بزدل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے مزید یہ کرم فرمایا کہ جب مقابلہ کا وقت آیا، اور مڈبھیڑ ہوگئی تو مسلمانوں کی آنکھوں میں کافروں کو، اور کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کو کم تعداد میں دکھایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان شجاعت اور بے جگری سے بے خوف ہوکر لڑے، اور کافر بھی یہ سمجھ کر لڑے کہ یہ تھوڑے سے لوگ ہیں، ان کو ختم کرنا ہمارے لئے آسان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے! اول مبارزہ میں جہاں کفار کے سرغنے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ جو حضرت علی حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، یہ کفار کے لئے ناقابلِ برداشت صدمہ بھی تھا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے قلوب پر ایک رعب بھی تھا، اس کے بعد ان کا بہادر جو تلوار چلا کر آگے بڑھتا تھا وہ خوفزدہ ہی رہتا تھا، اور اپنے ہدف تک کارگزاری نہیں دکھا سکتا تھا۔ پھر انجام یہ ہوا کہ نادیدہ ہاتھ نے انہیں وہ سبق سکھایا کہ بڑے بڑے سردار نامور پہلوان یا تو مارے گئے یا مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو گئے، اور دیگر لوگ حواس باختہ ہوکر اپنے سامان چھوڑ کر ایسے بھاگے کہ انہیں پیچھے دیکھنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی۔ ایک واحد لاشریک حقیقی خدا نے ان کے خداؤں کی ناک کٹوا کر انہیں ہمیشہ کے لیے شرمندہ ورسوائے جہاں بنا دیا۔

ابوجہل وغیرہ نے شروع میں کہا تھا کہ ہمارے سارے خداؤں کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اکیلے خدا کے ساتھ مقابلہ ہے، آج انہیں لات وعزّٰا وہبل کی طاقت کا پتہ چلے گا، چنانچہ مسلمان فتح یاب ہوئے، اور کفر کا بھاری لشکر تہہ وبالا ہوکر شکست کھا گیا، اور اللہ تعالیٰ کا جو فیصلہ مقرر ہوا تھا اس کی برکات وفوائد ظاہر ہوئے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: بدر کے دن کفار کی تعداد ہماری آنکھوں میں اس قدر کم معلوم ہوگئی تھی کہ میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا جو میرے قریب کھڑے تھے کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ لوگ ستر کے قریب ہوں گے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے خیال میں یہ سو کے قریب ہیں، اس کے بعد ہم نے مشرکین میں سے ایک شخص کو قید کرلیا، اور اس سے پوچھا تمہاری کتنی تعداد ہے؟ تو اس نے کہا کہ ایک ہزار لوگ میدان میں ہیں، کہاں ہزار کی نفری اور کہاں ستر یا سو؟ [معالم التنزیل]

﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ﴾ اس میں یہ فرمایا کہ واقعۂ بدر میں دینِ اسلام کی کھلی اور واضح معجزانہ حقانیت ظاہر ہوگئی، اور کفر وشرک کا بُطلان خوب واضح طریقہ پر کھل گیا۔ اسی بناء پر اس معرکہ کو یَوْمُ الْفُرْقَانِ کا نام دیا گیا۔ تو فرمایا اب بھی جو شخص ہلاک ہوگا یعنی کفر پر جما رہے گا، وہ حجت تمام ہونے

کے بعد اس کو اختیار کرے گا (دیدہ دانستہ طور پر) اور آج کے بعد جو شخص ایمان پر پختگی کے ساتھ جما رہے گا وہ بھی حجت کے ساتھ دین حق پر رہے گا (دیدہ دانستہ طور پر) ہلاکت سے مراد ہے کفر پر باقی رہنا، اور حیات سے مراد ہے اسلام پر جما رہنا، کیونکہ اسلام ابدی حیات کا ذریعہ وسبب ہے، اور کفر ایک موت وتباہی کا پیش خیمہ ہے، حق واضح ہو جانے کے بعد ہر طرح کی غلط فہمی جہالت کا احتمال ختم ہو گیا، اب کافر دیکھتی آنکھوں سے جانتے ہوئے دہکتی آگ جہنم میں جائے گا، اور خود اپنی ہلاکت کا انتخاب کرے گا۔

اور جو شخص اسلام پر جما رہے گا، یا جو کافر اسلام قبول کرے گا وہ بھی دلیل وحجت کی روشنی میں حق پر قائم رہے گا، تمام شکوک وشبہات ختم ہو گئے، اور جہالت کے پردے چاک ہو گئے، اور وساوس کافور ہو گئے، اب کفر اور جہالت کا دور ختم ہو چکا، اب کافر کا کفر مبنی برعناد ہی رہے گا۔ کچھ تفصیل سورۂ انفال کے شروع میں، اور کچھ سورۂ آل عمران میں دیکھی جائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٤٥﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَ رَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٤٦﴾ وَلَا تَكُونُوا كَا لَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم کسی جماعت سے بھڑ جاؤ تو ثابت قدم رہو، اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ ﴿٤٥﴾ اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ صابروں کے ساتھ ہے ﴿٤٦﴾ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے (متکبرانہ انداز میں) لوگوں کو دکھانے کے لئے نکلے، اور وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے ﴿٤٧﴾

معارف ومنازل

پچھلی آیات میں مجاہدین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت وخصوصی انعامات کا ذکر تھا، اب نصرتِ الٰہی حاصل کرنے کا نسخہ اور قانون وطریق کار کی تعلیم ہو رہی ہے کہ دشمن کی کثرت وقوت سے مت گھبراؤ، تمہارا مددگار رب سے

بڑا ہے، ظاہراً اور باطناً اس کی اطاعت اور ذکر جاری رکھو، اسی میں تمہاری سربلندی کا راز مضمر ہے، اور یہی تمہارے لئے نسخۂ اکسیر ہے۔

سبحان اللہ! قرنِ اول دوئم سوئم میں مسلمانوں نے اپنی قلّت کے باوجود بے سروسامانی کے ہوتے ہوئے ٹڈی دل کی طرح عظیم فوجوں کے ساتھ اسی اکسیری نسخہ پر عمل کرتے ہوئے مقابلہ کیا، تو تاریخِ عالم گواہ ہے کہ انہوں نے کفر وباطل کو وہ شکست دی جسے رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی چھتیس ہزار فوج نے میدانِ یرموک میں رومیوں کی نو لاکھ ساٹھ ہزار فوج کو وہ شکست فاش دی جس سے پورے کفر کے ایوانوں میں صفِ ماتم بچھ گئی، اسی طرح دوسرے محاذوں پر بھی ایسا ہی ہوا۔

اکسیری نسخہ کے اجزاء کا بیان ان آیات میں کامیابی وفلاح کے جن قیمتی اجزء کا ذکر ہے وہ آٹھ ہیں مثلاً:

(۱) قتال کے وقت ثابت قدم باحوصلہ رہنا۔ (۲) کثرت کے ساتھ زبانی وقلبی ذکر جاری رکھنا۔ (۳) اللہ تعالیٰ شانہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے امیر کی اطاعت ومکمل فرمانبرداری کرنا۔ (۴) آپس میں اتفاق واتحاد قائم رکھنا، اور اختلاف وجھگڑوں سے پرہیز کرنا۔ (۵) صبر واستقامت اختیار کرنا۔ (۶) عجز، انکساری اور اخلاص کے ساتھ لڑنا۔ (۷) کبر وغرور سے پرہیز کرنا۔ (۸) ریاکاری، نام ونمود سے بچنا وغیرہ۔

ان آٹھوں چیزوں کی مختصر نشاندہی اور مطلب یہ ہے:

اول: **الثبات**: یعنی ثابت قدم رہنا اور جم کر لڑنا۔ اس میں اثباتِ قدم اور اثباتِ قلب دونوں داخل ہیں، کیونکہ جب تک کسی شخص کا دل مضبوط وثابت نہ ہو اس کے قدم اور اعضاء مضبوط نہیں رہ سکتے، انسانی بدن کے تمام اعمال وارادے قلب ہی کے تابع ہیں، دراصل میدانِ جنگ کے اصلی ہتھیار قلب ہے، باقی ہر چیز اس کی تابع ہے۔

دوسرے: **ذکر اللہ**: وہ بھی کثرت کے ساتھ ہو، یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ پورے قرآن کریم میں ذکر اللہ کے علاوہ کسی عبادت کو کثرت سے کرنے کا حکم نہیں، مثلاً یہ کہیں نہیں کہ: "صَلٰوۃً کَثِیْرَۃً زَکٰوۃً کَثِیْرَۃً صَوْمًا کَثِیْرًا حَجًّا کَثِیْرًا"۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ذکر اللہ ایک ایسی آسان عبادت ہے کہ اس میں نہ کوئی بڑا وقت خرچ ہوتا ہے، نہ محنت، نہ وضو، نہ استقبالِ قبلہ، نہ جلوس، نہ خاص وضع قطع، نہ مخصوص عمل، نہ خاص تلفظ، نہ لباس وغیرہ۔

علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ نے "حِصن حَصین" میں تصریح کی ہے کہ زبانی ذکر، قلبی ذکر، عملی ذکر جیسے نماز صدقہ یا کوئی بھی نیک عمل سب ذکر اللہ میں شمار ہیں۔ یعنی مؤمن کا ہر عمل ذکر اللہ کا حصہ اور جزء ہے، تعلیم وتعلّم نیک ارادہ کے

ساتھ، کھانا پینا اور نیک ارادہ کے ساتھ سونا سب ذکر میں شمار ہیں۔ یہ بات اَظْهَرُ مِنَ الشَّمْس ہے کہ ذِکْرُ اللہِ تَعَالٰی مردہ اور غافل دلوں کے لئے بمنزلۂ حیات ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس پر توکّل واعتماد وہ بجلی کی عظیم طاقت ہے جو ایک ضعیف مسلمان کو پہاڑوں سے ٹکرا جانے پر آمادہ اور برانگیختہ کردیتی ہے، اور کیسی ہی مصیبت اور پریشانی ہو اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس پر اعتماد سب کو ہوا میں اڑا دیتی ہے، اور انسان کے قلب وقدم اور اس کے اعضاء کو مضبوط اور محکم رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکرین کا صبر اور شکر دوسرے لوگوں کی بنسبت مثالی ہوتے ہیں، اور ان کی محبت خلقِ خدا کے قلوب میں جاگزیں ہوتی ہے، جیسا کہ بخاری کی حدیث میں ہے۔

تیسرا عمل: وہ ہے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت، نیز امیرِ لشکر کی فرمانبرداری، یہ اطاعت تمام دنیوی واخروی کامیابیوں کا سرچشمہ اور بنیاد ہے۔ غزوۂ احد میں معمولی سی نافرمانی نے جنگ کا نقشہ تبدیل کیا، اور بہتر (۷۲) کے قریب جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش کیا، جس کی تفصیل گزر چکی سورۂ آل عمران میں۔

چوتھا عمل: فرمایا: آپس میں منازعت اور جھگڑہ نہ کرو، کہ یہ چیز بہت نقصان دہ اور ضرر رساں ہے، جس سے تمہارا رُعب اور بہادری کا خاتمہ ہو جائے گا، تمہارے اندر بزدلی پیدا ہو جائے گی، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، دشمن تمہارے اختلاف سے فائدہ اٹھائے گا، تمہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دے گا، وغیرہ۔

ہمارے زمانے میں چالباز مکار یورپ نے اسی قانون پر عمل کیا، سادہ لوح اور نفس پرست ودنیا پرست لالچی مسلمانوں کے ذریعہ ان کی صفوں میں انتشار پھیلایا، اور انہیں غیر ضروری مسائل اور اختلافات میں الجھا کر دست وگریبان کر دیا، اور ان میں بزدلی پیدا کرکے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کا نعرہ لگایا، یہ نادان آپس میں لڑتے رہے، اور وہ اپنا کام کرتے رہے، پانچ لاکھ انگریزوں نے برصغیر کے تقریباً چالیس کروڑ لوگوں پر ڈھائی سو سال تک حکومت کی، اور انہیں غلام بنائے رکھا۔

پانچواں عمل: صبر کی تلقین ہے، جو کہ تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کی کنجی ہے۔ بار بار اس کی تاکید ہوتی رہی ہے۔ قرآن کریم کے ایک سو دو مقامات پر اس عظیم عمل کی تاکید ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی افادیت، فوائد، درجات، مراتب اور اقسام کا تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔ اسی طرح یہ بہت بڑا انعام ہے، فرمایا:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ زہے نوازش اور سعادت! کہ ربّ العزّت سبحانہ کی معیت صابرین کی پیشانی کا جھومر ہو۔ دراصل ثبات قدم، ذکر اللہ اطاعت اللہ والرسول ترکِ منازعت، ترکِ کبر و

غرور اور اخلاصِ نیت وعمل، یہ ساری چیزیں "صبر" ہی پر موقوف ہیں۔ اگر صبر ہے تو یہ آسان ہیں، اگر صبر نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ البتہ صبر کرنا ضرور تلخ اور سخت ہے، مگر اس کا پھل بڑا لذیذ اور میٹھا ہے، اور بنیادی بات بھی یہی ہے کہ مؤمن کی پوری زندگی صبر سے تعبیر ہے، جس کا اجر وثواب دگنا اور بہت بڑا ہے، بلکہ آپس کا اتحاد اور موافقت صبر اختیار کرنے سے باقی رہ سکتا ہے، جب چند آدمی آپس میں مل کر رہتے ہوں، خواہ ایک ہی گھر کے افراد ہوں، آپس میں کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی جانب سے قول یا فعل کے اعتبار سے ناگواری پیش آجاتی ہے، پس صبر کے ساتھ تمام کدورتیں ختم ہوجاتی ہیں۔

اسی طرح شوہر اور اس کی بیوی میں سے اگر دونوں میں نہ سہی کسی ایک میں صبر کا مادہ وجذبہ ہو تو کبھی ناراضگی اور ناچاتی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اگر ایک طرف سے بے رخی ہوتی ہے تو دوسری طرف سے نہیں ہوگی۔

چھٹے عمل: جو کہ بہت مضرت رساں ہے وہ کبر وغرور ہے، جس کی ضد تواضع اور انکساری ہے، جیسے ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ﴾ اے اہل ایمان! تم تواضع و انکساری اور اخلاص وللہیت کا مظاہرہ کرو، یہی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے پسندیدہ اعمال اور ان کی سنتوں کے مظاہر ہیں، اگر تمہیں قربِ الٰہی اور فوز وفلاحِ دارین حاصل کرنا ہو، اور اپنے اعمال کو گرانقدر بنانا ہو، تو اس کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ کبر وغرور اور ریاکاری سے اجتناب کر کے تواضع، عاجزی، انکساری اور اخلاص جیسے کمالات حاصل کرنے کی کوشش کرو، اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے غرور کے ساتھ اِتراتے ہوئے لوگوں کو اپنی پہلوانی وقوت دکھاتے ہوئے نکلے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ معالم التنزیل میں لکھتے ہیں کہ آیت بالا مشرکینِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، جب وہ بدر کے لئے روانہ ہوئے تو فخر اور تکبر کے انداز میں چلے، ادھر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تواضع وانکساری کے ساتھ دعا کی: اے اللہ تعالیٰ! یہ لوگ تکبر اور فخر وگھمنڈ کے ساتھ آئے ہیں، آپ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، اور آپ کے رسول کو جھٹلاتے ہیں، آپ نے جو مدد کا وعدہ فرمایا ہے اس کو پورا فرمائیے۔

ابوسفیان تو اپنا قافلہ لے کر بچ نکلا، جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے قریش کو رائے دی کہ مسئلہ قافلہ کے تحفظ کا تھا وہ حل ہوگیا، ابھی آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں، واپس ہونا چاہئے، اس پر ابوجہل نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! جب تک ہم بدر نہ پہنچ جائیں واپس نہ ہوں گے، وہاں تین روز قیام کریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، کھانے کھلائیں

گے، شرابیں پلائیں گے، گانے والی عورتیں جو ہمارے پاس ہیں وہ گانے گائیں گی، اور پورے عرب میں ہماری شہرت ہوجائے گی، پھروہ ہمیشہ ہم سے ڈرتے رہیں گے۔ بات تو بڑی کہی تھی، لیکن قریش کے تکبر وغرور اور فخر کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف روانہ ہوئے، عاتکہ کے خواب کے مطابق انہیں مقتل گاہ کو پہنچایا گیا، اونٹوں کی جگہ وہ خود ذبح ہوئے، گانے والی عورتوں نے بجائے گانے کے نوحہ شروع کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے اہلِ ایمان بندوں کی فرشتوں کے ذریعہ وہ محیر العقول مدد فرمائی جس کی نظیر نہ ہو۔ الحمد للہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک شخص اس لئے لڑتا ہے کہ مالِ غنیمت حاصل ہو، اور ایک شخص اس لئے لڑتا ہے کہ اس کی شہرت ہو، اور ایک شخص اس لئے لڑتا ہے کہ اس کی بہادری کا چرچا ہو، تو ارشاد فرمایئے ان میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس لئے جنگ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہے۔ [متفق عليه]

مطلب یہ ہے کہ حسن نیت اور اخلاص ہر عمل کی قبولیت کے لئے شرط ہے، بغیر اخلاص اور صفائی نیت کے کوئی بڑے سے بڑے عمل کا کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ﴾ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں۔ پہلے فرمایا تھا کہ وہ لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں، اور خود کو مسجد حرام کا متولی سمجھتے ہوئے اور کہتے ہوئے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ شانہ کے گھر سے منع کرتے تھے، تفصیل گزر گئی، اور اللہ تعالیٰ کا علم کائنات کے ہر ہر ذرہ پر محیط ہے، کوئی چیز اس کے علم محیط کے دائرہ سے باہر نہیں۔

براو علم یک ذرہ پوشیدہ نیست ☆ کہ پیدا و پنہاں بہ نزدش یکسیت

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ
وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ
مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۚ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾

ترجمہ: اور جب شیطان نے ان کو اعمال خوشنما کر کے دکھائے، اور اس نے یوں کہا کہ لوگوں میں سے آج تم پر کوئی بھی غلبہ پانے والا نہیں ہے، اور میں تمہاری حمایت کرنے والا ہوں، پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگ نکلا، اور اس نے کہا کہ بلاشبہ میں تم سے بری ہوں، بے شک میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے ﴿۴۸﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کی تفسیر سے پہلے چند مقدمات ضرور سمجھیں، تاکہ مطلب واضح ہو جائے۔

اول: اخلاص ہر عمل میں ضروری ہے، بشرطیکہ عمل کا رخ صحیح اور اسلامی ہو، ورنہ نہیں۔

دوئم: ہر سردار یا سرپرست یہی چاہتا ہے کہ میری قوم کامیاب ہو، اور غلبہ پائے۔

سوئم: شیطان مسلمانوں کا دشمن اور کافروں کا والی وارث اور دوست ہے۔

چہارم: شیطان کبھی نہیں چاہتا کہ اس کی قوم یعنی کفار مغلوب اور خوار ہوں۔

پنجم: شیطان جس طرح وسوسہ کے ذریعہ کام خراب کرتا ہے اسی طرح بسا اوقات وہ انسانی شکل میں آکر دھوکہ دہی کی کوشش بھی کرتا ہے۔

ششم: اگر شیطان کو یہ معلوم ہوتا کہ اس جنگ میں قریش کو بدترین شکست ہوگی اور مسلمانوں کی جیت ہوگی تو وہ ہرگز قریش کو مکہ سے نکلنے نہیں دیتا، اور بدر کے میدان میں جنگ کے لئے آمادہ نہ کرتا۔

ہفتم: شیطان فرشتوں کو بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

ہشتم: ابلیس کفار کی مدد کے لئے اپنی شیطانی فوج میدان میں لاسکتا ہے، اسی بناء پر ابلیس قریش کی مدد کے لئے اپنا لشکر میدان میں لایا تھا، اور جب فرشتوں کا نزول ہوا تو ابلیس اپنے لشکر کو لے کر بھاگ گیا۔

نہم: مکہ میں اور میدانِ بدر میں ابلیس قبیلہ بنی بکر کے سردار سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں آیا، اور قریش کو اپنی قوم بنی بکر اور بنی کنانہ کی حمایت کی پیشکش کی، اور انہیں دھوکہ دیا اور ورغلایا، وغیرہ۔

شیطان کی دھوکہ دہی اور بھاگنے کا بیان:

شیطان ملعون انسان کا بنیادی دشمن ہے، وہ یہی چاہتا ہے کہ کافر ہمیشہ اپنے کفر پر جمے رہیں، اور اہلِ اسلام

سے جنگ کرتے رہیں، اس کی خواہش ہے کہ پورے عالم میں کفر پھیلے اور عام ہو جائے، اور اسلام کی اشاعت رک جائے، جیسے وہ قریشِ مکہ کے اس مشورے میں شیخ نجدی کی صورت بنا کر شریک ہو گیا تھا، جس میں سرورِ عالم ﷺ کے بارے میں مشورہ ہو رہا تھا، جس کا بیان ابھی گزر گیا۔

اسی طرح وہ غزوۂ بدر کے موقع پر بھی آ کر موجود ہوا، اول تو وہ مکہ مکرمہ میں اس وقت مشرکین کے پاس پہنچا جب وہ بدر کے لئے روانہ ہونے کا مشورہ کر رہے تھے، اور ساتھ انہیں قبیلہ بنی بکر کی دشمنی کا بھی خیال پریشان کیے ہوئے تھا، کہ ہماری غیر موجودگی میں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مکہ مکرمہ پر چڑھائی کریں، اس لئے روانہ ہونے میں کچھ جھجک محسوس کر رہے تھے۔ اس موقع پر ابلیس سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت میں حاضر ہوا، اور یہ سراقہ قبیلہ بنی کنانہ کے قابلِ احترام سرداروں میں سے تھا، جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے رحمتِ عالم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا ہجرت کے موقع پر تعاقب کیا تھا، پھر آپ ﷺ نے اسے امن کا سرٹیفکٹ عطا فرمایا تھا۔

ابلیس نے قریشِ مکہ سے کہا کہ تم لوگ ہرگز اپنے ارادہ سے باز نہ آؤ، بلکہ چلے چلو، میں تمہارا حامی اور مددگار ہوں، آج تم پر کوئی غلبہ پانے والا نہیں ہے، یہ تو مکہ مکرمہ میں ہوا، پھر ابلیس دوبارہ بدر میں بھی سراقہ کی صورت میں حاضر ہوا، اس مرتبہ وہ شیاطین کا لشکر بھی ساتھ لے کر آیا تھا، کہ مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ خوب لڑیں، (اس وقت اسے فرشتوں کے نزول کا علم و اندازہ نہ تھا، اور وہ بڑا مطمئن تھا کہ فتح ہماری ہو گی)۔

جب مسلمانوں اور کافروں کی صفیں مقابلے کے لئے ترتیب دی گئیں، تو یہاں بھی وہ مشرکین کی صف میں سراقہ کی صورت میں بمع اپنے ساتھیوں کے موجود تھا، اور حارث بن ہشام کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا، اور منہ شگافیاں کرتا رہتا تھا، عین اس وقت جب اس نے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے سرورِ عالم ﷺ کے سامنے موجود ہیں، تو وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگا۔ حارث بن ہشام نے کہا کہ تو جنگ سے پہلے ہی بھاگ رہا ہے، اس پر اس نے حارث کے سینہ میں دھپ مارا، جس سے وہ گر گیا، اور یہ پہلوان الٹے پاؤں چلا گیا، اور وہ یوں کہتے ہوئے بھاگا کہ میں تم سے بیزار ہوں، میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، اگر میں تھوڑا سا صبر کروں تو ہلاک ہو جاؤں، وغیرہ۔

یہ تو اس وقت کی بات ہوئی، پھر جب قریش شکست کھا کر مکہ معظمہ پہنچے تو انہوں نے یوں کہنا شروع کیا کہ ہمیں سراقہ نے شکست دی، جب یہ بات سراقہ کو پہنچی تو اس نے کہا کہ تم لوگ میرے بارے میں ایسا کہتے ہو اللہ کی

قسم مجھے تو تمہارے جانے کی خبر نہیں ہوئی، مجھے تو تمہاری شکست کی خبر پہنچی ہے، ان لوگوں نے کہا: کیا تو فلاں روز ہمارے پاس نہیں آیا تھا؟ اس نے قسم کھا کر کہا: مجھے تو اس کی بالکل خبر ہی نہیں، تب سراقہ کو یقین آ گیا کہ یہ لوگ شیطان کے نرغے میں گمراہ ہو گئے ہیں، جب سراقہ اور کچھ دوسرے لوگ مسلمان ہو گئے تو پتہ چلا کہ یہ سب کچھ ابلیس کی حرکت تھی۔ [روح المعاني، معالم، مظهري]

شیطان کا یہ کہنا کہ: ﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ﴾ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اس کا مطلب حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دیگر ہلاک ہونے والوں کے ساتھ مجھے ہلاک نہ کر دے، کیونکہ اس نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دیکھ کر خطرہ محسوس کیا کہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تمہارے بارے میں ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہلاک نہ کر دے، ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ سخت عقاب والا ہے، تم لوگوں پر تو عذاب آنے ہی والا ہے، میں کیوں تمہارے ساتھ شریک رہوں؟

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ابلیس کا کلام: ﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ﴾ پر ختم ہو گیا، اور ﴿وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ یہ جملہ مستانفہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کے لئے یہاں بھی سخت عذاب ہے، اور آخرت میں بھی ابلیس اس موقع پر جو بھاگ گیا، تو وہ اس کے ساتھی یہ نہ سمجھے کہ وہ عذاب سے بچ گئے، آخرت کا عذاب تو لازمی ہے جو شدید ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [ص:٨٥] (ہم ضرور جہنم کو تم سے اور تیرے ماننے والوں سے بھر دیں گے) جن لوگوں نے تیرا سب کچھ مانا وہ جہنم میں تمہارا رفیق رہیں گے۔

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ
دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٤٩﴾

ترجمہ: جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے یوں کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے گھمنڈ میں ڈال دیا، اور جو کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے، تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ عزت والا ہے غلبہ والا ہے ﴿٤٩﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

منافقین جو کہ مارِ آستین بنے ہوئے ہیں وہ کافروں کی طرح ہمیشہ مسلمانوں پر طنز واستہزاء کرنے سے نہیں تھکتے تھے، ادھر مشرکین کا بھی یہی طنز و مذاق جاری رہتا تھا، اس آیت کریمہ میں منافقینِ مدینہ اور مشرکینِ مکہ کا ایک مشترک مقولہ مسلمانوں کے بارے میں یہ نقل کیا گیا، گو وہ مسلمانوں پر ترس کھاتے ہوئے کہتے تھے کہ انہیں دیکھو! یہ کتنے سادہ ناعاقبت اندیش لوگ ہیں؟ انہیں ان کے دین نے دھوکہ میں رکھا ہے، جو سراسر اپنے نفع ونقصان سے بے خبر ہیں، اپنی بے سروسامانی اور غیر مسلح ہونے کے باوجود قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے بڑے بڑے طاقتور مسلح لشکروں کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں اترے ہیں، جس کا نتیجہ لازماً یہی سامنے آئے گا کہ تمام کے تمام کٹ کر بے دردی سے مارے جائیں گے۔

ان کے دین نے انہیں موت کے منہ میں ڈالا ہوا ہے، ربّ العزّت سبحانہ نے ان کے اس احمقانہ فلسفہ کا جواب دے کر ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَإِنَّ اللهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکّل اور بھروسہ کرتا ہے تو وہ کبھی خوار و ذلیل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک اور خالق ہے، وہ ہر شی پر غالب ہے، وہ تمام قوتوں اور کامرانیوں کا مالک ہے، تم صرف مادیات کو جانتے ہوئے، اس طرح کی بے سروپا باتیں کرتے ہو، وہ تمام تر مادیات کا مالک ہے، تم نے اچھی طرح سے مشاہدہ کیا، اور آئندہ بھی دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے مٹھی بھر بے سروسامان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غیبی مدد کے ساتھ اپنے سے تین گنا بڑے چاق وچوبند مسلح لشکر کو وہ سبقِ عبرت سکھایا جسے رہتی دنیا تک لوگ یاد کریں۔

اگر تمہاری نظر ظاہری اسباب اور مادی قوتوں پر مرکوز رہتی ہے تو یاد رکھو! مسلمانوں کا بھروسہ واعتماد مسبب الاسباب حق تعالیٰ شانہ پر ہمیشہ ہمیشہ مرکوز رہتا ہے، وہ اگر چاہے تو مست و طاقتور ہاتھی کو ایک کمزور چیونٹی سے مار بھگائے اور تباہ کرے، تو بیشک وہ ہر چیز پر بلاشبہ قادر و توانا ہے، وہ غلبہ والا ہے اور حکمت والا ہے۔

بہ حکمش دو نیم ست و دریائے نیل ☆ بمرغان کشد فیل و اصحاب فیل

﴿الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ اگر منافقین مراد ہوں تو یہ عطف تفسیری ہوگا، اور اگر ان سے وہ لوگ مراد ہوں جو قریشِ مکہ کے ساتھ آئے تھے ان کے قلوب میں اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات ہوتے تھے، اور

تذبذب کا شکار رہتے تھے، یہ معنی بھی صحیح رہے گا۔

وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝۵۰ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۝۵۱ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝۵۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۵۳ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۝۵۴ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۵۵

ترجمہ: اور اگر آپ دیکھیں جب فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہوئے ان کے مونہوں پر اور ان کی پشتوں پر مارتے جاتے ہیں، اور یوں کہتے ہیں کہ جلنے کا عذاب چکھ لو ۵۰ یہ ان اعمال کی وجہ سے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے ۵۱ جیسا کہ آلِ فرعون کی حالت تھی، اور ان لوگوں کی جو ان سے پہلے تھے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا، سو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے سبب ان کو پکڑ لیا، بیشک اللہ تعالیٰ قوی ہے، سخت عذاب والا ہے ۵۲ یہ اس وجہ سے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کسی نعمت کا بدلنے والا نہیں جو کسی قوم کو دی ہو، یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنے ذاتی اعمال کو نہ بدل دیں، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ۵۳ جیسا کہ آلِ فرعون کی اور ان لوگوں کی حالت تھی جو ان سے پہلے تھے، انہوں نے اپنے ربّ کی آیات کو جھٹلایا، سو ہم نے ان کے سبب انہیں ہلاک کر دیا، اور ہم نے آلِ فرعون کو غرق کر دیا، اور یہ سب ظالم تھے ۵۴ بیشک زمین پر چلنے پھرنے والوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین لوگ وہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا، سو وہ ایمان نہ لائیں گے ۵۵

معارف ومنازل

یہ بات تمام علماء سلف وخلف کے نزدیک مسلم ہے کہ فرشتے جب انسانوں کی ارواح قبض کرتے ہیں تو ان کا سلوک تمام مرنے والوں کے ساتھ ایک جیسا نہیں ہوتا، مؤمن کی روح قبض کرتے وقت جس پیار ومحبت اور حسنِ سلوک کا نظارہ ہوتا ہے وہ قابلِ دید ہے، اور کفار کا معاملہ نہایت پیچیدہ اور بہت سخت ہے۔

دراصل کفار کا معاملہ گویا کہ جہنم کے عذابِ الیم کا ابتدائی حصہ ہے، ان آیات میں اسی سختی اور تنگی کا بیان ہے، جو انہیں موت کے وقت ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ معرکہ بدر میں جو کفارِ قریش مسلمانوں کے مقابلہ میں آئے تھے، اور پھر جنگ میں مارے گئے، جب وہ مقتول ہو رہے تھے تو فرشتے ان کو ان کے چہروں اور پشتوں پر مار رہے تھے، اور موت کے بعد جہنم کے عذاب میں مبتلا ہونے کی انہیں خبر دے رہے تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی نقل کیا ہے۔

جبکہ دیگر مفسرین نے اس مضمون کو عام بتایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت فرشتوں کا کافروں کے چہروں اور پشتوں پر مارنا یہ مقتولینِ بدر کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام کافروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے، جیسا کہ سورۂ محمد میں ارشاد ہے: ﴿فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ﴾ [محمد: ٢٧] (سو کیسا ہوگا جب فرشتے ان کی ارواح قبض کر رہے ہوں گے، اور ان کے چہروں اور پشتوں پر مار رہے ہوں گے؟)۔ واضح رہے کہ یہ عمومی والا دوسرا قول راجح ہے، جس میں مقتولینِ بدر اور سارے کفار شامل رہیں گے، جیسے دوسرے مقامات پر بھی اس کی تصریح ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ یہ موت اور بعد از موت کی سخت ترین سزا اس وجہ سے ہے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی تکذیب کر کے اپنے لئے خود سزا تجویز کی، اور تمہارے ہاتھوں نے غلط اعمال کا ارتکاب کر کے آگے بھیجا، جو تمہاری تباہی کا سبب بن گیا۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے، اور جو سزا انہیں ملے گی وہ ان کے برے اعمال کا بدلہ ہے۔

﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ فرمایا: ان مجرموں پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آیا یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ سلسلہ بہت ہی قدیم ہے، اور سنت اللہ یہی رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت سے ناامیدی ہوتی ہے تو اس قوم پر عذاب کا نزول ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے ان کو عقل وفہم دیتے ہیں، اور آیاتِ آفاقیہ اور آیاتِ انفسیہ انہیں مہیا فرماتے ہیں، اور انبیاء ورسل علیہم السلام کا نیز آسمانی کتابوں کا نزول فرماتے ہیں، تو عقل وفہم اور آیاتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ ہے کہ بندے غور وفکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کریں، اور اس کے احکام پر عمل کریں، طاعات وعبادات بجا لائیں، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، شیطان کا

کہا مانا، نفس کی خواہشات پر چلے، احکامِ الٰہیہ کی تکذیب کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوئے، اور آخرت میں بھی اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوئے، اور آخرت میں بھی کافروں کا ٹھکانا ابدُ الآباد جہنم ہی ہوگا، جس میں ہمیشہ جلتے رہیں گے، چنانچہ بطور مثال کے فرمایا:

﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ جیسا کہ آل فرعون اور ان لوگوں کی حالت تھی جو ان سے پہلے تھے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ جیسے آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کے ساتھ معاملہ ہوا اسی طرح اس زمانہ کے مجرمین کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ سورۂ مرسلات میں فرمایا: ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٦ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝١٧ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝١٨ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٩﴾ [المرسلات] (کیا ہم نے پہلے والوں ہلاک نہیں کیا؟ پھر ان کے پیچھے اوروں کو نہیں لگایا؟ ہم ایسا ہی کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ۔ ہلاکت ہو جھٹلانے والوں کے لیے)۔

جب یہ لوگ ہدایت پر نہیں آئیں گے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کو جھٹلائیں گے، تو یہ بھی مستحقِ عذاب ہوں گے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ قوی اور سخت عذاب والا ہے۔ اب قاعدہ کلیہ بتاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی اس نعمت کو اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جب تک کہ وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال کو نہ بدلیں، جب لوگ خود بدل جاتے ہیں، کفر و شرک اختیار کرتے ہیں، نافرمانیوں پر ڈٹ جاتے ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی نعمت چھین لیتے ہیں۔ جب لوگ ایمان کو چھوڑ دیں اچھے اعمال کو ترک کر دیں، اور بجائے شکر کے ناشکری اختیار کریں تو نعمت سلب ہو جاتی ہے، اور لوگ عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جیسے سورۂ ابراہیم میں فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ [ابراھیم: ٢٨] (کیا تم نے ان کو لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا، اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں لا اتارا)۔ سورۂ قریش میں فرمایا: ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ [القریش: ٤] (جس نے بھوک کی حالت میں انہیں کھانے کو دیا، اور بدامنی سے انہیں محفوظ رکھا)۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾ [ابراھیم: ٧] (اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقیناً، میرا عذاب بڑا سخت ہے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ [بخاري]

جب قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچائی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد حرام سے منع کیا، تو اللہ تعالیٰ کا ان پر عذاب نازل ہوا، وہ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے، اور ان کا امن تباہ ہوگیا، وہ غزوۂ بدر میں قتل ہو گئے، قیدی بنا لئے گئے، خوار وذلیل اور شرمندہ ہو گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا دستور اور تکوینی قانون یہی مقرر ہوا ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا کہ نافرماں لوگ فرعون اور اس سے پہلے لوگوں عاد وثمود اور قومِ لوط کی طرح دنیا میں تباہ وہلاک ہوجایا کریں گے، اور آخرت میں ابدی عذاب میں جھونک دیئے جائیں گے۔

جب فرعون جیسے جابر وظالم فوج وحشم کا مالک دریا میں غرق ہوسکتا ہے، تو یہ قریش اس کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچتے، ان کا تباہ کرنا نہایت آسان ہی ہوگا، اور آئندہ مجرمین کے ساتھ یہی سلوک ہوتا رہے گا، تا کہ دینِ الٰہی کو مکمل غلبہ حاصل ہو۔

﴿كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ﴾ اس آیت کریمہ میں سابقہ آیات کی تاکید بھی ہے اور تکرار بھی۔ پہلی آیت میں: ﴿كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ فرمایا، اور دوسری آیت میں: ﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ﴾ فرمایا، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا بھی انہوں نے خیال نہیں کیا، کہ جس نے پیدا فرمایا، پھر پرورش فرمائی، اور پرورش کے اسباب اور سامان مہیا فرمائے، حاجات پوری کیں، تو انصاف یہ ہے کہ اس کی توحید کا اقرار ہو، اور اسباب و پرورش اور دوسری نعمتوں کا شکر واعتراف بھی ہو، اور ناشکری اور نافرمانی سے اجتناب بھی ہو، مگر ایسا نہیں ہوا، تو اسی وجہ سے فرعون غرق ہوا کہ وہ بجائے بندگی کے اُلوہیت اور خدائی کا دعوے دار ہوا، اور حد سے تجاوز کیا، جس کے نتیجے میں غرق ہوا۔

کفار برے جانور سے بھی برے اور بدتر ہیں:

﴿اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک زمین پر چلنے پھرنے والوں میں سب سے برے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا۔

"اَلدَّوَابُّ" "دابة" کی جمع ہے، ہر وہ چیز جو زمین پر چلے پھرے۔ لغوی اعتبار سے یہ لفظ سب کو شامل ہے، یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے وغیرہ سب کو۔ مگر عرف ومحاورات میں دَابَّة چوپائیوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شَرَّ النَّاسِ نہیں فرمایا، بلکہ شَرَّ الدَّوَابِّ فرمایا، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ گویا یہ لوگ جنسِ انسانی سے نہیں ہیں، بلکہ جنسِ دَوَاب میں سے ہیں، اور جنسِ دواب میں سے بدترین افراد میں سے ہیں۔

﴿فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ ان کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی ہے، اور کفر وگمراہی کی آخری حد تک پہنچ چکے ہیں، اس لئے ان کے ایمان لانے کی نہ امید ہے اور نہ امکان ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق ارشاد فرمایا: ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] (ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں، وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں حواسِ ظاہرہ اور حواسِ باطنہ سب کچھ دیا ہوا ہے، وہ انہی حواس سے دنیاوی امور اور مادی منفعتوں میں بڑے سنجیدہ اور ماہر ہیں، مجال نہیں کہ وہ دنیاوی امور میں دھوکہ کھائیں، لیکن جب دلائلِ تکوینیہ سامنے آجاتے ہیں اور روحانی اقدار ان کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں تو قصداً وارادۃً جاہل وغافل اندھے بہرے گونگے ہوجاتے ہیں، یہ لوگ جانوروں سے بھی دوتین درجہ بدتر ہیں، انہیں انسان کہنا اور اولادِ آدم شمار کرنا انسانیت کی توہین ہے، پس ان کے لئے یہی فیصلہ ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾
فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا
تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن سے آپ نے معاہدہ کیا، پھر وہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں، اور وہ نہیں ڈرتے ﴿۵۶﴾ سو اگر آپ ان کو جنگ میں پالیں تو ان کے ذریعہ ان لوگوں کو منتشر کر دیجئے جو ان کے پیچھے ہیں، تاکہ ان کو عبرت حاصل ہو ﴿۵۷﴾ اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو ان سے جو عہد آپ نے کیا ہے وہ ان کی طرف پھینک

دیجئے تا کہ وہ اور آپ برابر ہو جائیں، بیشک اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۵۸

معارف ومنازل

کافر لوگ معاہدہ کے بعد اگر غدر کریں تو سخت سزا کے مستحق ہوں گے:

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ پہلی آیت: ﴿اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ﴾ میں یہودِ بنی قریظہ کا تذکرہ ہے، ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے مقابلہ میں کسی کی مدد نہیں کریں گے، پھر انہوں نے ہتھیار دے کر مشرکین کی مدد کی۔ جب ان سے سوال کیا گیا، تو کہنے لگے: ہم بھول گئے تھے۔ اس کے بعد پھر معاہدہ کیا تو اسے بھی توڑ دیا، اور غزوۂ خندق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں مشرکینِ مکہ کے مددگار بن گئے، اور کھلم کھلا ابو سفیان کے ساتھ ساز باز کر کے کہنے لگے کہ تم اُدھر سے مدینہ پر حملہ کرو، ہم پیچھے سے حملہ کریں گے۔

ان کا سردار کعب بن اشرف مکہ معظّمہ گیا اور مشرکین سے معاہدہ کیا کہ ہم تمہارے ساتھ مل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کریں گے، یہاں تک کہ اس نے مشرکین کا حوصلہ بڑھا کر ان کے بتوں کو سجدہ بھی کیا، جس سے مشرکین بڑے خوش ہوئے، اور اس کی دوستی پر اعتماد کیا (سورۂ نساء میں دیکھیں) اسی کو فرمایا:

﴿ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ﴾ پھر وہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔

﴿لَا یَتَّقُوْنَ﴾ اور وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ صاحب مظہری نے لکھا ہے کہ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابونعیم رحمۃ اللہ علیہم نے بیان کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل، بشیر بن براء اور حضرت داؤد بن سلمہ رضی اللہ عنہم نے یہودیوں سے فرمایا کہ اے گروہ یہود! تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، مسلمان ہو جاؤ، ہم جب مشرک تھے تو تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لے کر ہم پر فتحیاب ہونے کی دعاء کرتے تھے، اور ہم سے کہا کرتے تھے کہ ان کی بعثت ہونے والی ہے، اور تم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف جمیلہ بھی بیان کیا کرتے تھے، (تفصیل سورۂ بقرہ میں گذر چکی)۔

﴿فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ﴾ سو اگر آپ انہیں جنگ میں پالیں تو ان کے ذریعے ان لوگوں کو منتشر کر دیں جو ان کے پیچھے ہیں۔ یعنی لڑائی کے موقع پر آپ ان پر ایسا مضبوط حملہ کریں کہ یہ ناکام ہو جائیں، ان کی ناکامی اور آپ کی کامیابی کا جب شہرہ ہوگا تو ان کے پیچھے یعنی ان کے علاوہ جو بہت سے قبائل ہیں وہ بھی منتشر ہو جائیں گے، اور آپ پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کریں گے۔

﴿لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ﴾ تا کہ ان کو عبرت حاصل ہو، اور وہ جان لیں کہ عہد شکنی کرنے والوں کا اور کفر سے چمٹنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔

اہلِ ایمان عہد شکنی و نفاق سے اور خیانت سے دور ہیں:

اہلِ ایمان کو کبھی نقضِ عہد کی ضرورت پیش آجاتی ہے، اور یہ جب ہوتا ہے جب دشمن سے خطرہ ہو کہ وہ اپنا عہد توڑنے والا ہے، اگر ہم نے اپنے عہد کی پاسداری کی اور انہوں نے اپنا عہد توڑ دیا اور اچانک غفلت میں انہوں نے حملہ کر دیا تو ہمیں تکلیف پہنچے گی، ایسے موقع پر طریق کار یہ ہے کہ خود ان پر غفلت میں حملہ نہ کریں۔

ہاں! ایسا کریں کہ پہلے اعلان کریں، اطلاع دیں اور ان کو بتادیں کہ ہمارا تمہارا جو معاہدہ تھا ہم اسے ختم کر رہے ہیں، اسی کو فرمایا:

﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو جو عہد آپ نے ان سے کیا ہے وہ ان کی طرف پھینک دیجئے، تا کہ آپ اور وہ اس بات کے جاننے میں برابر ہو جائیں کہ اب معاہدہ باقی نہیں رہا۔ اگر معاہدہ کیا اور ان کا معاہدہ واپس نہ کیا اور معاہدہ ختم کرنے کی اطلاع کے بغیر ان پر حملہ کیا تو یہ غدر ہوگا، اور خیانت ہوگی، جس کی اسلام میں ہرگز اجازت نہیں ہے، اسی کو واضح کیا کہ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ﴾ بلا شبہ حق سبحانہ و تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا، ہوسکتا کہ بعض مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات آجاتی کہ چونکہ دشمن تو دشمن ہی ہے، کچھ بھروسہ نہیں کہ وہ اپنا عہد توڑ دے، اس لئے ہم اپنی حفاظت کے لئے پہلے حملہ کر دیں تو ہماری حفاظت ہو جائے گی، یا یہ کہ کفار و مشرکین خدا کے باغی نافرمان ہیں، ہمیں کیا ضرورت کہ ہم اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ کریں؟

اس خیال کو دفع کرنے کے لئے یہ نصیحت فرمائی کہ گو کافر تمہارے ربّ کے اور تمہارے دشمن ہیں، لیکن جب معاہدہ ہو گیا تو اب تمہارے لئے معاہدہ کی خلاف ورزی کبھی جائز نہیں، اگر ان سے عہد کی خلاف ورزی کا ڈر ہے تو تم پہلے انہیں بتادو کہ ہمارا عہد ختم ہے، اس کے بعد تمہیں حملہ کرنا جائز ہو جائے گا۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عہد کی پاسداری کا شریعت اسلامیہ میں کتنا ہی اہتمام ہے؟ مسلمان کے ساتھ یہ رواداری تو در کنار غیر مسلم کفار کے ساتھ بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام دینِ رحمت ہے، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعلمین ہیں، کیا کوئی مذہب و ملّت ایسے انصاف اور ایسی بے

مثال رواداری کا کوئی ثبوت پیش کرسکتا ہے؟

یہودیوں کی عہد شکنی:

حافظ محمد یوسف الصالحی رحمۃ اللہ علیہ نے سَبِیلُ الرَّشَادِ فِی هَدْیِ خَیرِ الْعِبَادِ میں لکھا ہے کہ بنی قینقاع کے یہودیوں نے عہد شکنی کی تھی، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا تھا، اور بغاوت وخیانت کا مظاہرہ کیا تھا، وہ یہ کہ ایک برقعہ پوش عربی عورت بنوقینقاع کے بازار میں آئی اور زیور خریدنے کے لئے ایک یہودی سنار کے پاس بیٹھ گئی، لوگوں نے اس کی نقاب اتروانا چاہی، لیکن اس نے نقاب کھولنے سے انکار کیا، سنار نے اس کے کپڑے کا کنارہ کسی کانٹے میں الجھادیا، عورت جو نادانستگی میں اٹھی تو ننگی ہوگئی، لوگ اس پر ہنس پڑے، عورت چیخنے لگی، اس کی چیخ سن کر وہاں موجود ایک مسلمان نے سنار پر حملہ کردیا اور اس کو قتل کردیا، یہودیوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا۔ شہید کردیا، اور مسلمانوں سے کیا ہوا عہد توڑ دیا۔

مقتول مسلمان کے رشتہ داروں نے مسلمانوں سے فریاد کی، مسلمان غضبناک ہوگئے، اس طرح مسلمانوں اور بنی قینقاع کے یہودیوں میں جھگڑا ہوگیا، اس پر:

﴿وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ﴾ آیت نازل ہوئی، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر یہودیوں کا محاصرہ فرمایا، اور پندرہ روز تک محاصرہ جاری رکھنے کے بعد تین روز کے اندر اندر انہیں مدینہ طیبہ سے جلاوطن فرمایا، وہ وہاں سے نکل کر خیبر چلے گئے۔

منافق کی چار علامات کا بیان:

سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس میں یہ چار چیزیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اور ان چار میں سے جس میں ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کا ایک حصہ مانا جائے گا جب تک اسے چھوڑ نہ دے:

(۱) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

(۲) اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

(۳) اور جب معاہدہ کرے تو دھوکہ دے (نقض عہد کرے)۔

(۴) اور جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکے (بدزبانی کرے)۔ [بخاري]

لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ ان چیزوں سے اجتناب کرے، اور اگر کسی سے معاہدہ کرے تو اس کی پاس داری کرے۔ حکومت سے معاہدہ ہو یا کسی جماعت سے، یا کسی فرد سے اس کی خلاف ورزی گناہ کبیرہ اور حرام ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (حدیث قدسی) کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن تین شخصوں پر میں خود دعویٰ کرنے والا ہوں: ایک وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد کیا پھر اس نے غدر کیا، اور ایک وہ شخص جس نے کسی آزاد کو بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا، اور ایک وہ شخص جس نے کسی مزدور کو کام پر لگایا، اس سے کام پورا لے لیا، اور اس کی مزدوری نہ دی۔ [بخاري]

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٦٠﴾

ترجمہ: اور کافر لوگ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ وہ آگے بڑھ کر بچ نکلے، وہ لوگ عاجز نہیں کر سکیں گے ﴿٥٩﴾ اور ان کے مقابلہ کے لئے تیاری کرو جو کچھ تم سے ہو سکے، قوت سے بھی اور پلے ہوئے گھوڑوں سے بھی، اس کے ذریعہ تم اللہ تعالیٰ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور ان لوگوں کو جو ان کے علاوہ ہیں ڈراتے رہو، تم ان کو نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے، اور جو بھی کوئی چیز تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دے دیا جائے گا، اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا ﴿٦٠﴾

معارف ومنازل

پہلی آیت میں ان کفار کا ذکر ہے، اور ساتھ تنبیہ بھی ہے کہ یہ کفار جو جنگ بدر کے موقع پر بچ کر نکل گئے، مقتول بھی نہ ہوئے اور قید میں بھی نہ آئے، یہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ ہم ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے، اور بچ نکلے تو کامیاب ہو گئے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وقتی طور پر بچ جانا مستقل بچاؤ نہیں ہے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے باہر نہیں ہیں، وہ اسے عاجز نہیں کر سکتے، وہ اگر چاہے گا تو دنیا میں بھی انہیں عقوبت میں مبتلا فرمائے گا، اور آخرت میں تو بہر حال ہر کافر کے لئے بدترین سخت سزا ہے، جس کا بیان قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ میں بکثرت بے شمار ہے۔ کوئی

انسان کتنا ہی طاقتور اور محفوظ ہو وہ اللہ تعالیٰ سے اور اس کی گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتا، اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی قوت کائنات کے ہر ہر ذرہ پر محیط ہے۔

جس طرح جہاد فرض ہے اسی طرح اس کے لئے سامانِ حرب کی پوری تیاری بھی فرض ہے:

اس کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم سے جو بھی کچھ ہو سکے دشمنوں سے لڑنے اور ان کا دفاع کرنے کے لئے ہر طرح کی قوت واسلحہ سامانِ حرب، اسبابِ جنگ تیار رکھو، جب کفر قیامت تک رہے تو تمہارا جہاد وقتال بھی قیامت تک رہے گا، کفر کی دشمنی اور تمہارے خلاف یلغار جب دائمی اور ہر زمانہ میں جاری ہے تو تمہاری طرف سے بھی اسی طرح اسباب وآلاتِ حرب کی تیاری بھی ضروری ہے، جیسا مرض ویسا علاج پھر فرمایا:

﴿مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ یہ لفظ بہت عام ہے، ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق تیاری کرنے کو شامل ہے، اور:

﴿مِّنْ قُوَّةٍ﴾ کا لفظ بھی نکرہ ہے، اور عام ہے، ہر قسم کی قوت جمع کرنے کو اس کا عموم شامل ہے، جس طرح کی تدبیروں کی جس طرح کے ہتھیاروں کی جس زمانہ میں ضرورت ہو ان سب کا بنانا، جمع کرنا خریدنا، سیکھنا سکھانا، فراہم کرنا، اور دوسری ہر طرح کی قوتیں اتفاق اتحاد، مشورہ، ایفائے عہد، تقویٰ، امانت، دیانت یہ سب لفظ ﴿مِّنْ قُوَّةٍ﴾ میں داخل ہیں۔

اور یاد رہے کہ سارے ظاہری اسباب پر جو قوت واثر روحانی تقویٰ اور اخلاص کا ہے وہ مسلم اور یقینی ہے۔ مسلمانوں نے اسی تقویٰ کی بنیاد پر بڑی بڑی عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل کیا، اور کرۂ ارض پر چھا گئے۔ نیز:

﴿مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ﴾ پلے ہوئے باندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھنے کا بھی حکم فرمایا، اس میں کوئی تخصیص نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ سواری کے تمام اسباب کو مہیا کیا جائے، جیسے آج کی دنیا میں کاروں، گاڑیوں اور ٹرکوں، بسوں کا زمانہ ہے، تو بکثرت ان چیزوں کی فراہمی اسی طرح ضروری ہے جس طرح سے پرانے زمانہ میں گھوڑے، گدھے، خچروں، اور اونٹوں کا ہوتا تھا۔

پھر آج کی ترقی یافتہ زمانہ میں بھی اونچے اونچے اور ناہموار پہاڑی دروں میں جہاں جیپوں ٹرکوں سے کام لینا مشکل ہے وہاں یہی گھوڑے، گدھے اور خچروں سے بآسانی ہر طرح کا کام لیا جاسکتا ہے۔

بہر حال حکم یہ ہے کہ زمانہ کی ترقی ورفتار کے ساتھ ہر قسم کی جو تیاری ممکن ہو دسترس میں تیار رکھو، اور مہیا کرو، اسی نکتہ کے پیش نظر سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ، اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْیُ، اَلَا اِنَّ الْقُوَّةَ

الرَّمْیُ۔ [مسلم] یعنی قوت تیر پھینکنا ہے۔ یہ حصر مراد نہیں، بلکہ اس زمانے میں سب سے بڑی قوت جو ہوتی تھی اس کی نشاندہی ہے، کہ تلوار صرف آمنے سامنے پر کارآمد ہے، جبکہ تیر اندازی دور اور نزدیک ہر وقت کارآمد ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو خطاب فرما کر کہا: اِرْمِ یَا سَعْدُ فِدَاکَ أَبِیْ وَأُمِّیْ۔ [بخاري] اس عظیم خطاب کے بعد جہاد کی اہمیت ومنقبت پر روشنی پڑتی ہے، کہ اس کا بہت اونچا مقام ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اپنے تیروں کو بچاؤ، اندھا دھند تیر باری نہ کرو، جب دشمن کثرت کے ساتھ نزدیک ہو تو تیر مارو۔ [بخاري]

زمانہ بدلنے کے ساتھ طریق جنگ اور آلات جنگ بدل گئے:

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی: اَلَا اِنَّ الْقُوَّۃَ الرَّمْیُ۔ یہ حصر کے لئے نہیں، اس کا عموم دورِ حاضر کے راکٹ بم اور ہر طرح کے سامان جنگ کو شامل ہے، کیونکہ لفظ الرَّمْیُ کا مفعول ذکر نہیں فرمایا، تو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ پھینکنے کی جب کوئی چیز ایجاد ہو جائے وہ سب اَلْقُوَّۃَ اور الرَّمْیُ کے مفہوم میں داخل ہو جائے گا، اور مسلمانوں کو اس کے حاصل کرنے کا اہتمام کرنا بھی لازم ہوگا، جدید ہتھیار، راکٹ، میزائل بم وغیرہ سب اسی عموم میں داخل ہو جائیں گے، اور آیت کریمہ کا عمومی معنی سب پر حاوی رہے گا۔

پس مسلمانوں کو چاہئے کہ یہ ہتھیار خود بنائیں، بصورت دیگر دوسروں سے خرید کرلیں، جدید ہتھیار بنانے کے اسباب، قوت عقلیہ مادی اشیاء اور محنت وجفاکشی اور سرمایہ واقتصادی قوت سب ضروری ہیں۔ آج مسلمانوں کے پاس بڑی کثرت کے ساتھ یہ سارے وسائل موجود ہیں، سوائے محنت وجفاکشی کے، جو کہ عیاشی، خوشحالی، تن آسانی کی وجہ سے مسلمان پسماندہ بھی ہیں، نہتے اور دست نگر وخوار بھی ہیں۔

آج ہتھیار اور ہر قسم کی ٹیکنالوجی بنانے والے اہلِ کفر ہی ہیں، اور کفر ملّت واحدہ ہے، وہ اپنے کافروں کو پہلے دیں گے اور زیادہ دیں گے، اور اصلی کارآمد ہتھیار ان کو دیں گے، اور جبکہ مسلمانوں کو کم اور ناکارہ محض برائے نام دفاعی ہتھیار دے کر انہیں مروائیں گے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں سارے کفار نے مل کر اسرائیل کو اعلیٰ پیمانہ کے ہتھیاروں سے مسلح کیا، اور گیارہ عربی ممالک کو جان بوجھ کر روس کے کھاتے میں ڈال دیا، اور روس نے انہیں کمزور اور ناکارہ ہتھیار دے کر عربوں کو مروایا، اور اسرائیل کو جتوایا۔ اس طرح کفار نے مل کر اسرائیل کو پورے خطے پر مسلط کیا، اور بیت المقدس

ودیگر بہت سے علاقوں پر اسرائیل قابض ہوگیا، جس کی سزا آج تک عرب حضرات بھگت رہے ہیں، اور اسرائیل کے امریکہ وروس سمیت غلام بنے ہوئے ہیں، یہ سب کچھ اپنی عیاشی اور تن آسانی وغفلت کی وجہ سے، اور فریضۂ جہاد سے دوری اور بھاگنے کی وجہ سے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ناز پروردہ تنعم نہ بردراہ بدوست ☆ عاشقی شیوۂ رندان جفاکش باشد

اسلام نے ہمیں برتر ہوکر اور سربلند ہوکر زندہ رہنا بتایا ہے، کافروں کے سامنے جھکنے اور انہیں اپنا رازدار اور وفادار بنانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگر آج ہم مسلمان اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہوتے، صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے جہادی کارناموں پر عامل ہوتے، تو دنیا کا یہ موجودہ نقشہ نہیں ہوتا، جسے ہم اپنا رہے ہیں، اور برداشت کررہے ہیں، اسی جہاد کی خاطر فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ جب تم ہر قسم کے سامانِ جنگ سے لیس رہو، اور ہر قسم کی خیانت سے پرہیز کرو، اور تقویٰ واخلاص کو اپنا شعار بنالو، تو تمہارا رعب ایک ماہ کی مسافت سے تمہارے دشمن کے قلوب پر پڑ جائے گا، وہ تمہارے سمت آنے اور فوج کشی سے کترائے گا، اور تم سے مرعوب ہوگا، پھر فرمایا:

﴿وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ﴾ یہ کون لوگ ہیں جنہیں اس وقت تم نہیں جانتے؟ یہ فارس وروم کے مضبوط وطاقتور لوگ ہیں، جن کے پاس افرادی قوت بھی ہے، اور ہر قسم کے ہتھیار وسامان بھی، جزیرہ عرب پر بسنے والے تمہارے دشمن مٹھی بھر یہود اور مشرکین یہ کچھ بھی نہیں، یہ مختصر مدّت میں ختم ہوجائیں گے، اور تمہارے تسلط میں آجائیں گے، جبکہ فارس وروم کی ٹڈی دل افواج بھی تمہارے دست نگر اور تابع بن جائیں گی، اور تمہاری کاری ضرب سے نیست ونابود ہوجائیں گی، مگر اس شرط پر: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ١٣٩] (اور تم سربلند ہوں گے، بشرطیکہ تم واقعی مؤمن رہو)۔

دیکھو! یہ پیشینگوئی مختصر وقت میں خلافتِ فاروقی میں کیسے بار آور اور پوری ہوئی؟ البتہ تم یہ کام بھی کرو کہ جانی قربانیوں کے ساتھ مالی قربانیوں کا سلسلہ بھی جاری رکھو، ایک روپیہ کے عوض تمیں سات سو کا بدلہ ملے گا، فرمایا:

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ﴾۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ [البقرة: ١٩٥] (اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو، اور اپنے آپ کو اپنے

ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو)۔سورۂ صف میں فرمایا:﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑩ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾[الصف] (کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتادوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلادے؟ تم اللہ اوراس کے رسول پر ایمان لاؤ،اوراپنے مال ودولت اوراپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو)۔

سرورعالم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ عام صدقہ وخیرات کا اجردس گنا ہے،جبکہ جہاد کے راستے میں خرچ کئے ہوئے مال کے اجر کی ابتدا سات سوگنا سے شروع ہوتی ہے،پھر یہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے مطابق بیس لاکھ تک پہنچتی ہے۔[درمنثور]

سرورعالم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے ایک اونٹنی پیش کی،آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں قیامت کے دن سات سواونٹنیاں بمع پالان ملیں گی۔اس حدیث کوامام مسلم نے ابومسعودانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

﴿وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کروتمہیں اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا،اورتم پرظلم نہ ہوگا۔چونکہ ہتھیار تیار کرنے میں اورہتھیارخریدنے میں گھوڑے پالنے میں بھی مال خرچ ہوتا ہے،اسی طرح جہاد میں شریک ہونے کے لئے بھی مال کی ضرورت ہوتی ہے،ان سب کا ثواب وبدلہ ایک کے عوض سات سوتک اللہ تعالیٰ عطافرمائیں گے،پس تم ہرحال اللہ تعالیٰ کی رضاء میں مال خرچ کرکے درجاتِ عالیہ کا مستحق بنو۔

✿ ✿ ✿

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ⑪ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ
يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ⑫ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ
اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ⑬

ترجمہ: اوراگروہ لوگ صلح کے لئے مائل ہوجائیں توآپ بھی اس کے لئے مائل ہوجائیں،اوراللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے،بے شک وہ سننے والا،جاننے والا ہے⑪ اوراگروہ لوگ آپ کودھوکہ دینے کا ارادہ کریں توبیشک اللہ تعالیٰ آپ کوکافی ہے،اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے اپنی مدد کے ساتھ اوراہلِ ایمان کے ساتھ آپ کوقوت دی⑫ اوران کے دلوں میں الفت پیدافرمائی،اگرآپ سب کچھ خرچ کردیتے جوزمین میں ہے تب بھی آپ ان کے دلوں میں

الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے، اور لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان الفت پیدا فرمائی، بیشک وہ غلبہ والا، حکمت والا ہے ۞

معارف ومنازل

دشمن کے ساتھ حسبِ ضرورت صلح بھی جائز ہے:

اس سے پہلی آیات میں حکم تھا کہ سامانِ جنگ تیار کر کے دشمن کو خوفزدہ رکھو، اور یہ بھی حکم تھا کہ عہد شکنی سے پرہیز کرو، اب حکم یہ ہے کہ اگر دشمن صلح پر آمادہ ہو، اور اس کا جھکاؤ صلح کی طرف ہو، تو آپ بھی آمادہ ہو جائیں۔ غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مصلحت وحکمت کے تحت اہلِ مکہ سے دس سال جنگ بندی کا معاہدہ فرمایا تھا، مگر اہلِ مکہ نے مدّت پوری ہونے سے پہلے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کر لی۔

بہر حال! یہ حکم وجوبی نہیں ہے، موقع ومصلحت سے متعلق ہے، مسلمانوں کی تیاری اور مجاہدانہ قربانیوں کو دیکھ کر بہت ممکن ہے کہ کفار خوفزدہ ومرعوب ہو کر صلح وآشتی کے خواستگار ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہے کہ حسبِ صوابدید ومصلحت آپ بھی صلح کا ہاتھ بڑھا دیں، کیونکہ جہاد سے مقصد خونریزی نہیں، اِعلَاءِ کلمۃ اللہِ تعالٰی اور دفعِ فتنہ مقصود ہے، اگر بدونِ خونریزی کے یہ مقصد حاصل ہو سکے تو خواہ مخواہ خون بہانے کی کیا حاجت؟

پس اگر صلح سے کام چلتا ہو تو صلح کر لیں، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ ان سے جزیہ لینا قبول کر لیں، اور صلح کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ وہ لوگ صلح کی بنیاد پر مسلمانوں سے ملیں گے، تو آپس میں ایک دوسرے کے ملک میں آنا جانا ہوگا، اس سے اہلِ کفر مسلمانوں کے اخلاق واعمال سے، اذان اور نماز وروزہ سے متأثر ہوں گے، اور اسلام کی طرف راغب ہوں گے۔

اگر کوئی اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کرے اس سے معلوم ہوگا کہ موجودہ سب سے بڑا مسلمان ملک انڈونیشیا اور اس کے ساتھ ملائیشیا یہ دونوں ایسے خطے میں واقع ہیں کہ جہاں مسلمانوں نے کبھی جہاد کی خاطر فوج کشی نہیں کی، اور کوئی جہادی لشکر وہاں نہیں گیا۔ ہوا یہ کہ مسلمان خاص کر عرب لوگ بغرضِ تجارت وہاں جاتے رہے، اور وہاں کی سکونت اختیار کی، ان کے اعمال واخلاق اور خالص اسلامی زندگی سے متأثر ہو کر رفتہ رفتہ سارے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ آج کرۂ ارض پر سب سے زیادہ اسلامی تعلیمات کا چرچا انہیں اسلامی ملکوں میں زیادہ ہے، اور پورا خطہ

دیندار اور متبعِ شریعت ہے۔

بعض اکابر نے فرمایا ہے کہ لفظ اِنۡ جَنَحُوۡا میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمان خود سے صلح کی پیشکش نہ کریں، اور اگر وہ لوگ پیشکش کریں تو صلح کرلیں۔ کتبِ فقہ میں یہ حکم لکھا ہوا ہے کہ صلح امام کی رائے اور صوابدید پر موقوف ہے، اگر صلح میں مصلحت اور فائدہ ہو تو صلح بہتر ہے۔

البتہ اگر کوئی سخت مجبوری ہو، مثلاً یہ کہ مسلمان دشمن کے نرغے میں ہوں، اور بغیر صلح کے کوئی نجات کا طریق ممکن نہ ہو، تو مسلمانوں کو اپنی طرف سے صلح کی پیش کش کی اجازت ہے۔

رہی یہ بات کہ ہوسکتا ہے کافر صلح کر کے بدعہدی کریں، اور چھپ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی شرارت کریں، اس لئے فرمایا:

﴿وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ﴾ اور آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ واعتماد کریں، بلاشبہ وہ سننے والا، جاننے والا ہے، وہ دشمن کے ہر شر و سرکشی سے تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ یا یہ مطلب ہو کہ اگر آپ صلح میں مصلحت دیکھیں تو صلح کرلیں، ایسے احتمالات کو بنیاد بنا کر صلح کی پیش کش کو مسترد نہ کریں، اور آئندہ کا حال اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں، کیونکہ:

﴿وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ﴾ اور اگر وہ آپ کو دھوکہ دینے کا ذریعہ بنائیں تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کے لئے کافی ہے، ان کا فریب مکر و چالبازی سب خاک میں مل جائے گا، اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے گا۔ پھر فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے اپنی مدد کے ذریعہ آپ کو قوت عطا فرمائی، یعنی ہر طرح سے بھی اور فرشتوں کے ذریعہ سے بھی، اور مسلمانوں کے ذریعہ سے بھی کہ انہوں نے ثابت قدمی کے ساتھ جنگ کر کے کافروں کو شکست دیدی۔

﴿وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کے دلوں میں الفت پیدا فرمائی، یہی وہ لوگ ہیں جو زمانہ کفر میں آپس میں لڑتے تھے، ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی، پھر ان کے قلوب میں محبت والفت ڈال کر انہیں متحد اور ایک بنایا۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ﴾ [آل عمران: ١٠٣] (اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کے اس انعام کو جو اس نے تم پر فرمایا، جب تم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کردی،

پس تم اس کی مہربانی سے آپس میں بھائی بن گئے۔ پھر فرمایا:

﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اور اگر آپ وہ سب کچھ خرچ کر دیتے جو زمین میں ہے تب بھی ان کے درمیان الفت پیدا نہیں کر سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی، وہ آپس میں بھائی بن گئے، اور آپ کے ہر حکم پر جان قربان کرنے کے لئے متحد و متفق ہو کر اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے لڑے، اور ان کی جان نثاری اور اتحاد نے دشمن کے منصوبے خاک میں ملائے، اور یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ
اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ
مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: اے نبی! آپ کو اللہ تعالیٰ کافی ہے، اور وہ مؤمن بندے جنہوں نے آپ کا اتباع کیا ﴿٦٤﴾ اے نبی! آپ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیجئے، اگر تم میں سے بیس افراد ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب ہو جائیں گے، اور اگر تم میں سے سو افراد ہوں گے تو ہزار کافروں پر غالب ہو جائیں گے، اس وجہ سے کہ یہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے ﴿٦٥﴾ اب اللہ تعالیٰ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا، اور اس نے جان لیا کہ بیشک تمہارے اندر کمزوری ہے، سو اگر تم میں سے ثابت قدم رہنے والے سو افراد ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے، اور اگر تم میں سے ایک ہزار افراد ہوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے دو ہزار پر غالب ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے ﴿٦٦﴾

معارف ومنازل

اصل مدد اور ہر معاملہ میں کامیابی تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، تمام ظاہری اسباب خواہ کچھ بھی ہوں سب اسی واحد لاشریک کے قبضۂ قدرت میں ہیں، جو حقیقی مدد ہے، اور ظاہری اسباب کے طور پر مسلمانوں کی جماعت اور

جمعیت بھی آپ کے ساتھ ہے۔ یہ حضرات آپ کا اتباع کرنے والے ہیں، جہاں دیگر مسائلِ معاد اور اسبابِ معاش میں آپ کا حکم بجالاتے ہیں وہاں جہاد میں بھی وہ دل سے اور جان و مال سے آپ کا اتباع کرنے والے ہیں۔

اہلِ ایمان کی جماعت مخلص ہو، اطاعت رسول ﷺ سے سرشار ہو، آپس میں یکجان و متحد ہو، تو پھر ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ یہ آیت بالاتفاق مدنی ہے، جن حضرات نے اس کے نزول کا سبب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کو بتایا ہے صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ آپ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیں، اور جہاد کے فضائل وفوائد سے انہیں مطلع کریں تاکہ وہ ذوق وشوق کے ساتھ رضائے الٰہی کی خاطر ثابت قدمی کے ساتھ فریضۂ جہاد میں حصہ لیں۔

امتحان کے انداز امتحان صرف ثابت قدمی کے لئے ہے:

جہاد کوئی آسان کام نہیں، جسے خوشی کے ساتھ ہر شخص انجام دینے پر مستعد ہو، یہ بہت سخت کٹھن کام ہے، اور اس میں ثابت رہنا اور پورا پورا صبر کرنا مزید امتحان بالائے امتحان ہے، اور پھر یہ حکم کہ تمہارے بیس افراد کفار کے دوسو سے نبرد آزما ہوں، اور تمہارے ایک سو افراد دشمن کے ایک ہزار کے مقابلہ میں ثابت قدم ہوں، یہ مزید بہت بڑا ناقابلِ برداشت امتحان ہوگا۔

ابتداء میں یہی حکم تھا کہ ڈٹ کر مقابلہ کرو، راہِ فرار اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ سورۂ انفال کے دوسرے رکوع کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے، وہاں تفصیل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسانی فرمائی، جس کی تفصیل یہ ہے فرمایا: کافروں سے صلح کی جو اجازت دی گئی وہ محض وقتی طور پر، اور وہ بھی جواز کے درجے میں، اصلی حکم جہاد اور قتال ہے، کیونکہ مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے، اور وہ اس پر موقوف ہے کہ کفر وشرک کا مکمل خاتمہ ہو، اور یہ چیز صلح سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ البتہ اس کا حصول جہاد ہی سے ہوگا، اسی بناء پر فرمایا کہ اے نبی! آپ اہلِ ایمان کو جہاد وقتال کی ترغیب اور شوق دلائیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو، اور اس کا بول بالا ہو، اور کفر کی شوکت مکمل ختم ہو، اور یہ بات جہاد سے حاصل ہوتی ہے، صلح سے نہیں، اور اس کا طریق کار یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے اگر بیس افراد کی تعداد ہوگی اور وہ جم کر ثابت قدمی سے لڑیں گے تو اپنے مقابل کافروں کے دوسو افراد پر غالب آئیں گے، اور اگر سو مسلمان ہوں گے تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب ہوں گے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی تھا، اور اس وعدہ میں یہ حکم بھی مضمر ہے کہ مسلمان اپنے سے دس گنا تعداد کے مقابلہ

میں راہِ فرار اختیار نہ کریں، اور جم کر قوت سے لڑیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس گنا تعداد کے مقابلہ میں غلبہ پانے کا وعدہ ہوگیا تو اب راہِ فرار اختیار کرنے کا کوئی موقع نہ رہا۔ یہ جملہ لفظاً خبریہ ہے، اور معنیٰ انشائیہ ہے۔ پھر فرمایا:
﴿بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ﴾ یہ اس لئے کہ کفار ثوابِ آخرت کو سمجھتے نہیں، یعنی اس لئے وہ تم پر غالب نہیں آئیں گے کہ وہ آخرت کو نہیں جانتے ہیں، ان کی نظر صرف دنیاوی زندگی پر مرکوز ہے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ آخرت اور جنت کے ایسے مشتاق و دلدادہ ہیں جیسے پیاسا شخص پانی کا مشتاق ہو، وہ آخرت کے شوق میں اپنی جان کو قربان کرنے کے لئے منتظر رہتے ہیں۔

پس جو صرف نفس و شیطان اور عصبیت و جاہلیت کے لئے لڑتا ہو وہ مسلمانوں پر کیوں اور کیسے غلبہ پائے گا؟ جن کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور لڑنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور اس کا مطلب و مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہو، وہ اگر بلند و بالا پہاڑوں سے ٹکرائے تو یقین ہے کہ اس کی جیت ہوگی، اور پہاڑ اس کی ہیبت سے ریزہ ریزہ ہوں گے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے ☆ جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا ☆ سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو ☆ عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن ☆ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اقبالؒ

فرمایا: ﴿اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنۡكُمۡ وَعَلِمَ اَنَّ فِيۡكُمۡ ضَعۡفًا﴾ اس آیت کریمہ کا سببِ نزول بتاتے ہوئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے (کتاب التفسیر ج ۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب پہلی آیت: ﴿اِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ﴾ نازل ہوئی تو مسلمانوں کو یہ بات بھاری معلوم ہوئی کہ دشمن کے افراد دس گنا ہوں تب بھی ان کے مقابلہ سے راہِ فرار اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تخفیف فرمادی اور دس گنا افراد سے مقابلہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ سو افراد دو سو کے مقابلہ میں راہِ فرار اختیار نہ کریں، یعنی دوگنی جماعت سے راہِ فرار اختیار کرنا ممنوع ہوگیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے تخفیف فرمادی اور دس گنا افراد کے مقابلہ میں لڑنے کا جو حکم تھا اس کے بجائے اپنے سے دوگنی جماعت سے لڑنے کا حکم دیدیا، اور راہِ فرار اختیار کرنے سے منع

فرمادیا تواسی قدران کے صبر میں سے کمی فرمادی۔

علماء کرام کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ پچھلی آیت اگلی آیت کے لئے ناسخ ہے۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ پہلا حکم عزیمت ہے، اور دوسرا رخصت ہے۔ بعض حضرات نے یہ کہا کہ:

﴿وَعَلِمَ اللّٰهُ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ خیر القرون میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگر چہ عدد میں تھوڑے تھے، لیکن توکل علی اللہ اور صبر میں کامل تھے م لہٰذا دس گنی جماعت سے بھی ثابت قدمی کے ساتھ لڑ سکتے تھے، جیسے جنگِ یَرموک میں چھتیس ہزار نے نو لاکھ ساٹھ ہزار کے ساتھ لڑ کر انہیں عبرت ناک تاریخی شکست سے دو چار کیا۔ بعد میں مسلمانوں کی اگر چہ کثرت تو ہوگئی مگر وہ صبر واستقامت کہیں بھی نظر نہیں آیا، اس لئے یہ تخفیف ہوگئی، اور یہ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام ہے، جیسے مسافر کے لئے صلوٰۃِ قصر۔

البتہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ہر موقع پر مسلمانوں کی مدد فرمائی ہے، فارس اور روم کے محاذوں پر بھاری تعداد میں دشمن سامنے آئے، مگر مسلمانوں نے تعداد کی کمی کے باوجود انہیں ہر محاذ پر شکست دیدی۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ یہ بتادیا کہ طاعت پر جمنے والوں اور معصیت ترک کرنے والوں کا اور مصیبتوں پر صبر کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ ساتھی ہے، اور ان کی مدد فرمائے گا، کامیابی کے تمام اسباب کا خلاصہ تقویٰ اور صبر ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد انہی کے ساتھ مربوط ومتعلق ہے۔

....

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَ
اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۶۷ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۶۸ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۶۹

ترجمہ: نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے پاس قیدی موجود رہیں جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح خونریزی نہ کرلے، تم دنیا کا سامان چاہتے ہو، اور اللہ تعالیٰ آخرت کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے ۶۷ اگر اللہ تعالیٰ کا نوشتہ پہلے سے مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کے بارے میں تم کو بڑا عذاب پہنچ جاتا ۶۸ سو کھاؤ اس میں سے جو تمہیں بطورِ غنیمت کے مل گیا، حلال پاکیزہ ہونے کی حالت میں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو،

بیشک اللہ تعالیٰ شانہ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۶۹﴾

معارف ومنازل

غزوۂ بدر کی لڑائی سے ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو کر آئے، حق تعالیٰ شانہ نے ان کے متعلق دو صورتیں مسلمانوں کے سامنے پیش کیں: پہلی یہ کہ انہیں قتل کیا جائے، دوسری یہ کہ ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اس شرط پر کہ آئندہ سال اسی تعداد میں تمہارے آدمی قتل کئے جائیں گے۔ حقیقت میں خدا تعالیٰ شانہ کی طرف سے ان دو صورتوں کا انتخاب کے لئے پیش کرنا امتحان وآزمائش کے طریقہ پر تھا کہ ظاہر ہو جائے کہ مسلمان اپنی رائے اور طبیعت سے کس طرف جھکتے ہیں، جیسے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو دوصورتوں میں تخییر دی گئی تھی: ﴿إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ﴾ [الأحزاب:۲۸] (اگر تم دنیا اور اس کی زینت کا ارادہ رکھتی ہو تو آؤ۔۔۔)۔

معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے شراب اور دودھ کے دو برتن پیش کیے گئے تھے، آپ نے دودھ کو اختیار فرمایا، جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اگر بالفرض آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت بہک جاتی (یعنی گمراہ ہو جاتی)۔

بہر حال! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے اس معاملہ میں رائے طلب کی، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ سب قیدی اپنے خویش واقارب اور بھائی بند ہیں، بہتر یہ ہے کہ فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے، اس نرم سلوک اور احسان کے بعد ممکن ہے کہ کچھ لوگ مسلمان ہو کر وہ خود اور ان کی اولاد و اتباع ہمارے دست وبازو بنیں، اور جو مال بالفعل (یعنی ابھی) ہاتھ آئے اس سے جہاد وغیرہ دینی کاموں میں سہارا لگے۔ باقی آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہو جائیں تو مضائقہ نہیں، ان کو درجۂ شہادت ملے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا میلان بھی فطری رحم دلی اور شفقت وصلہ رحمی کی بناء پر اسی رائے کی طرف تھا، بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عام رائے اسی جانب تھی، بہت سے تو ان ہی وجوہ کی بناء پر جو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان فرمائیں، اور بعض محض مالی فائدہ کو دیکھتے ہوئے اس رائے سے متفق تھے، كَمَا يَظْهَرُ مِنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: ﴿تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا﴾ صَرَّحَ بہ الحافظ ابن حجر وابن قیم رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اس سے اختلاف کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں، ان کو ختم کر دیا جائے تو کفر و شرک کا سر ٹوٹ جائے گا، اور تمام مشرکین پر ہیبت طاری ہو جائے گی، آئندہ مسلمانوں کو ستانے اور اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکنے کا حوصلہ نہ رہے گا، اور خدا تعالیٰ کے آگے مشرکین سے ہماری انتہائی نفرت و بغض اور کامل بیزاری کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اپنی قرابتوں اور مالی فوائد کی کچھ پرواہ نہیں کی، اس لئے مناسب ہے کہ ان قیدیوں میں جو کوئی ہم میں سے کسی کا عزیز و قریب ہو وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

الغرض بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل ہوا، کیونکہ کثرت رائے ادھر تھی، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبعی رأفت یعنی نرم دلی رحمت و شفقت کی بناء پر اسی طرف مائل تھے، اور ویسے بھی اخلاقی اور کلی حیثیت سے عام حالات میں وہی رائے قرینِ صواب معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اسلام اس وقت جن حالات سے گزر رہا تھا ان پر نظر کرتے ہوئے وقتی مصالح کا تقاضا یہ تھا کہ کفار کے مقابلہ میں سخت کمر شکن کارروائی کی جائے، تیرہ سال کے ستم کشوں و مظلوموں کے طاغوت کے پرستاروں پر یہ ثابت رہنے کا پہلا موقع ملا تھا کہ تمہارے تعلقات، قرابت، اموال جتھے اور طاقتیں اب کوئی چیز تم کو خدا کی شمشیر انتقام سے پناہ نہیں دے سکتی۔ ابتداً ایک مرتبہ ظالم پر یعنی مشرکین پر رعب و ہیبت بٹھلا دینے کے بعد رحم دلی اور صلہ رحمی کے استعمال کے لئے آئندہ بہتیرے مواقع باقی رہتے تھے، ادھر ستر مسلمانوں کے آئندہ قتل پر راضی ہو جانا معمولی بات نہ تھی، اس لئے اس رائے کو اختیار فرمانا وقتی مصالح اور ہنگامی حیثیت سے حق سبحانہ و تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ نہ ہوا، فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ﴾ اس آیت میں اسی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ ایک سخت خطرناک اجتہادی غلطی قرار دی گئی ہے، اور جن بعض لوگوں نے زیادہ تر مالی فوائد پر نظر کر کے اس سے اتفاق کیا تھا ان کو صاف طور پر:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ﴾ سے خطاب کیا گیا، یعنی تم دنیا کے فانی اسباب پر نظر کر رہے ہو، حالانکہ مؤمن کی نظر انجام پر ہونی چاہئے، خدا کی حکمت مقتضی ہو تو وہ تمہارا کام اپنے زورِ قدرت سے ظاہری سامان کے بغیر بھی کر سکتا ہے۔

بہر حال فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس وقت کے حالات کے اعتبار سے بڑی بھاری (اجتہادی) غلطی قرار دی گئی۔ اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ روایات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ محض صلہ رحمی اور رحمدلی کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رجحان اس رائے کی طرف تھا۔ اَلْغَرَض بُغض فِی اللهِ میں کوتاہی کرنا اور اصل مقصد "جہاد" سے غفلت برتنا، اور ستر مسلمانوں کے قتل کئے جانے پر اپنے اختیار سے رضامند ہوجانا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جیسے مقربین کی شانِ عالی اور منصبِ جلیل کے منافی سمجھا گیا، اور سخت عتاب نازل ہوا۔ [تفسير عثماني]

﴿لَوۡلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمۡ فِيۡمَاۤ اَخَذۡتُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بات پہلے سے لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تمہیں فدیہ لینے پر بڑے عذاب کا سامنا ہوتا، مگر اس لکھے نے عذاب روک دیا۔ اس نوشتہ سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں حضرات مفسرین نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے متعدد اقوال نقل کئے ہیں، مثلاً:

(۱) مجتہد کو اس قسم کی اجتہادی غلطی پر عذاب نہیں ہوگا۔

(۲) جب تک اللہ تعالیٰ صریح امر و نہی کے ذریعہ کسی چیز کا حکم بیان نہ فرمائے اس وقت تک اس کے مرتکب کو عذاب نہیں دیتا۔

(۳) اہلِ بدر کے متعلق فیصلہ ہے کہ ان کی خطائیں معاف ہیں۔

(۴) غلطی سے جو رویہ (یعنی فیصلہ) قبل از وقت اختیار کرلیا گیا، یعنی فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دینا اللہ تعالیٰ کے علم میں طے شدہ تھا کہ آئندہ اس کی اجازت ہوجائے گی، ﴿فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾ [محمد ﷺ: ۴] (چاہے احسان کر کے چھوڑ دو، یا فدیہ لے کر)۔ جب فدیہ کا جواز عنقریب آنے والا ہی تھا تو عجلت پر معافی ہوگئی، اور عذاب رک گیا۔

(۵) یہ بھی طے شدہ ہے کہ جب تک سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان میں موجود ہیں یہ لوگ صدقِ دل سے استغفار کرتے ہیں تو عذاب نہیں آئے گا، جیسے گزر گیا۔

(۶) ان قیدیوں میں جن کی قسمت میں اسلام لانا لکھا گیا تھا اور قتل کی صورت میں وہ محروم ہوجاتے اور جہنمی ہوتے جو کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہ تھا۔

الغرض اگر یہ تمام توجیہات مراد ہوں جو مختلف اقوال کی صورت میں بیان ہوئیں، تو اس میں کوئی اشکال

نہیں، اور ان میں سے ہر توجیہ اپنی جگہ میں صحیح اور درست ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس قسم کے موانع نہ ہوتے بصورتِ انفرادی یا اجتماعی تو یہ غلطی اتنی ثقیل و عظیم تھی کہ سخت عذاب نازل ہو جانا چاہئے تھا۔ [عثماني وغيره]

﴿فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ پس کھاؤ اس میں سے جو تمہیں بطورِ غنیمت کے مل گیا حلال پاکیزہ ہونے کی حالت میں۔ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لے کر جو انہیں چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا اس پر عتاب تو ہو گیا، لیکن اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنی مہربانی سے اس مال کو حلال و طیب قرار دے کر کھانے کی جازت مرحمت فرمائی، اور ساتھ یہ بھی حکم جاری فرمایا کہ:

﴿وَّاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، آئندہ ایسی غلطی نہ کرو، اور عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، تمہارے گناہ معاف فرما کر تم پر رحمت و کرم فرمایا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب پہلی آیت نازل ہوئی تو جو کچھ بطورِ فدیہ مال لے چکے تھے، اس سے پرہیز کرنے لگے، جب ﴿فَكُلُوا﴾ آیت نازل ہوئی تو اس مال کو استعمال کر لیا، ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگوں سے پہلے مال لے لیا گیا ہو، اور باقی لوگوں سے بعد میں لیا گیا ہو، اور اَقرب یہی ہے، کیونکہ سب کے پاس اس وقت مال موجود نہیں تھے، ان قیدیوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص رضی اللہ عنہ بن الربیع، اور آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب بھی تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اجازت لے کر ابو العاص رضی اللہ عنہ کو فدیہ لئے بغیر چھوڑ دیا، اور ان کو وہ ہار بھی واپس کر دیا جسے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا نے ابو العاص رضی اللہ عنہ کے لئے فدیہ کے طور پر بھیجا تھا، یہ ہار سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے بطور جہیز حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو دیا تھا، اسے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم رنجیدہ ہوئے تھے، اور جس ہستی نے دنیا میں سب سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور جان نثاری کا حق ادا کر دیا تھا اس کے ہار کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محسنۂ کائنات اور رفیقہ حیات رضی اللہ عنہا کی جان نثاری یاد آ گئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت دگرگوں ہو گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: اگر تم بطیبِ خاطر اجازت دو تو میں سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا ہار واپس کر دوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ضبط نہ ہو سکا، سب چیخ چیخ کر رونے لگے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ کی جگہ ابو العاص رضی اللہ عنہ پر یہ شرط لگائی کہ تم مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو

میرے پاس بھیج دینا (حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے بڑی بیٹی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر ان کو مدینہ منورہ نہ لا سکے تھے، وہ وہیں مکہ مکرمہ میں رہ گئی تھیں)۔ اس لئے ابو العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ زینب رضی اللہ عنہا کو بھیج دینا، انہوں نے وعدہ پورا کیا، اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ پہنچایا، اور بعد میں مسلمان ہو کر خود بھی مدینہ آ گئے۔ پوری تفصیل کتب سیرت میں دیکھیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ قیدیوں سے جو فدیہ لیا گیا اس کی مقدار کیا ہے؟ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ ہر قیدی کا فدیہ چالیس اوقیہ تھا، اور ہر اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا تھا، اس طرح سے ہر قیدی کا فدیہ سولہ سو درہم ہوا۔ اور روح المعانی میں لکھا ہے کہ ہر قیدی کا فدیہ سوا اوقیہ تھا، اور اس کے علاوہ اور بھی بعض اقوال ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدیوں میں تھے، انہوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مال کا کیا ہوا جو تم مکہ سے چلتے وقت ام الفضل کو دے آئے تھے، اور یہ کہہ کر آئے تھے کہ اس سفر میں اگر مجھ پر کوئی افتاد پڑے تو یہ میرے بیٹوں عبد اللہ، فضل اور قثم کا ہے؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! میں یقین کرتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں، کیونکہ اس چیز سے سوائے میرے اور اُمّ الفضل کے اور کوئی واقف نہ تھا۔ [أبو داؤد، مظهري]

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا
يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٧٠ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا
خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٧١

ترجمہ: اے نبی! جو قیدی آپ کے قبضے میں ہیں ان سے فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے دلوں میں ایمان معلوم ہوگا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو عطا فرما دے گا، اور اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے گا، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ۝٧٠ اور وہ لوگ اگر آپ کی خیانت کا ارادہ کریں سو وہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی خیانت کر چکے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر قدرت دیدی، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے ۝٧١

☆☆☆

معارف ومنازل

شانِ نزول حضرت عباس رضی اللہ عنہ مشرکین کے لشکر میں آئے تھے، اور بیس اوقیہ سونا لے کر چلے تھے، تاکہ اپنے ساتھیوں کو کھلاتے پلاتے رہیں، ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا تھا، اب ان کے پاس بیس اوقیہ جو رہ رہے تھے مقامِ بدر میں جب ان کو قیدی بنالیا گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہ بیس اوقیہ ان سے لے لئے، جب قید کر کے لائے گئے اور ان سے سوال ہوا کہ فدیہ ادا کرو، تو انہوں نے کہا کہ وہ جو بیس اوقیہ جو مجھ سے لئے تھے اسی کو میری جان کے فدیہ میں شمار کرو۔

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو چیز تم ہمارے مقابلہ میں خرچ کرنے کے لئے لے کر آئے تھے وہ مالِ غنیمت میں شمار ہے، تمہارے فدیہ کے حساب میں وہ شمار نہیں ہوسکتا۔ عباس رضی اللہ عنہ نے یوں بھی کہا: یارسول اللہ! میں تو مسلمان تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تم مسلمان تھے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے، اگر تم سچے ہو تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کا بدلہ دے دے گا، ہمارے نزدیک بظاہر تم جنگ کرنے کے لئے مقابلہ میں آئے ہو، لہٰذا تم اپنی جان کا بھی فدیہ دے دو، اور اپنے دونوں بھتیجوں نوفل بن حارث اور عقیل بن ابی طالب اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو کا بھی فدیہ دو۔

عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم مجھے اس حال میں چھوڑنا چاہتے ہو کہ میں زندگی بھر قریش سے بھیک مانگا کروں، میرے پاس اتنا مال نہیں ہے کہ اس قدر فدیہ دے سکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ مال کہاں ہے جو تم نے اور تمہاری بیوی اُم الفضل نے مل کر دفن کیا ہے؟ تم نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ میں اگر اس سفر میں مقتول ہوگیا تو یہ مال میرے بیٹوں عبداللہ اور عبیداللہ اور فضل اور قثم کے کام آئے گا۔ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! یارسول اللہ! اس بات کا علم میرے اور اُم الفضل کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے، آپ کو کس نے بتایا؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے میرے ربّ عزّ شانہ نے بتایا۔ اس پر عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں، اور وہ بات پھر دہرائی کہ وہ جو بیس اوقیہ میدانِ جنگ میں جو مجھ سے لے لیا گیا ہے وہ میرے فدیہ کے حساب میں لگالیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، وہ حساب میں نہیں لگ سکتا، وہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں (بطور مالِ غنیمت) کے عطا فرمایا ہے، لہٰذا عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا فدیہ بھی دیا، اور دونوں بھتیجوں کا بھی، اور اپنے حلیف کا بھی۔ [معالم، ابن کثیر وغیرہ]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا اسلام تو فدیہ کے دن ہی ظاہر کردیا تھا، لیکن وہ اس وقت مکہ معظمہ چلے گئے

تھے، پھر فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تھے (الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ حرف عین)۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب نے یہ کہا کہ میں تو مسلمان تھا، اور میرا مال جو غزوۂ بدر میں مجھ سے لے لیا گیا ہے اسی کو میرے فدیہ میں لگا یا جائے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے انکار فرما دیا، جس پر انہوں نے اپنا اور مزید تین آدمیوں کا فدیہ دیا تو اللہ تعالیٰ نے آیت:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيٓ أَيْدِيكُمْ مِّنَ الْأَسْرَىٰ﴾ نازل فرمائی، جس میں یہ فرمایا کہ اے نبی! جو قیدی آپ کے قبضے میں ہیں ان کو فرما دیں: اگر تمہارے دل میں ایمان ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر عطا فرما دے گا جو تم سے لیا گیا، اور اللہ تعالیٰ تمہیں بخش دے گا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جب پوری طرح اسلام میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اس خدائی وعدہ کو سچا پایا، وہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بیس اوقیہ کی جگہ بیس غلام عطا فرمائے ہیں، جو مال کما کر لاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید بھی رکھتا ہوں، کیونکہ آیت کریمہ میں مغفرت کا بھی وعدہ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: جو مال مجھ سے لیا گیا تھا اس کے عوض اللہ تعالیٰ نے مجھے سو گنا مال عطا فرمایا۔ صاحب روح المعانی اور مفسر حقانی وغیرہ حضرات فرماتے ہیں کہ آیت کے الفاظ کا عموم تمام قیدیوں کو شامل ہے، اگر چہ سببِ نزول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، مگر یہ حکم تمام قیدیوں کو شامل ہے، پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنْ يُّرِيدُوا خِيَانَتَكَ﴾ کہ یہ قیدی اگر آپ کی خیانت کا ارادہ کریں، واپس جا کر جنگ کرنے کی نیت سے لوٹ آئیں، یا آپ کے مقابلہ میں مشرکین کی مدد کرنے لگیں، تو آپ فکر مند نہ ہوں، اس سے پہلے یہ اللہ تعالیٰ کی خیانت کر چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو ہر عاقل سے توحید کے بارے میں عہد لیا تھا، اسے توڑ کر کفر اختیار کیا، پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ کو ان پر مسلط فرما کر آپ کو قدرت دیدی، اور انہیں آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں سے بدر میں مقتول کروا دیا، اور قیدی بنا کر مدینہ میں حاضر کروا دیا۔ اگر انہوں نے پھر ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ پھر آپ کی مدد فرمائے گا، اور انہیں خوار و ذلیل فرمائے گا۔

﴿وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، اس کو سب کچھ معلوم ہے، وہ سب کی نیتوں کو جانتا ہے، وہ حکیم بھی ہے، اپنی حکمت کے مطابق اپنی مخلوقات میں تصرف فرماتا ہے، جس کو جب چاہے فتحیاب کرتا ہے، اور جس کو جب چاہے شکست دیتا ہے، جب چاہتا ہے کسی کو انعام دیتا ہے، یا اگر چاہے تو کسی کو سزا دیتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٧٢﴾

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے، اور ہجرت کی، اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، اور وہ لوگ جنہوں نے جگہ دی، اور مدد کی، وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی، تمہارا ان سے میراث کا کوئی تعلق نہیں، جب تک کہ ہجرت نہ کریں، اور اگر وہ تم سے دین میں مدد طلب کریں تو تمہارے ذمہ ان کی مدد لازم ہے، سوائے اس قوم کے مقابلہ میں کہ ان میں اور تم میں کوئی معاہدہ لازم ہے، سوائے اس قوم کے مقابلہ میں کہ ان میں اور تم میں کوئی معاہدہ ہو، اور اللہ تعالیٰ شانہ ان کاموں کو دیکھتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿٧٢﴾

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٧٥﴾

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہیں، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد ہوگا ﴿٧٣﴾ اور جو لوگ ایمان لائے، اور ہجرت کی، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، اور وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانا دیا اور مدد کی، یہ وہ لوگ ہیں جو واقعی ایمان والے ہیں، ان کے لئے مغفرت ہے، اور رزق کریم ہے ﴿٧٤﴾ اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی، اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا، سو یہ لوگ تم میں سے ہیں، اور جو لوگ رشتہ دار ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ایک دوسرے کے قریب تر ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے ﴿٧٥﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں قیدیوں کو تسلی دی، اب ان آیات میں مہاجرین اور انصار کے فضائل اور مسلمانوں کے باعتبار ہجرت وعدمِ ہجرت کے مراتب اور احکام کا بیان ہے، حکم شرعی یہ ہے کہ اگر کافروں سے مقابلہ ومقاتلہ کی قدرت ہو تو پھر جہاد فرض ہے، اور اگر قدرت نہ ہو عجز ہو تو ہجرت فرض ہے، ان آیات میں اسی ہجرت اور اس کے احکام کا، نیز ضمناً جہاد وہجرت دونوں کے مراتب کا بیان ہے۔

زمانہ رسالت میں لوگ دو قسم کے تھے: (۱) مسلمان (۲) کفار۔ آیت کریمہ میں کفار کا بیان صرف اس قدر ہے:

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ باقی ساری تفصیل مؤمنین کے بارے میں ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مسلمان چار قسم کے تھے: (۱) مہاجرین۔ (۲) انصارِ مدینہ۔ (۳) غیر مہاجرین جو ہجرت نہ کرسکے بدستور مکہ شریف میں رہے۔ (۴) جو مسلمان صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد بھی کیا، آیاتِ بالا میں انہی چاروں کا بیان، اور ان کے احکام کی نشاندہی ہے۔ اب ان کی تفصیل کا بیان ہے۔

قسم اول:

مہاجرینِ اولین جنہوں نے دینِ اسلام کی خاطر اپنا کنبہ اور وطن چھوڑا، اور اسلام کی خاطر تمام تکلیفوں کو برداشت کیا، اور ہجرت کی۔

قسم دوئم:

انصارِ مدینہ جنہوں نے مہاجرین کو ٹھکانا دیا، اور جان ومال سے ان کی مدد کی، اور ان کے ساتھ ہوکر اعداء اسلام سے لڑے، ان دونوں قسموں کا حکم یہ بیان فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ یعنی یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے دوست اور وارث ہیں۔ پہلا گروہ مہاجرینِ سابقین کا ہے، دوسرا گروہ انصارِ سابقین کا ہے، ان دونوں گروہوں میں آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مواخات (بھائی چارہ) قائم کیا، اور اسی رشتہ مواخات کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا وارث بنا دیا، اور ایک کی دوسرے پر نصرت واجب کی۔ یہ دونوں فریق صلح اور جنگ میں ایک دوسرے کے شریک ہیں، ان سب کی صلح اور

جنگ ایک ہے، ایک کا موافق سب کا موافق، اور ایک کا مخالف سب کا مخالف ہے۔ پہلی آیت کے پہلے حصہ میں انہی کا بیان ہے۔

قسم سوئم:

وہ مسلمان جو ایمان تو لائے مگر ہجرت نہیں کی، اور اپنے ہی وطن میں رہے، جہاں کافروں کا زور اور تسلط تھا، یعنی دار الحرب میں رہے، اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہ کر سکے، ان لوگوں کے متعلق دو حکم بیان ہوئے: ایک یہ کہ یہ لوگ مسلمانوں کی حمایت، وراثت، مال غنیمت، مال فیٔ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ مواخات کی بنیاد پر مہاجرین اور انصار کے درمیان جو توریث کا سلسلہ قائم ہے، اس میں یہ غیر مہاجر لوگ شامل نہیں ہیں۔ یہ لوگ مہاجرین اور انصار کے وارث نہیں ہو سکتے، اسی طرح مالِ غنیمت اور مال فیٔ میں بھی شریک وحقدار نہیں ہو سکتے۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ اگر یہ لوگ تم سے کسی دینی امر میں مدد طلب کریں تو تم اپنی مقدور کے موافق ان کی مدد کرو، کیونکہ وہ اہلِ ایمان ہیں، تمہارے دینی بھائی ہیں۔ البتہ انہیں ان لوگوں کے مقابلہ میں مدد نہ دو جن سے تمہارا کوئی عہد ہو چکا ہے، تا بقائے عہد معاہدین کے مقابلہ میں دار الحرب کے مسلمانوں کی مدد نہیں کی جاسکتی، عہد کی پابندی واجب ہے، لہٰذا معاہدین سے بدعہدی حرام ہے۔

قسم چہارم:

یہ وہ لوگ ہیں جو صلحِ حدیبیہ کے بعد ایمان لائے، اور پھر ہجرت کر کے آنحضرت سرور عالم ﷺ کے پاس مدینہ طیبہ پہنچے، اور آپ ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد بھی کیا، ان کی نسبت یہ ارشاد ہے کہ یہ لوگ باعتبار احکام کے مہاجرین اوّلین کی برادری میں منسلک ہیں، اور یہ لوگ اگر چہ ہجرت کے تقدم وتاخر کی وجہ سے مرتبہ میں ان سے کم ہیں، مگر دینی نصرت وحمایت کے اعتبار سے سب کا حکم ایک ہے۔ [تفسیر کبیر جلد چہارم]

فائدہ:

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے قسمِ سوئم کے ذکر کے بعد قسمِ اول اور قسمِ دوئم کے مسلمانوں کا دوبارہ ذکر فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ کہ ان لوگوں کے لئے آخرت میں مغفرت اور جنت میں عزت وکرامت کی

روزی ہے۔اس آیت میں ان دونوں قسموں کی مدح اور فضیلت بیان کرنا مقصود ہے،اور پہلی بار جو ان دونوں قسموں کا ذکر فرمایا وہاں باعتبار ولایت اور وراثت کے ان کا حکم بیان کرنا مقصود تھا، لہٰذا آیت میں تکرار نہیں۔دوسری مرتبہ ذکر کرنے سے سابقینِ اوّلین کی خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار محض ان کی فضیلت کو بیان کرنا مقصود ہے،اور مِن جانب اللہ ان کے پکے سچے مؤمن ہونے کی شہادت دینا مقصود ہے، جیسے فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ یہ لوگ ان لوگوں سے افضل اور اکمل ہیں جو ایمان لانے کے بعد دار الحرب میں مقیم رہے،اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی۔

خلاصہ یہ کہ ربّ العزت سبحانہ نے پہلی قسم اور دوسری قسم کے مسلمانوں میں باہمی دو چیزیں ثابت کیں: ایک نصرت، اور ایک وراثت، اور تیسری قسم کے لئے صرف نصرت کو ثابت کیا، اور میراث کی نفی فرمائی۔ خوب سمجھو۔[کبیر] قسمِ اول کا بیان:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ بیشک جو لوگ ایمان لائے، اور خدا اور رسول کی محبت میں اپنے وطن اور خویش واقارب سے ہجرت کی، اور جان ومال سے خدا کی راہ میں جہاد وقتال کیا، اور غزوات وسرایا میں اپنے کافر عزیز وقریب اور دوستوں سے اسلام کی خاطر مقابلہ اور مقاتلہ کیا، یہ گروہ سابقینِ اسلام اور مہاجرینِ اوّلین کے لقب سے ملقب ہے، جو سب سے افضل واکمل ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبدالرحمن کفار کے لشکر میں شامل تھے، بعد میں ایمان لائے، اپنے والد سے کہنے لگے: ابا جان! دو تین مرتبہ آپ میری تلوار کی زد میں رہے، مگر میں قصدًا دوسری طرف رُخ کر کے آپ کے مارنے سے احتراز کیا، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: افسوس اگر میں آپ کو دیکھا ہوتا تو آپ کا سر قلم کرتا، اور مجھے بڑی خوشی ہوتی۔اسی طرح حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جن کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شہادت سے پہلے فرمایا: اگر آج حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ مقرر کرتا، جن کے متعلق سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم (فداه أرواحنا) نے فرمایا تھا: لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينٌ وَأَمِينُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَبُو عُبَيْدَةَ رضی اللہ عنہ۔[بخاري] (ہر اُمّت کے لئے ایک امین ہوتا ہے میری امت کا امین اور برحق امین ابوعبیدہ بن الجراح ہے)۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے بدر میں اپنے کافر والد کو تلوار سے قتل فرمایا تھا، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوعبیدہ! تم نے اپنے والد کو کیوں قتل کیا؟ کہنے لگے: یارسول اللہ! آپ کی محبت والد کی محبت پر غالب رہی۔ایک

والد تو کیا میں پورے خاندان کو آپ پر اور اسلام پر قربان کرتا ہوں۔ رضی اللہ عنہ

دوسرا گروہ انصار کا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا﴾ وہ لوگ یعنی انصار جنہوں نے مہاجرین کو ٹھکانا دیا اور جان و مال سے ان کی مدد کی، یہ جماعت انصار کے لقب سے مُلقب ہے، جن کا درجہ مہاجرینِ اولین کے بعد ہے، کیونکہ حق کی نصرت وحمایت کچھ آسان ہے، مگر حق کے پیچھے ایسا دیوانہ وعاشق زار ہو جانا کہ بیوی، بچے، رزق وروزی، احباب ودوستوں اور وطنِ اصلی سب کچھ قربان کر کے اکیلا وتنہا ہجرت کرنا، یہ بہت ہی سخت اور نہایت مشکل کام ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے والی اور وارث ہیں، یعنی مہاجرین اور انصار، اور ان کے قریبی رشتہ دار جو کافر ہیں وہ ان کے وارث نہیں۔

اب قسم سوئم کے لوگوں کا بیان ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ اور جو لوگ ایمان تو لائے، لیکن دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی، ان کی میراث میں تمہارا کوئی حق نہیں، یعنی مہاجرین کی میراث میں ان کا کوئی حق نہیں، نہ یہ ان کے وارث اور نہ وہ ان کے وارث، یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کریں، جب وہ ہجرت کریں گے تو میراث کا استحقاق انہیں حاصل رہے گا۔

البتہ یہ ہجرت نہ کرنے والے اگر کافروں کے مقابلہ میں تم سے کوئی مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد واجب ہے، کیونکہ وہ اہلِ ایمان اور تمہارے بھائی ہیں، مگر اس قوم کے مقابلہ میں نہیں جن کے اور تمہارے درمیان صلح کا کوئی عہد و پیمان ہو۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے کہ عہد شکنی حرام ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ﴾ اور جو لوگ کافر ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، ان کے ساتھ کوئی ولایت و وراثت نہیں، اور نہ ہی ان کی تمہارے ساتھ کوئی وراثت ہے، جتنے کفار دنیا میں ہیں وہ سب تمہارے بدخواہ اور دشمن ہیں، اور آپس میں الکفر ملة واحدة ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

پھر فرمایا: اے مسلمانو! اگر تم ایسا نہیں کرو گے یعنی کافروں کو اپنا دشمن نہیں سمجھو گے، اور ان سے قطع تعلق نہیں کرو گے، تو زمین میں بڑا فتنہ اور فساد برپا ہو جائے گا، یعنی اگر مسلمان ایک دوسرے سے دوستی نہیں کریں گے، اور

باہمی تعاون و مدد نہیں کریں گے، اور کافروں کو اپنا دشمن نہیں سمجھیں گے، تو سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا، جس سے مسلمان مغلوب ہوجائیں گے، اور کافر غالب آجائیں گے، اور کفر کا غلبہ بڑے بڑے فتنوں اور فسادوں کا پیش خیمہ ہوگا، اور کفر سے بڑھ کر نہ کوئی فساد ہے، اور نہ ہی کوئی فتنہ، لہٰذا ضروری ہوا کہ تم کافروں سے الگ تھلگ رہو، اور میراث کا قاعدہ اسلام کی بنیاد پر جاری رکھو۔

خدانخواستہ اگر تم کافروں کو اپنا دوست اور وارث بنانے لگے تو اسلام بے انتہا کمزور ہوجائے گا، اور تمہاری بقاء مشکوک ہوجائے گی۔ ان آیات میں ربّ العزّت سبحانہ نے مسلمانوں کی تیسری قسم کے احکام بیان فرمائے، اب آئندہ آیات میں قسمِ اول اور قسمِ دوئم کے مسلمانوں کی مدح اور فضیلت بیان کرتے ہیں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ اور جو ایمان لائے اور پھر ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے مہاجرین حضرات کو ٹھکانہ دیا، اور ان کی مدد کی، یہ دونوں جماعتیں یعنی مہاجرین اور انصار سچے پکے مسلمان ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے بڑی مغفرت کا وعدہ ہے، اور ان کے لئے مغفرت وروزی کی بشارت ہے۔ آئندہ آیت میں قسمِ چہارم کا ذکر ہے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ﴾ اور جو لوگ صلحِ حدیبیہ کے بعد ایمان لائے، اور ہجرت کی، اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا، سو یہ لوگ بھی تم ہی میں سے ہیں، اور تمہیں میں شمار ہیں، سو یہ لوگ اگرچہ فضیلت اور مرتبہ میں تمہارے برابر نہیں، مگر تمہارے ساتھ ملحق و وابستہ ہیں، تم ان کے وارث ہو، اور وہ تمہارے وارث ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایمان کی فضیلت تم سب کو حاصل ہے۔ البتہ مراتب میں تفاوت ہے، اور احکامِ میراث میں تو سب برابر ہیں، کیونکہ اس کا تعلق اسلام سے ہے، اور میراث کے لئے مرتبہ میں برابری کی شرط نہیں۔ پھر فرمایا:

﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ اور جو لوگ آپس میں رشتہ دار ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ایک دوسرے سے قریب تر ہیں، لہٰذا رشتہ داریوں کی بنیاد پر آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، جس کی تفصیل سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں گزر چکی ہے۔

اس سے میراث کا وہ حکم منسوخ کردیا گیا جو اوائلِ ہجرت میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کے

بعد جاری کر دیا گیا تھا۔ یہ حکم ذَوِی الفروض اور عصبات سب کو شامل ہے، بلکہ علماء فرائض کی اصطلاح میں جن کو ذَوِی الأرحام کہا جاتا ہے ان کو بھی شامل ہے۔ البتہ ان سب کے درمیان ترتیب ہے، جو کہ کتبِ فرائض میں مذکور ہے، لہٰذا اسلام اور ہجرت کے ساتھ جس میراث کا تعلق تھا اب وہ باقی نہیں رہا، آئندہ میراث کا تعلق صرف نسبی قرابت کے ساتھ ہوگا۔ فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ احکامِ شرعیہ کی خلاف ورزی کرنے والے یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے اعمال کی خبر نہیں، اللہ تعالیٰ کو ہر شخص اور ہر ذرہ کا علم ہے، وہ احکام کی خلاف ورزی پر سخت سزا دے گا، اور اطاعت گزاروں کو اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ یہ مہاجرین وانصار سچے پکے برحق مسلمان ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ اور دیگر بہت سی آیتوں نے اور بے شمار احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ امت نے پوری وضاحت کے ساتھ محسنینِ اسلام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایمان اور صداقت پر مہر تصدیق ثبت فرما کر پوری امت پر واضح فرمایا کہ یہ جماعت اہلِ حق کی جماعت ہے، اور ان کے ایمان وامانت پر خود ربّ العزّت عزّ وجل اور سید کائنات ﷺ اور ملأ أعلی کے فرشتے سارے گواہ ہیں، اور یہی وہ جماعتِ برحق ہے جس نے پورے چار دانگ عالم میں اسلام کو پھیلایا، اور ہر محاذ پر قرآن وسنت کی حفاظت کی۔

دینِ اسلام کے بنیادی ارکان پانچ ہیں، ان پانچوں ارکان کی عمارت جن دیواروں، دروازوں، روشندانوں، کھڑکیوں، اینٹوں وغیرہ پر کھڑی ہے وہ سرورِ عالم ﷺ کے رفقاء کار، جان نثار اور سرفروش خدمت گار صحابہ رضی اللہ عنہم ہی ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ کے لئے دنیاوی زندگی اور بعد از وصال برزخی زندگی میں جن جن چیزوں کی ضرورت ہوئی ایک ادنیٰ چیز سے لے کر اعلیٰ اور آخری چیز تک سب کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی منظوری دی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتخاب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا، اگر اسلام اور شریعت مطہرہ میں اس پاکیزہ بابرکت جماعت کو نظر انداز کیا جائے تو اسلام کی پوری عمارت زمین بوس ہو کر گر جائے گی، اور خدانخواستہ شریعت مطہرہ کی حیثیت ایک حروف بے معنی کے برابر ہو جائے گی۔

یہود ونصاریٰ اور ان کے گماشتے قرنِ اول سے لے کر آج تک اسی سازش میں مصروف عمل رہے ہیں کہ اسلام قرآن حدیث اور سیرۃ النبی ﷺ کی حیثیت مشکوک ہو، اور پوری شریعت کے راویوں کی عدالت مجروح ہو،

وہ اپنے مذموم وناپاک ارادوں کی تکمیل کی خاطر عبداللہ بن سبا جیسے یہودی اور رافضی کے ذریعہ اسلامی تعلیمات پر حملہ آور ہوئے، اور کاری ضرب لگا کر مسلمانوں میں طرح طرح کے انتشار پیدا کیے۔

یہ سلسلہ چودہ سو سال سے مسلسل جاری ہے، اگر کسی عصر و زمانہ میں مسلمانوں پر کوئی دینی یا دنیاوی یا سیاسی تنزل و آفت آئی ہے تو روافض کا ہاتھ ضرور اس میں ملوث رہا ہے، بلکہ ہر فتنہ کا بانی وہی جماعت نظر آتی ہے۔

دراصل شیعیت یہود کی پیداوار اور یہودیت کا باطنی نقشہ اور اس کی تصویر ہے، ایران کا شیعہ ہو یا اسرائیل کا یہودی پسِ پردہ دونوں ایک تصویر کے دو رخ ہیں، جن کا نظریہ تقیہ اور تکذیبِ حق کے سوا اور کچھ نہیں، اور دونوں گروہ دراصل دجالی مشن کے ہراول دستے اور خبیث دجال کے کارکن ہیں۔

جب دجال کا اصفہان ایران سے ظہور ہوگا تو یہی اس کے لشکر کے سپاہی ہوں گے، اور دجالی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا کر یہی دونوں اپنا مذہبی حق ادا کریں گے۔ دراصل ان کا مشن صرف یہ نہیں کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تکفیر کریں، بلکہ "بدا" جیسے عقیدہ کی بنیاد پر وہ پوری شریعت اسلامیہ بشمولِ توحید و رسالت، قرآن مجید، عقیدۂ آخرت اور کعبۃ اللہ وغیرہ سب کے منکر ہیں، ان کا بنیادی کلمہ وہ نہیں جو کہ عالم اسلام کا کلمہ ہے۔

الغرض ادنیٰ حکمِ شرعی سے لے کر توحید و رسالت اور کتاب اللہ تک وہ عالم اسلام سے الگ تھلگ اور مخالف ہیں، عالم اسلام کا کوئی ایک مسئلہ ایسا نہیں جسے انہوں نے تسلیم کیا ہو، یا اپنایا ہو، جب ایک قوم خدا کے متعلق یہ کہتی ہو کہ وہ عالم الغیب نہیں، عجلت میں کوئی کام انجام دیتا ہے، پھر پشیمان ہو کر افسوس کرتا ہے، تو اس قوم کے متعلق آپ کا فیصلہ اور کیا ہوگا سوائے اس کے کہ وہ کافر اور غیر مسلم ہوں؟ قرآن مجید کی حیثیت ان کے سامنے کچھ بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال کے عرصہ میں کوئی شیعہ حافظ قرآن نہ بنا، پس اگر وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر و مرتد کہیں تو آپ کو کیوں تعجب ہوگا؟ وہ تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن و کعبہ سب ہی کے تو منکر ہیں، یہی وجہ ہے کہ چودہ سو سال سے علماء اسلام کا متفقہ فتویٰ ہے کہ سنی مسلمان مرد کا شیعہ عورت کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکتا، اگر کوئی ایسے نکاح کا ارتکاب کرے گا تو زندگی بھر زنا ہی شمار ہوگا، اور بچے حرامزادے شمار ہوں گے۔

شیعہ تحریفِ قرآن کے قائل ہیں، اور موجودہ قرآن کو نہیں مانتے، اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن شرابی خلفاء کا ترتیب دیا ہوا قرآن ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ آئے دن قرآن مجید کی بے احترامی کرتے رہتے ہیں، اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر و مرتد کہتے ہیں، حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو فرعون و ہامان سے بھی بدتر سمجھتے ہیں، جبکہ قرآن و سنت کی رُو سے

اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پکے اور سچے مسلمان تھے، اور پوری امت کے چشم و چراغ تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو معیارِ حق قرار دیا ہے، جو فرمایا: ﴿ فَإِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ [البقرة:١٣٧] (اگر وہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو یہ راہِ ست پر آجائیں گے)۔

شیعہ کی تکفیر کوئی نئی بات نہیں، یہ بہت قدیم سے تواتر کے درجہ میں پہنچ چکی ہے، اس میں کسی عقلمند، دانشور، عالم، مورخ کو نہ شک رہا ہے اور نہ ہی تردد۔ شیعہ کی تکفیر کے لئے مستقلاً تفصیلاً "تاریخی دستاویزی تالیفِ ابوریحان مجاہد کبیر حضرت ضیاء الرحمان فاروقی شہید رحمۃ اللہ علیہ کی جو مختلف مکاتبِ فکر کے چار سو علماء کرام کی موجودگی میں ۲۸ ستمبر ۱۹۹۱ء کو گورنر ہاؤس میں وزیر اعظم محمد نواز شریف کو پیش کی تھی، جس میں شیعہ مذہب کے بنیادی عقائد ونظریات ان کی کتابوں کے اصل عکس بمع سرورق پیش کئے گئے تھے جو کہ قابلِ دید ہے، اور بے مثال مجموعہ ہے، جس کی نظیر نہیں، اس کا دیکھنا ضروری ہے۔

فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ